قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اردو ترجمہ

جلد سوم

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خان

(۱) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (سورۃ الانعام : ۳۸)

''ہم نے (اپنی اس) کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں رکھی۔'' (۶ : ۳۸)

(۲) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ٥ (سورۃ الانعام :۵۹)

''اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں (موجود) ہیں۔'' (۶ : ۵۹)

(۳) وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورۃ النحل :۸۹)

(اے محبوبِ مکرم!) ''ہم نے آپ پر ہر بات کو کھول دینے والی کتاب اتاری ہے۔'' (۱۶:۸۹)

(۴) وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ٥ (سورۃ القمر : ۵۳)

''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔'' (۵۴ : ۵۳)

قرآنک انسائیکلو پیڈیا (اُردو ترجمہ)

(جلد سوئم)

مؤلّف : پروفیسر اشفاق احمد خان

سابق صدر شعبہ عربی۔ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان

مترجم : پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلو پیڈیا ہذا)

ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز

5۔ شالیمار کالونی' عقب ٹویوٹا شوروم۔ بوسن روڈ ملتان

موبائل : 0331-2220692

0301-7422684

طبع اوّل : جنوری 2013ء

ملنے کے پتے :

اندرونِ ملک :

(۱) پروفیسر اشفاق احمد خان ـ ۵ شالیمار کالونی، عقب ٹویوٹا شوروم ـ بوسن روڈ ملتان
موبائل : 0331-2220692
0301-7422684 (محمد جمیل ـ مارکیٹنگ منیجر)

(۲) ملتان کتاب گھر ـ بالمقابل گورنمنٹ کالج، بوسن روڈ ملتان
فون: 6750226 -061

(۳) مکتبہ قاسمیہ ـ کچہری روڈ، نزد چوک گھنٹہ گھر ـ ملتان
موبائل : 0300-7300097

بیرونِ ملک : پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم
drhafizsaleem@yahoo.com.uk.
Landline Tel: 0044-1628-823632

قیمت : ایک ہزار روپے (Rs. 1000/-)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ

DEDICATED TO THE HOLY PROPHET ﷺ

To whom a Non-Muslim pays his Glowing Tributes as under :-

" I am only surprised when some Muslim asks me as to why I always use black blankets ; I tell them that I do so as a token of my personal homage to Prophet Mohammad who was the greatest man the world has ever produced. He was so simple in his day-to-day life that one could hardly imagine that he was the man who was ruling over the hearts of the millions all over the world. I instructed the Congress Government, immediately after they assumed power after the elections of 1936 that they should follow the footsteps of Hazrat Umar who thoroughly implemented every preaching of Prophet Mohammad and thus bettered the lot of the common man." **(M. K. Gandhi, quoted in "Freedom", October, 1976).**

انتساب

اُس مقدّس ہستی کے نام جنہیں ایک ہندو نے یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے :-

"جب کوئی مسلمان مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ ہمیشہ کالی اوڑھنی کیوں اوڑھتے ہیں تو میں ازراہِ حیرت اُنہیں کہتا ہوں کہ میں پیغمبرِ اسلام محمد (ﷺ) کو خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے ایسا کرتا ہوں جو ایسے عظیم ترین انسان ہیں جو دُنیا شاذ و نادر ہی پیدا کیا کرتی ہے۔ آپ اپنی روز مرّہ زندگی میں ایسے سادہ منش تھے کہ کوئی آدمی بہ مشکل ہی یہ تصوّر کر سکتا تھا کہ آپ وہی ہیں جو دُنیا کے کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ 1936ء کے انتخابات کے فوراً بعد جب کانگریس حکومت نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو میں نے اُنہیں ہدایت کی تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلیں جنہوں نے پیغمبرِ اسلام کے ہر حکم کا مکمل طور پر نفاذ کیا اور اِس طرح اپنے پیغمبر کی پیروی میں اُنہوں نے عامّۃ الناس کی زندگی کو بہتر بنا دیا تھا۔"

(مہاتما گاندھی بحوالہ ماہنامہ "فریڈم" اکتوبر 1976ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

محتویات (CONTENTS)

رسمی (رواجی) تعلیم ۔ غیر رسمی تعلیم ۔ اختباری علم ۔ غیر اختباری علم ۔ ایجابیت (اِثباتیت (Positivism)۔ مادیت پرستوں کی ذہنیت بحوالہ قارون ۔ علم کے دروازے ۔ علمائے دین کا فرضِ منصبی ۔ مسلم سماج کے لئے تعلیم و تعلم کی پالیسی ۔ علمی اور جسمانی تعلیم ۔ ہمارے نوجوانوں کے لئے اَخلاقی تعلیم ۔ اسلام کی بنیاد ۔ اسلامی علوم کے نمونے ۔ تعلیم و تعلم سے متعلق چند متعلقہ الفاظ اور اصطلاحات ۔ کلاس (تدریسی جماعت) کے آداب کی تربیت ۔

اظہار مافی الضمیر بطور عطیہ الٰہی ۔ فنّ خطابت اور انبیاء علیہم السلام کا طریق استدلال ۔ عصبیّتِ جاہلی کا تدارک ۔ سدّ ذرائع کا قاعدہ ۔ جدّ الانبیاء ابراہیم علیہ السّلام کی مثال ۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ کی مثال ۔ سورۃ الکافرون کی آخری آیت سے پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی کا ازالہ ۔ کفّار و مشرکین کو کافر/مشرک قرار دینے اور اُن سے لاتعلقی کے اظہار میں تاخیر کی حکمت ۔ نبی معظم ﷺ کی خوش بیانی' خطابت کے نمایاں امتیازات اور طرزِ خطابت ۔ آپ ﷺ کے فنّ خطابت پر چند مفکّرین کی آراء ۔ آپ ﷺ کے خطبات کے چند نمونے ۔ آپ کا خطبہ حجۃ الوداع ۔ اَلنَّسِیئَۃ ۔

تعریف و توضیح ۔ سول انجینئرنگ اور قرآنِ حکیم ۔ تَماثیل ۔ الہام اور وحی ۔ مکینیکل انجینئرنگ اور قرآنِ حکیم ۔ ہوانوردی (Aeronautical) کا ذکر قرآنِ حکیم میں ۔ کان کنی اور دھات کاری کی انجینئرنگ ۔ کیمیکل انجینئرنگ ۔ الیکٹریکل انجینئرنگ ۔ ٹیکسٹائل (پارچہ بافی) انجینئرنگ اور قرآن مجید ۔ جینیاتی (Genetic) انجینئرنگ ۔ زندگی سے زندگی کیسے؟ قانونِ اوّلیّت و سبقت (Principle of Priority)۔ سورہ عَبَس کی آیت ۲۰ کے لفظ اَلسَّبیل سے مراد ۔

ماحولیات کی تعریف و توضیح ۔ ماحولیاتی تعلیم ۔ مذہب اسلام اور مادّی و روحانی ماحول ۔ ماحولیات کی درجہ بندی : (۱) قدرتی ماحول (۲) مصنوعی ماحول (۳) معاشرتی ماحول (۴) حج اور معاشرتی و روحانی ماحول ۔ نسلِ انسانی کی ہم کاری اور لیگ آف نیشنز ۔ (۵) نفسیاتی ماحول ۔ (۶) روحانی (مذہبی) ماحول ۔ مادیّت (لامذہبیت) کا ماحول ۔ مادیّتی ماحول کا نقشہ اور قرآنِ حکیم ۔ ماحول کی حفاظت ۔ انسانی زندگی میں ماحولیات کی اہمیت ۔ ایکالوجی ۔ انسانوں اور پرندوں کی انسانوں سے مماثلت کی وجہ ۔ ماحولیات کا روحانی پہلو ۔ انسان کی اپنے ماحول سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت ۔ نبی اکرم ﷺ اور ماحولیات ۔

(۳۹) احوالِ حشر ونشر (ESCHATOLOGY) ___ ___ ___ ___ ___ ___ ۱۱۸۰

ابتدائی مکی زندگی میں دو اہم تبلیغی پیغامات: (۱) وحدانیتِ الٰہی (۲) رب کے حضور اعمال کی جوابدہی۔ انسان کا ابتدائی مذہب۔ توحید یا شرک؟ حیاتِ انسانی اور موت۔ روزِ محشر کے لئے مختلف قرآنی نام۔ دَآبَّۃُ الارض۔ وقوعِ قیامت پر عقلی دلائل۔ وقوعِ قیامت پر شرعی دلائل۔ دنیا میں راحت اور مصیبت کا آنا مکمل جزا و سزا نہیں ہے۔ نفخِ صور، حشر ونشر اور قیامت۔ نفخہ اُولٰی اور نفخہ ثانیہ۔ جوابدہی کا وقت۔ انسان اپنے مقدر کا خود معمار ہے۔ میزان۔ آخرت میں میرٹ کی بنیاد پر درجہ بندی۔ مقامِ اَعراف۔ پُل صراط۔ جہنم کے مختلف نام۔ جہنم کی ہولناکیاں۔ جہنم کی گہرائی اور حدّت۔ دوزخ میں جلنے والے پتھر۔ سورہ مَریَم کی آیت ۷۱ کے لفظ وَارِد کا معنیٰ۔ دوزخ کے قول هَلْ مِنْ مَّزِيد کی تاویلات۔ دوزخ میں اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کی توجیہ۔ دوزخیوں کا لباس اور کھانا۔ دوزخیوں اور جنتیوں کا دوزخ اور جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا۔ روزِ قیامت میں شفاعت کا بیان۔ منکرینِ شفاعت کے اعتراضات اور جوابات۔ انکارِ شفاعت میں اعتدال کا عنصر (Mitigating Element)۔ نبی معظم ﷺ کی اہلِ محشر کے لئے شفاعت۔ مقامِ محمود احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں۔ جنابِ ابو طالب کے لئے آپ ﷺ کی شفاعت۔ آپ کے علاوہ دیگر لوگوں کی شفاعت۔ دنیا میں اہلِ جنت کی صفات۔ جنت کے درجات۔ چاروں جنتوں میں فرق۔ ایک اِشکال اور اُس کا جواب۔ جنت کے ایک درجہ کی وسعت۔ جنت کے دروازے اور اُن کی وسعت۔ جنت کے درخت۔ جنت کی بیری کا درخت۔ درخت طوبیٰ۔ کدّو اور تربوز جنتی پیداوار ہیں۔ جنت کے درختوں کی نوعیت۔ جنتیوں کے لباس۔ سبز رنگ کو مخصوص کرنے کی وجہ۔ جنت کا موسم اور درجہ حرارت۔ جنت میں ذکرِ مواصلت۔ اہلِ جنت کے لئے بے بہا انعامات کا ذکر۔ ادنیٰ جنتی کا مرتبہ۔ ایک اُلجھاؤ اور اُس کا سُلجھاؤ۔ جنتیوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا تحفہِ سلام۔ وَلَدَيْنَا مَزِيد اور لِلَّذِينَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَة" کی تفسیر۔ دیدارِ الٰہی اور قرآنِ مجید۔ دیدارِ الٰہی کی بابت سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا موقف۔ دیدارِ الٰہی اور احادیثِ مبارکہ۔ آیا جنت اور جہنم پہلے ہی سے موجود ہیں؟ زمین وآسمان کے تبدیل ہونے کی حکمت۔ کیا اس تبدیلی سے مراد اُن کی ذات کی تبدیلی ہے یا صفات کی؟ آسمان کی تبدیلی۔ اَشراطُ السّاعۃ۔ یاجوج و ماجوج۔ دجّال کا ظہور۔ امام مہدی علیہ السلام۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول۔ کسی اور وقت کی بجائے اُس وقتِ (مخصوص) میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حکمت۔ اپنے دنیاوی مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہم حیات بعد از موت کو بھول جاتے ہیں۔

(۴۰) علم الاخلاق (ETHICS) ___ ___ ___ ___ ___ ___ ___ ۱۲۳۴

تعریف وتوضیح۔ حیاتیاتی ونباتاتی اَخلاقیات (Bioethics)۔ حیواناتی (Zoological) اَخلاقیات۔ انسانی اَخلاقیات۔ ذاتی اَخلاقیات۔ سماجی زندگی کی اَخلاقیات۔ مسلم اَخلاقیات میں شرم وحیا کی

اہمیت از روئے احادیث۔ مغربی تہذیب۔ قانونِ عدل اور قانونِ فضل۔ احترامِ آدمیت۔ زکوٰۃ : اسلامی نظامِ معیشت میں ایک انتہائی اہم عامل۔ زکوٰۃ کی اہمیت از روئے احادیث۔ زکوٰۃ کے فائدے۔ سماجی خدمت اور قرآنِ مجید۔ آدابِ مجلس کی تعلیم۔ تجارتی اَخلاقیات۔ اِزدواجی اَخلاقیات۔ خانگی اَخلاقیات۔ بین الاقوامی تعلقات سے متعلق اَخلاقیات۔ جنگی اَخلاقیات۔ جزیہ اور اس کے متعلق غیر مسلم مفکرین کی آراء۔ دربارِ نبوی کے آداب اور ضابطۂ اَخلاق۔ دُنیا کی بے چینی اور قرآن مجید۔

گواہی کی تعریف۔ اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت۔ اسلام میں شہادت کی اہمیت۔ حدّ، تعزیر اور قِصاص۔ جرم یا حق کو ثابت کرنے کے اسلامی طریقے۔ گواہ کی شرائط۔ عورت کی گواہی۔ زِنا بالجبر کا ثبوت۔ زِنا کا غلط الزام۔ نصابِ شہادت (مالی معاملات میں، زِنا کے بارے میں، وصیّت کے بارے میں، قذف کے بارے میں اور طلاق کا نصابِ شہادت)۔ شرائطِ شہادت۔ تَزکیۃُ الشُّھود۔ تَزکیۃُ النُّفوس۔ شہادت میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ شھادۃ علی الشھادۃ۔ گواہی سے منحرف ہونا۔ جھوٹی گواہی دینا۔ اعتراف واقرار (Confession/Admission) اقبالِ جرم / اقرارِ جرم کی شرائط۔ غیر عدالتی اقبالِ جرم۔ اقبالِ جرم کا نصاب۔ اقبالِ جرم میں تاخیر۔ ایسے شخص کا اعتراف جو جرم میں شریک ہی نہیں۔ اقبالِ جرم / اقرارِ جرم سے انحراف۔ واقعاتی شہادت: اَلقرینہ (Circumstantial Evidence)۔ ایک آزمودہ کار کی شہادت۔ قسم۔ قسم اٹھانے والے لوگ۔ فیصلہ صادر کرنے میں قاضی / جج کے ذاتی علم کا دخل۔

نظریہ ارتقاء (ڈارونزم) کا تعارف۔ ڈارونزم کا تمام تر زور وجودِ باری تعالیٰ کی نفی اور ارتقاء کے اِصرار پر ہے۔ فطری انتخاب کیا ہے؟ کائنات میں منصوبہ بندی سے انکار کے باعث سائنس کو پہنچنے والے نقصانات۔ نظریہ ارتقاء کے ردّ میں قرآنی، سائنسی وعقلی دلائل۔ رِحمِ مادر میں بچے کے تین مراحل۔ انفجارِ عظیم (Big Bang)۔ کائنات کا سکڑاؤ (Big Crunch)۔ ڈارونزم کے برعکس قرآن مجید انسان کو باوقار مقام عطا کرتا ہے۔ ''حادثاتی کائنات'' کے ردّ میں دلائل: خون میں کارپردازانِ عمل۔ خون بطور ذریعۂ ابلاغ۔ بارش کا تناسب۔ سمندروں کا آپس میں خلط ملط نہ ہونا۔ بچے کی جنس (بیٹا یا بیٹی؟)۔ ایکس (X) لونیے اور وائی (Y) لونیے۔ رِحم پر گٹھلی جم جانا۔ ہڈیوں پر عضلات کو لپیٹنا۔ فنگر پرنٹ: شناخت کا یقینی ذریعہ۔ پہاڑوں کی کارکردگی۔ آسمان ایک محفوظ چھت۔ واپس بھیجنے والا آسمان۔ فضائی تہیں۔ مدار۔ پورا دائرۂ کائنات راستوں اور مداروں سے پُر ہے۔ فوسل ریکارڈ اور نظریہ ارتقاء۔ وجودِ باری تعالیٰ پر غیر مسلم مفکرین کے اعترافات۔

(۴۳) اِخراجِ بول و براز (EXCRETION) --- --- --- --- --- ۱۳۳۰

بول و براز کا ذکر قرآنِ حکیم میں۔ تیمّم کے مسائل۔ عملِ اِخراج شروع ہونے سے قبل کے آداب۔ قضائے حاجت کے دوران کے آداب۔ قضائے حاجت سے فراغت کے بعد کے آداب۔

(۴۴) خاندانی منصوبہ بندی / تحدیدِ نسل (FAMILY PLANNING) --- -- -- ۱۳۳۴

تعریف و توضیح۔ تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) کی اصطلاح کا آغاز کب سے ہوا؟ خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں اور مخالفت میں دلائل۔ حدیث کے الفاظ اَلْوَدُود اور اَلْوَلُود کی توضیح۔ برتھ کنٹرول اور عزل۔ اِسقاطِ حمل (Abortion)۔ مانعِ حمل ادویات (Contraceptives)۔ اِسقاطِ حمل بمقابل مانعِ حمل ادویات۔ اِسقاطِ حمل کے جائز ہونے کی تحقیق۔ مانعِ حمل ادویات کے استعمال میں مضر اثرات کے حوالہ جات۔ منعِ حمل کی معقول وجوہ۔ برتھ کنٹرول پر علمائے دین کے فتاویٰ۔ برتھ کنٹرول کے ذرائع کا مطلوبہ نتائج دینا یقینی نہیں ہوتا۔ برتھ کنٹرول کی آڑ میں دشمنانِ اسلام کی مسلمانوں کے خلاف شیطانی سازش۔ وہ حالات جن میں برتھ کنٹرول کی اجازت ہے۔

(۴۵) تحریکِ آزادیٔ نسواں (FEMINISM) --- --- --- --- --- ۱۳۵۷

تعریف۔ طلوعِ اسلام کے وقت انسانی سماج میں عورت کی حیثیت۔ اسلام کے خلاف کثیر الجہتی الزامات کا تجزیہ اور اُن کے جوابات۔ تعدّدِ اَزواج مسلم معاشرہ کے عائلی نظام کے کواڑ کا ایک حفاظتی پَٹ ہے' وہ بے لگام اجراء (لائسنس) نہیں بلکہ اِتلاف سے تحفظ کی جھاڑ بندی (حفاظت)' حالات پر مبنی مشروط اجازت نامہ اور معاشرتی برائیوں کے خلاف تحفظ کا پروانہ ہے۔ یک زوجیت (Monogamy) اور تعدّدِ اَزواج (Polygamy)۔ تعدّدِ اَزواج کے حق میں چند مستند آراء۔ حقِ طلاق مرد کو کیوں سونپا گیا؟ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں؟ عورتیں بطور گواہان۔ صرف عورتوں کی گواہی۔ قِصاص میں عورت کی گواہی۔ قذف (تہمت) میں عورت کی گواہی۔ یتیم کا مال اُس کے حوالے کر دینے پر گواہان۔ زِنا کے ارتکاب پر عورتوں کے خلاف چار گواہ۔ عدّت کے اختتام پر میاں بیوی میں جدائی کے وقت دو گواہ۔ وصیّت پر گواہ۔ وصیّت کے گواہوں پر شک کی صورت۔ حدود اللہ میں عورتوں کی گواہی۔ روایتِ حدیث میں عورتوں کی گواہی۔ خانگی قیادت مرد کے سپرد کیوں؟ ملکہ سبا (بلقیس) کے واقعہ سے عورت کی قیادت کا جواب۔ جنگِ جمل کے واقعہ سے عورت کی سربراہی پر اِستدلال کا جواب۔ قیادت کا اشتراک۔ مستثنیات۔ عورت بہ یک وقت دو خاوندوں سے محروم کیوں؟ عورت کا میراث میں حصّہ مرد کے حصّہ میراث سے نصف کیوں؟ اس نظریہ کا ردّ کہ مہر کے نام پر بیوی کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ مساوات یا مماثلت۔ عورت کی بابت غیر اسلامی نظریات۔

عورت کی بابت اسلام کا نظریہ۔ مساوات' نہ کہ یکسانیت۔ عورت کی قدرتی جسمانی کیفیت۔ نوعِ انسان کی مساوات۔ کارزارِ حیات میں مرد اور عورت برابر کے شریک۔ لفظ "عَورۃ" کا مفہوم۔ حجاب (پردہ)۔ عورت کا اصلی میدانِ عمل۔ عورت اپنے گھر کی نگران۔ حقوقِ نسواں کی حفاظت۔ لفظ "قوّام" کی وضاحت۔ مہر طلب کرنا بیوی کا حق ہے۔ خلع۔ حلالہ۔ ظہار۔ عدت کے بعد بیوہ/مطلقہ کو دوسری شادی کا حق۔ حیض والی عورت سے جماع کرنے کی ممانعت۔ ایامِ حیض میں جماع سے ممانعت کی بابت چند ماہرین کی آراء۔ خاوند کے فیصلے بیوی پر ٹھونسے نہیں جاسکتے۔ عورت کے معاشرتی حقوق۔ عورت کے اقتصادی حقوق۔ عورت کے تعلیمی حقوق۔ والدین اور خاوند کے لئے ہدایات۔ عورت کی ذہنی تعلیم۔ تعلیمِ نسواں کی قانونی حیثیت۔ مخلوط تعلیم (Co-Education)۔ بہ حیثیت بیوی' عورت کے حقوق۔ عورت کے حقوق بہ حیثیت والدہ۔ بیوی کی سرتابی (نُشوز) کی صورت میں اُسے زدوکوب کرنے کی قرآنی اجازت۔ خاوند کے اس قرآنی اختیار پر دشمنانِ اسلام کا ہنگامہ اور اُس کا جواب۔ اسلام میں عورت کے مقام کی بابت مسلم اور غیر مسلم شخصیات کی تشخیص۔ عورت اور جہاد۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' کے خلاف سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی جدّ وجُہد کا تجزیہ۔ مغرب میں عورت کا مقام۔ موجودہ دَور کی مسلم خواتین کے لئے لمحہِ فکریہ۔ طریقِ کار اور حکمتِ عملی۔

(۴۶) اسلامی تہوار اور یادگاری دن (Festivals & Commemorative Days) ۱۴۱۸

"تہوار" کے لئے قرآنی لفظ "عید"۔ لفظِ عید کے کثیر الجہتی معانی۔ عید الفطر۔ عید الاضحیٰ۔ عید میلاد النبی ﷺ۔ قرآنِ حکیم میں میلادِ نبوی کا ثبوت۔ قرآن مجید میں فضل اور رحمۃ کے اکٹھے استعمال سے مراد نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس۔ ولادتِ نبوی پر رب تعالیٰ کی جانب سے غیر معمولی خوشی منانے کا اہتمام۔ نبی علیہ السلام نے خود اپنا میلاد مختلف طریقوں سے منایا۔ اپنے بھتیجے محمد ﷺ کی پیدائش پر کافر ابولہب کے خوشی منانے پر اُس کے عذاب میں تخفیف۔ میلادِ مصطفیٰ علماء کی نظر میں۔ میلادِ مصطفیٰ اور بدعت کا تصوّر۔ بدعت کی اقسام۔ کیا بارہ ربیع الاوّل واقعی نبی ﷺ کا یومِ وصال ہے؟ میلاد النبی عیدِ میلاد کیوں؟ لفظ "میلاد" کی اصل دین میں موجود ہے۔ اوّل دَور کے مسلمانوں نے جدید طریقوں سے میلادِ مصطفیٰ کیوں نہیں منایا؟ بعد کے زمانوں میں نبی ﷺ کے یومِ پیدائش کی خوشی آپ کی جدائی کے صدمے پر غالب آگئی۔ صدمہ ہمیشہ کسی خوشی کے اختتام کا ذیلی وجود (شاخچہ) ہوتا ہے۔ تاج الدین فاکھانی کو میلاد سے اختلاف ہے۔ فاکھانی کے اعتراض کا جواب۔ میلادِ مصطفیٰ پر لٹریچر۔ پیغمبرانِ الٰہی کا میلاد منانا سنتِ کبریاء ہے۔ ذکرِ انبیاء علیہم السلام اور اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرنا بھی سنت الٰہیہ ہے۔ حرفِ آخر۔ تمام مناسکِ حج اور پنجگانہ نمازیں انبیاء علیہم السلام کی یاد میں۔ نبی علیہ السلام کے روضہِ اطہر کی زیارت۔ یومِ شہادتِ حسین منانا۔

اعترافات (منجانب مؤلف انسائیکلو پیڈیا)

سب سے پہلے راقم الحروف اپنے والدین مرحومین کا نہاں خانہ دل سے ممنونِ احسان ہے جنہوں نے مجھ ناچیز کو قرآنِ پاک کی نعمتِ غیر مترقبہ سے مالا مال کیا۔ بندے کا رُواں رُواں اور ہر ہر سانس اُن کی مغفرت اور جنّات الفردوس میں مقامِ ارفع واعلیٰ کے لئے ربّ ذوالجلال کے حضور فریاد کناں رہتا ہے۔

اپنے روحانی استادِ مکرّم جناب حافظ گل محمد صاحب مرحوم اور بالخصوص مولانا منظور احمد خان پٹیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت اور ترقی درجات کے لئے بھی دعا گو ہوں جنہوں نے قرآن مجید صحیح مخارج حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ بندۂ پُر خطا میں حُبُّ اللہ و حُبُّ الرّسول کی لو سلگائی اور وقتاً فوقتاً اُس لو کو تیز سے تیز تر کرتے رہے۔

استادِ محترم جناب احمد نواز خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لئے ربّ العالمین کے حضور دست بہ دعا رہتا ہوں جنہوں نے اپنی بے لوث اور بے غرض محنت سے بندے میں حصولِ علم کی لگن اور تڑپ پیدا کی جس کی بدولت میں اپنے خالقِ رحیم وکریم کا اَبدی پیغام انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اُس کے بندوں تک پہنچانے کے قابل ہوا ہوں۔

یوں تو راقم الحروف کو تعلیمی دُنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر قابل ترین اساتذہ ملتے رہے لیکن اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے طرزِ حیات نے اُس کے دل و دماغ پر اَن مٹ' مثبت نقوش چھوڑے ہیں۔ اس طول طویل تفصیل میں سرِ فہرست میرے سکول کے عربی ٹیچر جناب عبدالمجید مرحوم' کالج کے عربی پروفیسر جناب منظور احمد مرحوم اور یونیورسٹی لائف میں جناب ڈاکٹر پروفیسر صوفی ضیاء الحق صاحب مرحوم ومغفور ہیں۔ اللہ ربّ العزت میرے سب اساتذہ کرام اور والدین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے! آمین بجاہ خاتم النّبیین ﷺ

انتہائی ناقدر شناسی ہوگی اگر اس موقع پر اپنے سابق رفیقِ کار اور تلمیذ پروفیسر شیخ محمد منیر زید مجدہ' کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے کمال فیّاضی سے اپنی لائبریری میں سے بڑی نادر کتب میرے ہاں استفادہ کے لئے چھوڑیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے! آمین

جناب نوروز خان صاحب (ہیڈ لائبریرین' اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد) کا بھی ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے ہر بار بکمال فراخدلی سے میری علمی راہ نمائی فرمائی اور اپنی وسیع وعریض لائبریری سے استفادہ کرنے کا بھر پور موقع عطا کیا۔

آخر میں اپنے اُن سب کرم فرماؤں اور اَحباب (بالخصوص چوہدری محمد رمضان صاحب انجنیئر) کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے انسائیکلو پیڈیا کے انگریزی حصّے کو اردو میں لانے کا شوق دلایا اور اس ضمن قدمے' سخنے بندے کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

خاکِ پائے صالحین

اشفاق

۱۸ محرّم الحرام ۱۴۳۴ھ / 3 دسمبر 2012ء

کچھ مؤلف کے بارے میں

یہ ۱۴۲۰ھ (1999ء) کے ماہِ رمضان المبارک کی ایک بابرکت رات تھی کہ مجھے ایک پرانے دوست نے بتایا کہ ریلوے کے ڈویژنل میڈیکل سپرنٹنڈنٹ (ڈاکٹر محمد تسلیم قریشی صاحب) کی قیام گاہ پر سرورِ کائنات ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ وہاں گورنمنٹ کالج بوسن روڈ کے ریٹائرڈ پروفیسر حافظ اشفاق احمد خان تراویح بھی پڑھاتے ہیں اور بعدہٗ سنائی گئی منزل کی وہ تفسیر وتوضیح بھی بیان کرتے ہیں۔

تشنہ لبوں کو اور کیا چاہئے! راقم الحروف تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اپنے اُس دوست کے ہمراہ وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچ گیا۔ پروفیسر صاحب کی امامت میں ہم نے نمازِ تراویح بھی ادا کی اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی حب اللہ اور حبُّ الرسول میں ڈوبی ہوئی تفسیر بھی سنی۔ مجلس برخواست ہونے کے بعد راقم نے پروفیسر موصوف سے اپنا تعارف کرایا اور مصمّم ارادہ کرلیا کہ حتی الوسع روزانہ یہ شرف حاصل کرتا رہوں گا۔ ایک عالمِ باعمل کی اقتداء میں نمازِ تراویح بھی پڑھوں گا اور ایمان افروز تفسیری بیان بھی سنوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر موصوف نے تفسیر کے ساتھ متواتر اٹھارہ مصلےٰ جات بغیر کسی دنیاوی طمع کے محض رضائے الٰہی کی خاطر سنائے۔ آج کل کی مادیت پرستی کے پُر آشوب ماحول میں ایسی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے ساڑھے نو برس کی عمر میں پہلا مصلےٰ اپنے ماموں جان کے زیرِ نگرانی سنایا اور تب سے ہر سال بغیر کسی ناغہ کے بلا معاوضہ قرآن مجید کسی نہ کسی مسجد میں سناتے چلے آرہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر صاحب سے بھائیوں جیسا میرا تعلق استوار ہوگیا۔

پروفیسر موصوف ملتان شہر کے ایک تعلیم یافتہ اور باعزت بلوچ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت 1939ء میں ہوئی۔ آپ کے والدِ ماجد اور نانا دونوں کا اسمِ گرامی رحمت اللہ خان ہے جو ملتان کے ماہر اور یگانہ روزگار قانون دان تھے۔ آپ کی تعلیم اپنے ماموں اور بعد میں سسر ہونے والے چوٹی کے وکیل جناب حافظ محمد اسلم خان صاحب کے زیرِ نگرانی ہوئی جنہوں نے اپنے بھانجے کو دنیاوی تعلیم میں بھی ایک درخشاں ستارے کی مانند بنایا اور حفظِ قرآن کے ایک قابلِ ستائش مقام تک پہنچا دیا۔ اُنہیں اپنے بھانجے پر بجا طور پر ناز تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی دخترِ نیک اختر کو اُن کے نکاح میں دے کر بے حد خوش ہوئے۔

پروفیسر موصوف نے میٹرک سے ایم۔اے (عربی) تک تمام امتحان متواتر فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اُنہیں ہمیشہ اعزازات سے نوازا گیا۔ اُنہوں نے ایم اے (عربی) یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے 1962ء میں اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ملازمت کی ابتدا ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج ملتان سے کی جو اُن دنوں پرائیویٹ کالج تھا۔ سرکاری ملازمت کی ابتدا اُنہوں نے 1966ء میں گورنمنٹ

کالج ڈیرہ اسماعیل خان (NWFP) سے کی۔ 1966ء ہی میں اُنہوں نے ایم اے (علوم اسلامیہ) کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ علی پور اور مظفرگڑھ کے ہر دو کالجوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال کا عرصہ ملازمت رہا۔ اور پھر متواتر ساڑھے ستائیس سال گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں پڑھانے کا اعزاز حاصل رہا۔ 1997ء میں اُنہوں نے قبل از وقت (Premature) ریٹائرمنٹ لے کر علم کی شمع کو ایک انوکھے انداز سے منوّر کرنے کا کام شروع کر دیا۔

پروفیسر صاحب نے 1997ء ہی میں ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کے نام سے قرآن مجید پر تحقیقی کام شروع کیا جس میں جدید علوم سے متعلق موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی اور اس میں اپنے قاری کو علم کے بحرِ ذخّار میں غوطہ زن ہونے کا موقع فراہم کیا۔ قرآن مجید کے دعویٰ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (ہر خشک و تر چیز اس کتابِ مبین میں موجود ہے) کو ثابت کر کے انگریزی خواندہ قارئین (غیر مسلموں) کے آگے قرآن مجید کی عظمت کو اجاگر کیا۔

قارئینِ کرام! انگریزی میں لکھے گئے اِن چھ ہزار صفحات (جو چھ جلدوں پر مشتمل ہیں) کے مطالعہ کے بعد آپ یقیناً ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں گے کہ ہر بات اور ہر دعویٰ کو اُنہوں نے ٹھوس اور مُسکت دلائل سے پیش کیا ہے جس سے صرف کوڑھ مغز اور متعصب شخص ہی انکار کر سکتا ہے۔ حافظ صاحب نے اس مبارک تالیف کی کمپوزنگ خود فرمائی تا کہ اَغلاط کا احتمال ہی نہ رہے۔

میں گزشتہ بارہ سال سے حافظ اشفاق احمد خان صاحب سے اکتسابِ فیض کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آج کے اس پُرفتن دَور میں انہوں نے میرے قبلے کو مسلک کے حوالے سے اتنا درست فرمایا ہے کہ میں اب عظمتِ مصطفےٰ ﷺ پر کسی بھی قیمت میں مصالحت نہیں کر سکتا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اپنے محترم بھائی اور مخلص دوست پروفیسر صاحب کا احترام کرتا ہوں اور اُن کی درازیٔ عمر کے لئے رب العالمین کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ اُنہیں اردو میں بھی قرآنک انسائیکلوپیڈیا کا (مترجم) کام مکمل کرنے کے لئے استقامت عطا فرمائے! آمین۔

۹ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
24 نومبر 2012ء

محمد رمضان چوہدری

محمد رمضان چوہدری (انجنیئر)
شمس آباد کالونی۔ ملتان

تاثرات

علوم القرآن بہت وسیع اور لا متناہی ہیں۔ قرآنِ حکیم کُل عالمِ انسانیت کے لئے پیغامِ رحمت اور شِفا ہے۔ چنانچہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو حلقۂ قرآن کے فہم میں لانا ایک ناگزیر فریضہ ہے جس کی بہ طریق احسن تکمیل پروفیسر اشفاق احمد خان نے کی ہے اور مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ اُنہوں نے آج سے تقریباً بیس سال پہلے رمضان المبارک میں تراویح اور پھر تراویح میں سنائی گئی منزل کا ترجمہ و مدلل تفسیر کا سلسلہ راقم الحروف کی رہائش گاہ پر شروع کیا اور تین سال پہلے تک غیر منقطع طور پر جاری رکھا۔ اٹھارہ اُنیس سال کے اس طویل دورانیے میں ہر سال شبِ قدر بھی نصیب ہوتی رہیں اور قبولیتِ دعا والتجا کی وہ ساعتیں بھی جن میں پروفیسر موصوف حاضرین سمیت خالقِ لم یزل کے حضور اپنا سرِ نیاز رکھ کر انتہائی عاجزی کے ساتھ اور نہ تھمنے والے آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ اُس کے فضل و کرم اور مغفرت کی بھیک مانگتے رہے۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام شاہد ہے کہ یہی گھڑیاں ہماری زندگی کا حاصل تھیں۔

علومِ قرآن کی تحصیل و تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت ایک ایسی سعادت ہے جو فرشتوں کی محبت کا ذریعہ ہے۔ صاحبِ لولاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآنی علوم حاصل کرنے والوں کو فرشتے گھیر لیتے ہیں' اُن سے محبت کرتے ہیں اور رب تعالیٰ سے اُن کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ (مُسند امام احمد' طبرانی)

ایک اور حدیثِ مبارکہ کے مطابق قرآنِ حکیم کی تلاوت اور درس و تدریس میں مشغول اَفراد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکون کی ایک خاص کیفیت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان ماہرینِ قرآن کا ذکر مجلسِ ملائکہ میں کرتے ہیں۔

اِن احادیث کی تائید پارہ تیس کی سورہ عَبَس کی آیات ۱۱ تا ۱۶ سے ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا:

''قرآنِ پاک اللہ کے ہاں ایسے مقدس صحیفوں میں درج ہے جو بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہیں اور یہ قرآنی صحیفے ایسے کاتبوں کے ہاتھوں سے لکھے گئے ہیں جو بہت باعزت اور نیک ہیں۔''

عصرِ حاضر میں جدید انگریزی اُسلوب اور لب و لہجہ میں علومِ قرآن کی اشاعت اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ مستشرقین کے قرآن پر ہونے والے اعتراضات کا اُنہی کی زبان میں جواب دیا جائے۔ کچھ عرصہ قبل امریکہ اور اسرائیل کے مستشرقین نے مل کر پروفیسر Anes Shoorush کی رہنمائی میں صرف 77 سورتوں پر مشتمل قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ The True Furqan کے نام سے شائع کیا اور اس کے عربی اور انگریزی نسخے تمام دنیا میں پھیلا دیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہمیشہ جنابِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو احادیثِ نبوی سنا کر صحیح مشورہ دیتے تو عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم میں عبداللہ بن عباس جیسے لوگ موجود ہیں جو ہمیں ہمارے نبی پاک ﷺ کی حدیثیں سناتے ہیں اور ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔

ہم بھی اس اُسوۂ فاروقی کی روشنی میں پروفیسر اشفاق احمد خان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے درمیان اُن جیسے ماہرِ قرآن موجود ہیں جو عام ڈگر سے ہٹ کر جدید تحقیقی اصولوں میں ہماری راہ نمائی کرتے ہیں اور ہمارے ایمان کو تابندگی اور جلا بخشتے ہیں۔

قارئینِ کرام! اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' (حصہ اردو مترجم) کی تیسری جلد آپ کے مطالعہ کے لئے پیشِ خدمت ہے جبکہ حصہ انگریزی کی کُل چھ جلدیں بحمدہٖ تعالیٰ قبل ازیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کی قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے والہانہ عشق و محبت اور فریفتگی اس عظیم کام کو تکمیل تک پہنچانے کا سبب بنی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے صدقے میں پروفیسر موصوف کے ہاتھوں قرآنِ پاک کا وہ اَنمول کام کرایا جو اپنی انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں عصرِ قدیم کے علوم کے پہلو بہ پہلو عصرِ جدید کے علوم کا بھی آپ نے تفصیلاً احاطہ کیا ہے۔ طغرائے امتیاز یہ کہ اپنے آرام کے اوقات کو کم کر کے کم و بیش روزانہ سولہ سترہ گھنٹے کی محنتِ شاقّہ سے بغیر کسی کی مدد کے (Single-handed) سب کچھ خود ہی ترتیب دیا۔ اس کا دیدہ زیب سرِ ورق (ٹائٹل)، دلآویز طباعت اور اعلیٰ کاغذ کا استعمال اُن کا آخری الٰہی کتاب سے والہانہ شیفتگی اور محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ع ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ سچ ہے کہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کی اس پیرانہ سالی میں اُن کی اس مخلصانہ کوشش اور محبت کو اپنی بارگاہِ عالیہ میں شرفِ قبول عطا فرمائے، اسے اُن کی آخرت کا سرمایہ نجات بنائے اور اُنہیں دین و دُنیا کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین بجاہِ سیّد المرسلین وخاتم النّبیین ﷺ۔

29 نومبر 2012ء

ڈاکٹر محمد تسلیم قریشی
میڈیکل سپرنٹنڈنٹ۔ ریلوے ہسپتال ملتان

تعارف (جلد سوم)

''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کے سلسلہ جات کا مقصدِ اوّلیں مذہب سے دُور' مادیّت گزیدہ ذہنوں کی اُلٹ سوچ میں تعمیراتی فکر اور مثبت تبدیلی لانا ہے۔ آج کے اس مادیّت گزیدہ دَور میں اشرف المخلوقات یعنی حضرت انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر جس بحرانی کیفیت اور قلق واضطراب کا شکار ہے' اس کے ازالہ کے لئے کبھی تو وہ مال ودولت اکٹھا کرنے یا عیش کوشی میں امن وسکون کو تلاش کرتا ہے' تو کبھی ترکِ دنیا اور اپنے ابنائے جنس سے لاتعلقی میں خیر وعافیت سمجھتا ہے۔ کبھی وہ سرمایہ دارانہ نظام کے گن گاتا ہے تو کبھی اشتراکیت اور سوشلزم کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھنے لگتا ہے۔ غرض کسی کروٹ بھی اُسے چین میسر نہیں۔ قرآنک انسائیکلوپیڈیا کے اس سلسلہ کے ذریعے بے یقینی کی فضا میں گم حضرتِ انسان کو یہ باور کرانا ہے کہ جس امن وسکون کی تلاش میں وہ مارا مارا پھر رہا ہے اور در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے' وہ امن وسکون اُسے صرف اور صرف اپنے رحمان ورحیم خالق ومالک کی چوکھٹ پر اپنے سراپا کو بہ صد عجز و نیاز جھکا دینے میں ملے گا' جس مقصد کے لئے اُس نے انبیاء ورُسُل کا ایک طول طویل سلسلہ جاری کیا اور خیر الامم کو اپنی آخری کتاب کا تحفہ لازوال دے کر یہ باور کرادیا کہ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ [دیکھو ہمت نہیں ہارنا اور غم بھی نہیں کرنا (میرا وعدہ ہے کہ) غلبہ تم ہی کو دوں گا بشرطیکہ تم صاحبِ ایمان رہے]۔ یعنی غلبہ کے لئے ایمان پر ثبات شرطِ اوّل ہے۔ غلبہ کا یہ وعدہ مادّی وروحانی ہر قسم کے غلبہ کو شامل ہے۔ پھر یہ بات بھی کہ اللہ کی اس آخری کتاب میں ہمارے دنیاوی اور دینی کس کس مسئلے کا حل موجود نہیں ہے۔ اگر قرآن کسی مسئلے پر خاموش ہے یا اجمال واختصار سے کام لیتا ہے تو حدیث وفقہ میں اُسکی تفصیل یا جواب مل جاتا ہے۔

''طاغوتی طاقتوں کا پروپیگنڈہ ہے کہ پاکستان کے پاس موجودہ تباہ کن بحرانوں سے نجات پانے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ بیرونی ممالک سے قرضے اور خیرات لینا اُس کی ضرورت اور مجبوری ہے' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

''تاریخ انسانی گواہ ہے کہ کسی ملک کی خوشحالی اور ترقی کا دارومدار اُس کے وسائلِ پیداوار اور اَفرادی قوّت پر ہوتا ہے۔ ربِّ جلیل نے ہمارے ملک کو اِن دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک طرف اگر اُس کی زمین سونا اُگلنے والی ہے اور اُس کے اندر معدنیات کے بے بہا خزانے موجود ہیں تو دوسری طرف اُس میں اَفرادی قوّت (Manpower) کی بہتات ہے۔ ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اور حاصلِ محنت پر سرطانی' قارونی اداروں کا ناجائز تصرّف ہے اور چند خاندان اُن پر قابض ہیں جس کی وجہ سے عوام اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہو کر محتاج ومفلوک الحال اور طرح طرح کے اندیشوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں زمین کے خزانے بے کار پڑے ہیں اور افراد اپنی قوّت سے استفادہ کرنے اور ملک وقوم کو فائدہ پہنچانے کی بجائے اُن کے لئے کمر توڑ بوجھ بن چکے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وسائلِ پیداوار تک جمہور کی رسائی ہو جائے تا کہ دونوں شعبوں سے مکمل استفادہ کرکے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔''

''کاش کہ ہمیں اس حقیقت کا یقین ہوتا کہ ہماری تمام مشکلات کا حل قرآنِ حکیم اور اُس کی عملی تفسیر اُسوۂ حسنہ میں موجود ہے جس کے احکامات ومنہیات پر عمل پیرا ہو کر انتہائی قلیل مدّت میں ہم تمام عالمِ انسانیت کے راہ نما اور حاکم بن سکتے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی مرضی سے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی، ثقافتی اور عسکری پالیسی بنا کر اور اُس پر عمل پیرا ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔''

''یہ کسی مجذوب یا دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ یہ نظام اسلام ہے جسے قرآنِ حکیم نے بیان کیا اور پیغمبرِ آخرالزماں ﷺ نے قائم فرمایا، اُس پر خود عمل فرمایا اور اپنی اُمت سے عمل کرایا جس کے نتیجے میں اُمّتِ مسلمہ انتہائی قلیل مدّت میں زندگی کے ہر شعبے میں اقوامِ عالم سے بہت آگے نکل کر اُن کی قیادت کرنے لگی۔'' (''پاکستان کا تباہ کن بحران اور اُس کا حل''۔۔خواجہ محمد اسلم، صفحات ۱۰، ۱۱)

''**اسلام کا اقتصادی نظام** :اس نظام کے بنیادی خد وخال حسب ذیل ہیں:

(۱) زمین اللہ کی، کھیتی کسان کی اور عُشر حکومت کا (سورۃ الانعام:۱۴۱؛ سورہ یونس:۵۵؛ الرحمٰن:۱۰: المشکوٰۃ: کتاب الزکوٰۃ)

(۲) حکومت پر قرآن وسنت کے مطابق زکوٰۃ اور اَلْعَفْو (زائداز ضرورت مال) وصول کرنا اور حاجتمندوں پر خرچ کرنا فرض ہے۔ (سورۃ الحج:۴۱ ؛ المومنون:۴ ؛ المشکوٰۃ : کتاب الزکوٰۃ)

(۳) قوم کو بنیادی حقوق دینا اور اُس کی کفالت یعنی روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم وتربیت، علاج معالجے اور جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا معقول انتظام کرنا حکومت کی بنیادی ذمّہ داری ہے۔ (سورۃ البقرۃ:۳۶؛ سورۃ الحج:۴۱ ؛ الماعون :۱ تا ۷)

(۴) کارخانوں، فیکٹریوں، صنعتی وتجارتی اداروں، دکانوں، گھروں، نیز سرکاری ونیم سرکاری اور نجی دفتروں میں تمام کام کرنے والوں کو کم سے کم معاوضہ (تنخواہ، مزدوری وغیرہ) اتنا ضرور ملنا چاہئے جس سے اُن کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں (سورۃ النحل:۹۰ ؛ الماعون:۱ تا ۷ ؛ احادیثِ طیّبہ، کتب سیرۃ النبی ﷺ خصوصاً اصولِ مواخاۃ)۔'' (ایضاً، ص۲۴)

معاشی اور اقتصادی بحران کا حل : درج ذیل قرآنی آیات میں ہمارے معاشی اور اقتصادی بحران کا حل موجود ہے :

(۱) اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ○ (البقرۃ : ۳)
''متقی وہ لوگ ہیں جو بن دیکھے پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' (۳ : ۲)

(۲) وَیَسۡئَلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ (البقرۃ : ۲۱۹)
''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) ہم کیا خرچ کریں۔ فرما دیجئے کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے۔'' (۲۱۹ : ۲)

''اَلۡعَفۡو'' کے لفظ سے سوشلزم کے جواز پر استدلال اور اُس کا جواب: جمہوری طریقہ سے رائے عامہ کو ہموار کر کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنا اور اسمبلی کی منظوری سے زرعی' صنعتی اور تجارتی اداروں کو اُن کے مالکوں سے معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ چھین کر قومیا لینا سوشلزم ہے اور نادار' محنت کش عوام کو منظم کر کے تاجروں' صنعت کاروں اور زمینداروں کے خلاف جنگ کر کے انقلاب لانا اور تمام پیداواری اداروں کو قومیا لینا کمیونزم ہے۔

1970ء میں جب پاکستان میں سوشلزم کا زور تھا' اُس وقت بعض سوشلسٹ علماء نے اس آیت سے سوشلزم کے اسلامی ہونے پر استدلال کیا تھا کہ اللہ نے ضرورت سے زائد ہر چیز کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے' لہٰذا تمام بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی اداروں کو قومی ملکیت میں لینا جائز ہے کیونکہ وہ تمام ادارے اُن کے مالکوں کی ضرورت سے زائد ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ ائمہ تفسیر نے اَلۡعَفۡو کے لفظ کے تین معانی بیان کئے ہیں: زائد از ضرورت' میانہ روی سے خرچ کرنا اور جس کا خرچ کرنا آسان ہو۔ جن صحابہ' تابعین اور ائمہ تفسیر نے اس کا معنیٰ ''زائد از ضرورت'' بیان کیا ہے' اُنہوں نے تصریح کر دی ہے کہ زائد از ضرورت مال خرچ کرنے کا حکم زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے تھا۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور جن ائمہ تفسیر نے یہ بیان کیا کہ اس کا معنیٰ ہے راہِ خدا میں میانہ روی سے خرچ کرو یا جس کا خرچ کرنا آسان ہو' اُسے خرچ کرو' تو اس معنیٰ میں یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ اس کی تائید حسبِ ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

''امام ابن سعد' امام ابوداؤد اور امام حاکم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونے کا ایک ٹکڑا لے آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مجھے ایک کان (معدن) سے یہ سونا ملا ہے۔ میں اسے صدقہ کرتا ہوں' آپ اسے لے لیجئے۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا۔ اُس نے دوبارہ پیچھے سے آ کر عرض کیا۔ آپ نے اُس سے وہ سونا لے کر اس کی طرف اتنے زور سے پھینکا کہ اگر وہ اُسے لگ جاتا تو اُسے بہت چوٹ لگتی۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنا (کُل) مال لے کر میرے پاس آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے۔ پھر وہ بیٹھ کر لوگوں

کے آگے ہاتھ پھیلائے گا۔ بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد خوشحالی رہے اور خرچ کی ابتدا اپنے اہل و عیال سے کرو۔'' (الدرّ المنثور' ج ۱' ص ۲۵۴)

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ اپنی ضروریات سے زائد کل مال راہِ خدا میں خرچ کرنا شرعاً محمود اور مستحسن بھی نہیں ہے۔ اگر ہر شخص پر یہ لازم ہوتا کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد چیز اللہ کی راہ میں دے دے تو کوئی شخص صاحب نصاب نہ ہوتا' نہ کسی کے نصاب پر سال گزرتا اور پھر زکوٰۃ کی فرضیت بالکل لغو اور بے فائدہ ہوتی' نہ کسی شخص پر قربانی واجب ہوتی' نہ کسی پر حج فرض ہوتا' نہ صدقہ فطر ہوتا اور اس طرح قربانی اور حج کی مشروعیت کے احکام بھی لایعنی ہوتے' کیونکہ جب مال جمع کرنا شرعاً جائز ہی نہیں تو پھر ان احکام کے کیا معنیٰ؟ یہ حکم نہ ہوتا کہ اپنی زرعی پیداوار کا دسواں حصہ راہِ خدا میں دو بلکہ یہ حکم ہوتا کہ اپنی ضرورت کا غلہ رکھ کر باقی سارا غلہ راہِ خدا میں دے دو' چور کا ہاتھ کاٹنا بھی غلط ہوتا بلکہ الٹا چور مالک سے باز پرس کرتا کہ تم نے اتنا مال جمع ہی کیوں کیا جسے چرایا جا سکے۔ غرضیکہ سوشلسٹ علماء کے خیال کے مطابق اگر اس آیت کی (برخود غلط) تفسیر کی گئی تو العیاذ باللہ ساری شریعتِ اسلامیہ ہی غلط ہو جائے گی۔'' (''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدی' جلد اوّل' ص ص ۷۷۹' ۷۸۰)

(۳) لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ'' ٥
(آلِ عمران : ۹۲)

''جب تک اپنی محبوب چیز کو خرچ نہ کرو گے' (کامل) نیکی (کے مرتبہ) کو ہرگز نہ پہنچ سکو گے اور جو کچھ بھی کسی چیز سے خرچ کرتے رہتے ہو تو اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔'' (۹۲ : ۳)

(۴) هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ وَاللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ٥ (مُحَمَّد : ۳۸)

''ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے' سو تم میں سے کچھ وہ ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور جو کوئی کنجوسی کرتا ہے تو وہ (دراصل) خود اپنے سے کنجوسی کرتا ہے اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں بلکہ تم (سب اُس کے) محتاج ہو اور اگر تم رُوگردانی کرو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا' پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔'' (۳۸ : ۴۷)

یہ اِنۡفَاق فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہ ہمیشہ بندوں ہی کے فائدہ کے لئے اور اُنہی کی مصلحتوں کی رعایت سے ہوتا ہے اور انسان اپنے مال کو اُس کی راہ میں خرچ نہ کر کے اپنے آپ ہی کو نفعِ دائمی سے محروم کر لیتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں خلوصِ نیت کے ساتھ غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر ہم فرمانِ الٰہی پر بہ

دل و جان عمل کر لیں تو ہم اپنے پیداواری وسائل اور افرادی قوّت سے کما حقہٗ استفادہ کرنے کے قابل ہو کر ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

''معاشی بحران اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مالیاتی امور پر حکومت کا کنٹرول نہ رہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا سرکاری خزانہ خالی ہے اور حکومت کے پاس مالی وسائل کی زبردست کمی ہے۔قومی آمدنی کا صرف ۱۲ فیصد حصّہ عوام پر خرچ ہوتا ہے اور اس کا بھی بیشتر حصّہ کام کرنے اور کروانے والوں کی جیبوں میں ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ بن کر چلا جاتا ہے۔''

''روپے کی قیمت میں مسلسل کمی ہمیں دن رات اقتصادی پس ماندگی اور تباہی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ زراعت وصنعت کے میدان میں پیش رفت نہ ہونے کے باعث (جس کی ایک وجہ حد درجہ لوڈ شیڈنگ بھی ہے) بیروزگاری میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ٹیکس کا نظام انتہائی ناقص اور قومی معیشت کے لئے تباہ کن ہے۔اربابِ حکومت جو خود جاگیردار ہیں یا محض سرمایہ دار، انسانیت سوز غیر اسلامی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظاموں کو منسوخ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے بلکہ وہ تو جاگیرداروں، وڈیروں اور زمینداروں پر ٹیکس لگانے سے بھی معذور ہیں۔تاجر اور صنعتکار حکومت کو ٹیکس دینے کی بجائے سرکاری کارندوں اور افسروں کو رشوت دینے پر مجبور ہیں۔اس کے نتیجے میں چالیس فیصد گھرانے انتہائی تنگدستی کے باعث دو وقت کا کھانا بھی آسانی سے نہیں کھا سکتے۔بڑے شہروں میں ساٹھ لاکھ معصوم بچے اپنے خاندانوں کے لئے روزی مہیا کرنے کے لئے سارا دن محنت مزدوری کرنے اور اپنا مستقبل برباد کرنے پر مجبور ہیں۔شادی کی عمر کو پہنچنے والی لاکھوں لڑکیاں ''جہیز'' نہ ہونے کے باعث گھروں میں سوگوار بیٹھی ہیں۔کروڑوں افراد ہمیشہ کے لئے مزارع اور محکوم وغلام، دیہاڑی دار مزدور یا سڑکوں کے کنارے ریڑھی لگانے والے یا چھابڑی فروش ہیں۔مہنگائی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے جس نے عوام کی زندگی اس حد تک اجیرن کر دی ہے کہ وہ خودکشی کرنے اور اپنے بچوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ڈاکٹر غریبوں کی پہنچ سے باہر ہیں اور دواؤں کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ لوگوں کا بغیر علاج کے مرنا اور اَن پڑھ رہنا مقدّر ہو چکا ہے۔''

اسلام میں علم وحکمت کی غیر معمولی اہمیت کو متعلقہ مضمون ''تعلیم وتعلّم'' کے تحت اجاگر کیا جا چکا ہے۔علم کا حصول ہی انسان کو درندگی سے نکال کر انسان بناتا ہے اور اقوامِ عالم کی صف میں سر اونچا کرنے کے قابل بناتا ہے لیکن اُس حرماں نصیبی کا کیا کیجئے کہ ''وہ امت جس کی آسمانی کتاب میں آدم کی برتری اور افضلیت کا راز یہ بتایا گیا ہو کہ اُسے کائنات کے اسرارِ سربستہ سے آگاہ کیا گیا تھا، وہ امت اگر علم سے محروم ہو، سائنس اور حکمت سے ناآشنا ہو تو اُس کی اپنی بدبختی ہے۔اس کے دین نے تو اس کے سمندِ شوق کو مہمیز لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔دنیا میں جتنے مذہبی صحائف موجود ہیں، کسی میں اتنی وضاحت اور اتنے اہتمام سے مقامِ آدم کی نشاندہی نہیں کی گئی۔اب ہم اپنی شورہ بختی کے علاوہ کسے ملامت کریں کہ ہماری غالب اکثریت تو ابجد خواں بھی نہیں۔اور جو لوگ علم سے آشنا ہیں، وہ

علم کو تن پروری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ دن کب طلوع ہوگا جب مؤمن اپنے مقام کو پہچانے گا۔ پھر کب اِس آسودہ خوابِ راحت کو رُومی کا سوز اور رازی کا پیچ و تاب نصیب ہوگا۔ ہمارے مطالعہ کی میز پر تو تہہ در تہہ گرد جمی ہوئی ہے اور ہمارے عشرت کدوں میں نور و نکہت کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے۔ ہماری رصد گاہیں اب اُن تھک تیز نگاہوں سے محروم ہیں جو ستاروں کی معمولی سی جنبش کا تعاقب کیا کرتی تھیں۔ ہماری تجربہ گاہیں اب ایسے علماء کو ترس گئی ہیں جو دُنیا کی لذّات سے کنارہ کش ہو کر نشترِ تحقیق سے کائنات کی ہر چیز کا دل چیرا کرتے اور اُن میں پوشیدہ اثرات اور قوّتوں کا کھوج لگایا کرتے اور اس سے بھی بڑھ کر قابلِ حیرت بلکہ لائقِ نفرت وہ آواز ہے جو بعض حلقوں سے توحید کے نام پر اُٹھائی جا رہی ہے کہ نبی کو تشریعی علم دیا جاتا ہے' تکوینی علم سے اُسے کیا سروکار! اور اس طرح اُس ذاتِ اقدس ﷺ کے خداداد علمِ بیکراں وسعتوں کو تنگ سے تنگ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا سارا زور صَرف کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالتِ زار پر رحم فرمائے اور ہماری کم اندیشیوں اور کوتاہیوں کو بخشے! ('' ضیاء القرآن'' ج ۱' ص ۴۸)

'' تعلیمی بحران کا حل : نصابِ قرآن کے مطابق تعلیم و تربیت کا بندوبست کرنا اور تعلیم کو لازمی قرار دینا اسلامی حکومت کی بنیادی ذمّہ داری ہے۔ حکومت اپنی اس انتہائی اہم ذمّہ داری سے بہ احسن طریق عہدہ برآ ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ درجِ ذیل لائحہ عمل اختیار کرے:۔

(۱) سُلطان یا سائنس و ٹیکنالوجی کی قوّت کے ذریعے انسان فضا کی تسخیر کر سکتا ہے اور ارضی و دیگر سماوی کُروں سے پار نکل سکتا ہے (بحوالہ سورہ الرّحمٰن: ۳۳)

(۲) ملک میں قائم تین مختلف طرز کے غیر اسلامی تعلیمی نظاموں کو ختم کر کے قرآن و سنت کے مطابق ایک نظام قائم کیا جائے۔

(۳) چھوٹی بڑی مسجدیں جو لاکھوں کی تعداد میں ملک کے قریہ قریہ' بستی بستی' محلّے محلّے میں موجود ہیں' اُن میں رقبے کے مطابق پرائمری' مڈل' ہائی سکول اور کالج قائم کئے جائیں۔ اس سے حکومت اربوں بلکہ کھربوں روپے خرچ کئے بغیر ملک بھر میں تعلیمی ادارے قائم کر کے ناخواندگی اور جہالت کو ختم کر سکے گی۔

(۴) اپنے اپنے علاقے کے چار پانچ سال کی عمر کے تمام بچوں کو سکول میں داخل کرانا' والدین اور محلہ/علاقہ کی انتظامیہ کی مشترکہ ذمّہ داری ہوگی۔ ارکان دیکھیں گے کہ اُن کے محلّے/علاقے کا کوئی بچہ سکول میں داخل ہوئے بغیر نہ رہ جائے۔ تمام مسجدی سکول نظامتِ تعلیم کے منظور شدہ ہوں گے جو اُن کے اخراجات کی ذمّے دار ہوگی۔

(۵) ہر بچے کو اپنے علاقے کے سکول میں داخل کرانا لازمی ہوگا اور اُس کے داخلے کا بندوبست کرنا انتظامیہ کی

ذمّے داری ہوگی۔ مڈل تک تعلیم مفت ہوگی۔ یہ سب کچھ منصوبہ بند پالیسی کے تحت ہوگا۔

(۶) سکولوں اور کالجوں میں علوم قرآنی کے ساتھ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سیکھنے کا معقول انتظام ہوگا جو مذہبِ اسلام کی جانب سے اُمّتِ مسلمہ کے لئے فرضِ کفایہ ہے اور جس کا ذکر سورہ اَلرَّحمٰن کی آیت ۳۳ میں ہوا۔''

''اس اسلامی نظامِ تعلیم کے چند بڑے بڑے **فوائد** یہ ہوں گے:۔

''(۱) اساتذہ اور طلباء جوتے اتار کر سکولوں میں جائیں گے☆۔ اس سے اُن میں مسجد' درسگاہ اور علم کا احترام پیدا ہوگا اور مساوات و اخوّت کے جذبات نشو و نما پائیں گے۔''

''(۲) نصابِ قرآن کے مطابق طلباء و طالبات کا تزکیہ کیا جائے گا۔ تزکیہ کا مطلب ہے کہ اُن کے اَخلاق کی تہذیب و تحسین کی جائے گی' اُنہیں مؤدّب و مہذّب اور با اَخلاق بنایا جائے گا' اُن میں نیکی و بدی کا شعور بیدار کیا جائے گا اور اُن میں ربِّ جلیل کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو قوّۃ سے فعل میں لایا جائے گا۔''

''(۳) سکول محلّے میں ہونے کے باعث والدین کو اُن کی سواری کا بندوبست کرنے کی فکر نہ ہوگی' نیز بچے اُن کی نظر میں رہیں گے۔ اس کے نتیجے میں جب وہ فارغ التحصیل ہوں گے تو حقیقی معنوں میں متقی و صالح انسان بن کر نکلیں گے اور اپنے خاندان' قوم اور ملک کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دے سکیں گے۔''

''(۴) تمام طالب علموں کو ایک جیسا ماحول' ایک جیسے تعلیمی مواقع میسر ہوں گے تو اُن میں اخوّت و مساوات اور صحت مند مسابقت (Healthy Competition) کا جذبہ پروان چڑھے گا۔ یہ مسابقت ذہنی قابلیت اور جسمانی توانائی میں ہوگی۔ عزت کا معیار دولت و اقتدار کی بجائے صالحیت اور علم بن جائے گا۔''

''(۵) محلّوں میں سکول ہونے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ٹریفک کا ہجوم جو ایک مسئلہ بن چکا ہے' خاصا کم ہو جائے گا اور ملک کو اربوں روپے سالانہ کے پٹرول کی بچت ہوگی۔''

''یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اِس منہاجِ تعلیم کی بدولت آٹھ دس برس کے اندر قلیل مصارف سے نئی نسل پڑھی لکھی بن جائے گی۔ اس کے بعد طلباء و طالبات کے رُجحانات کے مطابق' اُن کے والدین کی مرضی اور ان بچوں

☆ یاد رہے کہ مسلمانوں کی پیروی میں ترقی یافتہ جاپان میں اساتذہ اور طلباء جوتے اتار کر سکولوں میں جاتے ہیں۔ (''پاکستان کا تباہ کن بحران اور اُس کا حل''۔ خواجہ محمد اسلم' ص ۲۰)

کی قابلیت کے اصول پر وہ ہائی سکول یا کالج میں جائیں گے جو اس دوران ہر محلّے رعلاقے میں قائم ہو چکے ہوں گے۔''

اُفرادی قوّت میں کمی کا حل اس طرح ہوگا کہ سکولوں اور کالجوں سے فارغ ہونے پر اُنہیں فوراً مناسب ملازمت مل جائے گی اور وہ آج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح ذہنی پریشانی اور مایوسی کا شکار نہیں ہوں گے۔''

''قرآنِ حکیم کی روشنی میں سیاسی' معاشی' تعلیمی اور دوسرے بحرانوں کے حل دراصل نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ زکوٰۃ کی عملی تفسیریں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے جُڑواں ادارے نظامِ اسلام کی دو اہم ترین بنیادیں ہیں۔ صرف اُنہی کی بدولت افرادِ معاشرہ اطمینانِ قلب اور امن و سلامتی کے ساتھ حیاتِ طیّبہ بسر کر سکتے ہیں' قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور مادّی و معنوی ترقی کر سکتے ہیں۔ اِن اداروں کو جمود و تعطّل اور فعّال و حرکی رکھنے کی خاطر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اداروں کی غیر معمولی اہمیت کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔''

''<u>امر بالمعروف</u>: تمام قرآنی احکامات پر عمل کرنے اور نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کو خاص طور پر فعّال رکھنے کا حکم اور تلقین کرتے رہنا' رعایا اور حکومت کی مشترکہ ذمّہ داری ہے جسے رعایا وسائلِ اِبلاغ اور حکومت قانون کے ذریعے پورا کرے گی۔''

<u>نہی عن المنکر</u>: نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کو خاص طور سے فعّال رکھنے کی خاطر لوگوں کو قانون اور جملہ وسائلِ اِبلاغ کے ذریعے شرک وظلم اور جرم وگناہ (= نواہی) سے باز رکھنے کے لئے مسلسل و مؤثر جہاد کرتے رہنا' حکومت اور رعایا کی مشترکہ ذمّہ داری ہے۔''

''یہاں اس نکتے کی صراحت کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ قائم وفعّال کئے بغیر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نظام نہ تو فعّال رہ سکتے ہیں اور نہ ہی مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں اسلام کے یہ چاروں نظام قائم کر لیں تو صحیح معنوں میں ہم قرآنی لقب خَیرَ اُمّۃٍ کے مصداق ہو سکتے ہیں۔''

''<u>عدل وانصاف</u>: انگریز حاکموں کے بنائے ہوئے موجودہ غیر اسلامی اور غیر انسانی قوانین اور صبر شکن طریقِ کار کو بلا تاخیر منسوخ کر کے قرآن وسنت کے مطابق عدالت کا نظام قائم کرنا اور لوگوں کو بلا امتیاز فوری اور مفت عدل وانصاف مہیّا کرنے کی ضمانت فراہم کرنا حکومت کی اوّلیں ذمّہ داری ہوگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ہر محلّے رعلاقے کے لئے اُن کی انتظامیہ عدالتیں قائم کریں گی جن کے فیصلوں کے خلاف عدالتِ عالیہ میں اپیل ہو سکے گی۔'' (ایضاً ص ص ۲۱' ۲۲)

انجینیر نگ کے حوالے سے ''ایک چھوٹی سی شہد کی مکھی بھی اپنے خالق کی قدرت وحکمت کی تجلی گاہ ہے۔ اس کے مختصر سے چھتے میں بھی اُس ذاتِ کبریاء کا مینا بازار لگا ہوا ہے۔شہد کی مکھی کے بنائے ہوئے اُس چھتے کو بہ غور دیکھئے کہ کس مہارتی انجینیر نگ سے اُسے مسدّس خانوں میں تقسیم کردیا گیا ہے جن کے تمام اضلاع اور سارے زاویے مساوی ہیں۔کوئی ماہر انجینیر بھی مسطر اور پرکار کے بغیر ایسے مسدّس خانے نہ بنا سکے۔ پھر اس کے مختلف حصّوں پر نظر ڈالئے۔کہیں تو نوزائیدہ بچوں کی قیام گاہ ہے' کہیں شہد کا ذخیرہ کیا جارہا ہے' کہیں موم تیار ہورہا ہے' کہیں خوراک کا گودام ہے۔ پھر اس حیران کن نظم ونسق کو دیکھئے جس کے ماتحت یہ کثیر التعداد مکھیاں یہاں آباد ہیں' کسی متمدن ملک کی بہترین تربیت یافتہ فوج بھی اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ان میں ایک مکھی سب کی سردار ہے اور دوسری مکھیاں اُس کی فرمانبردار ہیں اور اس کا حکم بجالانے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتیں۔ بعض خوراک لانے کے لئے متعیّن ہیں' بعض پہریدار ہیں۔کیا مجال کہ کوئی اجنبی اندر قدم بھی رکھ سکے۔جو خوراک لانے پر مقرر ہیں' وہ اپنے چھتے سے دُور دراز مقامات پر اُڑ کر جاتی ہیں اور وہاں سے مختلف پھولوں' کلیوں' کونپلوں اور پتوں کا رس دن بھر چوستی رہتی ہیں اور پھر طویل مسافت طے کر کے اپنے چھتہ میں واپس آجاتی ہیں۔نہ وہ راستہ بھولتی ہیں' نہ لیٹ ہوتی ہیں اور نہ اپنے فرض کو انجام دینے میں کسی کاہلی کی روادار ہیں۔ پھر جس حکمت وخوبی سے پھلوں کے چوسے ہوئے اُس رس کو شہد بنانے کا عمل تکمیل پاتا ہے' وہ تو اتنا حیرت انگیز ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔انسان اتنے علمی کمال اور صنعتی ترقی کے باوجود کوئی ایسی مشینری تیار نہیں کرسکا جس کے ذریعے وہ پھلوں وغیرہ کے رس سے شہد جیسا جوہر کشید کرسکے۔غور طلب امر یہ ہے کہ اس چھوٹی سے مکھی کو یہ مہارت اور یہ کمال کس نے سکھایا۔یہ باقاعدگی' نظم ونسق کی پابندی' اپنے فرائض کی ادائیگی' اپنے امیر کی اطاعت' یہ فنّی نزاکتیں اور اس پیچیدہ کام کو انجام دینے میں اتنی نفاستیں اور یہ سب چیزیں اس معمولی سے حیوان کو کس نے تعلیم کیں۔قرآن کریم فرماتا ہے کہ اے محبوبِ کبریاء ﷺ یہ آپ کے رب کی تعلیم ہے۔'' ☆ (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحات ۵۸۱'۵۸۲)

انسان جہاں ایک سماجی جانور ہے (بہ ایں معنیٰ کہ مل جل کر رہنا اُس کی فطرت ہے نہ کہ تنہائی کی زندگی بسر کرنا)' وہاں سماج میں رہتے ہوئے اُس کے ماحول سے اثر لینا بھی اُس کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ ایک ایسی تابندہ اور روشن حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں اور جسے قرآن مجید نے بھی مانا ہے۔چنانچہ سورۃ الانفال میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

☆ یاد رہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے قرآنِ مجید میں ۲۰۹ مقامات پر اپنی ربوبیت کو اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رب ہونے کی طرف نسبت دی ہے حالانکہ وہ نہ صرف اپنے محبوب کا رب ہے بلکہ ربُّ العالمین بھی ہے۔ جہاں وہ بلال حبشی کا رب ہے' وہاں وہ اُمیّہ بن خلف کا بھی رب ہے۔ جہاں وہ صدّیق اکبر کا رب ہے' وہاں وہ ابوجہل کا بھی رب ہے۔اپنے محبوب علیہ السلام کا بھی رب ہے۔لیکن کیا وجہ کہ وہ جگہ جگہ اپنے رب ہونے کو محبوب علیہ السلام کا رب ہونے کی طرف نسبت دیتا ہے۔عارفینِ کاملین نے اس کی وجہ یہی بتائی کہ پیارے! کوئی شک نہیں کہ میں سب کا رب ہوں' تیرا بھی رب ہوں۔لیکن محبوب! جو مزہ تیرا رَب ہونے میں ہے' وہ کسی اور کا رَب ہونے میں نہیں ہے ﷺ۔

وَالَّذِیۡنَ آمَنُوۡا وَلَمۡ یُھَاجِرُوۡا مَالَکُمۡ مِنۡ وَّلَایَتِھِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوۡا (الانفال : ۷۲)
''اور جو لوگ ایمان تو لائے لیکن ہجرت نہیں کی' تو تمہارا اُن سے میراث کا کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔'' (۸ : ۷۲)

مکہ میں رہ گئے مسلمانوں کو ہجرت کی یہ تاکید صرف اسی لئے ہے کہ اُن کا مکہ مکرّمہ میں کفر کے ماحول میں رہنا اُن کے دین و ایمان اور عقیدے پر منفی طور پر اثرانداز ہو سکتا تھا۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے ہجرت کا تاکیدی حکم دیا گیا اور جب اُنہوں نے ہجرت کر لی تو وہ بھی مہاجرین میں داخل ہو گئے۔ ہجرت کا وجوب اگرچہ فتحِ مکہ کے بعد باقی نہیں رہا' تاہم دارالکفر سے ہجرت کر جانا ہمیشہ اَولیٰ اور موجبِ اجرِ عظیم ہے۔ معلوم ہوا کہ ماحولیات کا اثر بہرحال انسان کے خیالات اور عقیدے پر پڑتا ہے۔

فنِّ خطابت اور خوش بیانی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک خداداد وصف رہا ہے کیونکہ دینِ متین کی تبلیغ کا براہِ راست تعلق عوام الناس سے ہوتا ہے' اس لئے قدرت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ ان انبیاء و رُسُل کو فنِّ خطابت اور خوش بیانی کے وصفِ جمیل سے آراستہ کر کے دین کی تبلیغ کے لئے منظرِ عام پر لایا جائے اور اس فنِّ خطابت کو حد درجہ فصاحت و بلاغت اور مُسکِت طرزِ استدلال کے ذریعے چار چاند لگانے والے ہوں۔ ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی بابت یہ ارشادِ گرامی کہ اَنَا اَفۡصَحُ الۡعَرَب (میں ملکِ عرب کا فصیح ترین انسان ہوں) مشہور و معروف ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی اپنی قوم سے خطابت کے نمونے قرآن مجید میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

ڈارونزم یعنی نظریہ ارتقاء اُنیسویں صدی کی پیداوار ہے جو ''مادیت پرستی'' کا ایک ایسا فلسفہ ہے جو ہمارے کیوں اور کیسے وجود میں آنے کے جوابات کے بارے میں غیر حقیقی نظریات کا حامل ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے مادہ پرستی میں مادّے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور مادہ ہی تمام نامیاتی اور غیر نامیاتی اشیاء کا جوہر ہے۔ یہ فلسفہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے وجود سے انکاری ہے جس کے نتیجہ میں ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے مصداق آخرت اور محاسبے کا خوف محض ایک تصوّر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے مادیت ہی سب کچھ ہے' روحانی اور اَخلاقی اقدار کے تصوّر تک کو اس نظریہ میں کوئی گنجائش حاصل نہیں۔ اس صورتِ حال میں انسان اور حیوان' انسانیت اور بربریت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ماں' بیٹی اور بہن کا تقدس پامال ہو کے رہ جاتا ہے اور افراد اور افراد کے مابین کے تعلقات پر ''جنگل کے قانون'' کا راج ہوتا ہے۔ حب الوطنی' اپنے اَبنائے جنس سے محبت و مودّت' عدل و انصاف' جذبہ ایثار' عزت و عظمت' عفو و درگزر اور احترامِ آدمیت کے جذبات نام کو نہیں ملتے۔ ظلم و بربریت کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔ ظالم کو کھلی چھٹی دینا اور مظلوم کو تختہ مشقِ ستم بنانا اس نظریہ کے عمومی خدّ و خال ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سماجی نظام کی تشکیل ایسے افراد سے ہوتی ہے' اُس کے نصیب میں بہت جلد ٹوٹ جانا اور بکھر جانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادیت پرستی کسی قوم کے سیاسی و سماجی نظام کی بنیادی اَقدار کے لئے شدید خطرات کا موجب بنتی ہے۔

اشتراکیت (سوشلزم) مادہ پرست فلسفے کا قدرتی و سیاسی نتیجہ ہے۔ خاندان اور ریاست جیسے مقدس تصوّرات کو کالعدم قرار دینے کی کوشش میں یہ ہر قسم کے علیحدگی پسندانہ کاموں کے لئے بنیادی نظریہ تشکیل دیتی ہے۔ اشتراکیت کے بانی مبانی کارل مارکس نے بالوضاحت لکھا ہے کہ ڈارونزم نے اُسے مادیت پسندی اور بالآخر کمیونزم کے لئے ایک ٹھوس اور مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ اُس نے اپنی مشہور ترین کتاب ''داس کیپیٹل'' ڈارون کے نام منسوب کر کے ڈارون کے لئے اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ وہ کتاب ہے جس میں ہمارے نقطہ نظر کے لئے قدرتی تاریخ میں ایک بنیاد موجود ہے۔'' (''نظریہ ارتقاء۔۔ایک فریب'' : ہارون یحییٰ (اردو ترجمہ' ص ص ۹' ۱۰)

''انسان اور بندر کے درمیان ظاہری مشابہت سے قطع نظر ایک بہت بڑا فرق موجود ہے۔ بندر ایک جانور ہے اور اگر اُس کے شعور کی سطح کو سامنے رکھا جائے تو وہ گھوڑے یا کتے سے مختلف نہیں ہے۔ مگر انسان ایک باشعور' علم و آگہی رکھنے والا اور مضبوط قوّتِ ارادی کا مالک ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے' بات کر سکتا ہے' سمجھ سکتا ہے' اُس میں قوّتِ فیصلہ ہے اور وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ تمام باتیں اُس کی خداداد رُوح سے تعلق رکھتی ہیں۔ روح ایک نہایت اہم اور نمایاں فرق ہے جو انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان ایک وسیع خلیج کی طرح موجود ہے۔ انسان اور کسی دوسرے جاندار کے درمیان یہ بہت بڑا خلاء کسی بھی طبعی مشابہت سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جسے روح عطا کی گئی ہے۔'' (ایضاً' ص ۱۹۵)

نظریہ ارتقاء کے ردّ میں مندرجہ ذیل حقائق پر غور کرنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ کائنات اور اُس میں بسنے والی مخلوق کسی حادثاتی یا اتفاقی نتیجے میں معرضِ وجود میں نہیں آئی بلکہ اُس کے پیچھے ایک عقلِ کُل اور مقتدرِ اعلیٰ کا غیر مرئی (نظر نہ آنے والا) ہاتھ کارفرما ہے اور جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے انسانی عقل و فکر کو یوں مہمیز لگائی:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥ (اَلرُّوم : ۴۰)

''اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا' پھر تمہیں روزی دی' پھر تمہیں موت دیتا ہے' پھر تمہیں جلائے گا۔ تو کیا تمہارے شریکوں میں بھی کوئی ایسا ہے جو اِن کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے؟ وہ اللہ اُن کے شرک سے پاک و برتر ہے۔'' (۳۰ : ۴۰)

''کٹھ بڑھئی (ھُد ھُد) : ہر شخص جانتا ہے کہ کٹھ بڑھئی اپنے گھونسلے درختوں کے تنوں پر چونچیں مار مار کر بناتا ہے۔ تاہم حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مسلسل چونچیں مارنے سے بھی اس پرندے کو کسی دماغی صدمے سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ کٹھ بڑھئی کا اپنے گھونسلے کے لئے کام کرنا ایسے ہی ہے جس طرح کوئی شخص دیوار میں اپنے سر سے کیل ٹھونکنے کی

کوشش کرے تو اوّلاً اُسے دماغی دھچکوں اور انجام کار دماغی شریان پھٹ جانے (Brain haemorrhage) جیسے صدمے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مگر کٹھ بڑھئی 2.10 سے 2.69 سیکنڈ کے درمیان 38 سے 43 مرتبہ درختوں کے تنوں پر چونچ مارتا ہے اور اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ اس کا سبب کٹھ بڑھئی کی دماغی ساخت ہے جو اس کے کام کے لئے موزوں ہے۔ اُس کی کھوپڑی میں ایسا نظام موجود ہے جو درخت پر چوٹ لگاتے وقت دماغ پر پڑنے والی قوّت کو جذب کرتے ہوئے کم کر دیتا ہے۔ اُس کی دماغی ہڈیوں میں اس مقصد کے لئے مخصوص نرم عضلات ہوتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۲۰۰)

'' مچھر کی ساخت : مچھر کو ہمیشہ اُڑنے والا جانور سمجھا جاتا ہے۔ مگر اُس کی نشوونما کے تمام مراحل زیرِ آب مکمل ہوتے ہیں اور یہ پانی سے اوپر اُس وقت آتا ہے جب اُس کا مطلوبہ غیر معمولی ساختیاتی ڈھانچہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مچھر جب اپنی پرواز کا آغاز کرتا ہے تو اپنے شکار کی شناخت کے لئے اپنا مخصوص حواس کا نظام استعمال کرتا ہے۔ ان نظاموں کے ساتھ یہ ایک ایسے جہاز سے مشابہ لگتا ہے جس میں گرمی، گیس، نمی اور بو کو محسوس کرنے کے نظام نصب ہیں۔ اس کے علاوہ درجہ حرارت کے احساس کے ساتھ یہ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے جس سے یہ گہری تاریکی میں اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے۔''

'' مچھر میں خون چوسنے کی صلاحیت بھی ایک بہت ہی پیچیدہ نظام پر مشتمل ہے۔ یہ اپنے چھ بلیڈوں والے کاٹنے کے نظام سے جلد کو آرے کی طرح کاٹتا ہے۔ جلد کو کاٹنے کے دوران جو رطوبت زخم پر پڑتی ہے، اُسی سے جلد سُن ہو جاتی ہے اور آدمی کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اُس کا خون چوسا جا رہا ہے۔ یہی رطوبت خون کو جمنے بھی نہیں دیتی اور مچھر تسلسل کے ساتھ خون چوستا رہتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک عنصر بھی موجود نہ ہو تو مچھر نہ صرف خون نہ چوس سکے بلکہ اس کے لئے اپنی نسل کو قائم رکھنا بھی مشکل ہو جائے۔ اس غیر معمولی ساخت کی وجہ سے یہ اپنے عظیم خالق کی نشانی ہے۔ قرآن کریم میں اہلِ عقل کے لئے وجودِ خداوندی کی دلیل کے طور پر مچھر کا تذکرہ بھی اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا وَمَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿البقرۃ : ۲۶﴾

'' بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثال مچھر کی یا اُس چیز کی جو اُس سے بڑھ کر ہو بیان کرے۔ پھر جو ایماندار ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ مثال جو اُن کے رب کی طرف سے نازل ہوئی بالکل درست ہے۔ لیکن جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ کو اس مثال کے دینے سے کیا فائدہ؟ (اللہ اس سے) بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے اور اس سے کسی کو بھی گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقوں کو۔'' (۲۶ : ۲)

مچھر میں عجیب و غریب لطائف : (۱) مچھر بھوکا رہ کر زندہ رہتا ہے، پیٹ بھر کر مر جاتا ہے۔ اسی طرح

دُنیادار مصیبت میں رب کی یاد کرتا ہے' عیش وطرب میں رب کو بھول جاتا ہے۔ (۲) چھوٹی چھوٹی چیزیں حق تعالیٰ کی قدرت کو بڑی چیزوں سے زیادہ ظاہر کرتی ہیں کیونکہ چھوٹی چیزوں میں بھی وہی سارے اعضاء موجود ہوتے ہیں جو بڑی چیزوں میں ہیں چنانچہ مچھر میں ہاتھی کے سارے عضو موجود ہیں حتّٰی کی اُس کی سونڈ بھی ہے بلکہ دو پَر اور زیادہ ہیں۔ نیز انسان بڑی چیز کا اچھی طرح فوٹو کھینچ سکتا ہے مگر مچھر وغیرہ کا صحیح فوٹو جس میں اُس کے سارے اعضاء موجود ہو جائیں' ناممکن ہے۔ (۳) مچھر ہاتھی جیسے گرانڈیل اور عظیم الجثہ جانور کو مار ڈالتا ہے لیکن ہاتھی مچھر کو نہیں مار سکتا۔ (۴) مچھر بہت بہادر اور دلیر مخلوق ہے کہ شیر' ہاتھی اور سانپ وغیرہ جیسے قوی جانور تو انسان سے ڈر کر جنگل میں رہتے ہیں لیکن یہ بہادر انسان کے گھروں میں رہے اور آواز دے کر انسان کو کاٹے۔ بقول کسے:

پشّے سے پوچھے شیوۂ مردانگی کوئی　　　جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

اگر مچھر کی سی بہادری شیر اور سانپ میں ہوتی تو کوئی بھی انسان زندہ نہ رہتا۔ تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵) بڑے بڑے بادشاہ مچھر سے عاجز ہوئے کہ اس کے دفع کرنے کی صدہا تدبیریں کرتے ہیں مگر اس سے اَمن نہیں ملتا۔ نمرود جیسے جابر بادشاہ کو ایک مچھر نے اتنے جوتے لگوائے کہ اُس کا خدائی کا نشہ کافور ہو گیا اور آخر کار مچھر ہی نے اُسے ہلاک کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ جب بڑے سے بڑا انسان ایک مچھر کی مار برداشت نہیں کرسکتا تو جہنّم کے سانپ' بچھو کیسے برداشت کرے گا!'' (تفسیر نعیمی: مفتی احمد یار خاں گجراتی' جلد اوّل' صفحہ ۲۵۱' مطبوعہ لاہور ۱۳۷۸ھ)

''اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے: (۱) جب ضدّی انسان دلائل سے عاجز ہوتا ہے تو وہم اور بے جا شکوک کی دَلدل میں پھنس جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ ہدایت دلائل سے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے ملتی ہے۔ (۲) بُری چیز کا جاننا اور اُس کا ذکر کرنا بُرا نہیں' ہاں فحش طریقے سے بیان کرنا بُرا ہے۔ (۳) بدکاروں کے لئے اچھا وعظ بجائے فائدہ کے نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ وعظ کی خرابی نہیں بلکہ اُس کے دل کی خرابی ہے۔ (۴) قرآن ایک ہے مگر اس کے دیکھنے والی نظر دو قسم کی ہے یعنی قبول کی نظر اور اعتراض کی نظر۔ پہلوں کو ہدایت اور دوسروں کو اس سے گمراہی ملتی ہے۔ معاذ اللہ یہ قرآن کا قصور نہیں بلکہ نظر کا فتور ہے۔ یہی حال صاحبِ قرآن ﷺ کے جمالِ پاک میں ہے۔ صدّیقی نگاہ سے دیکھنے والے صحابی بن گئے اور ابوجہلی نظر سے مشاہدہ کرنے والے طاغی اور عذابی بن گئے۔ ماں اپنے بچے کو اور نظر سے دیکھتی ہے اور ڈائن دوسری نظر سے۔'' (ایضاً' ص ص ۲۵۳' ۲۵۴)

''<u>مکڑی کا دھاگہ</u>: Dinopis نامی مکڑی شکار میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ ایک سا کن جال بُن کر شکار کا انتظار کرنے کی بجائے یہ ایک چھوٹا مگر بہت ہی غیر معمولی جال بُنتی ہے جو یہ اپنے شکار پر پھینک دیتی ہے پھر وہ اپنے شکار کو سختی سے اس جال میں باندھ دیتی ہے۔ قید ہونے والا کیڑا مکوڑا اس جال سے نکل نہیں سکتا۔ یہ جال اتنی مہارت سے بُنا جاتا ہے کہ جوں جوں مقید حشرہ اُس جال سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے' وہ اُس میں مزید پھنستا

چلا جاتا ہے۔ اپنی خوراک کو ذخیرہ کرنے کے لئے یہ مکڑی اپنے شکار کے گرد مزید جال بُن دیتی ہے گویا کہ وہ اُسے پیک کر رہی ہے۔''

''ایک مکڑی کے لئے میکانکی اور کیمیائی لحاظ سے اتنا مکمل جال بُننا کس طرح ممکن ہوا؟ یہ ممکن نہیں کہ محض اتفاق سے مکڑی نے یہ کمال حاصل کر لیا ہو' جیسا کہ ماہرینِ ارتقاء کا دعویٰ ہے۔ مکڑی تو سیکھنے اور یاد کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہے حتّٰی کہ اس طرح کا کام انجام دینے کے لئے اُس کے پاس دماغ بھی نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اُسے یہ صلاحیت ایک طاقتور ہستی یعنی اُس کے خالق نے ہی عطا کی ہے۔''

''مکڑی کے دھاگے میں بھی غیر معمولی معجزات پوشیدہ ہیں۔ یہ دھاگہ جو ایک ملی میٹر کے ہزارویں حصے سے بھی کم قطر کا حامل ہے' اس قطر کے لوہے کی تار سے پانچ گنا زیادہ مضبوط ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت اُس کا بالکل ہلکا ہونا ہے۔ اگر اس دھاگے کو پوری زمین کے گرد لپیٹا جائے تو اُس کا کل وزن 320 گرام ہوگا۔ صنعتی مقاصد کے لئے تیار کیا جانے والا سٹیل وہ مضبوط مواد ہے جو انسان نے خود تیار کیا۔ مگر مکڑی اپنے جسم میں سٹیل سے کہیں زیادہ مضبوط دھاگہ بناتی ہے جبکہ انسان سٹیل کی تیاری میں اپنے صدیوں کے تجربات سے حاصل ہونے والے علم اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ٹیکنالوجی ہے جسے اپنے دھاگے کی تیاری کے لئے مکڑی استعمال کرتی ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اپنے تمام علم و ہنر کے باوجود انسان اس میدان میں مکڑی سے کہیں پیچھے ہے۔'' (''نظریہ ارتقاء۔۔ایک فریب'' ص ص ۲۰۳' ۲۰۴)

''جانوروں کا ذہانتی منصوبہ: بھیس بدلنا (Camouflage): اپنی زندگی بچانے کے لئے جانوروں کی ایک اہم خصوصیت خود کو چھپا لینے کا فن ہے جسے ہم بھیس بدلنا یا Camouflage کہتے ہیں۔ جانور دو وجوہ سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں: شکار کرنے کے لئے یا شکار ہونے سے بچنے کے لئے۔ کیموفلاژ تمام طریقوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں جانور بہت زیادہ ذہانت استعمال کرتا ہے۔ جانوروں کی کیموفلاژی تدابیر حیران کن ہیں۔ کسی کیڑے کے درخت کے تنے یا پتے کے نیچے چھپے ہونے پر اُسے پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔''

''پتوں کے کیڑے جو اپنی خوراک پودوں کی رطوبتیں چوس کر حاصل کرتے ہیں' وہ درختوں کی شاخوں پر کانٹوں کی طرح چپکے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بڑے دشمنوں یعنی پرندوں کو دھوکہ دیتے ہیں جو کانٹے دیکھ کر درختوں پر نہیں بیٹھتے اور اُن سے دُور رہتے ہیں۔'' (ایضاً ص ص ۲۰۵' ۲۰۶)

''مختلف بصری نظام: اکثر سمندری جانوروں کے لئے دیکھنا شکار اور دماغ دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اکثر سمندری جانوروں کی آنکھیں اُن کی سمندری ضروریات کے مطابق ہی بنی ہوتی ہیں۔

پانی سے نیچے دیکھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور 30 میٹر سے نیچے بالکل نظر نہیں آتا۔ تاہم اس گہرائی میں رہنے والے جانوروں کی آنکھوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس اندھیرے میں بھی دیکھ سکیں۔''

''زمین پر رہنے والے جانوروں کے برعکس پانی کے جانوروں کی آنکھوں کے عدسے مدوّر ہوتے ہیں اور وہ گہرے پانی میں دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ زمینی جانوروں کی بیضوی آنکھوں کی نسبت یہ گول دائروی آنکھیں اس ماحول میں زیادہ سازگار رہتی ہیں جو اپنے ہدف کو زیادہ بڑا اور قریب تر دیکھ سکتی ہیں۔ جب کوئی جسم ان جانوروں سے بہت دُور واقع ہو تو اُن کی آنکھوں کا عدسی نظام مخصوص پٹھوں کی مدد سے آنکھ کے اندر کو کھچ جاتا ہے تاکہ دیکھنے میں سہولت ہو۔''

''ان کی آنکھوں کے دائروی ہونے کی دوسری وجہ سمندر میں انعطاف کا عمل ہے۔ چونکہ ان کی آنکھوں میں بھی پانی ہی کی کثافت والا مائع بھرا ہوتا ہے' اس لئے جب وہ کسی بیرونی جسم کو دیکھتے ہیں تو روشنی کا کوئی انعطافی عمل نہیں ہوتا۔ اس طرح اس جسم کی شبیہ کو آنکھ کا عدسہ مکمل طور پر پردۂ چشم پر بناتا ہے اور انسان کی نسبت مچھلی پانی میں زیادہ بہتر طور پر دیکھتی ہے۔''

''کئی جانوروں مثلاً آکٹوپس کی آنکھیں زیادہ بڑی ہوتی ہیں تاکہ وہ زیادہ روشنی لے سکیں۔ 300 میٹر نیچے رہنے والی مچھلیوں کو اردگرد کی اشیاء کو دیکھنے کے لئے زیادہ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے' اس لئے اُن کی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں۔ اُنہیں پانی میں آنے والی معمولی نیلی روشنی کو بھی محسوس کرنا ہوتا ہے اس لئے ان کے پردۂ چشم پر بہت سے حساس خلیے ہوتے ہیں۔''

''جیسا کہ ان کی تفاصیل سے واضح ہے کہ ہر جاندار کو اس کی ضروریات کے مطابق بصری نظام دیا گیا ہے جو اِس امر کا ثبوت ہے کہ اُنہیں اُن کے خالق نے ہی مکمل طور پر بنایا جو ابدی حکمت و دانش' علم اور قوّت کا مالک ہے۔'' (ایضاً' ص ص ۲۰۷' ۲۰۸)

احوالِ حشر و نشر کے ضمن میں جہاں قرآن مجید نے اہلِ جہنم کی دلدوز ہولناکیوں کا منظر نامہ پیش کیا ہے وہاں اہلِ جنت کے ناقابلِ تصوّر آرام و سکون کا نقشہ بھی خوب باندھا ہے۔ اس حوالے سے جنت میں ہر قسم کے پھلوں اور وہاں کی چار نہروں کا ذکر سورہ مُحَمَّد کی آیت ۱۵ میں ہوا: (۱) پانی کی نہر جس کی بُو متغیر نہیں ہوگی' جیسے اس دنیا کا پانی پڑے پڑے بدبودار اور کائی دار ہو جاتا ہے' جنت کا پانی اس طرح کا نہیں ہوگا۔ (۲) دودھ کی نہر جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوگا۔ (۳) شرابِ طہور کی نہر جس کا ذائقہ دنیا کی شراب کی طرح بدذائقہ نہیں ہوگا بلکہ پُرلطف اور سرور آفریں ہوگا جس کے پینے سے نہ تو ہوش و حواس گم ہوں گے اور نہ ہی دردِ سر ہوگا۔ (۴) صاف' ستھری' نتھری شہد کی نہر جس میں نہ تو موم کے ذرّات ہوں گے اور نہ ہی اس کے اثرات ہوں گے۔

اُمّتِ مسلمہ کی عددی قوّت(Manpower) سے خائف ہوتے ہوئے تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) کی آڑ میں دشمنانِ اسلام کی مسلمانوں کے خلاف فیملی پلاننگ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے اور اس کی تاریخ کے ڈانڈے 1914ء سے پہلے کہیں نہیں ملتے۔ تاہم اسلام نے چند کڑی اور سخت شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے مثلاً یہ کہ اسقاطِ حمل(Abortion) کی اجازت اُس وقت تک ہے جب تک جنین میں روح نہ پڑی ہو۔ کچھ صحابہ کرام کا عزل (Withdrawal) پر عمل بھی اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے۔

قارئینِ کرام! چلتے چلتے آخر میں پھر وہی بات کہوں گا کہ راہِ ہدایت واہونے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کا پڑھنے والا اس کے ساتھ ایک قلبی اور روحانی تعلق قائم کرے اور جب تک وہ اس یقین کے ساتھ کتاب اللہ سے ربط قائم نہیں کرے گا کہ اللہ تعالیٰ خود براہِ راست اُسؔ سے ہم کلام اور اُس سے مخاطب ہے اور اس عزمِ صمیم کے ساتھ کہ اُسے پیغامِ الٰہی کو نہ صرف پڑھنا ہے بلکہ پڑھنے کے بعد اُسے سمجھنا اور اُس پر عمل بھی کرنا ہے' اُس وقت تک یہ کلامِ الٰہی اپنے دروازے کسی پر نہیں کھولے گا اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

تیرے ضمیر میں پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

بقول افتخار الدین راٹھور'' میں ٹکٹکی باندھے ایک حسرت زدہ آدمی کی طرح اِس بحرِ علم کو دیکھ رہا ہوں۔ ہاتفِ غیبی نے آواز دی کہ یوں دیکھنے سے تجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اگر لعل و گوہر تیری قسمت میں نہیں ہیں تو ساحل کی سوغات یعنی گھونگھوں اور سیپیوں کو ہی حاصل کرلے کہ اُنہیں بھی تو اُس بحر سے کچھ نسبت ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بحرِ علم کے سنگریزوں سے اپنا دامن بھر لیا اور گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں کے باوجود میں چند کلیوں پر ہی قناعت کر گیا۔''

قارئینِ کرام! علم و آگہی کے بحرِ موّاج کی کم مایہ اشیاء جنہیں حقیر نے اپنی بساط کے مطابق اور خالقِ لم یزل کی توفیق سے پندرہ سالہ عرق ریزی کے ساتھ اکٹھا کیا ہے' آپ کے سامنے ہے۔ ع گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف اگر ان کم مایہ چیزوں کے ساتھ کوئی موتی بھی چمٹا ہوا نظر آجائے تو اُسے میرے خالق و مالک کی فیضانِ نظر سمجھئے جس کے لئے میرا سراپا اُس کے حضور سربسجود ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ يُبَلِّغُنِیْ حُبَّكَ
اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَأَهْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدْ

۱۰ محرّم الحرام ۱۴۳۴ھ
25نومبر 2012ء

خاکپائے صالحین
آئی۔اے۔خان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
(انتہائی مہربان اور رحمت فرمانے والے اللہ کے پاک نام سے)

(۳۴) معاشیات (ECONOMICS)

''معاشیات اُن انسانی کارکردگیوں کے اثرات کی باضابطہ تحقیق کا نام ہے جن کی تقسیم ان وسیع عنوانات کے تحت کی گئی ہے: پیدائشِ دولت' تبادلۂ دولت' تقسیمِ دولت اور صرفِ دولت۔'' (Grolier Academic Encyclopedia, Vol. 7, p. 47) USA 1967.

اسلامی معاشیات کے اصول: سورۃ القصص کی مندرجہ ذیل آیت (جس میں جناب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے ایک بہت بڑے مالدار ''قارون'' نامی شخص کی مادیت گزیدہ ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے) میں کچھ اصول بتائے گئے ہیں جو اسلام کی معاشیات کی رُوح کے عین مطابق ہیں :۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ○ (اَلْقَصَص : ۷۷)

''اور جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے' اُس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر اور دُنیا سے (بھی) اپنا حصّہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے' تو بھی (بندوں کے ساتھ) حُسنِ سلوک سے پیش آ اور روئے زمین پر فساد مت پھیلا' بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۲۸:۷۷)

اس آیت سے معاشیات کے مندرجہ ذیل اصول اخذ کئے گئے ہیں :۔

(۱) انسان کو دولت دینے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اگر کوئی شخص اس دولت کو اپنی ہنرمندی' قابلیت اور زورِ بازو کا نتیجہ سمجھتا ہے تو یہ اُس کی خام خیالی اور قارونی سوچ کی پیداوار ہے' جیسا کہ اُس نے کہا تھا: أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (اَلْقَصَص : ۷۸) یعنی مجھے یہ سب میرے علم و ہنر کی بدولت ملا ہے اور اس میں کسی کے احسان کی کیا بات اور اس میں کسی کا استحقاق کیسا؟ نہ میرے اوپر کوئی احسانِ غیبی اور نہ میری کمائی میں دوسروں کا حق ہے۔ عارفین نے کہا کہ علم وفضل' فن و ہنر کو اپنی جانب منسوب کرنا اور اپنا ذاتی کمال سمجھنا اور اُسے اللہ کا عطیہ نہ جاننا بھی اللہ کے غضب اور راندۂ درگاہ ہونے کی اصل جڑ ہے۔

(۲) انسان کو اُس دولت کا امین ہونے کی وجہ سے اُسے اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کرنا چاہئے یعنی اُسے فیّاضانہ طور پر خیرات' نیک کاموں اور اللہ اور اُس کے بندوں کی خدمت میں صَرف کرنا چاہئے تاکہ آخرت کا گھر رہنے کی بہترین جگہ بن جائے۔

(۳) کنجوسوں اور بخیلوں کی طرح اُسے اس زندگی کی جائز ضروریات کو بھولنا نہ چاہئے۔ اپنی محنت اور دیانتداری سے وہ جتنا ممکن ہو قانونی اور جائز ذرائع سے کمائے تاکہ وہ کمائی اُس کی ذات اور اُس کے سماج کے لئے ایک مفید اثاثہ بن جائے۔

(۴) اُسے اپنے بھائی بندوں کے حقوق ادا کرنے چاہئیں، مستحقوں اور ضرورتمندوں کی مدد کرے اور اپنی دولت کو اپنے خود غرض دنیاوی مقاصد کی خاطر مستحقین کو محروم رکھتے ہوئے سنبھال کے نہ رکھے۔

(۵) اسلام میں دولت کو نمائش اور عیش وعشرت کا ذریعہ نہیں سمجھا گیا۔ لہٰذا طاقت اور منصب کی بنیاد پر انسان کو اپنے غریب، خستہ حال بھائیوں پر ظلم وتشدّد کرنے، اُن کے حقوق کو غصب کرنے، ناجائز طور پر دولتمند بننے اور بدعنوانی کے کاموں سے بچنا چاہئے۔

(۶) اسلام یہ نہیں کہتا کہ ساری کی ساری دولت بندگانِ خدا میں تقسیم کردی جائے بلکہ اپنی حدود کے اندر رہ کر اپنی ذات کے بھی اور محروم القسمت افراد کے بھی حقوق پورے کئے جائیں، حقوقِ واجب کی ادائی پر توجہ کر کے اسی سرمایہ کو توشہِ آخرت بنا لینے پر اسلام زور دیتا ہے۔

(۷) وَلَاتَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ (روئے زمین پر فساد مت پھیلا) آج معاشیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہر سرمایہ پرست معاشی توازن کو بگاڑ کر دنیا میں کتنی تباہی اور بربادی کا باعث ہو سکتا ہے۔

مادیت پرستی انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ دولت کا خالق وہ خود ہے، لہٰذا وہ اُسے اپنی مرضی سے جیسے چاہے، خرچ کرنے یا اپنے مخصوص مفادات کی خاطر دوسروں کو شریک کئے بغیر اُسے سنبھال کر رکھنے میں آزاد ہے۔ یہ دونوں رویّے سماجی مفادات کے لئے نقصان دِہ ہیں۔

اس کے برعکس قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ کسی بھی شعبہِ حیات میں انسانی کوششیں خالقِ حقیقی کی مدد اور رہنمائی کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ جب تک اس پُر از خار، سخت محنت کی زندگی میں اللہ کی رہنمائی انسان کے شاملِ حال نہ ہو، وہ ایک قدم تک نہیں اٹھا سکتا بلکہ وہ دنیا میں رہ بھی نہیں سکتا۔ دراصل یہ اُس خالقِ حقیقی کا غیر مرئی ہاتھ ہی ہے جو زندگی کے پہیے کو بڑے آرام وسکون سے چلا رہا ہے۔ کائنات میں جو کچھ بھی ہے، سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے :۔

(۱) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰهِ یَرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ۝ (فاطر : ۳)

"اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسانات یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی بہم پہنچاتا ہو؟ اُس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، سوتم کہاں اُلٹے چلے جارہے ہو؟" (۳۵:۳)

(۲) اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّکُمۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اِنِ الۡکٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ۝ اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُکُمۡ اِنۡ اَمۡسَکَ رِزۡقَهٗ بَلۡ لَّجُّوۡا فِیۡ عُتُوٍّ وَّنُفُوۡرٍ۝ (الملک : ۲۰، ۲۱)

’’بھلا (خدائے) رحمٰن کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کر سکے؟ کافر تو بڑے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ بھلا وہ کون ہے جو تمہیں روزی پہنچا سکے اگر اللہ اپنی (طرف سے) روزی بند کر لے؟ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ سرکشی اور نفرت میں جمے ہوئے ہیں۔‘‘ (۲۰، ۲۱ : ۶۷)

اسلامی معاشیات کی وسعت اور گہرائی : مندرجہ ذیل قرآنی آیات ہماری توجہ کو محروم القسمت، مفلس و کنگال، یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی زبوں حالی کی طرف مبذول کرتی ہیں اور اُن کی معاشرتی اور اقتصادی رفعت (فلاح و بہبود) کا مربوط پروگرام پیش کرتی ہیں:۔

(۱) وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ
’’(نیکی تو اس میں ہے کہ) اللہ کی محبت میں مال قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، راہ گیروں اور سائلوں پر اور گردنوں کے آزاد کرانے میں صَرف کرے۔‘‘ (۲: ۱۷۷)

(۲) يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝ (البقرۃ : ۲۱۵)
(اے پیغمبر!) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ فرما دیجئے کہ جو کچھ تمہیں مال میں سے خرچ کرنا ہے، سو وہ والدین، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے اور جو بھی تم نیکی کرو گے، اللہ کو اُس کا پورا علم رہتا ہے۔‘‘ (۲۱۵ : ۲)

(۳) لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝ (البقرۃ : ۲۷۳)
’’(اصل) حق اُن حاجتمندوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں، ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے، ناواقف اُنہیں احتیاطِ سوال کے باعث غنی خیال کرتا ہے، آپ اُنہیں اُن کے چہرہ بُشرہ ہی سے پہچان لیں گے، وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو، اللہ اُس کا خوب جاننے والا ہے۔‘‘ (۲۷۳ : ۲)

(۴) وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ (التوبۃ : ۳۴، ۳۵)

''اور جولوگ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' آپ اُنہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے ۔ یہ اُس دن (واقع ہوگا) جبکہ اُس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا' پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں کو' اُن کے پہلوؤں کو اور اُن کی پشتوں کو داغا جائے گا' یہی وہ ہے جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے' سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔'' (۹: ۳۴'۳۵)

(۵) وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ○ (اَلذّٰرِیٰت : ۱۹)
''اور اُن کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق رہتا ہے۔'' (۵۱ : ۱۹)

(۶) مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (اَلۡحشر : ۷)
''جو کچھ اللہ اپنے رسول کو (دوسری) بستیوں والوں سے بطور فَے دلوا دے' سو وہ اللہ کا' رسول کا' (رسول کے) عزیزوں کا' یتیموں کا' مسکینوں کا اور مسافروں کا حق ہے تا کہ وہ (مالِ فَے) تمہارے تونگروں ہی کے قبضہ میں نہ رہ جائے۔'' (۵۹ : ۷)

محققین نے یہ لکھا ہے کہ آیت میں صراحت کے ساتھ اگر چہ صرف فَے * کا ذکر ہے لیکن اس سے یہ استنباط بھی ہوتا ہے کہ اسلام بالعموم اِسی سرمایہ داری (Capitalism) یا سرمایہ کے اجتماع و مرکزیت کے حق میں نہیں ہے۔

یہ اور اِس قسم کی دوسری آیات مسلمان معاشرے کی اقتصادی تنظیمِ نو کے لئے عظیم منصوبے (Master Plan) کے ایک حصّہ کی بالکل نئی بنیاد پر تشکیل کرتی ہیں اور وہ یہ کہ طاقت اور منصب' معاشرے میں مقام اور عزت کو دولت کی ملکیت سے نہیں جوڑا جائے گا بلکہ اُن کی قدر ذاتی خوبی کی بناء پر ہوگی۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ میں عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے بالعموم اور معاشرے کے محروم القسمت لوگوں کے لئے بالخصوص اِس نظام کو اپنی مثال کے ذریعے اور وہ سب کچھ قربان کرنے کے ذریعے جو آپ کے بس میں تھا' متعارف کرایا اور ایسا کرنے میں آپ نے یہ بتا دیا کہ صحیح انقلاب ہمیشہ قائد (رہنما) کی ذات سے شروع ہونا چاہئے۔ آپ نے اپنے دوستوں اور دشمنوں سے بڑھ کر بھوک اور فاقہ برداشت کیا۔ آپ کی غریبانہ اقتصادی حالت کسی مجبوری یا پابندی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ یہ اختیاری تھی کیونکہ آپ اُس وقت مملکتِ مدینہ کے حاکم اور خود مختار سربراہ تھے جس کے وسائل آپ کو شاہانہ زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھے۔ غذا اور تعیش کے تمام وسائل آپ کے قدموں میں تھے لیکن آپ حاصل شدہ تمام اشیاء کو یتیموں اور ضرورتمندوں میں تقسیم فرما دیتے اور آپ کے پاس اپنی

* یہ وہ مال ہوتا ہے جو دشمن سے جنگ کئے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے' جبکہ وہ مال جو دشمن سے جنگ کے بعد ہاتھ آئے' مالِ غنیمت کہلاتا ہے۔

بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بھی کچھ باقی نہ بچتا تھا۔آپ دن بھر میں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کھانا پسند نہیں کرتے تھے جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو جاتا کہ معاشرے کے ہر فرد کو دو وقت کا پیٹ بھر کھانا میسر ہے۔اگر آپ پیٹ بھر کر کھانا پسند فرما لیتے تو لاکھوں کروڑوں بھوکے' ننگے لوگوں کے لئے آپ کی ذاتِ اقدس انسانِ کامل اور اَخلاقِ حسنہ کا نمونہ کیسے بنتی جس کے مطابق اُنہوں نے اپنی زندگی کو ڈھالنا تھا۔آپ کو اُس کردار کے نبھانے کا بخوبی علم تھا جس کی خاطر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو منتخب فرمایا تھا (بحوالہ سورۃ الاحزاب:۲۱ ؛ سورۃ القلم:۴) اور اسی وجہ سے آپ اکثر کئی کئی دنوں کا فاقہ برداشت کرتے تھے۔بعض اوقات آپ کا چولہا کئی دنوں تک نہیں جلتا تھا کیونکہ پکنے کے لئے گھر میں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا' لہٰذا آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کو کھجوروں اور پانی پر قناعت کرنا پڑتی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کی چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی اِسی طرح فاقہ کشی کرتی تھیں۔اناج پیسنے کی وجہ سے اُن کے ہاتھوں پر چھالے اور مشکیزہ میں پانی بھر بھر کر لانے کی وجہ سے اُن کے کندھوں پر نشان پڑ گئے تھے۔ایک مرتبہ اُنہوں نے اپنے والدِ محترم یعنی رسول اللہ ﷺ سے اُن غلاموں میں سے جو اُن کے پاس بطور قیدی لائے گئے تھے' ایک غلام دیئے جانے کی درخواست کی لیکن آپ نے اپنی بیٹی کی ضرورت پوری کرنے سے معذرت کی کیونکہ بیٹی سے زیادہ اصحابِ صُفّہ کو اس کی ضرورت تھی۔آپ نے اپنی بیٹی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''فاطمہ! اللہ کا خوف رکھو' اپنے رب کے حقوق کو ادا کرو اور اپنی خانہ داری کے کام میں مصروف رہو۔جس قسم کی یہ زندگی تم بسر کر رہی ہو' وہ غلام رکھنے سے کہیں بہتر ہے۔''

نبی اکرم ﷺ انسان کے خود قائم کردہ عزت و وقار' خود نمائی اور منصب کے معیار کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے۔اپنے گھر میں وہ ہر کام خود اپنے ہی ہاتھ سے کرتے تھے۔کردار کی سادگی کی اِس روشن حقیقت کی طرف باسورتھ سمتھ (Bosworth Smith) کا کہنا ہے:

''اپنے سفرِ حیات کے آخر تک آپ نے اُس انکساری اور سادگی کو قائم رکھا جو آپ کی جبینِ کردار کا حسین و جمیل جھومر ہے۔جیسا کہ یہ مشہور ہے کہ طاقت و اختیار یقیناً انسان کے لئے آزمائش ہوا کرتی ہے۔یہ طاقت و اختیار آپ کے سامنے نئی جاذبیتوں اور نئی ناکامیوں کو پیدا کر سکتا تھا جن سے وہ صحرائی شاہزادہ بالکل آزاد تھا۔وہ شخص کتنا پُرمسرت ہے جو جہالت کی اتھاہ تاریکیوں میں رہتے ہوئے تختِ شاہی کو لات مارے اور ہر زہرِ ہلاہل کو زہر ہی کہے' صحیح معنوں میں ہر آزمائش پر پورا اترے' اور وہ انسان صرف اور صرف محمد ﷺ ہی تھے۔'' ("Muhammad & Muhammadanism" p.93) 1874 Edn.

کئی صفحات آگے چل کر اُسی جذبہ کے ساتھ (Bosworth Smith) یوں لکھتا ہے:

''آپ سربراہِ مملکت ہونے کے ساتھ ساتھ سربراہِ دین و مذہب بھی تھے۔ خود نمائی اور جاہ و حشمت کے سائے تک سے آپ کوسوں دُور تھے۔ آپ کی کوئی مستقل فوج نہیں تھی' کوئی جسمانی محافظ نہیں تھا' کوئی شاہی محل نہیں تھا' کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں تھا اور اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ اللہ کی تائید سے حکومت کر رہا ہے تو یہ صرف محمد ﷺ کے متعلق ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ آپ کے پاس وہ تمام تر قوت و طاقت تھی جس کے ظاہری اسباب نامعلوم تھے۔ آپ اعزازی القاب و خطابات' ظاہرداری کی رسموں' نا قابلِ التفات رواج اور آدابِ شاہی کی تفاخرانہ انکساری سے کہیں ماوراء اور بلند و بالا تھے۔ آپ حق و صداقت کے پیام بر ہونے پر جب قانع اور مطمئن تھے تو آپ کو جاہ و منصب کا لبادہ اوڑھنے کی ضرورت ہی کیا تھی! آپ کی نجی زندگی کی سادگی بھی آپ کی عوامی زندگی کی طرح تھی۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو زمین بھر کے خزانوں کی کنجیاں پیش کیں لیکن آپ نے اُنہیں قبول نہیں فرمایا۔'' (ایضاً ص ۲۳۷) اور عرض کیا کہ کیا میرے لئے یہ اعزاز کم ہے کہ ایک وقت کی تو مجھے دے تو دوسرے وقت کی تجھ سے مانگ کر کھاؤں!

اور فلپ۔کے۔ہٹی لکھتے ہیں :

''اپنی اعلیٰ شہرت اور ناموری کے عروج میں بھی محمد ﷺ نے۔۔اپنی گمنامی کے زمانہ کی طرح۔۔۔اُن کچے مکانات میں سادہ اور خود نمائی سے دُور زندگی بسر کی جو صحن کی طرف کھلنے والے چند قابلِ رسائی حجروں پر مشتمل تھے۔ آپ اکثر اپنے کپڑوں کی اصلاح خود کرتے تھے اور لوگوں کے لئے ہمہ وقتی قابلِ رسائی تھے۔ اپنے پیچھے آپ نے کوئی بھی جائداد نہیں چھوڑی۔ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ' آپ کے روزمرّہ رویّہ نے ایسے دستور العمل کی بنا ڈالی جس پر آج تک لاکھوں لوگ شعوری طور عمل کرتے آئے ہیں۔ نسلِ انسانی کے کسی بھی گوشہ میں اگر کسی انسان کو ''انسانِ کامل'' کہا جا سکتا ہو' اُس کی اِس قدر باریک بینی سے پیروی نہیں کی گئی جس طرح محمد ﷺ کی کی گئی ہے۔'' ("History of the Arabs" p. 120)

ایک اور مستشرق John Davenport آپ کے کردار کی سادگی کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے :

''تمام تر سادگی کے ساتھ جو ایک عظیم ذہن کی فطرت ہوتا ہے' آپ نے ادنیٰ ترین کاموں کو خود انجام دیا۔ ملکِ عرب کا مقتدرِ اعلیٰ ہوتے ہوئے آپ اپنے جوتوں اور موٹے جھوٹے اونی کپڑوں کی خود مرمت کیا کرتے تھے' بکریوں بھیڑوں کا دودھ خود دوہتے تھے' چولھے کی خود صفائی کرتے اور خود آگ جلاتے تھے۔ کھجوریں اور پانی آپ کی عمومی غذا تھی اور دودھ اور شہد آپ کی ''عیشِ حیات'' تھے۔ دورانِ سفر آپ اپنے غلام کو بھی شریکِ طعام کرتے تھے۔ آپ کو شان و شوکت سے نفرت تھی اور اصولی طور پر انتہائی کفایت

پسند زندگی بسر کی' اگر چہ آپ تارک الدنیا نہیں تھے۔ انتہائی ادنیٰ کاموں کو آپ اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے تھے۔ آپ دین و اخلاق میں خالصتاً محتاط اور سادگی پسند (Puritan) تھے۔"
("An Apology for Muhammad and the Koran", p. 52)

نبی اکرم ﷺ کی اقتصادی اصلاحات

پیغمبر کی بعثت کا مقصد لوگوں کی تمام زندگی کو ہر قسم کی گندگی' بدی اور گناہ سے پاک و صاف کرنا اور اُنہیں عمدہ' مہذّب اور نیک بنانا ہوتا ہے۔ اِسی مقصد کے پیشِ نظر پیغمبر ہر وقت اپنی اُمّت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مستعد رہتا ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حصول میں جہاں کہیں رکاوٹ نظر آتی ہے' وہ اُسے دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں کہیں اُسے کوتاہی اور کمزوری نظر آتی ہے' وہ اُس کی اصلاح کرتا ہے۔ اُس کے تبلیغی مشن کا مقصد حیاتِ انسانی میں خلل ڈالنا یا ہنگامہ برپا کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ بنیادی مقصدِ حیات کے حاصل کرنے میں کارفرما عوامل خوش آئند طور پر کام کر رہے ہیں تا کہ انسان صحیح آزادی اور عدل و انصاف کے ساتھ امن و سلامتی کی پُرسکون زندگی گزارے۔

انسانی تجربہ بتاتا ہے کہ دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز (Concentration) نے ہمیشہ جبر و تشدّد کا مسئلہ کھڑا کیا ہے۔ حد درجہ جارحیت اور ایک فریق کا دوسرے فریق کے حقوق کو غصب کرنے کے نتیجہ میں چند ہاتھوں میں دولت کے اکٹھا ہونے نے انسانوں کے جمالیاتی نظم و تناسب اور ہم آہنگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں قرآن مجید نے اس روشن حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے :

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا٥

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اُس (بستی) کے عیش پرستوں کو احکام بھیجتے ہیں سو وہ اُن احکام کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں' پھر ہم اُس (بستی) کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں۔" (١٧ : ١٦) (تشریح کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۹۶۰' ۹۶۱ جلد دوم)

اِن غلط کاریوں اور حد درجہ بے انصافیوں کے ہوتے ہوئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکتے تھے اور جب اِن بدیوں کو کسی معاشرہ میں کھلی چھوٹ دے دی جائے تو اصولی طور پر "قدرتی انصاف" (Poetic Justice) (یعنی تسلی بخش صلہ جو انصاف کا تقاضا ہوتا ہے) حرکت میں آتا ہے۔ مختلف اوقات میں نبی معظم ﷺ نے اس ناپسندیدہ اقتصادی حالت کے مہیب نتائج کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا:

"کثرتِ دولت جہاں ایک طرف مسلمانوں کے ایمان و اخلاق کے لئے باعثِ خطرہ بن سکتی ہے' تو دوسری طرف مفلسی اور غربت اُنہیں کفر کی طرف لے جا سکتی ہے۔"

ایک مرتبہ آپ نے ایک آدمی کو چیتھڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھا۔ اُسے محروم القسمت دیکھتے ہوئے آپ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ آپ نے اپنے صحابہ سے محروم لوگوں کی مدد کرنے کو کہا اور جب اُن کے لئے خاصی رقم، سامان اور لباس اکٹھے ہو گئے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اس قدر خوش ہوئے کہ آپ کا چہرہ انور سونے کی طرح چمکنے لگا۔

آپ کا فرمان کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا (یعنی قریب ہے کہ فقر و افلاس کفر کی طرف لے جائے) انسانی احتیاجات کی تسکین کی اہمیت کا کھلا ثبوت ہے۔ دراصل غریب و کنگال کا کوئی دین و ایمان اور کوئی اخلاقی قدر نہیں ہوتی۔ اس لئے اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کیا ہے کیونکہ جب تک آدمی اپنی بنیادی اور لازمی ضروریات کی تسکین نہیں پاتا، وہ نہ تو اچھا شہری بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کے اخلاقی معیار اصلاح پذیر ہو سکتے ہیں۔ لاکھوں انسانوں کا لاتعداد دکھوں اور مصیبتوں کا جھیلنا اور چند ایک کا عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا خوشحال طبقے کی طرف سے قرآن مجید کی بتائی ہوئی راہ سے گریز ہے۔ وہ زندگی کے مادّی مشغلوں کے حاصل کرنے میں دیوانوں کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں اور اپنے خالق کے وضع کردہ ضابطہِ اخلاق کی اُنہیں ذرّہ بھر پروا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو قرآن کی زبان میں:

رِجَالٌ" لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ" وَّلَا بَيْعٌ" عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ٥ (اَلنور: ۳۷)

"(وہ ایسے) لوگ ہیں جنہیں نہ تجارت اور نہ خرید و فروخت اللہ کی یاد سے، نماز ادا کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل کرتی ہے، وہ ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔"

اس میں اُن کے کمالِ خشیت اور تقویٰ کا بیان ہے کہ باوجود پابندیِ احکام کے ہر وقت روزِ جزا سے ڈرتے رہتے ہیں۔

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رب تعالیٰ نے زندگی میں جمالیاتی نظم و تناسب کے قائم رکھنے کا حکم ان الفاظ میں دیا:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ٥ (بنی اسرائیل: ۲۸)

"اور اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ پابند رکھئے جو اپنے پالنہار کو صبح و شام محض اُس کی رضا جوئی کے لئے پکارتے رہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو اُن سے نہ ہٹایئے اور اُس شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اُس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔"
(۱۷:۲۸)

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے بہتر وہ ہے جو آخرت کی خاطر اِس دنیا کو چھوڑ نہیں دیتا اور آخرت کو اِس دنیا کی خاطر چھوڑ نہیں دیتا اور جو دوسروں پر بوجھ نہیں بنتا۔"

آپ نے ''جو دوسروں پر بوجھ نہ بنے'' میں واضح طور پر بتا دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو دوسروں پر انحصار کرتے ہوئے خود کوئی کام نہیں کرتے۔ آپ کی یہ نصیحت لوگوں کو کام کرنا سکھاتی ہے تاکہ وہ روزی اپنے ذاتی استعمال کے لئے بھی کمائیں اور دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: ''دنیا میں رہ کر اس طرح کام کرو گویا کہ تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور آخرت کے لئے اس طرح کام کرو گویا کہ کل تمہیں مرنا ہے۔''

اس حدیث میں منصفانہ اور معتدلانہ طرزِ زندگی کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ مادّی اور روحانی ضروریات کے مابین خوش آہنگی حاصل کی جا سکے کیونکہ مادّہ اور روح ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہونے کے لحاظ سے برابر کی اہمیت کے حامل ہیں جن میں سے کسی ایک کے بغیر زندگی ادھوری رہ جاتی ہے اور اس طرح اس قسم کی تعلیم آدمی کو درمیان کا راستہ اپنانا سکھاتی ہے جو زندگی کی انتہا پسندیوں سے دُور ہوتی ہے۔

یہ اُس اقتصادی نظام کی طرز ہے جس کی طرف قرآن اور سنتِ نبوی ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور جس پر چاروں خلفائے راشدین نے عمل کر کے دکھایا۔ پہلے خلیفہ راشد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کی حکمتِ عملی (Policy) کا یوں اعلان کیا:

''تم میں سے کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک کہ میں بہ توفیقِ الٰہی اُسے اُس کا جائز حق نہ دلوا دوں اور تم میں سے طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں بہ توفیقِ الٰہی اُس سے دوسروں کا حق لے کر حقداروں کو واپس نہ کرا دوں۔'' (''معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل''۔۔نعیم صدیقی' ص ۵۷) ۱۹۵۸

محولہ بالا حکمتِ عملی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام کے معاشی نظام میں معاشی ناہمواریوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس نظام میں زائد مال اُن لوگوں سے لے لیا جاتا ہے جو غیر منصفانہ اور ناجائز ذرائع سے اپنے جائز حق سے زیادہ لے لیتے ہیں جبکہ اُن لوگوں کو جنہیں اپنے جائز حق سے کم ملتا ہے' اُن کا جائز حق دیا جاتا ہے۔ اس طرح قانون کے آہنی پنجے کے ذریعے معاشرے میں اقتصادی انصاف اور خوش آہنگی قائم کئے جاتے ہیں۔

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی اقتصادی حکمتِ عملی کی بنیاد انصاف اور مساوات پر رکھی۔ خلافت سنبھالنے کے بعد آپ کا خطبہ کچھ اس طرح کا تھا:

''بخدا! میرے نزدیک تم میں سے کوئی بھی کمزور شخص سے زیادہ طاقتور نہیں ہے جب تک کہ میں اُس کا حق دوسروں سے نہ دلوا دوں اور تم میں کوئی بھی طاقتور شخص سے زیادہ کمزور نہیں ہے جب تک میں اُس سے دوسروں کے غصب کردہ حقوق لے کر حقداروں کو نہ دلوا دوں۔'' (''الفاروق۔۔۔عمرؓ از محمد حسین ہیکل بحوالہ ''معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل''۔۔نعیم صدیقی' صفحات ۵۷' ۷۶)

عمر فاروق رضی اللہ عنہ سماجی انصاف کے قائم کرنے میں اتنے سخت تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کہا: ''میں غاصب کا ایک رخسار زمین پر رکھوں گا اور اپنا پاؤں اُس کے دوسرے رخسار پر رکھوں گا اور پھر اُس سے وہ تمام کچھ وصول کروں گا جو اُس کے ذمّہ ہے۔'' (Encyclopaedia of Seerah, Vol. VIII, p. 671)

آپ کے اس بیان میں ہمیں یہ بات جتلائی گئی ہے کہ معاشرے کے تحفظ' اُس کی کامیابی اور خوشحالی کو اعتدال' خوش آہنگی اور انصاف کے ساتھ قریب کا تعلق ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتے پر مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :۔

''اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے نظام کو پسند نہیں کرتا جس میں عوام کی تمام ترجدّ وجُہد مادّی فلاح و بہبود کے حصول کے لئے ہو۔ دراصل اللہ نہ تو عیش وعشرت کی زندگی پسند کرتا ہے اور نہ ہی ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی کی زندگی۔ دونوں طرزوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پیغمبروں کو کہا گیا کہ وہ درمیانی راستہ اپنائیں تاکہ انسانی زندگی کے روحانی اور مادّی پہلو کے درمیان توازن قائم ہو سکے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ' ج ۱' ص ۱۰۴)

''یہ اسلام کا انتہائی اہم کارنامہ ہے کہ جہاں وہ آدمی کو اپنی مادّی زندگی کی اصلاح کرنا سکھاتا ہے وہاں اُس کی روحانی زندگی کی اصلاح کرنا بھی سکھاتا ہے۔ زندگی کا یہ اخلاقی تصوّرِ زندگی کے متضاد نظریات کے مابین ایک قابلِ عمل ذریعہ عطا کرتا ہے۔ ایک طرف تو اس کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے ہے تو دوسری طرف انسان کی ذمّہ داریوں پر زور دیتا ہے کہ جس طرح انسان خود کا ذمّہ دار ہے' اُسی طرح وہ اپنے کنبہ' رشتہ داروں' اپنی قوم بلکہ تمام عالمِ انسانیت کا بھی ذمّہ دار ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی دولت سے خود فائدہ اٹھاتا ہے' اُسی طرح دوسروں کو بھی اُس کی دولت سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔''

''اس طرح انسان کی خودغرضی کا رُخ بے غرض راہوں کی طرف موڑنے کے ذریعے اور مادیّت کو روحانیت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے ذریعے اسلام نے ایک انتہائی پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کا عملی حل تجویز کر دیا ہے۔ وہ انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی کے نظام کی بنیاد انصاف اور مساوات پر رکھتے ہوئے زندگی کے مادّی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے فائدہ اٹھائے۔ اس مقصد کو ایسے سادہ طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک فرد شعوری اور لاشعوری طور پر اقتصادی نظام کا مفید حصّہ بن جاتا ہے' اس میں پوری طرح ضم ہو جاتا ہے' سماج کے عمومی مفاد میں اپنا حصّہ ڈالتا ہے اور اُس سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔'' (Encyclopaedia of Seerah, Vol. VIII, pp. 671-672)

خلاصہِ کلام : اسلام کے معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

(1) اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں کوئی شخص مفلس و نادار نہ ہو کہ وہ دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی بسر

کرے۔اس ضمن میں حضور ﷺ نے فرمایا: (۱) كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا (قریب ہے کہ فقر و افلاس کفر کی طرف لے جائے) (۲) حضور ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّىٓ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ (اے اللہ! میں کفر سے، ناداری سے اور قرض کے غلبہ سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔)

(2) اسلام معاشرے میں تقسیم دولت کے اصول کا نفاذ چاہتا ہے جس کے بارے میں سورۂ الحشر کی آیت ہفتم میں ارشاد ہوا: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (تا کہ مال تمہارے تونگروں ہی کے قبضہ میں نہ رہ جائے) اور حضور علیہ السلام کے اس فرمان میں بھی دولت کی مساوی تقسیم کا اصول موجود ہے: صَدَقَةٌ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَاءِ هِمْ (زکوٰۃ ایک صدقہ ہے جو اُمراء سے لے کر غرباء کو دیا جاتا ہے)۔

(3) حُبِّ مال کی بیخ کنی: ضرورت مندوں کی ضروریات پوری نہ کرنے کا محرک صرف ایک ہی ہوسکتا ہے کہ انسان کو اللہ کی محبت سے بڑھ کر دولت سے محبت ہو جبکہ اللہ کی محبت کے ساتھ دولت و دنیا کی محبت جمع نہیں ہو سکتے۔مؤمن کی تربیت کی ضروری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی محبت کے سوا اپنے دل سے تمام محبتوں کو کلیتاً نکال دے۔اسی لئے سورہ آلِ عمران کی آیت ۹۲ میں ارشاد ہوا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تم نیکی ہرگز نہیں پاسکتے جب تک اپنے پسندیدہ مال (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو۔] جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کی کہ میرا ایک باغ ہے جو مجھے بہت عزیز ہے' میں اُسے اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کردو۔چنانچہ اُنہوں نے اُسے اپنے تین رشتہ داروں میں تقسیم کردیا۔(''قرآن اور علمِ جدید''۔۔ڈاکٹر محمد رفیع الدین' ص ۴۱۸)

(4) مال جمع کرنے (کنزِ مال) کی ممانعت: جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: (۱) وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (اَلتَّوبة: ۳۴' ۳۵)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' آپ اُنہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔یہ اُس دن (واقع ہوگا) جبکہ اُس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا' پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں کو' اُن کے پہلوؤں کو اور اُن کی پشتوں کو داغا جائے گا' یہی وہ ہے جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے' سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔'' (۹: ۳۴'۳۵)

(۲) وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝

''ہلاکت ہے ہر طعنہ زن' عیب جُو کے لئے جو مال جمع رکھتا ہے اور اُسے گن گن کے رکھتا ہے' وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ رہے گا۔'' (اَلْهُمَزَة: ۱ تا ۳)

(5) ذاتی ملکیت کا حق : دینِ اسلام کے مطابق ہر چیز کا مالک ربُّ العٰلمین ہے۔ اُس نے ذاتی ملکیت کا حق انسان کو عطا کیا ہے لیکن یہ حقِ ملکیت مطلق نہیں ہے بلکہ فرد کے حقِ ملکیت پر دوسرے افراد اور معاشرے کے مجموعی مفاد کی خاطر ضروری پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ہر فرد کے مال میں اُس کے قریبی عزیزوں، ہمسایوں، دوستوں، حاجتمندوں اور غریبوں کے حقوق کی رضا کارانہ ادائی پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً صدقہ، زکوٰۃ، وقف وغیرہ۔

(6) حصولِ رزقِ حلال اور اس کا استعمال : اسلام نے رزقِ حلال پر بہت زور دیا ہے اور اُسے اللہ کا فضل قرار دیا ہے (سورۃ الرّوم: ۲۳) اسلام اپنے ماننے والوں کو گداگر بن کر رہنے، دوسروں کے سامنے سوال کرنے اور محتاج رہنے کی مذمت کرتا ہے (سورۃ البقرۃ: ۲۷۳)، محنت کرنے والے کو اللہ کا دوست قرار دیتا ہے (اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ) ۔ دولت کمانے کے حلال ذرائع کو پسند کرتا ہے اور ناجائز ذرائع سے دولت کمانے اور خرچ کرنے کو حرام قرار دیتا ہے۔ چوری، رشوت، جوا، سود، دھوکہ دہی، نشہ آور اشیاء کی پیداوار اور خرید و فروخت حتّٰی کہ ایسی اشیاء کی نقل و حمل بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ اسی طرح مصوری، بت گری و بت فروشی، موسیقی، ذخیرہ اندوزی، کم ناپنا و تولنا، جھوٹی قسمیں کھا کر مال بیچنا، ڈاکہ زنی، مالک کی اجازت کے بغیر شے لینا اور خرید و فروخت کرنا وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ حرام مال سے پلے ہوئے جسم کی دعا بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔

(7) صَرفِ دولت میں اعتدال : اُمّتِ مسلمہ کو قرآن مجید نے اُمّتِ وَسط (اعتدال کی اُمّت) کہا ہے (سورۃ البقرۃ: ۱۴۳) اس لئے صرفِ دولت میں بھی قرآن نے میانہ روی پر زور دیتے ہوئے فرمایا ہے :

وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَ کَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًاo (اَلْفُرْقان : ۶۷)

"اور اللہ کے (اطاعت گزار) بندے وہی ہیں کہ جب وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی تنگی کرتے ہیں اور اس کے درمیان (اُن کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے۔" (۲۵:۶۷)

جس طرح حصولِ رزق کے لئے حلال ذرائع اپنانا ضروری ہے، اُسی طرح صرفِ دولت کے لئے بھی حلال طریقے اپنانا از حد ضروری ہے بلکہ جائز مقامات پر بھی اعتدال سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔

(8) گردشِ دولت پر زور : اسلامی نظامِ معیشت میں سب سے زیادہ زور دولت کی گردش پر دیا گیا ہے تا کہ دولت صرف اُمراء کے درمیان میں گردش نہ کرتی رہے (سورۃ الحشر: ۷) بلکہ دولت کا رُخ امراء سے غرباء کی طرف ہو جائے اور معاشرے کے تمام طبقات بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں۔

(9) دولت کی منصفانہ بنیادوں پر تقسیم : اسلام دولت کی تقسیم کو نہ تو افراد کے ہاتھوں میں کھلا چھوڑ کر طبقاتی تقسیم کی راہ کھولتا ہے اور نہ ہی مساوی تقسیمِ دولت کا قائل ہے، اس لئے کہ مساوی تقسیمِ دولت نہ تو ممکن ہے اور

نہ ہی محنت کی تقسیم کار کے تقاضے پورے کرتی ہے۔اس کے مقابلہ میں اسلامی معاشی نظام دولت کی منصفانہ بنیادوں پر تقسیم کو یقینی بناتا ہے۔

(10) معاشی آزادی : اسلامی معاشی نظام تمام افراد کے لئے رزق کی تلاش اور اُسے حاصل کرنے کے یکساں مواقع کو یقینی بناتا ہے۔اجارہ داریوں کی ممانعت اور مختلف افراد کو رنگ و نسل، قبیلے یا کسی اور بنیاد پر خصوصی امتیازات کی ممانعت کرتا ہے۔اس آزادی پر ایک ہی رکاوٹ ہے اور وہ یہ کہ اس آزادی کا استعمال شریعت کی حدود کے اندر رہ کر کیا جائے۔

(11) اسلامی ریاست کا معاشی کردار : اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں نظامِ عبادات کی تشکیل و قیام کے بعد زکوٰۃ پر مبنی نظامِ معیشت کو قائم کرنا ہے۔وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے لوگوں کی تکالیف کو دُور کر کے اُن کی پریشانیوں کے خاتمہ پر زور دیتا ہے اور ریاست کے سربراہ کو عوام کی ضروریات کی تکمیل کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ایک حدیثِ نبوی کے مطابق: ''جس کا کوئی ولی (سرپرست) نہیں، سلطان اُس کا سرپرست ہے۔''

اس طرح ہر فرد کے لئے بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کو ریاست کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ان بنیادی ضروریات میں خوراک، لباس اور رہائش ہی شامل نہیں ہیں بلکہ تعلیم اور صحت کو بھی ہر فرد کا حق قرار دیا گیا ہے۔

(12) قیمتوں کی میکانیت : اسلامی معاشی نظام طلب و رسد کی قوتوں پر انحصار کرتا ہے جس سے قیمتیں متعیّن ہوتی ہیں اور یہ قیمتوں کا نظام معاشی سرگرمیوں کا رخ متعیّن کرتا ہے۔تاہم اسلامی معاشی نظام میں قیمتوں کے نظام کو کھلا نہیں چھوڑا گیا بلکہ اخلاقی نظام کے نفاذ کے ذریعے ایک نظم و ضبط میں جکڑا گیا ہے۔یہ اخلاقی اقدار انسان کی راہ کو کھوٹا ہونے اور غلط طور پر کمائی کرنے اور قیمتوں پر اثر انداز ہونے سے روکتی ہیں۔

(13) وسائل سے بھرپور استفادہ : اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کے فائدے کے لئے بے شمار وسائل پیدا کئے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ انسان فکر و عمل کی صلاحیتوں کو پورے طور پر استعمال میں لا کر ان وسائل کو اپنے اور دیگر انسانوں کے فائدے کے لئے استعمال میں لائے۔ترکِ دنیا اور دنیاوی لذت سے منہ موڑنا خدا ترسی نہیں ہے بلکہ اِسی دنیا کے اندر رہتے ہوئے علم و فنون کے حصول اور اس کے انسانی فلاح کے لئے استعمال پر زور دیا گیا ہے تاکہ نئی نئی ایجادات اور اختراعات کے ذریعے اس کی بھلائی کے لئے ان وسائل کو استعمال میں لایا جا سکے۔

اسلامی معاشی نظام اور نظامِ سرمایہ داری

(۱) تصوّرِ ملکیت : اسلام تمام وسائل کو خالقِ کائنات کی ملکیت قرار دیتا ہے اور انسانوں کو دئے گئے حق

ملکیت کو خدا کا عطیہ قرار دیتا ہے۔ چونکہ زمین پر انسان کو نائبِ خدا بنایا گیا ہے اس لئے نائب خدا (خلیفۃ اللہ فی الارض) ہونے کی حیثیت سے انسان کو بہت سی حدود کے ساتھ محدود کر دیا گیا ہے۔ اس طرح انسان اپنی ملکیتی اشیاء کو استعمال کرنے میں آزاد نہیں بلکہ چند حدود کا پابند قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ چیزوں کو اسلام اجتماعی ملکیت قرار دیتا ہے جن سے استفادہ ہر انسان کا حق ہے۔''

''اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں انسان کا حقِ ملکیت مطلق ہے اور اُس پر کوئی قدغن اور پابندی نہیں۔ انسان جیسے چاہے اپنے مال کو استعمال کرے اور جیسے چاہے اس میں اضافہ کرے۔ اسی لئے سود، دولت کا ارتکاز اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ مختلف برائیاں نظامِ سرمایہ داری میں کاروباری خوبیاں قرار پاتی ہیں۔''

(۲) سُودی نظام : نظامِ سرمایہ داری میں کاروبار کی بنیاد سودی نظام پر ہے جس کے نتیجہ میں دولت چند ہاتھوں میں سکڑ کے رہ جاتی ہے، معاشی اجارہ داریاں وجود میں آتی ہیں جو بڑھتے بڑھتے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی شکل میں دنیا بھر میں پھیل کر معاشی استحصال کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس پورے جال کو پھیلانے میں سُود اُن کی مدد کرتا ہے۔''

''اس کے برعکس اسلام سودی لین دین کی پُرزور مذمت کرتا ہے اور اس کا لین دین کرنے والوں کے خلاف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے جنگ کا اعلان کرتا ہے اور وہ سُود کو ظلم قرار دیتا ہے۔'' (بحوالہ سورۃ البقرۃ : ۲۷۹)

(۳) دولت کی تقسیم : سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کا سارا زور پیدائشِ دولت پر ہے۔ اس نظام میں دولت کی تقسیم کا کوئی مربوط طریق کار نہیں ہے جس کی وجہ سے دولت کا ارتکاز چند افراد اور چند خاندانوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ امیر طبقہ امیر تر اور غریب طبقہ غریب تر ہوتا جاتا ہے اور یوں امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور معاشرہ، طبقۂ اُمراء اور طبقۂ غرباء میں تقسیم ہو کے رہ جاتا ہے۔''

''اس کے برعکس اسلام نے تقسیمِ دولت کے ضمن میں ایک مربوط نظام دیا ہے جس کے تحت اوّل تو عاملینِ پیدائش کے معاوضوں کی ادائیگی میں عدل و احسان کو پیشِ نظر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں دولت کے ارتکاز اور تقسیمِ دولت میں خرابی کے خاتمہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر دولت جمع ہوتی بھی ہے تو صدقہ اور خیرات کے رضاکارانہ شعبہ کا قیام اور زکوٰۃ کی فرضیت کے ذریعے، وراثت کے تقسیم کے احکام کے ذریعے، عید الفطر پر فطرانہ کی ادائیگی کے ذریعے، وقف اِداروں کے قیام کے ذریعے دولت کی تقسیم کی راہ ہموار کی جاتی ہے اور ارتکازِ دولت کے راستے بند کر دیئے جاتے ہیں۔۔''

(۴) دولت کمانے کے جائز ذرائع پر زور: نظامِ سرمایہ داری دولت کمانے کے ہر ذریعے کو جائز قرار

دیتا ہے۔اس کے لئے ہر اُس اِقدام کو ضروری قرار دیتا ہے جس سے منافع زیادہ سے زیادہ ہو سکے' خواہ وہ غلط اور گمراہ کن اشتہار بازی کے ذریعے ہو یا اشیاء پر اجارہ داریوں کے ذریعے ہو۔''

''اس کے بالمقابل اسلام رزق کمانے کی جدّ وجُہد کو حلال ذرائع کا پابند بناتا ہے اور ہر ایسے ذریعے کو ممنوع قرار دیتا ہے جو معاشرے کی اخلاقی حالت کو بگاڑنے کا سبب بنے یا عوام الناس کے استحصال کا ذریعہ بنے۔''

''(۵) معاشی نظام کی بنیادی قدریں : سرمایہ داری کے نظام کا ایک ہی اصول ہے کہ اپنے مال و دولت میں کیسے اضافہ ہو اور زیادہ سے زیادہ مال کیسے کمایا جائے جبکہ اسلام کے معاشی نظام کے بنیادی اصول تقویٰ و پرہیزگاری' احسان' اعتدال اور حلال و حرام کا جامع تصوّر ہیں۔''

''(۶) صَرفِ دولت (Consumption of Wealth): نظامِ سرمایہ داری میں مال کا مالک انسان بذاتِ خود ہوتا ہے اور وہ اپنے حق پر کسی ایسی پابندی کا قائل نہیں ہوتا جو اُسے اپنے مال کے استعمال سے روک سکے۔ اس کے برعکس صَرفِ دولت کے ضمن میں اسلام حلال و حرام میں تمیز کا حکم دیتا ہے' اِسراف کی ممانعت اور کنجوسی سے بچنے کا حکم دیتا ہے اور اس طرح اعتدال کی ترغیب دی جاتی ہے۔''

''(۷) اجارہ داریوں کا قیام : زیادہ سے زیادہ منافع کے لالچ میں سرمایہ دار مل کر معاشی اجارہ داریاں قائم کرتے ہیں اور اپنی مرضی کی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ اسلام معاشی اور ہر قسم کی اجارہ داریوں کا مخالف ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں عوام اور صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔''

سرمایہ دارانہ نظام بمقابل اسلام کا نظامِ زکوٰۃ : ''سرمایہ دارانہ نظام کام سے معذور لوگوں کا یا اُن لوگوں کا جنہیں کام نہیں ملتا یا جنہیں اپنی محنت سے کم مزدوری ملتی ہے' حق تسلیم نہیں کرتا۔ نہ ہی وہ اُمراء کی دولت میں اُن کا کوئی حق مانتا ہے اور نہ ہی اُن کی ضروریات کی فراہمی کی ذمّہ دار حکومت کو مانتا ہے۔ اس (سرمایہ دارانہ) نظام میں امیر محسنوں کی جانب سے غریبوں اور ناداروں کو عطا کردہ روٹی کے چُورا چُورا ٹکڑے ہی کافی سمجھے جاتے ہیں۔''

''سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے مشتہرین یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کو جدّ وجُہد اور کسبِ معاش کی آزادی دینے کے بعد ریاست اور معاشرے کا فرض پورا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بیماری یا بڑھاپے یا اپاہج ہونے کی وجہ سے کما سکنے کے قابل نہیں یا اُس پر کام کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور اُسے روزی کمانے کا کوئی بھی موقع میسّر نہیں' یا اُس کے اہل وعیال اُس پر بوجھ ہیں اور معاشی ذمّہ داریاں اُس کی آمدنی سے بڑھ گئی ہیں' تو نہ ہی ریاست' نہ ہی معاشرہ اور نہ ہی وہاں کے امراء اُس کی بھوک' لباس اور بیماری کے ذمّہ دار ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے یہی بات کافی ہے

کہ معاشرہ میں کچھ رحمدل انسان ہوں جو اُن سے ہمدردی کریں اور اُن کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں' وگرنہ سرمایہ دارانہ سوچ کے مطابق ایسے لوگوں کی قسمت یہی تھی اور اس لئے اُنہیں اپنی خستہ حالی اور بدنصیبی کو کوسنا چاہئے اور زندگی کے باقی ماندہ دن صبر وقناعت سے گزارنے چاہئیں۔''

''سرمایہ دارانہ معاشروں میں قسمت کے ماروں' غریبوں' اپاہجوں یا ضرورتمندوں پر رحم گستری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس لئے اُن نادیدنی حالات میں جنہیں دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا' نوجوان لڑکوں اور عورتوں کو کارخانوں اور تجارتی اداروں میں کام کرتے ہوئے دیکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشروں کے ہاں دو متبادل طریقے ہیں' تیسرا کوئی نہیں : یا تو غریب و نادار بھوک کی شدت' ننگے ہونے کی تکلیف یا رہائش کی محرومی کی وجہ سے مرجائے' یا وہ اُن سرمایہ دار وحشی درندوں کی چاکری کرے جن کے دلوں سے ہمدردی' رحمدلی اور خدا ترسی کے جذبات کا جنازہ نکل چکا ہے اور جو پتھر سے بھی زیادہ سنگدل ہو گئے ہیں۔''

''جب سرمایہ دارانہ نظام اپنی تندی' سختی اور بے انصافی میں عروج پر پہنچ گیا تو اُس نے سماجی بیمہ اور معاشرتی تحفظ کو اپنایا اور اِن دونوں طریقوں کو غربت کے مسئلے کے حل کے طور اور معاشرتی بے انصافی کے تشدّد میں نرمی کے طور پر متعارف کرایا۔ جماعتی بیمہ اُسے دیا جاتا ہے جو اپنی ملازمت کے دوران اپنی معذوری اور بیماری کی صورت میں اپنی آمدنی میں سے کچھ قسط اپنے بیمہ کے مبادل کے طور پر ادا کرتا ہے۔اپنی حقیقی ضرورت کے قطع نظر وہ اپنی آمدنی میں سے ادا شدہ رقم کے تناسب سے وصول کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص زیادہ ادا کرتا ہے' بیمہ میں سے زیادہ وصول کرتا ہے۔ معاشرتی تحفظ کا مطلب یہ ہے کہ ریاست خود کچھ معذور لوگوں اور ضرورتمندوں کو مقررہ وقفوں سے امداد مہیا کرتی ہے۔ یہ امداد ایک فرد کی مستقل ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی اور بمشکل ہی زندہ رہنے کے امکان کو پہنچتی ہے۔''

''اِن تمام باتوں کا اسلام کے اقتصادی نظام سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ضرورت مند اور غریب و نادار کو وہ کچھ عطا کرتا ہے جو اُسے رہن سہن کی نچلی سطح سے اٹھا کر خوشحالی اور مُرفہ الحالی کے بلند معیار تک لے جاتا ہے اور اُسے اتنا دیتا ہے جس کے ذریعے ہمیشہ کی خود کفالت اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔''

''معاشرتی تحفظ کے نظام پر لکھنے والے کچھ مصنّفین کا دعویٰ ہے کہ غریب اور ضرورتمند کی امداد کی مشترکہ ذمہ داری جس سے ہم آج واقف ہیں' کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ یہ بالکل جھوٹا دعویٰ اور اسلام کی صداقت سے ناواقفیت ہے جو دراصل غریبوں اور ضرورتمندوں کو اُمراء کی دولت میں سے حصّہ دلانے کا پہلا مذہب ہے۔ زکوٰۃ جسے اللہ تعالیٰ نے امیروں پر فرض کیا' وہ واضح اور غیر مبہم رقم کی مقدار ہے جسے اسلامی ریاست اپنے مستفید ہونے والے اَفراد کے لئے لوگوں سے وصول کرتی ہے۔ اگر کوئی صاحبِ نصاب مسلمان زکوٰۃ کی ادائی

سے انکار کرتا ہے تو حکومت کو منکرینِ زکوٰۃ سے اُس وقت تک لڑنے کا حق حاصل ہے جب تک وہ زکوٰۃ دینا تسلیم نہ کرلیں۔اُمراء کی دولت میں غریبوں اور حاجتمندوں کا حصّہ اُن کے حق کے طور پر اُنہیں دینا قرآنی حکم ہے (سورۃ الانعام: ۱۴۱ ؛ سورۃ الذّٰریٰت: ۱۹ ؛ سورۃ المعارج : ۲۴، ۲۵) اور چودہ سو سال سے سنتِ نبوی سے ثابت ہے اور اس حقیقت کی تائید یقینی طور پر خلفائے راشدین، دیگر مسلمان حکمرانوں اور عاملینِ زکوٰۃ کے عمل سے ہوتی ہے۔لہٰذا اُن کینہ پرور اور جہلاء کے لئے یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ معاشرتی تحفظ کا یورپی نظام پہلا نظام ہے جس نے اُمراء کی دولت میں غریب و نادار کی امداد کی شق مقرر کی۔'' ("Islam and the Right to Social Security" ... Dr. Husain Hamid Hasan, pp. 8, 9)

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مثال میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انصاف، رحم دلی، خدا ترسی اور اسلام کی نرم دلی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال کے مختصر عرصہ میں اہلِ یمن کو فراوانیِ دولت کے درجے تک تحفظ فراہم کیا۔آپ کی خلافت کا تیسرا سال شروع ہونے پر یمن میں کوئی ایسا غریب، حاجتمند، مقروض یا مسافر نہیں تھا جو حضرت معاذؓ سے زکوٰۃ وصول کرتا۔حضرت معاذؓ نے پہلے سال جو زکوٰۃ وصول کی، اُس کے ۶۷ فیصد حصّہ سے لوگ مالدار ہو گئے اور یہ بات اس حقیقت کی مظہر ہے کہ حضرت عمر کی مالیاتی حکمتِ عملی کا مقصد ہی یہی تھا کہ غریب و نادار کو اتنی رقم دی جائے جو اُسے غربت سے نکال کر خوشحال بنادے اور ضرورتمندی سے نکال کر اپنی زندگی کے بیشتر حصّہ تک خود کفیل بنادے تاکہ اُسے زکوٰۃ لینے کی ضرورت ہی نہ رہے۔'' (ایضاً صفحہ ۴۹)

''تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہر زمانہ میں مسلم اُمّہ کی خوشحالی اور فارغ البالی کا سبب اُن کا قرآنی تعلیمات کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور اُن پر عمل کرنا رہا ہے جس کی بابت صاحبِ قرآن ﷺ نے فرمایا تھا:

''اگر کوئی ظالم و جابر حکمران قرآنی تعلیمات کو ترک کرتا ہے، اللہ اُسے پارہ پارہ کردے گا اور جو کوئی قرآن کے علاوہ کسی اور سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے، اللہ اُسے گمراہ کردے گا۔'' (ترمذی)

''دراصل اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اس بات کا ضامن ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔اس سے بڑھ کر یہ کہ اسلام مسلمان کو مستقبل کے تفکرات سے بچاتا ہے۔زکوٰۃ کا بنیادی سیدھا سادہ اصول یہ ہے : آج آپ خوشحال ہیں اس لئے (زکوٰۃ سے) دوسروں کی مدد کیجئے۔اگر کل آپ غریب ہو گئے تو لوگ آپ کی مدد کریں گے۔

''<u>اقتصادی مساوات کا مفہوم</u> : اِس سے مراد دولت کی ایسی تقسیم ہے جو ہر شخص کی اقتصادی ضروریات کے مساوی ہو۔اقتصادی مساوات سے مراد ایسی مساوات نہیں جس میں ہر فرد کے لئے دولت کی تقسیم نقدی یا جنس کے پیمانہ سے ناپ کر برابر کردی گئی ہو کیونکہ ایسی مساوات کا نتیجہ عدم مساوات ہو جائے گا۔بعض لوگوں کے پاس اُن

کی حیاتیاتی ضروریات سے بہت زیادہ بچے گا' بعض کے پاس کم اور بعض اپنی حیاتیاتی ضرورت کو بھی پورا نہ کر سکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی ضروریات ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ مثلاً عورت اور مرد کی ضروریات' جوان' بچے اور بوڑھے کی ضروریات' بیمار اور تندرست کی ضروریات' سرد اور گرم علاقوں کے رہنے والوں کی ضروریات الگ الگ ہیں۔ اگر کوئی شخص اقتصادی مساوات کے اس تصوّر کے لئے ''اقتصادی عدل'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے تو نام کا اختلاف اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اگر اقتصادی عدل سے مراد دولت کی ایسی تقسیم ہے جس کی رُو سے بعض افراد تو حد سے زیادہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کر لیں اور بعض اُن کی تکمیل سے بالکل محروم رہیں تو اسلام اُسے نہ عدل سمجھتا ہے اور نہ ہی اُسے پسند کرتا ہے۔'' (''قرآن اور علمِ جدید''۔۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین' ص ۴۱۰)

اسلام کا معاشی نظام بمقابلہ نظام اشتراکیت : سوشلزم' کیونزم کی نرم اصطلاح ہے۔ سوشلسٹ ارتقائی جبکہ کمیونسٹ انقلابی ہیں۔ اسلام اور اشتراکی نظامِ معیشت میں فرق کی تفصیل یوں ہے:۔

(۱) مذہب اور روحانیت : اشتراکی نظام میں اللہ' روح' اَخلاق اور مذہب کی کوئی جگہ نہیں جبکہ اسلام کے تمام تر سماجی اور اقتصادی نظام کی بنیاد ہی یہی ہیں۔

(۲) ذاتی ملکیت کا حق : اشتراکیت کا نظام ذاتی ملکیت کے حق کو تسلیم نہیں کرتا اور اس میں تمام اَملاک عوامی ملکیت ہوتی ہیں جبکہ اسلام نے ذاتی ملکیت کے حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی بھی ہے جس کے قرآنی دلائل اِسی ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کی جلد اوّل کے صفحہ ۱۴۴ پر ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

(۳) ''معاشی مساوات : اشتراکی نظام نجی ملکیت کو ختم کر کے تمام وسائل کو اجتماعی ملکیت قرار دیتا ہے اور تمام وسائل کی مساوی تقسیم کا دعویدار ہے جو قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ چونکہ تمام انسان یکساں صلاحیتوں کے مالک نہیں ہیں' اس لئے معاشرے میں مختلف افراد میں وسائل کی تقسیم بھی برابر نہیں ہے۔ یہ طبعی اور فطری فرق و تفاوت ہی وہ وجہ ہے جس سے کائنات کا نظام چل رہا ہے (بحوالہ سورۃ الزُّخرُف' آیت ۳۲)۔ اگر تمام انسان وسائلِ رزق میں برابر ہو جائیں تو کارخانہِ حیات کا چلنا ناممکن ہو جائے گا۔''

(۴) طبقہ دارانہ مسابقت : اشتراکیت نظام طبقہ داری جنگ کا حامی ہے جبکہ اسلام امن وسکون کا مذہب ہونے کے لحاظ سے اس کے خلاف ہے اور وہ سماجی انصاف کے حصول کے لئے اپنے افراد کے درمیان صلح وآشتی اور اخلاق ومحبت پیدا کرنا چاہتا ہے تا کہ انسانیت کی اعلیٰ ترین اخلاقی اَقدار کا حصول ممکن ہو سکے۔

(۵) جبر وتشدّد بالمقابل امن وآشتی : سوشلزم ہو یا کیونزم' ہر شکل میں جبر وتشدّد کا پہلو کارفرما نظر آتا ہے کیونکہ سوشلزم (اشتراکیت) کا مقصدِ وحید سماج کی فلاح و بہبود کی خاطر آدمی کی انفرادیت کو کچلنا ہے۔ اسی

لئے اشتراکیت اسلامی روح کے موافق نہیں ہے۔اسلام سماجی انصاف کا حامی ہے جس کا ثبوت نبی اکرم ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے وہ الفاظ ہیں جس میں آپ نے فرمایا:

''لوگو! تمہاری جانیں' تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تا قیامت اسی طرح ایک دوسرے کے لئے محترم ہیں جس طرح یہ دن' یہ مہینہ اور یہ جگہ تمہارے لئے محترم ہیں۔''

(۶) بنیادی فلسفہ حیات کا فرق : اشتراکیت کی بنیاد زندگی کے مادّی نظریہ پر ہے جس کے مطابق مادّی ضروریات ہی انسان کی اصل ضروریات ہیں اس لئے اشتراکیت کے نزدیک انسان کی مصروفیات کا محور اُن ضروریات کا حصول ہونا چاہئے۔چونکہ اشتراکی نظام میں آخرت اور وہاں کے محاسبہ کا کوئی تصوّر نہیں اس لئے اس نظام پر یہ مقولہ صادق آتا ہے ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس کے برعکس اسلام انسان کو زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ قرار دیتا ہے اور اُسے ایک ضابطہ حیات کا پابند کرتا ہے تاکہ وہ اِس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہو۔

(۷) معاشی اصول : نظام اشتراکیت کے اصول جامد اور غیر لچکدار ہیں۔اِن اصولوں سے انحراف کو نظامِ اشتراکیت سے غدّاری تصوّر کیا جاتا ہے۔اس کے برعکس اسلام کے اصول اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔وقت اور زمانے کی تبدیلیوں کے لئے حالات کے مطابق قرآن وسنت کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اجتہاد کی راہ کھلی چھوڑ دی گئی ہے۔

(۸) اجتماعی فلاح و بہبود : نظامِ اشتراکیت اجتماعی مفاد کے لئے ملکی وسائل کے خرچ کا دعویدار ہے تاکہ عام لوگوں کے حالاتِ زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔ جبکہ اس ضمن میں اسلام بنیادی ذمّہ داری ہر فرد پر ڈالتا ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق ضروریاتِ زندگی کو حاصل کرنے کی جدّوجُہد کرے اور ناکامی کی صورت میں معاشرہ اس ذمّہ داری کو قبول کرے اور جب معاشرہ بھی اپنی اس ذمّہ داری کو ادا کرنے کی کوئی صورت نہ نکال سکے تو ریاست کی ذمّہ داری ہے کہ وہ ہر فرد کے لئے رزق وروزی کا بندوبست کرے اور ہر فرد کے لئے ضروریاتِ زندگی کو یقینی بنائے۔''

(۹) ''جذبہ کار: نظامِ اشتراکیت میں نجی ملکیت کے خاتمہ سے افراد میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور صارفین کو اپنی پسند اور ذوق کی اشیاء نہیں ملتیں۔اس کے برعکس اسلام چونکہ نجی ملکیت کے حق کا قائل ہے اور انسان کو فکر وعمل اور ذریعہ معاش کی آزادی دیتا ہے (اگرچہ وہ اِس آزادی پر حلال وحرام کی کچھ قیود عائد کرتا ہے)۔حاصل شدہ منافع اور مال کو اپنی ذات اور دوسرے افرادِ معاشرہ پر خرچ کرنے سے اللہ کی خوشنودی کا وعدہِ جانفزا ملتا ہے جو انسان کے اندر کام کرنے کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔''

''(۱۰) سرمایہ داری کا خاتمہ : نظام اشتراکیت سرمایہ داری کو بزورِ بازو اور تصادم کے ذریعے ختم کرتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام دولت کمانے کے ناجائز ذرائع پر پابندی، زکوٰۃ، عُشر اور تقسیم دولت کے قانون کے نفاذ اور سُود کی مذمّت کے ذریعے سرمایہ داری کا قلع قمع کرتا ہے۔''

''اشتراکیت سماجی جبر وتشدد کی بدترین شکل ہے۔۔۔ایک معقول انسان اشتراکی نظام میں سماجی انصاف کی کیسے توقع کر سکتا ہے جبکہ وہ نظام لوگوں کی جائداد و زمین کو ہتھیا کر اُسے ریاستی ملکیت میں دے دے، صنعتی اداروں کو قومی تحویل میں لے لے اور تمام ملک کو ایک ایسے قیدی کیمپ میں تبدیل کر دے جس میں تنقید، درخواست گزاری، شکایات، نالش اور مساوات کے تمام دروازے مضبوطی سے بند کر دیے گئے ہوں۔ ایسے ملک میں سماجی انصاف کیسے قائم ہوسکتا ہے جس میں کوئی جماعت، کوئی تنظیم اور ایسی کوئی جلسہ گاہ اور مشاورت گاہ (Forum) نہ ہو جہاں لوگ باہم تبادلہ خیال کر سکیں، جہاں کوئی پریس نہ ہو جو رائے عامہ کی عکاسی کرے اور جہاں کوئی عدالت نہ ہو جہاں لوگوں کو انصاف مل سکے۔ کیا ایسے ملک میں سماجی انصاف کے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں جہاں جاسوسی کا وسیع جال اس حد تک پھیلا ہوا ہو کہ ہر شخص دوسرے پر مخبر اور جاسوس ہونے کا شک کرے، جہاں ایک شخص اپنے گھر کی تنہائیوں میں بھی ایک لفظ منہ سے نکالنے سے پہلے اپنے آس پاس یہ دیکھ لے کہ کہیں گھات میں بیٹھا ہوا، کوئی سننے والا سن تو نہیں رہا کہ وہ اس کی خبر حکومت تک پہنچا دے؟۔''
("Economic System of Islam" --- S. Maududi, pp. 107 - 109)

''اسلامی سوشلزم کا نعرہ محض فریب ہے : ہم ''اسلامی سوشلزم'' کے حامیوں کی توجہ ''اسلامی سوشلزم'' کی تاریخ کی طرف مبذول کرتے ہیں کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں پر کیسے کیسے وحشیانہ مظالم ڈھائے اور کس طرح اس کے ہاتھوں اسلامی اَقدار کو پامال کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں انتہائی ناگوار ہیں اور ہر دھڑکنے والا دل اُن خرابیوں کی تباہی و بربادی کا خواہاں ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ مزدور اور کسان کو آرام واطمینان صرف اُس کے دَر پر نصیب ہوگا جس نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور جو ہمیشہ غریبوں، محتاجوں کی فلاح وبہبود کے لئے فکرمند رہے۔''

''تلنے کی کڑاہی میں سے اُچھل کر دیدہ و دانستہ آگ میں کود پڑنا کوئی عقل و دانش کی بات تو نہیں ہے۔''
("Our Socio-Economic Order"--- Mufti Muhammad Taqi Usmani, p. 70)

مندرجہ بالا بحث کا لُبِّ لباب یہی ہے کہ اسلام نے اپنے سماجی نظام میں ''اقتصادی مساوات'' کو لانے کے نہ تو جھوٹے دعوے کئے اور نہ ہی اُن کی وکالت کی جبکہ اشتراکیت ''اقتصادی مساوات'' کو اپنا مثالی نمونہ سمجھتی ہے

(جسے اُس نے نہ اب تک حاصل کیا ہے اور نہ ہی آئندہ اس کے حصول کی اُمید ہے)۔ اسلام کی مساوات سماجی مساوات ہے جو اشتراکیت کی کبھی بھی تائید نہیں کرے گی۔

''متشدد سرمایہ دارانہ نظام یا مُلحِد کیمونزم میں سے کسی نے بھی غریب اور ضرورتمند کے لئے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ اسلامی نظام کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا مُلحِد سوشلزم اُن لوگوں کو امیر بنا سکا جن پر اس نظام کو لاگو کیا گیا' یا اُس نے اپنے لوگوں کو روٹی کے چورا چور ٹکڑے ہی دئے ہوں۔ محض زبانی دعاوی اور خالی خولی نعرے ہی ہر زمانے میں غنائی اور دل بہلاوے کی باتیں رہی ہیں۔''

چند متعلقہ اصطلاحات قرآنِ حکیم کی روشنی میں

(1) معاشی پیداوار کی شرح میں تیز رفتاری اور اضافہ (Acceleration): وعدۂ خداوندی ہے:۔

(۱) وَیٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِّدۡرَارًا وَّیَزِدۡکُمۡ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِیۡنَ٥ (ھُود : ۵۲)

''(ہود علیہ السلام نے کہا:) اے میری قوم! اپنے پروردگار سے اپنے گناہ معاف کراؤ' پھر اُس کی طرف متوجہ رہو' وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تمہیں (اور) قوت دے کر تمہاری قوت میں ترقی کرے گا اور مجرم بن کر رُوگردانی مت کرتے رہو۔'' (۵۲ : ۱۱)

''پھر اُس کی طرف متوجہ رہو' یعنی کانپتے ہوئے دل' اشکبار آنکھوں سے سراپا عجز و نیاز بن کر اُن کئے ہوئے گناہوں کی بخشش کی درخواست کرو اور آئندہ کے لئے اپنی تمام کوششوں' سوچوں اور اعمال کا قبلہ اُسی کو بنالو اور دل وجان سے اُس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ آیت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ طاعات کو راحتِ دنیوی میں بھی دخل ہے اور مشاہدہ بھی ہے کہ طاعت وحُسنِ عمل کا ثمرہ کبھی کبھی برکتوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کی پیروی سے غریب ومفلس ہونے کا تصوّر محض شیطانی وسوسہ ہے اور وعدۂ الٰہی پر عدمِ ایمان کا ثبوت ہے۔

(۲) فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا٥ یُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِّدۡرَارًا٥ وَّیُمۡدِدۡکُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِیۡنَ وَیَجۡعَلۡ لَّکُمۡ جَنّٰتٍ وَّیَجۡعَلۡ لَّکُمۡ اَنۡہٰرًا٥ (نوح : ۱۰ تا ۱۲)

''چنانچہ میں (نوح علیہ السلام) نے کہا: اپنے پروردگار سے معافی چاہو' بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر کثرت سے بارش بھیجے گا اور تمہارے مال واولاد میں ترقی دے گا' تمہارے لئے باغ لگا دے گا اور تمہارے لئے دریا بہا دے گا۔'' (۱۰ تا ۱۲ : ۷۱)

آخری آیت ۱۲' ایمان کی مادّی اور دنیوی برکتوں کے بارے میں نص ہے۔ ابنِ سبیح کہتے ہیں کہ امام حسن

بصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا اور اُس نے قحط سالی کی شکایت کی۔ آپ نے اُسے فرمایا کہ اللہ سے مغفرت طلب کرو۔ ایک اور آدمی آیا' اُس نے فاقہ کی شکایت کی' اُسے بھی یہی جواب دیا۔ تیسرا آدمی آیا' اُس نے اولادِ نرینہ کے لئے دعا کرنے کو کہا' اُسے بھی وہی جواب دیا۔ ایک اور آدمی نے آ کر عرض کیا کہ میرا باغ خشک ہوگیا' اُسے بھی وہی جواب دیا۔ ہم نے کہا کہ مختلف لوگوں نے مختلف درخواستیں پیش کیں اور آپ نے سب کا ایک ہی جواب دیا۔ حسن بصری نے کہا کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نوح میں ایسا فرمایا ہے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۳۷۶)

(2) کثرتِ مال و دولت (Affluence): مال و دولت کی فراوانی اکثر اوقات بدی' گمراہی' بغاوت اور سرکشی کی راہ دکھاتی ہے جیسا کہ قارون کی مثال سے ظاہر ہے :

(۱) اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ (اَلْقَصَص : ۷۶)

''قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا' سو اُس نے اُن کے خلاف گھمنڈ اختیار کیا اور ہم نے اُسے اِتنے خزانے دے رکھے تھے کہ اُس کی کنجیاں زور آوروں کی ایک جماعت کو گراں بار کر دیتی تھیں۔'' (۲۸ : ۷۶)

(۲) وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ (اَلشُّورٰی:۲۷)

''اور اللہ اگر اپنے بندوں کے لئے رزق فراخ کر دیتا تو وہ روئے زمین پر سرکشی کرنے لگتے' لیکن وہ جتنا چاہتا ہے' اندازِ (مناسب) سے اتارتا ہے۔'' (۴۲ : ۲۷)

''مال و دولت کی تقسیم میں مساوات کی خرابیاں : اِس آیت کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تمام لوگ رزق اور مال و دولت میں مساوی ہوتے تو نہ کوئی مزدور ہوتا' نہ مستری ہوتا' نہ کوئی کاریگر ہوتا' نہ انجینیئر ہوتا۔ انسان کے جسم کے تمام اعضاء مساوی نہیں ہیں۔ آنکھ کی جو قدر و قیمت ہے' وہ ایک انگلی کی نہیں ہے۔ سر کی جو قدر و قیمت ہے وہ ایک ہاتھ یا پاؤں کی نہیں ہے۔ خون شریانوں میں ہوتا ہے اور پیشاب مثانہ میں ہوتا ہے۔ اگر اس کا الٹ ہو جائے تو جسم کا نظام فاسد ہو جائے گا۔ تو جس طرح انسان کے اعضاء میں درجات کے اعتبار سے فرق ہے' اسی طرح انسانوں کے طبقات میں بھی فرق ہے۔ جس طرح ایک کار یا جہاز کے پرزے ایک درجہ کے نہیں ہوتے' اسی طرح انسانوں کے تمام طبقات بھی ایک درجے کے نہیں ہیں۔ سب انسانوں کا برابر کا رزق ہوتا تو معیشت' کارخانے اور کاروبار معطل ہو جاتے۔'' (تبیان القرآن -- علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۱۰' ص ۵۹۹)

مال و دولت اور علم و ہنر کی تقسیم میں عدمِ مساوات میں رب تعالیٰ کی ''گوناگوں حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ کسی کو غنی تو کسی کو فقیر کر دیا۔ کسی کو جسمانی صحت و توانائی بخش دی' تو کسی کو فنی مہارت اور کسی ہنر میں کمال عطا

فرمادیا۔ کسی کو اقلیم ادب وسخن کا سلطان بنا دیا تو کسی کو ریاضی اور سائنس کے دقیق اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی قابلیت بخش دی۔ کسی کو دولت دی تو کسی کو کاروباری اور انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا۔ (یہ سب اس لئے) تاکہ ملت کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اگر سب سائنسدان ہوتے تو تجربہ گاہوں میں تو رونق رہتی لیکن ہل کون چلاتا اور کارخانوں میں کام کون کرتا؟ اگر سب لوگ انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہوتے تو انتظام کس کا کرتے؟ اگر سارے شاعر ہوتے' خواہ وہ ترقی پسند شاعر ہی ہوتے تو ساری دنیا مجلسِ مشاعرہ تو بن جاتی لیکن کھانے پینے کے لئے منّ وسلویٰ کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے بعض لوگوں کو بعض اُمور میں فضیلت دی اور بعض کو دوسرے کاموں میں فوقیت بخشی تاکہ سب ایک دوسرے سے کام لے کر اس بزمِ ہستی کی رونق کا باعث بنیں۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔۔جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد ۴' صفحات ۴۱۲' ۴۱۳)

''<u>کشادگی رزق کی وجہ سے سرکشی کی وجوہات</u>: (۱) اگر اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو رزق میں مساوی کر دیتا تو بعض لوگ دوسروں کے محتاج نہ ہوتے۔ اِس سے اس جہان کا کاروبار چل نہیں سکتا تھا اور تجارت' صنعت وحرفت' کارخانے' تعمیرات اور افواج وغیرہ کا نظام جاری نہ رہ سکتا۔ (۲) اگر سب لوگ سرمایہ دار ہوتے تو زکوٰۃ' صدقہ اور فطرہ لینے والا کوئی نہ ہوتا اور لوگ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدارسِ دینیہ کی طرف رُخ نہ کرتے' کیونکہ علمِ دین حاصل کرنے والے زیادہ تر فقراء ہی ہوتے ہیں۔ (۳) انسان جب خوشحالی کو پائے گا تو وہ اپنی سرشت اور خلقتِ اصلیہ کی وجہ سے فخر اور تکبر کرے گا اور جب وہ تنگ دستی اور فقر وفاقہ میں مبتلا ہوگا تو اُس میں تواضع اور انکسار پیدا ہوگا۔

''اگر اس پر اعتراض کیا جائے کہ پھر چاہئے تھا کہ سب لوگ مفلس اور فقیر ہوتے تاکہ سب لوگ متواضع ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی وہ عبادات نہ ہوسکتیں جو مال ودولت پر موقوف ہیں۔ مثلاً لوگ حج اور عمرہ نہ کر سکتے' قربانی نہ کر سکتے' زکوٰۃ' صدقات' خیرات اور فطرہ وغیرہ ادا نہ کر سکتے۔ نصف ایمان صبر ہے اور نصف ایمان شکر ہے۔ تنگدست لوگ مال نہ ہونے پر صبر کرتے ہیں اور خوشحال لوگ مال ہونے کی وجہ سے شکر کرتے ہیں۔ پس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں میں فقر وفاقہ رکھا اور کچھ لوگوں میں مال ودولت رکھا۔'' (تبیان القرآن' ص ۶۰۱)

(3) <u>حرصِ مال وزر (Avarice)</u>:

وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ﴿﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿﴾ (ألفجر: ۱۹' ۲۰)

''اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی زیادہ محبت رکھتے ہو۔''

(۸۹: ۲۰ '۱۹)

مال کی محبت تو امرِ طبعی ہے البتہ اس محبت میں دوسروں کی حق تلفی کی نوبت کا آ جانا سرتا سر ممنوع ہے اور قرآن مجید میں بار بار گرفت اسی پر آئی ہے۔ دراصل مال کی یہ مجنونانہ لالچ ہی ہزاروں خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔ اگر لوگوں کے

دلوں سے اس کی یہ بے محابا محبت ختم ہو جائے تو جرائم کا دائرہ بہت محدود ہو جائے اور مظالم کی یہ شدت بھی باقی نہ رہے۔

جن لوگوں کا اپنے حق کے طور پر میراث میں کوئی حصّہ ملتا ہے' اُنہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ میراث بھی اللہ کی طرف سے ایک مقدس امانت ہے جسے اُنہیں اُن مقاصد و فرائض پر خرچ کرنا چاہئے جو اُنہیں ورثے میں ملے ہیں۔ اُنہیں اس بات کی کھلی چھٹی ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ کام چور بن کر یا اُسے اللّے تللّے کاموں میں یا عیاشی میں اُڑا دیں۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۶۱۲۳)

(4) ایزادیہ (غیر متوقع فائدہ Bonus) :

لَهُم مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ٥ (قٓ : ۳۵)

''اُن لوگوں کو وہاں (جنت میں) سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے
اور ہمارے پاس اور بھی زائد ہے۔'' (۳۵ : ۵۰)

''ابر کرم کی رم جھم ملاحظہ ہو۔ اپنی کرم نوازیوں کا ذکر جاری ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو سرفراز فرمائے گا۔ یعنی میری بخشش قلیل اور محدود نہیں ہوگی کہ جو کچھ وہ چاہیں گے' ہم اُنہیں اُتنا ہی دیں گے کیونکہ اُن کا دامنِ طلب بڑا وسیع کیوں نہ ہو' الطافِ خسروانہ کے سامنے وہ بھی تنگ ہے۔ اُن کا ظرفِ دل کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو' بحرِ کرم کے سامنے اُس کی کیا حقیقت ہے! فرمایا ہم صرف اُتنا ہی نہیں دیں گے جتنا وہ مانگیں گے اور جتنا وہ چاہیں گے وہ بھی دیں گے اور اس کے علاوہ ہمارے پاس اُن کے لئے اور بھی بہت کچھ موجود ہے۔ حضرت اَنس و جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس ''مزید'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کا دیدار ہے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۴' ص ۶۱۹)

(5) صدقات و خیرات کا ثواب ضرور ملے گا: اللہ تبارک و تعالیٰ دولت کا عطا کرنے والا ہے اور انسان اللہ کی طرف سے اُس دولت کا امین ہے۔ اللہ تعالیٰ خود تو کسی دولت کا محتاج نہیں ہے کہ اُس پر اُسے خرچ کیا جائے۔ شانِ استغناء اور صمدیّت اُس کا طغرائے امتیاز ہے۔ البتہ اُس نے مؤمنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی ضروریاتِ اصلیہ کی تسکین کے بعد اپنے مال کو اللہ کے مستحق اور مفلس و نادار لوگوں پر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے پر خرچ کریں۔ اس خرچ کرنے کی فضیلت کو یوں بیان کیا گیا ہے :-

(۱) مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَآءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ٥ (البقرۃ : ۲۶۱)

''جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں' اُن کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اُس سے سات بالیاں اُگیں' ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور اللہ جسے چاہے بڑھاتا رہتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا' بڑا علم والا ہے۔'' (۲۶۱ : ۲)

کیسی خوبصورت اور نادر مثال سے مال کو جس سے انسان کو طبعی اُنس و محبت ہوتی ہے' عطا کرنے والے کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ مؤمن اُس مال کو اپنا مال نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ امانت سمجھتا ہے' جسے وہ اُس کے مطالبہ پر بہ رضا و رغبت اُس کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس کے بدلہ میں وہ رحیم و کریم ایسے شخص کو توالی ہندسی (۱'۲'۳'۴'۵ وغیرہ Arithmetic Progression) سے نہیں بلکہ بڑھتے ہوئے اعداد جس میں ہر اگلا عدد اُسی نسبت سے بڑھے جس نسبت سے پچھلا عدد بڑھا تھا' جیسے ۱'۳'۹'۲۷'۸۱ (Geometric Progression کے حساب سے اجرِ خیر عطا فرمائے گا۔ اُسی قسم کا ابرِ کرم ذیل کی آیت میں برستا ہوا نظر آتا ہے:

(۲) وَمَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَتَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبۡوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَیۡنِۚ فَاِنۡ لَّمۡ یُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ "(البقرۃ:۲۶۵)

"اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنا مال رضائے الٰہی کی طلب میں اور اپنے نفس میں پختگی پیدا کرنے کی غرض سے خرچ کرتے رہتے ہیں' ایک باغ کی طرح ہے جو کسی ٹیلے پر واقع ہو اور اُس پر زور کا مینہ پڑا ہو پھر وہ دوگنا پھل لایا ہو اور اگر زور کا مینہ نہ بھی پڑے تو ہلکی پھوار ہی کافی ہے۔"

"نفسِ بشری کا خاصہ ہے کہ ہر عمل سے تکرار و عادت کے بعد اس عمل سے متعلق ایک پختہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے مزاحمت کی قوت مغلوب و ضعیف ہو جاتی ہے۔ تَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ میں نفسیاتِ بشری کی ایک گہری حقیقت بیان ہو رہی ہے۔ گناہ اور نافرمانی کی طرح ہر طاعت اور فرمانبرداری کا بھی خاصہ ہے کہ اطاعت والے اعمال کو کھینچتی ہے چنانچہ ہر عملِ صالح کے بعد نفس میں دوسرے اعمالِ صالح کے لئے آمادگی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ٹیلے پر کی ہوا قدرتاً لطیف اور بار آور ہوتی ہے۔ آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ جس طرح عملِ صالح سے حصولِ اجر مقصود ہوتا ہے' اُسی طرح اصلاحِ نفس بھی مقصود ہوتی ہے۔" (ماجدی)

(۳) اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡؕ وَیُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِكُمۡؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۝ (اَلۡبَقَرۃ: ۲۷۱)

"اگر تم صدقات کو ظاہر کر کے دو تو بھی اچھی بات ہے اور اگر انہیں چھپاؤ اور فقیروں کو دو تب تو وہ تمہارے حق میں اور بھی بہتر ہے اور اللہ تم سے تمہارے کچھ گناہ بھی دُور کر دے گا اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔" (۲۷۱ : ۲)

"عام اصول یہ ہے کہ صدقات و خیرات کو چھپا کر کیا جائے اور اُن کے اعلان کی اجازت خاص موقعوں پر ہے۔ مثلاً ایک شخص بھوک پیاس سے نڈھال یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ ہم قریب سے گزر رہے ہیں اور بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اُسے کھلا کر یا دوا دے کر کہنا چاہئے کہ از سرِ نو زندہ اُٹھا کھڑا کریں لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں ہماری اس خدمت کا شمار ریا و نمائش میں نہ ہو جائے' اُس کے پاس سے کتراتے اور خاموش

گزرتے چلے جاتے ہیں' یہ تقویٰ نہیں' عین معصیت اور انتہائی وہم پرستی ہوئی۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی تھی خواہ اس کے لئے اعلان بہ بانگِ دہل ہی کرنا پڑے۔'' (تفسیر ماجدی اُردو' صفحہ ۱۱۴؛ اَنگریزی ص ۴۴۔ اے)

(۴) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَایَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ لَایَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ" ٥ (البقرۃ : ۲۷۳)

"(اصل) حق اُن حاجتمندوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں' ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے' ناواقف اُنہیں احتیاطِ سوال کے باعث غنی خیال کرتا ہے' آپ اُنہیں اُن کے چہرہ بُشرہ ہی سے پہچان لیں گے' وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو' اللہ اُس کا خوب جاننے والا ہے۔''

اِحْصار (گھر جانے) میں بڑی گنجائش ہے۔ علماء نے فرمایا کہ آیت کے مصداق ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علومِ دین میں مصروف ہیں کہ علمِ دین میں جس مشغولی اور انہماک کی ضرورت ہے' اُس کے ساتھ اگر فکرِ معاش کی مصروفیت کو جمع کر لیا جائے تو علمِ دین کی خدمت ناتمام رہ جائے گی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ (۱) ممکن ہے کہ بلا امتیاز' ہر جہتی (Indiscriminate) خیرات کا ثواب نہ ہی ملے لہٰذا آدمی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مستحقین اور محروم القسمت لوگوں کو تلاش کر کے اُن کا حق اُنہیں دے۔ (۲) اِلْحاف (لگ لپٹ کر مانگنے کی عادت) بُری عادت ہے۔ (۳) اسلام میں گداگری کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

<u>زکوٰۃ و خیرات کی برکت سے متعلق ایک پیشین گوئی</u> : حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

تَصَدَّقُوْا فَاِنَّہٗ یَأْتِیْ عَلَیْکُمْ زَمَانٌ "یَمْشِیْ بِصَدَقَتِہٖ فَلَا یَجِدُ مَنْ یَّقْبَلُھَا فَیَقُوْلُ الرَّجُلُ : لَوْ جِئْتَ بِالْاَمْسِ لَقَبِلْتُ وَلٰکِنْ لَا حَاجَۃَ لِیْ بِھَا الْیَوْمَ

''صدقہ و خیرات کیا کرو' یقیناً تم پر ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب تم میں سے کوئی شخص اپنا صدقہ لئے پھرے گا اور اُسے قبول کرنے والا نہ پائے گا۔ وہ کہے گا: اگر کل تو آتا تو میں اُسے ضرور قبول کر لیتا' لیکن آج (حالات بدل چکے ہیں) مجھے اِس کی ضرورت نہیں۔''

(6) <u>گردشِ مال و زر</u> : سورۃ الحشر کی درج ذیل آیت ہفتم اسلام کے سماجی' اقتصادی نظام کی بنیاد ہے:

(۱) کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (اَلْحَشْر : ۷)

"تاکہ مال تمہارے تونگروں ہی کے قبضہ میں نہ رہ جائے۔''

''اسلام یہ چاہتا ہے کہ ملکی وسائل سکڑ کر ایک مخصوص طبقے میں مرتکز نہ ہو جائیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اُن کا

پھیلاؤ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو۔ اُس نے تمام ایسی پیش بندیاں کر دی ہیں جن سے سرمایہ سکڑنے کے عمل کو روکا جا سکتا ہے اور اُس کے دائرۂ اثر کو وسیع سے وسیع تر کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ پیش بندیاں جو سرمایہ کو سکڑنے سے روکتی ہیں' اُن پر ایک سرسری نظر ڈالتے جایئے:

''کسبِ معاش کے وسائل کو دو حصّوں میں بانٹ دیا گیا ہے: حلال اور حرام۔ حرام میں تمام ایسے وسائل ذکر کر دئے جن کے ذریعہ محنت کے بغیر' خطرات کا مقابلہ کئے بغیر بڑی آسانی سے دولت اُڑتی چلی آتی ہے۔ سود' جُوا' سٹّہ' ذخیرہ اندوزی' سمگلنگ' چور بازاری' رشوت کا شمار اِنہی حرام وسائل میں ہوتا ہے۔ بلاخوف تردید پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آج جس جگہ آپ کو دولت کی بے پناہ ریل پیل نظر آتی ہے' وہاں ان ممنوع وسائلِ معاش میں سے ایک آدھ کی کارفرمائی ضرور ہے۔ آج پاکستان میں بائیس خاندانوں کا رونا رویا جاتا ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات خود ہی بتائیں کہ اگر یہاں سود ممنوع ہوتا اور بڑے بڑے بینک آسان شرحِ سود پر اُنہیں قرض نہ دیتے تو کیا یہ بائیس خاندان سارے ملک کا سرمایہ سمیٹ سکتے تھے؟ سب کچھ لُٹا کر راہزن کو کوسنے دینے کی رسم اسلام کو پسند نہیں۔ وہ پہلے سے وہ راہ بند کر دیتا ہے جہاں سے راہزن کے داخلے کا امکان ہو۔''

''اگر پاکستان میں معاشی لوٹ مار کے ذرائع کو ختم کر دیا جائے تو چند ماہ میں آپ کو کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً کی برکتوں کا احساس ہونے لگے۔ حلال وسائل سے جو دولت کمائی جاتی ہے' وہ ضخامت میں اس قدر تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ پھر بھی اس کا بہاؤ فقراء اور عوام کی طرف کرنے کے لئے اسلام نے مؤثر تدابیر اختیار کی ہیں۔ زکوٰۃ' عُشر' صدقات اور ان کے علاوہ نظامِ وراثت' زندگی بھر کے اندوختہ کو اس طرح بانٹ دیتا ہے کہ مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور کسی پر گراں بھی نہیں گزرتا۔''

''الغرض یہ جملہ اسلامی نظامِ معاشیات کا ستون ہے۔ ہمارے ماہرین دیگر فرسودہ اور ناکارہ نظریات اپنانے کی بجائے اگر نیک نیتی سے اسلام کے نظامِ مالیات کو سمجھیں' پوری دیانتداری اور اخلاص سے اس کو عملی جامہ پہنائیں تو کیمونزم اور کیپٹلزم کے دو پاٹوں میں پستی ہوئی دنیا اُن کی ممنون ہوگی۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ جن ہاتھوں میں زمامِ اقتدار ہے' اُن کے دل نورِ ایمان سے خالی ہیں۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے جس ذوق اور یقین کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔ ضرورت صرف ایسے یقین کی ہے جو تمام مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہونے کی ہمت رکھتا ہو۔ ضرورت اُس ایمان کی ہے جس کے چراغ کو کوئی آندھی نہ بجھا سکے' جو گُھپ اندھیروں کو بقعۂ نور اور رشکِ صدطور بنانے کی اہلیت رکھتا ہو۔'' (ضیاء القرآن۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد ۵' ص ص ۱۷۱' ۱۷۲)

(۲) وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ o نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ o یَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ o

''ہلاکت ہے ہر طعنہ زن' عیب جُو کے لئے جو مال جمع رکھتا ہے اور اُسے گن گن کے رکھتا ہے' وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اُس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔'' (اَلْھُمَزَة: ۱ تا ۳)

مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں آخرت کے عذاب سے بچنے کا ایک عام اصول بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ اپنا مال وزر بندگانِ خدا کی فلاح و بہبود اور معاشی بہتری کے لئے خرچ کیا جائے اور اُنہیں اس طرح مالی پریشانیوں سے بچایا جائے جو اکثر اوقات محروم القسمت لوگوں کے لئے اخلاقی بے راہروی اور سنگین جرائم کا محرّک بنتی ہیں:۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ٥ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ٥ (اَللَّيل: ۱۷' ۱۸)

''اور وہ (جہنم سے) دُور رکھا جائے گا جو اپنا مال اپنے دل کو پاک کرنے کے لئے دیتا ہے۔'' (۹۲:۱۷'۱۸)

اپنے گناہوں کے کفارہ کی نیت سے بھی ضرورتمندوں اور مستحق افراد میں محض اللہ کی رضا جوئی کی خاطر مال کو خرچ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ صفحہ ۱۰۴۵ پر درج شدہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۱ سے ثابت ہے۔

گردشِ زر کے تسلسل کا ایک اور طریق اسلام کا قائم کردہ ''نظامِ میراث'' ہے۔ مسلمان متوفّٰی کا اثاثہ اور چھوڑا ہوا مال اُس کے ورثاء میں اُن کے قانونی اور شرعی حصہ کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے اور اگر متوفّٰی کا کوئی وارث نہیں ہے تو اُس کا متروکہ (چھوڑا ہوا) مال بیت المال میں جمع ہو جاتا ہے۔ اِن طریقوں سے اسلام نے مال و دولت کو صرف امیر طبقے میں مرتکز ہونے سے روک دیا ہے۔

(7) <u>طبقاتی کشمکش کا خاتمہ</u> : طبقاتی کشمکش خستہ حال اور خوشحال طبقے کے درمیان معاشی عدم موافقت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید کے اِس سبق کی رُو سے کہ خالق و رزّاق اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت کچھ بندوں کو زیادہ اور کچھ کو کم دولت سے نوازتا ہے' کسی قسم کی طبقاتی کشمکش اور ایک دوسرے سے دست بہ گریبان ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :۔

(۱) وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (اَلنِّسَآء: ۳۲)

''اور تم ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔'' (۴:۳۲)

(۲) اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ٥ (الاسراء: ۲۱)

''آپ دیکھئے تو سہی ہم نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور یقیناً آخرت درجات کے اعتبار سے بھی اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔'' (۲۱ : ۱۷)

یہ ایک پر دوسرے کی فضیلت' مال و جاہ' منصب و کمالات وغیرہ جیسے انعاماتِ دنیوی میں ہے۔ آخرت میں

باہمی فرقِ درجات تو اس سے ہزاروں گنا زیادہ نمایاں ہوگا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ترجیحات کی یہ حکمتِ عملی خوشحال اور خستہ حال دونوں طبقوں کے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۵ اور سورۃ التوبہ کی آیات ۵۵ اور ۸۵ میں بیان ہوا۔

(8) صَرفِ دولت (Consumption of Wealth): ''زندگی اگر منصفانہ اعتدال پر رہے تو یہ اُن معاشی بیماریوں کے لئے اَمرت کی حیثیت رکھتی ہے جو دولت کے غیر معقول استعمال کا نتیجہ بنتی ہیں۔ یہ نظریہ کہ ''صرفِ دولت جتنی زیادہ ہو' اُتنی ہی زیادہ وہ معاشی سرگرمیوں کا محرّک ہوتی ہے اور معیارِ زندگی بھی بہتر ہوتا ہے'' اُس بے اطمینانی کے مدِّ نظر تباہ کن ثابت ہوا ہے جو اُس نے معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک میں پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اس نظریہ نے امیر طبقے میں غریب کی جیب پر بوجھ بنتے ہوئے تعیشات کی زیادہ سے زیادہ حرص میں اضافہ کیا ہے اور اس طرح غریب و نادار طبقہ کی حالتِ زار کو اور زیادہ خراب کر دیا ہے۔ بنی نوعِ انسان کی حالت کو بہتر بنانے اور معیشت کی صحتمندانہ ترقی کے لئے صرفِ دولت کو اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق متوازن اور معقول ہونا چاہئے۔'' ("Economics and Islam"--- Dr. Muhammad Musleh-ud-Din, pp. 57, 58)

چنانچہ اسی توازن اور معقولیت کے مدِّ نظر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(۱) وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَلَاتُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ: ۱۹۵)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' (۲ : ۱۹۵)

بیانِ حقیقت یہ ہو رہا ہے کہ اگر افرادِ اُمّت نے بوقتِ ضرورت اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کیا تو اُس کا نتیجہ لازمی طور پر ساری اُمّت کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

(۲) وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ٥ (البقرۃ: ۲۷۲)

''اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو' سو اپنے لئے کرتے ہو اور تم اللہ کی رضا جوئی ہی کے لئے خرچ کرتے ہو اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو' سب تمہیں لوٹا دیا جائے گا اور تم پر (ذرّہ بھر) زیادتی نہیں کی جائے گی۔'' (۲ : ۲۷۲)

یعنی یہ مقصد ہر حاجتمند کی حاجت براری سے پورا ہو جاتا ہے' خواہ اُس کے عقائد کچھ بھی ہوں۔ ابتداء میں نبی اکرم ﷺ صدقات و خیرات مشرکین کو نہیں دیتے تھے تو وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ کے نازل ہونے پر آپ نے اُنہیں بھی صدقات و خیرات دینے شروع کئے (تفسیر ابن جریر)۔

(۳) وَفِیْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ٥ (ألذّٰرِیٰت : ۱۹)
''اور اُن کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق رہتا ہے۔'' (۱۹ : ۵۱)

(9) رائج الوقت سکہ (Currency): اصحاب کہف نے کچھ صدیوں بعد نیند سے اٹھنے کے بعد ایک دوسرے سے کہا:
فَابْعَثُوْا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ إِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ٥ (الْكَهْف : ۱۹)
''تو اب اپنے میں سے کسی کو یہ رقم دے کر شہر کی طرف بھیجو' سو وہ تحقیق کرے کہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے' پھر اُس میں سے کچھ کھانا تمہارے پاس لے آئے اور خوش تدبیری سے کام لے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔'' (۱۹ : ۱۸)

یہی سے یہ مسئلہ نکلا کہ (۱) جس طرح اصحابِ کہف نے کسی سے سوال کرنے کی بجائے کھانا قیمتاً خریدنا پسند کیا' دوسروں کو بھی چاہئے کہ ہمت بلند رکھیں اور لوگوں سے مانگنا ترک کر دیں۔ (۲) بعض نے أَزْكٰى طَعَامًا کی تفسیر لذیذ و نفیس کھانے سے بھی کی ہے اور اسی کی رُو سے بعض صوفیہ نے بعض دینی مصلحتوں سے لذیذ و نفیس کھانوں ہی کو پسند کیا ہے۔ (۳) محققین نے یہیں سے یہ استدلال کیا ہے کہ سفرِ ہجرت میں زادِ راہ ہمراہ لے لینا توکل کے خلاف نہیں (تفسیر کبیر و بیضاوی) (۴) اور اس صورت کا جواز بھی نکالا ہے کہ کئی انسان (مثلاً سفر میں) اپنے مشترک سرمایہ سے خریدیں اور اس میں سے سب کھائیں خواہ ایک کے کھانے کی مقدار دوسرے سے زیادہ ہو۔ (تفسیر ماجدی ص ۶۰۴ بحوالہ جصاص) (۵) آیت میں خرید و فروخت کے لئے کسی کو وکیل بنانے کا ثبوت ہے کہ اصحابِ کہف نے اپنے ایک ساتھی کو رائج الوقت سکہ دے کر کھانا خریدنے کے لئے بھیجا تھا۔ احادیث میں بھی اس کا ثبوت ہے (''تبیان القرآن'' جلد ہفتم' ص ۱۷)

(10) طلب (Demand): یوسف علیہ السلام کے بھائی اُن سے عرض کناں ہوئے:
يٰٓأَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ٥ (یوسف : ۸۸)
''اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو (بڑی) تکلیف پہنچ رہی ہے اور ہم یہ حقیر پونجی لے کر آئے ہیں' سو آپ ہمیں ہمارے لئے غلہ پوری ناپ سے دے دیجئے اور ہم سے رعایت کیجئے' بے شک اللہ رعایت کرنے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔'' (۸۸ : ۱۲)

اب یوسف علیہ السلام ہی عزیزِ مصر تھے اس لئے بھائیوں نے اُنہیں اِس خطاب سے پکارا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ حاجت کے وقت ایسی اضطراری اور عاجزی کا اظہار قدرتی ہوتا ہے اس لئے وہ جائز ہے اور اس سے حق تعالیٰ کی شکایت کا پہلو نہیں نکلتا (''احکام القرآن'' لجصاص)۔ اپنی پیش کردہ رقم کو حقیر و ناقص کہہ کر پیش کرنا عزیز پر اور

مزید اپنی محتاجی اور شدید ضرورت کا اظہار کرتا تھا۔ یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے مزاج سے خوب واقف تھے' اب جو اُن کا گدایانہ اور سائلانہ لہجہ دیکھا تو نہ رہا گیا' دل پگھل گیا' شفقتِ پیمبری تو غیروں تک کا دُکھ دیکھ نہیں سکتی چہ جائیکہ یہ تو اپنے بھائی تھے۔ ''صدقہ'' سے یہاں اُس کے اصطلاحی معنی مراد نہیں۔ کسی کے ساتھ معاملت میں بہت زیادہ رعایت برتنا مجازاً صدقہ ہی کے حکم میں داخل ہے۔ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ یعنی ہماری راشننگ (Rationing) میں کہیں کمی نہ کر دیجئے گا اور ہماری ضرورتوں کا لحاظ کر کے اللہ ہم پر رحم کیجئے گا۔

(11) عملِ فرسودگی (Depreciation): شکست وریخت اور توڑ پھوڑ کے اِس قدرتی عمل میں متعلقہ شے کی قدر و قیمت اور اَفادیت کم ہو جاتی ہے خواہ وہ شے جاندار ہو یا بے جان۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے :

(۱) إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتّٰى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَا أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ

''دراصل دنیا کی زندگی کا حال تو ایسا ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اُس سے زمین کی سبزی گنجان ہو کر نکلی جسے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین (پوری طرح) اپنی رونق پر پہنچ چکی اور اُس کی زیبائش ہو چکی اور اُس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب وہ اُس پر بالکل متصرف ہو چکے تو ہمارا حکم اُس پر (اچانک) رات کو یا دن کو آپڑا' سو ہم نے اُسے ایسا کاٹ کر رکھ دیا گویا وہ کل موجود ہی نہ تھی۔'' (سورہ یونس : ۲۴)

(۲) اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (الرُّوم : ۵۴)

''اور (وہی) اللہ ہے جس نے تمہیں (تمہاری) ناتوانی کی حالت میں پیدا کیا' پھر ناتوانی کے بعد توانائی عطا کی' پھر توانائی کے بعد ناتوانی اور بڑھاپا دیا' وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے۔'' (۳۰:۵۴)

(۳) وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (یٰسٓ : ۶۸)

''اور ہم جسے طویل عمر دیتے ہیں تو اُس کی طبعی قوتوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔'' (۳۶:۶۸)

(12) کسبِ معاش اور روزی (Earning & Livelihood): قانونِ اُلوہیت کی ہمہ گیری ملاحظہ ہو:

(۱) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○ (اَلْحِجر : ۲۰)

''اور ہم نے اُس (زمین) میں معاش کے سامان تمہارے لئے بھی بنائے اور اُن کے لئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔''

(۲) وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (اَلْقَصَص : ۷۳)

''اور یہ اُس کی رحمت ہی تو ہے کہ اُس نے تمہارے لئے رات اور دن بنا دئے کہ تم اُس میں آرام بھی کرو اور تا کہ اُس کی روزی بھی تلاش کرتے رہو اور تا کہ تم شکر کرتے رہو۔'' (۲۸:۷۳)

روزی کمانے کے دھندے کو رحمتِ الٰہی کے تحت میں لانا صاف اس امر کی دلیل ہے کہ معاشی مشغلے اسلام میں کتنی فضیلت کا درجہ رکھتے ہیں! یہ مشغلے حقیر و ذلیل نہیں بلکہ معزز و مکرم ہیں۔

(13) اقتصادی انصاف بمقابل اقتصادی مساوات : یہاں اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ اسلام اقتصادی انصاف کا حامی ہے نہ کہ اقتصادی مساوات کا۔ اقتصادی انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کا حق اُس کی اُس خدمت کے تناسب سے ملنا چاہئے جو اُس نے معاشرے کے لئے کی ہے اور یہ کہ کوئی شخص دوسرے کے حقوق کا استحصال نہ کرے۔ اقتصادی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ معاشی ذرائع پر تمام افراد کو برابر کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

تمام قرآن مجید میں اقتصادی عدمِ مساوات کو، جو ایک فطری اور قدرتی بات ہے، سماج میں سے خارج کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے تا کہ اُس کی جگہ ایسا نظام قائم کیا جائے جو معاشرہ کے ہر فرد کو معاشی ذرائع میں برابر کا حصّہ دے۔ اقتصادی عدمِ مساوات منشائے الٰہی ہے جس کی بنیاد اُس کی حکمتِ بالغہ ہے جیسا کہ کچھ انسانوں کو اعلیٰ دماغ، ذہانت، حسن و جمال، صحت اور اعلیٰ جسمانی قوّت سے نوازا گیا ہے۔ جب تک فطری صلاحیت کے فرق موجود ہیں، اُس وقت تک انفرادی آمدنی کے فرق بھی رہیں گے اور کوئی بھی سماجی نظام ان فرقوں کو ختم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ''اقتصادی مساوات'' کا نعرہ طبقاتی فرق کی بدترین قسم ہے جو کمیونزم کے ممالک میں لگایا جاتا ہے اور جو اقتصادی مساوات کے زبردست حامی ہیں۔

درجِ ذیل قرآنی آیات اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کے ''دولت اور جائداد کی مساویانہ تقسیم'' کے خیالی اور تصوّراتی نظریے کو مسترد کرتی ہیں :۔

(۱) وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (اَلنِّسَآء : ۳۲)

''اور ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔'' (۴:۳۲)

(۲) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ (الانعام : ۱۶۵)

''اور وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا اور تم میں سے ایک کے رُتبے دوسرے پر بلند کئے تا کہ تمہیں اُن چیزوں میں آزمائے جو اُس نے تمہیں دے رکھی ہیں۔'' (۱۶۵ : ۶)

رَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ سے مراد طبعی فرقِ مراتب سے ہے۔کوئی تندرست ہےتو کوئی بیمار' کوئی قوی وتوانا تو کوئی کمزور' کوئی حاکم کوئی محکوم' کوئی مرد کوئی عورت' کوئی زردار کوئی نادار (قرطبی)۔

(۳) وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ (اَلنَّحل : ۷۱)
''اور اللہ نے تم میں سے کسی کو کسی پر رزق کے معاملہ میں فضیلت دے رکھی ہے۔'' (۷۱ : ۱۶)

(۴) اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًاo(الاسراء)
''بے شک آپ کا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق بڑھا دیتا ہےاور تنگی بھی کر دیتا ہے۔
بے شک وہی اپنے بندوں کی خوب خبر رکھنے والا ہے۔'' (۳۰ : ۱۷)

(۵) نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَہُمْ مَّعِیْشَتَہُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَہُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُہُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا (اَلزُّخْرُف : ۳۲)
''ہم نے تو اُن کے درمیان اُن کی دنیوی زندگی میں اُن کی روزی تقسیم کر رکھی ہےاور ہم نے ایک کے درجے دوسرے سے بلند کر رکھے ہیں تا کہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔'' (۳۲ : ۴۳)

معلوم ہوا کہ (۱) معاشرہ میں فرقِ مراتب بالکل فطری وطبعی ہے۔کوئی دولتمند ہوگا تو کوئی نادار' کوئی افسر کوئی ماتحت۔ بے طبقات معاشرہ (Classless Society) کا لفظ ہی سرے سے بے معنی ہے یعنی بڑے چھوٹے کا فرق تو قائم رہے گا اور اسے قائم رہنا بھی چاہئے۔(۲) مال و دولت میں عدم مساوات فطری وطبعی ہے اور تقسیمِ دولت میں مساوات کا دعویٰ بجائے خود بے بنیاد اور خلافِ فطرت ہے۔فقہاء اور مفسرین نے آیت سے مالک اور غلام کے درمیان نفیِ مساوات صراحت کے ساتھ نکالی ہے۔(جصاص)

(14) سماجی انصاف اور اسلام کو اشتراکیت کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے : کچھ لوگ اپنی ناکام کوشش میں مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن مجید کا مقصد انسانوں میں مکمل اقتصادی مساوات کو قائم کرنا ہے جو بہرحال اشتراکیت کا دوسرا نام ہے:۔

(۱) وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِہِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ فَہُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ'' (اَلنَّحل : ۷۱)
''اور اللہ نے تم میں سے کسی کو کسی پر رزق کے معاملہ میں فضیلت دے رکھی ہے' سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے حصّہ کا مال اپنے غلاموں کو کبھی اس طرح دینے والے نہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں۔'' (۷۱ : ۱۶)

(۲) ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلاً مِّنْ أَنفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِي مَا رَزَقْنٰكُمْ فَأَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآء" تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ (الرُّوم : ۲۸)

"(اللہ) تمہارے ہی متعلق ایک مثال تم سے بیان کرتا ہے' کیا تمہارے غلاموں میں کوئی اُس روزی میں تمہارا شریک ہے جو ہم نے تمہیں دی ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر ہو جائیں اور تم اُن کا ایسا ہی خیال رکھو جیسا کہ تم اپنے آپس والوں کا خیال رکھتے ہو؟'' (۲۸ : ۳۰)

دراصل مندرجہ بالا دونوں آیات شرک کی مذمت میں نازل ہوئیں اور ان میں اقتصادی عدمِ مساوات کی بجائے ہمہ گیر اقتصادی مساوات کے قیام کا کوئی منصوبہ نہیں۔ آیات میں اس بات کا صاف اشارہ موجود ہے کہ چونکہ تم خود اپنے غلاموں کو اپنی دولت میں برابر کے شریک ماننے کے لئے تیار نہیں ہو تو تمہارا یہ مشرکانہ عقیدہ کتنا فضول اور غیر معقول ہے کہ اللہ کی کوئی مخلوق اُس کی اُلوہیت میں اُس کی شریک ہو سکتی ہے؟

اقتصادی مساوات کے علمبردار (یعنی اشتراکی) خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کی مثال بھی دیتے ہیں جنہوں نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے وہ قطعہِ زمین زبردستی واپس لے لیا تھا جو اُنہیں نبی اکرم ﷺ نے عطا کیا تھا۔ اس سے اُن کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر کا یہ عمل اشتراکیت کی طرف ایک قدم تھا لیکن یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ حقائق یہ ہیں کہ حضرت بلال اس موہوبہ زمین کو اپنے استعمال میں نہیں لائے تھے اور وہ کافی عرصہ تک بنجر' غیر مزروعہ پڑی رہی تھی۔ حضرت عمر کا اِقدام اسلامی اصول کے مطابق تھا جو ایسی زمینوں کو ریاست کے سپرد کرنے پر زور دیتا ہے جو تین سال تک غیر مستعمل پڑی رہیں اور آپ کا یہ عمل نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کے مطابق تھا:

''زمین اُس کی ہوتی ہے جو اُسے بارآور کرتا ہے یا کاشت کرتا ہے لیکن جو شخص اُسے تین سال تک استعمال کئے بغیر (یونہی) رکھ چھوڑتا ہے' اُس کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔'' (''کتاب الخراج''۔۔ابو یوسف ص ۳۵۰)

اشتراکی اپنی شدید ضد میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے منظورِ نظر صحابی ابوذر غِفاری رضی اللہ عنہ کی مثال بھی دیتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے عیاش' خود غرض بخیلوں اور غیر ذمہ دارشاہ خرچوں کے خلاف بغاوت میں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ جب تک تمام باشندوں کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو جاتیں' اُس وقت تک اُمراء کو دولت ذخیرہ کرنے یا پُرعیش زندگی بسر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ابوذر کے نزدیک اپنے ابنائے جنس کی پست ترین اور تکلیف دِہ غربت کے مدّنظر اُمراء کے لئے دولت کی ذخیرہ اندوزی اور اُسے سنبھال سنبھال کے رکھنا امانت میں خیانت کرنے سے بڑھ کر جرم تھا۔

ابوذر غِفاری رضی اللہ عنہ کو اشتراکی (سوشلسٹ) سمجھنا غلط بات ہے کیونکہ (۱) اُنہوں نے کبھی بھی انسان

کی انفرادیت کو دبانے کی تبلیغ نہیں کی۔ (۲) نہ ہی اُنہوں نے ذرائع پیداوار کے اجتماعی کنٹرول کی وکالت کی۔ (۳) نہ ہی وہ جائداد کی نجی ملکیت کے خلاف تھے بلکہ وہ اُمراء کے خلاف اُنہیں اُن کے سماجی فرائض کی یاددہانی کے لئے اُٹھے تھے۔اسی وجہ سے ابنِ حزم اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:۔

''اگر بیت المال یا ریاستی خزانہ کی آمدنی غریبوں' فقیروں کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے تو سربراہِ مملکت اُمراء کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ غریبوں کو ضروری کھانا اور ایسا لباس مہیا کریں جو اُنہیں گرمی کی حرارت اور سردیوں کی سردی سے محفوظ رکھ سکے اور ایک پناہ گاہ بھی مہیا کریں جو اُنہیں گرمی اور طوفانِ بادو باراں سے بچا سکے۔'' (''محلّہ''۔ابن حزم' جلد ششم' صفحہ ۱۵۶)

اور خلیفۃ المسلمین حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' نے فرمایا:۔
''اللہ تعالیٰ نے اُمراء کو اس بات کا مکلّف کیا ہے کہ وہ غریبوں کی ضروریات کو پورا کریں اور اگر غریب اُمراء کی غفلت کی وجہ سے بھوکے ننگے رہتے ہیں تو اُمراء کو اللہ تعالیٰ سخت سزا دیں گے۔'' (ایضاً ص ۱۵۸)

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:
''ریاستی خزانہ میں ہر مسلمان کا حق ہے خواہ وہ اُس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اُٹھائے۔''
(''کتاب الاموال'' لابی عُبید' صفحہ ۳۰۴)

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سوشلزم نہیں بلکہ سوشل سیکیورٹی (سماجی تحفظ) ہے جو سماجی انصاف کی ذیلی شاخ ہے۔ مزید برآں اب تک یہ بھی واضح ہو چکا ہوگا کہ اسلام دولت کی مساویانہ تقسیم کا حامی نہیں ہے بلکہ اس کی منصفانہ اور دیانتدارانہ تقسیم کا حامی ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تمام لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوں۔

''لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ اسلام اشتراکیت ہے۔ایسا نتیجہ نکالنے کی بڑی وجہ سوشلزم اور سماجی انصاف کے مابین فرق کا نہ سمجھنا ہے (''سماجی انصاف'' کو آئندہ صفحات میں زیرِ بحث لایا گیا ہے)۔''سوشلزم (اشتراکیت) کے نظریہ کی تمام تر بنیاد مادیّت ہے اور مادیت کے مطابق مادّہ کے سوا کسی چیز کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ ایسا نظریہ مکمل طور پر مذہب کی نفی کرتا ہے اور دراصل تشدّد پسند اِلحاد (اللہ کی ہستی کا انکار) ہے جس کی اسلام کسی بھی شکل میں پشت پناہی نہیں کر سکتا۔''

''یہاں ہم اُن چراگاہوں اور کھیتوں کا حوالہ دیتے ہیں جنہیں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے کہ اُنہیں نجی ملکیت کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ اور خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ نے قومی تحویل میں لے لیا تھا جبکہ وہ عام زمینیں تھیں اور کسی

خاص شخص کی ملکیت نہیں تھیں۔ اُن چراگاہوں میں سے اَلنّقی نامی چراگاہ کو جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر تھی' نبیِ اکرم ﷺ نے چراگاہ کا درجہ دیا تھا۔ ابو عُبَیدہ کی ''کتاب الاموال'' (صفحہ ۲۷۶) کے مطابق وہ ٹھہرے ہوئے پانی کے جوہڑ کی قسم ہوگئی تھی اور اُس پر گھاس اُگ آئی تھی اور اس طرح وہ جانوروں کے چرنے کے لئے رہ گئی تھی۔ دوسرا قطعہِ زمین جس کے چراگاہ ہونے کا اعلان عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا' ربضہ کے مقام پر تھا اور اس اعلان کے خلاف وہاں کے لوگوں نے احتجاج کرتے ہوئے حضرت عمرؓ سے رابطہ بھی کیا تھا اور خود کہا تھا کہ وہ عوامی زمین ہے۔'' ("Economics and Islam"" --- Dr. Muhammad Musleh-u-Din, p. 103)

(15) معاشی امانت : مال وزَر اور دولت کا عطا کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے اور اُس کی مدد کے بغیر انسان ایک پھوٹی کوڑی بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ انسان کو دولت عطا کر کے اللہ نے اُسے اُس دولت کا امین بنایا ہے بایں معنی کہ اُس کی ضروریاتِ اصلیہ سے جو مال باقی بچے' وہ معاشرہ کے مستحق اور ضرورتمند افراد کی امانت ہے۔ یہ وہ معاشی امانتداری ہے جس کے متعلق قرآن مجید نے یوں حکم دیا ہے:۔

(۱) وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللهِ الَّذِيٓ آتٰكُمْ (اَلنّور : ۳۳)

''اور اللہ کے مال میں سے اُنہیں بھی دو جو اُس نے تمہیں عطا کیا ہے۔'' (۳۳ : ۲۴)

(۲) وَفِيٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِo (اَلذّٰرِیٰت : ۱۹)

''اور اُن کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق رہتا ہے۔'' (۱۹ : ۵۱)

(۳) آمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ (اَلحَدید : ۹)

''اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اُس نے تمہیں دوسروں کا جانشین بنایا ہے' اُس میں سے خرچ کرو۔'' (۹ : ۵۷)

''مُسْتَخْلَفِینَ فِیهِ کے دو مفہوم بیان کئے گئے ہیں: ایک تو یہ کہ جو مال آج تمہارے قبضہ میں ہے' تم اُس کے حقیقی مالک نہیں ہو' اُس کا حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہے اور تم اُس کے نائب ہو۔ اب یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ مالک حکم دے اور نائب اُس کی بجا آوری میں پس وپیش کرے۔ لہٰذا اُس کے حکم پر بلا تامّل اُسے خرچ کیا کرو' تمہیں مفت میں اُس کی خوشنودی حاصل ہو جائے گی۔ اِس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے یہ مال و دولت کسی اور کے تصرّف میں تھے۔ وہ اُنہیں چھوڑ کر چلے گئے اور اب یہ چیزیں تمہارے قبضہ اور استعمال میں ہیں۔ تم نے بھی ایک دن یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ اُس وقت یہ چیزیں کسی اور کے استعمال میں چلی جائیں گی۔ جتنے عرصہ کے لئے تمہیں اِن کا مالک بنایا گیا ہے' اس سے فائدہ اٹھالو اور اُنہیں اس طرح خرچ کرو کہ تمہارا پروردگار تم سے راضی ہو جائے۔ جب یہ چیزیں تمہارے قبضہ سے نکل جائیں گی تو پھر کچھ نہ کرسکو گے۔'' (روح المعانی بحوالہ ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۱۱۱)

(16) روزگار (Employment): حضرت شُعَیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

اِنِّیٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ ھٰتَیْنِ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِکَ وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْکَ (اَلْقَصَص : ۲۷)

''میں چاہتا ہوں کہ اپنی اِن دو بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے دوں اِس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو اور اگر تم دس سال پورے کرو تو یہ تمہاری طرف سے (احسان) ہے اور میں تم پر کوئی سختی نہیں چاہتا۔'' (۲۷ : ۲۸)

''یعنی آٹھ سال کی خدمت اُس نکاح کا مہر قرار پایا۔ کسی مدتِ معیّنہ تک مویشیوں کی چَرائی کا مہر مقرر ہو جانا فقہِ اسلامی میں جائز ہے۔ یہ بکریاں اگر شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کی تھیں تب تو اُن کا مہر ادا کیا جانا ظاہر ہے اور اگر والد کی تھیں تو بالغہ کی رضا سے ایسا معاملہ اُس شریعت میں بھی جائز ہے۔'' (ماجدی اردو ص ۷۸۵)

سرکاری اسامیاں اسلامی ریاست کے پاس امانت ہوتی ہیں اور اُن اسامیوں پر اہل اور لائق آدمیوں کی تقرری اہل و مجاز لوگوں کا جائز حق ہوتی ہے۔ سرکاری مشینری کے پہیے کو صحیح ڈگر پر چلانے کے لئے اس شرط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ حکمِ قرآن ملاحظہ ہو:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (اَلنِّساء : ۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کرو۔'' (۵۸ : ۴)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس ضمن میں فرمایا:

''ایک وقت آئے گا جب سرکاری عہدے اور اسامیاں اہلیت اور لیاقت کی بنیاد پر نہیں دئے جائیں گے بلکہ کثرتِ دولت اور اثر و رسوخ کی بنیاد پر دئے جائیں گے۔ جب ایسی صورتِ حال پیدا ہو، تو یقین جاننا کہ یومِ حساب (قیامت کا دن) قریب ہے۔''

(17) غبن۔ خورد بُرد (Embezzlement): غبن (خورد بُرد) کے بارے میں قرآن کا فیصلہ واضح ہے

وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آلِ عمران : ۱۶۱).

''اور جو کوئی خیانت (یا غبن) کرے گا تو وہ قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز کو حاضر کرے گا۔'' (۱۶۱ : ۳)

(18) ذخیرہ اندوزی : اسلام میں مقصدِ حیات تعیشات اور لذت کوشی میں گم ہو جانا نہیں ہے جو دولت کے ذخیرہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ مقصدِ حیات اپنی بنیادی ضروریات کی تسکین کے بعد خستہ حال اور غربت کے ماروں کی مدد اور خدمت کرنا ہے۔ قرآن فرماتا ہے :۔

(۱) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ آتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آلِ عمران : ۱۸۰)

''اور جو لوگ اُس مال میں بخل کرتے رہتے ہیں جو کچھ اللہ نے اُنہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے' وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ اُن کے حق میں اچھا ہے' نہیں بلکہ اُن کے حق میں (بہت) بُرا ہے' روزِ قیامت اُنہیں اُس مال کا طوق پہنایا جائے گا جس میں اُنہوں نے بخل کیا۔'' (۱۸۰ : ۳)

(۲) وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍo يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَo (اَلتَّوبة : ۳۴' ۳۵)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' آپ اُنہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ یہ اُس دن (واقع ہوگا) جبکہ اُس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا' پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں کو' اُن کے پہلوؤں کو اور اُن کی پشتوں کو داغا جائے گا' یہی وہ ہے جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے' سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔''

''قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام میں مال و زر کے جائز طریقوں سے کمانے کی ممانعت نہیں ہے تو ذخیرہ اندوزی اور مال اکٹھا کرنے کی کیوں مذمت اور ممانعت ہے اور اسے گناہِ کبیرہ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ذخیرہ اندوزی سے معاشی محرومی' استحصال اور سماجی عدم مساوات جنم لیتے ہیں' اس لئے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ کچھ لوگ ذخیرہ شدہ مال غیر محدود ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر عیش و عشرت کی طرف مائل ہوں گے جبکہ اُن کے بھائی بندوں کو کھانے کے لئے نانِ جویں بھی نہیں ملے گی۔ اس قسم کی صورتِ حال سماجی ہم آہنگی کو جو اسلام کا بنیادی ہدف ہے' درہم برہم کردے گی اور اس طرح اخلاقی بے راہروی اور دوسرے سنگین جرائم کو راہ ملے گی۔''

(19) اشاریہ سازی (Indexation): (تنخواہوں' پنشنوں' قرضہ جات وغیرہ کو قیمتوں کے اضافہ کے ساتھ جوڑنا)

سود اور انڈیکسیشن : بعض لوگ سود کو جائز قرار دینے کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ روپے کی مالیت روز بروز گھٹتی جارہی ہے تو سُود کو روپے کی مالیت کے نقصان کی تلافی قرار دینا چاہئے۔ تمویل کرنے والے (Financier) کو کم ازکم اتنی مقدار کے مطالبے کا حق ملنا چاہئے جتنی مالیت کا اُس نے دوسرے کو قرضہ دیا تھا۔ لیکن اگر وہ عددی طور پر اتنی ہی تعداد واپس لے گا تو وہ اب اتنی ہی قوّتِ خرید واپس نہیں لے گا جتنی کہ بوقتِ قرضہ اُس نے دی تھی کیونکہ افراطِ زر روپے کی بہت بڑی مالیت حقیقت میں کم کرچکی ہوگی۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ سُود کے ذریعے تمویل کرنے والے کو ہونے والے نقصان کی تلافی کردینی چاہئے۔

''لیکن یہ دلیل بالکل بے وزن ہے کیونکہ اگرچہ دوسرے اسباب کے ساتھ شرح سود' افراطِ زر کا ایک سبب ہے لیکن یہ شرح سود افراطِ زر کی شرح پر مبنی نہیں ہوتی۔ اگر سودی شرح افراطِ زر کا معاوضہ ہوتی تو افراطِ زر کی شرح ہمیشہ سودی شرح کے ہم وزن ہوتی بلکہ سودی شرح کا تعین زر کی رسد وطلب کی طاقتیں کرتی ہیں' افراطِ زر کی قیمت اُس کا تعین نہیں کرتی۔ اگر کسی بھی وقت دونوں قیمتیں ایک دوسرے کے ہم وزن ہو جائیں تو وہ اتفاقی حادثہ تو ہوسکتا ہے' کسی متعین اُصول کا اثر نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے سود کو قوتِ خرید کے نقصان کا معاوضہ اور بدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔''

''سود پر تاریخی فیصلہ'' (اردو ترجمہ)۔۔مولانا مفتی محمد تقی عثمانی' ص ۱۳۱)

مشہور مسلمان فقیہہ ابن عابدین شامی نے اپنی کتاب بہ عنوان ''تنبیہ الرقود علی مسائل النقود'' کے صفحہ ۱۹۳ پر اس مسئلہ پر واضح اور مدلل بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

''اگر رائج الوقت سکّے کی قیمت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انحطاط پذیر (کم) ہو جاتی ہے تو مقروض اُسی سکے میں اُسی قدر رقم واپس کرے گا جو اُس نے قرض لی تھی۔ جب وہ سکہ جس میں قرض دیا گیا' بالکل بیکار' یا حکومت کی جانب سے منسوخ ہو جاتا ہے تو قرضخواہ اپنی قرض کی ادائی کے وقت رائج الوقت سکّہ میں ادا کئے جانے کا دعویٰ کرسکتا ہے لیکن اُس وقت بھی قرض کی قدر و قیمت وہی ہوگی جو قرض دیتے وقت تھی۔''

نوٹ: اشاریہ سازی کے حق اور مخالفت میں دلائل کے لئے دیکھئے صفحات ۶۴۷ تا ۶۴۹ (اردو ترجمہ جلد دوم)

(20) سرقہ۔۔۔چوری (Larceny): اس کی سزا سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئی ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا أَيْدِيَهُمَا (اَلمائدۃ : ۳۸)

''اور چوری کرنے والا مَرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔'' (۵:۳۸)

سزاؤں کا موقوف ہونا: اگر عوام کی بنیادی ضروریات کی تسکین نہ ہو رہی ہو تو چوری کی (یعنی ہاتھ کاٹنے کی) سزا کا نفاذ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک معاشی تعطّل دُور نہیں ہو جاتا۔ عملی طور پر ہم اس کی مثال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں پاتے ہیں جب آپ نے قحط کے زمانہ میں چوری کی سزا اس خیال کے مدِّنظر موقوف کر دی تھی کہ لوگ کہیں بھوک اور تنگ کی وجہ سے چوری کی طرف مجبور نہ ہو جائیں۔

(21) قانونِ تقلیلِ حاصل (Law of Diminishing Returns): (یہ نظریہ کہ اخراجات' سرمایہ کاری' ٹیکس وغیرہ کی ایک حد سے زیادہ افزائش سے متناسب منافع حاصل ہونا موقوف ہو جاتا ہے)

قرآن مجید نے اس اصول کو یوں پیش کیا ہے:

(۱) اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (اَلرُّوم : ۵۴)

''اور (وہی) اللہ ہے جس نے تمہیں (تمہاری) ناتوانی کی حالت میں پیدا کیا' پھر ناتوانی کے بعد توانائی عطا کی' پھر توانائی کے بعد ناتوانی اور بڑھاپا دیا' وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے۔'' (۳۰:۵۴)

(۲) وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (یٰسٓ : ۶۸)
''اور ہم جسے طویل عمر دیتے ہیں تو اُس کی طبعی قوّتوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔'' (۳۶:۶۸)

(22) محنت (Labour): عام طور پر محنت سے مراد انسان کی دماغی اور جسمانی کوشش ہے جو وہ اشیاء و خدمات کی پیدائش کے سلسلہ میں سرانجام دیتا ہے۔ لیکن معاشی اصطلاح میں محنت سے مراد وہ تمام جسمانی اور ذہنی جدّ وجہد ہے جو کوئی شخص معاوضہ حاصل کرنے کے لئے کرے۔ گویا جو جدّ وجہد معاوضہ کے حصول کے لئے نہ کی جائے' وہ محنت نہیں کہلائے گی۔ محنت کی مثال ہمیں سورۃ القصص کی آیت ۲۷ میں ملتی ہے جب شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو آٹھ سال تک اپنی نوکری کرنے کے لئے رکھا تھا (دیکھئے صفحات ۹۳'۷ ۹۴ جلد دوم اردو ترجمہ)۔

(23) مختتم افادہ (Marginal Utility): کسی شے کی آخری اکائی کو استعمال کرنے سے حاصل ہونے والا افادہ مختتم افادہ کہلاتا ہے۔ مختتم افادہ سے مراد ہر اگلی اکائی کے استعمال سے حاصل ہونے والا افادہ ہے:۔

(۱) وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (اَلْبَقَرۃ : ۶۱)
''اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز ایک کھانے پر بس نہیں کر سکتے' سو اپنے رب سے ہمارے لئے اُن چیزوں کی دعا کر دیجئے جو زمین اُگاتی ہے' یعنی ساگ' ککڑی' گیہوں' دال مسور اور پیاز۔''

(۲) وَآتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ (ابراھیم : ۳۴)
''اور اللہ نے تمہیں ہر اُس چیز میں سے دیا جو تم نے اُس سے مانگی۔'' (۱۴ : ۳۴)

(24) مارک اَپ (مُرابحہ): مارک اَپ اشیائے صَرف کو اُس قیمت پر فروخت کرنا ہے جو قیمتِ خرید + وہ منافع جس پر فریقین رضامند ہوں۔ مُرابحہ میں فروخت کرنے والا فروخت ہونے والی شے کی قیمت بتاتا ہے۔ وہ خریدار کو بتاتا ہے کہ اُس نے وہ چیز مثلاً ایک سو روپے میں خریدی ہے اور وہ اصل قیمت پر دس روپے بطور منافع زیادہ وصول کرے گا۔ منافع کو فیصد میں مقرر کرنا بھی جائز ہے مثلاً قیمت خرید کا پانچ فیصد' یا دس فیصد وغیرہ۔''

''مُرابحہ دراصل امانت کی فروخت (بَیعُ الامانۃ) ہے جس میں خریدار فروخت کار کی دیانتداری اور اُس کی بتائی ہوئی قیمت پر اعتماد کرتا ہے۔ لہٰذا فروخت کار کا یہ قانونی اور اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ خریدار کو قیمت

بتانے میں ایمانداری سے کام لے جس میں اُس نے وہ شے خریدی ہے۔ اور اگر اُسے کچھ رعایت (Rebate) مل جاتی ہے تو اُس کا ذکر بھی بل میں ہونا چاہئے اور یہ چیز خریدار کے مفاد میں جاتی ہے۔

فریبی اور چالباز خریدار کا علاج : مُرابَحہ خریداری کی صورت میں اگر خریدار کو معلوم ہو جائے کہ اُس نے فروخت کار کو رقم ناجائز طور پر بہت زیادہ ادا کی ہے تو شریعتِ اسلامی دھوکہ کھانے والے خریدار کی پریشانی کا مداوا کرتی ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک ایسی صورت میں یہ خریدار پر منحصر ہے کہ آیا وہ خرید شدہ چیز کو ادا شدہ رقم پر قبول کرنے کے لئے تیار ہے یا خرید کو کالعدم (منسوخ) قرار دے کر رقم واپس لینا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ چیز خریدار کے ہاتھوں میں پہنچ کر خراب ہو گئی ہے یا اُسے وہ اپنے تصرّف میں لے آیا ہے تو خریدار سے معاملہ منسوخ کرنے کا حق جاتا رہے گا۔ امام ابو یوسف کے نزدیک مُرابَحہ خریدار کو زر کے ناجائز اضافہ میں تخفیف کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' (''اَلْمَبْسُوط'' ۔۔۔ سرخسی' ج ۱۳' ص ۸۶ بحوالہ "Islamic Law of Contracts and Business Administration" ... Dr. Muhammad Tahir Mansuri, p. 213)

(25) مادیت گزیدہ ذہنیت : کی عکاسی قرآنِ حکیم نے یوں کی ہے :

(۱) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا (الانعام: ۵۳)

'' اور اس طرح ہم نے اُن میں سے ایک دو دوسرے کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے جس سے یہ لوگ کہیں گے کہ کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟''

(۶ : ۵۳)

شروع میں اسلام کے ماننے والوں میں غرباء اور مفلس لوگ کثرت سے تھے۔ سرکش اور شریر الطبع دولتمند کافر یہ سوچنے لگے کہ اگر اسلام واقعی کوئی نعمتِ عظمٰے ہے تو کیا اس کے لئے نظرِ انتخاب انہی بدحالوں اور فاقہ مستوں پر ہی پڑی؟ کیا ہم موجود نہ تھے؟ شکل وصورت' حسب ونسب' مال وجاہ غرضیکہ ہم ہر لحاظ سے اِن لوگوں سے بہتر تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ شرف ہمیں بخشا جاتا۔ اس لئے یہ کوئی شرف کی چیز نہیں ورنہ اِن ناداروں کو عطا نہ کی جاتی۔

(۲) قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (القصص : ۷۸)

یعنی ''روشن خیال'' قارون نے کہا کہ میں خود مالیات ومعاشیات کا ماہر ہوں۔ مجھے جو کچھ بھی ملا ہے' یہ میں نے اپنی ذاتی قوّتِ بازو اور اپنے علم وہنر کے زور سے کمایا ہے۔ نہ میرے اوپر کوئی احسانِ غیبی ہے اور نہ میری کمائی میں دوسروں کا حق ہے۔ عارفین نے کہا ہے کہ علم وفضل' فن وہنر کو اپنی طرف منسوب کرنا' اپنا ذاتی کمال سمجھنا اور اُسے اللہ کا عطیہ نہ جاننا بھی مغضوبیت اور راندۂ درگاہ ہونے کی اصل جڑ ہے۔ قارون کو اتنی عقل نہ آئی کہ اگر دولتمندی' ہنرمندی ہی کا نتیجہ ہوتی تو پرانے بڑے بڑے سرمایہ دار اور ساہوکار اپنے کو تباہ ہی کیوں ہونے دیتے!

(۳) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍo (یٰسٓ : ۴۷)

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے' اُس میں سے خرچ کرو تو کافر مؤمنوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھانے کو دیں جنہیں اگر اللہ چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دے دے' تم تو نری کھلی غلطی میں پڑے ہوئے ہو۔'' (۴۷ : ۳۶)

متکبرین رؤوسائے قریش سے جب کہا جاتا تھا کہ غریبوں' مسکینوں کی مدد کرو (جو عموماً مسلمان ہی تھے) تو وہ طنزیہ جواب یہ دیتے تھے کہ ہم سے ان غریبوں کی مدد کو کہتے ہو حالانکہ تم یہ بھی کہتے ہو کہ تمہارا خدا رازق ہے' وہ جسے چاہے روزی دے' تو وہ خود کیوں اُنہیں روزی نہیں دیتا؟ اُن کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ اسی عالمِ اسباب میں اللہ کی رزّاقی بھی تو اُس کی ہر صفت کی طرح انسانوں ہی کے واسطے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کب تھا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں عادۃً رزّاق بلا واسطہ اور بلا ذریعہ اَسباب ہے۔ بہر حال اِن پیٹ کے پجاریوں اور خود فراموش بلکہ خدا فراموشوں کے خلاف غریبوں کے اندر ہی اندر نفرت کا لاوا پکتا رہتا ہے اور بالآخر خونی انقلاب کی شکل میں پھٹ پڑتا ہے۔ ''اِن خونی انقلابات کی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ کا خوف اور قیامت کے محاسبہ کا یقین دل میں پیدا نہ ہو جائے' اُس وقت تک جَور وستم کو مٹانے کے لئے جو بھی کوشش کی جائے گی' اُس سے ظلم وستم کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا۔ مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کے بعد اور ملکی خزانوں پر تصرّف کا مکمل اختیار رکھنے کے باوجود وہی لوگ دنیا کی محبت سے اپنا دامن بچا سکتے ہیں جنہیں فیضِ نبوّت سے کچھ حصّہ مرحمت ہوتا ہے۔'' (ضیاء القرآن' جلد چہارم' ص۱۸۲)

(26) اعتدال (Moderation): ''سادہ زندگی اور بلند سوچ'' اسلامی معاشیات کا مقولہ ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی کی زندگی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام اپنی ذات سے دست برداری (Self-abnegtion) کی حمایت کبھی نہیں کرتا بلکہ وہ لذتیاتی خواہشات (Hedonistic Desires) پر کچھ حدود وقیود لگاتا ہے جو جسم اور روح کی خوش آئند ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ حکومت کی سنجیدہ اور متین حکمتِ عملی کے تحت صاف ستھری اور سادہ زندگی کا اندازہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی خلافت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے دَور میں لوگ اس قدر خوشحال ہو گئے تھے کہ زکوٰۃ وخیرات لینے والا کوئی نہ تھا۔ قرآن مجید معاشرے کی فلاح وبہبود کے لئے اس قابلِ تحسین صفت کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتا ہے:

(۱) وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًاo

''اور اپنا ہاتھ گردن ہی سے نہ باندھ لے اور نہ اسے بالکل کھول ہی دے ورنہ تو ملامت زدہ' تہی دست ہو کر بیٹھ جائے گا۔'' (۲۹ : ۱۷)

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ عربی محاورہ میں انتہائی بخل سے کنایہ ہے اور وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ عربی محاورہ میں فضول خرچی کی انتہا سے کنایہ ہے۔ خرچ کے معاملہ میں اسلام کی تعلیم اعتدال' اقتصاد اور میانہ روی کی ہے یعنی نہ اپنی حالت اور قدرت سے بڑھ کر خرچ اور نہ بالکل کنجوسی ہو' نہ صَرفِ بےمحل' نہ خلافِ موقع' اور نہ موقع و محل پر صَرف سے گریز ہو۔

(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًاo (اَلْفُرْقَان : ۶۷)

"اور اللہ کے (اطاعت گزار) بندے وہی ہیں کہ جب وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی تنگی کرتے ہیں اور اس کے درمیان (اُن کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے۔" (۲۵:۶۷)

(27) اجارہ داری (Monopoly): اجارہ داری مکمل مقابلہ کی الٹ صورت ہے۔ بڑے پیمانے پر اشیائے صَرف کی پیدائش اکثر اجارہ داری کا باعث بنتی ہے کیونکہ بڑے بڑے تاجر اپنے باہمی اشتراک سے اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں اور چھوٹے آجرین کو صنعت سے بھگانے کے لئے بعض اوقات لاگت سے بھی کم قیمت پر اشیاء فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح چھوٹے پیمانے پر کاروبار کرنے والے اپنے محدود وسائل کی وجہ سے قیمتوں کی جنگ (Price War) کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اپنے کاروبار کو سمیٹ کر میدان خالی کر دیتے ہیں جس سے بڑے تاجروں کو اجارہ داری قائم کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو اپنے نقصانات کو پورا کرنے کے لئے بعد میں اپنی مرضی کی قیمتیں وصول کرتے ہیں اور اس طرح صارفین کو نقصان پہنچتا ہے۔ لوگوں کی قوّتِ خرید کم ہو جاتی ہے اور معیشت سرد بازاری کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔

چونکہ اجارہ داری سماجی فلاح و بہبود کے خلاف ہے' لہٰذا یہ قرآن کی نظر میں قابلِ نفرت اور گناہِ کبیرہ ہے اور کوئی بعید نہیں کہ قرآن نے اسی ناپسندیدہ رجحان کو فساد فی الارض کہا ہو (سورہ ھُود: ۸۵)۔

نوٹ: مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۶۴۱ جلد دوم (اردو ترجمہ)۔

(28) قومیانہ (Nationalisation) : اراضی وغیرہ کو نجی ملکیت سے نکال کر سرکاری تحویل میں لے لینا اُن معاشی خرابیوں کے قلع قمع کرنے کا علاج نہیں ہے جو ہمارے معاشرہ کے وسیع دائرہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ قومیانے کا عمل محض مغربی فلسفہ کا ملغوبہ (چوں چوں کا مربّہ) ہے جو اُسے معاشرے کے تمام افراد کے درمیان دولت کی صحتمندانہ گردش کے لئے اور آزاد مقابلہ کی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی نظر میں حکومت کا لوگوں کی جائز کمائی پر قابض ہو جانا ایک آمرانہ اور ظالمانہ عمل ہے۔ حکمِ قرآن ملاحظہ ہو:

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (النساء : ۲۹)

''مومنو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو۔'' (۴ : ۲۹)

بالبَاطِل خیانت اور بددیانتی کی تمام صورتوں کی بندش اِس حکم میں آ گئی۔ یعنی ایک دوسرے کے مال میں تصرُّف کی اجازت کسی بَاطل طریقہ (سود، جوئے بازی، غبن اور غصب وغیرہ) سے تو سرے سے ہی نہیں۔ صرف جائز طریقوں کے اندر ایک دوسرے کی رضامندی سے تصرُّف کر سکتے ہو مثلاً مشترک سرمایہ سے تجارت جس میں کسی کی سادہ لوحی یا مجبوری سے ناروا فائدہ نہ اٹھایا جائے بلکہ فریقین نے راضی خوشی سے لین دین کیا ہو اور اس طرح تمہیں نفع حاصل ہو تو عین باعثِ برکت ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے ابنائے جنس کے حقوق کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف زبردست تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''خبردار! تمہارے خون، تمہاری جائدادیں اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے کے لئے ایسی ہی محترم ہیں جیسے یہ دن، یہ شہر (مکّہ) اور یہ مہینہ تمہارے نزدیک محترم ہیں۔''

لہٰذا قومیانے کے عمل کی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ مبارک سے لے کر اب تک اجازت نہیں ہے۔

درحقیقت قومیانے کے عمل کی بنیاد کارل مارکس کے ''قدرِ زائد'' (Surplus Value)* کے نظریہ پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور کی مزدوری کے علاوہ تمام آمدنی ناجائز ہے خواہ وہ سود کی شکل میں ہو یا منافع اور کرایہ کی شکل میں ہو، جبکہ اسلام اِن تینوں (منافع، کرایہ اور مزدور کی مزدوری) کو بالکل جائز قرار دیتا ہے۔ آمدنی کے چار ذرائع میں سے اسلام صرف سُود کو ناجائز اور ناقابلِ اجازت قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے تجارت میں حاصل شدہ منافع، خرید و فروخت، معاہدے اور مشترکہ کاروبار کی تمام شاخیں بڑے انعاماتِ الٰہی ہیں۔ مضاربت اور دوسرے کئی متعلقہ اصول، منافع اور کرایہ داری کے جواز کے اصول سے اخذ کئے گئے ہیں۔''

''جب یہ ثابت ہو گیا کہ ''قدرِ زائد'' کا نظریہ اسلام کے خلاف ہے اور صنعتکار کی وہی آمدنی ناجائز ہے جو سُود، سٹّہ بازی، جوئے اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز ذرائع سے حاصل ہو۔ لیکن اگر آمدنی (کاروباری) منافع اور کرایہ داری سے حاصل ہو تو وہ بلاشک وشبہ جائز ہے اور اُس کے جائز ہونے کی وجہ سے اُس پر قابض نہیں ہونا چاہئے بلکہ حکومتِ وقت کو اس میں سے زکوٰۃ اور عُشر کی مدّات جیسی مدّات لینی چاہئیں۔''

("Our Socio-Economic Order" ...... Justice Muhammad Taqi Usmani, pp. 55 - 56)

* یعنی کام کی قیمت اور ادا کی جانے والی مزدوری کا درمیانی فرق۔

(29) امتیازی قیمت (اِغراق--- Price Discrimination Or Dumping): جب ایک ہی قسم کی شے کو مختلف منڈیوں، علاقوں یا مقامات پر مختلف قیمتوں پر فروخت کیا جائے تو اُسے ''مقامی امتیاز'' یا ''امتیاز بلحاظِ مقام'' یا ''اِغراق'' (Dumping) کا نام دیا جاتا ہے۔ قیمت کا یہ امتیاز ملکی منڈیوں میں بھی ہوسکتا ہے اور غیر ملکی منڈیوں میں بھی۔ اس پالیسی کے تحت عام طور پر ملکی صارفین سے شے کی زیادہ قیمت وصول کی جاتی ہے جبکہ غیر ملکی خریداروں کو نسبتاً کم قیمت پر شے فروخت کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال سورہ یوسف میں ملتی ہے:

(۱) وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ (یوسف: ۶۵)

''جب اُنہوں نے اپنا سامان کھولا تو اُنہیں اپنی نقدی بھی ملی کہ اُنہی کی طرف واپس کردی گئی تھی، وہ بولے: اے ہمارے باپ! ہمیں اور کیا چاہئے، یہ ہماری نقدی بھی تو ہمیں ہی لوٹا دی گئی ہے، ہم اپنے گھر والوں کے لئے رسد لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ غلّہ اور لائیں گے۔''

(۲) فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝ (یوسف: ۸۸)

''پھر جب وہ لوگ (عزیزِ مصر) کے پاس پہنچے تو بولے: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو (بڑی) تکلیف پہنچ رہی ہے اور ہم یہ معمولی پونجی لے کر آئے ہیں، سو آپ ہمیں ہمارے لئے غلّہ پورے ناپ سے دے دیجئے اور ہمارے ساتھ رعایت کیجئے، بے شک اللہ رعایت کرنے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔'' (۱۲ : ۸۸)

(30) اصل زر اور سُود (Principal Amount and Interest): سودی کاروبار سے توبہ کرنے کی صورت میں قرآن مجید اصل زر کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ آیتِ مبارکہ:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (البقرة: ۲۷۹)

''اور اگر تم (سود سے) توبہ کرلو گے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر (کسی کا) ظلم ہوگا۔'' (۲ : ۲۷۹)

یعنی سود سے توبہ کرنے کی صورت میں حکومتِ اسلامی تمہارا اصل سرمایہ تمہیں واپس دلا دے گی۔ وگرنہ

*اس میں کوئی شک نہیں کہ اِغراق (Dumping) کا نتیجہ معاشی عدم مساوات اور سماجی بے آہنگی میں نکلتا ہے اور اسی لئے اسلام میں یہ مذموم فعل ہے۔ لیکن جناب یوسف علیہ السلام کی طرف سے اپنے بھائیوں کے لئے امتیازی قیمت رَوا رکھنا صرف آپ ہی کی خداداد عطا کردہ تخصیص ہے اور اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ یوسف علیہ السلام کے حقیقی، پیارے بھائی بنیامین کو اپنے پاس ٹھہرانے کی بنیاد بنانا چاہتا تھا۔

راس المال (اصل زر) بھی بہ حقِ حکومتِ اسلام ضبط ہو جائے گا۔

(31) مال: لفظِ ''مال'' یا ''جائداد'' کا اِطلاق اُس شے پر ہوتا ہے جسے ذخیرہ کیا جائے یا جس کی حفاظت کی جائے تاکہ وہ بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔ ''مال'' کی تین خاصیتیں ہوتی ہیں: (۱) اُس کی کوئی قدر (قیمت) ہو۔ (۲) یہ ایسے منافع کی حامل ہو جسے اسلامی شریعت اجازت دیتی ہو۔ (۳) اس پر انسانی قبضہ ہو۔ سورج کی روشنی اور ہوا جیسی عام منفعت کی چیزیں مال یا جائداد نہیں کہلا سکتے۔ مزید برآں یہ ایسی چیز ہونی چاہئے جس کی طرف انسانی فطرت مائل بھی ہو اور اسے تحفظ بھی حاصل ہو۔ ("Economics and Islam" ... Dr. Muhammad Musleh-ud-Din, pp. 98, 99)

ایم۔اے منّان نے اپنی کتاب ''اسلامک اکنامکس'' میں مال کے مالک کے طرزِ عمل کو کنٹرول کرنے کے مندرجہ ذیل کچھ اصول بیان کئے ہیں:۔

(الف) مال کو مسلسل مفاداتی استعمال میں رہنا چاہئے: مال کے غیر مستعمل ہونے کی اسلام میں اجازت نہیں ہے اور اس سلسلہ میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''اُس شخص کو جو کسی غیر ملکیتی زمین پر قبضہ کرتا ہے اور پھر تین سال تک اُسے معقول طور پر استعمال میں نہیں لاتا تو اُس کا اُس زمین پر کوئی حق باقی نہیں رہتا۔''

اصولِ ملکیت کو خلیفہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں خوب تحریک ملی جب اُنہوں نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے وہ چند قطعاتِ اراضی واپس لے لئے تھے جو نبی علیہ السلام نے اُنہیں ہبہ کئے تھے جس کی محض وجہ یہی تھی کہ جناب بلال اُن قطعات کو استعمال میں نہیں لائے تھے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''جو شخص کسی غیر ملکیتی زمین کو کاشت کرتا ہے' اُس کا اُس زمین پر زیادہ حق ہے۔''

''اس حکمتِ عملی کے پس پردہ کارفرما معقولیت آج کے اِس دَور میں بھی ظاہر ہے کیونکہ کئی مسلم ممالک میں کئی زرعی زمینیں سالہا سال تک غیر مزروعہ اور غیر مستعمل رہی ہیں جس کی بڑی وجہ خراب مالیاتی نظام ہے جس نے زمینداری نظام یا اس سے ملتے جلتے نظام کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ چونکہ زمین کے استعمال میں نہ رہنے کا معنی زمین کا ضائع ہونا ہے اور مالک کو بھی اور سماج کو بھی بہ حیثیت مجموعی قلاش و مفلس بنا دیتی ہے' لہٰذا اسلامی ریاست کو

مداخلت کرنے اور مالک کو حقِ ملکیت سے محروم کرنے کا حق حاصل ہے۔ حکومت ایسی عدمِ ملکیت کی تلافی صرف وہاں کرے گی جہاں زمین جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو نہ کہ ناجائز ذرائع سے۔ اگر اس حکمتِ عملی کو اپنا لیا جائے تو وسیع تر کاشت کے نتیجہ میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔''

(ب) ''مفاداتی استعمال کا طریقہ مالکِ زمین اور سماج دونوں کے مفاد میں ہو: اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی جو بھی کام کرے، اُسے نہایت خوش اسلوبی اور پختگی مہارت سے کرے کہ یہ سنّتِ الٰہیہ بھی ہے (بحوالہ سورۃ النّمل: ۸۸)۔ اگر مالک، جائداد کو فضول خرچی یا غیر منفعت بخش کاموں میں اُڑا دے یا اگر لوگ اپنی توجہ کو کسی خاص قسم کی جائداد، صنعت یا سرمایہ کاری میں مرکوز کر دیں اور دوسری اقسام سے غافل ہو جائیں یا یہ کہ اگر دولت لوگوں کے ایک مخصوص طبقے میں مرکوز ہو کر رہ جائے جس سے بہ حیثیتِ مجموعی پورے سماج کو نقصان ہو تو اسلامی ریاست کو معاشی مفادات اور سماجی سرگرمیوں میں توازن قائم کرنے کے لئے مداخلت کا حق حاصل ہے۔ ابواُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب بھی ہل اور زرعی آلات کو دیکھتے تو میں نے اُنہیں یہ فرماتے سنا ہے کہ ''یہ چیزیں جس گھر میں بھی داخل ہوتی ہیں تو اپنے ساتھ خوشحالی ہی لاتی ہیں۔'' (صحیح بخاری ۴۱ : ۲)

(ج) ''زکوٰۃ کی ادائیگی: صاحبِ نصاب کو اپنے ملکیہ مال کے تناسب سے زکوٰۃ ضرور ادا کرنی چاہئے۔ سونا، چاندی، ہر قسم کا رائج الوقت سکہ، زرعی پیداوار، مویشی، تجارتی سامان اور ہر وہ چیز جس کا انسان اپنی زندگی میں مالک ہے، زکوٰۃ کی رُو سے ''مال'' ہے۔ وہ شخص جس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور جو کام کرنے سے معذور ہے، مفلس و نادار اور ضرورتمند ہے اور زکوٰۃ لینے کا مستحق ہے۔''

(د) استعمال برائے فلاح و بہبود: اس کا مطلب ہے کہ ''مال'' اور جائداد کو سماج کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ ہونا چاہئے اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) کی جو ترغیب آئی ہے، اُس کا مطلب بھی یہی فلاح و بہبود ہے۔ میرے نزدیک اِنفاق فی سَبیل اللہ کا بہترین مصرف ایسی مالیاتی حکمتِ عملی کا بنانا ہے جو امیر طبقے سے اُن محصولات کو یقینی بنائے جو اُن کے ذمّہ واجب الادا ہوں اور پھر اُس آمدنی کو عوامی مفاد کو ترقی دینے میں خرچ کیا جائے۔''

(ذ) ''بے ضرر استعمال: اسلام جہاں ایک طرف مال کو فلاح و بہبود کے کاموں میں خرچ کرنے پر زور دیتا ہے، وہاں وہ مالک پر مال کے بے ضرر استعمال کا فرض بھی عائد کرتا ہے۔ کیونکہ جب مال کا استعمال دوسرے کے لئے ضرر کا موجب بن جائے تو یہ جارحیت بن جاتی ہے جس کی قرآن مجید میں سخت ممانعت آئی ہے:۔

لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ٥ (البقرۃ: ۱۹۰)

''حد سے باہر مت نکلو کہ اللہ حد سے باہر نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۲:۱۹۰)

اِس اصول کی بنیاد یہ مقولہ ہے کہ ''کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے خواہ نقصان پہنچانے والے کو اس سے فائدہ ہو یا نہ ہو'' جو فرمانِ نبی بھی ہے۔ بہت سے ذیلی اصول اسی اصول کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں۔''

(ر) جائز اور قانونی قبضہ : رشوت اور جھوٹی گواہی جیسے بدعنوان ذرائع کے ذریعے کسی جائداد کو ہتھیا لینا غیر قانونی اور ناجائز عمل ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ:۱۸۸ ؛ سورۃ النساء : ۲۹)

(ز) متوازن استعمال: جائداد کے مالک کو اُس کے استعمال میں نہ تو فضول خرچ اور نہ ہی تنگ دل اور کنجوس ہونا چاہیئے بلکہ معتدل اور متوازن ہونا چاہیئے (بحوالہ سورۃ النساء:۳۷ ؛ سورۃ الاسراء:۲۹)۔

(س) جائز مفادات : دولت کی قوّت کی بنیاد پر جائداد کو خود غرضانہ مقاصد کے حصول کے لئے استعمال نہیں ہونا چاہیئے۔ قرآنی فرمان کے مطابق امانت کو اہل اور مستحق افراد تک پہنچنا چاہیئے (سورۃ النساء:۵۸)

(ش) متوفّی کے قانونی اور جائز وارثوں کو اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق حصّہِ وراثت ملنا چاہیئے اور کسی بھی فریق کے لئے دوسرے فریق کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

''مال'' یا جائداد کے استعمال کے لئے اِن تمام اصولوں کے مدِّنظر یہ معلوم ہوگیا کہ کمیونزم/سوشلزم کے برعکس قرآن مجید ذاتی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے جس کے قرآنی دلائل جلد اوّل کے صفحہ ۱۴۴ پر ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

(32) راشن سسٹم: سورہ یوسف کی آیات ۵۹، ۶۰، ۶۵ اور ۸۸ سے ثابت ہے۔

(33) آجر اور اجیر کے مابین تعلقات: اسلام مزدور کے استحصال کے خلاف ہے اور اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آجر اور اجیر کے درمیان انصاف کو قائم کرنے کے لئے دونوں کے باہمی رویّہ کے لئے اسلام نے کچھ مخصوص معیار مقرر کئے ہیں۔ اجیر (مزدور) کے لئے منصفانہ تنخواہ (مزدوری) کا حقدار ہونے کے ساتھ ساتھ آجر کی بہتری کا خیال رکھنا اور پیداواری صلاحیت کو بڑھانا بھی ضروری ہے۔ مسلمان آجر کے لئے اپنے ملازم کا استحصال کرنا غیر قانونی اور ناجائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ روزِ قیامت تین قسم کے لوگ یقیناً اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سامنا کریں گے: اُن میں سے ایک وہ ہوگا جو ایک مزدور کو اجرت پر رکھتا ہے، اُس سے پورا پورا کام لے لیتا ہے لیکن اُسے اُس کی مزدوری نہیں دیتا۔ (صحیح بخاری، جلد سوئم)

(34) ضروریات کی تسکین: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات پر بڑا ہی مہربان ہے۔ اُنہیں پیدا کرنے کے بعد وہ

رب ہونے کے ناطے سے اُن کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے اور اُن سے اُمید کرتا ہے کہ میری طرح میرے بندے بھی اپنے ماتحتوں اور اجیروں (Employees) کے ساتھ مہربانی اور کرم فرمائی کا سلوک کیا کریں۔ چنانچہ فرمایا:

وَآتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراھیم : ۲۴)

''اور اُس نے تمہیں ہر اُس چیز میں سے دیا جو تم نے اُس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گِنتا چاہو تو اُنہیں شمار نہیں کر پاؤ گے۔'' (۲۴ : ۱۴)

(35) سروس چارجز (Service Charges): وہ سروس چارج جو کہ دستاویز تیار کرنے کے اصل اخراجات پر مبنی ہو اور جو قرضہ دینے والا قرض دینے کے سلسلہ میں برداشت کرتا ہے' قرضہ لینے والے سے طلب کر سکتا ہے۔ یہ اصول قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کیا گیا ہے :

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ (البقرة : ۲۸۲)

''اور وہ شخص لکھوادے جس کے ذمہ حق واجب ہے۔''

یعنی دستاویزات کی تیاری میں اگر کوئی اخراجات آتے ہیں تو اُنہیں قرضہ لینے والا برداشت کرے گا۔

(36) مال و دولت کی اہمیت (قرآن کی نظر میں):

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا٥ (النساء : ۵)

''اور اپنا وہ مال کم عقلوں کو نہ دے دیا کرو جسے اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے اور اُس مال میں سے اُنہیں کھلاتے پہناتے رہو اور اُن سے بھلائی کی بات کہتے رہو۔''

یعنی قرآن مجید نے مال و زر کو انسانی زندگی کا سہارا مانا ہے جس پر اُس کی حیاتِ مادّی اور معاشرتی کا انحصار ہے اور جو بڑی قدر کی چیز ہے۔ اس لئے اُسے اُن کم عقلوں کے سپرد کرنے سے منع کیا ہے جن میں مال کی حفاظت کا سلیقہ اور اُسے سنبھالنے کی سمجھ بوجھ پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس کی قدر و منزلت سے ناواقفیت کی بناء پر اُسے اُڑا دیں گے۔

(37) سماجی انصاف (Social Justice): اس کا مطلب ہے کہ ہر آدمی کو اُس کا جائز حق ملنا چاہئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو ایک خاص انداز اور توازن سے پیدا فرمایا ہے اور انسان سے توقع رکھی ہے کہ وہ اس توازن کو برقرار رکھے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(۱) وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ٥ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ٥ (الرّحمٰن : ۷، ۸)

''اور آسمان کو اُس نے اونچا کیا اور اُسی نے ترازو وضع کر دی کہ تم تولنے میں گڑبڑ نہ کرو۔'' (۵۵:۸،۷)

میزان (ترازو) سے یہاں مراد اِنصاف ہے۔جس طرح اجرامِ فلکی کو ایک توازن میں رکھا گیا ہے' اُسی طرح انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو اُسی توازن و انصاف سے بجالائے' خواہ وہ سرگرمیاں اُس کے خالق سے متعلق ہوں یا اپنی آس پاس کی دنیا سے۔

(۲) لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (أَلْحَدِيد : ۲۵)

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کو نازل کیا تا کہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔'' (۲۵ : ۵۷)

لفظ اَلْقِسْط میں براہِ راست اشارہ سماجی انصاف کی طرف ہے۔حیاتِ انسانی میں حق و باطل کے تمام معاملات اور تمام اَخلاقی اور مادّی مسائل اِسی لفظ اَلْقِسْط کے تحت آتے ہیں۔

سماجی انصاف رسماجی مساوات (نہ کہ معاشی مساوات) کی وضاحت کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: أَلنَّاسُ كَأَسْنَانِ الْمُشْطِ یعنی ''تمام لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح (برابر) ہیں''

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کسی علاقے کو بطور عامل (گورنر) بھیجتے ہوئے عمر رضی اللہ عنہ نے یوں ہدایات دیں:

''لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کی حاکمیت اس طرح ہونی چاہئے کہ تمہاری ناانصافی سے کسی خوشحال کو ناجائز فائدہ نہ پہنچے اور نہ ہی اِس وجہ سے کوئی کمزور اپنے قانونی حق سے محروم رہ جائے۔''

آپؓ کی یہ مشہور سرزنش (تنبیہ) بھی سبق آموز ہے:

''کس بنیاد پر تم نے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے جبکہ اُن کی ماؤں نے اُنہیں آزاد جنا ہے؟''

(38) سماجی معاشی استحکام: درجِ ذیل قرآنی آیت پر عمل پیرائی سے قائم ہوسکتا ہے:۔

وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرۃ:۱۷۷)

''اور اللہ کی محبت میں مال خرچ کرے قرابتداروں' یتیموں' مسکینوں' راہگیروں' مانگنے والوں اور گردنوں کے چھڑانے میں۔'' (۱۷۷ : ۲)

(39) معیارِ زندگی : ضروریات' سہولیات اور تعیّشات کے تین زمرے ایسے ہیں جن میں انسانی ضروریات کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ضروریات تو جو کچھ ہیں' سو وہ ہیں۔لیکن سہولیات اور تعیّشات کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔لاکھوں پتی انسان کے نزدیک جو چیز سہولت کی ہے وہ ایک متوسط شخص کے لئے سامانِ عیش وعشرت ہے۔اس لئے اسلام کی فکرِ نظر ناگزیر ضروریات' اطمینان بخش جائے پناہ (گھر)' لباس' طبی امداد اور بچوں کی تعلیم کی فراہمی وغیرہ سے ہے۔خوشحال طبقہ کو چیتھڑوں اور پھٹے پرانے لباس میں رہنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ رزّاقِ عالم اپنے بندوں پر اپنی عنایتِ رزق کی علامات دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی اَنانیت (نفس پرستی Egoism) کی تسکین کی خاطر اپنے بھائی بندوں کے فرائض سے غافل ہو جائیں۔اور یہاں اسلامی معاشیات اپنے کو اصل رنگ وروپ میں ظاہر کرتی ہے کہ روح اور مادّہ' اِس دُنیا اور اُس دُنیا کے حسین ومعتدل امتزاج کا نام ہی تو اسلام ہے!

(40) رسد (Supply): کسی شے کی وہ مقدار جو فروخت کرنے والے کسی خاص قیمت پر بیچنے کے لئے تیار ہوں' رسد کہلاتی ہے' مثلاً اگر پچاس کلوگرام چینی 70 روپے فی کلوگرام کے حساب سے بیچنے کے لئے منڈی میں لائی جائے تو چینی کی یہ مقدار رسد کہلائے گی۔رسد کے متعلق قرآنی آیات ملاحظہ ہو:۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝

(الشُّعراء : ۱۸۱'۱۸۲)

''پورا ناپا کرو اور نقصان پہنچانے والے نہ بنو اور صحیح ترازو سے تولا کرو۔'' (۱۸۱'۱۸۲ : ۲۶)

(41) زرِ فاضل (Surplus Money): قرآن مجید زرِ فاضل کے متعلق یوں کہتا ہے :

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرة : ۲۱۹)

''(اے پیغمبر!) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ فرما دیجئے جو ضرورت سے بچ جائے۔''

امام ابن سعد' امام ابو داؤد اور امام حاکم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ایک شخص سونے کا انڈا لئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میری طرف سے یہ صدقہ قبول فرمایئے۔آپؐ نے منہ پھیر لیا۔وہ بار بار اصرار کرتا رہا اور حضور علیہ السلام چہرہ انور پھیرتے رہے۔جب وہ باز نہ آیا تو آپ نے وہ انڈا اس سے لے کر غصّے سے دُور پھینک دیا اور اگر وہ اُسے لگ جاتا تو اُسے بہت چوٹ لگتی یا اُس کی آنکھ پھوٹ جاتی۔پھر اُس حکیم ومشفق استاد اور مُربی نے فرمایا: تم میں سے کوئی اپنا (کُل) مال خیرات کر دیتا ہے اور پھر لوگوں سے بھیک مانگنے لگتا ہے۔صدقہ تو تب ہے جب احتیاج نہ ہو۔(اَلدُّرُّ المنثور۔۔لجلال الدین السیوطی' جلد اوّل' ص ۲۵۴-۲۵۳ ؛ تبیان القرآن' جلد اوّل' ص ۷۸۰ ؛ ضیاء القرآن' جلد اوّل' ص ۱۵۰)

عَفو کے لفظ سے سوشلزم کے جواز پر استدلال اور اُس کا جواب : سوشلزم (اشتراکیت) کے حامی کہتے

ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں ضرورت سے زائد ہر چیز کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا تمام بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی اداروں کو قومی ملکیت میں لینا جائز ہے کیونکہ وہ تمام ادارے اُن کے مالکوں کی ضرورت سے زائد ہیں۔

''اس کا جواب یہ ہے کہ ائمہ تفسیر نے لفظ عَفْو کے تین معانی بیان کئے ہیں: زائد از ضرورت' میانہ روی اور آسان۔ جن صحابہ' تابعین اور ائمہ تفسیر نے اس کا معنی ''زائد از ضرورت'' بیان کیا اُنہوں نے یہ وضاحت کردی ہے کہ زائد از ضرورت مال خرچ کرنے کا حکم زکوٰۃ کی فرضیت اور اُس کی مقدار بیان کرنے سے پہلے تھا اور اُس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اور جن ائمہ تفسیر نے یہ بیان کیا کہ اس کا معنی ہے کہ راہِ خدا میں میانہ روی سے خرچ کرو' یا جس کا خرچ کرنا آسان ہو' اُسے خرچ کرو تو اِس معنی میں یہ حکم اب بھی باقی ہے' اور اس کی تائید کئی احادیث سے ہوتی ہے۔'' (''تبیان القرآن'' جلد اوّل' ص ۷۷۹)

''اس لفظِ عَفْو میں اُن لوگوں کے لئے بھی درسِ عبرت ہے جن کے پاس بے حساب دولت ہے اور اُن کے گرد و نواح اور پڑوس میں کئی غریب' مسکین اور محتاج زندگی کی اہم ضروریات کے لئے بھی ترس رہے ہوتے ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ زکوٰۃ ادا کر کے وہ اب ہر قسم کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے ہیں بلکہ اُن کی ضرورت سے زائد جو سرمایہ ہے اس سے وہ اپنے اسلامی بھائیوں کی ضرور مدد کریں۔'' (ضیاء القرآن' جلد اوّل' ص ۱۵۰)

(42) سُودی مشاغل (Usury Pursuits) : اسلام میں سود کی مذمّت واضح الفاظ میں آئی ہے۔ یہ ایک ایسا سنگین گناہ ہے کہ جو لوگ سودی لین دین سے باز نہیں آتے' اُنہیں قرآن مجید نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا ہے (سورۃ البقرۃ: ۲۷۹)۔ نیز فرمایا :۔

(۱) اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ
''جو لوگ سُود کھاتے رہتے ہیں وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے سوا اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے (جنون سے) خبطی بنا دیا ہو۔'' (۲ : ۲۷۵)

(۲) یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ (البقرۃ : ۲۷۶)
''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔'' (۲ : ۲۷۶)

(۳) وَمَا آتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا آتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ○ (اَلرُّوم : ۳۹)
''اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو وہ اللہ کے آگے نہیں بڑھتی اور تم اللہ کی رضا جوئی میں جو صدقہ و خیرات کرو گے تو ایسے ہی لوگ (اپنے مالوں کو) کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔'' (۳۰ : ۳۹)

مفسرینِ قرآن کی بیان کردہ تعریف اَلرِّبو: امام ابوبکر الجصاص (م ۳۸۰ ھ) لکھتے ہیں :
وَالرِّبَاالَّذِیْ کَانَتِ الْعَرَبُ تَعْرِفُہ' وَتَفْعَلُہ' اِنَّمَا کَانَ قَرْضَ الدَّرَاھِمِ وَالدَّنَانِیْرِ اِلٰی أَجَلٍ بِزِیَادَةٍ عَلٰی بِقْدَارِ مَااسْتُقْرِضَ عَلٰی مَایَتَرَاضَوْنَ بِہٖ (احکام القرآن' ج ۱' ص ۴۶۵)
''اور وہ رِبا جو اہلِ عرب کے ہاں معروف اور مستعمل تھا' اُس کی صورت یہ تھی کہ وہ درہم (چاندی کے سکے) یا دینار (سونے کے سکے) کی شکل میں مخصوص مدت کے لئے اپنے اصل سرمایہ پر متعیّن اضافے کی شرط کے ساتھ قرض دیا کرتے تھے۔''

امام فخرالدین رازی نے دورِ جاہلیت میں مروج ربا کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے:۔
أَمَّا رِبَا النَّسِیْئَةُ فَھُوَالْأَمْرُالَّذِیْ کَانَ مَشْھُوْرًا مُتَعَارِفًا فِی الْجَاھِلِیَّةِ وَ ذٰلِكَ أَنَّھُمْ کَانُوْا یَدْفَعُوْنَ الْمَالَ عَلٰی أَنْ یَّأْخُذُوْا کُلَّ شَھْرٍ قَدْرًا مُعَیَّنًا وَیَکُوْنُ رَأْسُ الْمَالِ بَاقِیًا ثُمَّ إِذَا حَلَّ الدَّیْنُ طَالَبُوا الْمَدْیُوْنَ بِرَأْسِ الْمَالِ فَإِنْ تَعَذَّرَ عَلَیْہِ الْأَدَاءُ زَادُوْا فِی الْحَقِّ وَالْأَجَلِ فَھٰذَا ھُوَ الرِّبَاالَّذِیْ کَانُوْا فِی الْجَاھِلِیَّةِ یَتَعَامَلُوْنَ بِہٖ (التفسیر الکبیر' ج ۷' ص:۹۱ مطبوعہ تہران)
''جہاں تک رِبَا النَّسِیْئَة کا تعلق ہے تو یہ دَورِ جاہلیت کا ایک مشہور و معروف عقد تھا اور وہ یہ کہ لوگ اس شرط کے ساتھ رقم دیا کرتے تھے کہ وہ ایک مقرر شدہ ماہانہ رقم وصول کیا کریں گے اور اصل سرمایہ ویسا ہی واجب الادا رہے گا۔ پھر مدّت کے اختتام پر وہ مقروض سے اصل سرمایہ کی واپسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اب اگر وہ ادا نہ کر سکا تو وہ مدّت اور واجب الادا رقم بڑھا دیتے تھے۔ یہ تھا وہ رِبا جو جاہلیت کے زمانے میں رائج رہا ہے۔''

بالکل یہی وضاحت ابنِ عدیل الدمشقی نے اپنی مفصل تفسیر ''اللُّباب'' ج ۴' ص ۴۴۸ میں بیان فرمائی ہے۔

رِبوٰ (سُود) کی لغوی اور اصطلاحی تعریفات کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۵۸۳' ۵۸۴ (جلد ہٰذا)

اضافی شرحِ سود کی بابت کچھ سوالات اور اُن کے جوابات : (1) کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ربا کی حرمت صرف اُن معاملات سے متعلق ہے جن میں سود کی شرح بہت زیادہ یا مرکب ہو۔ وہ اپنے موقف کی تائید میں سورہ آلِ عمران کی یہ آیت دیتے ہیں:
یٰٓأَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آلِ عمران : ۱۳۰)
''اے ایمان والو! تم سود نہ کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔''

آیت میں ربا کی حرمت کو أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (دگنا چوگنا کر کے) کے ساتھ مقیّد کیا گیا ہے جس کا مطلب

یہ ہے کہ صرف وہ ربا حرام قرار دیا گیا ہے جس کی شرح اتنی زیادہ ہو کہ وہ اصل سرمایہ سے دگنی ہو جائے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر سود کی شرح اتنی زیادہ نہ ہو تو وہ حرام نہیں ہے اور چونکہ بینکوں کے سود کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ اصل سرمایہ کے مقابلہ میں دگنی ہو جائے' لہٰذا وہ سود کی حرمت کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔''

یہ دلیل اس لئے بے بنیاد ہے کہ قرآن مجید میں سود کی قباحت اور حرمت سے متعلق تمام چاروں آیات سے یہ متصادم ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی اس آیت (۲۷۸) کو ہی لے لیجئے جس میں فرمایا گیا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سُود درہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم صاحبِ ایمان ہو۔''

آیت میں جملہ ''جو کچھ سُود رہ گیا ہے'' یہ بتا رہا ہے کہ اصل سرمایہ کے اوپر ہر مقدار چھوڑ دینی چاہئے۔ اس نکتے کو درج ذیل جملے میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (البقرة : ۲۷۹)

''اور اگر تم (عملِ ربا) سے توبہ کر لو تو تم صرف اصل سرمایہ کے مستحق ہو گے۔''

یہ الفاظ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں کہ عملِ ربا سے توبہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اصل سرمایہ کے اوپر ہر قسم کی رقم چھوڑی نہ جائے اور قرض دینے والا صرف اور صرف اصل سرمایہ کا مستحق ہو۔ سورۃ البقرۃ:۲۷۹ اور سورہ آلِ عمران: ۱۳۰ کی آیات کے مشترکہ مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سورۃ آلِ عمران میں موجود یہ الفاظ أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (دُگنا چوگنا کر کے) قیدِ احترازی نہیں ہیں اور ''دُگنا چوگنا'' ہونا حرمتِ ربا کی لازمی شرط نہیں ہے۔ بلکہ أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کے الفاظ درحقیقت ربا کی اُس بدترین صورت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے گئے ہیں جو اُس وقت رائج تھی۔''

''قانون کی کتابوں کے برخلاف قرآنِ کریم کچھ ایسے الفاظ یا جملے استعمال کرتا ہے جن کا مقصد مزید تاکید یا کسی فعل کی مزید قباحت بیان کرنا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد کسی امر یا نہی کے لئے قید لگانا نہیں ہوتا۔ قرآنِ پاک کے اِس انداز کے ثبوت کے لئے خود مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کافی ہے :

(۱) لَاتَشْتَرُوْا بِآيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرة : ۴۱)

''میری آیات کو کم قیمت پر مت بیچو۔''

''اس آیت کا کوئی شخص بھی یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا کہ قرآنی آیات کو فروخت کرنے کی حرمت کی وجہ اُس کی

قیمت کم ہونا ہے اور اگر اُسے مہنگے داموں فروخت کیا جائے تو جائز ہوگا۔ ذرا سی عقل رکھنے والا شخص بھی اس آیت میں ''کم قیمت پر'' کی قید کو قیدِ احترازی نہیں سمجھے گا بلکہ اس کا مطلب کچھ لوگوں کے عملِ بد کو واضح کرنا ہے کہ وہ اس قدر عظیم گناہ ذرا سی مالی منفعت کے عوض کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں ان پر ملامت کی وجہ سستے داموں بیچنا نہیں بلکہ خود بیچنے پر ملامت مقصود ہے۔''

(۲) وَلَاتُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اَلنُّور : ۳۳)
''اور اپنی لڑکیوں کو طوائف بننے پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامنی چاہتی ہوں۔''

''ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ اگر کوئی لڑکی پاک دامنی نہ چاہتی ہو تو اُسے کوئی شخص طوائف بننے پر مجبور کر سکتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عصمت فروشی از خود ایک بڑا گناہ ہے مگر اس کی برائی اُس وقت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے جب کوئی لڑکی پاکدامنی چاہے اور کوئی شخص اُسے عصمت فروشی پر مجبور کرے۔ اس آیت میں شرط کا اضافہ صرف اِس فعلِ بد کی قباحت میں اضافے کے لئے کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح سورہ آلِ عمران کی آیتِ ربا میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (دگنا چوگنا کر کے) کی قید صرف عملِ ربا کی مزید خرابی کو بیان کرنے کے لئے کی گئی ہے اور اس میں صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ رِبا کا گناہ اُس وقت اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے جب اُس کی شرحِ سود اتنی زیادہ یا دگنی ہو جائے۔ اس آیت کا یہ مقصد اُس وقت مزید واضح ہو جاتا ہے جب اس آیت (آلِ عمران) کو سورۃ البقرۃ کی آیات کی روشنی میں پڑھا جائے۔''

''نیز یہ کہ قرآن پاک کی تفسیر ہمیشہ اُس تشریح پر مبنی ہونی چاہیے جو حضور ﷺ کی احادیث اور آپ کے صحابہ کرام کے آثار میں مذکور یا اُن سے ماخوذ ہو کیونکہ دراصل وہی قرآنی آیات کے بلاواسطہ مخاطب تھے اور وہی قرآنی آیات کے سیاق و سباق اور اس پس منظر کو سمجھتے تھے جس کے تحت وہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ اس پہلو سے بھی اگر غور کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رِبا کی حرمت صرف مخصوص شرحِ سود تک محدود نہ تھی بلکہ حرمتِ سود اصل سرمایہ سے زائد ہر رقم پر محیط تھی خواہ وہ تھوڑی ہو یا زائد۔ درج ذیل احادیث اس نکتے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں:

(۱) حضور ﷺ نے رِبا کی حرمت کا اعلانِ عام اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں یوں فرمایا:
اَلَا اِنَّ كُلُّ رِبًا كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْع'' عَنْكُمْ كُلُّه'' لَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ وَاَوَّلُ رِبًا مَوْضُوْع'' رِبَاالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ مَوْضُوْع'' كُلُّه'' (تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۲، ص ۵۵۱، حدیث ۲۹۲۵ ؛ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ص ۳۳۱)
''سنو! تمام سُود کی رقوم جو دَورِ جاہلیت میں واجب الادا تھیں، وہ سب پوری کی پوری ختم کر دی گئیں۔ تم صرف اپنے اصل سرمایہ کے حقدار رہو گے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے اور سب سے پہلا سُود جس کے فسخ کا اعلان کیا جاتا ہے، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے جو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔''

''یہاں حضور ﷺ نے اصل سرمایہ سے زائد ہر قسم کی رقم کو مکمل طور سے ختم فرما دیا اور اس بات کی صراحت کر کے کسی قسم کا شبہ یا ابہام باقی نہیں رہنے دیا کہ قرض دینے والے صرف اپنے راس المال کے حق دار ہوں گے' اس کے علاوہ وہ ایک سکے کے بھی حقدار نہ ہوں گے۔''

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:
كُلُّ قَرْض جَرَّ مَنْفِعَةً فَهُوَ رِبٰوا (الجامع الصغیر للسیوطی' ج ۲' ص ۹۴)
''ہر ایسا قرض جو نفع کھینچے' وہ رِبا (سُود) ہے۔''

(۳) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے درج ذیل فتویٰ کا ذکر فرماتے ہیں:
مَنْ أَسْلَفَ سَلَفًا فَلاَ يَشْتَرِطْ إِلاَّ قَضَاءَهٗ (مؤطا امام مالك ص ٦١٣)
''جو شخص کسی کو قرض دے تو وہ اس کے ساتھ سوائے اس کی واپسی کی شرط کے کوئی دوسری شرط نہیں لگا سکتا۔'' (بحوالہ ''سود پر تاریخی فیصلہ'' (اردو ترجمہ) مفتی محمد تقی عثمانی' ص ص ۷۱ تا ۷۵)

(2) ان لوگوں کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حُرمتِ رِبا کی بنیادی وجہ ظلم ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ لاَ تَظْلِمُوْنَ وَلاَ تُظْلَمُوْنَo (البقرۃ: ۲۷۹)
''اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے واسطے تمہارا اصل سرمایہ ہے کہ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

''یہاں ''نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے'' کے الفاظ کی حرمت کی بنیادی علت ظلم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان مالدار لوگوں سے سود وصول کرنے میں قطعاً کوئی ظلم نہیں جنہوں نے خطیر رقم کمانے کے لئے بھاری بھاری رقمیں قرضے پر حاصل کیں۔ بینکوں اور مالیاتی اداروں کے تجارتی سُود میں چونکہ حرمت کی بنیادی علت موجود نہیں ہے' لہٰذا اسے ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

''دراصل یہ دلیل دو تصوّرات پر مبنی ہے: ایک یہ کہ حرمت کی بنیادی علت ظلم ہے اور دوسرے یہ کہ موجودہ سُودی نظام بینکاری میں یا تو کوئی ظلم نہیں ہے یا کم از کم بعض سُودی معاملات میں ظلم نہیں ہے۔''

''اس دلیل کے دونوں حصّے گہرے مطالعے کے بعد بھی قابلِ تسلیم نظر نہیں آتے۔ آیئے ان دونوں تصوّرات کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ کریں:

''علّت اور حکمت کے درمیان فرق: پہلا تصوّر جو ظلم کو حرمتِ رِبا کی بنیادی علّت قرار دیتا ہے' دراصل حرمت کی علت کو اُس کی حکمت سے خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے۔ اسلامی فقہ کا یہ ایک طے شدہ اُصول ہے کہ علت اور

حکمت کے درمیان بہت فرق ہے۔علت کسی معاملے کا ایسا وصف ہوتا ہے جس کے بغیر متعلقہ قانون اُس پر لاگو نہیں ہوتا جبکہ حکمت اُس مصلحت یا فلسفے کا نام ہے جو کوئی قانون ساز قانون بناتے وقت مدِّنظر رکھتا ہے۔اب قاعدہ یہ ہے کہ اگر کبھی کسی قانون میں علت (بنیادی صفت) پائی جائے جبکہ اُس کی حکمت اُس میں نظر نہ آ رہی ہو تو قانون پھر بھی اطلاق پذیر ہوگا۔یہ اصول غیر اسلامی قوانین پر بھی مسلّم ہے۔اس کی آسان مثال یہ ہے کہ قانون نے تمام گاڑی سواروں پر لازم کیا ہے کہ جب وہ سڑک پر جا رہے ہوں اور سرخ بتی جل رہی ہو تو وہ رُک جائیں۔اس قانون میں سرخ بتی کا جلنا علّت ہے جبکہ حکمت' حادثات سے بچاؤ ہے۔اب قانون ہر اُس وقت لاگو ہوگا جب بھی سرخ بتی جلے گی اور اُس کا اطلاق حادثے کے خوف ہونے یا نہ ہونے پر مبنی نہ ہوگا۔چنانچہ اگر سرخ بتی کھلی ہو تو ہر گاڑی رکنے پر مجبور ہوگی خواہ اس کے سامنے دونوں طرف کی سڑکوں سے کوئی ٹریفک نہ آ رہی ہو۔اس متعیّن صورت میں قانون کی بنیادی حکمت نظر نہیں آ رہی کیونکہ کسی قسم کے حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے' پھر بھی قانون اپنی قوت کے ساتھ اطلاق پذیر ہے کیونکہ سرخ بتی جو اس قانون کی بنیادی علت ہے' وہ موجود ہے۔''

''اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ قرآن پاک نے شراب حرام قرار دی ہے اور اُس کی حرمت کی علت نشہ ہے جبکہ شراب اور قمار دونوں کا بنیادی فلسفہ از روئے سورۃ المائدۃ:۹۱' لوگوں کے درمیان بغض اور عداوت کا پیدا کرنا اور اُنہیں اللہ کے ذکر سے روکنا ہے۔کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں شراب کافی عرصے سے پی رہا ہوں لیکن میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے لہٰذا شراب کی حُرمت یہاں نہیں پائی جا رہی اور وہ مجھ پر حلال ہونی چاہئے؟ یا کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب پینے کی وجہ سے میری کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور میں پابندی سے نماز اُن کے اوقات میں پڑھ لیتا ہوں' لہٰذا حرمتِ شراب کی بنیادی وجہ نہ پائے جانے کی وجہ سے شراب میرے لئے حلال ہونی چاہئے؟ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اِن دلائل کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ آیت مذکورہ میں بغض اور عداوت کے تذکرے کا مقصد اُس کی حُرمت کی علت بیان کرنا نہیں بلکہ اس میں تو صرف شراب اور قمار (جوا) سے پیدا ہونے والے ان بُرے نتائج کا ذکر ہے جو اکثر اُن سے پیدا ہوتے ہیں۔لہٰذا اُنہیں حُرمتِ حکمت یا فلسفہ تو کہا جا سکتا ہے' علت نہیں کہا جائے گا لہٰذا اُن کی حرمت اُن بُرے نتائج کے پائے جانے یا نہ پائے جانے پر منحصر نہیں ہوگی۔بالکل یہی صورتِ حال رِبا والی قرآنی آیت کے اندر بھی ہے کہ اُس میں ظلم کا تذکرہ حرمت کی حکمت اور فلسفے کے طور پر کیا گیا ہے۔لہٰذا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جہاں پر ظلم نظر نہ آ رہا ہو' وہاں پر حرمت نہیں آئے گی۔رِبا کی بنیادی علّت قرض کے معاملے میں وہ زیادتی ہے جو اصل سرمایہ کے اوپر طلب کی جائے اور جیسے ہی یہ علّت پائی جائے گی' حرمت آ جائے گی خواہ اُس صورت میں قانون کا فلسفہ اور حکمت نظر آئے یا نہ آئے۔''

پھر یہ بات بھی ہے کہ ''ظلم ایک ایسی مبہم اور اضافی اصطلاح ہے جس کی حقیقی ماہیت اور تعریف متعیّن کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ایک چیز جسے ایک نظام ظلم قرار دیتا ہے' تو دوسرا اُسے جائز قرار دیتا ہے۔اشتراکی نظریہ معیشت ذاتی ملکیت کو بذاتِ خود ظلم قرار دیتا ہے جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ ذاتی ملکیت ختم کرنے کو ظلم قرار دیتا

ہے۔ اس قسم کی مبہم اصطلاح کو کسی قانون کی علت قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' [''سود پر تاریخی فیصلہ'' (اردو ترجمہ)۔۔ مفتی محمد تقی عثمانی' ص ص ۸۷۔۹۰]

(3) کچھ لوگوں کے نزدیک ''ظلم یا رِبا کی جامع تعریف کا موجود نہ ہونا از خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے یہ سہولت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ خود فیصلہ کرلیں کہ اُن کے زمانہ کے مخصوص حالات میں ظلم کیا ہے؟''

''اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں نہ شراب کی تعریف مذکور ہے' نہ زنا کی' نہ چوری کی' نہ ڈاکے کی۔ یہاں تک کہ کفر کی بھی کوئی تعریف مذکور نہیں۔ اسی طرح قرآن میں اوامر مثلاً نماز' روزہ' حج اور جہاد کی بھی تعریف مذکور نہیں ہے۔ تو کیا اب ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ اِن اوامر میں سے کوئی بھی اپنا مخصوص مطلب نہیں رکھتا اور اس وجہ سے یہ تمام احکامات زمان و مکان کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ قرآن کریم نے اِن احکامات کی کوئی قانونی تعریف اس لئے نہیں دی کیونکہ اُن کے معانی خود اتنے واضح تھے کہ وہ محتاجِ وضاحت نہیں تھے۔ اس بات کا امکان تھا کہ اِن احکامات کی کچھ ذیلی تفصیلات بہت زیادہ واضح نہ ہوں اور وہ اختلافِ آراء کا سبب بن رہی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کے بنیادی تصورات ہی کو خلا میں تیرتا چھوڑ دیا گیا ہے جن کا کوئی مخصوص مفہوم ہی نہیں ہے۔'' (ایضاً ص ص ۹۰' ۹۲)

(4) کچھ لوگوں کے نزدیک آیاتِ ربا متشابہات آیات میں سے ہیں اور سورہ آلِ عمران کی آیت ہفتم میں حکم ہے کہ صرف اُن آیات پر عمل کیا جائے جو معانی کے لحاظ سے بالکل واضح (محکمات) ہوں اور متشابہات کا اتباع نہ کیا جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک رِبا کی آیات دوسری قسم میں داخل ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل نہیں ہیں۔''

یہ دلیل باطل ہے کیونکہ سورۃ البَقَرۃ کی آیت ۲۷۹ میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے جو عملِ رِبا سے باز نہیں آتے۔ کوئی شخص یہ تصوّر کیسے کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دانائے کُل اور رحیم و کریم ذات نے کیسے ایسے عمل کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے جس کی صحیح حقیقت کسی کو معلوم ہی نہ ہو؟ درحقیقت ''متشابہات'' کی اصطلاح سورہ آلِ عمران کی ابتداء میں دو قسم کی قرآنی آیات کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ ''متشابہات'' کی پہلی قسم میں وہ بعض الفاظ داخل ہیں جو بعض سورتوں کے شروع میں استعمال ہوئے ہیں اور جن کے صحیح معنی کسی کو بھی یقینی طور پر معلوم نہیں۔ مثلاً الٓمّرٰا لیکن اُن کے صحیح معانی کا نا معلوم ہونا مسلمانوں کی زندگیوں پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ شریعت کا کوئی حکم ان الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ''متشابہات'' کا لفظ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کچھ ایسی صفات کے لئے استعمال ہوا ہے جن کی صحیح ماہیت کسی بھی انسان کے لئے نا قابلِ تصوّر ہے' مثلاً سورہ آلِ عمران کی آیت ۷۳' سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۴ اور سورۃ الفتح کی آیت دہم میں یَدُاللہِ (اللہ کا ہاتھ) کے الفاظ

آئے ہیں۔ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کی حقیقت کیا ہے اور نہ ہی یہ بات کسی کے لئے جاننا ضروری ہے کیونکہ کوئی عملی مسئلہ اس کے معلوم ہونے پر موقوف نہیں لیکن بعض لوگ اُن کی صحیح حقیقت کی کھوج میں لگ گئے حالانکہ نہ اس حقیقت کا دریافت کرنا اُن کی ذمہ داری تھی' نہ شریعت کا کوئی عملی حکم اُن کی فہم پر موقوف تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو اُن صفات کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں جستجو اور قیاسی بحثوں سے منع فرمایا ہے کیونکہ شریعت کے واجب الاتباع احکام سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شریعت کے کسی عملی حکم کو ''متشابہات'' کی اصطلاح میں داخل کر دیا گیا ہو۔ اس بات کا اعلان نہ صرف سورۃ البَقَرۃ کی آیت ۲۸۶ میں کیا گیا ہے بلکہ یہ ہر شخص کی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کسی ایسے حکم کا مکلف نہیں فرماتے جس پر عمل کرنا اُن کی طاقت سے باہر ہو۔ اگر ''رِبا'' کے صحیح معنی کسی بھی شخص کو معلوم نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ذمہ یہ بات لازم کیوں کرتے کہ وہ رِبا سے پرہیز کریں۔ سورۃ البَقَرۃ کی آیاتِ رِبا کے سادہ مطالعہ ہی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ رِبا کو ایک سخت گناہ قرار دیا گیا ہے اور اس گناہ کی شدّت اس سخت انداز میں بیان کی گئی ہے کہ اگر مسلمانوں نے اِس عمل کو ترک نہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔'' (ایضاً ص ۴۲۔۴۴)

(5) رِبا اور نظریہ ضرورت : بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآنِ پاک نے انسان کو اپنی سخت بھوک کی حالت میں زندگی بچانے کے لئے خنزیر کھانے کی بھی اجازت دی ہے (سورۃ البقرۃ: ۱۷۳؛ سورۃ المائِدۃ: ۳) اور سود پر مبنی نظام ایک ایسی عالمگیر ضرورت بن چکا ہے کہ کوئی بھی ملک اِس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سود کو بلا شک وشبہ قرآنِ پاک نے حرام قرار دیا ہے تاہم ملکی سطح پر اُس کی حرمت کا نفاذ ایسی خودکشی کے مترادف ہوگا جو تمام ملکی معیشت کو نقصان پہنچائے گا' اس لئے اسے اسلامی احکامات کے خلاف قرار نہیں دینا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آج پوری دنیا ایک عالمی بستی کی شکل اختیار کر چکی ہے اور کوئی ملک تنہا نہیں رہ سکتا' بالخصوص ہمارا ملک جو کہ قرضوں تلے دبا ہوا ہے اور اس کے تمام ترقیاتی منصوبے زیادہ تر غیر ملکی سودی قرضوں پر منحصر ہیں' ایک مرتبہ اگر مکمل طور پر سود کی حرمت نافذ کر دی جائے تو یہ تمام ترقیاتی منصوبے آخری سانس لیں گے اور پوری معیشت اچانک زوال کا شکار ہو جائے گی۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کبھی کسی ایسے حکم پر کسی بھی فرد یا حکومت کو مجبور نہیں کرتا جس کی تعمیل اُس کے اختیار سے باہر ہو۔ ''نظریہ ضرورت'' اُن نظریات میں سے ہے جو قرآن کریم اور سنتِ رسول ﷺ سے مستنبط اور ماخوذ ہیں اور جسے مسلمان فقہائے کرام نے تفصیلاً بیان بھی کیا ہے۔ یہ تسلیم کہ قرآن کریم نے شدید اضطراری کیفیت میں خنزیر کھانے کی بھی بقدرِ ضرورت اجازت دی ہے جس کے بغیر جینا مشکل ہو جائے۔ لیکن اسلام میں نظریہ ضرورت کا تصور مجمل اور مبہم نہیں ہے۔ مسلمان فقہائے کرام نے قرآن وسنت سے استنباط کر کے اس کے کچھ ایسے اوصاف بیان فرمائے ہیں جن سے ضرورت کی شدّت اور مقدار معلوم ہوتی ہے کہ ضرورت کے مواقع پر کس حد تک قرآن وسنت کے احکام کے مطابق گنجائش دی جا سکتی ہے۔ اسی لئے ضرورت کی بنیاد پر کسی بھی مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اس بات کی یقین دہانی ضروری ہوگی کہ ضرورت حقیقی ہے اور خیالی اندیشوں اور ملمع سازی پر مبنی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس ضرورت

کی تکمیل اس ناجائز کام کے سرانجام دیئے بغیر ناممکن ہے۔ اِس اصول کی روشنی میں سود کے بارے میں غور کرنے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس بارے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا جارہا ہے کہ سود کا بالکلیہ خاتمہ کرنا معیشت کے خاتمے کا سبب بنے گا۔ حقیقت پسندانہ تجزیے کے لئے ہمیں معروضی طور پر غور کرنا ہوگا۔''

''سُود کے خاتمے کے خلاف خدشات اس بات پر مبنی ہیں کہ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ سود کے خاتمے کا مقصد بینکوں کو خیراتی اداروں میں تبدیل کردینا ہے اور بینک اسلامی نظام کے تحت رقمیں کسی نفع کے بغیر تمویل (فنانس) کریں گے، لہٰذا کھاتہ داروں کو بھی بینکوں میں رکھی گئی رقوم کے عوض کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دراصل اسلام میں قرض کا کردار تجارتی معیشت میں بہت محدود ہے۔ بینکوں اور تمویلی اداروں کو اسلامائز کرنے کا مطلب بغیر نفع کے تمویل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر اور دوسرے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی بنیاد پر تمویل(Finance) کریں گے جن میں سے کوئی بھی نفع کے بغیر نہیں ہوگا۔''

''کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اسلامی اصولوں پر مبنی متبادل بینکاری نظام ابھی تک نہ تو تیار کیا گیا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی اچانک تعمیل کرنے سے ہم ایک ایسے تاریک اور مبہم علاقے میں داخل ہوجائیں گے جو ہمیں اَن دیکھے خطرات کی طرف دھکیل دے گا جو ہماری معیشت پر مکمل تباہی لاسکتا ہے۔''

''یہ خدشہ درحقیقت موجودہ بینکاری نظام کے بارے میں نئے افکار اور اسلامی بینکاری نظام کے میدان میں گزشتہ تین دہائیوں میں کی گئی مساعی سے بےخبری کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی بینکنگ کوئی دیومالائی تصوّر (Utopian Idea) یا افسانوی خواب نہیں ہے۔ مسلمان فقہائے کرام اور معاشی ماہرینِ اسلامی بینکاری کے مختلف میدانوں میں تقریباً پچاس سال سے کام کررہے ہیں اور 1970ء سے اسلامی بینکاری کا تصوّر ایسے حقیقی اداروں کے روپ میں تبدیل ہوا جو اسلامی خطوط کے مطابق کام کررہے ہیں۔ پوری دنیا میں اسلامی بینکوں اور تمویلی اداروں کی تعداد تین دہائیوں سے روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اسلامی بینکوں اور تمویلی اداروں کی تعداد 65 ممالک میں نو بلین ڈالرز کے سرمایہ اور پندرہ فیصد سالانہ اضافہ کے ساتھ 200 سے زائد ہے۔'' (ایضاً ص ص ۱۴۰، ۱۴۱)

''موجودہ اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) جدّہ کو آرگنائزیشن آف اسلامی کانفرنس (.O.I.C) نے 1975ء میں اسلامی بینکاری کے موجد کے طور پر قائم کیا تھا جس کا اوّلیں مقصد رکن ممالک کے ترقیاتی منصوبوں کے واسطے بین الحکومتی تمویلی عقود (Financial Agreements) کے ذریعے سرمایہ فراہم کرنا تھا لیکن یہ اب نجی شعبے میں بھی تجارتی تمویل (ٹریڈ فنانس) کی سہولت فراہم کررہا ہے۔ یہ بینک اب اپنا ایک تحقیقی مرکز قائم کئے ہوئے ہے جو اسلامی بینکاری اور معیشت کے مختلف مسائل پر کام کررہا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۴۱)

''اسلامی بینکاری دو لحاظ سے بڑی قابلِ امتیاز ہے: ایک یہ کہ وہ معیشت کے حقیقی شعبے میں مرتکز ہے۔ مالیاتی

بہاؤاوراشیاء وخدمات کے درمیان ایک شناخت پیدا کرکے، نفع ونقصان میں شرکت کے اعلیٰ نظام کو اپناتے ہوئے یہ معاشی نظام میں زبردست استحکام پیدا کرتی ہے۔ یہ معاشرے کو قرضوں کے بوجھ سے بچاتی ہے، اس وجہ سے کہ اگر کبھی معیشت بحران کا شکار ہوجائے تو نفع نقصان میں شراکت کے اصول، ریاست اور معاشی کارکنان کو اجتماع سُود کی خرابیوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور دیوالیہ پن اور نادہندگیوں کے خطرات کم کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۱۴۴)

نفع ونقصان میں شرکت : اسلامی تمویل کی بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک متعین شرح سود کی بجائے نفع اور نقصان پر مبنی ہوتی ہے۔ قرض پر مبنی معیشت کے تباہ کن نتائج کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ہیں۔ قرض پر مبنی معیشت کی تباہ کاریوں کو محسوس کرتے ہوئے بہت سے معیشت دان یہاں تک کہ مغربی معیشت دان بھی شراکت پر مبنی تمویلی نظام کی حمایت کررہے ہیں۔ مثلاً John Tomlinson نامی ایک کینیڈین معیشت دان نے اپنی کتاب "Honest Money : A Challenge of Banking" جو Helix میں 1993ء میں شائع ہوئی، کے صفحات ۱۱۵ و ۱۱۸ پر لکھا ہے کہ:

''شراکت پر مبنی نظام سے بازاروں کو بھی عمومی طور سے فائدہ ہوگا۔ قرض کی شراکت کی طرف منتقلی زر کی قیمت میں استحکام کا سبب بنے گی چنانچہ بچتیں اپنی قدر و قیمت برقرار رکھ سکیں گی، قیمتوں کا اُتار چڑھاؤ کسی پیداوار کی طلب و رسد کے پیمانہ تقویم کے ذریعے ہی ہوگا، لوگوں کے مختلف زمانوں میں تبادلے کی قدر و قیمت کی پیائش کا صحیح طریقے سے اندازہ ہوسکے گا، زر کی اکائی ایک مرتبہ پھر قدرِ تبادلہ کی پیائش کی ایک صحیح اکائی ہوگی، اور بہت سی خرابیوں کی اصلاح ہوجائے گی۔ مجوزہ ترامیم بہت سے لوگوں کو قرضوں کی غلامی سے آزاد کردیں گی، قومیں اور افراد دوبارہ اپنی عظمت حاصل کرلیں گے، وہ اپنی پسند کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں گے اور منیجروں کو اس قسم کی چوائس کا کوئی سامنا نہیں کرنا پڑے گا کہ یا تو وہ سود ادا کریں اور کچھ ملازمین کو نکال دیں یا سود ادا نہ کریں اور سب ملازمین کو فارغ کردیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اُس دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو موجودہ نظام میں تجارتی چکروں سے پیدا ہوتا ہے، تجارتی نفع کے ایک مرکز کے طور پر نئی سرمایہ کاری کے مواقع تسلسل کے ساتھ تلاش کئے جائیں گے کیونکہ انفرادی بچتوں اور تجارتی منافع میں سے ہر ایک یہ چاہے گا کہ فالتو روپیہ کو محفوظ رکھنے کی فیس ادا نہ کرنی پڑے، نیز ترقی نئے قرضوں کی تخلیق پر منحصر نہیں ہوگی بلکہ نئے تصوّرات اور نئے پیداواری مواقع کی مسلسل ترقی پر منحصر ہوجائے گی، زر کی قدر کے دوبارہ مضبوط ہونے سے انسانی تصادم کے ایک اہم سبب کا خاتمہ ہوجائے گا، زر اُن لوگوں سے چپکے سے چوری نہیں ہوگا جو طویل المیعاد معاہدوں میں سرمایہ لگاتے ہیں یا بچت کرکے رکھتے ہیں یا جن کی آمدنی متعیّن ہے۔ مزید یہ کہ اچھا ذاتی کردار رکھنے والوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان زیادہ ہوگا، شراکت پر مبنی مارکیٹ میں باہمی آزادی واستقلال کو تسلیم کرنا دوسروں کی ضروریات کی مزید فکر کرنے کا باعث بنے گا جس کی انتہاء مزید رحمدل اور مددگار معاشرہ کا قیام ہوگی۔'' (ایضاً ص ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۵۴-۱۵۶)

اسی طرح ایک اور Philip Moore نامی معیشت دان اپنی حالیہ تحقیق میں لکھتے ہیں:

''اسلامی معاشی اصولوں پر مبنی معیشت کا طریقہ تیز رفتاری کے ساتھ پوری دنیا میں پسند کیا جا رہا ہے اور پوری دنیا میں اسلامی تمویل کی بیداری کی جو لہر ہے' اسے بعض حضرات اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ دنیا بھر کی معیشت واضح طور سے قرضوں پر مبنی نظام سے شرکت کے نظام کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور یہ لہر اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔--- شاید حقیقت یہ ہے کہ مغربی دنیا نادانستگی میں تین عشروں سے زائد عرصے سے تمویل کے اسلامی اصولوں کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔'' ("Islamic Finance : A Partnership of Growth" p. 173, Economy Publishers, 1997)

''<u>روپے کی ماہیت</u> : ایک غلط تصور جس پر تمام سودی نظریات کی بنیاد ہے' وہ یہ ہے کہ نقدی کو سامان (جنس) کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اسی لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح سامان کو اپنی اصل لاگت سے زائد نفع پر فروخت کیا جا سکتا ہے اُسی طرح نقدی کو بھی اُس کی قیمت اسمیہ سے زائد پر فروخت کیا جانا چاہئے' یا جس طرح کوئی شخص اپنی جائیداد کو کرایہ پر چڑھا سکتا ہے' اُسی طرح وہ نقدی کو بھی کرایہ پر دے کر ایک مخصوص اور متعین سود یا کرایہ پر دے سکتا ہے۔'' (ایضاً)

<u>نقدی اور سامان (جنس) میں فرق</u> : ''اسلامی اصول اس نقطہ نظر کی حمایت نہیں کرتے۔ نقدی اور جنس (سامان) میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ اس لئے اسلام میں دونوں کے ساتھ معاملہ بھی الگ الگ کیا گیا ہے۔ نقدی اور سامان کے درمیان بنیادی فرق درج ذیل طریقوں سے واضح کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) نقدی کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ اور استعمال نہیں ہے۔ اُسے انسانی ضروریات پورا کرنے کے لئے بلاواسطہ استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُسے صرف کچھ سامان یا خدمات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس سامان کی اپنی افادیت ہوتی ہے' اُسے ذریعہ مبادلہ بنائے بغیر بھی استعمال کر کے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

(۲) اشیاء یا سامان مختلف اوصاف کے ہو سکتے ہیں جبکہ نقدی میں اوصاف کا کوئی اعتبار نہیں۔ نقدی کے تمام اجزاء برابر مالیت کے سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک ہزار روپے کا میلا کچیلا' پرانا نوٹ وہی مالیت رکھتا ہے جو بالکل نیا نویلا ایک ہزار روپے کا نوٹ رکھتا ہے۔

''(۳) سامان کی خرید و فروخت کسی متعین اور شناخت شدہ چیز سے متعلق ہوتی ہے مثلاً زید بکر سے ایک کار اشارے کے ذریعے متعین کر کے خریدتا ہے تو اب زید اُسی کار کے لینے کا حقدار ہے جو اشارہ کر کے متعین کی گئی تھی۔ بیچنے والا اُسے کوئی دوسرے کار لینے پر مجبور نہیں کر سکتا' خواہ وہ اُنہی خصوصیات کی حامل ہو۔

''اس کے برخلاف رقم کسی خرید و فروخت کے معاملے میں اشارے کے ذریعے متعین نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً زید نے بکر سے ایک چیز ایک ہزار روپے کا مخصوص نوٹ دکھلا کر خریدی۔ جب ایک ہزار کی ادائیگی کا وقت آیا تو اُسے

اختیار ہے کہ وہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ایک ہزار کا نوٹ بکر کو دے دے۔''

''مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامیہ نے نقدی کا حکم سامان سے الگ رکھا ہے۔ اگر استثنائی حالات میں نقدی کا تبادلہ نقدی سے کرنا ہی پڑے یا اُسے قرض لیا جا رہا ہو تو دونوں طرف کی ادائیگی برابر ہونی چاہیئے تاکہ اُسے اس کے لئے استعمال نہ کیا جا سکے جس کے واسطے اُسے نہیں بنایا گیا یعنی خود نقدی کی تجارت کرنا۔'' (ایضاً)

سود کے مجموعی اثرات: سودی قرضوں کا دائمی رُجحان یہ ہے کہ وہ مال داروں کو فائدہ اور عام آدمیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ سودی لین دین ظلم پر مبنی نظام ہے۔ یہ پیدائشِ دولت، وسائل کی تخصیص اور تقسیمِ دولت پر بھی منفی اثرات لاتا ہے۔ ان میں سے چند اثرات ذیل میں درج ہیں:۔

''(۱) وسائل کی تخصیص پر اثراتِ بد: موجودہ بینکاری نظام میں قرضے زیادہ تر اُن لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو مال و دولت کے لحاظ سے خوب مضبوط ہوتے ہیں اور وہ ان قرضوں کے لئے آسانی کے ساتھ رہن (Collateral) مہیا کر سکتے ہیں۔''

''(۲) پیداوار پر بُرے اثرات: چونکہ سود پر مبنی نظام میں سرمایہ مضبوط رہن گروی (Collateral) کی بنیاد پر فراہم کیا جاتا ہے اور فنڈز کا استعمال تمویل کی لئے کسی قسم کا بنیادی معیار قائم نہیں کرتا، اسی واسطے یہ لوگوں کو اپنے وسائل کے پار رہنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ مالدار لوگ صرف پیداواری مقاصد کے لئے ہی قرضے نہیں لیتے بلکہ عیاشانہ خرچوں کے لئے بھی قرضے لیتے ہیں۔''

''اسی طرح حکومت صرف حقیقی ترقیاتی پروگرام کے لئے قرضے نہیں لیتی بلکہ فضول اخراجات اور اپنے اُن سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی قرضے لیتی ہے جو صحت مند معاشی فیصلوں پر مبنی نہیں ہوتے۔ منصوبوں سے غیر مربوط (Non-Project Related) قرضے جو کہ صرف سود پر مبنی نظام میں ہی ممکن ہیں، اُن کا فائدہ قرضوں کے سائز کو خطرناک حد تک بڑھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

''(۳) تقسیمِ دولت پر اثراتِ بد: موجودہ بینکاری نظام میں بینک ہی کھاتہ داروں کا سرمایہ بڑے بڑے تاجروں کو فراہم کرتے ہیں۔ تمام بڑے تجارتی منصوبوں کی تمویل بینکوں یا مالیاتی اداروں کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ متعدد حالات میں تاجروں کا اپنی جیب سے لگایا ہوا سرمایہ اُس سرمایہ کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے جو اُنہوں نے عوام کا سرمایہ بینکوں اور مالیاتی اداروں سے قرض کی صورت میں لیا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایک تاجر کا اپنا سرمایہ صرف دس ملین ہو تو وہ نوّے ملین بینک سے لے کر عظیم نفع بخش تجارت شروع کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نوّے فیصد

پروجیکٹ کھاتہ داروں کے وسائل سے اور دس فیصد خود اُس کے اپنے وسائل سے شروع کیا گیا ہے۔ اگر یہ عظیم پروجیکٹ بہت زیادہ نفع کمائے تو اس کا بہت تھوڑا سا تناسب جس کی حدود مختلف ممالک میں دو فیصد سے دس فیصد تک ہوتی ہیں' اُن کھاتہ داروں کو ملتا ہے جن کی سرمایہ کاری اس منصوبے میں نوّے فیصد تھی جبکہ بقیہ سارا نفع وہ تاجر لے جاتا ہے جس کا سرمایہ صرف دس فیصد لگا ہوا ہوتا ہے اور پھر یہ تھوڑی رقم جو کہ کھاتہ داروں کو دی گئی ہوتی ہے' واپس اُنہی بڑے بڑے تاجروں کی جیب میں چلی جاتی ہے کیونکہ وہ تمام رقم جو اُنہوں نے سُود کی شکل میں ادا کی تھی' وہ اپنی پیداوار کے اخراجات میں شامل کر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کا صافی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام بڑی بڑی تجارتوں کا نفع صرف اُن لوگوں نے کمایا جن کی اپنی خود سرمایہ کاری دس فیصد سے زائد نہ تھی' جبکہ جن لوگوں کی سرمایہ کاری نوّے فیصد تھی' اُنہوں نے درحقیقت کچھ نہ کمایا کیونکہ اُنہیں سُود کی شکل میں جو کچھ نفع ملا تھا اسے اس پیداوار کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے واپس انہی تاجروں کو ادا کرنا پڑ گیا بلکہ بہت سی صورتوں میں اُن کا نفع حقیقی معنوں میں منفی ہو گیا۔'' (ایضاً ص ص ۱۱۲۔۱۱۶)

(۴) اخلاقی اعتبار سے سود انسان کو خودغرض' بخیل اور تنگ دل بناتا ہے جبکہ اس کے مقابل اللہ کی راہ میں صدقہ دینے سے ہمدردی' قربانی وایثار اور اعلیٰ ظرفی کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۵) معاشرتی اعتبار سے خودغرضی اور بخل کے نتیجے کے طور پر معاشرہ میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور باہمی ربط وتعاون میں کمی آتی ہے۔

(۶) معاشی اعتبار سے سُود سرمایہ کاری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ سُود کی بجائے منافع میں شرکت سے سرمایہ کاری کے راستے کی تمام رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں اور روزگار کی سطح بلند ہوتی ہے۔

(۷) بین الاقوامی اور قومی قرضوں پر سُود کی ادائیگی کی وجہ سے پوری قوم مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔ بجٹ' مصارف اور قرضہ (سود اور قرضہ کی واپسی) کی وجہ سے غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ وسائل ترقیاتی کاموں پر خرچ ہونے کی بجائے سُودی قرضوں کی ادائیگی اور سود کی ادائیگی پر خرچ ہوتے چلے جاتے ہیں اور پوری معیشت نامساعد معاشی حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔

اسلام کا نظامِ زکوٰۃ (Poor-due): صاحبِ نصاب مسلمان کا اپنے مال کا اڑھائی فیصد غرباء ومساکین کو دے دینا کوئی ٹیکس نہیں ہے جیسا کہ بعض کم فہم لوگوں نے سمجھا بلکہ (۱) وہ مالی عبادت ہے (۲) وہ مال کی تطہیر (پاک کرنے) کا ذریعہ ہے جیسا کہ زکوٰۃ کا لفظ اپنے معنی کے لحاظ سے بتا رہا ہے اور (۳) غرباء ومساکین کا اُس مال کی زکوٰۃ پر حق ہوتا ہے اور اُمراء کی طرف سے اُن پر کوئی احسان نہیں ہوتا (سورۃ الذّاریٰت: ۱۹ ؛ سورۃ المعارج: ۲۴' ۲۵)۔ (۴) زکوٰۃ دینے سے مال میں کمی نہیں آتی بلکہ اُس میں خیر وبرکت اور اضافہ ہوتا ہے (سورۃ الرُّوم :۳۹)

اگر زکوٰۃ کو ''مالی عبادت'' کی بجائے ٹیکس سمجھا جائے تو زکوٰۃ کے اصل مقاصد یعنی روحانی اور اَخلاقی فوائد فَوت ہو جائیں گے اور اجتماعی فلاح و بہبود کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ لفظ ''زکوٰۃ'' کی بذاتِ خود تعبیر و مفہوم پاک وصاف کرنے کی ہے اور عبادت کا یہ عمل خوشحال لوگوں پر فرضِ عین ہے تا کہ اُن کا مال ہر قسم کی آلائش سے پاک وصاف ہو جائے جس کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہے جس میں نبی علیہ السلام کو حکمِ الٰہی ہوا :

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (اَلتَّوبة : ۱۰۳)

''آپ اُن کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے' اُس کے ذریعہ سے آپ اُنہیں پاک وصاف کر دیں گے۔'' (۹ : ۱۰۳)

زکوٰۃ کو اسلام کے پانچ ستونوں میں سے محض ایک ستون ہی نہ سمجھا جائے بلکہ اُس کا معاشرتی اور معاشی اثرات کے لحاظ سے بھی جائزہ لیا جائے۔ زکوٰۃ کا مقصد غربت و ناداری کو جڑ سے اکھیڑنا ہے جیسا کہ نبی معظم ﷺ کی اُس ہدایت سے ظاہر ہے جو آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا عامل (گورنر) بناتے وقت دی تھی جس میں آپ نے فرمایا تھا :

''لوگوں میں اعلان کر دیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کے اُمراء پر زکوٰۃ کی ادائی فرض کر دی ہے جو اُن سے لے کر غرباء کو دی جائے گی۔''

زکوٰۃ کی اہمیّت کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جا سکتا ہے کہ (۱) قرآن مجید میں اس کا حکم تیس سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ (۲) پہلے خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن لوگوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا جنھوں نے زکوٰۃ اور نماز کے درمیان فرق کیا۔

اسلام کے عظیم ترین اور مستند مفکر شاہ ولی اللہ محدّثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کس خوبصورتی سے زکوٰۃ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''اِس حقیقت میں کسی غلطی کو راہ نہیں پانا چاہئے کہ زکوٰۃ کا حکم دو مقاصد کے لئے دیا گیا ہے: (۱) ضبطِ نفس اور (۲) معاشرتی غربت وعُسرت کو دُور کر کے معاشی خوشحالی لانا۔ دولتمندی 'چھن' خود غرضی' باہمی نفرت و بے رغبتی اور اخلاقی انحطاط (زوال) کو جنم دیتی ہے۔ اِن برائیوں کا بہترین علاج یہ ہے کہ اپنے مال میں سے غریبوں اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کی جائے۔ یہ عمل دل کی خلش کو جڑ سے اُکھیڑ دیتا ہے اور یہ خود غرضی کا علاج بھی ہے۔ یہ معاشرتی فرق کو حل کرتا ہے اور لوگوں میں بھائی چارہ (اخوّت) قائم کرنے کا موجب ہے۔ یہی جذبہ اخوّت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگِ بنیاد بن جاتا ہے۔ ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے یہ ایماندارانہ جذبہ خوش معاملگی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ سست رفتاری سے سہی لیکن یہ شریفانہ

خصلتیں یقینی طور پر انسان کو اخلاقی عمدگی کے نمونہ میں بدل دیتی ہیں اور اس کا مطلب ضبطِ نفس کے ذریعے اصلاحِ نفس ہے۔"

"زکوٰۃ معاشرتی اور طبقاتی خستہ حالی کے خلاف تحفظ کا انتہائی مؤثر ذریعہ ہے کیونکہ سماجی ڈھانچہ اُس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی اقتصادی بنیاد مضبوط نہ ہو۔ اپنی اقتصادی میکانیت کی بدولت سماج اپنے افراد کی ضروریات اُن کے مقام اور پوزیشن کے مطابق پوری کر سکتا ہے۔ یہ گداگری کو پھیلنے سے روکتا ہے کیونکہ ایسے معاشرہ میں حاجتمندوں' بیماروں' اپاہجوں' یتیموں' بیواؤں اور اسی طرح کے دوسرے ضرورتمندوں کی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کیا جاتا ہے اور اُنہیں گداگری کی ذلت اور رسوائی سے بچایا جاتا ہے۔ اُن کی روزی اور رزق کی فراہمی کی ذمہ دار حکومت ہی ہے لیکن وہ اس عظیم اور بھاری فرض سے تبھی عہدہ برآ ہوسکتی ہے جب مفید عوامی مالیاتی ذریعہ کے علاوہ اُمراء کی جانب سے زکوٰۃ کی صورت میں مال و زر کی مناسب فراہمی ہو۔" ("Economics and Islam" ... Dr. Muhammad Musleh-ud-Din, pp. 79, 80)

"مضاربہ: مضاربہ میں ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور سرمایہ استعمال کرنے والا اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر کاروبار چلاتا ہے۔ دونوں کاروبار کے نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ آجکل مضاربہ سرٹیفکیٹس بھی استعمال میں آرہے ہیں جنہیں کاروباری کمپنیاں فروخت کرتی ہیں۔ اُن کی میعاد کا تعین حکومت کرتی ہے اور اُن کے خریداروں اور کمپنی کے درمیان نفع ونقصان کی شراکت اور رقم کی واپسی کے بارے میں تمام معاملات طے شدہ ہوتے ہیں۔"

"اجارہ (Leasing): اسلامی قانونِ معیشت کی رُو سے اجارہ بھی کسبِ معاش کا جائز طریقہ ہے۔ اس طریقہ میں کوئی مشین' موٹر کار' بحری جہاز' مکان وغیرہ جیسا اثاثہ' اجارہ پر دینے والا مالک کرایہ دار کو مخصوص مدت کے لئے اور مخصوص قیمت کے عوض اجارہ پر دیتا ہے۔ ہر دو فریقین کی ذمہ داری سے متعلق کسی بھی غیر یقینی عنصر سے بچنے کے لئے ہر فریق کی سرمایہ کاری اور منافع معاہدہ کی دستاویز میں واضح طور پر لکھا جانا چاہئے۔ اسلامی بینکوں میں تمویل کا یہ طریقہ بہت ہردلعزیز ہورہا ہے اور اس قسم کا کاروبار کرنے والے بہت اہم بینک یہ ہیں: اسلامی ترقیاتی بینک' اسلامی بینک ملیشیا اور پاکستان کے تجارتی بینک۔"

"اس طریقہ تمویل میں بینک کوئی حقیقی اثاثہ خرید کر اپنے کسی گاہک کو اجارہ پر دے دیتا ہے جس کی مدت کا تعین اثاثے کی نوعیت کے مدِ نظر فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اجارہ کی مدت کے دوران اثاثہ جات بینک کی ملکیت میں رہتے ہیں لیکن اثاثہ پر حقیقی قبضہ اور اس کے استعمال کا حق کرایہ دار کو حاصل ہوتا ہے۔ اجارہ داری

کی مدّت کے اختتام پر تمام تر اثاثہ اُس کے اصل مالک کی طرف لوٹ آتا ہے۔" ("Elimination of Riba from the Economy"... Edited by : Khurshid Ahmad etc., pp. 363, 364)LHR.1995

"حکومت کے مُلکی قرضے :سُود کے خاتمے کے سلسلے میں ایک بڑی مشکل حکومتی قرضوں کو قرار دیا جا رہا ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان ملکی اور غیر ملکی قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جہاں تک ملکی قرضوں کا تعلق ہے' تو اُنہیں پروجیکٹ فنانس کی بنیاد پر ڈیزائن کیا جانا چاہئے۔ یہ طریقہ شریعتِ اسلامی کے مطابق ہونے کی وجہ سے قرضوں پر حاصل شدہ رقوم کی خورد بُرد' خیانت اور غلط استعمال سے روکنے میں مددگار رہوگا۔ اس شعبے کو اسلامی طریقے سے بدلنے کے لئے بینکاری کے پرائیویٹ معاملات کی بہ نسبت زیادہ مہلت کی ضرورت ہوسکتی ہے۔"

"حکومت کے غیر ملکی قرضے : یہ خیال کہ غیر ملکی قرضے ترقی پذیر ممالک کے ترقی کے منصوبوں میں مددگار رہوتے اور خوشحالی لانے کا سبب بنتے ہیں' تیسری دُنیا کے بہت سارے ممالک کی حالت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جھوٹا اور غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس خیال کا بڑھتا ہوا احساس آزاد معیشت دان کر رہے ہیں۔"

"اسلامی بینکوں کی پیدا کردہ فضا کے نتیجے میں ان اسلامی طریقہ تمویل سے مغرب اب ناواقف نہیں رہا۔ یہاں تک کہ بین الاقوامی تمویلی ادارے بھی اُنہیں سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ آئی ایف سی (انٹرنیشنل فنانس کارپوریشن جو عالمی مالیاتی ادارے سے ملحق ہے) نے پہلے ہی سے اسلامی طریقہ ہائے تمویل استعمال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اثاثوں سے وابستہ قرضے آسانی کے ساتھ اجارہ کے طریقہ تمویل میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ پروجیکٹ سے وابستہ قرضے آسانی سے استصناع کی بنیاد پر تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ قرضہ دینے والوں کی توجہ صرف اپنی تمویل کے اوپر نفع کی طرف ہوتی ہے' وہ کسی مخصوص طریقہ تمویل پر اصرار نہیں کرتے' اس لئے موجودہ قرضوں کو اسلامی خطوط پر منتقل کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے۔ نئی تمویلات کے لئے اور بھی زیادہ متنوع قسم کے طریقہ ہائے تمویل موجود ہیں جنہیں اسلامی خطوط پر تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ اُسی وقت ممکن ہے جب حکومت خود اسلامی ذمّہ داریوں کو پورا کرنے کا عزم رکھتی ہو۔ معذرت خواہانہ انداز کبھی بھی دوسروں کو اتنے پرانے عرصے سے زیرِ استعمال طریقوں کو تبدیل کرنے پر راضی نہیں کرسکتا۔ آئی ایف سی کے صدر حالہ اسپنگ طرز کی مجوّزہ سرمایہ کاری پر بورڈ آف ڈائریکٹرز کو پیش کردہ رپورٹ پوری قوم کے لئے شرمندگی کا باعث ہے۔ اُن کا تبصرہ درج ذیل ہے:

> "آئی ایف سی اسلامی طریقہ ہائے تمویل اختیار کرنے پر غور کر چکی ہے' لیکن یہ حکومتِ پاکستان کے ارادے کے مخالف نظر آتا ہے۔ کسی غیر ملکی قرض دہندہ کے اسلامی طریقہ اختیار کرنے کو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کی اس پالیسی کی درپردہ مخاصمت ہوگی کہ وہ غیر ملکی قرض دہندوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا چاہتی ہے۔" ("سود پر تاریخی فیصلہ")

نظریہ فلاحِ عام (Utilitarianism): قرآن مجید کا مقصدِ وحید مادّی دُنیا کو روحانی دُنیا سے خوبصورت طریقے سے جوڑنا اور مادّی دولت کے ذریعے آخرت کے گھر کے حصول کی کوشش کرنا ہے (بحوالہ سورۃ القصص: ۷۷ نیز صفحہ ۹۱۶ جلد ہٰذا)۔ ہماری یہ دُنیا اگلی دُنیا کے لئے پیش دالان (ڈیوڑھی) ہے جو کہیں زیادہ پائیدار اور بہتر ہوگی (بحوالہ سورۃ الاعلیٰ: ۱۷)۔ اس لئے قرآن مجید کی نظر میں فلاحِ عام کا کاروبار وہ ہے جس کے ذریعے آخرت کا گھر حاصل کرنے کی جستجو کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

رِجَال "لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ" وَّلَا بَيْعٌ "عَنْ ذِكْرِاللهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْأَبْصَارُ ٥ (اَلنُّور: ۳۷)

"(وہ ایسے) لوگ ہیں جنہیں نہ تجارت اور نہ خرید وفروخت اللہ کی یاد سے، نماز ادا کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل کرتی ہے، وہ ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔"

مزدوری (تنخواہ): مزدوری کا ذکر سورۃ القصص کی آیت ۲۵ میں آیا ہے جب موسیٰ علیہ السلام نے شعیب علیہ السلام کے مویشیوں کو لوگوں کی بھیڑ کو چیر کر پانی پلا دیا تھا۔

مزدور کو اُس کی مزدوری کی بروقت ادائی کی تاکید کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَعْطُواأَجْرَ الْأَجِيْرِ قَبْلَ أَنْ يَّجِفَّ عَرَقُه،

"مزدور کی مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دیا کرو۔"

منصفانہ مزدوری (Just Wages): کچھ ماہرینِ معاشیات کا کہنا ہے کہ منصفانہ مزدوری کا مطلب یہ ہے کہ مزدور کو اُس کی مزدوری اُس کی اُس محنت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے فائدہ کے تناسب سے دی جائے جو اُس نے انجام دی ہے۔ لیکن مزدوری / تنخواہ کو منظم کرنے میں ایسا کرنا مشکل ہے اور عملی طور پر اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تاہم نبی علیہ السلام کی ایک حدیثِ مبارکہ کی رُو سے کم از کم اور "مثالی" تنخواہ یا مزدوری کی سطح اخذ کی جا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اجیر کا یہ حق ہے کہ اُسے کم از کم معتدلانہ اچھا کھانا اور لباس ملے اور یہ کہ اُس کی طاقت سے بڑھ کر اُس پر کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔" (مؤطا امام مالک، جلد دوئم)

اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مزدور کی مزدوری کم از کم اتنی تو ہونی چاہئے جس سے اُسے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے معقول حد تک اچھا کھانا اور پہننا میسر ہو اور وہ مالی امداد کے لئے ہاتھ نہ پھیلاتا پھرے۔

(۳۵) تعلیم و تعلّم (EDUCATION)

"علم" کی تعریف: متکلمین کے نزدیک علم کی مشہور تعریف یہ ہے:

هُوَ صِفَةٌ" یَتَجَلی بِهَا الْمذکور لِمَنْ قَامَتْ هِیَ بِهٖ

(عالم کے ذہن میں کسی چیز کا انکشاف "علم" ہے)

یعنی علم انکشافِ ذہنی کا نام ہے۔ (تبیان القرآن۔۔ مولانا غلام رسول سعیدی، ج ۱۰، ص ۱۹۱)

ملّا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں:

"علم مومن کے قلب میں ایک نور ہے جو فانوسِ نبوت کے چراغ سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ علم نبی ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کے اِدراک کا نام ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور اُس کے احکام کی ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ علم کسی بشر کے واسطے سے حاصل ہو تو کسبی ہے اور اگر بلا واسطہ حاصل ہو تو علمِ لدنّی ہے۔ علمِ لدنّی کی تین قسمیں ہیں: وحی، اِلہام اور فراست۔ وحی کا تعلق صرف انبیاء اور رسولوں سے ہوتا ہے۔ الہام وہ علمِ حق ہے جس کا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اِلقاء فرماتا ہے اور اُنہیں امورِ غیبیہ پر مطلع فرماتا ہے۔ وحی اور الہام میں یہ فرق ہے کہ الہام وحی کے تابع ہے اور وحی الہام کے تابع نہیں۔ نیز وحی سے حاصل ہونے والا علم قطعی ہوتا ہے جبکہ الہام سے حاصل ہونے والا علم ظنّی ہوتا ہے۔ فراست وہ علم ہے جس میں ظاہری صورت کو دیکھ کر اُمورِ غیبیہ منکشف ہوتے ہیں۔ علم الیقین دلائل سے حاصل ہوتا ہے، عین الیقین مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے اور حق الیقین تجرد سے واصل ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔"

(مرقاۃ، جلد ۱، ص ۲۶۴: بحوالہ تبیان القرآن، جلد دہم، صفحات ۱۹۱، ۱۹۲)

"علم اور شعور میں فرق: حواس سے اِدراک کرنے کو شعور کہتے ہیں اور عقل سے اِدراک کرنے کو علم کہتے ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: لَا تَشْعُرُوْنَ کا معنی ہے تم حواس سے اِدراک نہیں کرتے اور لَا تَشْعُرُوْنَ کی جگہ لَا تَعْقِلُوْنَ کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہیں جن کا حواس سے اِدراک نہیں ہوتا بلکہ عقل سے اُن کا اِدراک ہو جاتا ہے۔" (تبیان القرآن، جلد اوّل، صفحات ۶۰۳، ۶۰۴)

اسلام، علم کا مُمِد (مددگار) بن کر آیا: علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرشتوں کو کہا کہ وہ زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہے تو اُنہوں نے حیرانی سے کہا:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْ

أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ o (البقرة : ۳۰)

''کیا آپ اُس (زمین) میں ایسے کو بنائیں گے جو اُس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا درآنحالیکہ ہم آپ کی حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور آپ کی پاکی پکارتے رہتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا: یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' (۲ : ۳۰)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ (فرشتے) انسانی روح کے صرف منفی رُجحان کو اپنی چشمِ تصوّر سے دیکھ سکے اور اس کے مثبت رُجحان کی قوت کو نہ دیکھ سکے اور نہ ہی وہ صحیح رہنمائی مل جانے اور اس (رہنمائی) کے ارتقاء کے بعد بنی آدم کی منفی رُجحان کو زیر کرنے کی صلاحیت کو دیکھ سکے۔ ملائکہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ مکالمہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسانی نمو اور افزائش کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک قطعی اور یقینی منصوبہ تھا جسے قرآن مجید نے ایک مقام پر یوں بیان کیا :

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی o وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی o (سورۃ الاعلیٰ : ۲، ۳)

''وہ وہی تو ہے جس نے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھیک بنایا اور جس نے انداز دیا پھر راہ بتلائی۔'' (۸۷ : ۲، ۳)

قرآنی لفظ سَوّٰی (بمعنی تناسب کی درستی سے بنانا) کا مفہوم یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرتِ انسان کی پیدائشی صلاحیتوں اور کمزوریوں دونوں کا حساب رکھا تاکہ اُس کی افزائش کا مربوط منصوبہ تشکیل دیا جائے جس پر عملدرآمد کا آغاز آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

خلیفہ وہ ہے جو کسی کے ملک میں اس کے نائب کی حیثیت سے اُس کے احکام کے مطابق عمل کرائے۔ اِس منصب کے لئے انسان کے انتخاب کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے علاوہ جتنی مخلوق ہے اُس کی استعداد، علم اور اُس کا دائرۂ عمل محدود ہے اور جس کی محدودیّت کا یہ عالم ہو وہ اُس ذاتِ پاک کا خلیفہ نہیں بن سکتا جس کا علم، ارادہ، احکام اور تصرّف غیر محدود ہے۔ لیکن انسان جو ابتداء میں ضعیف بھی ہے اور جہول بھی، اس میں ایسی استعداد رکھ دی گئی ہے اور عقل وفہم کی وہ قوتیں ودیعت فرما دی گئی ہیں جن کے تصرّفات کی حد نہیں۔ اس لئے جملہ مخلوقات میں سے صرف یہی ایک مخلوق ہے جو منصبِ خلافت کی اہلیت رکھتی ہے۔ علمائے ربانیین نے اس مشتِ خاک میں پوشیدہ توانائیوں سے جیسے پردہ اٹھایا ہے، اُس کی گردِ راہ کو بھی نفسیاتِ انسانی کے ماہرین نہیں پہنچ سکتے۔ عارف کامل اسمٰعیل حقّی کا بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

''انسان مختلف عناصر سے مرکب ہے۔ اس کی صورت کا تعلق عالمِ محسوس سے ہے اور اس کی روح کا تعلق عالم غیب ملکوتی سے ہے۔ صورت وروح کے علاوہ اس میں ایک پوشیدہ قوت ہے جو انوارِ ربانی کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ اچھی تربیت سے وہ عالمِ محسوس سے ترقی کر کے عالمِ غیب تک رسائی حاصل کرتا ہے اور رسالتمآب ﷺ کی سچی پیروی سے اُس پر عالمِ جبروت وعظموت کی راہیں کھلتی ہیں۔ وہ الٰہی نور جو اِس اطاعت وپیروی کی برکت سے اُسے حاصل ہوتا ہے، اس سے وہ جمال وجلال کے انوار وتجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ فَسُبْحَانَ اللہِ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ انسان کو جو صرف خاک کا پتلا سمجھتے ہیں، کاش کہ اُس کی حقیقت پر غور کریں تاکہ اُن میں اپنے بلند مقام پر پہنچنے کی تڑپ پیدا ہو۔ یہ وہ ذرّہ ہے جس کے سامنے آسمان کی رفعتیں سرنگوں ہیں اور یہ وہ قطرہ ہے جس میں سمندروں کی گہرائیاں گم ہیں۔'' (''ضیاء القرآن'' ۔۔۔۔ جسٹس کرم شاہ الازہری، جلد اوّل، صفحہ ۴۶)

جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اشیاء کے حقائق، خواص، اسماء، علوم کے قواعد اور مختلف صنعتوں کے قوانین تعلیم فرمائے (البقرۃ :۳۱) اور خلافت کے منصب کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اُنہیں اُن تمام چیزوں کا علم عطا فرمایا جاتا۔ پھر فرشتوں کو عاجز کرنے اور اہلیتِ خلافت سے اُن کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے اُنہیں حکم دیا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ معصوم ہونے کی وجہ سے صرف تم خلافت کے اہل ہو۔ ہر چند کہ فرشتوں نے صراحتہً یہ دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن اُن کے کلام سے یہ دعویٰ ظاہر ہوتا تھا۔

''فرشتوں نے کہا: تو پاک ذات ہے، ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دیا، بے شک تو ہی بڑا علم والا، حکمت والا ہے۔'' (البقرۃ : ۳۱)

جب فرشتے اظہارِ عجز کر چکے تو اَب آدم علیہ السلام سے ارشاد ہوا کہ تم اپنی معلومات کا اظہار کرو:

قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ o (البقرۃ:۳۳)

''(اللہ نے) فرمایا: اے آدم! اُنہیں اُن کے نام بتلا دو۔ پھر جب اُنہوں نے اُنہیں اُن کے نام بتلا دیئے تو فرمایا کہ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور اُسے بھی جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔'' (۲: ۳۳)

جب فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی وسعتِ علم اور اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو پروردگارِ عالم نے اُنہیں حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو سوائے عزازیل کے (جو بعد میں 'ابلیس' اور 'شیطان' کے القاب سے ملقب ہوا) سب فرشتے سجدہ ریز ہو گئے۔ بعض علماء کے نزدیک یہاں سجدہ کا لغوی معنی (تذلّل اور خضوع) ہے کہ فرشتوں کو ادب و احترام کرنے کا حکم دیا گیا لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہاں شرعی معنی مراد ہے یعنی اُنہیں حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کے سامنے پیشانی رکھ دیں۔ اب اس سجدہ کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ پیشانی جھکانے والا یہ اعتقاد کرے کہ جس کے سامنے میں پیشانی جھکا رہا ہوں وہ معبود اور اللہ ہے تو یہ عبادت ہے اور یہ خاص ہے اُسی وحدہٗ لاشریک کے ساتھ جو تمام کائنات کا خالق و مالک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت بھی کسی نبی کی شریعت میں جائز نہیں رہی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جس کے سامنے سجدہ کیا جا رہا ہے، اُس کی عزت و احترام کے لئے وہ سجدہ ہو، عبادت کے لئے نہ ہو تو اِسے سجدہ تحیہ کہتے ہیں۔ یہ پہلے انبیاء کی شریعتوں میں جائز تھا لیکن ہمارے نبی معظم ﷺ نے اس سے منع فرما دیا اور اب سجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں حرام ہے۔

اس واقعہ سے درج ذیل دو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:

(۱) فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم آدم علیہ السلام کی فضیلتِ علمی کو ظاہر کرتا تھا۔ اُنہیں یہ حکم یہ ثابت ہونے کے بعد ملا کہ فرشتوں کا خداداد علم آدم علیہ السلام کے خداداد علم سے کہیں کم اور فروتر ہے۔

(۲) سچی اور سُچی عقل و دانش رب تعالیٰ کے حضور قولاً و فعلاً جھک جانے کا نام ہے۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں فرشتوں کا آدم کے آگے جھک جانا عقلمندی پر مبنی تھا جبکہ ابلیس کو جس نے اپنے آپ کو آدم سے برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہوئے حکمِ الٰہی سے سرتابی کی' راندۂ درگاہ کر دیا گیا اور اُسے متکبر کا فرقرار دے کر اُس کی تذلیل کی گئی۔ اس واقعہ کے بیان کرنے میں رب تعالیٰ نے جہالت پر علم کی فتحیابی کو ثابت کیا ہے۔ وہ جہالت جو خود پرستی اور خود پسندی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ اس طرح ربّ ذوالجلال والاکرام نے عقل کے خلاف عمل کرنے کے بد نتائج سے تنبیہ کی ہے کیونکہ جیسا کہ بیان ہوا' صحیح عقل خالقِ کائنات کی رضا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔ اور اِسی حقیقت کی روشنی ہی میں فرمودۂ رسول ﷺ: رَاسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ الله (سب سے بڑی دانائی خوفِ خدا ہے) کو سمجھا جا سکتا ہے۔

آدم علیہ السلام کو ابتداءً علم دئے جانے کی بابت اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا کچھ چیزوں کے ناموں کو جان لینے ہی کو علم کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قابلِ اعتنا چیز سطحِ علم نہیں تھی کہ کتنا علم دیا بلکہ اہمیتِ علم تھی اگرچہ سطحِ علم کتنی ہی کم ہو۔ انسانی ارتقاء کا عمل شروع ہی اشیاء کے نام جاننے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی عام طور پر سوال کیا جاتا ہے کہ اگر آدم نے زمین پر خلیفۃ اللہ ہونے کی خدمت انجام دینا تھی تو اُنہیں اوپر جنت میں کیوں رکھا گیا اور پھر وہاں سے نیچے زمین پر کیوں بھیجا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آدم اور اُن کی بیوی حوا علیہما السلام کو جنت میں رکھنے میں ایک قطعی منصوبہ تھا اور وہ یہ کہ اُنہیں آزمائش میں سے گزارنا تھا جو انسان کے ارتقاء کے عمل کا ایک جزء ہے اور اس ارتقائی عمل میں صرف یہ بتانا کافی نہیں ہوتا کہ کون سی چیز عمل میں لائی جائے اور کون سی نہیں۔ آدمی زندگی میں پیش آنے والے کچھ حوادث' سانحات' پلٹا کھانے' مزاحمتوں اور دھچکا کھانے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ لٰہذا آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا حکم دینا اُن کے حق میں سزا نہیں تھی بلکہ یہ اُن کے مقصدِ تخلیق کی تکمیل تھی جس کا اشارہ تخلیقِ آدم سے قبل ہی رب تعالیٰ نے فرشتوں کے آگے کر دیا تھا۔ پھر دنیا میں آپ کا آنا ایک بہت بڑی کامیابی کا پیش خیمہ تھا اور شیطان کی ناکامی اور نامرادی کا مقدمہ تھا۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آدم شجرِ ممنوعہ سے نہ کھاتے تو ہم اُن کی اولاد ہونے کے ناطے سے جنت ہی میں رہتے۔ اُن کے شجرِ ممنوعہ سے کھانے کی وجہ سے ہمیں بھی جنت سے آنا پڑا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں رہنا کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ جنت تو پاک لوگوں کی جگہ ہے۔ حضرت آدم کی پشت میں پاک لوگ بھی تھے اور ناپاک لوگ بھی تھے۔ رب تعالیٰ نے حضرت آدم کو دنیا میں بھیجا کہ اپنی پشت سے تمام اولاد کو نکال کر زمین پر چھوڑ آؤ۔ اُن میں سے جو پاک لوگ ہوں گے وہ جنت میں جائیں گے اور ناپاکوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو حضرت آدم کی پشت میں ان ناپاک لوگوں کا وجود اُن کے جنت سے آنے کا سبب تھا اور حقیقت یہ ہے

کہ چونکہ حضرت آدم کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس لئے اُنہوں نے بہر حال زمین میں آنا تھا۔ اگر شجرِ ممنوعہ سے کھانا سبب نہ ہوتا تو زمین پر آنے کا کوئی اور سبب بن جاتا۔''

اِسی عمل کے دوران حضرت آدم اور حوّا علیہما السلام کو ایک طرف تو محو بالذات تکبّر (Self-centred pride) کے نتائج سے آگاہ کرنا تھا تو دوسری طرف توبہ وتاسّف اور رجوع الی اللہ کی طرف مائل کرنا تھا۔ شیطان کو اپنی جھوٹی برتری پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اُس نے نہ صرف آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا بلکہ اپنی نافرمانی اور گستاخی پر معذرت کرنے کی بھی پروا نہ کی جس کے نتیجہ میں وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوگیا۔ جبکہ آدم اور حوّا علیہما السلام اپنی کوتاہی کو تسلیم کرتے ہوئے فوراً معافی کے خواستگار رہوئے اور اُنہیں معاف کر دیا گیا۔

قرآن مجید ہمیں عقل و دانش سے بھرپور ایک اور واقعہ سناتا ہے جس میں استاد (معلّم) اور شاگرد (متعلّم) کے لئے کئی نصیحت آموز سبق ہیں۔ یہ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ نبوت کے اعلیٰ منصب کے ناطے سے انبیاء اور رسولوں کا مقام مثالی اور ناقابلِ رسائی ہوتا ہے اور خالقِ کائنات سے قریبی رابطہ ہونے کی وجہ سے اُن کی عقل و دانش اور علم سے کسی اور کا مقابلہ نہیں ہوسکتا بلکہ وہ تو عقل و دانش اور علم و آگہی کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ ان روشن، ظاہر و باہر حقائق کے باوصف ہمیں موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کے واقعہ میں سبق آموز بات ملتی ہے اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ اور اُن کے ساتھی یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف (علیہما السلام) ایک مرتبہ بہ حکمِ الٰہی ایک عالم شخص کی تلاش میں نکلے۔ تکلیف دِہ سفر کے بعد وہ اُس آدمی کے پانے میں کامیاب ہو گئے۔ سورۃ الکہف کی آیات ۶۵ تا ۷۰ میں اُن کی ملاقات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس واقعہ سے مندرجہ ذیل نکات اخذ کئے ہیں:

(۱) آدمی خواہ علم کے کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے، اُسے بہر حال علم کا متلاشی اور طالب رہنا چاہئے۔

(۲) متعلّم کے لئے معلّم کا احترام اور اپنی طرف سے انتہائی فروتنی برتنا لازم ہے اور یہ کہ وہ استاد کے احکام کی اطاعت اور اُس پر ترکِ اعتراض ومخالفت کی عادت اختیار کرے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مؤدّبانہ کلام سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا (آپ انشاءاللہ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا) سے ظاہر ہے۔

(۳) متعلّم اپنے استاد کے سامنے فروتنی کا اظہار کرے اگرچہ استاد شاگرد سے دنیوی لحاظ سے رتبے میں کم ہی کیوں نہ ہو۔

(۴) متعلّم کو اپنے سفری اخراجات کا بندوبست کر لینا چاہئے اور یہ چیز توکل علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔

(۵) ناگوار چیزوں اور نسیان کے عمل کو شیطان کی طرف منسوب کرنا بہ طورِ استعارہ ہے اور اس قسم کا اظہار

اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور عظمت کے لئے ہوتا ہے۔
(۶) معلّم اگر یہ محسوس کرے کہ متعلّم اُس کے علم و ہنر سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا تو معلّم کو اُسے تعلیم نہ دینے پر معذرت خواہی کا پورا حق حاصل ہے۔
(۷) باہمی معاملات میں آدمی کو اپنے شکوک وشبہات پہلے ہی بیان کر دینے چاہئیں۔
(۸) آدمی کو اُس شخص پر شرائط عائد کرنے کا حق حاصل ہے جو اُس کی پیروی کرنا چاہتا ہے یا اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔
(۹) شرط کے طے ہو جانے پر اُس کی تکمیل لازم ہے۔
(۱۰) یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے بھول چوک (نسیان) اور دوسری کوتاہیوں کے سرزد ہو جانے میں انسان قابلِ ملامت نہیں ہے۔

ان کے علاوہ علمائے تفسیر نے اس واقعہ سے کچھ اور نکات بھی مستنبط کئے ہیں مثلاً:
(۱۱) تفسیر روح المعانی میں ہے کہ جب کوئی بندہ خالصۃً اللہ کے لئے کسی کام کو نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی تکالیف کو راحت وسکون میں بدل دیتا ہے اور اُسے وہ تکلیف محسوس بھی نہیں ہوتی لیکن جب بندے کا وہ کام اللہ کے لئے نہیں رہتا تو پھر مصائب اپنی شکل میں نمودار ہوتی ہیں اور محسوس ہونے لگتی ہیں اگرچہ بندے کے عمل وفعل کی یہ تبدیلی بلاارادہ ہی کیوں نہ ہو اور بندہ اب تک اپنے اس فعل کو عبادت ہی سمجھ رہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے بحرین تک کے دراز سفر میں وہ تکلیف محسوس نہ ہوئی جو اس تھوڑے سے سفر میں ہوئی۔
(۱۲) سفرِ علم کے لئے تکلیف اٹھانا اور تکلیف کی پروا نہ کرنا اور تکالیف ومصائب کے باوجود ہمت وکوشش جاری رکھنا انبیائے کرام علیہم السلام کی سنتِ مبارکہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھی کا مصر سے سفر کرنا اور بے سروسامانی اور راہ کی تکالیف کا کچھ غم اور فکر نہ کرنا صرف اللہ کے علم کو حاصل کرنے کے لئے تھا۔
(۱۳) تلی ہوئی مچھلی کا زندہ ہو کر ناشتہ دان سے نکلنا اور دریا میں چلے جانا (۱۸:۶۳) اُس مقام پر ہوا جہاں خضر علیہ السلام سکونت پذیر تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والوں کا خداداد مقام مردہ کو زندگی بخشتا ہے۔
(۱۴) سفر کی صعوبتوں اور تکالیف کا کسی کے آگے ذکر کرنا بالکل جائز ہے خواہ سفر کسی قسم کا ہو۔ لیکن یہ ذکر ازراہِ شکایت نہ ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کا سفر کی تکالیف کا ذکر کرنا ازراہِ تعجب تھا نہ کہ ازراہِ شکایت۔ اور یہ تعجب اس معنی میں تھا کہ مصر سے بحرین تک کے چالیس دن کے طویل سفر میں تو ہم نے کوئی بے آرامی یا تکلیف محسوس نہیں کی تھی لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس مختصر سے سفر میں ہم تھک گئے ہیں!
(۱۵) مستقبل کے ہر کام کی تکمیل کے لئے انشاء اللہ کہنا ضروری ہے' بالخصوص اُس کام میں جس کی تکمیل غیر یقینی ہو۔ یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے فرمان اِنْ شَاءَ اللّٰہُ سے ثابت ہوئی (بحوالہ آیت ۱۸:۶۹)۔

ملکہِ سبا (بلقیس) کے تخت کے سلیمان علیہ السلام کے دربار میں لائے جانے کے واقعہ میں جسے سورۃ النّمل

کی آیات ۲۸ تا ۴۴ میں بیان کیا گیا' مندرجہ ذیل نکات ملتے ہیں:۔

(۱) یہ کہ علم کی طاقت جنات کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے۔

(۲) ایک عالم کی طاقت ایک انتہائی ماہر جن کی طاقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی علم کی بدولت وہ اکناف عالم کا سفر کرتا ہے' فاصلوں کو ختم کرتا ہے اور کرامات دکھاتا جاتا ہے۔ حقیقت تو ہے کہ زمان ومکان سے متعلق آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت ($E=mc^2$) اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ یہاں جلوہ گر نظر آتا ہے جب (Space) سکڑ گئی اور ایک اللہ والے کی کرامت سے تختِ بلقیس ۱۵۰۰ میل کی مسافت سے چشمِ زدن میں آموجود ہوا۔

علم کی فضیلت ازروئے قرآن: (۱) ہمارے نبی معظم ﷺ پر پہلی وحی کا نزول علم کی فضیلت کے اظہار سے ہوا جیسا کہ سورۃ العَلَق کے الفاظ اِقْرَأْ اور عَلَّمَ سے ظاہر ہے۔

(۲) ربِ تعالیٰ نے صرف قلم کی قسم کھا کر علم کی فضیلت کو ظاہر نہیں فرمایا بلکہ وَمَا یَسْطُرُوْن فرما کر علم کے اُن جواہر پاروں کی بھی قسم کھائی ہے جو نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنتے ہیں (بحوالہ سورۃ القلم' آیت اوّل)۔

(۳) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آلِ عمران: ۱۸)

''اللہ نے گواہی دی ہے کہ اُس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں اور فرشتوں اور علم والوں نے (بھی گواہی دی کہ) وہ عدل سے انتظام رکھنے والا معبود ہے۔'' (۱۸ : ۳)

یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی شہادت کا ذکر کیا' پھر فرشتوں کی شہادت کا اور پھر اہلِ علم کی شہادت کا اور یہ اہلِ علم کی بڑی عزت ہے۔ عدل سے مراد ہے کہ ہر شے اپنے محلِ مناسب میں ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا خدا' خدائے معطّل نہیں۔ وہ منظّم ہے' ہر ایک کا کارساز ہے اور ہر کام بنانے والا ہے۔

(۴) وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النساء)

''اور اگر وہ اسے رسول ﷺ اور اپنے میں سے صاحبانِ امر کے حوالے کر دیتے تو اُس (کی مصلحت) کو وہ لوگ جان لیتے جو اُن میں سے استنباط کر سکتے ہیں۔'' (النساء: ۸۳)

معلوم ہوا کہ عوام الناس پر اہلِ علم (جن میں مسائلِ شرعیہ کا استنباط کر سکنے کی صلاحیت ہے) کی تقلید واجب ہے۔

(۵) قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ (اَلرَّعد: ۴۳)

''(اے نبی!) فرما دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور وہ جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا علم ہے' بہ طور گواہ کے کافی ہیں۔'' (۴۳ : ۱۳)

اللہ کی گواہی تو وہ ہوئی جو آپ کی عملی زندگی کے گوشہ گوشہ سے ظاہر ہو رہی تھی اور اہلِ کتاب کی گواہی سے اُن پیش گوئیوں اور بشارتوں کی طرف اشارہ ہے جو آپ کے متعلق پہلی آسمانی کتابوں میں موجود تھیں۔ (ماجدی)

(۶) وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًاo (طٰہٰ : ۱۱۴)
''اور دعا کیجئے کہ اے میرے پالنہار! میرے علم کو زیادہ فرما۔'' (۱۱۴ : ۲۰)

اِس آیت میں نبی ﷺ کو اضافہِ علم کے لئے دعاء بتائی گئی ہے جس سے ایک تو علم کی فضیلت واضح ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ علم کا منبع صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ وہی سب کو علم عطا کرنے والا ہے۔ جس کو جتنا چاہے عطا کرے۔ اس لئے اُسی سے علم طلب کیا جائے۔

(۷) وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَo (العنکبوت : ۴۳)
''اور یہ مثالیں جنہیں ہم لوگوں کے لئے بیان فرماتے ہیں' اُنہیں صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''

(۸) بَلْ هُوَ آيٰتٌ "بَيِّنٰتٌ" فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت : ۴۹)
''بات یہ ہے کہ یہ اُن لوگوں کے سینہ میں روشن آیتیں ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔'' (۴۹ : ۲۹)

یہاں اللہ تعالیٰ نے مؤمن حفاظِ قرآن اور قرآن کی قرأت کرنے والوں کی صفت میں علم کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کے کلام اور انسانوں اور شیاطین کے کلام میں فرق کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ صحیح بخاری کی کتاب العلم میں آیا کہ وہ حکماء' علماء اور تفقہ فی الدین میں انبیاء علیہم السلام کی مثل ہیں۔

(۹) إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ (فاطر : ۲۸)
''اللہ سے ڈرتے تو وہی بندے ہیں جو علم والے ہیں۔'' (۲۸ : ۳۵)

علماء سے اِصطلاحی علماء مراد نہیں جو فلاں فلاں کتابیں پڑھ چکے ہیں یا فلاں امتحان کی سند رکھتے ہیں' بلکہ وہ اشخاص مراد ہیں جو اللہ اور اُس کے احکام کی معرفت رکھتے ہیں اور اُن کا عمل بھی اُن کے مرتبہِ علم ومعرفت کے متناسب رہتا ہے۔ یہ آیت فضلیتِ علم پر دلیل ہے اور اس پر کہ خوف صرف علماء کے دلوں میں ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ علم کی بدولت اللہ کی عظیم قدرت وعظمت اور اُس کی صفات سے آگاہ ہوتے ہیں اور اللہ سے خشیت و تقویٰ علم کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔

(۱۰) قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (اَلزُّمَر : ۹)

''(اے نبی!) فرما دیجئے کہ کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے' برابر ہیں؟''(۹ : ۳۹)
اِس آیت میں استفہامِ انکاری ہے جو نفی کا معنی دیتا ہے یعنی عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہو سکتے۔

<u>نوٹ ضروری</u>: قرآن حکیم نے علم سے مراد کہیں بھی وہ چیزیں نہیں لیں جنہیں دنیا میں علوم و فنون کہا جاتا ہے۔

(۱۱) یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المُجادلۃ : ۱۱)
''تم میں سے جو کامل ایمان والے اور علم والے ہیں' اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرما دے گا۔''

جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جنت میں عام مسلمانوں کی بہ نسبت علماء سات سو درجہ بلند ہوں گے۔ (احیاء العلوم ؛ قُوْتُ القلوب ۔۔ بحوالہ تبیان القرآن' ج دہم' ص ۱۹۳)

<u>علم کی فضیلت از روئے احادیث:</u>

(۱) عَنْ مُعَاوِیَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ
(صحیح بخاری: کتاب العلم؛ صحیح مسلم: کتاب الزکوٰۃ؛ مسند احمد؛ سنن الدارمی)
''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی کرنا چاہتا ہے' اُسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔''

''دین کی سمجھ'' (فقاہت) سے مراد قرآن و حدیث کا فہم' دین کے مسائل و احکام کا علم اور حلال و حرام کی تمیز ہے۔

(۲) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَاحَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ: رَجُل'' آتَاہُ اللّٰہُ مَالاً فَسَلَّطَہٗ عَلٰی ھَلَکَتِہٖ فِی الْحَقِّ وَرَجُل'' آتَاہُ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فَھُوَ یَقْضِیْ بِھَا وَیُعَلِّمُھَا (صحیح بخاری: کتاب العلم؛ صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین)
''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رشک کے قابل صرف دو آدمی ہیں: ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا' پھر اُسے راہِ حق میں خرچ کرنے کی توفیق بھی دی اور دوسرا وہ جسے اللہ نے دانائی سے نوازا' پس وہ اس کے ساتھ (لوگوں کے معاملات کے) فیصلے کرتا اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔''

یہاں حَسَد رشک کے معنی میں ہے۔ حسد کرنا حرام اور اس صورت میں رشک کرنا جائز ہے کہ جب انسان یہ دیکھے کہ فلاں پر مال و دولت کی شکل میں اللہ کا انعام و اکرام ہو رہا ہے تو یہ آرزو کرے کاش! مجھے

بھی اللہ کی طرف سے یہ نعمتیں حاصل ہوں اور میں بھی اُسی کی طرح اُسے راہِ حق میں خرچ کر کے رب کی رضا حاصل کروں۔ وہ حاسد کی طرح جلے کُڑھے نہیں بلکہ خوش ہو کر اللہ سے دعا کرے۔ حکمت سے مراد قرآن و حدیث کا علم ہے کیونکہ یہی انسان کے لئے نافع ہے اور اس کے ذریعے ہی سے لوگوں کے درمیان صحیح فیصلے کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں مال کے ساتھ علمِ نافع کے حاصل کرنے کی بھی ترغیب ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اِن دو چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز میں رشک کرنا جائز نہیں ہے (اور حسد کرنا تو بالکل حرام ہے)۔

(۳) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِعَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ (صحیح بخاری: کتاب المغازی؛ صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابہ، باب: مِن فضائل علی ابن طالب رضی اللہ عنہ)

''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ کی قسم! تیرے ذریعے سے کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کا ہدایت دے دینا، تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔'' (بخاری و مسلم)

''سرخ اونٹوں سے بہتر'' ہر بہتر چیز کے لئے تمثیل ہے۔ عرب میں سرخ اونٹ بہت بیش قیمت ہوتا تھا۔ اس حدیث میں دعوت الی اللہ کی فضیلت اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے کی ترغیب ہے۔ تاہم اس کے لئے پہلے ضروری ہے کہ انسان خود بھی ہدایت کے راستے سے آگاہ اور واقف ہو۔ اس لئے قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔

(۴) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهٖ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ (صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص علم (دین) کی تلاش کے لئے کسی راہ پر چلے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے جنت کی راہ آسان فرما دیتا ہے۔''

(۵) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْا لَهُ (صحیح مسلم: کتاب الوصیۃ)

''سابق راوی ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان مر جاتا ہے تو اُس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب اُسے ملتا رہتا ہے: ایک صدقہ جاریہ، یا وہ علم جس سے فائدہ اُٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اُس کے لئے دعائے خیر کرتی رہے۔''

''علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے'' کا مطلب ہے دوسروں کو علم سکھانا، یا تالیفات و تصنیفات کے ذریعے

سے علم پھیلانا۔ جب تک اس کا سلسلۂ تلمّذ قائم اور کتابیں محفوظ وموجود رہیں گی اور لوگ اُن سے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو اُن کا اجر بھی استاد یا مصنفِ کتاب کو ملتا رہے گا۔ اولاد کی نیک تربیت بڑی ضروری ہے تا کہ وہ بعد از وفاتِ والدین اُن کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے کیونکہ اولاد کی دعاء والدین کے حق میں مفید اور مستجاب ہے۔

(۶) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: أَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ" مَلْعُوْنٌ" مَافِیْھَا اِلَّا ذِکْرَاللّٰہِ تَعَالٰی وَمَا وَالَاہُ وَعَالِمًا أَوْمُتَعَلِّمًا (سنن ترمذی : کتاب الزھد)

''سابق راوی ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں سامان ہے وہ بھی ملعون ہے' سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے اور عالم یا متعلم کے۔''

اس حدیثِ مبارکہ کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی دنیا اور اس کا ساز وسامان ملعون ہے بلکہ دُنیا کا وہ مال ومتاع ملعون ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کردے یا اُس کے لئے ملعون ہے جسے دنیا میں اللہ یاد ہی نہ آئے۔ حدیث میں عالم اور متعلم کو مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔

(۷) عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ خَرَجَ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ کَانَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَرْجِعَ (سنن ترمذی : ابواب العلم)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ لوٹنے کے وقت تک اللہ کی راہ میں (شمار) ہوتا ہے۔''

اس حدیث میں طلبِ علم کو جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

(۸) عَنْ أَبِیْ أُمَامَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِیْ عَلٰی أَدْنَاکُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: إِنَّ اللّٰہَ وَمَلَائِکَتَہٗ وَأَھْلُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ حَتَّی النَّمْلَۃَ فِیْ جُحْرِھَا وَحَتَّی الْحُوْتَ لَیُصَلُّوْنَ عَلٰی مُعَلِّمِی النَّاسَ الْخَیْرَ (سنن ترمذی)

''حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ایک ادنیٰ آدمی پر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ' اُس کے فرشتے اور آسمان وزمین کی مخلوق حتیٰ کہ چیونٹی اپنے بل میں اور مچھلی تک (پانی میں) لوگوں کو بھلائی سکھلانے والوں پر (اپنے اپنے انداز میں) رحمت بھیجتی اور دعا کرتی ہیں۔''

چونکہ عابد کے نوافل اور کثرتِ ذکر کا فائدہ اُس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے جبکہ عالم کے علم کا فیض

دوسرے لوگوں تک بھی پہنچاتا ہے۔ اس لئے وہ عابد پر بہت زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ صلوٰۃ کی نسبت اگر اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوتے ہیں رحمت بھیجنا' فرشتوں کی طرف ہو تو معنی ہیں مغفرت کی دعا کرنا اور دوسری مخلوق (انسان و حیوان) کی طرف ہو تو معنی ہوتے ہیں دعا و التجا کرنا۔ گویا معلمِ خیر پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتا ہے' فرشتے اُس کی بخشش طلب کرتے ہیں اور دوسری مخلوق اُس کے حق میں خیر کی دعائیں کرتی ہے۔ اس میں عالم کی فضیلت اور علماء کی توقیر و تکریم کا بیان ہے۔

(۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَّارٍ (سنن ابی داؤد : کتاب العلم ؛ سنن ترمذی : ابواب العلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس سے علمِ دین کی کوئی بات پوچھی جائے' پھر وہ اُسے چھپائے تو روزِ قیامت اُسے آگ کی لگام دی جائے گی۔''

''اِس سے معلوم ہوا کہ سائل کو دین کی صحیح بات نہ بتلانا سخت گناہِ کبیرہ ہے جس پر جہنم کی شدید وعید ہے۔ بدقسمتی سے فقہی جمود اور حزبی تعصب میں مبتلا حضرات اور اہلِ علم' کتمانِ علم (علم کو چھپانے) کے اس جرمِ عظیم میں عام طور پر ملوث ہیں۔ اللہ اُنہیں ہدایت عطا فرمائے''۔ (ریاض الصالحین ۔۔ امام النووی' ج ۲' ص ۳۰۹)

(۱۰) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءًا سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ' كَمَا سَمِعَهُ' فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ (سنن ترمذی : ابواب العلم)

''حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا: اللہ تعالیٰ اُس آدمی کو تروتازہ رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے' پھر وہ اُسے اِسی طرح دوسروں تک پہنچا دے جس طرح اُس نے سنا' اِس لئے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہیں بات پہنچائی جائے' سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔''

(۱۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ' مِنَ النَّاسِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا (صحیح بخاری : کتاب العلم ؛ صحیح مسلم : کتاب العلم ' باب : رفع العلم وقبضہ)

''حضرت عبداللہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اُسے لوگوں (کے سینوں) سے کھینچ لے لیکن وہ علم کو علماء کی وفات کے ذریعے سے اُٹھا لے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو باقی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے۔ پس اُن سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اور (یوں) خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

یہ قربِ قیامت کی ایک علامت کا بیان ہے کہ علمائے دین ناپید ہو جائیں گے اور جاہل لوگ پیشوا، سردار اور امام بن جائیں گے جو قرآن و حدیث کا علم نہ رکھنے کے باوجود مفتی اور مجتہد بنے ہوں گے اور اپنے فتووں اور خود ساختہ مسئلوں سے اپنے ساتھ دوسروں کی بھی گمراہی کا باعث بنیں گے۔ اِس میں جہاں اس امر کی ترغیب ہے کہ علمائے دین زیادہ سے زیادہ تیار کئے جائیں، وہاں اس کی بھی تاکید ہے کہ جاہلوں کو دین کا پیشوا بنانے سے گریز کیا جائے۔

(۱۲) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًى بِمَا يَصْنَعُ وَإِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَه، مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ حَتَّى الْحِيْتَانُ فِي الْمَاءِ وَفَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَه، أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ (سنن ابی داوٗد : کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم ؛ سنن ترمذی :ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة)

''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: فرشتے طالب علم کے لئے اُس کے اس عمل سے خوش ہو کر اپنے پَر رکھ دیتے ہیں اور عالم کے لئے آسمان وزمین کی ہر مخلوق، حتیٰ کہ مچھلیاں بھی پانی میں بخشش کی دعا کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چاند کو تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے، اور علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے اپنے ورثے میں دینار اور درہم نہیں چھوڑے، وہ تو (دین کا) علم ہی ورثے میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ پس جس شخص نے وہ علم حاصل کیا، اُس نے (شرف وفضل کا) ایک بڑا حصّہ حاصل کیا۔''

فرشتوں کے پَر رکھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے پروں کو بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں جیسے علم و ذکر کی دوسری محفلوں کو وہ گھیر لیتے ہیں۔ (''ریاض الصالحین'' ۔۔۔ امام یحییٰ بن شرف النووی، ج دوم، صفحہ ۳۰۸) امام ابن الاثیر الجزری (م ۶۰۶ ھ) لکھتے ہیں: ''فرشتوں کے پر جھکانے یا پَر بچھانے کا معنی یہ ہے کہ وہ طالب علم کی تعظیم اور توقیر کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنا اُڑنا موقوف کر کے طالب علم کے ساتھ رہنے کو اختیار کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اپنے پروں پر طالبِ علم جہاں جانا چاہے، اُسے اٹھا کر لے جاتے ہیں یعنی اُس کی مدد کرتے ہیں۔'' (جامع الاصول، ج ۸، ص ۶، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ ۔۔۔ بحوالہ ''تبیان القرآن''، ج ۱۰، ص ۱۹۴)

ابن عبدالبرّ فرماتے ہیں: ''علم نیکی ہے اور نبی معظم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: علم حاصل کرو کہ علم صاحبِ علم کو حق و باطل کی تمیز سکھاتا ہے، جنت کا راستہ آسان بناتا ہے۔ جب دوست واحباب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو یہ ہمارا ساتھی ہوتا ہے۔ علم خوشی وشادمانی کی طرف ہماری راہ نمائی کرتا ہے، مصیبت میں ہمارا سہارا ہوتا ہے۔ علم دشمنوں کے

خلاف ہتھیار ہے اور دوست واحباب میں زیور ہے۔ علم ہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اقوام عالم کو رفعت اور بلندی بخشتا ہے' نیکی کے کاموں میں اُن کی راہ نمائی فرماتا ہے اور اُنہیں سیادت (سرداری) عطا فرماتا ہے یہاں تک کہ اُن کے نقوش ہائے قدم کی پیروی کی جاتی ہے' اُن کے کارناموں کی نقل کی جاتی ہے' اُن کی آراء کو قبول کیا جاتا ہے اور اُنہیں تعظیم و تکریم بخشی جاتی ہے۔'' (''فضل العلم''۔۔۔ابن عبدالبرّ)

علاوہ ازیں نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ:

(۱) ایک فقیہ (احکامِ شرعیہ کا عالم) شیطان پر ایک ہزار عابدوں کی بہ نسبت زیادہ سخت ہوتا ہے (سنن ترمذی رقم الحدیث ۲۶۸۱ ؛ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۲۲۲ ؛ المعجم الکبیر رقم الحدیث ۱۱۰۹۹ ؛ مسند ابن عباس رقم الحدیث ۳۲۰۲)

(۲) طالب علم جاہلوں کے درمیان اس طرح ہے جس طرح زندہ مُردوں کے درمیان ہو (کنز العمال رقم الحدیث ۲۸۷۲۶)

(۳) طالب علم' طالبِ رحمت ہے۔ طالبِ علم اسلام کا رکن ہے' اُسے نبیوں کے ساتھ اجر دیا جائے گا۔
(کنز العمال رقم الحدیث ۲۸۷۲۹' ۲۸۸۳۴)

یہ اِنہی قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ کا اثر تھا جنہوں نے عرب و عجم کے مسلمانوں کی دلچسپی کو اُبھارا اور اُنہوں نے علم کی طلب (تلاش) میں دُور دراز کے سفر کیے اور اس طرح انسانی فکر اور ارتقاء کے پروان چڑھانے میں خاصا کردار ادا کیا۔ عربی زبان بہت ہی جلد طبیعیات' کیمیا' ارضیات' حیاتیات اور نباتیات وغیرہ جیسے مادّی علوم (Natural Sciences)' طب اور فلسفہ کی زبان ہوگئی۔ آٹھویں صدی کے آغاز سے تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک اُمّتِ مسلمہ تمام دنیا میں تہذیب و تمدّن کی نمایاں اور ممتاز مشعل بردار ملت بن گئی اور یونان' ایران اور بھارت کے قدیم علوم اور ذہنی ورثے مغرب کو منتقل کیے گئے جس نے مغربی یورپ میں اِحیائے علوم کو ممکن بنا دیا۔

مسلمانوں کے تعلیم و تعلّم کی تاریخ خود نبی اکرم ﷺ تک جا پہنچتی ہے جنہوں نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس طرح تعلیم دی جس طرح بچوں کو مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اِن تعلیماتِ نبوی کا مرکز قرآنِ حکیم' اس کے معانی و مفاہیم اور فقہِ اسلامی تھا۔ فتح بدر کے بعد آپ نے جنگِ بدر میں قید ہونے والے پڑھے لکھے قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کے ناخواندہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ مدینہ منوّرہ میں آپ کی اپنی مسجدِ (نبوی) علوم و معارف اور مذہبی و معاشرتی سرگرمیوں کا منبع اور سرچشمہ تھی جس میں آنجناب ﷺ نے قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کی تعلیم دینے کے لئے علماء و فضلاء کا ایک حلقہ قائم فرمایا ہوا تھا (''اسلامک کلچر''۔ عنوان

''ایجوکیشنل سسٹم اِن دی ٹائم آف دی پرافٹ'' کے تحت۔از ایم۔حمید اللہ' صفحات ۴۸' ۴۹)۔ بعد ازاں ہر علاقہ میں مساجد کا افتتاح ہوا اور اب تک وہ مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا ابتدائی مرکز چلی آرہی ہیں۔(انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ''مسجد'' کے عنوان کے تحت)۔نبیِ اکرم ﷺ نے بھی اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لئے مبلّغین کے دستے عرب اور غیر عرب ممالک کے مختلف حصّوں کو روانہ فرمائے۔

معلّم اور استاد کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کی مثال آپ کے پیروکاروں اور خلفائے راشدین کے لئے ایک عظیم کارِ خیر بن گئی جنھوں نے اپنے دَورِ خلافت میں مسجدوں' مدرسوں اور مادر ہائے علمی کی تعمیر کو کارِ ثواب سمجھا' معلّمین اور متعلّمین کی کفالت کے لئے وقف ادارے قائم کئے اور اپنے آپ کو علم و فضل کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔
("The Muslim Education in the Golden Age of the Khilafah" narrated in the "Islamic Culture" by A. L. Tibawi, pp. 418, 419)

''وقت کے ساتھ ساتھ نبیِ اکرم ﷺ کے قائم کردہ مدرسہ کا سادہ نمونہ رفتہ رفتہ تعلیم و تعلّم کی ایک مربوط اور منضبط تنظیم میں ترقی کر گیا جو معاشرتی اور اقتصادی طرزِ حیات سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔''
("Modernization of Muslim Education" --- Ghulam Nabi Saqib, p. 66)

اسلامی تعلیم کے ساختی خدوخال : مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو اجتماعیت' سکولنگ اور تحصیلِ علم کے لحاظ سے درجِ ذیل تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) **اجتماعیت پسندی**: بچے کی اجتماعیت پسندی کا پہلو اُس کے گھر سے شروع ہوتا تھا جہاں بچے کی رسمی تعلیم شروع ہونے سے پہلے اُسے دین کے مبادیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔والدین کی قدرتی طور پر یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے ننھے مُنّے بچے کو اپنے ساتھ مسجد میں مذہبی فریضہ ادا کرتے دیکھیں۔تمام مسلمان بچوں کی اوّلیں درسگاہ اب تک مسجد رہی ہے جہاں وہ قرآن مجید اور عقائدِ اسلامی پڑھتا اور یاد کرتا ہے۔کچھ اسلامی ممالک میں جب بچہ چار سال' چار ماہ اور چار دن کی عمر کو پہنچتا ہے تو اہلِ خانہ بسم اللہ خوانی کی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔یہ انتہائی خوشی اور شادمانی اور بچے کے لئے نیک دعاؤں کا موقع ہوتا ہے کہ بچے نے اللہ کے گھر (مسجد کے مدرسہ یعنی مکتب) میں قدم رکھا ہے' یا رسمی تعلیم کے لئے استاد کی نگرانی اُسے حاصل ہوئی ہے۔'' (ایضاً' صفحات ۶۶' ۶۷)

(۲) **بنیادی تعلیم** : اِس تعلیم کے لئے ملک بھر میں پھیلے ہوئے مدرسے ''کُتّاب'' یا ''مکتب'' کے نام سے موسوم تھے جو اَب اِس دَور میں پرائمری سکول کہلاتے ہیں۔لکھنے' پڑھنے اور قرآنی تعلیم کے لئے مکاتب یا کُتّاب کا تصوّر خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَور سے شروع ہوا جنھوں نے مدینہ منوّرہ' کوفہ' بصرہ اور دمشق جیسے بڑے شہروں میں معلّمین مقرر کئے۔
("Science and Civilization in Islam" --- Seyyed Hossein Nasr, p. 65 -- Cambridge, 1968)

حضرت عمرؓ اِس نظریہ کے بھی حامی تھے کہ قرآن مجید پڑھنے اور لکھنے کے علاوہ بچوں کو تیراکی، گھوڑسواری، اچھی ضرب الامثال اور شاعری بھی سیکھنی چاہئیں۔ مکاتب کے نصاب کی تکمیل کے لئے بعدازاں علمِ ہندسہ (ریاضی) کا اضافہ کیا گیا۔

مکاتب میں داخلے اور انہیں چھوڑنے کی معیاری عمر کی بابت تاریخ خاموش ہے۔ طلبہ چار سال کی عمر سے دس سال کی عمر تک متفرق طور پر داخل ہوتے تھے۔ جو چیز بالکل واضح ہے وہ یہ کہ مکاتب نہ صرف بنیادی تعلیم کے مراکز تھے بلکہ وہ اعلیٰ تعلیم کی تیاری کے لئے سٹیج کا کام بھی دیتے تھے۔ اِن مکاتب (کُتّاب) کا جال پوری اسلامی دنیا میں ایسا پھیلا ہوا تھا کہ ابن خلدون نے اُس وقت کے مختلف ممالک میں نصاب پڑھانے کے طریقوں کا ایک روشن تقابلی جائزہ مہیا کیا ہے۔ ابن خلدون کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ قرآن مجید مغرب اور افریقہ کے دوسرے شمالی ممالک میں ایک مشترک عامل تھا، لیکن طالب علم کو اُس وقت تک کوئی دوسرا مضمون لینے کی اجازت نہیں ہوتی تھی جب تک وہ قرآن مجید میں مکمل مہارت حاصل نہیں کر لیتا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۶۷)

تاریخ میں یہ بات محفوظ ہے کہ طالبات کو مکاتب میں غالباً اُن کی بلوغت کی عمر میں طلبہ سے علیحدہ کر کے اُن کے گھروں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ("An Introduction to the History of Modern Education in Egypt"---J. Heyworth Dunne, p. 14, quoted by Ghulam Nabi Saqib at p. 67

کُتّاب میں تعلیم مفت تھی اور استاد جسے معلم کہا جاتا تھا، بڑے احترام وعظمت کا حامل تھا اگرچہ اُن کا مشاہرہ معتدل تھا۔ شرفاء اور خوش حال طبقہ اپنے بچوں کے لئے نجی استاد رکھتے تھے جنہیں ''مؤدِّب'' کہا جاتا تھا۔ مؤدِّب اخلاقی اور ذہنی دونوں طرح کی تعلیم دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مؤدِّب قدرتی طور پر معلم کی نسبت زیادہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ("History of Muslim Education" --- Ahmad Shalaby, p.24 quoted by Ghulam Nabi Saqib at page : 68).

(۳) سکولنگ اور اعلیٰ تعلیم: جونہی مسلم معاشرہ مستحکم ہوا تو اعلیٰ تعلیم کے رُجحان نے بھی ترقی کی۔ ابتدائی تعلیمی ادارہ اگرچہ مسجد تھا جہاں طلبہ کے متعدد طبقات اور حلقے ایک عالم کے گرد جمع ہوتے تھے اور قرآنِ حکیم، سنتِ رسول ﷺ، فقہ اور اُن علوم کی تعلیم پاتے تھے جو بعد میں مذہبی علوم بنے۔ جب ایک عالم اپنے مضمون میں مہارت حاصل کر لیتا تھا اور اپنی شہرت کو پایۂ اِستناد تک مستحکم کر لیتا تھا، تو وہ اپنا حلقہ مسجد میں یا اپنے گھر میں بنا لیتا تھا۔ تعلیم کے مزید ترقی کر جانے سے کتابوں کی دکانیں بھی تعلیمی سرگرمی کا مرکز بن گئیں۔ حکمرانوں، شرفاء اور خوشحال لوگوں نے خصوصی ہال تعمیر کرائے جہاں علماء، طلبہ اور عوام الناس میں سے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے اور خطابات، مباحثوں اور علمی مباحثوں کے لئے محفلیں منعقد کرتے۔ یہ مقامات غیر رسمی تعلیم کی خاطر تھے اور نجی طور پر اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی قسم کی مشہور ومعروف اکیڈمی عباسی خلیفہ المامون نے ''بیت الحکمۃ'' کے نام سے ۸۱۵ھ میں قائم کی تھی۔ حکومتی خزانے سے اس کے اخراجات برداشت کئے جاتے تھے اور خلیفۂ وقت نے اُسے یونانی

فلسفہ وعلوم کے مطالعہ اور اُن کے ترجمہ کرنے کے لئے قائم کیا تھا۔ اکیڈمی کے ساتھ ''الشمیسیہ'' کے نام سے ایک رصد گاہ اور ایک لائبریری بھی تعمیر کی گئیں جو بعد میں علماء، فلسفیوں، سائنسدانوں، مترجمین اور مفسرین کے لئے مادر ہائے علمی بن گئیں اور انجام کار اُنہوں نے اسلام میں نام نہاد ''عقلیت پسند'' طبقے کو جنم دیا۔ (ایضاً، ص ۵۸، بحوالہ غلام نبی ثاقب، صفحہ ۶۸)

تاہم یہ تمام ادارے ۱۰۵۵ء تک اپنا نظام قائم نہ کر سکے۔ ۱۰۵۵ء میں سلجوقی وزیر نظام الملک نے مثالی نمونے کا نظامیہ مدرسہ بغداد میں اور نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، بلخ، مرو، آمل اور موصل میں قائم کیا۔ مدرسہ کے نصاب میں مذہبی اور دینوی مضامین شامل تھے۔ دنیائے اسلام کے مشہور فلسفی الغزالی نے مدرسہ نظامیہ میں تدریس کے فرائض انجام دئے اور اس طرح مدرسہ نظامیہ اعلیٰ اسلامی تعلیم کے لئے نقشِ اوّل کا ادارہ بن گیا اور پھر اس طرز کی اسلامی تعلیم تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی جن میں سے کچھ ممالک صدیوں تک شہرت کی مسلسل روایت کے ساتھ خوب پھلے پھولے۔

حکمران، شرفاء اور مرفہ الحال طبقے مدرسے قائم کرتے تھے۔ کچھ مدرسے فنِ تعمیر، مہیا کردہ سہولتوں، اُن کے ساتھ منسلک لائبریریوں کے رقبے، ممتاز اُساتذہ اور مضامین کے تخصص میں اہم یادگار کے حامل تھے جن میں ممتاز ترین دمشق کا نوریۃ الکبریٰ، نظامیہ اور بغداد کا مستنصریہ تھے۔ (غلام نبی ثاقب، صفحات ۶۸، ۶۹)

مغل شہنشاہانِ ہند اور اُن کے پیشرو سلاطینِ دہلی اور دوسرے (حکمران) خاندانوں نے برِّصغیر کے مختلف شہروں میں متعدد کالج کھولے۔ اُن میں سے ایک سلطان فیروز تغلق نے چودھویں صدی عیسوی میں دہلی میں قائم کیا جو بغداد کے مستنصریۃ مدرسہ سے اپنی آن بان اور شان وشوکت میں اگر زیادہ نہیں تھا تو کم بھی نہیں تھا۔ (ایضاً)

اِن مدرسوں کے علاوہ جہاں تعلیم زیادہ تر نظریاتی تھی، کچھ رصد گاہیں اور شفا خانے بھی تھے جو سائنسی علوم اور تجرباتی اداروں کے طور پر آزادانہ (بلا روک ٹوک) کام کر رہے تھے جبکہ کچھ دوسرے مدرسے کالجوں سے منسلک تھے۔ خلیفہ مامون الرشید کی مشہور ''الشمیسیہ'' نامی رصدگاہ کی نقل کئی دوسرے ممالک میں کی گئی۔ مسلم ہندوستان میں مغل شہنشاہ ہمایوں اپنی رصدگاہ میں باقاعدہ جانے والے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ رصدگاہ ہے جہاں اُن کا پاؤں پھسلا اور وہیں وفات پائی۔ (ایضاً)

مسلم نظامِ تعلیم کے نقطۂ عروج کے وقت قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی بہت مشہور ہے جس نے ابھی حال ہی میں اپنا پہلا ہزار واں سال مکمل کیا ہے۔ گزشتہ چند عشروں میں اسے جدید لائنز پر استوار کیا گیا۔ ۸۵۹ء میں مراکش میں قائم شدہ قراوییّن کا مدرسہ بھی دنیائے اسلام کی قدیم ترین جامعہ (یونیورسٹی) ہے۔

۱۱۰۶ (تعلیم وتعلّم EDUCATION)

احاطۂ معلومات اور علم (Knowledge and Ilm): اسلام میں احاطۂ معلومات (Knowledge) کو ''علم'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے' اگرچہ ''معرفت'' اور ''شعور'' وغیرہ جیسے دیگر الفاظ بھی اس کے لئے مستعمل ہیں۔ لیکن دوسرے الفاظ میں تنگیِ معانی ہے جبکہ ''علم'' کا لفظ زیادہ جامع ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام' صفحات ۴۶۹'۴۷۰)

انگریزی لفظ (Knowledge) کی بابت Rosenthal کی رائے یہ ہے:

''اس لفظ میں 'علم' کے تمام حقیقی اور جذباتی مشمولات (مندرجات) کے اظہار کی کمی ہے۔ کیونکہ 'علم' اُن اصطلاحات میں سے ایک ہے جنہوں نے عالمِ اسلام میں خاصا اثر کیا ہے اور مسلم تہذیب کو اس کی ممتاز شکل اور نیا رُخ عطا کیا ہے۔ دراصل علم جیسا اور کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو مسلم تہذیب کی تمام جہتوں میں تعین کے لئے اس طرح فعّال ہو جیسا کہ علم کا لفظ۔ ("Knowledge Triumphant"....Rosenthal, pp. 1, 2)

اپنی کتاب ''اِحیاء علوم الدین'' میں جو اسلام کے علمِ عمرانیات میں مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے' امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا کہ انسان فطری طور پر علم کا طالب (متلاشی) اور حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ علم کے متلاشی لوگوں کا بنیادی مقصد حقیقت سے وابستگی ہوتا ہے کیونکہ حقیقت کا حتمی یقین اسی سطح پر ممکن ہوتا ہے۔ حقیقت کے ساتھ وابستگی جسے الغزالی نے ''مکاشفہ'' کا نام دیا ہے' علم کی اعلیٰ ترین کیفیت ہے۔ مکاشفہ نا قابلِ انتقال ہوتا ہے یعنی الفاظ اس کی اصل فطرت کو ظاہر نہیں کر پاتے کیونکہ الفاظ تو روایتی طور پر معلوم و معروف تصورات کو ظاہر کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مکاشفہ کی تحصیل بھی نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا تجربہ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کی سنتِ مبارکہ پیغمبر علیہ السلام کے مکاشفہ کے نتیجہ کی تشکیل کرتے ہیں کیونکہ عقل وفہم کی ہر سطح کے لئے اِنہیں خدائے قدوس نے خود ظاہر کیا ہے۔ ("Modernization of Muslim Education" --- Ghulam Nabi Saqib, pp. 44, 45)

مکاشفہ کے بعد وحی اور الہام کا مرحلہ آتا ہے جن میں حقیقت خود بخود احاطۂ معلومات مہیا کرتی ہے۔ وحی انبیاء اور رسولوں پر اور الہام صداقت کے متلاشی لوگوں کو ہوتا ہے۔ علم کی یہ تمام اعلیٰ سطحیں علمِ لدُنّی کا جزو ہیں اور جب تک انسان اِنہیں حاصل نہیں کر لیتا' وہ صاحب عقل و دانش نہیں کہلا سکتا۔ قرآنِ حکیم کے مطابق وحی یا رب تعالیٰ کا رسول سے براہِ راست مخاطب ہونے کا عمل نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد ختم ہو گیا جبکہ الہام (یعنی کسی بات کا منجانب اللہ دل میں ڈالا جانا) کا دروازہ کھلا ہے اور نیک بندوں کو ہر زمانہ میں الہام ہوتا ہے۔ (ایضاً' ص ۴۵)

علم کو نظریاتی اور عملی دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور عملی حصّہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''علم کی اُس وقت تک تکمیل نہیں ہوتی جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔ وہ شخص جو علم حاصل کرتا ہے اور اُس پر عمل بھی کرتا ہے' نیکی کے دو کام کرتا ہے۔ اگر اُس نے علم حاصل تو کیا لیکن اُس پر عمل نہ کیا تو اُس نے ایک مرتبہ اللہ کی فرمانبرداری کی اور ایک مرتبہ اُس کی نافرمانی کی اور وہ شخص جس نے نہ تو علم حاصل کیا اور نہ ہی (اُس پر) عمل کیا' اُس نے دو مرتبہ حد سے تجاوز کیا۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام'' ''علم'' کے عنوان کے تحت' صفحات ۴۶۹' ۴۷۰ بحوالہ غلام نبی ثاقب)

ایجوکیشن کا طریق کار : یہ اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح ہوتا ہے۔ اس کا اجتماعی طریق کار معاشرہ کے ہر فرد کو زمانہ ماضی اور حال کے اجتماعی تجربات کو اُس تک پہنچانے کے ذریعے اپنے سماج کا مؤثر کارکن بنانا ہوتا ہے۔ اس کا انفرادی طریق کار ہر فرد کو نئے نئے تجربات کامیابی سے کرنے کے ذریعے پُرسکون اور پیداکار (Productive) زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔(Encyclopedia Americana, Vol. 9, p. 642)

مقصدِ تعلیم از روئے قرآن حکیم : اسلامی معاشرہ میں تعلیم کے طریق کار اور اس کے مقصد کی بابت قرآنِ حکیم ہماری اِس طرح راہ نمائی فرماتا ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آلِ عمران : ۶۴)

''حقیقت میں اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا جب اُس نے اُنہی میں سے ایک پیغمبر اُن میں بھیجا جو اُنہیں اُس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُنہیں پاک وصاف کرتا ہے اور اُنہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے' اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔'' (۳:۶۴)

''آیتیں پڑھ کر سنانے'' کا مطلب اسلامی ماحول کا لانا ہے۔ ''پاک وصاف کرنے'' کا مطلب اُس اسلامی ماحول کے ذریعے مثالی مسلمان پیدا کرنا ہے۔ ''کتاب وحکمت کی تعلیم دینے'' کا مطلب تعلیم وتعلّم اور نئی تکنیکی مہارتیں سکھانے کے ذریعے تحقیق وتدقیق کا شوق دلانا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اِس جامع مقصدِ تعلیم پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا :

''جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ تعلیم وتعلّم کی انتہا ہے' اُس نے علم کے مقام کو گھٹا دیا اور اُسے اُس مقام سے گرا دیا جو اللہ تعالیٰ نے اُسے عطا کیا ہے۔'' (''الاحکام السلطانیہ'' المآوردی' صفحہ ۲۷)

تعلیم وتعلّم کے مقاصد کا خلاصہ اِن سطور میں درج کیا جاتا ہے:

(الف) علم برائے حصولِ علم نہیں : اسلام کے نزدیک علم منتہائے مقصد نہیں بلکہ یہ تو اُس مقصد کو

پانے کا ذریعہ ہے جو مقصدِ حیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ قرآن حکیم نے کئی مقامات پر مقصدِ حیات کو بیان کیا ہے۔ مثلاً

(۱) یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ o (البقرۃ : ۲۱)

(۲) وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ o (اَلْحِجر : ۹۹)

(۳) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ o (اَلذّٰرِیٰت : ۵۶)

(۱) ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔'' (۲ : ۲۱)

(۲) ''اور اپنے رب کی عبادت امرِ یقین پیش آجانے تک (وقتِ آخر تک) کرتے رہیے۔'' (۱۵ : ۹۹)

(۳) ''اور میں نے جنات اور انسان کو پیدا ہی اِسی لئے کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔'' (۵۱:۵۶)

اسلامی تعلیم جہاں ایک طرف اپنے ضابطہِ حیات سے متعارف کراتی ہے تا کہ مسلمان اس کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں تو دوسری طرف یہ اُنہیں اِن اصولوں کی معاشرے میں تشہیر کرنے کی ترغیب دیتی ہے تا کہ تمام ماحول الٰہی رنگ میں ڈھل جائے۔ ڈاکٹر احمد لسٹر فرماتے ہیں :۔

''نظامِ تعلیم کو ایسے لوگ پیدا کرنے چاہئیں جن کا فرد اور سماج سے متعلق اسلامی نظریہ پر پختہ اور غیر متزلزل ایمان ہو۔ اس نظام کو اُن میں ایسی اسلامی روح بھرنی چاہیے جو اُنہیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر شعبہ حیات میں آزادانہ ترقی کرنے کے قابل بنا دے۔'' (''اسلام کا نظریہِ تعلیم''۔ ڈاکٹر احمد لسٹر' ص ۴۳)

(ب) رضائے الٰہی کا حصول : حصولِ علم میں اسلام کا نظریہ اپنے خالق و مالک کی خوشنود اور رضا کا حصول ہے' نہ کہ مال و دولت اکٹھا کرنا یا کوئی اہم منصب حاصل کرنا۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے نزدیک عہدہ و منصب اور دھن دولت غیر مانوس الفاظ ہیں۔ قرآن مجید اس نکتے کو یوں بیان کرتا ہے :

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا o (اَلنَّجم : ۲۹)

''تو آپ اُس کی طرف سے خیال ہی ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کی طرف سے بے پروائی اختیار کئے ہوئے ہے اور دُنیوی زندگی کے سوا اُس کا کوئی مقصود ہی نہیں۔'' (۵۳: ۲۹)

تعلیم کے طریقِ کار کے حوالے سے منوّر ابنِ صادق لکھتے ہیں :

''تعلیم کا بنیادی مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اُس کی معرفت ہونی چاہیے۔ اسی وجہ سے اُخروی زندگی سے متعلق علوم کی خاص اہمیت بیان کی گئی ہے۔'' (''تعلیم و تعلّم'' ص ۷)

اور ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی بیان کرتے ہیں:۔

''اسلام میں مقصدِ تعلیم آدمی اور خدا کے درمیان تعلق پیدا کرنا ہے جس کے نتیجہ میں انسان احکامِ الٰہی کی پابندی اپنی خوشنود اور آزادانہ رضامندی سے کرتا ہے اور اُنہیں اپنی پسند اور ناپسند کا معیار ہونے کا ایمان رکھتا ہے۔'' (''اسلام کا نظامِ تعلیم''۔۔۔ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی' ص ۵۱)

(ج) تعمیرِ کردار : ہمارے نبیِ معظم ﷺ کی تعلیمات کا بنیادی دائرۂ عمل بنی نوعِ انسان کو تمام اندرونی' بیرونی' جسمانی اور اَخلاقی بیماریوں سے پاک وصاف کرنا تھا اور اُن کی روحوں کی تطہیر کرنا تھی جس کی طرف قرآن حکیم نے وَیُزَکِّیهِمْ کے معنی خیز کلمہ میں اشارہ کیا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تعلیم کا اہم مقصد متعلم میں نہ صرف علم کی پیاس کو آسودہ کرنا ہے بلکہ اُس میں اعلیٰ اَخلاقی کردار سے پیدا ہونے والی معاشرتی زندگی کی خصوصیات کو بھی اجاگر کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا صدرالدین اصلاحی یوں لکھتے ہیں :۔

''اسلام ایک طرف تو آدمی کی انفرادیت کی تکمیل کرتا ہے تو دوسری طرف وہ اُسے سماج کا ایک مفید اور راست رَو اور راست باز رُکن دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ماحول کو خوبصورت بنائے اور اُسے اپنے ابنائے جنس کے جائز مقاصد کی تکمیل کے موافق بنائے۔ اس طرح اسلامی تعلیم کا مقصد فرد اور سماج کے درمیان ایک خوبصورت توازن قائم کرنا ہے۔'' (''اسلام ایک نظر میں''۔ مولانا صدرالدین اصلاحی، صفحہ ۵۱)

(د) دنیا اور آخرت کا حسین امتزاج : اسلام ترکِ دنیا اور تمام راہبانہ طریقوں کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ نسلِ انسانی کو اُن تمام ذرائع و وسائل سے بھرپور استفادہ کی ترغیب دیتا ہے جو اللہ نے اُنہیں عطا کئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا :

(۱) يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (المائدۃ : ۸۷)

''اے ایمان والو! اپنے اوپر اُن پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرلو جو اللہ نے تمہارے لئے جائز کی ہیں اور حدود سے آگے نہ نکلو۔'' (۵:۸۷)

(۲) قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف : ۳۲)

''(اے نبی!) آپ اُن سے پوچھئے کہ اللہ کی زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے' کس نے حرام کردیا ہے؟'' (۷ : ۳۲)

(۳) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (اَلْمُلك : ۱۵)

''وہ وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے مسخر کردیا' سو تم اُس کے راستوں میں چلو پھرو اور اللہ کی (دی ہوئی) روزی میں سے کھاؤ۔''

۱۱۱۰ (تعلیم وتعلّم EDUCATION)

نبیِ اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''اُس علم سے اللہ کی پناہ مانگو جو فائدہ نہ دے۔''

لیکن اِس فائدہ سے مراد کوئی ماڈی یا مالی پہلو مراد نہیں۔ اسلام ایسے طرزِ تعلیم کی حمایت کرتا ہے جو مسلمان میں دونوں دنیاؤں کے درمیان ایک خوش کن اور ہم آہنگ توازن کو پروان چڑھائے۔ اسلامی تعلیم کے معانی ومفہوم کے حوالے سے مولانا محمد طاسین لکھتے ہیں:

''اسلامی معاشرے میں صحیح طرزِ تعلیم ماڈی اور روحانی دونوں ضرورتوں کا مناسب اہتمام کرتا ہے۔ وہ نظام جو صرف روحانی کامیابی پر مشتمل ہو یا اس کے برعکس صرف ماڈی کامیابی وکامرانی پر مشتمل ہو' اُسے مکمل نظام نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ اسلام کی تعلیم ہے' مادر ہائے علمی میں پڑھائے جانے والے تمام علوم کو انسانیت کی فلاح و بہود پر مرکوز ہونا چاہئے۔'' (''اسلامی نظامِ تعلیم کا مفہوم ومطلب'' بحوالہ ''اسلامی تعلیم نمبر' صفحہ ۳۸۰)

رسمی یا رواجی تعلیم (Formal Education) : سکولوں اور کالجوں کی طرح یہ منظم اور باضابطہ حاضری اور مطالعہ کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔

غیر رسمی تعلیم (Informal Education) : یہ روز بروز کے تجربات یا کتب' رسائل وجرائد' حرکی تصاویر' ریڈیو یا ٹیلیویژن جیسے میڈیا سے حاصل کی جاتی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیروکاروں کو ہر ذریعے سے علم حاصل کرنے کا شوق دلایا خواہ وہ رسمی تعلیم کا ذریعہ ہو یا غیر رسمی ذریعہ۔

اختباری علم (Empirical Knowledge) : یہ علم نظریات کی بجائے مشاہدے اور عملی تجربے پر مبنی ہوتا ہے اور اس میں حسی مشاہدات کو معتبر مانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تحصیلِ علم کا یہ ذریعہ امکانیت (Probability) پر مبنی اور غیر یقینی ہوتا ہے کیونکہ انسانی حس اور تجربے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔

غیر اختباری علم (Knowledge based on Priorism) : یہ علم تجربات اور محسوسات کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاتا اور اسی لئے یہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے جیسا کہ ۲+۲=۴ یقینی اور متفق علیہ بات ہے۔
(Dictionary of Contemporary Thought---- David Kirby, p. 7)

ذاتی تحقیق' تجربے اور تفکر کے ذریعے حاصل شدہ انسانی علم حتمی اور قطعی نہیں ہوتا اور متعدد احتمالات اور مفروضات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ کہ ایک سائنسی نظریہ ایک وقت میں مستحکم اور ہر دلعزیز ہوتا ہے لیکن کچھ وقت کے بعد

وہی نظریہ ایک اور نظریہ سے مسترد کر دیا جاتا ہے' ایک کھلی اور واشگاف تاریخی حقیقت ہے جس کی وجہ انسانی کوشش ہے۔ لیکن اُس علیم وخبیر کی جانب سے آیا ہوا علم ہمیشہ یقینی' حتمی اور قطعی ہوتا ہے اور اس میں کسی احتمال یا تغیر وتبدل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ قرآن مجید اس حقیقت کو یوں واضح کرتا ہے :۔

(۱) فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَ الرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
''اگر تم میں کسی چیز کی بابت باہم اختلاف ہو جائے تو اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اُس (معاملے) کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دیا کرو۔'' (النّساء : ۵۹)

کتاب اللہ (قرآنِ حکیم) کے ذریعے اللہ کے احکام کی طرف رجوع کرنا تو ظاہر ہے لیکن رسول کی طرف رجوع کرنے کی کوئی صورت آپ کی وفات کے بعد سوائے اس کے ممکن نہیں کہ دفترِ احادیث وسُنن کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس طرح حدیث وسُنّیت کی حُجّیت خود قرآن حکیم سے ثابت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حکام وعلماء سے عوام کا اختلاف بالکل جائز ہے اور یہ کہ آخری اپیل کتاب وسنت کی عدالت میں ہونی چاہئے۔

(۲) وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ o فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَنِعْمَةً (الحُجرات : ۷، ۸)
''اور جانے رہو کہ تم میں رسول اللہ (موجود) ہیں' بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اُن میں اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو تمہیں تکلیف پہنچے لیکن اللہ نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اُسے تمہارے دلوں میں پسندیدہ بنا دیا' اور کفر وفسق اور نافرمان سے تمہیں نفرت دلا دی۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور انعام سے راہِ راست پر ہیں۔'' (۷، ۸ :۴۹)

''اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں'' سے مراد صرف امورِ دنیوی میں کہنا ماننا ہے ورنہ احکامِ شریعت میں تو اس کی گنجائش سرے سے تھی ہی نہیں۔ اَلفُسُوق سے بڑے گناہ اور العِصْیان سے چھوٹے گناہ مراد ہیں (ماجدی)

ایجابیت (اِثباتیت Positivism) : تجربیت اور مابعد الطبیعیات سے صَرفِ نظر کر کے یہ صرف مادّی' قابلِ مشاہدہ مظاہر کو تسلیم کرنے کا نظریہ ہے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کے عہد میں قارون کا ہیبت ناک انجام مادیّت پرستوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو اپنے خالق ومالک کی اُن نوازشات وانعامات پر شکر کرنے کے عادی نہیں ہیں جو اُس نے فانی انسان پر کی ہیں۔ قارون ایسا کند ذہن اور متکبر تھا جو اس بات کا مدعی تھا کہ اُس نے دولت اپنی ذاتی خوبی' علم ومہارت کی

وجہ سے کمائی ہے اور اسی لئے وہ اپنے ابنائے جنس سے بے دلی اور لا پروائی سے پیش آتا تھا کہ کسی کو وہ اپنے سے فائق اور بڑا نہیں سمجھتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے معاصر پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) سے مخالفت کے نتیجہ میں انجامِ بد سے دوچار ہوا۔

سورۃُ الْقَصَص کی آیات ۷۶ تا ۷۹ میں کس خوبصورتی اور عمدگی سے دنیا دار لوگوں کی ذہنیت کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اِسی زندگی کی زیب و زینت کو اپنا مقصدِ وجود بنائے ہوئے اور اپنا اصلی مطمحِ نظر قرار دئے ہوئے تھے:۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَا اِنَّ مَفَاتِحَه، لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ اِذْقَالَ لَه، قَوْمُه، لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَo وَابْتَغِ فِيْمَا آتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَo قَالَ اِنَّمَا اُوْتِيْتُه، عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِه مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَo فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِه فِىْ زِيْنَتِه قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ قَارُوْنُ اِنَّه، لَذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍo وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَo فَخَسَفْنَا بِه وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَه، مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَه، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَo وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَه، بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِه وَ يَقْدِرُ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّه، لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَo (اَلْقَصَص : ۷۶ تا ۸۲)

"قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا' سو اُس نے اُن کے خلاف گھمنڈ اختیار کیا اور ہم نے اُسے اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ اُس کی کنجیاں زور آوروں کی ایک جماعت کو گراں بار کر دیتی تھیں۔ جب اُس کی قوم نے اُسے کہا کہ اِترا مت' کہ اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے' اُس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر اور دُنیا سے (بھی) اپنا حصہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے' تو بھی (بندوں کے ساتھ) حُسنِ سلوک سے پیش آ اور روئے زمین پر فساد مت پھیلا' بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ کہنے لگا: مجھے تو یہ سب میری ہنر مندی سے ملا ہے۔ کیا اُسے یہ خبر نہ تھی کہ اللہ اُس سے پہلے کی اُمتوں میں ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو طاقت میں بھی اُس سے بڑھے ہوئے تھے اور جمعیت میں بھی اور مجرموں سے اُن کے گناہوں کی بابت سوال نہیں کرنا پڑتا۔ پھر وہ اپنی قوم والوں کے سامنے اپنے تجمّل و آرائش کے ساتھ نکلا۔ جو لوگ دنیوی زندگی کے طالب تھے' بولے: کاش ہمیں بھی ایسا (ساز و سامان) ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے' بے شک وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی' وہ بولے: تمہارا ناس ہو' اللہ کے ہاں کا ثواب کہیں بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ تو صرف صبر کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔ پھر ہم نے اُس (قارون) کو مع اُس کے مکان کے زمین میں دھنسا دیا' سو کوئی جماعت اُس کے لئے ایسی نہ ہوئی جو اُسے اللہ کے مقابلہ

میں بچالیتی اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا۔ اور کل جو لوگ اُس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (اب) کہنے لگے: بس تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے' خوب روزی دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگی سے دیتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ نے (اپنا) کرم نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی وہ دھنسا دیتا۔ بس تو معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی۔'' (۷۶ تا ۸۲ : ۲۸)

گزشتہ صفحہ کی خط کشیدہ سطور میں دنیاداروں اور اللہ والوں کی ذہنیت کا تقابل قرآنِ حکیم نے کس مؤثر انداز میں پیش کیا ہے جن کے مطالعہ سے قاری اپنے ذہن میں اُخروی انعامات کے مقابل اس دنیا کی منفعتوں کے خلاف زہر آلود نفرت پائے گا اور اُس کا سر بے اختیاری طور پر اپنے خالق و مالک کے حضور جھک جائے گا اور وہ یہ تسلیم کرے گا کہ علم و فن کی مہارتوں سمیت فانی انسان پر تمام نوازشات وعطیات اور برکتیں اُس خالقِ لم یزل کی طرف سے ہو رہی ہیں' کسی ذاتی غرض وغایت یا منفعت کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی مخلوقات پر بہت ہی مہربان اور شفیق ہے (بحوالہ قرآنی آیات ۲۰۷ :۲ ؛ ۳۰ :۳)۔

علم کے تین دروازے : اگر غیر جانبدارانہ طور پر دیکھا جائے تو سوال یہ ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ کا آخر منبع کیا ہے اور وہ کہاں سے آئے؟ تو جواب یہ ہے کہ علیم وخبیر اللہ ہی اپنی مخلوقات پر تجربے اور مشاہدے کے راستے کھولتا ہے۔ قرآن حکیم اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے :۔

(1) وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُم مِّنْ بُطُوْنِ أُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَ الْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (اَلنَّحل : ۷۸)

''اور اللہ ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے سماعت' بینائی اور دل پیدا کئے تا کہ تم شکر گزار بنو۔'' (۷۸ :۱۶)

سماعت اس لئے دی کہ حق تعالیٰ کے احکام سنو۔ آنکھیں اس لئے دیں کہ حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے نمونے مشاہدے کرو اور دل اس لئے دیا کہ حق تعالیٰ کی عظمت کا احساس اور اُس پر غور وتدبّر کرو۔ سماعت وبصارت کی تخصیص اس لئے کی کہ علم ومعرفت کے ذرائع میں اہم ترین یہی دو ہیں۔ اور دل کی تخصیص اس لئے کی کہ حواسِ ظاہری وباطنی سب اسی کے تابع ہیں (ماجدی اردو' حاشیہ صفحہ ۵۶۵۔ نوٹ:۱۲۳)

دل اور سمعی وبصری حواس تین ایسی راہیں (دروازے) ہیں جن کے ذریعے علیم وخبیر اللہ انسانِ فانی کو علم عطا فرماتا ہے اور اِن تین ذرائع کے صحیح استعمال کے متعلق اللہ کے حضور پوچھا جائے گا جیسا کہ قرآن نے متنبہ کیا:

(ا) اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ٥ (بنی اسرائیل:۳۶)

''بے شک کان' آنکھ اور دل ان کی پوچھ ہر شخص سے ہوگی۔'' (۳۶ : ۱۷)

یعنی ہر شخص سے سوال اس کا ہوگا کہ کان سے سننے کا' آنکھ سے دیکھنے کا اور دل سے سوچنے' سمجھنے' اور یقین کرنے کا کام جائز اور صحیح موقعوں پر کتنا لیا اور ناجائز اور غلط موقعوں پر کتنا؟ ہر ہر فرد کو احساسِ ذمہ داری کی تعلیم اس سے بہتر اور کہاں ملے گی؟ اس پر اگر آج عمل ہونے لگے تو شخصی' قومی' انفرادی واجتماعی ہر قسم کے کتنے جھگڑے قصے آج دنیا سے مٹ جائیں!

(۲) أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللهِ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ٥ (أَلْجَاثِيَة : ۲۳)

''تو کیا آپ نے اُس شخص کی بھی حالت دیکھی ہے جس نے اپنی خواہشِ نفسانی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اللہ نے اُسے باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا اور اُس کے کانوں اور اُس کے دل پر مُہر لگا دی اور اُس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا' تو ایسے کو اللہ کے سوا اور کون ہدایت کرے۔ تو کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟''

(۳) وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَا اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّأَبْصَارًا وَّأَفْئِدَةً فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَىْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ (أَلاحقاف : ۲۶)

''اور ہم نے اُنہیں جو قدرت دی تھی وہ قدرت تم لوگوں کو نہیں دی اور ہم نے اُنہیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے تھے' سو نہ اُن کے کان اُن کے ذرا بھی کام آئے اور نہ اُن کی آنکھیں اور نہ اُن کے دل کیونکہ وہ لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تھے اور جس (عذاب) کی وہ ہنسی کیا کرتے تھے اُسی نے اُنہیں آگھیرا۔'' (۲۶ : ۴۶)

یعنی جو تہذیبی اور تمدّنی عروج اقوامِ عاد و ثمود کو حاصل تھا وہ اے اہلِ مکّہ! تمہیں کہاں نصیب! آیت سے بہ قاعدہ عبارۃ النص یہ بھی نتیجہ نکلا کہ انسان کو مادّی وعقلی جتنی بھی صلاحیتیں اور قوّتیں عطا ہوئی ہیں' وہ اسی لئے ہیں کہ اُنہیں رضائے الٰہی کے کاموں میں لگایا جائے اور اپنی عاقبت کو سنوارا جائے کہ یہی زندگی کا ماحصل ہے۔

(۴) قُلْ هُوَ الَّذِىْٓ أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (أَلْمُلك

''فرما دیجئے کہ اللہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے (مگر) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔'' (۲۳ : ۶۷)

(2) وَمَآ أُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ٥ (بنی اسرائیل : ۸۵)

''اور تمہیں علم تو تھوڑا ہی دیا گیا ہے۔'' (۱۷ : ۸۵)

قرآنی لفظ أُوْتِيْتُمْ (تمہیں دیا گیا) فعل مجہول ہے اور صاف ظاہر کرتا ہے کہ علم، تجربہ یا مشاہدہ اُس قادرِ مطلق کے عطیات اور بخششیں ہیں نہ کہ کسی کی ذاتی مِلک۔

(3) نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ٥ (القلم : ۱)
''ن، قسم ہے قلم کی اور اُس کی بھی جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔'' (۱ : ۶۸)

''کوئی شک نہیں کہ علوم وفنون، نظریات وافکار کی تعلیم واشاعت میں زبان کی قوتِ بیانیہ کا بڑا حصہ ہے لیکن اُس کی افادیت زمان ومکان کی حد بندیوں میں محصور ہے جبکہ قلم ایک ایسا آلہ ہے جو زمان ومکان کی مسافتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ گزشتہ صدیوں کے علوم وفنون سے حال ومستقبل کو روشن کرتا ہے اور دُور دراز علاقوں میں پیدا ہونے والے حکماء وفضلاء کے افکار ونظریات کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے قلم کی جو علم کی نشرواشاعت کا مؤثر اور بے مثال ذریعہ ہے، جلالتِ شان کو ظاہر کرنے کے لئے اُس کی قسم کھائی تاکہ اس قرآنِ کریم کے ماننے والے قیامت تک حکمت ودانش کے کارواں کی قیادت کرتے رہیں۔ صرف قلم کی قسم کھا کر اُس کی عزت افزائی نہیں کی گئی بلکہ وَمَا يَسْطُرُوْنَ فرما کر علم کے اُن جواہر پاروں کی بھی قسم کھائی گئی ہے جو نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنتے ہیں۔ اس طرح اُن کی شان کو بھی دوبالا کر دیا۔''

آیتِ مذکورہ میں ''اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس ذاتِ پاک کے بارے میں یہ ایسی لغو باتیں کرتے ہیں، وہ تو ایسی ستودہ صفات ہستی ہے کہ قلم کو اس کی تعریف وثنا سے فرصت نہ ملے گی۔ وہی تحریریں علمی دنیا کے لئے باعثِ عز وافتخار ہوں گی جن میں اس محبوبِ دلرُبا کا ذکرِ پاک ہوگا۔ اس پر تو اُس کے رب نے فضل وکرم فرمایا ہے۔ اُس کے روئے زیبا کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، اُس کی حکمت بھری باتیں سن کر دلوں کے ویرانوں میں بہار آ جاتی ہے۔ بد بخت اُس کی صحبت میں پل برابر بیٹھیں تو اُنہیں ابدی سعادت کا تاج پہنایا جاتا ہے۔ اُس کے نامِ مبارک پر جو لوگ اپنا سر کٹا دیتے ہیں، اُنہیں حیاتِ سرمدی سے سرفراز کر کے شہادت کے منصبِ عالی پر فائز کیا جاتا ہے۔ ہر سچائی، ہر صداقت کے لئے اُس کا قول وفعل شاہدِ عدل تسلیم کیا جاتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۵، ص ص ۳۲۹، ۳۳۰)

(4) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ أَحَدًا ٥ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجنّ : ۲۶، ۲۷)
''وہی علمِ غیب کا جاننے والا ہے، سو وہ غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے پسند فرما لیا ہو۔'' (۷۲: ۲۶، ۲۷)

''یہ پسند کیا گیا رسول'' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات ہے جو ایک طرف تو اپنے خالق ومالک سے علم اور دوسری نوازشات وعطیات وصول کرتا ہے تو دوسری طرف اُنہیں اُس کی مخلوقات میں تقسیم فرماتا

ہے جیسا کہ آپ کا فرمودہ بھی ہے : اَللّٰهُ مُعْطِيْ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِم " یعنی عطا کرنے والا تو اللہ پاک ہے' میں تو (اُس کی جانب سے) تقسیم کرنے والا ہوں ۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خداداد علوم کی بے کرانیوں کا کچھ اندازہ اُن احادیثِ صحیحہ سے ہوتا ہے جن سے کتبِ احادیث بھری پڑی ہیں ۔

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۹ اور سورۃ الانفال کی آیات ۲۲' ۵۵ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام علوم کا مخزن و منبع اللہ بزرگ و برتر ہے جس کے فضل و کرم کے بغیر آدمی جاہلِ مطلق' وحشی اور غیر مہذّب حیوان ہی رہتا ہے اور اُسے انسان کہنا بھی انسانیت کے نام کو بٹہ لگانا ہے ۔

علم کی فضیلت و اہمیت کی بابت شکاریات کے ضمن میں سورۃ المائدۃ کی آیت چہارم میں بیان ہوا کہ:
'' تمہارے سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار جو شکار پر چھوڑے جاتے ہیں' حلال ہے ۔تم اُنہیں اس طریقہ پر سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے ۔'' (۴ : ۵)

(5) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العَلَق : ۵)
'' اُس (اللہ) نے انسان کو وہ کچھ تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا ۔'' (۵ : ۹۵)

محولہ بالا آیات ۱۶:۷۸ اور ۵ : ۹۵ کی رُو سے یہ حقیقت کوئی سربستہ راز نہیں رہتی کہ فانی انسان جہالت ہی سے آیا ہے اور یہ بھی کہ جو چیز اُسے انسان بناتی ہے' وہ علم ہی ہے جس کا منبع و سرچشمہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہے اور یہ علم اُسے اُس کے آخری رسول ﷺ کی وساطت سے اُسے عطا کیا گیا جیسا کہ قرآن مجید نے اس حقیقت کا اِعادہ کئی جگہوں پر کیا ہے مثلاً :

(۱) كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ آيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ٥ (البقرۃ : ۱۵۱)
'' جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تمہارے رُوبرو ہماری آیتیں پڑھتا ہے' اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں اُس کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ۔'' (۲: ۱۵۱)

اِسی مضمون کو سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ اور سورۃ الجمعہ کی آیت دوم میں بھی بیان کیا گیا ہے ۔

(۲) وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا٥ (النِّساء : ۱۱۳)

''(اے نبی!) اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھایا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے۔'' (۴ : ۱۱۳)

اللہ تبارک و تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ پر اُس ذاتِ کردگار کی بے پناہ نوازشات و انعامات ہوتے ہوئے آپ میں کسی نقص یا غلطی کا پایا جانا محال بالذات ہے اور آپ پر اِن نوازشات و عطیات کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ کوئی آپ کو (معاذ اللہ) صراطِ مستقیم کی پٹڑی سے اُتار دے۔ اس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کے دشمنوں کی بدخواہیوں کے باوجود اپنے رسول کی حفاظت فرماتا ہے تاکہ آپ کی ذاتِ مقدّسہ تمام عالم کے تمام انسانوں کے لئے تاابد مشعلِ راہ بنی رہے۔

علمائے دین کا فرضِ منصبی: نبی مکرّم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ''علمائے دین انبیائے کرام کے وارث ہیں'' بہ ایں معنی کہ علمائے دین پر عوام الناس تک دین کا صحیح علم اور درست معلومات پہنچانا لازم ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو دنیا کی ہوا و ہوس اور لالچ سے دُور رکھیں تاکہ خدا خوفی پر مبنی فضا قائم ہو جائے جو الٰہی احکام کے آسان نفاذ کے موافق ہو۔ قرآنِ حکیم علمائے دین کو اُن کی ذمّہ داری کا احساس یوں دلاتا ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ (فاطر : ۲۸)

''اللہ کا خوف رکھنے والے تو اللہ کے عالم بندے ہی ہوتے ہیں۔'' (۳۵ : ۲۸)

غیر موافق اور سنگین حالات میں شرعی احکام کے توضیحی بیان میں امام ابوحنیفہ' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ کی حیران کن مثالیں نسلِ انسانی کے لئے عموماً اور اُمّتِ مسلمہ کے لئے بالخصوص ہدایت کی تابندہ مشعل ہیں۔

مسلم سماج کے لئے تعلیم و تعلّم کی حکمتِ عملی (پالیسی): نبی مکرّم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے قرآنِ حکیم اُنہیں حکم دیتا ہے:

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ آیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃَ (الاحزاب : ۳۴)

''اور تم اللہ کی اُن آیتوں اور علم و حکمت کا ذکر کرتی رہو جو تمہارے گھروں میں پڑھ کر سنائے جاتے رہتے ہیں۔'' (۳۳ : ۳۴)

اُذْکُـــرْنَ (فعلِ امر) کا معنی نہ صرف ذکر کرنا یا تلاوت کرنا ہے بلکہ اس کا معنی ''یاد کرنا' تعلیم دینا' جتلانا اور خالق کے اُس پیغام کو مشتہر کرنا بھی ہے جو آپ پیغمبر علیہ السلام سے سنتی رہتی ہیں' وہ پیغمبر جو خداداد علم کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ خطرات و حوادث سے بچنے کے لئے ہر شعبۂ حیات میں آپ کی ہدایات و تعلیمات پر عمل پیرائی ازبس ضروری ہے۔ غیروں کے نظامہائے تعلیم پر نظر رکھنے کی بجائے اگر قرآنِ حکیم کی پیش کردہ اس تعلیمی پالیسی

کا نفاذ صحیح معنوں میں ہمارے مادر ہائے علمی میں کر دیا جائے' تو یقیناً یہ دونوں جہانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہوگا۔

علمی اور جسمانی تعلیم : اِن دونوں کا ذکر علی الترتیب ذیل کی آیات میں آیا ہے :۔

(١) كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ٥ (البقرة : ١٥١)

''جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تمہارے رُو برو ہماری آیتیں پڑھتا ہے' اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں اُس کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔'' (٢: ١٥١)

(٢) إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرة : ٢٤٧)

''بے شک اللہ نے اُسے (طالوت کو) تمہارے مقابلہ میں منتخب کر لیا ہے اور اُسے علم اور جسم دونوں میں کشادگی زیادہ دی ہے۔'' (٢: ٢٤٧)

ہمارے نوجوانوں کے لئے اَخلاقی تعلیم : لڑکپن کا اختتام اور بلوغت کی ابتدا تیرھویں سال سے شروع ہوتی ہے اور عنفوانِ شباب کا زمانہ بیس سے کچھ اوپر سالوں تک کا زمانہ ہوتا ہے۔ زندگی کا یہ دَور جسمانی نشوونما' ذہنی صلاحیتوں کے ارتقاء' اخلاقی بلندی اور اُٹھان' خودمختاری اور زندگی کی ذمہّ داریوں کے اُٹھانے کے احساس کا دَور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جذباتی اور حیاتیاتی انتشار بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

بالخصوص اسلامی معاشرہ کے نوجوان قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جن کی ہیتِ ترکیبی دو نمایاں اجزاء سے تشکیل پاتی ہے جن میں سے ایک روحانی اور دوسرا ماڈی ہے۔ یہ دونوں اجزاء ہماری انتہائی توجہ اور حفاظتی تدابیر چاہتی ہیں۔ نوجوان نسل پر نگاہ رکھنے کے لئے ہماری توجہ میں ایسی کوشش شامل ہونی چاہئے جو نوجوان کو اُس کی اپنی ذاتی اور ملکی وقومی فلاح و بہبود کی خاطر ایک قیمتی' قابلِ فخر سرمایہ بنا دے۔ مذہبی اور اَخلاقی اقدار کی پرداخت (کاشت)' نظم وضبط' نفسیاتی توجہ اور سب سے بڑھ کر موافق معاشرتی ماحول خاطر خواہ نتائج کے حصول کے لئے معاون ہوتے ہیں۔ ہمارا معاشرتی ماحول ایسا ہونا چاہئے جو ہر نوجوان کو روحانیت کا برقی مورچہ (Battery) مہیا کرے جسے گاہے گاہے دوبارہ بھرنے (re-charging) کی ضرورت بھی پیش آئے گی اور اس دوبارہ بھرنے کے وقت میں نوجوان کے آس پاس کے لوگ خود اِس ضرورت کو پورا کر دیا کریں گے۔ اعلیٰ اَخلاقی اقدار کی پشت پناہی میں اور قوم میں خوشحالی اور فلاح و بہبود لانے میں نوجوان کی رہنمائی کرنے کی ذمہ داری والدین' رشتہ داروں' دوستوں' اساتذہ اور بالخصوص حکومتِ وقت پر عائد ہوتی ہے۔

ہمارے نوجوان کی راہ نمائی کا طریق کار عملی ہونا چاہئے جو اُن کے جبلّیاتی رُجحانات کو سمجھنے پر مبنی ہو جس میں زبانی پند و نصائح کم ہوں اور ہمارے رویّہ اور انداز میں اچھی مثالیں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ کسی کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں عملی مظاہرہ (جو زبانی نمود سے پاک ہو) اور اُس کوشش میں نفاست کی بابت قرآن مجید فرماتا ہے :۔

(۱) اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ (النّحل)

''اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور اُن کے ساتھ پسندیدہ طریقے سے بحث کیجئے۔'' (۱۶: ۱۲۵)

(۲) یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ○ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ○

''اے ایمان والو! ایسی بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔'' (۲، ۳ : ۶۱)

اسلام ہر مسلمان کو عملی انسان' سیرت کا پختہ اور کردار کا مضبوط اور مجاہد بنانا چاہتا ہے اور نفاق بلکہ شائبہِ نفاق سے بھی دُور رکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے وہ قول و عمل کی مطابقت پر شدّت سے مُصر رہا ہے۔

اعلیٰ اَخلاقی اَقدار پر مبنی زندگی ٹھوس بنیادوں پر استوار پختہ ایمان ہوتا ہے۔ ایمان ایک ایسا چشمہ ہے جہاں ایک آدمی اپنی روحانی پیاس بجھاتا ہے۔ یہ ایک ایسا حصار ہے جہاں آدمی حوادثِ حیات سے پناہ میں آتا ہے۔ یہ ایک ایسی بریک ہے جو صراطِ مستقیم سے ہٹنے کی ہر کوشش کو روک دیتی ہے اور شکوک و شبہات کے خلاف دفاعی مورچہ بندی کا کام دیتی ہے۔ اس لئے یقین محکم اور پختگیِ ایمان کا حامل شخص تشکیک سے بہت دُور اور آزاد ہوتا ہے جو ایسی بیماری ہے جو ہمارے سماج کے نام نہاد ''روشن خیال'' طبقے میں عام طور پر دیکھی جاتی ہے۔ یقین محکم کے بغیر نہ تو آپ خوش کن زندگی گزار سکتے ہیں اور نہ ہی زندگی کے تلخ حقائق کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ پختگیِ ایمان کی بہترین مثالیں ہمارے آباء و اَجداد اور اَسلاف کی زندگیوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ قرآنِ حکیم ایمان کی اہمیت پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اس کے بغیر لوگوں کی نظر میں انتہائی نیکی کے کام اللہ کی نظر میں بالکل بے قدر رہے ہیں۔

ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسلام کی بنیاد چار باتوں پر ہے جن کا احاطہ مندرجہ ذیل احادیثِ مبارکہ کرتی ہیں :۔

(1) اِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَ اِنَّمَا لِکُلِّ امۡرِئٍ مَّا نَوٰی (بخاری' مسلم' اربعین نووی)

''دراصل اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔''

یعنی حُسنِ نیّت آدمی کو اپنے ابنائے جنس کی بھلائی اور اُن کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کا شوق دلاتا ہے جبکہ بدنیتی سماج پر مصیبت اور تباہی لاتی ہے۔ سماج کے معاملات کو صحیح ڈگر پر چلانے کے لئے ہر ہر فرد کو خلوص اور لگن کا

مجسمہ ہونا چاہئے جو حُسنِ نیت کا دوسرا نام ہے۔ اس لحاظ سے حُسنِ نیت اور پسندیدہ مقاصد نوجوانوں کے اَخلاقی کردار کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے میں کافی مُمد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

(2) مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہ' مَا لَا یَعْنِیْہِ (جامع ترمذی ؛ اربعین نووی)
''آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک خوبی اُس کا اُن باتوں کا چھوڑ دینا ہے جن کا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کرنا اَخلاقی معیار سے گرا ہوا فعل ہے اور قرآن وسنت میں تعلیم شدہ عمدہ ونفیس آداب کے ڈھانچے کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے:

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًاo (الفُرقان : ۷۲)
''اور (اللہ کے صحیح بندے وہ ہیں) جو بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور جب وہ لغو مشغلوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریفانہ گزر جاتے ہیں۔'' (۷۲ : ۲۵)

لایعنی اور بے ثمر مشاغل میں پڑنے کی ناپسندیدہ عادت وقت اور توانائی کے ضیاع کا سبب ہے۔ وہ توانائی جسے بدی کے استیصال کے لئے اور تعمیری کاموں میں صَرف ہونا چاہئے تاکہ سماج خوشحالی کا گہوارہ بن جائے۔

(3) لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ (بخاری' مسلم' اربعین نووی)
''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔''

خود پسندی' بالخصوص جبکہ وہ اپنی حدود سے بڑھ جائے' صرف دوسروں کے حقوق غصب کرنا اور اپنے ذاتی خودغرضانہ مفادات کا تحفظ کرنا جانتی ہے۔ باہمی نفرت اور عداوت اَنانیت کی اس جھوٹی عادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے قانونی حقوق کے تحفظ کی اَن تھک کوشش میں افرادِ معاشرہ ہمیشہ ایک دوسرے سے دست بہ گریباں رہتے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں سکون وآسائش لانے کے لئے کوئی تعمیری کام نہیں ہو پاتا۔ ایک صحیح اسلامی معاشرہ میں ہر فرد ایک دوسرے کے لئے بے لوث اور بے غرض پُرجوش حامی ہوتا ہے اگرچہ وہ غربت ومحتاجی میں مبتلا ہو۔ قرآنِ حکیم خدا خوف ماحول کو یوں آشکار کرتا ہے :۔

(۱) وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃ'' (اَلْحَشر : ۹)
''اور وہ دوسروں کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود فاقہ میں ہی ہوں۔'' (۹ : ۵۹)

(۲) وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُo (المُدَّثّر : ٦)

''اور کسی کو اِس غرض سے مت دیجئے کہ زیادہ معاوضہ ملے۔'' (٦ : ٧٤)

(۳) وَيُطۡعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًاo اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَانُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًاo (أَلدَّهر : ٨، ٩)

''اور وہ اللہ کی محبت سے مسکینوں، یتیموں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے رہتے ہیں۔ ہم تو تمہیں بس اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور نہ تم سے اس کا عوض چاہیں اور نہ شکریہ۔'' (٨، ٩ :٧٦)

نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی جانب سے مدینہ منورہ میں قائم کردہ ''مؤاخاتِ مدینہ'' مندرجہ بالا قرآنی نظریہ کا عملی مظاہرہ ہے اور اسی میں مسلمان کے ایمان کی پختگی، باہمی بھائی چارے کے جذبات، ایک دوسرے کے لئے قربانی کے جذبہ اور نتیجۃً سماج کے استحکام کی بقا ہے۔

(4) اِنَّ الۡحَلَالَ بَيِّن" وَاِنَّ الۡحَرَامَ بَيِّن"وَّبَيۡنَهُمَا مُشۡتَبِهَات" لَا يَعۡلَمُهُنَّ كَثِيۡر" مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اِسۡتَبۡرَأَ لِدِيۡنِهٖ وَعِرۡضِهٖ وَمَنۡ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الۡحَرَامِ كَالرَّاعِيۡ يَرۡعٰى حَوۡلَ الۡحِمٰى يُوۡشِكُ أَنۡ يَّرۡتَعَ فِيۡهِ أَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى أَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ، أَلَا وَاِنَّ فِي الۡجَسَدِ مُضۡغَة" اِذَا صَلَحَتۡ صَلَحَ الۡجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَافَسَدَتۡ فَسَدَالۡجَسَدُ كُلُّهٗ، أَلَا وَهِيَ الۡقَلۡبُ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، اربعین نووی)

''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور اِن دونوں کے درمیان شبہ میں ڈالنے والی چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ تو جو شخص شبہات سے بچ گیا تو وہ اپنے دین وعزت کو بچالے گیا اور جو شخص شبہات میں پڑا تو وہ حرام میں پڑ گیا اُس چرواہے کی طرح جو چراگاہ کے اِردگرد (اپنا ریوڑ) چراتا ہے، قریب ہے کہ وہ اس (چراگاہ) میں چَرانے لگے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی کوئی نہ کوئی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ خبردار! اللہ تعالیٰ کی پناہ گاہیں اُس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو تمام جسم صحیح اور تندرست ہوتا ہے اور جب وہ فساد پذیر ہو تو تمام کا تمام جسم فساد پذیر ہوتا ہے۔ خبردار! وہ ٹکڑا دل ہے۔''

مسلمان کے رویّہ کی لائن ہمیشہ حِلّت اور حرمت کی حدود کے اندر ہوتی ہے۔ ہماری صوابدید کے لئے بارڈر لائن معاملات ہیں جن سے ہمیں بچنا ہے۔ حدیثِ بالا میں ''دماغ'' یا ''ذہن'' کے الفاظ کی بجائے قلب (دل) کے لفظ کا استعمال اتفاقی نہیں بلکہ ارادی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اعمال وافعال جسم کے اس عضوِ رئیس سے صادر ہوتے ہیں۔ لہٰذا حیاتیاتی اور نفسیاتی دونوں نقطہ ہائے نظر سے یہ ضروری ہے کہ سماج کے پہیے کو ساعت وار

(کلاک وائز) چلانے کے لئے دل تمام برائیوں اور گناہوں سے پاک ہو۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ ہر والدین پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کے قول و فعل کی نگرانی کے لئے اُن پر ہمہ وقتی نگاہ رکھیں۔

محمد مہدی عالم کے مضمون کے حوالہ سے مندرجہ ذیل خصوصیات ہمارے نوجوانوں کی صحیح اسلامی اوصاف سے رُوشناس کرانے میں ممد و معاون ہوں گی:

تکبر سے عاری فخر و مباہات ؛ غلامانہ خصلت سے عاری اطاعت ؛ عاجزی کے بغیر خاکساری ؛
فضول خرچی سے عاری سخاوت ؛ خودسری کے بغیر خودمختاری ؛ کمزوری سے عاری صبر واستقامت
بغض و کینہ سے عاری جذبہ مسابقت ؛ مذہبی تعصّب سے عاری پارسائی ؛
انجام سے بے پروائی کے بغیر جرأت ؛ تصنع' خودفریبی سے عاری علم ؛ ڈھیلے پن سے عاری بُردباری ؛
ماضی سے گریز کئے بغیر مسلسل آگے کی طرف حرکت۔

("Encyclopaedic Survey of Islamic Culture" Vol. 17, p. 156)

اسلامی علوم کے نمونے : اسلام میں علم و فضل کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ دراصل قرآن مجید کے مطابق وحی الٰہی اور انبیاء و رُسُل کے بھیجے جانے کا مقصد علم کا ابلاغ (پہنچانا) تھا۔ (بحوالہ سورۃ البقرۃ آیات ۱۵۱' ۱۲۹ ؛ سورہ آلِ عمران آیت ۱۶۴ ؛ سورۃ الجمعۃ آیت دوم) دیگر متفرق آیاتِ قرآنی اور فرموداتِ رسول ﷺ تعلیم و تعلّم اور علم کے پھیلانے پر خاصا زور دیتے ہیں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔

پھر قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں انسان کو مظاہرِ قدرت' دن رات کے آنے جانے' پیدائش اور موت کے راز، افزائش اور فرسودگی' قوموں کے عروج و زوال اور اُن سے اشیاء کی ماہیت اور اسباب پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ("The Reconstruction of Religious Thought" ... Dr. Muhammad Iqbal, pp. 12, 13 quoted by Ghulam Nabi Saqib)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :
(۱) اللہ تعالیٰ کی آفرینش پر ایک گھنٹے کا غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔
(۲) علم سربہ مُہر خزانے کے گھروں کی طرح ہے جس کی کنجیاں تحقیق و تدقیق ہیں۔ لہٰذا تحقیق کیا کرو جو ثواب سے خالی نہیں۔
(۳) تمہارا علم اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس پر عمل نہ کرو۔ جو شخص علم حاصل کرتا ہے اور اُس پر عمل بھی کرتا ہے' اُس کے لئے دو اجر ہیں۔ جو عالم تو ہے لیکن اس کا عامل نہیں اُس نے ایک مرتبہ اللہ کا حکم مانا اور ایک

مرتبہ اُس کی نافرمانی کی۔ اور وہ جو نہ تو عالم ہے اور نہ ہی اس کا عامل ہے' اُس نے دو مرتبہ حد سے تجاوز کیا۔''
(انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: ''علم'' کے عنوان کے تحت' بحوالہ غلام نبی ثاقب' صفحہ ۴۵)

تعلیم وتعلّم سے متعلق چند معروف الفاظ واصطلاحات قرآنِ حکیم کی روشنی میں

(1) جذبہِ مسابقت (Competition): طالب علم میں بالخصوص یہ ایک انتہائی مستحسن جذبہ ہے بشرطیکہ وہ کینہ' حسد اور عداوت سے پاک ہو۔ اِس جذبہ کی بابت قرآن کا نظریہ ملاحظہ ہو:

(۱) وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ o
''اور اپنے پروردگار کی طرف سے بخشش اور اُس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔'' (آلِ عمران ۱۳۳ : ۳)

(۲) سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الحدید : ۲۱)
''دوڑو اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت کی سی ہے' اُن لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔''

''اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو'' سے معلوم ہوا کہ ہر مؤمن کا مُنتہائے عمل اور منزلِ مقصود مغفرتِ پروردگار ہونی چاہئے۔ ''آسمان وزمین کی سی وسعت'' کا معنی یہ کہ جنت بے انتہا وسیع ہے۔ عربی محاورہ میں انتہا اور وسعت کے اظہار کا یہی پیرایہ ادا ہے۔ جنت کی بجنسہٖ پیائش بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اُس کی بے انتہا وسعت اور گنجائش کا اظہار ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الحدید کی آیت ۲۰ پیشِ نظر رہے اور پھر قرآن مجید کی بلاغت ملاحظہ ہو۔ جونہی اس متاعِ دنیا کے فانی اور ہیچ ہونے اور دولتِ آخرت کے باقی وقائم ہونے کا نقش دل میں بیٹھا' معاً جنت کی طرف دوڑ کرنے کا پیام پہنچا دیا۔'' (ماجدی حاشیہ اردو' صفحہ ۱۰۸۱' نوٹ: ۳۰)

اِس آیت میں جنت کے حصول کے لئے صرف ایمان کا ذکر ہے لیکن اس کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی قید نہیں لگائی جس سے بہ ظاہر فرقہ مرجئہ کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نجات کے لئے صرف ایمان لانا کافی ہے' نیک اعمال کی ضرورت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سی آیاتِ قرآنی میں ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذکر موجود ہے اس لئے وہ ذکر اس پر قرینہ ہے کہ یہاں ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی مراد ہیں اور یا ایمان سے ایمانِ کامل مراد ہے اور ایمانِ کامل وہی ہے جس کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی ہوں۔ البتہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ کے بغیر جنت نہیں

ملتی۔ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان والوں کو جنت ضرور ملے گی۔اگر اُن کے نیک اعمال نہیں ہیں یا اُن میں کوئی کمی ہے' تب بھی ممکن ہے کہ رب تعالیٰ اُنہیں اپنے فضل سے ابتداءً جنت عطا فرمادے یا پھر اُنہیں اُن کے گناہوں کی کچھ سزا دینے کے بعد جنت عطا فرمادے۔

آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ جنت کسی نیک عمل سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے ملتی ہے جیسا کہ سورۃ الدُّخان کی آیات ۵۶' ۵۷ میں فرمایا: وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ○ فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكَ (اور اللہ نے اُنہیں دوزخ کے عذاب سے بچالیا۔ یہ سب آپ کے پروردگار کے فضل سے ہوا)۔رہے نیک اعمال تو وہ بھی بندوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی نصیب ہوتے ہیں۔

یہ سوال کہ بعض آیات میں جنت کے حصول کا سبب نیک اعمال کو قرار دیا گیا جیسے فرمایا: تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (الاعراف: ۴۳) (یعنی تم اپنے نیک اعمال کے سبب اِن جنتوں کے وارث بنائے گئے ہو)۔اس کا جواب یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی اور حدیثِ صحیح میں آچکا کہ جنت میں کوئی بھی اپنے اعمال کے سبب سے نہیں بلکہ رحمتِ الٰہی سے جائے گا۔دراصل قرآنِ حکیم میں ذکر ظاہری اور قریبی سبب کا ہے اور حدیثِ مبارکہ میں سببِ حقیقی کا بیان ہے اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

(2) نصاب (Curriculum) : مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول ﷺ دونوں ہی امتِ مسلمہ کا تعلیمی نصاب ہیں اور یہ حقیقت منکرینِ حدیث کے منہ پر زبردست طمانچہ ہے کیونکہ نبی علیہ السلام کی حیثیت محض حاملِ وحی یا ''خط رساں'' کی نہیں بلکہ شارحِ قرآن اور بیان کرنے والے کی بھی ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ (اَلنَّحل: ۴۴)

''(اے نبی!) ہم نے آپ پر یہ نصیحت نامہ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں پر ظاہر کردیں جو کچھ اُن کے پاس بھیجا گیا ہے اور تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیا کریں۔'' (۴۴: ۱۶)

<u>(3) دنیاوی امتحانات میں نقل کرنے کی اجازت نہیں اور نقل کرنے والا سزا سے بچ نہیں جاتا لیکن پیغمبر علیہ السلام کے اُسوہ مبارکہ کی زیادہ سے زیادہ پیروی اور نقل اللہ کی دوستی کا سبب بن جاتی ہے:</u>

(۱) قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آلِ عمران)

''فرمادیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا۔'' (۳۱ : ۳)

(۲) فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْ أُنْزِلَ مَعَهٗ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

''سو جو لوگ اِس نبی پر ایمان لائے اور اُس کا ساتھ دیا اور اُس کی مدد کی اور اُس نور کی پیروی کی جو اُس کے ساتھ اتارا گیا' تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' (الاعراف ۱۵۷ : ۷)

لفظ مَعَه' (اُس کے ساتھ) ہے نہ کہ اِلَیْهِ (اُس کی طرف) جس میں اِس حقیقت پر زور دینا مقصود ہے کہ ہدایت کی وہ روشنی جو آپ ﷺ رب کی طرف سے لائے' ہر اُس شخص کی زندگی کو منوّر کر دیتی ہے جو اُس سے راہ نمائی لینا چاہتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حلقۂ اُمّت میں شامل ہونے کی یہ آفاقی رفاقت اور ہمدمی تمام جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لئے تریاق ہے۔ جب نوح علیہ السلام کی کشتی اپنے سواروں کے لئے ذریعہ نجات بن گئی تو امام الانبیاء ﷺ کا سفینہ دونوں جہانوں کے تمام تفکرات اور پریشانیوں سے نجات کا سبب کیوں نہ بنے۔ حمد و ثنا کے لائق ہے وہ ذات جس نے ہم جیسے گنہگاروں کو ایسا عظیم' مثالی پیغمبر عطا فرمایا ﷺ۔

(4) معلّم اور متعلّم کے حُسنِ تعلقات کی تربیت: کے اشارات قرآنِ حکیم کے کئی مقامات پر ہیں مثلاً:

(۱) يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا (اَلْبَقَرة : ۱۰۴)

''اے ایمان والو! رَاعِنَا مت کہا کرو اور اُنظُرنَا کہا کرو اور (رسول کے ارشادات ادب و تعظیم کے ساتھ) بہ غور سنا کرو۔'' (۱۰۴ : ۲)

رسول اللہ ﷺ جب مجمع میں قرآن مجید سناتے یا تبلیغ کرتے ہوتے اور لوگ کوئی بات سن نہ پاتے تو وہ قدرۃً دوبارہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے۔ یہود نے ایسے موقع کے لئے از راہِ شرارت لفظ رَاعِنَا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جس کے اصل معنی تو ''ہماری رعایت کیجئے'' کے ہیں لیکن رَاعِـنَـا کے ع کو ذرا کھینچ کر اور لچکا دے کر پڑھنے سے اس کے معنی میں ایک گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمان اس شرارت سے غافل' بے خبر' خالی الذہن خود بھی بعض اوقات یہ لفظ بولنے لگتے۔ یہاں اُنہی کو یہ ممانعت ہو رہی ہے۔ اُنظُرنَا کے معنی ہیں ''ہم پر نظر کیجئے'' اور یہ لفظ بے ادبی سے خالی ہے۔ آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مرتبہ رسالت کا ادب صرف معنوی حیثیت ہی سے نہیں' لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے احتمال بھی توہین کا نکلتا ہو' اُن سے احتیاط لازم ہے۔

(۲) لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (اَلنُّور : ۶۳)

''تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔'' (۶۳ : ۲۴)

کوئی شک نہیں کہ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام نسلِ انسانی کے معلّمِ اعظم ہیں۔ یہاں جس نکتے پر زور دینا مقصود ہے وہ یہ کہ ایک متعلم کو اپنے معلم کے لئے باادب اور فرماں بردار شاگرد بن کر رہنا چاہئے جسے نہ صرف اپنے قول میں صاف گو اور مخلص و ایماندار ہونا چاہئے' بلکہ اُسے ہمہ تن گوش ہو کر اپنے معلّم کے فرمودات کو سننا چاہئے تاکہ معلّم کو اپنے الفاظ دُہرانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

آیتِ مذکورہ بالا (۶۳ : ۲۴) کا ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو تم ایسے نہ پکارا کرو جیسا تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو بلکہ اُن کے لئے خصوصی الفاظِ ادب وتعظیم کا اہتمام کیا کرو جیسا کہ سورۃ الفتح میں حکم ہوا:

وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح : ۹)

''اوران (رسول) کی مدد کرو اور ان کی تعظیم کرو۔'' (۹ : ۴۸)

(5) کلاس (تدریسی جماعت) کے آداب کی تربیت: اس طرح کی گئی:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِيْنَا آيَةٌ" كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ (اَلْبَقَرَة : ۱۱۸)

''اور جنہیں علم حاصل نہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانِ (عظیم) کیوں نہیں آجاتا۔ اسی طرح کی بات اُن سے پہلے لوگ کہہ چکے ہیں' اُن کے دل ایک جیسے ہوگئے۔ ہم نے تو اپنے نشان اُن لوگوں کے لئے کھول کھول دئے ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔'' (۱۱۸ : ۲)

آیتِ بالا میں کفارِ مکہ کا دُہرا مطالبہ بیان کیا گیا ہے: ایک تو یہ کہ اللہ ہم سے براہِ راست بات کر کے یہ کیوں نہیں کہتا کہ محمد (ﷺ) واقعی میرا بھیجا ہوا پیغمبر ہے اور دوسرا یہ کہ اگر ایسا نہیں تو ہماری طرف اُن کی رسالت کی توثیق وتصدیق کے لئے کوئی نشانی کیوں نہیں آجاتی! اُن کے اس دوسرے مطالبے کا جواب صراحۃً دے دیا گیا لیکن پہلے مطالبے (اللہ کی ہم کلامی) کا جواب دینے کے لئے قرآن بالکل خاموش ہے اور پورے قرآن میں اس کا جواب موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اُن کا یہ مطالبہ اس قدر گستاخانہ اور گھٹیا ہے کہ اس کا جواب نہ دینا ہی بہتر ہے۔ اس طرح قرآنِ حکیم نے متعلّمین کو کلاس کے آداب کی تعلیم دی کہ وہ ایسے سوال کرنے سے گریز کریں جن میں معلّم کی عزت وتوقیر میں فرق آتا ہو۔

کفار کا مطالبہ ایک نشان (آیت بہ صیغہ واحد) کا تھا۔ جواب یہ ملا کہ یہاں تو نشان (الآیات بہ صیغہ جمع) پیش کئے جاچکے ہیں۔ کتبِ تاریخ وسیرت میں مذکور معجزوں سے قطع نظر دو معجزے تو بالکل ظاہر اور نمایاں تھے: اوّل رسولِ مکرّم ﷺ کی سچائی' امانت ودیانت' پاکبازی' عقل وفہم میں بے مثال ہونا اور آپ کی سیرتِ طیّبہ کے ایک ایک جزو کا بجائے خود معجزہ ہونا اور دوئم قرآن مجید کا لفظی' معنوی' ظاہری' باطنی وادبی اعتبار سے بے مثل ہونا۔ بَيَّنَّا یعنی یہ نشانات کچھ اُن سے چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہم نے اُنہیں بالکل واضح اور آشکار کر رکھا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا کی تاکید نے بَيَّنَّا کی صراحت کو اور زیادہ زوردار بنا دیا اور اسی کے اظہار کے لئے ترجمہ میں ''کھول کھول'' لایا گیا ہے۔ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ یعنی یہ کھلے ہوئے نشان بھی نظر اُن لوگوں کو آتے ہیں جن کے دل جہل وعناد کی گندگی اور شک کی آلودگیوں سے پاک ہیں۔ شواہد ودلائل مادّی قسم کے ہوں یا معنوی' بہر حال اُن سے نفع

حاصل کرنے کے لئے دیدۂ بصیرت و چشمِ بینا ضروری ہے۔ آنکھ رکھنے والے کے لئے پیمبر کی کتابِ زندگی کی ایک ایک سطر روشن معجزہ ہے۔

متعلّم کے کردار اور اس کے طرزِ مطالعہ کی بابت ڈاکٹر محمد اقبال نے یوں وضاحت کی ہے:

''اگر طالب علم میں کسی چیز کے آغاز کی قدرت نہیں' اگر وہ اپنی ذات کی اندرونی صلاحیتوں کی فراوانی کی بدولت ترقی نہیں کرتا' اگر وہ زندگی کو آگے بڑھانے کی اندرونی جدّ وجُہد کو محسوس کرنے سے رک جاتا ہے' تو اُس کا اندرونی جذبہ پتھر کی سی سختی میں بدل جاتا ہے اور وہ خود ایک مردہ مواد ہو کے رہ جاتا ہے۔ اُس کی حیات اور اُس کے جذبہ کی ترقی کا انحصار اُس اَبدی حقیقت کے ساتھ تعلق جوڑنے میں ہے جس سے وہ دوچار ہوتا رہتا ہے۔ یہ علم ہی ہے جو اِن تعلقات کو مستحکم کرتا ہے اور علم قوتِ اِدراک کے شعور کا نام ہے جو سمجھ بوجھ' ذہانت اور فہم و فراست سے پختہ ہوتا رہتا ہے۔'' (محمد پیر کے مضمون بہ عنوان "Muslim Approach to Education" سے ایک اقتباس بحوالہ ''انسائیکلو پیڈک سروے آف اسلامک کلچر'' جلد سوئم' صفحہ ۹۳' نئی دہلی ۱۹۹۷ء' طبع اوّل)

علم کی اہمیّت اور اُستاد کے ادب و احترام اور اس کے اعلیٰ مقام کی بابت جو اُسے ایک وقت میں معاشرے میں حاصل تھا' ''انسائیکلو پیڈک سروے آف اسلامک کلچر'' سے ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

''سماجی اقتصادی ترقی کے لئے علم کو ہمیشہ ایک ناگزیر ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ تعلیم و تعلّم کے مفید اور تعمیری کردار کو ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ذات پات' طبقہ' مذہب اور جنس سے قطع نظر کسی ملک کی ہمہ گیر ترقی کا انحصار معاشرہ کے تمام طبقات کے ذہن کی اختراعات' اُن کی مہارات اور توانائیوں کو بروئے کار لانے میں ہے۔'' (جلد سوم' صفحہ ۹۱)

''بہ طور ایک فرد کے استاد کا کردار اور اُس کی عزت و وقار اِس قدر عظیم تھے کہ اکثر اوقات مدرسہ اور مادرِ علمی کے نام کی بجائے اُستاد کے نام پر اَسناد جاری کی جاتی تھیں۔ دراصل یہ کہنا صداقت و حقیقت سے دُور نہیں ہوگا کہ قرونِ وسطیٰ کے بعد کے زمانوں میں علم کے مشہور و معروف بے لوث خادم مدرسوں کی پیداوار نہیں تھے بلکہ وہ ایسے لوگ تھے جو نجی اَساتذہ کے غیر رسمی شاگرد تھے۔ اگر کسی کو اسلام کے عظیم اور ابتدائی مفکرین کی تاریخ لکھنی ہو' تو اُسے مدرسوں میں بھرتی کئے ہوئے یہ مفکرین نہیں ملیں گے۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۵۶)

(6) <u>تنبیہ و سرزنش</u>: مستقبل میں پیش آنے والے کسی ناخوشگوار وقوعہ کے ممکنہ خطرہ سے آگاہ کرنے اور

اُس کے بدنتیجہ سے بچانے کے لئے انسان کے مفاد کی خاطر یہ تنبیہ کی جاتی ہے۔قرآن مجید نے مؤمنوں کو یوں تنبیہ کی:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَه' (آلِ عمران : ۲۸)

''مؤمنوں کو نہ چاہیئے کہ مؤمنوں کے ہوتے ہوئے کافروں کو دوست بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں کسی شمار میں نہیں مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم اُن سے کچھ اندیشہ (ضرر) رکھتے ہو اور اللہ تمہیں اپنے (عذاب) سے ڈراتا ہے۔'' (۲۸ : ۳)

''دوستی ایک کیفیتِ قلبی اور پھر عملی برتاوے کا نام ہے۔مسلمانوں کو کافروں' منکروں اور اللہ کے باغیوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کی قطعی ممانعت ہے اور عقلاً بھی یہ ملّی خودداری اور قومی تشخص کے بالکل منافی ہے۔دفعِ ضرر کے لئے بہ قدرِ ضرورت ظاہری تعلقاتِ دوستانہ کی اجازت ہے۔''

''کافروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تین ہی ممکن صورتیں ہیں: (ا) موالات یا دوستی (۲) مدارات یا ظاہری خوش خلقی و خاطر داری (۳) مواسات یا احسان و نفع رسانی۔ موالات یا حقیقی دوستی تو کسی صورت میں جائز نہیں۔مدارات تین حالتوں میں درست ہے: اپنے رفعِ ضرر کے لئے' کافر کی توقعِ ہدایت کے لئے اور کافر جب مہمان ہو تو اُس کے اِکرام و اعزاز کے لئے۔اِن تین صورتوں کے سوا اپنے نفع یا حصولِ مال و جاہ کے لئے مدارات درست نہیں خصوصاً جبکہ اس سے ضررِ دین کا خدشہ ہو تو یہ اختلاط بدرجہِ اَولیٰ حرام ہوگا۔ یہ لحاظ رہے کہ آیت میں ذکر اندیشہ کا ہے۔محض توہم یا احتمالِ بعید اس کے لئے کافی نہیں۔'' (حاشیہ تفسیر اردو عبدالماجد دریا آبادی' صفحہ ۱۲۸' ۱۲۹)

''اگر ایمان اور عقیدہ ہماری زندگیوں میں ایک بنیادی بات ہے تو ہمارے تعلقات اور دوستیاں قدرتی طور پر اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گی جن کا اور ہمارا عقیدہ ایک ہے۔بُرے رسل و رسائل اچھے اطرازِ عمل کو بگاڑ دیتے ہیں اور بُری صحبت عقیدے کو بگاڑ دیتی ہے۔اپنے روزمرہ کے معاملات میں ہمیں غیر مسلموں کی بجائے مسلمانوں سے مدد لینے کو کہا گیا ہے۔ صرف اسی طور ہمارا سماج تنظیم و اتحاد میں مضبوط رہے گا۔ بہرحال ہمیں اپنے بھائی چارے اور اخوّت کو کمزور نہیں کرنا چاہیئے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۳۷۳)

(7) <u>فضول اور بے کار مشاغل میں وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں</u>: زندگی ایک بار ملتی ہے جو الٰہی عطیہ ہے اور اُسے فضول اور بے کار مشاغل میں گزارنا اِس عظیم نعمتِ الٰہی کی بے قدری کرنا ہے۔قرآن مجید نے بندگانِ خدا کی جملہ صفاتِ حسنہ میں سے ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ لغو اور فضول باتوں سے گریز کرتے ہیں اور اگر اُن کا گزر لغویات کی کسی جگہ سے ہو بھی جائے تو شریفانہ گزر جاتے ہیں (بحوالہ سورۃ المؤمنون آیت:۳ ؛ سورۃ الفرقان' آیت ۷۲)۔تضیعِ اوقات سے گریز کی یہی صفت بالخصوص ایک متعلم کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

(۳۶) فنِّ خطابت / خوش بیانی (ELOCUTION)

دیگر کثیر التعداد انعامات و احسانات کے علاوہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بنی نوع انسان کو بولنے اور خطاب کرنے کی اضافی صلاحیت عطا فرمائی ہے تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر کا اپنے اَبنائے جنس کے سامنے کھل کر اظہار کرسکیں۔ آب و ہوا اور رنگ ونسل سے قطع نظر بولنے کے ذریعے اپنے جذبات و احساساتِ اندرونی کے اظہار میں تمام انسان برابر ہیں۔لیکن اُن میں سے کچھ انسان زیادہ مراعات یافتہ ہیں اور اُنہیں واضح' مؤثر' برمحل اور مدلّل گفتگو کرنے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ سامعین کو مسحور بلکہ اُن پر عملِ تنویم کاری (Hypnotise) کر دیتے ہیں۔اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اِس پُر اثر لسانی خصوصیت کا اپنے تمام پیغمبروں اور انبیاء علیہم السلام پر فیّاضانہ طور پر فیضان کرتا رہا ہے کہ اس فیضان میں غیرِ انبیاء شریک نہیں ہیں۔چونکہ انبیاء علیہم السلام کا اوّلین فریضہ گم کردہ راہ انسانیت کو ایک وحدت کے جھنڈے تلے جمع کرنا تھا اور اُنہیں ہر قسم کے انسان سے پالا پڑتا تھا جن میں سے اکثر بد دماغ' ضدی اور کج فطرت بھی تھے جنہوں نے کسی مُسکت نشانی یا پیش آگاہی کے آگے مغلوب نہیں ہونا تھا خواہ وہ کیسی ہی معجزاتی کیفیت کی حامل کیوں نہ ہو'اس لئے اللہ بزرگ و برتر نے اپنے ہر پیغام بر کو فنِّ خطابت کا حصّہ وافر فیّاضانہ طور پر عطا کیا۔حضرت شُعیب علیہ السلام ''خطیب الانبیاء'' کے لقب سے مشہور ہیں اور اپنی قوم سے اُن کے خطبات قرآن مجید کے مختلف مقامات پر موجود ہیں مثلاً سورۃ الاعراف کی آیات ۸۵ تا ۸۹' سورہ ھُود کی آیات ۸۴ تا ۹۳' اور سورۃ الشُّعَراء کی آیات ۱۷۷ تا ۱۸۸)۔

انبیاء علیہم السلام کے فنِّ خطابت کی نمایاں خصوصیت جو اُنہیں دوسرے مصلحین کے طریقِ استدلال سے متمیز کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے کا مقصد نیکی اور راستی کے مقدّس اور اعلیٰ مقصد کا حصول ہوتا ہے' وہ کلّی طور پر ایسے مقدّس اور اعلیٰ ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت پر مستعد ہوتے ہیں جو اُن کی نیکی کے مشن کے حصول میں موزوں ہوتے ہیں۔

<u>انبیاء علیہم السلام کا طریقِ استدلال</u> : انبیاء اور رسول اُس زمانے میں مبعوث کئے جاتے ہیں جب وحیِ الٰہی کے بغیر حق و باطل میں تمیز کرنا ناممکن ہو کے رہ جاتا ہے اور تمام حیاتیاتی نظام شر اور بدی کے قبضہ میں ہوجاتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں نیکی اور اچھائی صرف اُس وقت کے (معاصر) پیغمبر کی زندگی میں ملتی ہے۔اس وجہ سے اگر انبیاء اپنے معاشرہ کے گمراہ لوگوں کو یوں خطاب کریں کہ ''اے کافرو! اللہ پر ایمان لاؤ'' یا ''اے مشرکو! توحید پرست بن جاؤ'' تو نیکی اور اچھائی کی طرف اُن کا اِس طرح لوگوں کو بلانا صحیح اور مبنی بر انصاف ہوگا کیونکہ اُن کے دُوری حلقہ کے اُس پار جو کچھ بھی نظر آتا ہے' وہ سرکشی اور کفر کی نفرت انگیزی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔لیکن تاریخِ رسالت میں یہ ثبوتِ محکم موجود ہے کہ انبیاء اپنے مخالفین کو ''کافروں'' اور ''مشرکوں'' جیسے اشتعال انگیز القاب سے نہیں پکارتے بلکہ وہ اپنے لوگوں کو ''اے انسانو!'' یا ''اے لوگو!'' یا ''اے میری قوم!'' یا ''اے اہلِ کتاب!'' یا ''وہ جو یہودی

بن چکے ہو' یا "اے عیسائیو!" یا "اے صابئین" وغیرہ سے خطاب کرتے ہیں۔ اُن کا اپنے لوگوں کو خطاب کرنے کا یہ غیر معاندانہ اور غیر افتراپردازانہ طریقہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ انبیاء لوگوں کی مسلسل ہٹ دھرمی' نخوت و غرور اور نیکی کے خلاف پکّی دشمنی سے تنگ آجاتے ہیں اور اُنہیں اپنے مشن کو قبول کرنے کی کوئی امید نہیں رہتی اور یہ چیز انبیاء کی نقل مکانی (ہجرت) اور لوگوں سے علیحدگی پر منتج ہوتی ہے۔ جب سرکش لوگ اپنے درمیان نیک و پاکباز لوگوں کے وجود کو برداشت نہ کرنے کی حد تک چلے جاتے ہیں اور اُن سرکشوں کی انانیت کے مقابل انتہائی مدلل اور مؤثر منطق کُند ہو کے رہ جاتی ہے تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انبیاء و رسول حکمِ الٰہی کے تحت اپنی قوم کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اپنے مشن کی صداقت کو قائم کرنے اور اپنی قوم کے مسلسل طرزِ سرکشی کے خلاف بیزاری کے اظہار میں وہ اُنہیں "کافرون" اور "مشرکون" کے واضح اور غیر مبہم الفاظ سے خطاب کرتے ہیں۔

پیغامِ الٰہی کی اشاعت اور اُس کے پھیلانے میں انبیاء کا ایک اور طریقہ تدریج کا رہا ہے یعنی وہ کسی قانون یا ضابطہ کو فوری طور پر نافذ نہیں کرتے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اُن کی افرادی قوّت (Manpower) بدی کی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے تو کافروں اور مشرکوں سے تعلقات منقطع کرنے اور ممکنہ حد تک شیطانی قوّتوں سے نبرد آزما ہونے کا حکمِ الٰہی آپہنچتا ہے۔ یہ تدریج ہمارے پیغمبر علیہ السلام کی شریعت میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جس سے متعلق سیدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک حدیث یوں ہے :

حَتّٰیٓ اِذَا ثَابَ النَّاسُ اِلَی الْاِسْلَامِ نُزِّلَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ وَلَوْ نُزِّلَ اَوَّلُ شَیْءٍ لَاتَشْرَبُوا الْخَمْرَ لَقَالُوْا : لَا نَدَعُ الْخَمْرَ وَلَوْ نُزِّلَ لَا تَزْنُوْا لَقَالُوْا : لَا نَدَعُ الزِّنَا اَبَدًا (بخاری : باب تالیف القرآن)

"حلال و حرام کے احکامات اُس وقت نازل ہوئے جب لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ اگر حرمتِ شراب کا حکم شروع میں آجاتا تو لوگ یہ کہتے کہ ہم شراب کو کبھی بھی نہیں چھوڑیں گے اور اگر حرمتِ زنا کا حکم شروع میں (فوری طور پر) آجاتا تو لوگ ضرور یہ کہتے کہ ہم اس کے چھوڑنے کو تیار نہیں۔"

لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلانے اور پیغامِ الٰہی کی نشر و اشاعت میں لوگوں کی نفسیات کا پیشِ نظر رکھنا بھی انبیاء علیہم السلام کا ایک اور طریقۂ تبلیغ رہا ہے۔ زمین کی ضرورت کی طرح نفوس و قلوب کے بھی موسم ہوتے ہیں اور صراطِ مستقیم کے مبلّغ پر یہ لازم ہے کہ وہ اُن مواسم سے بہ خوبی واقف رہے جس طرح ایک کسان فصلوں اور اُن کے موسموں کی موافقت سے باخبر ہوتا ہے۔ کسان اُس وقت بیج بوتا ہے جب موسم اس کے موافق ہوتا ہے۔ (انبیاء علیہم السلام کے علاوہ) جو مبلّغین اس بنیادی اصول کے خلاف کام کرتے ہیں جس کی وجہ خواہ اُن کی کوتاہ نظری ہو یا یہ خیال کہ نیکی اپنی جبلّی جاذبیت اور کشش کی وجہ سے خود بخود اُن کے دلوں میں جگہ بنا لے گی' لہٰذا ضروریات کے فکر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں' تو یہ اُن کی سنگین غلطی ہے جو اُنہیں تکلیف دِہ ناکامی سے دوچار کرے گی اور اُن کی نیک نیتی اور پاک عزائم اُنہیں اُن نتائج سے بچا نہیں سکیں گے جو عوام کی نفسیات کو سمجھنے میں اُن کے تغافل اور غلط منصوبے کی پیداوار ہوں گے۔

عصبیّتِ جاہلی (حمیّۃ الجاھلیّۃ) کے ہیجان وغضب کی خطرناک بیماری عوام کی نفسیات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مبلّغ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر فرد اور ہر قوم کا اپنے عقائد و روایات کے ساتھ مضبوط رشتہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح مبلّغ کا بذاتِ خود اپنے مذہبی عقائد سے کٹھور قرب ہوتا ہے (بحوالہ سورۃ الانعام آیت ۱۰۸؛ سورۃ التوبۃ آیت ۳۷؛ سورۃ الرُّوم آیت ۳۲)۔ اُس کا اپنے مخالفین کے عقائد پر حملہ لازمی طور پر اوّل الذکر کے مذہب کے خلاف عناد اور دشمنی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور موٴخر الذکر کا غم و غصہ اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اُسے جو بھی اینٹ یا پتھر ملتا ہے ''بیچارے' نادان'' مبلّغ پر دے مارتا ہے۔ قرآنِ حکیم ایسی جذباتیت سے دُور رہنے کی یوں تلقین کرتا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (الانعام: ۱۰۸)

''اور اُنہیں برا بھلا مت کہو جن کی یہ لوگ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں (ایسا نہ ہو) کہ وہ بھی از راہِ جہالت اللہ کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔ یونہی ہم نے ہر اُمت کے لئے اُن کا عمل آراستہ کر دیا ہے۔'' (۶:۱۰۸)

''علمائے اصول نے اس آیت سے سدِّ ذرائع کا قاعدہ اخذ کیا ہے جس کا مختصراً مطلب یہ ہے کہ ہر مباح اور جائز کام جب کسی گناہ کا سبب بن جائے تو اُسے ترک کر دیا جائے گا۔'' (ضیاء القرآن' ج ۱' ص ۵۹۰)

انبیاء علیہم السلام کے فنِّ خطابت میں ایک اور عنصر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے استدلال میں الزامی اور اتہامی طریق سے گریز کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی غیر مسلم اسلام کے اصولوں پر اعتراض کرتا ہے یا اُن پر تنقید کرتا ہے' تو ہمارے مبلّغین معترض اور نقاد کے اپنے مذہب سے ملتی جلتی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے اسلام کو اعتراضات کے حملوں سے بچا لیا ہے جبکہ اصولی طور پر یہ طریقہ غلط ہے اور اس سے اجتناب کی ضرورت ہے۔ ایسے طریقے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ممکنہ حد تک یہ ہو سکتا ہے کہ معترض خاموش ہو جائے اور اس طرح ہماری انانیت کو تسکین مل جائے۔ لیکن اس سے نہ تو معترض کو اسلام کی صداقت کا کوئی مدلّل ثبوت ملتا ہے اور نہ ہی مبلّغ کا انشراحِ صدر ہوتا ہے کہ اُس کے علمی تجسس کی تسکین ہو سکے۔ بلکہ یہ تو مبلّغ کی علمی کوتاہ دامنی اور نااہلی کا کھلا ثبوت ہے جسے اُس نے خود اپنے ہاتھوں معترض کو مہیا کیا۔ لہٰذا خطیبوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر سچے معاملہ میں خود اُس کے اندر اپنی صداقت کا ثبوت موجود ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ دوسروں کی غلط باتوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا مخالف کو خاموش کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے اندر سے دلائل پیش کئے جائیں۔

جدّ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال: مذکورہ بالا حکمتِ عملی کو تمام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ تبلیغ میں بالعموم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے پیغمبر ﷺ میں بالخصوص دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ القاب و الفاظ جن سے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا' اپنی قوم اور اپنے وقت کے معاصر بادشاہ کو خطاب کیا' اُن میں کہیں

بھی آپ نے ''کافر'' یا ''مشرک'' کے لفظ استعمال نہیں کئے۔ لیکن جب آپ کی تبلیغ کو ایک اچھا خاصا وقت گزر گیا اور قوم کی کج روی اور ہٹ دھرمی کے مقابل منطق اور معجزات کی تمام تر قوّت بے ثمر ثابت ہوئی اور وہ آپ کی زندگی کے خاتمہ کے درپے ہو گئے تو یہ وہ وقت تھا جب آپ نے اُن سے بیزار ہو کر اُن سے علیحدگی کا اعلان کیا اور ایسے لفظ استعمال کئے جو اس بات کو صاف عیاں کرتے ہیں کہ اُن کا مشرکانہ اور باغیانہ رویّہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ نے نہ صرف اُن کے کفر و شرک کے بطلان کا برملا اعلان کیا بلکہ آپ نے اُن کے خلاف نفرت و عداوت کو بھی ظاہر کیا جب تک کہ وہ اسلام قبول نہ کر لیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنة : ۴)

''ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے شریکِ حال لوگوں میں تمہارے لئے یقیناً ایک عمدہ نمونہ ہے جب اُن لوگوں نے اپنی قوم والوں سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو اُن سب سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں (یا ہم تمہیں خاطر میں نہیں لاتے) اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض پیدا ہو گیا ہے جب تک کہ تم ایک اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔'' (۶۰ : ۴)

<u>ہمارے نبی معظم ﷺ کی مثال</u>: ایسا ہی معاملہ ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ کے مشن کا ہے۔ ہجرتِ مدینہ سے قبل کی نازل شدہ کسی بھی سورت میں ہمیں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں آپ نے اپنی قوم یا اہلِ کتاب کو ''کافرون'' یا ''مشرکون'' یا ''منافقون'' کے القاب سے خطاب کیا ہو۔ ابتدا کی نازل شدہ سورتوں میں اُنہیں يٰأَيُّهَا الْإِنْسَانُ یا يٰأَيُّهَا النَّاسُ یا يٰقَوْمِ کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔ اسی طرح اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے لئے يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ فتح مکہ کے بعد منافقین تک کے لئے يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا کی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی نہ کہ يٰٓأَيُّهَا الْمُنٰفِقُوْنَ۔ لیکن جب پیغمبر علیہ السلام کی ایک طویل عرصہ تک کی تبلیغ کے بعد کافروں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہا اور اُنہوں نے دیدہ و دانستہ نبی علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا تو آپ کے پاس ہجرت کرنے اور اُنہیں ''کافرون'' کی اصطلاح سے خطاب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا جس میں اُن سے علیحدگی اور اُن کے مذہب کے خلاف بیزاری کا بھی اعلان تھا۔ اس موقع پر سورۃ الکافرون نازل ہوئی جو دراصل کافروں کے خلاف اعلانِ جنگ کی سورت ہے:

قُلْ يٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ أَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ أَعْبُدُ ۝ وَلَآ أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ أَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ (الکٰفرون : ۱ تا ۶)

''(اے نبی!) فرما دیجئے کہ اے کافرو! نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی۔ نہ میں (آئندہ) تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے والا ہوں اور نہ تم ہی (آئندہ) میرے معبود کی عبادت کرنے والے ہو۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔'' (۱۰۹:۶)

یعنی ''حق و باطل میں آمیزش کا میں قائل نہیں۔ مجھے ایسے اتحاد کی بھی ضرورت نہیں جو باطل کے ساتھ مصالحت پر موقوف ہو۔ بے شک تم اپنے کفر پر ڈٹے رہو' میری خاطر تم اِس کفر میں توحید کا پیوند نہ لگاؤ کہ ان دونوں میں کوئی جوڑ اور مناسبت نہیں۔ اس طرح میں تمہارے فریب میں آ کر توحید کو ہرگز داغ دار نہیں کروں گا کیونکہ پھر توحید' توحید نہ رہے گی۔ حق کا نور پھیلانے کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں تو حق' حق نہیں رہے گا بلکہ باطل بن جائے گا۔'' (ضیاء القرآن' جلد پنجم' صفحہ ۶۹۵)

''بعض لوگوں نے عجب ''خوش فہمی'' سے کام لیتے ہوئے سورۃ الکفرون کی اس آخری آیت کو اسلام کی ''رواداری'' اور ''مرنجاں مرنج پالیسی'' کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اسلام نے ہر مذہب والے کو اپنی اپنی جگہ قائم اور باقی رہنے کی اجازت دے دی ہے جبکہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ آیت تو اکبر (فرمانروائے ہند) کے نکالے ہوئے مخلوطی دین اور اسی قبیل کی ساری کوششوں کی لاحاصلی اور ناکامی کا اعلان کر رہی ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' حاشیہ صفحہ ۱۲۱۳)

معترضین کے اس اعتراض کہ آیاتِ مذکورہ میں مشرکین کو شرک کرنے اور ہر مذہب والے کو اپنی اپنی جگہ قائم اور باقی رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے' کا جواب یہ ہے کہ رسولِ مکرم ﷺ کی بعثت تو شرک کی بیخ کنی کے لئے ہوئی تھی تو آپ شرک کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ رہی یہ آیت تو اس کے حسب ذیل محامل ہیں:

(۱) اس آیت سے مراد تہدید (دھمکانا) اور زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) ہے جیسے ذیل کی آیت میں ہے:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' ٥ (حٰمٓ السجدة : ۴۰)

''جو چاہو کرتے رہو' بے شک وہ تمہارے تمام کاموں کو دیکھنے والا ہے۔'' (۴۰ : ۴۱)

''اِعْمَلُوْا امر کا صیغہ ہے لیکن اس سے مقصود عذاب سے ڈرانا اور دھمکانا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کو شرک اور کفر و معصیت کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ سو اِسی طرح سورۂ الکافرون میں ہے۔

(۲) گویا آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں توحید کی دعوت دینے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اگر تم اس دعوت کو قبول نہیں کرتے تو مجھے چھوڑ دو اور مجھے شرک اور بت پرستی کی دعوت نہ دو۔

(۳) دین کا ایک معنی ''حساب'' کا بھی ہے یعنی تم سے تمہارے اعمال کا حساب ہوگا اور مجھ سے میرے اعمال کا حساب ہوگا اور کسی سے دوسرے کے اعمال کا حساب نہیں ہوگا۔

(۴) تمہیں تمہارے اعمال کی سزا ملے گی اور مجھے میرے اعمال کی جزا ملے گی۔

(۵) ''دین'' کا ایک معنی عادت کا بھی ہے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ تمہاری عادت تمہیں شیطان سے ملی اور میری عادت مجھے وحیِ الٰہی سے حاصل ہوئی ہے۔ لہٰذا تم اتباعِ شیاطین کی وجہ سے دوزخ میں جاؤ گے اور میں اتباعِ وحی کی وجہ سے جنت میں جاؤں گا۔'' (تبیان القرآن۔۔علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۱۲' ص ۱۰۱۶)

"سورۃ الکافرون کی آیات میں تکرار (Repetition) کا جواب: سوال یہ ہے کہ سورۃ الکافرون کی آیات ۲، ۳ اور ۴، ۵ کا ایک ہی معنی اور مفہوم ہے اور یہ تکرار ہے اور تکرار غیر مفید ہوتا ہے۔

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلیغ کے کلام میں کوئی چیز غیر مفید نہیں ہوتی۔ دراصل آیات ۵، ۴ آیات ۳، ۲ کی تاکید ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آیات ۳، ۲ حال کے زمانہ پر اور آیات ۵، ۴ مستقبل کے زمانہ پر محمول ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہ میں زمانہ حال میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں اور نہ زمانہ مستقبل میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا۔ اسی طرح کفار کے متعلق فرمایا کہ نہ تم زمانہ حال میں اُس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ تم زمانہ مستقبل میں اس کی عبادت کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ یہ آیات اُنہی کافروں کے ساتھ مخصوص ہیں جن کے متعلق اللہ کو علم تھا کہ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔" (ایضاً)

مستشرق ولیم میور کا کہنا ہے کہ "سورۃ الکفرون کی یہ آیات اپنے اندر کیسے کفر و شرک کے ساتھ غیر مصالحانہ عداوت رکھتی ہیں!"

کفار کو کافر / مشرک قرار دینے اور اُن سے لاتعلقی کے اظہار میں تاخیر کی حکمت: اللہ کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ وہ اُنہیں کافر یا مشرک قرار دینے سے پہلے یا مسلمانوں کے اُن سے لاتعلقی سے پہلے اُنہیں اچھا خاصا وقت بہ طورِ مُہلت دیتا ہے۔ اس عمل کو "اِتمامِ حُجت" (Consummation of Contention) کہا جاتا ہے۔

اِس تاخیر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کسی سماج کا نظام بدی اور بے انصافی کی غلط راہ پر چلنا شروع ہو جائے تو نیکی کو اپنانا اُن لوگوں کے لئے بھی تقریباً مشکل ہو جاتا ہے جو نیکی میں مخلص اور بے لوث ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بدی ہر شعبہ حیات میں اس قدر دخیل ہو جاتی ہے کہ معاشرہ کے انتہائی محتاط اور انتہائی ہوشمند لوگ بھی بدی کے کچھ جراثیم کو لئے بغیر سانس نہیں لے سکتے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال میں اگر انبیاء اور رسول کسی منصوبہ کے بغیر اپنے مشن کے آغازِ کار میں ہی کافروں سے لاتعلقی کا اظہار کر دیں یا اُنہیں کفر یا شرک کی طرف منسوب کرنے لگیں تو یہ عمل نیکی اور خیر کے متلاشیوں کے لئے یقیناً بے انصافی کا ہوگا۔ تو ایسے عجلت کے اقدام کو اختیار کرنے سے پہلے انبیاء اور رسولوں نے ہمیشہ ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جو نیک لوگوں کے موافق ہو، تا کہ وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی گزاریں جن کا اُن کی پاک فطرت تقاضا کرتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی خوش بیانی (خطابت) کے نمایاں امتیازات: کسی چیز کے اظہار میں طرز

۱۱۳۵ (فنّ خطابت رخوش بیانی..Elocution)

وطریق، انتخابِ الفاظ، حُسنِ کارکردگی، الفاظ کا زیروبم اور خطیب کی شخصیت اُس کی خطابت میں ایسا خوش آئند عنصر پیدا کرتے ہیں کہ خطابت دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتی معلوم ہوتی ہے اور سامعین اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ نہ تو وقت اور نہ ہی اُن کا شعور اُنہیں وجدانی کیفیت سے باہر لانے کے قابل ہوتے ہیں۔ مجمع سے اُٹھنے سے پہلے وہ اپنے اندر ایک غیر مانوس سی تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ بھارت کے شاعر ابراہیم ذوقؔ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

ذوقؔ ! اندازِ بیاں بات بنا دیتا ہے ورنہ دُنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

لیکن جب معاملہ بالکل اچھوتا اور نیا ہو بالخصوص قسمتوں کی بہتری کا اور نوعِ انسانی کو ظلمتوں کے گنجلک اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی تابناک روشنی کی طرف لانے کا ہو اور جبکہ خطیب اَفْصَحُ العرب اور مَدینۃُ العِلم یعنی خاتَمُ الانبیاء ﷺ ہوں، تو آپ کی خطابت کی اثر پذیری کی توضیح اُن خوش نصیب صحابہ کرام کی ذواتِ مقدسہ ہی سے ممکن ہے جنہوں نے آپ کے اقوالِ مبارکہ کو گوشِ ہوش سے سنا اور اپنی روحوں کو ایمان و یقین کی تابناک روشنی سے منوّر کیا!

''آپ ﷺ کا طرزِ خطابت : آپ کا مجمع میں خطاب کرنا یوں لگتا تھا جیسے تشنہ چٹانوں اور صحراؤں پر ابرِ رحمت برس رہا ہو، دِن سونگھی خوشبو دل و دماغ کی زمین کو بحال اور تازہ دَم کر رہی ہو اور روحوں کی ظلمتوں کو کوئی تابندہ روشنی ختم کر رہی ہو۔ اس تمام عرصہ کے دوران، خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، تمام سامعین گم صُم اور بے نقل و حرکت رہتے اِس ڈر سے کہ کہیں اُن کے سروں پر بیٹھی ہوئی فاختائیں اُڑ نہ جائیں۔''

''آپ کے الفاظ کے اظہار میں ایسا معقول وقفہ ہوتا تھا کہ سامع الفاظ کو بہ آسانی حفظ کر سکتا تھا۔ اُمِّ معبد نے کن خوبصورت الفاظ میں آپ کی مدح سرائی کی ہے:

''آپ کی گفتگو کے الفاظ دست بند میں جڑے ہوئے موتیوں کی طرح ہوتے تھے جو نہ ضرورت سے زائد اور نہ ضرورت سے کم ہوتے تھے۔ گفتگو نہ تو مختصر اور نہ ہی اتنی طویل ہوتی تھی کہ سننے والے اُکتا جائیں۔ خاموشی کے دوران آپ سنجیدہ و متین تھے۔ جب آپ بولتے تھے تو آپ کا چہرۂ انور تابناک حُسن کے ساتھ چمک اٹھتا تھا۔ آپ کی گفتگو شیریں ہوتی تھی جو بالکل واضح اور غیر مبہم ہوتی تھی، نہ ہی بے فائدہ اور نہ ہی فضول ہوتی تھی۔ آپ کی گفتگو یوں لگتی تھی جیسے زمرد کی لڑی اپنے حسین و جمیل موتی بکھیر رہی ہو۔''

سامعین کو سمجھانے کے لئے آپ اکثر مخصوص الفاظ اور فقرات کو دُہراتے تھے۔ اگر آپ کسی چیز کو صاف اور واضح الفاظ میں اظہار کی مصلحت نہ سمجھتے تو آپ اُسے کنایۃً بیان فرما دیتے۔ آپ ہمیشہ فحش اور ناگوار الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے اور خطابت کے دوران آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہوئی نظر آتی۔ عبداللہ بن حارث

رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر علیہ السلام کے چہرۂ انور جیسا مسکراتا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ سنجیدگی اور متانت کے باوجود یہ مسکراہٹ کرختگی کو داخل نہیں ہونے دیتی تھی اور آپ کے صحابہ کے لئے مانوسیت اور جاذبیت کا کام کرتی تھی۔ اپنی گفتگو کے دوران آپ اکثر آسمان کی طرف نگاہ دوڑاتے اور کسی بات پر زور دینے کے لئے آپ ٹیک لگانے کے انداز سے بیٹھنے کے انداز میں آجاتے۔ کسی چیز کی وضاحت کے لئے آپ اکثر اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشاروں سے مدد لیتے۔''

''اگرچہ آپ کی عمومی گفتگو انتہائی سادہ ہوا کرتی تھی لیکن مجمع کو خطاب کرتے ہوئے آپ پر کچھ جوشیلے اثرات نمودار ہوتے تھے جو شوقِ فراواں اور دلجمعی کو بڑھا دیتے تھے۔ یہ جوش آپ کی آواز کو قدرے بلند کر دیتا تھا اور بعض اوقات آپ کا جسم کبھی اِدھر اور کبھی اُس سمت کو جھک جاتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ایک سپہ سالار اپنے جنگجوؤں کو کسی جھڑپ کے لئے تیار کر رہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلام کو منبر پر خطاب کرتے ہوئے دیکھا جس کا نچلا حصہ اِدھر سے اُدھر اس حد تک ڈول رہا تھا کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ آپ سمیت گر نہ جائے۔ مسجد میں خطاب کرتے ہوئے آپ کے ہاتھ میں عصا ہوتا تھا۔ میدانِ جنگ میں آپ اپنی کمان کا سہارا لیتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے سوا آپ کے خطاب کا کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا اور ضرورت محسوس کرنے پر آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ آپ کے خطبات کے اثرات سنگدل لوگوں کے دلوں کو موم کی طرح نرم کر دیتے تھے اور صدیوں پرانی قبائلی عداوتیں اور کینے پائیدار بھائی چارے اور باہمی محبت میں بدل جاتے تھے۔ یہ پُر اثر خطابت آپ کی ناگزیر ضرورت تھی کیونکہ آپ رحمۃ'' للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور اس ضرورت کی تکمیل کے طور پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کو بتمامہ وصفِ خطابت سے نوازا تھا۔

چارلس ملز نے ہمارے نبی اکرم ﷺ کی خصوصیاتِ خطابت کا خلاصہ اپنی کتاب History of Muhammadanism میں اس طرح بیان کیا ہے:

''اُمّی ہونے کے باوجود فطرت کی وسعتِ کاملہ پر آپ کی گہری نظر تھی۔ اپنے عقلمند ترین دشمنوں سے مباحثہ میں بھی آپ کو انشراحِ صدر حاصل تھا۔ آپ کی سیدھی سادہ فصاحت و بلاغت پُر اثر ہوتی تھی جس میں وقار اور شائستگی، چہرے کے خدوخال کے اظہار کی آمیزش ہوتی تھی اور جس میں جلالت کا رُعب اور دبدبہ ایسی مرغوبِ خاطر شیرینی کے ساتھ ملا ہوتا تھا جو عظمت و احترام اور محبت کے جذبات کو ابھارتا تھا۔ آپ فنِ خطابت کی اُس معتبر و مستند غیر معمولی ذہنی صلاحیت (عبقریت) سے نوازے گئے تھے جو ایک پڑھے لکھے شخص کو متاثر کرتی ہے اور ایک ناخواندہ شخص کو راہ دکھاتی ہے۔ بہ طور ایک دوست اور والد کے آپ ہماری فطرت کے نازک ترین احساسات کا مظاہرہ کرتے تھے اور بہت سے سماجی اور گھریلو فرائض کی انجام دہی میں آپ نے رسول اللہ ہونے کے منصبِ اعلیٰ کو کم تر نہیں ہونے دیا۔''

اور سٹینلے لین پول لکھتا ہے :

''گرمجوشی کا لفظ اکثر کینہ وری کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی گھٹیا مقصد کے ساتھ ہوتا ہے یا اُس بنجر زمین کے ساتھ جو بے ثمر ہوتی ہے۔لیکن ایسی بات محمد ﷺ کے ساتھ نہیں تھی۔آپ کی گرمجوشی شریفانہ تھی اور ایک اعلیٰ اور شریف مقصد کے لئے تھی جس نے دنیا بھر میں صداقت کی تلاش کی آگ بھڑکا دی۔آپ اُن چند خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہوں نے ایک ہی عظیم صداقت کو منبع حیات بنانے کی عظیم خوشی حاصل کی۔آپ اپنی قوم کے لئے بڑے وقار کے ساتھ مژدہ ہائے جانفزا لائے جو آپ کے منصبِ جلیلہ کے شعور سے پھوٹتا تھا اور جس میں انتہائی شیریں فروتنی اور عاجزی بھی شامل تھی۔تھامس کارلائل نے اپنے پیغمبر ہیرو کے لئے آپ ہی کو منتخب کیا۔بلند و بالا جذبات رکھنے والے دیگر لوگوں کی پاک وصاف زندگیاں بھی ہمارے سامنے ہیں لیکن اپنے مشن کا مکمل ادراک رکھنے والا محمد ﷺ جیسا کوئی نہ تھا یا جس نے اپنے مشن کو نہایت دلیرانہ طور پر چلایا ہو۔'' ("Studies in a Mosque" p. 81)

<u>آپ کے خطبات کے چند نمونے</u>: بت پرستی جس نے کعبہ میں قدیم عبادت کو بگاڑ دیا تھا اور اس کی جگہ کچھ اور رسومات نے لے لی تھی' اُس پر آپ کے تابڑ توڑ حملوں نے حساس اثر دکھانا شروع کیا اور قبیلہ قریش کی آنکھیں کھول دیں۔اُنہوں نے جنابِ ابوطالب پر زور دیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو خاموش کرائیں یا اُسے باہر بھیج دیں لیکن اپنی کوششوں کو ناکام پاتے ہوئے اُنہوں نے عمر رسیدہ ابوطالب کو آگاہ کیا کہ اگر (معاذاللہ) اُس کا جھوٹ موٹ کا رسول اور اس کے پیروکار اپنی بدعقیدگی پر ڈٹے رہے تو اُنہیں اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ابوطالب نے محمد ﷺ کو یہ منت سماجت کرتے ہوئے اُن کے منصوبے سے فوراً آگاہ کیا کہ وہ ایسے کثیر التعداد اور طاقتور دشمن کو اپنے اور اپنے کنبہ کے خلاف اشتعال نہ دلائیں۔اِن الفاظ پر محمد ﷺ کی جوشیلی روح میں مزید اشتعال آ گیا اور آپ نے یوں جواب دیا :

یَا عَمِّ! وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى أَنْ أَتْرُكَ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ أَوْأَهْلَكَنِيْ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهُ' (تفسیر ابن کثیر' ج ا' ص ۴۷۴)

''چچا جان! اگر وہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اس شرط پر کہ میں اس کام سے باز آجاؤں یہاں تک کہ اللہ اس کام کو کامیابی سے ہمکنار کر دے یا مجھے اس میں ہلاک کر دے لیکن میں اپنے مقصد سے باز نہیں آؤں گا۔''

<u>آپ کا خطبہ حجۃ الوداع</u> : جس کا کچھ حصہ سیرت ابنِ ہشام کی جلد چہارم اور کچھ حصہ ''مشکٰوۃ المصابیح'' کی اردو شرح ''مظاہرِ حق'' کی جلد دوئم میں ملتا ہے۔خطبہ حجۃ الوداع کا اصل متن ذیل کے صفحات میں دیا گیا ہے:۔

أَيُّهَاالنَّاسُ! اِسْمَعُوْا قَوْلِيْ فَإِنِّيْ لَا أَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَاأَلْقَاكُمْ بَعْدَعَامِيْ هٰذَابِهٰذَاالْمَوْقِفِ أَبَداً۔

أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: يٰأَيُّهَاالنَّاسُ إِنَّاخَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ أَتْقٰكُمْ فَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَبْيَضَ وَلَالِأَبْيَضَ عَلٰى أَسْوَدَ فَضْل" إِلَّا بِالتَّقْوٰى اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَاب۔

مَعْشَرَقُرَيْشٍ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمُهَابِالْآبَاءِ أَيُّهَاالنَّاسُ! إِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَ أَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَام" إِلٰى أَنْ تَلْقَوارَبَّكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَكَحُرْمَةِ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا وَإِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْأَلُكُمْ عَنْ أَعْمَالِكُمْ وَقَدْبَلَّغْتُ۔

فَمَنْ كَانَتْ عِنْدَه' أَمَانَة" فَلْيُؤَدِّهَا إِلٰى مَنِ ائْتَمَنَه' عَلَيْهَا۔

أَلَا كُلُّ مَأْثُرَةٍ أَوْدَمٍ أَوْمَالٍ يُدَّعٰى بِه فَهُوَ تَحْتَ قَدَمِيَّ هَاتَيْنِ إِلَّاسَدَانَةُالْبَيْتِ وَسِقَايَةُ الْحَاجِّ

يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ! لَا تَجِيْئُوْا بِالدُّنْيَاتَحْمِلُوْنَهَاعَلٰى رِقَابِكُمْ وَيَجِيْءُ النَّاسُ بِالْآخِرَةِ فَلَا أُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئاً أَلَافَلَا تَرْجِعُوْابَعْدِيْ ضُلَالاً يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِّنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمِيَّ مَوْضُوْع" وَّدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَة" وَأَنَّ أَوَّلَ دَمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَاءِ نَا دَمُ ابْنِ رَبِيْعَةَ ابْنَ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضَعاً فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ فَقَتَلَه' هُذَيْل" فَهُوَ أَوَّلُ مَا أَبْدَأُ بِه مِنْ دِمَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ۔

وَإِنَّ كُلَّ رِبًا وَرِبَاالْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْع" وَلٰكِنْ لَّكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ وَ أَوَّلُ رِباً أَضَعُ مِنْ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَإِنَّه' مَوْضُوْع"۔

أَيُّهَاالنَّاسُ! كُلُّ مُسْلِمٍ أَخُوا الْمُسْلِمِ وَإِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ إِخْوَة" أَرِقَّاءَ كُمْ أَرِقَّاءَ كُمْ أَطْعِمُوْهُمْ مِمَّاتَأْكُلُوْنَ وَاكْسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ۔

أَيُّهَاالنَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْأَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّه' فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔

أَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِالْحَجَرُ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔

مَنِ ادَّعٰى إِلٰى غَيْرِ أَبِيْهِ أَوْتَوَلّٰى إِلٰى غَيْرِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ۔

اَلدَّيْنُ مَقْضِيّ" وَالْعَارِيَةُ مُرَدَّاة" وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَة" وَ الزَّعِيْمُ غَارِم"۔

وَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِنْ أَخِيْهِ إِلَّامَاأَعْطَاهُ عَنْ طِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ فَلَا تَظْلِمُنَّ أَنْفُسَكُمْ أَلَا لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تُعْطِيَ مِنْ مَّالِ زَوْجِهَاشَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِه۔

فَاتَّقُوااللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوْهُنَّ بِأَمَانَةِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ

أَيُّهَاالنَّاسُ! إِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَاءِ كُمْ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّاوَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُوْنَه' وَعَلَيْهِنَّ أَنْ لَّا يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فَإِنْ فَعَلْنَ فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْأَذِنَ لَكُمْ أَنْ

تَهجُرُوْهُنَّ فِی المَضَاجِعِ وَتَضرِبُوْهُنَّ ضَرباً غَیرَمُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَیْکُمْ رِزقُهُنَّ وَکِسوَتُهُنَّ بِالمَعرُوْفِ وَاستَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّهُنَّ عِندَکُمْ عَوَانٍ لَا یَمْلِکنَ لِأَنفُسِهِنَّ شَیْئًا۔

فَاعْقِلُوْا أَیُّهَا النَّاسُ قَوْلِیْ فَاِنِّیْ قَدْبَلَّغتُ وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَااِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِه فَلَنْ تَضِلُّوْاأَبَدًا أَمراً بَیِّنًا کِتَابُ اللهِ وَسُنَّةُ نَبِیِّهٖ وَاِیَّاکُمْ وَالغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ فَاِنَّمَاأَهلَكَ مِنْ قَبلِکُمُ الغُلُوُّ فِی الدِّیْنِ۔

أَیُّهَاالنَّاسُ! فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ قَدیَئِسَ مِنْ أَنْ یُّعْبَدَ بِأَرْضِکُمْ هٰذِهٖ أَبَدًا وَلٰکِنَّه' اِنْ یُّطَعْ فِیْمَا سِوٰی ذٰلِكَ فَقَدْ رَضِیَ بِه مِمَّا تَحْقِرُوْنَ مِنْ أَعْمَالِکُمْ فَاحْذَرُوْهُ عَلٰی دِیْنِکُمْ۔

أَیُّهَا النَّاسُ! اِنَّمَاالنَّسِیُ زِیَادَة" فِی الکُفْرِیُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَه' عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَه' عَامًا لِّیُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللهُ فَیُحِلُّوْامَا حَرَّمَ اللهُ وَیُحَرِّمُوْا مَا أَحَلَّ اللهُ وَاِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ کَهَیْئَتِه یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضَ وَاِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَاللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا مِنْهَا أَرْبَعَة" حُرُم" ثَلَاثَة" مُتَوَالِیَة" وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِیْ بَیْنَ جُمَادِیْ وَشَعْبَانَ۔

أَلَا فَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَصَلُّوْاخَمْسَکُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَکُمْ وَأَدُّوْا زَکٰوةَ أَمْوَالِکُمْ طَیِّبَةً بِهَاأَنفُسُکُمْ وَتَحُجُّوْابَیْتَ رَبِّکُمْ وَأَطِیْعُوْا وُلَاةَ أَمرِکُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّکُمْ۔

أَلَالَا یَجْنِیْ جَانٍ اِلَّا عَلٰی نَفْسِه أَلَالَا یَجْنِیْ جَانٍ عَلٰی وَلَدِه وَلَا مَوْلُوْد" عَلٰی وَلَدِه۔

أَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُالغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ۔

وَأَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّیْ فَمَاأَنْتُمْ قَائِلُوْنَ قَالُوْا: نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْأَدَّیْتَ الأَمَانَةَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَنَصَحْتَ فَقَالَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ یَرْفَعُهَا اِلَی السَّمَاءِ اَللّٰهُمَّ اِشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ہشام' ج ۴' ص ص ۲۵۰ ـ ۲۵۳ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ بمصر ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶م' مظاہر حق (شرح مشکوٰۃ المصابیح اردو) از مولانا قطب الدین ج ۲' ص ۳۵۰' کتاب المناسک' باب قصۃ حجۃ الوداع) وغیرہ

''لوگو! میری بات کو بہ غور سنو کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ میں تمہیں اِس سال کے بعد اس مقام پر کبھی مل پاؤں گا۔

لوگو! اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ اے لوگو! بے شک ہم نے تم (سب کو) ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے پرہیزگارتر ہی اللہ کے نزدیک معزّزتر ہے۔ پس کسی عربی کو کسی غیرعربی (عجمی) پر اور کسی غیرعربی کو کسی عربی پر' نہ ہی کسی کالے کو کسی سفید رنگ والے پر اور نہ ہی کسی سفید فام کو کسی کالے رنگ والے پر کوئی فضیلت حاصل ہے ہاں مگر خداخوفی (تقویٰ) کی بنیاد پر۔ تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔

اے قبیلۂ قریش! بے شک اللہ تعالیٰ نے تم سے زمانہ جاہلیت کے فخر وغرور اور آباء واَجداد کی بڑائیاں بیان کرنے کو دُور کر دیا ہے۔ اے لوگو! تمہارے خون' تمہارے مال اور تمہاری عزتیں قیامت تک کے لئے تم پر

اِسی طرح حرام ہیں جس طرح کہ یہ دن' یہ مہینہ اور تمہارا یہ شہرِ مکہ تمہارے لئے محترم ہیں۔ عنقریب تم یقیناً اپنے پروردگار سے ملوگے' وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا جس کی بابت میں نے تمہیں خبر دے دی ہے۔ پس جس کسی کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ اُسے اُس شخص کو ادا کر دے جس کی وہ امانت ہے۔

فضیلت و فوقیت کے تمام دعوے' خون یا قصاص کے تمام مطالبات اور قانون و اُصول کے غلط پہلو تمام کے تمام میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف کعبہ پر تولیت اور حجّاجِ کرام کو پانی پلانے کی خدمت کی قدیم روایات باقی رہیں گی۔

اے قبیلۂ قریش! اس بات کا خیال رکھو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روزِ محشر تم اللہ تعالیٰ کے حضور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے گناہ کا بوجھ اٹھائے پیش ہو اور اپنی نیکیوں کی بنیاد پر نجات کی امید رکھو' کیونکہ اُس صورت میں میں رب کے حضور تمہارے کسی کام نہ آ سکوں گا۔ خبردار! میرے بعد گم کردہ راہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

خبردار! زمانہ جاہلیت کی تمام باتیں میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے تمام خون منسوخ کئے جاتے ہیں (لہٰذا کوئی کسی کے خلاف انتقام نہیں لے گا)۔ انتقام لینے کے پہلے حق سے جو میرے خاندان سے متعلق ہے' دست کشی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ میں (اپنے قبیلہ) بنو سعد کے ابنِ ربیعہ بن حارث نامی دودھ پیتے بچے کے خون کو جو زمانہ جاہلیت کا پہلا قتل تھا' معاف کرتا ہوں جو قبیلہ بنی ہذیل کے ہاتھوں قتل ہوا۔

زمانہ جاہلیت کے تمام سود اور سودی واجبات کو ختم کیا جاتا ہے لیکن تمہارے اصل زر باقی رہیں گے۔ نہ تم پر کسی پر ظلم کرو گے اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔ سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کو ادا ہونے والے سود کو منسوخ کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔

لوگو! مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور اس طرح تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اپنا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے غلاموں کا بھی خیال رکھو۔ اُنہیں کھانے کو وہی کچھ دو جو خود کھاتے ہو اور اُنہیں پہننے کو وہی دو' جو خود پہنتے ہو۔

لوگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے قانونِ وراثت کے ذریعے ہر جائز وارث کا حصّہ مقرر کر دیا ہے' لہٰذا (اس کے بعد) کسی وارث کے لئے کوئی وصیت یا ثبوت جائز نہیں ہوگا۔

رشتہ اِزدواج میں پیدا شدہ بچہ ہی اپنے والدین کا جائز وارث ہوگا۔ ثابت شدہ زنا رجم (سنگ باری) کے ساتھ قابلِ سزا ہوگا۔ بھول چوک سے کئے گئے اور ارادۃً کئے گئے اعمال کا روزِ آخرت میں حساب ہوگا۔

اُس شخص پر اللہ تعالیٰ کی لعنت جو اپنے باپ کی بجائے اپنی نسبت کسی اور کی طرف کرتا ہے اور اُس غلام پر بھی (لعنت) جو اپنے مالک کی بجائے اپنے کو کسی اور مالک کی طرف نسبت دیتا ہے۔

ادا ہونے والے قرضہ جات کو ادا کیا جانا چاہئے۔ تمام مستعار شدہ چیزیں اپنے مقام پر لوٹائی جائیں۔ تحفہ جات یا اُن کے بدل کو اُس کے ہاں پہنچنا چاہئے جس کے نام کا تحفہ ہے اور ایک ضامن کو اُس نقصان کی تلافی کر دینی چاہئے جو متعلقہ شخص کو ہوئی ہے۔ کسی شخص کے لئے اپنے (دینی یا حقیقی) بھائی کی کوئی چیز اُس کی مرضی کے بغیر ہتھیانا جائز نہیں۔ لہٰذا ایسا کرنے سے نہ اپنے آپ پر ظلم کرو اور نہ ہی دوسروں پر اور نہ ہی کسی قسم کا تجاوز عن الحد کرو۔ خبردار! کسی عورت کے لئے اپنے خاوند کے مال کی کوئی بھی چیز خاوند کی واضح اجازت کے بغیر کسی کو دینا جائز نہیں ہے۔

اپنی بیویوں (کے حقوق) کے بارہ میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے اُنہیں اللہ کے نام پر قبول کیا ہے اور اُسی کے نام پر وہ تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں۔ لوگو! جس طرح تمہارا تمہاری بیویوں پر حق ہے' اُسی طرح اُن کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارا اُن پر یہ حق ہے کہ وہ اُس شخص کو اپنے ہاں نہ آنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور یہ کہ وہ پاکدامن رہیں اور بے حیائی سے بچیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ تمہیں اُن کے بستر سے علیحدہ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنا رویہ نہ بدلیں تو اُنہیں ایسی ہلکی مار مارو جس کا نشان ظاہر نہ ہو۔ اُن کا تم پر حق یہ ہے کہ اُنہیں طعام ولباس صحیح طور پر دو۔ اپنی بیویوں سے اچھی بود و باش رکھو کہ وہ تمہارے قبضہ میں ہیں اور اپنے اکثر معاملات کو از خود نمٹانے کے قابل نہیں ہیں۔

لوگو! گوش ہوش اور دانشمندی سے میرے بیان پر تدبّر و تفکر کرو جسے میں نے تم سب کے آگے اسی طرح بیان کر دیا ہے جیسا کہ بیان کرنے کا حق تھا۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' اگر تم نے اُنہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے اور وہ اللہ کی مقدّس کتاب قرآن مجید اور اُس کے رسول ﷺ کی سنتِ مبارکہ ہیں۔ دین کے معاملات میں تجاوز عن الحد سے باز رہو۔ تم سے پہلے جو اُمتیں تباہ و برباد ہوئیں' وہ اِسی قسم کی بلا جواز غلطیوں سے ہوئیں۔

لوگو! تمہارے اس شہر (مکہ) میں شیطان اب اپنا حکم چلانے سے ناامید ہو چکا ہے۔ تاہم وہ مواقع اب بھی موجود ہیں کہ اُن معاملات میں جو تمہاری جانب سے نادانستہ طور پر معمولی سمجھے جاتے ہیں' شیطانی طریقے رائج ہو جائیں۔ لہٰذا شیطانی ترغیبات کے مقابل اپنے عقیدہ و مذہب کی حفاظت میں محتاط رہو۔

لوگو! دراصل مہینوں کا ہٹا دینا" کفر میں اور ترقی کرنا ہے۔ اس سے (عام) کفار گمراہ کئے جاتے ہیں' وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اُسے حرام سمجھتے ہیں تا کہ اُن مہینوں کی جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے' گنتی پوری کر لیں' پھر اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور اُس کے حلال کئے ہوئے

مہینہ کو حرام کر لیتے ہیں۔ اور دراصل زمانہ اُسی ڈگر پر گھوم آیا ہے + جو اللہ نے اس کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ اور دراصل اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ماہ ہے جن میں چار مہینے حرمت والے ہیں' تین مہینے (ذی قعدہ' ذوالحجہ اور محرم) متواتر ہیں اور جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان کا رجب نامی مہینہ (علیحدہ) ہے۔ خبردار! اپنے پروردگار کی عبادت کرو' پانچوں نمازوں کی ادائیگی کرو' ماہِ رمضان کے روزے رکھو' اپنے مالوں کی خوشدلی سے زکوٰۃ ادا کرو' اپنے رب کے گھر کا حج کرو اور اپنے قائدینِ امور کا حکم مانو' تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو گے۔

خبردار! مجرم اپنے جرم کا خود جوابدہ ہوگا۔ کسی والد کو اپنے بیٹے کے جرم کا اور نہ کسی بیٹے کو اپنے والد کے جرم کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ خبردار! یہاں موجود لوگوں کو چاہئے کہ وہ اُن لوگوں تک میرا پیغام پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں کیونکہ جن لوگوں کو پیغام پہنچایا جاتا ہے' اکثر اوقات سمجھنے اور امین ہونے کی صلاحیت میں سننے والے کی نسبت زیادہ فائق ہوتے ہیں۔

لوگو! تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ سب نے (بہ یک زبان) کہا کہ ہم اس بات کی گواہی دیں گے کہ آپ نے امانت پہنچا دی ہے' رسالت کا فریضہ ادا کر دیا ہے اور ہمیں رُشد و ہدایت کا راستہ دکھا دیا ہے۔ اس پر آپ نے اپنی انگشتِ شہادت کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے تین بار فرمایا: اے اللہ! گواہ رہنا' گواہ رہنا۔

* حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے سال کے چار مہینے (رجب' ذیقعدہ' ذی الحج اور محرم) حرمت اور عزت والے شمار ہوتے تھے اور ان میں لڑائی کرنے کی سخت ممانعت تھی نیز فریضۂ حج کی ادائی کے لئے ماہ ذوالحجہ کی تاریخیں مقرر تھیں۔ کچھ عرصہ بعد اہلِ عرب پر اِن تاریخوں کی پابندی گراں گزرنے لگی۔ اُن کا پیشہ راہزنی اور مار دھاڑ بن کر رہ گیا تھا۔ تین ماہ (ذیقعدہ' ذی الحجہ اور محرم) تک متواتر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لئے اُنہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان مہینوں میں سے جسے چاہا' حلال کر لیا اور اُس میں جی بھر کر قتل و غارت کی اور اُس کی جگہ سال کے کسی دوسرے مہینہ کو حرام قرار دیا۔ حرمت والے مہینوں کی تعداد بھی چار رہی اور اُن کا کام بھی بن گیا۔ نیز حج ایک عبادت کے علاوہ اُن کے لئے ایک بہت بڑا تجارتی میلہ بھی تھا' دُور دراز سے تجارتی قافلے آتے جس سے اُنہیں بہت نفع ہوتا لیکن حج کا فریضہ چونکہ قمری سال کے ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کیا جاتا اس لئے یہ ایسے موسم میں بھی آ جاتا جبکہ سخت سردی یا گرمی ہوتی اور موسم کی اس ناسازگاری کی وجہ سے اُن کا کاروبار ماند پڑ جاتا اور اُنہیں خاطر خواہ نفع نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل اُنہوں نے یہ نکالا کہ حج ہمیشہ معتدل موسم میں ادا کیا جائے۔ اس کے لئے اُنہوں نے حج کی مقررہ تاریخوں کو بدل دیا اور قمری سال کے بارہ مہینوں میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیا۔ اس طرح تینتیس سال کے بعد صرف ایک بار حج اپنی صحیح تاریخوں یعنی ۹ اور ۱۰ ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا۔ ان دونوں صورتوں میں چونکہ صرف اپنی ذاتی سہولتوں اور مالی منفعتوں کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کے اٹل اور محکم احکام میں ردّ و بدل کر لیا کرتے تھے اس لئے اُن کے اس فعل کو "زِيَادَةٌ فِى الْكُفْرِ" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحات ۲۰۲' ۲۰۳)

+ ۱۰ ہجری میں جب رحمتِ عالمیان ﷺ حجۃ الوداع کے لئے مکہ تشریف لے گئے تو اُس سال اُن کے دستور کے مطابق بھی ۹ اور ۱۰ ذی الحج کو ادا ہونا قرار پایا تھا۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یعنی اس سال بھی حج اُنہی تاریخوں میں ادا کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ ازلی میں اس کے لئے مقرر فرمائی تھیں۔ اس میں مسلمانوں کے لئے بھی درسِ عبرت ہے کہ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں اور دوسرے وجوہ کے لئے احکامِ الٰہی میں ردّ و بدل نہ کر دیا کریں۔ (ایضاً ص ۲۰۳)

(۳۷) انجنیئر نگ ---ENGINEERING

''انجنیئر نگ اُن طریقوں سے بحث کرتی ہے جن میں ہم اپنے مقاصد کے حصول کے لئے قدرتی لوازم اور مادّہ استعمال کرتے ہیں۔ انجنیئر نگ کا میدان بہت وسیع ہے اور وہ ننھے راکٹ کی ڈیزائننگ سے لے کر بڑے بھاری بھرکم فضائی صفاکاروں (Scrapers) سے بحث کرتا ہے۔ کچھ انجنیئر برقی آلات میں ماہر ہوتے ہیں' کچھ ملائمہ (plastics) کے مطالعہ میں مصروف اور کچھ مضبوط و پائیدار پُلوں کی تعمیر میں ماہر ہوتے ہیں۔ تخصیصات (Specializations) بہت سی ہیں لیکن تمام انجنیئروں میں ایک بات مشترک ہے کہ وہ سائنسی معلومات کو عملی استعمال میں لاتے ہیں۔'' (Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 7, p. 566)

(۱) سول انجنیئر نگ : یہ سڑکوں' پُلوں' آبی گزرگاہوں' ہوائی اڈوں، نہروں' پُشتوں (ڈیموں)' بدرَووں' ریلوے ٹریکوں' ہسپتالوں اور دوسری عوامی عمارات سے متعلق ہے۔ انجنیئر نگ کی اس قسم کی تعمیرات میں تحفظ کا پہلو انتہائی اہم ہوتا ہے۔ انجنیئروں کو زمین اور چٹانوں کی خصوصیات سے ازبس واقفیت ضروری ہے تاکہ وہ صحیح بنیادوں پر تعمیرات کا فیصلہ کرسکیں۔ اپنے استعمال میں لانے والے تمام میٹیریل کی توانائی کا اُنہیں علم ہونا چاہئے۔ اُنہیں اس بات کا بھی علم ہونا چاہئے کہ اُن کے تعمیر ہونے والے پُل کتنا وزن اٹھا سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ایک پُشتہ (ڈیم) میں کس حد تک پانی محفوظ طور پر سما سکتا ہے۔

ماہرینِ تعمیرات اور سول انجنیئر اکٹھے مل کر کام کرتے ہیں۔ ماہرِ تعمیرات ایک خوش کن اور باکفایت ڈیزائن کے بنانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور عمارت کی تعمیر میں موزوں اور مناسب میٹیریل کے استعمال کو چیک کرنے کا کام سول انجنیئر کا ہوتا ہے۔ پُل کے خوش منظر ہونے لیکن اس کے غیر پائیدار اور غیر محفوظ ہونے میں کوئی فائدہ نہیں۔

سول انجنیئروں کو عمارت میں استعمال ہونے والے آلات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ میٹیریل کی نقل وحمل میں استعمال ہونے والی کرینوں' بلڈوزروں' مکینیکل بیلچوں' کڑچھوں اور پھاوڑوں اور اس قسم کے دوسرے آلات' ذرائع ووسائل کا بھی علم ہونا چاہئے۔ اُنہیں آہنی شہتیروں کی ویلڈنگ سے لے کر زمین میں بلّیاں گاڑنے کی مشین تک کے استعمال کے طریقوں کے متعلق بھی معلومات ہونی چاہئیں۔ (ایضاً' جلد ہفتم' صفحہ ۵۶۴)

لندن کے سول انجنیئروں کے ادارے نے ۱۹۲۸ء کے اپنے دستور العمل (چارٹر) میں سول انجنیئر نگ کو یوں متعارف کرایا: ''قدرت میں ودیعت کئے گئے عظیم ذرائع کو نوعِ انسان کے استعمال اور سہولت میں لانے اور ملک کی اندرونی اور بیرونی تجارت میں پیداواری ذریعے کا نام سول انجنیئر نگ ہے اور اس سے سڑکوں' پُلوں' آبی گزرگاہوں' نہروں' دریائی سفروں اور بندرگھاٹوں کی تعمیر و تنصیب میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے تاکہ اندرونی ارتباطِ باہمی اور تبادلہِ معلومات رہے اور اس سے حسبِ منشا مشینری کی تیاری و فراہمی اور شہروں اور قصبوں کے نکاسیِ آب کا نظام برقرار رہے۔''

''مندرجہ بالا تعریف انجینئر نگ کی تقریباً اُن تمام برانچوں کا احاطہ کرتی ہے جن کا آج کل علیحدہ وجود ہے۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں تخصیص (Specialisation) پر بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث مکینیکل' کان کنی اور الیکٹریکل انجینئر نگ وغیرہ جیسے متعدد گروہ اور تحتی درجہ بندیاں (Sub-divisions) معرضِ وجود میں آئیں۔انجینئر نگ کی اِن شاخوں کی افزائش کے ساتھ سول انجینئر نگ کا دائرہ عمل رک گیا ہے اور اب سول انجینئر نگ صرف سڑکوں، ریلوے' پُلوں' نہروں' بندر گھاٹوں' بندر گاہوں' پناہ گاہوں اور آبی گزرگاہوں کی ڈیزائننگ اور تعمیر تک محدود ہو کے رہ گئی ہے۔'' ("A-One Comprehensive General Knowledge"... Mirza Muhammad Yusuf, p. 153) Lahore, 1988.

سولِ انجینئر نگ کا ذکر قرآنِ حکیم میں: قوم ثمودؔ اور سلیمان علیہ السلام کے بیان میں قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

(۱) وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا (الاعراف : ۷۴)

''اور (وہ وقت) یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قومِ عاد کے بعد آباد کیا اور زمین پر تمہیں ٹھکانہ دیا۔تم اس زمین کے نرم حصّوں پر محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔'' (۷۴ :۷)

(۲) وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ (الشُّعراء : ۱۴۹)

''اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اِتراتے ہوئے مکان بناتے ہو۔'' (۱۴۹ :۲۶)

جب ثمودی سنگ تراشی اور عمارت گری جیسی صنعتوں اور صناعیوں میں اس قدر ترقی یافتہ تھے تو لازمی ہے کہ جن علوم وفنون پر یہ صنعتیں مبنی ہیں یعنی ریاضی' ہندسہ' انجینئر ی' اُن میں بھی یہ نہایت بلند پایہ اور ممتاز ہوں۔

(۳) يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبا:۱۳)

''سلیمان علیہ السلام کے لئے وہ (جن) وہ وہ چیزیں بنادیتے جو اُنہیں بنوانا منظور ہوتیں مثلاً بڑی عمارتیں اور مجسمے* اور لگن جیسے حوض اور (بڑی بڑی) جمی ہوئی دیگیں۔'' (۱۳ : ۳۴)

مسجدِ اقصیٰ اور بیت المقدس کی اور عبادت گاہیں سلیمان علیہ السلام ہی کی تعمیر کرائی ہوئی ہیں اور لوگ آج بھی ان عمارتوں اور بڑے بڑے مقبروں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔

* ''تماثیل کا معنی ہے مجسمے۔اسلام میں مجسمے بنانا اور اُن کا رکھنا جائز نہیں ہے۔صرف چھوٹی بچیوں کے لئے گڑیاں کھیلنے کا جواز ہے اور تصاویر کا بنانا بھی جائز نہیں خواہ وہ تصاویر ہاتھ سے پینٹنگ کے ذریعے بنائی جائیں یا کیمرے کا فوٹوگراف ہو یا وڈیو کیمرے کی تصاویر ہوں یا سینما کی تصویر ہوں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ کیمرے کی تصاویر بھی آئینہ کے عکس کی طرح ہیں اس لئے انہیں بھی جائز ہونا چاہئے۔اس کا جواب یہ ہے کہ آئینہ میں عکس ناپائیدار ہوتا ہے جبکہ کیمرے میں اس تصویر کو اپنے اختیار سے قائم اور پائیدار کرلیا جاتا ہے لہٰذا کیمرے کے فوٹوگراف کو آئینہ کے عکس پر قیاس کرنا جائز نہیں ہے۔'' (تبیان القرآن۔۔ج ۹' ص ۶۱۲)

شہد کی مکھی بڑی ماہر انجینیر ہے اور انجینیر ز کے لئے تحرک اور جوش دلانے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔قرآنِ حکیم شہد کی مکھی کی انجینیر نگ کے اس مشینی عمل (mechanism) کو یوں بیان کرتا ہے :

وَأَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ٥ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً (اَلنَّحل : ۶۸، ۶۹)

''اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کو یہ بات سمجھا دی کہ تو پہاڑوں میں، درختوں میں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں، اُن میں بھی گھر بنالے، پھر ہر قسم کے رس چوستی پھر اور پھر اپنے پروردگار کے راستوں میں چل جو تیرے لئے آسان ہیں۔'' (۱۶:۶۹،۶۸)

اِن مکھیوں کا چھتا بھی صنعت و کاریگری کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔یوں لگتا ہے کہ کسی مہندس (انجینیر) نے اُسے تیار کیا ہے۔ان مکھیوں کا ایک ایک پھل پھول پر رس چوسنے کے لئے بیٹھے رہنا اور میلوں کا سفر طے کر کے بغیر راستہ بھولے بھٹکے اپنے چھتے کی طرف واپس آجانا ایک مشہورِ عالم واقعہ ہے۔سُبُلَ رَبِّكِ راستوں کا انتساب حق تعالیٰ نے اپنی جانب کیا ہے۔شہد کی مکھیوں کے آنے جانے کا راستہ اس حکمت سے بنانا صرف اُسی ذات کا کام ہے جسے اپنی ہر مخلوق سے رشتۂ ربوبیت حاصل ہے۔فرنگی ماہرینِ فن نے ان مکھیوں کی فراست و دانائی اور حُسنِ انتظام و تدبر پر کتابوں پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔تابکار شعاعوں کے ذریعے سرطان کے معالج (Radiotherapist) ڈاکٹر ہلوک نوربا کی (آف ترکی) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

''سورۃ النَّحل کی آیت ۶۸ میں جو اہم نکتہ بیان ہوا ہے، وہ الہام (کشف) اور وحیِ الٰہی کے مابین فرق کا ہے۔* انسان کی خدمت کے لئے شہد کی مکھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص وحی (الہام) وصول کرتی ہے جس کے تحت وہ عقل کو چکرا دینے والی دواسازی اور نامیاتی کیمیا (بائیوکیمیکل) کی فیکٹری کی طرح شہد بناتی ہے۔قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ مختلف نامیے (آرگنزمز) اور غیر حیاتیاتی مادّے الہامِ الٰہی کے پرتَو (انعکاس) سے راہ نمائی پاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ایک خصوصی الہام کے ذریعے نامیوں کو مختلف کام تفویض کرتا ہے، وہ الہام وجدان سے مختلف ہوتا ہے۔ عقلِ کُل (یعنی اللہ) کی ہمہ دانی شہد کی مکھی کو پُر اَسرار رموز سکھاتی ہے جو ایک معمولی سا کیڑا ہے۔''

''شہد کی مکھی جو انجینیر ز کے لئے ایک عطائی تحریک ہے، اُن مخلوقات میں سے ایک ہے جسے سربستہ راز عطا کیا گیا ہے۔ اور آیتِ بالا ۶۸ ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کی قدرتِ کاملہ شہد کی مکھی کے ذہن میں دانش و

*وحیِ الٰہی کا تعلق انبیاء اور رسولوں کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ الہام (کشف) غیر انبیاء سے متعلق ہے حتیٰ کہ انسانوں کے علاوہ اس میں حیوانات اور شیاطین بھی شامل ہیں (ملاحظہ ہو سورۃ القصص کی آیت ۷ أَوْحَيْنَا اِلٰى أُمِّ مُوْسٰى کہ ''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا۔'' اور سورۂ الانعام کی آیت ۱۲۱ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى أَوْلِيَآءِ هِمْ ''اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کو پٹی پڑھا رہے ہیں۔''

فراست ودیعت کرتی ہے جو ایک سوئی کے سرے کے حجم جتنا بھی نہیں۔ اسی لئے اس سورۃ کا نام النّحل رکھا گیا (بمعنی شہد کی مکھی)۔ یوں لگتا ہے کہ شہد کی مکھی تمام ملحدین (منکرینِ خدا) ' مادّہ پرستوں اور کافروں کی زبانوں کو اپنے خدادادرموز واسرار سے ڈنگ مارتی ہے۔'' ("The Holy Qur'an and the Facts of Science" pp. 143, 144)

''شش پہلو خانوں پر مشتمل اور علمِ ہندسہ کی رُو سے ہر طرح مکمل شہد کا چھتا بذاتِ خود ایک حیران کن ساخت ہے اور بجا طور پر اسے (قرآن نے) بُیُوت کہا ہے۔ پہاڑوں' درختوں اور لوگوں کی رہائش گاہوں کی نا قابلِ رسائی جگہوں کو شہد کی مکھی کا پالینا قدرت کے معجزات میں سے واقعی ایک معجزہ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو سجھا دینا ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی۔ نوٹ :۲۰۹۷)

''شہد کی مکھی کے بنائے ہوئے کمرہ نما خانوں کو قرآن نے اُن کے حُسنِ صناعی اور قابلِ تحسین اُپج کی وجہ سے بُیُوت (بیت کی جمع بمعنی گھر) کہا ہے جس کا کوئی بھی جیومیٹری دان مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' (بیضاوی)

''<u>شہد کا چھتا</u>: شش پہلو مخروطی شکل کا شہد کی مکھیوں کا گھر فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے جو صرف الٰہی الہام کی مدد سے ہی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہندسی انتخاب فنِ تعمیرات کی بہترین نمائندگی کرتا ہے جو کم از کم میٹیریل کے ساتھ خاصے حجم پر بنایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں چھتے کی بنیادی ساخت میں استعمال ہونے والا صمغہ (Resins) بڑی احتیاط کے ساتھ منتخب کیا جاتا ہے تا کہ وہ انسانی صحت کے موافق ہو۔'' ("The Holy Qur'an and the Facts of Science" ---- Dr. Haluk Nurbaki, p. 138)

(۲) <u>مکینیکل انجینئرز</u> مشینری میں ماہر ہوتے ہیں۔ اُن کا کام توانائی کے استعمال کو مکینیکل توانائی میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ ہر اُس صنعت میں جس کا آپ خیال کریں' کسی نہ کسی قسم کی مشین کا استعمال ہوتا ہے۔ کسان ٹریکٹروں' بیج ڈالنے کی مشینوں اور پچکاریوں کا استعمال کرتا ہے۔ پلاسٹک کے کارخانے میں پگھلانے' آمیزش کرنے' ڈھالنے' گھمانے اور سربہ مُہر کرنے کی سینکڑوں مشینیں ہوتی ہیں اور ہر وقت نئی مشینری کی ضرورت رہتی ہی ہے۔ مشینوں کی ڈیزائننگ اور اُنہیں بنانا مکینیکل انجینئرز کا کام ہوتا ہے۔

''توانائی پیدا کرنے والی صنعتوں میں مخصوص قسم کی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدرتی ذرائع سے توانائی حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم کی مشینری اور آلات استعمال کئے جاتے ہیں۔ مکینیکل انجینئرز کا واسطہ کوئلے' قدرتی گیس' تیل اور دوسرے اُن ایندھنوں سے ہوتا ہے جو توانائی پیدا کرنے والے کارخانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جوہری ایندھن کو مختلف قسم کی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (فنک اینڈ ویگنلز نیو انسائیکلو پیڈیا آف سائنس'')

<u>مکینیکل انجینئر نگ اور قرآنِ حکیم</u> :مکینیکل انجینئر نگ کے بارے میں ہمیں قرآن مجید میں کچھ اشارات ملتے ہیں۔مثلاً:

(۱) وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَo أَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (سَبا : ۱۱)

(۲) وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ (سَبا : ۱۲)

(۱) ''اور ہم نے داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو نرم کر دیا کہ تم پوری (زر ہیں) بناؤ اور اُن کے جوڑ میں (مناسب) اندازہ رکھو۔'' (۱۱ : ۳۴)

(۲) ''اور ہم نے داؤد علیہ السلام کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔'' (۱۲ : ۳۴)

یعنی'' تانبے کو اُس کے معدن میں رقیق سیال کر دیا تھا تاکہ اس سے آلات کی مدد کے بغیر مصنوعات کے بنانے میں سہولت ہو' پھر وہ منجمد ہو جاتا۔یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ زیرِ زمین جہاں گرم اور رقیق تانبے کے چشمے ہیں' وہ آپ پر ظاہر کر دیئے گئے تھے۔حضرت داؤد علیہ السلام ایک طرف نبوّت و رسالت اور دوسری طرف حکومت و سلطنت کے باوجود اپنا مستقل ذریعہ معاش صنعتِ زرہ سازی کو بنائے ہوئے تھے اور اسی کی تجارت کرتے تھے۔تو آیت سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ صناعی و دستکاری منصبِ نبوّت کے منافی نہیں۔'' (عبدالماجد دریا بادی (اردو) حاشیہ صفحہ ۸۶۱)

مکینیکل انجینئر نگ کی صنعت کا واضح تصوّر ہم قومِ عاد کے قرآنی ذکر سے بھی اخذ کر سکتے ہیں جس میں اُن کے کارخانوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی کارکردگی مشینوں کی رہینِ منّت ہوتی ہے:

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَo (الشُّعراء : ۱۲۹)

''اور تم بڑی بڑی فیکٹریاں (کارخانے) بناتے ہو جیسے تمہیں ہمیشہ ہی رہنا ہے۔'' (۱۲۹ :۲۶)

نوٹ : جدید عربی محاورہ میں مَصْنَع (جمع مَصَانِع) مل اور کارخانہ کے معنی میں آتا ہے۔

ممکن ہے کہ ذیل کی آیاتِ قرآنی نے مشینوں اور ان سے متعلق آلات کے ایجاد کا انسان کو تصوّر دیا ہو جو ترقی کی منازل طے کرتے کرتے مکینیکل انجینئر نگ کے مقام تک پہنچ گیا:۔

(۱) وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ o (اَلنَّحل : ۸)

(۲) لِيَأْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيْهِمْ (يٰسٓ : ۳۵)

(۱) ''اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے جن کی تمہیں خبر نہیں۔'' (۸ : ۱۶)

(۲) تاکہ لوگ اس (باغ) کے پھلوں سے کھائیں اور اُسے بھی جو اُن کے ہاتھ بناتے ہیں۔'' (۸ :۳۵)

(۳) <u>انجینئر نگ بہ متعلق ہوانوردی (Aeronautical Engineering)</u>: یہ انجینئر نگ کی وہ خاص قسم ہے جو طیاروں اور ہیلی کاپٹروں سے متعلق ہے۔

''ہوابازی Aviation'' کے عنوان کے تحت (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷۰ جلد اوّل' اُردو ترجمہ) یہ بیان کیا گیا تھا کہ پرندوں کی پرواز کی میکانیت کو دیکھ کر حضرتِ انسان میں ہوا کے دوش پر اُڑنے کا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے اس ضمن تحقیق کی اور بالآخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ ہوائی جہاز اور خلائی جہاز کی ایجاد نے قدرتی طور پر ہوا نوردی کی انجینئر نگ کو جنم دیا جس کا اصل محرّک قرآنِ حکیم ہی ہے جو فرماتا ہے :

(۱) أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ (اَلنَّحل: ۷۹)
''کیا اُن لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی فضا میں (قدرت کے) مسخر ہیں۔ اُنہیں بجز اللہ کے کسی نے نہیں تھام رکھا۔''

(۲) أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ (اَلْمُلك : ۱۹)
''کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں پر نظر نہیں کی کہ پَر پھیلائے ہوئے ہیں اور سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ اُنہیں سوائے خدا رحمان کے اور کوئی نہیں تھامے رہتا۔'' (۱۹ : ۶۷)#

نیز مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے بھی ہوانوردی کی انجینئر نگ کا خیال اُبھرتا ہے :

(۱) وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا (الانبیاء : ۸۱)
''اور ہم نے زوردار ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی جس میں ہم نے برکت رکھ دی ہے۔'' (۸۱ : ۲۱)

(۲) وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سَبَا : ۱۲)
''اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اُس کی صبح کی منزل مہینہ بھر کی ہوتی اور اُس کی شام کی منزل مہینہ بھر کی ہوتی۔'' (۱۲ : ۳۴)

(۴) **کان کنی اور دھات کاری کی انجینئر نگ**: یہ اُن طریقوں سے متعلق ہے جن کے ذریعے کچ دھاتوں اور معدنیات کو زمین سے نکالا جاتا ہے۔ یہ اُن طریقوں سے بھی متعلق ہے کہ دھاتیں اپنی خام دھاتوں سے کیسے نکالی جاتی ہیں اور استعمال کے لئے کیسے تیار کی جاتی ہیں۔ کان کنی کا انجینئر ماہرینِ ارضیات کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے جنہیں قشرِ زمین کے چٹانی مادّے کا مطالعہ ہوتا ہے۔

کان کنی کے انجینئر وں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مختلف حالات میں کان کے بادکش تعمیر کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اُنہیں بادکشوں کو ہوادار کرنے والی مشینری کا اور زمین سے معدنیات نکالنے کے لئے برما اور کھودنے والے آلات کا بھی علم ہونا چاہئے۔ کان کنی کے انجینئر کو کوئلے کی کان کنی' یورینیم کی کان کنی' سونے کی کان کنی وغیرہ میں تخصص حاصل ہونا چاہئے۔ اُنہیں سول' مکینیکل اور الیکٹریکل انجینئر نگ ہر تینوں کا بھی پختہ علم ہونا چاہئے۔

انہی دو آیات سے نیوٹن نے کششِ ثقل کا قانون اخذ کیا۔ تو اس قانون سے متعارف کرانے والا قرآن مجید ہے نہ کہ نیوٹن۔

''دھات کاری کے انجینئر دھاتوں کو اُن کی کچ دھاتوں سے علیحدہ کرنے اور اُنہیں استعمال کے قابل بنانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ان انجینئر وں کا ایک اور نام Extractive Metallurgist بھی ہے۔
(Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 7, p. 566)

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت پر محض سطحی نگاہ دوڑانے سے ہمیں اس میں کان کنی اور دھات کاری کی انجینئر نگ کی طرف صاف اشارہ معلوم ہوتا ہے :

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ٥ (فاطر : ۲۷)

''اور پہاڑوں میں بھی گھاٹیاں ہیں' کوئی سفید اور کوئی سرخ' اُن کے رنگ مختلف ہیں اور کوئی بہت گہرے سیاہ۔'' (۳۵:۲۷)

''پہاڑوں کے مختلف رنگوں کی طرف خصوصی طور پر متوجہ کر کے اُن معدنیات کا کھوج لگانے کی ترغیب دی گئی ہے جو اُن کے شکموں میں موجود ہیں اور مدت سے کسی جوانمرد اور باہمت انسان کی ضربِ خاراشگاف کے لئے چشم براہ ہیں اور پہاڑوں کی یہ مختلف رنگتیں ان مدفون خزانوں کا پتہ دے رہی ہیں۔افسوس وہ قوم جسے قرآن کریم جیسی کتاب منیر عطا کی گئی تھی' وہ اُسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر سوگئی اور یورپ کی وحشی قومیں اِس چشمہ صافی سے اپنی کشتِ حیات کو سیراب کرنے میں سبقت لے گئیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد چہارم' صفحہ ۱۵۴)

(۵) <u>کیمیکل انجینئر نگ</u>: انجینئر نگ کی اس برانچ کا واسطہ اُن طریقوں سے ہے جن میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ میٹیریل کو کیسے مفید پیداوار (Product) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔کیمیکل انجینئر کو کسی ایک کیمیائی طریق عمل میں بھی اختصاص حاصل ہوسکتا ہے مثلاً پینٹنگ' ڈائیاں' کھاد' پلاسٹک' صابن' آتش گیر مادّہ' منشیات یا کئی سینکڑوں چیزوں میں سے کسی ایک میں اختصاص (Specialisation)۔کچھ کیمیائی مادّے بہت خطرناک ہوتے ہیں اور اُنہیں بہ حفاظت سنبھالنے کے لئے ماہرانہ علم کی ضرورت ہوتی ہے۔کچھ کیمیائی مادّوں کو منتقل کرنے کے لئے خصوصی آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عملِ کشید (مائع کو گرم کر کے اُس کی بھاپ کو دوبارہ ٹھنڈا کرنا اور مصفّٰی شکل میں لانا)' عملِ تقلیم (چینی یا قند کی تہ چڑھانا)' عملِ تقطیر (چھاننے کا عمل)' آمیزش' پھوڑنا' اور کیمیائی مرکبات کو خشک کرنا' یہ سب کیمیکل انجینئر کے ذمہ دارانہ کام ہیں۔'' (فنک اینڈ ویگنلز نیو انسائیکلوپیڈیا آف سائنس)

سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا (بلقیس) کے قصہ میں قرآن مجید میں اُس بلند و بالا محل کا ذکر ہے جس کا فرش ہموار' چمکائے ہوئے شیشہ کی سِلوں کا تھا (بحوالہ سورۃ النّمل آیت ۴۴)۔

سورۂ الدّھر کی آیات ۱۵' ۱۶ میں جنت کے مکینوں کا ذکر کچھ اس طرح آیا ہے :

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ٥ قَوَارِيرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ٥

''اور اُن کے پاس چاندی کے برتن اور گلاس لائے جائیں گے جو شیشے کے ہوں گے اور وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جنہیں بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا۔'' (۷۶ : ۱۵'۱۶)

سورۃ النّمل کی آیت ۴۴ اور سورۃ الدّھر کی آیات ۱۵' ۱۶ میں وارد لفظ قَوَارِیر (بمعنی شیشہ) میں کیمیکل انجنیئر نگ کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

(٦) الیکٹریکل انجنیئر نگ: کا واسطہ مختلف قسم کے برقی آلات کی ساخت اور استعمال سے ہوتا ہے جو پاور پلانٹ' ریڈیو' ٹیلیویژن سٹیشنز' راڈار' ٹیلیفون اور ایئر کنڈیشنڈ نظاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ برقی جنریٹر آبی قوّت' جوہری قوّت' کوئلے یا تیل سے چلائے جاتے ہیں۔ الیکٹرانک انجنیئر چھوٹے پیمانے پر برقی سرکٹ ڈیزائن اور تیار کرتے ہیں۔ اِبلاغ کے انجنیئر ریڈیو' ٹیلیویژن' راڈار اور ٹیلیفون کے شعبہ جات میں ماہر ہوتے ہیں۔

آسمانی بجلی نے جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰' سورۃ الرّعد کی آیت ۱۲ اور سورۃ النّور کی آیت ۴۳ میں ہے' مصنوعی بجلی (الیکٹریسٹی) بنانے کا تصوّر دیا جسے بننے کے بعد انسان کے بہترین مفاد میں لایا گیا اور جو تدریجاً ترقی کرتے کرتے الیکٹریکل انجنیئر نگ کے مقام تک پہنچی جو انسان کی ناقابلِ تصوّر حد تک خدمت میں مصروف ہے۔

(٧) پارچہ بافی (ٹیکسٹائل) انجنیئر نگ: ٹیکسٹائل انجنیئر نگ کے نتیجہ میں بننے والے لباس کا ذکر جو انسان کی بنیادی ضرورت ہے' قرآن مجید کے مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) یٰبَنِیٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا (الاعراف: ۲۶)
''اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے جو تمہارے پردہ والے بدن کو چھپاتا ہے اور موجبِ زینت بھی ہے۔'' (۲۶ : ۷)

اَنْزَلْنَا کے لفظی معنی تو اُتارنے کے ہیں۔ یہاں خَلَقْنَا (ہم نے پیدا کیا) کا ہم معنی ہے۔ لفظ اَنْزَلْنَا میں اس کی برکتوں کی طرف اشارہ ہے کہ گویا وہ آسمان سے اُترا ہوا ہے (جصاص)۔ غور کیا جائے تو ہر لباس اپنی تیاری کے لئے اسبابِ آسمانی ہی کا محتاج نظر آئے گا۔ ریشم' اُون' سوت' سب کی پیداوار کے آخری ظاہری اسباب جاکر بارش ہی پر ٹھہرتے ہیں۔ وَرِیْشًا ـــــ ہربرٹ سپنسر' ویسٹر مارک وغیرہ مغربی فلسفیوں نے بھی لباس کا ایک مقصد زینت و آرائش ہی بتایا ہے۔ (عبدالماجد دریابادی)

آیت سے یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ لباس وحجاب مقاصدِ شرعی میں سے ہیں اور برہنگی و نیم برہنگی کا فلسفہ خواہ اس کی تبلیغ یورپ اور امریکہ سے ہو رہی ہو یا اس کی ترویج وحشی اور غیر مہذب قوموں میں ہو' بہر حال ایک شیطانی فلسفہ ہے۔

(۲) وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ ٥ (اَلنّحل: ۵)
''اور اُس نے چوپائے بنائے' اُن میں تمہارے لئے گرم لباس بھی ہے اور اور بھی فائدے ہیں اور اُن میں سے تم کھاتے بھی ہو۔'' (۵ : ۱۶)

(۳) وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْأَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَّمَتَاعًا إِلٰى حِيْنٍo ------ وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ (اَلنَّحل : ۸۱، ۸۲)

''اور اُس نے تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے جنہیں تم اپنے سفر کے دن اور اپنے مقام کے دن ہلکا پاتے ہو اور اُن کی اون اور اُن کی رووں اور اُن کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور ایک مدت تک چلنے والی فائدے کی چیزیں بنائیں ------
اور اُس نے تمہارے لئے پیرہن بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کرتے ہیں اور وہ پیرہن (بھی بنائے) جو تمہاری حفاظت (تمہاری آپس کی جنگ میں) کرتے ہیں۔'' (۸۱،۸۲ : ۱۶)

سردی کو چھوڑ کر یہاں صرف گرمی کی تخصیص کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سردی سے حفاظت کا ذکر اسی سورت کی آیت ۵ میں اوپر ہو چکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مخاطبینِ اوّل عرب تھے اور عرب میں لباس کی اصلی ضرورت' ظاہر ہے کہ بادِ سموم کی تند لپیٹ اور آفتابِ گرم کی کڑی کرنوں ہی سے بچنے کے لئے ہے۔

(۸) جینیائی (Genetic) انجینیر نگ : جدید طبی تحقیقات میں یہ نمایاں مقام کا حامل ہے۔ ایک آدمی کے جینز کا مطالعہ اُس کی تمام تاریخِ حیات بشمول اُس کے حسب ونسب' امراض اور کچھ دوسرے حقائق جن کا جاننا کسی اور طریق سے ممکن نہیں' کو ظاہر کر دیتا ہے۔ DNA (Deoxyribonucleic Acid) کے نظریہ نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا ہر خلیہ اس قدر وسعت کا حامل ہے کہ اس میں انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے حجم کے دس ارب صفحات کی معلومات لکھی جا سکتی ہیں۔ ڈی این اے کے نظریہ کی اس تحقیق نے کچھ اُن قرآنی حقائق کو سمجھنے کی راہ آسان کر دی ہے جو کسی اور ذریعہ سے انسانی فہم سے بعید تھے۔ ڈی این اے ہزاروں جینز کا بنا ہوتا ہے جو پروٹین بناتے ہیں اور یہ زندگی کے بایو کیمیکل بلاکس ہیں۔

''زندگی سے زندگی کیسے آتی ہے؟ جب مادہ (عورت) کا بیضہ اور مرد کا سپرم آپس میں ملتے ہیں تو بیضہ میں موجود 23 کروموسومز مرد کے سپرم سے 23 کروموسومز لے کر جوڑے بن جاتے ہیں جو 46 کروموسومز پر مشتمل ہوتے ہیں اور اسی میں ہمارے جسم کا ماسٹر پلان ہوتا ہے۔ ہماری جنس (لڑکا یا لڑکی) کا تعلق کروموسومز کے 23 جوڑوں پر انحصار کرتا ہے جنہیں سیکس کروموسومز کہتے ہیں۔ عورت کی طرف سے جو آتے ہیں' اُنہیں ایکس ایکس (XX) کروموسومز کہتے ہیں اور جو مرد سے آتے ہیں اُنہیں ایکس اور وائی (X and Y) کروموسومز کہتے ہیں۔ اگر X کے ساتھ X کا ملاپ ہو جائے تو لڑکی ہوتی ہے اور اگر X کے ساتھ Y کا ملاپ ہو جائے تو لڑکا ہوتا ہے یعنی کروموسومز کا ایک ایک رکن شامل ہوگا۔ قرآنِ مجید نے ایک جگہ پر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ إِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ الذُّكُوْرَo أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَآءُ عَقِيْمًا إِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌo (اَلشُّورٰى : ۴۹، ۵۰)

''وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اولادِ مادینہ عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے اولادِ نرینہ عنایت فرماتا ہے یا اُنہیں نر و مادہ کی صورت میں جمع بھی کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لاولد رکھتا ہے' پکی بات ہے کہ وہ بڑے ہی علم والا' بڑی ہی قدرت والا ہے۔'' (۴۹' ۵۰ : ۴۲)

اس تمام بحث سے قطع نظر مؤلف یہ کہنے میں اعزاز محسوس کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ ایک بہترین انجینئر اور ایک عظیم ریاضی دان ہے جس کی تکنیکی' تخلیقی مہارتیں نہ صرف ہمارے اِردگرد کی دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں بلکہ ہمارے اپنے جسمانی وجود میں بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ اُس نے فرمایا:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حٰمٓ السجدۃ : ۵۳)

''ہم عنقریب اُنہیں اپنی نشانیاں (اسی) دنیا میں دکھائیں گے اور خود اُن کی ذات میں بھی' یہاں تک کہ اُن پر کھل کر رہے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔'' (۵۳ : ۴۱)

قانونِ اوّلیت وسبقت (Priority) : اس ضمن میں اُس کا ارشادِ گرامی ہے :

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (البقرۃ : ۱۱۷' الانعام : ۱۰۱)

''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔'' (۲:۱۱۷ ؛ ۶:۱۰۱)

اپنی آزادانہ رضا اور مشیّت سے وہ اُن تمام تخلیقات کا موجد ہے جن کا پہلے کوئی وجود نہیں تھا (Lane's Arabic-English Lexicon, under the word "BADEE". اس طرح وہ قطعی اور حتمی خالقِ کُل ہے' نہ یہ کہ صرف بنانے والا یا ڈیزائن کرنے والا جسے اپنی مخلوق کے بنانے میں کسی میٹیریل یا طرز و نمونے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ تمام مخلوقات کا موجد اور خالق ہے اور اُس سے پہلے کچھ بھی نہ تھا تو اُسے اُن سب سے پہلے تقدّم حاصل ہونا چاہئے۔ ہر چیز کے فکر و خیال سے پہلے اُسی کا خیال ہونا چاہئے اور اسی کا نام ''قانونِ اوّلیت'' ہے۔

انسانی تخلیق کے متناسب ہونے کے متعلق قرآن مجید کا بہت سی جگہوں پر یہ دعویٰ ہے:

(ا) هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (آلِ عمران: ۶)

''وہ وہی تو ہے جو ماؤں کے شکموں میں جیسے چاہے' تمہاری صورت گری کرتا ہے۔ اُس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں' بڑا زبردست ہے' حکمت والا ہے۔'' (۶ :۳)

اِس آیت میں ہندو اَصنامیات (اساطیر mythology) کا ردّ ہے جس کے مطابق شکمِ مادر میں بچے کی صورت گری کرنا وَشتری (Tvashtri) نامی ایک دیوی کا کام ہے۔ (Religions of India...Barth, p. 21)

(۲) قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَه‘ o مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَه‘ o مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَه‘ فَقَدَّرَه‘ o ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَه‘ o (عَبَس : ۱۷ تا ۲۰)

''انسان پر اللہ کی مار وہ کیسا ناشکرا ہے! (اللہ نے) اُسے کس (حقیر) چیز سے پیدا کیا! نطفہ سے اُسے پیدا کیا پھر اُسے اندازِ مناسب سے متناسب کیا پھر اُس کے لئے راستہ آسان کر دیا۔'' (۱۷ تا ۲۰ : ۸۰)

یعنی نہ صرف عملِ تخلیق بلکہ ترکیبِ انسانی میں تناسب و توازن اور قویٰ' اعضاء وغیرہ کی ساخت و ترتیب غرض ہر شے قدرتِ الٰہی وحکمتِ کاملہ اور اُس کے ماہر و کامل انجنیئر ہونے پر دلیل کا کام دے رہی ہے۔ السَّبِيْل سے مراد (۱) یا تو بچے کا شکمِ مادر سے باہر آنے کا راستہ ہے جسے آسان بنا دیا گیا (۲) یا اسبابِ معیشت و روزگار ہیں جو آسان کر دئے گئے اور (۳) یا وہ نظرِ مستقیم ہے جو انسان کو ایمان کی طرف لاتی ہے اور اُس کی خداداد نعمتِ عقل اُس میں آسانی پیدا کر دیتی ہے۔

(۳) يٰأَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ o الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَ لَكَ o فِيْ أَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ o (الانفطار : ۶ تا ۸)

''اے انسان! تجھے (آخر) کس چیز نے اپنے رحیم و کریم پروردگار سے متعلق بھول میں ڈال رکھا ہے۔ (وہ پروردگار) جس نے تجھے پیدا کیا' پھر تجھے درست کیا' پھر تجھے اعتدال پر بنایا اور جس صورت میں بھی چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔'' (۶ تا ۸ : ۸۲)

سوال سے مقصود غیرت دلانا ہے کہ اِن نعمتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ تو ادائے شکر کرتا' چہ جائیکہ تو اس کی ناشکری پر آمادہ ہو گیا۔ جو مالک و مولیٰ ساتھ ساتھ رحیم و شفیق بھی ہو' اُس کے بارِ احسان سے تو سر اُوربھی ہرگز ہرگز نہ اٹھنا چاہئے۔ مَا شَآءَ میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کی صورت و سیرت تمام تر اللہ کے اپنے ارادہ ومشیّت کا نتیجہ ہے' باہر سے کوئی قوت اُس کے ارادہ کو مجبور یا متاثر کرنے والی نہیں۔

مادّی' حیاتیاتی' فلکیاتی' کائناتی اور ارضیاتی غرض تمام کے تمام اجسام کی تخلیق میں ماہرانہ انجنیئرنگ اور بے مثال کاریگری اور صناعی نظر آتی ہے جس کے متعلق قرآن مجید بلیغانہ اور فصیحانہ انداز میں یوں اشارہ کرتا ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (اَلنَّمل : ۸۸)

''یہ اُس اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط اور پختہ بنایا۔''

خود بیں اور محو بالذات انسان اس بات پر غور کیوں نہیں کرتا کہ ایک بند اُنار کے اندر کس نظم و ترتیب اور کس تناسب سے دانے پرو دئے گئے ہیں۔ کیا دنیا کے تمام ماہر انجنیئر اپنے تمام تر ہندسی آلات کے ساتھ اکٹھے ہو کر بھی ایسی معجزانہ ڈیزائننگ کر سکتے ہیں؟

(۳۸) ماحولیات ---ENVIRONMENT

''ہرنامیہ اور ذی حیات وجود (Organism) بہت سے خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ اِن اثرات میں زمین کا بالائی پرت (Soil)' ہوا' پانی' درجہ حرارت' کیمیائی عناصر' سورج کی روشنی کی مقدار' آندھی اور بہت سی دوسری چیزیں ہیں۔ اِن اثرات کو عام طور پر ماحولیاتی حالات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ذی حیات وجود پر اثر انداز ہونے والا تمام ماحولیاتی حالات کا مجموعہ اس کا ماحول ہی ہوتا ہے۔'' (Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 7, p. 568)

''ماحولیاتی مسائل: قدیم زمانہ میں دوسرے جانداروں کی طرح انسان بھی اپنے ماحول کی مطابقت و موافقت میں زندگی گزارتا تھا۔ تاہم کاشتکاری کے عمل کو شروع کرنے پر ماحول کے ساتھ اُس کے تعلق میں تبدیلیاں رُونما ہوئیں جس نے اُس کے رخ کو ویرانگی اور وحشت سے تہذیب کی طرف موڑا۔ خانگی زندگی اختیار کرنے سے اُس نے جانوروں کو پالنا اور اُنہیں چرانا شروع کیا جس کا نتیجہ زمین کی فرسودگی میں ہوا۔ گھریلو پودے اُگانے نے اُنہیں قدرتی نباتات کو ختم کرنے اور مختلف فصلوں سے متعارف ہونے کی طرف راغب کیا۔ پھر اُنہیں گھروں اور شہروں کے تعمیر کرنے کی بھی ضرورت ہوئی جس کے لئے اُنہیں لکڑی وغیرہ جیسے عمارتی سامان کی ضرورت پڑی۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہیں خوراک کی بھی ضرورت ہوئی جسے اُنہوں نے جانوروں کے ذبح کرنے سے پورا کیا۔''

''جب تک انسانی آبادی قلیل اور مشینی صنعت (ٹیکنالوجی) محدود رہے' ماحول پر انسانی اثر محدود رہا لیکن جب آبادی میں ترقی ہوئی اور مشینی صنعت میں وسعت ہوئی تو اُن کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی مسائل میں بھی اضافہ ہوا۔ صنعتی انقلاب جس نے زمین کے معدنی وسائل کے استعمال اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کو عام کر دیا' نے سطحِ زمین' اس کی فضا' اور اس کے پانی کی مقدار اور معیار کو تبدیل کرنے کی راہ ہموار کر دی۔ آج تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور جدید مشینی صنعت ماحولیات پر خاصا دباؤ ڈال رہے ہیں جو ماحول کے معیار اور زندگی کو قائم رکھنے میں اس کی استعداد میں ایک واضح اور مرئی تنزلی کا سبب بن رہے ہیں۔'' ("Environment and Islam" .. Dr. Saeedullah Qazi, pp. 3, 4)

''ماحولیاتی تعلیم: لوگ اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے اور وہ جدھر بھی چاہیں' ہر قسم کی چیز پھینک دیتے ہیں۔ اُنہیں ردّی' ناکارہ چیزوں کو موزوں جگہوں پر ڈالنے کا کوئی شعور ہی نہیں۔ بہت ہی اچھی سیر گاہیں بُرے طور سے استعمال کی جاتی ہیں۔ اُنہیں اِس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنا اُن کی اَخلاقی اور مذہبی ذمہ داری ہے۔ اپنے اِردگرد کے ماحول کا احساس دلانے کے لئے اُنہیں صحیح تعلیم دینے کی ضرورت ہے جو عوامی میڈیا بالخصوص ریڈیو' ٹیلیویژن اور اخبارات کے ذریعے ہو

سکتی ہے۔لیکن عوامی میڈیا پر تو حکومت کا کنٹرول ہے اور حکومت کو اِن اہم ذرائع ابلاغ و تعلیم کو ایسے مفید مقاصد میں لانے کا خیال ہی نہیں ہے۔اساتذہ اور علماء و فضلاء تک اِس ضرورت سے بے اعتنا معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے حلقہ کے لوگوں کو صاف ستھرے ماحول کی اہمیت کو سمجھائیں۔الغرض لوگوں کو خوش کن فضا مہیا کرنے کے لئے ہم میں سے ہر ہر فرد کو اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۲۲)

ہمارا مذہب اسلام مادّی اور روحانی دونوں طرح صاف ستھرے ماحول کو قائم رکھنے پر خاصا زور دیتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلام نے اندرونی یعنی دل و دماغ کی صفائی اور پاکیزگی سے ابتدا کی ہے جسے جسمانی پاکیزگی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔پیغمبرِ اسلام ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے :

أَلنَّظَافَةُ مِنَ الْإِيْمَانِ (صفائی جزوِ ایمان ہے)

یہی وجہ ہے کہ پانچوں نمازوں کے لئے وضو کرنا فرض کر دیا گیا (بحوالہ سورۃ المائدۃ' آیت ۶)۔دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنے سے جسم کے کسی ظاہر حصہ پر کسی قسم کی گندگی باقی نہیں رہے گی۔اِسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر یوں بیان فرمایا:

مَثَلُ الصَّلٰوتِ الْخَمْسِ كَمَثَلِ نَهْرٍ عَذْبٍ غَمْرٍ بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَقْتَحِمُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ فَمَا تَرَوْنَ ذٰلِكَ يَبْقَى مِنْ دَرَنِهٖ شَيْءٌ"؟ قَالُوْا : لَا قَالَ : فَإِنَّ الصَّلٰوتِ الْخَمْسَ تُذْهِبُ الذُّنُوْبَ كَمَا يُذْهِبُ الْمَاءُ الدَّرَنَ (صحیح مسلم)

''پانچ نمازوں کی مثال اُس میٹھی اور گہری نہر کی سی ہے جو تم میں سے کسی کے دروازے کے پاس سے گزر رہی ہو۔وہ اُس میں روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو۔تمہارا کیا خیال ہے کہ اُس کے جسم پر کوئی میل باقی رہے گی؟ صحابہ کرام نے کہا: نہیں۔آپ نے فرمایا: پانچ نمازیں بھی گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتی ہیں جس طرح پانی مَیل کو ختم کر دیتا ہے۔'' (صحیح مسلم)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ صاف ستھرا ذہن ہمیشہ صاف ستھرے جسم میں ہی ہوتا ہے۔ہفتہ میں کم از کم ایک دن (جمعہ) کو نہانا' صاف ستھرے جسم اور صاف ستھرے لباس کے ساتھ مسجد کو جانا' صاف ستھری جگہ پر نماز ادا کرنا اور جنسی عمل کے بعد غسلِ جنابت کرنا' صفائی و پاکیزگی کے اُسی سبق کی فروعات (شاخیں) ہیں۔دراصل جسمانی اور ذہنی دونوں بیماریوں کی بڑی وجہ گندگی اور غلاظت ہی ہوتی ہے۔نبی علیہ السلام کا ایک فرمودہ ملاحظہ ہو:

''ہر انسان کے لئے پانچ چیزیں قدرتی ہیں : ختنہ' زیرِ ناف کے بال مونڈنا' ناخن تراشنا' بغلوں کے بال دُور کرنا اور مونچھیں تراشنا۔''

ماحول کو صاف ستھرا اور خوش منظر رکھنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

(۱) ''گزرگاہ سے کسی ہڈی کا ہٹا دینا صدقہ (نیکی کا کام) ہے۔''
(۲) ''راستہ سے کسی مضر اور خطرناک چیز کا دور کر دینا صدقہ (نیکی کا کام) ہے۔''

ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں یہ دونوں احادیث بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے لوگوں کو درخت کے نیچے یا نہر کے کنارے یا پانی کی گزرگاہوں میں بول و براز (ٹٹی پیشاب) کرنے سے منع فرمایا کیونکہ لوگوں کو بعض اوقات آرام کے لئے درخت کے نیچے بیٹھنا ہوتا ہے' یا نہر اور آبی گزرگاہوں میں نہانا یا وضو کرنا ہوتا ہے۔ ان باتوں کا خیال نہ رکھنا ماحول کو غلیظ اور گندا کر دیتا ہے اور اسی لئے ان کی سختی سے ممانعت کر دی گئی ہے۔ (ایضاً صفحات ۴۷ تا ۴۹)

آپ نے شارع عام پر بیٹھنے' وہاں نماز ادا کرنے' وہاں ٹٹی پیشاب کرنے کی حوصلہ شکنی کی۔ شاہراہوں اور گزرگاہوں میں کسی قسم کی رکاوٹ کو آپ نے پسند نہیں فرمایا اور اس طرح آپ وہاں بلا رکاوٹ اور محفوظ ٹریفک کے حق میں تھے۔

ماحول کو پُرامن رکھنے اور زندگی کی بلا زحمت دوڑ کے لئے اسلام نے حقوق کے مطالبے کی بجائے فرائض کی ادائی پر زیادہ زور دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حقوق کا سوال فرائض کی ادائی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگ اپنے فرائض دیانتداری سے ادا کریں تو کسی بھی شخص کو اپنے حقوق کی طلب کی ضرورت نہیں رہے گی اور ہر شخص کو اپنے حقوق خود بخود ملتے رہیں گے۔ دراصل ایک آدمی کے فرائض دوسرے آدمی کے حقوق ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک آدمی کے حقوق دوسرے آدمی کے فرائض ہوتے ہیں۔ جب تک فرض بہترین صلاحیت اور ایمانداری کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے تو معاشرہ ہمیشہ پُرسکون' خوشحال' پُرامن' پُرمسرت اور ہر قسم کی غلاظتوں اور گندگیوں سے پاک رہتا ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۵۲)

ماحولیات کی درجہ بندی اس طرح کی گئی ہے:

(1) قدرتی ماحول: یہ اُن خارجی مادی عوامل یا مظاہر سے ترکیب پاتا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہیں۔ مثلاً آندھیاں' بارش' آفتاب' ستارے' پہاڑ اور سمندر وغیرہ۔ فضائی عفونت اور زمینی غلاظت خاص طور پر قدرتی ماحول پر اثر انداز ہونے میں بڑا اثر رکھتے ہیں۔ اس ماحولیاتی عامل کی بابت قرآن مجید یوں فرماتا ہے:-

(۱) أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ

''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں پڑی بہہ رہی ہوں اور اس کے لئے اُس (باغ) میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اُسے بڑھاپا آ چکا ہو اور اُس کے بچے کمزور ناتواں ہوں۔ اُس (باغ) پر ایک آتشیں بگولا آئے تو وہ (باغ) جل جائے۔
(البقرۃ: ۲۶۶)

''ذرا صورتِ حال کی حسرتناکی کا تصوّر تو کیجئے۔ ایک شخص کی عمر بھر کی کمائی ایک باغ ہے جو سرسبز' خوب پھلا پھولا ہوا اور ہر طرح کے میووں سے لدا ہوا ہے۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو جاتا ہے اور اب کسی محنت کے قابل نہیں رہا۔ بچے موجود ہیں مگر کمزور اور کمسن جو بجائے اس کے کہ روزی کمانے میں باپ کا ہاتھ بٹائیں' اُلٹا اُس کے لئے بوجھ بن رہے ہیں۔ عین اُس شدید ضرورت کے وقت اچانک معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں آگ لگی اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔ باغ کے مالک کے غم و حسرت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ اس سے کہیں لاکھوں گنا بڑھ کر اُس بدنصیب انسان کی حالت ہوگی جس کی آنکھیں زندگی بھر غفلت سے بند رہیں اور پہلی بار اُس وقت کھلیں گی جب چڑیاں سارا کھیت چگ گئی ہوں گی اور عمل کی مہلت بالکل ختم ہو چکی ہوگی اور اب وہ دیکھے گا کہ کوئی چیز بھی اُس کے دفترِ عمل میں ایسی نہیں جو اُس کے کام آسکے۔ اُس کی حسرت اور حرماں نصیبی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟'' (عبدالماجد دریابادی' ص ۱۱۲)

ازراہِ تمثیل بتانا یہ مقصود ہے کہ اُس شخص کا بھروسہ ظاہری طاعات و اعمالِ صالحہ پر تھا۔ وہ اپنے خیال میں نیک کام کر رہا ہے اور اپنی ساری توقعات اس سے لگائے بیٹھا ہے مگر ریاکاری کے بگولہ سے اُس نے اُن اعمال کو جلا کر بھسم کر دیا تو قیامت کے دن اُس کی حسرت' ندامت اور دل سوزی کا کیا عالم ہوگا۔ اگر تم اِس اندوہناک صورتِ حال سے دوچار نہیں ہونا چاہتے تو اپنے اعمال کو رِیا اور دکھلاوے سے بچاؤ۔

نوٹ : آتشیں بگولہ خارجی عوامل کا عکاس ہے اور باقی سارا بیان قدرتی ماحول کا مظہر ہے۔

(۲) وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَأَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (الاعراف : ۹۶)

''اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور پرہیزگاری اختیار کی ہوتی تو ہم اُن پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن اُنہوں نے تو جھٹلایا تو ہم نے اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں اُنہیں (اپنی) گرفت میں لے لیا۔'' (۷ : ۹۶)

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین' متقین کے لئے غیب سے کارسازیاں ہوتی رہتی ہیں اور برکاتِ سماوی و ارضی سے مراد بھی وہ کل چیزیں ہیں جو انجام کار کے لحاظ سے مبارک و مفید ہوتی ہیں۔ بلاؤں اور مصیبتوں سے حفاظت بھی اسی میں شامل ہے۔ ''فتح برکات'' سے مراد ہر امر میں آسانیاں پیدا کرنا ہے۔ اس آیت اور اس سے اگلی تین آیات (۹۷' ۹۸' ۹۹) سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عذابِ الٰہی سے قطعاً بے خوف ہونا کفر ہے۔

(2) مصنوعی ماحول: اس کا تعلق ہر اُس مادّی چیز سے ہے جسے انسانی عمل کافی حد تک تبدیل کر دے۔ مثلاً وسیع و عریض زیرِ کاشت قطعاتِ زمین' پشتے (ڈیم) اور بند جن کے ذریعے انسان دریاؤں کے پانی کو مفید مقاصد کے لئے موڑ لیتا ہے جس سے انسان کی اختراعی صلاحیت کی بدولت صنعت کا وسیع مشینی نظام وجود میں آیا:-

(۱) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ٥ (یوسف)
''(یوسف علیہ السلام نے) فرمایا کہ سات سال متواتر کاشتکاری کیئے جاؤ' پھر جو فصل کاٹو' اُسے اُس کی بالی ہی میں لگا رہنے دو سوائے تھوڑی سی مقدار کے کہ اُسی کو کھاؤ۔'' (۱۲: ۴۸)

(۲) فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ٥ (سَبا: ۱۶)
''سو اُنہوں (اہلِ سَبا) نے سرتابی کی' تو ہم نے اُن پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا اور ہم نے اُن کے دورویہ باغوں کے عوض دو باغ اور دیئے جو بدمزہ پھل اور جھاؤ اور قدرے قلیل بیری والے تھے۔''
(یعنی اُن کے قدرتی ماحول کو مصنوعی ماحول میں تبدیل کر دیا بوجہ اُن کے کرتوتوں کے)۔

اِس آیت اور اس سے اگلی آیت (۱۷) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طاعتِ الٰہی کو دُنیوی نعمت کے حصول اور معصیت کو اُس کے زوال میں دخل ہے۔ رہا سوال اللہ کے نافرمان دولتمندوں کا تو وہ ایمان والوں کی آزمائش کے لئے ہے۔

(3) <u>معاشری ماحول</u>: یہ ماحول ہمارے اَبنائے جنس کے سماج سے تشکیل پاتا ہے جن کا اثر ہم سب پر ہوتا ہے۔ سماج کا اثر نہ صرف انسان کی مادّی اور اقتصادی زندگی پر پڑتا ہے بلکہ اُس سے بڑھ کر اُس کے ذہنی اور اَخلاقی ماحول پر بھی ہوتا ہے۔ یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ فرد کی زندگی بہر حال سماج کے زیر اثر ہوتی ہے۔ سماجی ماحول ہمارے مصنوعی ماحول کو بھی متاثر کرتا ہے اور اگر سماج کا تعاون نہ ہو تو آرٹ' سائنس اور ٹیکنالوجی کے وجود بھی نہ ہوں:

(۱) وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (اَلنِّساء: ۱۴۰)
''اور اللہ تم پر یہ فرمان کتاب میں نازل کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر اور مذاق ہوتا ہوا سنو تو اُن لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں کہ اس حالت میں تم بھی یقیناً اُنہی جیسے ہو جاؤ گے۔'' (۴ : ۱۴۰)

منکرین کا استہزاء کفرِ اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور اُن کے جلسوں' محفلوں میں مسلمانوں کی شرکت محض فسق اور دین سے دُوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ سورۃ النساء مدنی ہے اور سورۃ الانعام مکی ہے جس کی آیت ۶۸ میں یہ الفاظ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھو) حکم مذکور دیا گیا تھا۔ بے دینی کا ہر مشغلہ' کفر و انکار کا ہر مظاہرہ اس کے تحت میں آ جاتا ہے۔ مسیحی یا ہندوانہ تعلیمی' تہذیبی و معاشری و سیاسی ماحول کے جو گہرے اثرات طبعی طور پر مسلمانوں پر پڑ رہے ہیں' وہ سب اس وعید کے تحت آ جاتے ہیں۔ حال ہی میں دشمنِ اسلام بلاک کی طرف سے بنائی گئی دل آزار فلم کے خلاف پورے عالمِ اسلام کے بھر پور احتجاج کا محرک اَلْحَمْدُ لِلّٰہ سورۃ النساء و سورۃ الانعام کی یہی دو آیات ہیں۔

یہاں بیٹھنے کے لفظی معنی لے کر یہ مراد نہیں کہ کھڑے ہونے کی اجازت ہے بلکہ یہ وسیع معنی میں ہے اور بے دینوں سے صحبت اور میل جول کی ہر صورت ناجائز ہے۔ گویا کہ اِن آیات میں مسلمانوں کو معاشری ماحول کے اثرات سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔

(۲) اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ (النساء: ۹۷)

''بے شک اُن لوگوں کی جان جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے جب فرشتے قبض کریں گے تو اُن سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اس ملک میں بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے کہ کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم میں اُس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔'' (۴: ۹۷)

یعنی دارالکفر اور دارالحرب میں رہ کر تم دین کے کن کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ ہجرت کو نہ نکلے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے ملک میں مغلوب اور بے بس تھے اور احکامِ الٰہی پر عمل کرنا ہمارے بس میں نہ تھا اس لئے ترکِ فرائض میں معذور رہے۔ فرشتوں کے جواب کے حوالہ سے فقہاء نے لکھا کہ جب ایک ملک میں رہ کر فرائضِ دین پوری طرح ادا نہ ہو سکتے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک ہے جہاں فرائضِ دین ادا ہو سکتے ہیں تو پہلے سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت واجب ہو جاتی ہے (تفسیر مدارک، تفسیر جصاص)۔

(۳) وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيۡنَ خُلِّفُوۡا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ اَنۡفُسُهُمۡ وَظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيۡهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوۡبُوۡا‌ ؕ (اَلتوبة: ۱۱۸)

''اور اُن تینوں پر بھی (توجہ فرائی) جن کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب زمین باوجود اپنی فراخی کے اُن پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور اُنہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اُس نے اُن پر رحمت سے توجہ فرمائی تا کہ وہ رجوع کرتے رہا کریں۔'' (۱۱۸ : ۹)

آیت میں اشارہ اُن تینِ انصار کی طرف ہے جن کے نام کعب بن مالک، ہلال بن اُمیّہ اور مرارہ بن ربیع تھے، جو صرف تقاضائے بشری کے تحت سستی (نہ کہ خود سری، سرکشی یا بد نیتی) کی بناء پر غزوہ تبوک میں پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ نہ جا سکے تھے اور آپ کی واپسی پر ان تینوں نے آپ سے برملا اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا تھا۔ اُنہیں حکمِ الٰہی کے آنے تک انتظار کرنے کو کہا گیا جس دوران تمام مسلمانوں کو اُن سے معاشرتی مقاطعہ کا حکم دیا گیا۔ یہاں اس آیت میں اُن کی ذہنی کیفیت کو ترسیمی صورت میں (graphically) بیان کیا جا رہا ہے کہ زمین باوجود اپنی فراخی کے اُن پر تنگی کرنے لگی تھی، اُن کا معاشرتی ماحول اُن پر تنگ کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے۔ روحانی طور پر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے اور اُنہوں نے اس حقیقت کو خوب خوب سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے خالق و مالک کے آگے سرکشی نہیں کر سکتے کیونکہ اُسی کا در بیکس پناہ سب کا ملجا و ماوی ہے۔ عذرِ لنگ کا سہارا لینے کی بجائے اُن کا یہ برملا

اعترافِ گناہ رب کو بھا گیا' اُنہیں پروانۂ مغفرت عطا ہوا اور الٰہی دامنِ عافیت و رحمت میں اُنہیں لے لیا گیا۔

یہیں سے فقہاء نے یہ استنباط کیا کہ دینی مجرم سے ترکِ سلام و کلام بالکل جائز اور درست ہے۔۔ اور یہ جو حدیث میں آیا کہ ترکِ کلام تین دن سے زیادہ جائز نہیں تو اس سے مراد دُنیاوی رنج و شکایت کا موقع ہے۔

معاشرتی اور روحانی خوشگوار ماحول پیدا کرنے میں حج ایک مؤثر محرّک ہے: جب ابراہیم علیہ السلام تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہو چکے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ایں الفاظ آپ کو حکم فرمایا:

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ o لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ o ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ o (اَلْحَجّ: ۲۷ تا ۲۹)

" اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو' لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو دُور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تا کہ وہ اپنے فوائد کے لئے آ موجود ہوں اور تا کہ ایامِ معلوم میں اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُنہیں عطا کئے ہیں' پس تم بھی اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔ پھر لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں' اپنے واجبات کو پورا کریں اور چاہئے کہ اس مقدّس گھر کا طواف کریں۔"

يَأْتُوكَ میں كَ بول کر جگہ مراد لی گئی۔ معنًا یہ دراصل يَأْتُوا بَيْتَكَ یا مَقَامَكَ ہے۔ (تفسیر نعیمی' جلد ۱۷' صفحہ ۷۴۹' لاہور اکتوبر ۱۹۹۹ء/ رجادی الثانی ۱۴۲۰ھ)

"اسلام کے ہر رکن اور ہر عبادت کی طرح حج کے فوائد و مصالح بھی بے شمار ہیں۔ انفرادی و شخصی بھی اور ملّی و اجتماعی بھی' مادّی اور روحانی بھی۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل بجائے خود سب سے بڑی روحانی عبادت ہے۔ پھر اسلام کے مولد' سردارِ اسلام کے وطن اور اُن تمام مقامات کی زیارت جن سے اسلام و سردارِ اسلام دونوں کی اوّلیں تاریخ وابستہ ہے' کس درجہ سبق آموز' ولولہ انگیز و مؤثر ہو سکتی ہے۔ دُنیوی و ملّی حیثیت کو لیجئے تو مسلمانانِ عالم کے درمیان تبادلۂ خیالات اور یک جہتی پیدا کرنے کے لئے نیز بین الاقوامی تجارت و سیاست کے لئے اس سالانہ عالمگیر اجتماع سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور افراد کو جو لمبے تجربے اور اکثر بحری سفر کے ہو جاتے ہیں وہ ان سب کے علاوہ ہیں۔" (دریابادی)

ایک انگریز مسلم خاتون بطور عینی شاہد کے حج کے متعلق یوں کہتی ہیں:

" کچھ حجاج نے افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا پار کر کے شارع حج کو پیدل طے کیا یا ایشیا کے بے آب و گیاہ میدانوں کو پا پیادہ اور اونٹوں پر طے کیا۔ کچھ حجاج جاوا اور سماٹرا کے فرحت انگیز جزیروں سے سمندری سفر کر کے آئے۔ بھارت' چین' مشرق و مغرب سے مہمانانِ گرامی اکٹھے ہوئے۔۔۔۔۔ دُور دراز ممالک سے کچھ

غریب لوگ راستے میں اپنے ننھے بچوں کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے یا اُن کی ٹانگوں کو اپنے کندھوں کی دونوں جانب لٹکائے ہوئے تھے اور اس طویل سفر میں کچھ بچوں کا جنم بھی ہوا۔'' ("Pilgrimage to Mecca"
... Lady Cobbold

''منبعِ اسلام (مکۂ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ) کی زیارت' اُس مقدس زمین میں پہنچنے کا شرف جس سے گم کردہ راہ' انسانیت کو ایک خدائے واحد کی طرف بلانے کی کوشش میں محمد ﷺ کی طویل جدّ وجُہد اور مصائب و آلام کی یادیں وابستہ ہیں' یہ سب کچھ قربانی اور شہادت کے شاندار زمانوں کو زندہ کرنا ہے اور اپنی روح کو اُس آسمانی روشنی سے منوّر کرنا ہے جس نے تمام روئے زمین کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ لیکن اسی پر بس نہیں ------ اگر اسلام کی بکھری ہوئی توانائیوں کو کوئی چیز متحد کر سکتی ہے اور اُنہیں سچا اور خالص جذبہ ایثار و ہمدردی عطا کر سکتی ہے تو وہ صرف حج ہے' جس میں فاصلے اور مسافتیں ختم ہو کے رہ جاتی ہیں' فرقہ واریت کے اختلافات اُڑن چھو ہو جاتے ہیں' رنگ و نسل کے امتیازات کا وجود اُس ہم عقیدگی میں ختم ہو جاتا ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک عظیم اخوّت کے رشتہ میں جوڑ دیتی ہے اور اُنہیں اپنی شاندار وراثت کا احساس دلاتی ہے۔ مذہبی فرائض (مناسکِ حج) ادا ہو جانے کے بعد تمام ممالک کے تاجر تجارت اور سوداگری کے معاملات زیر بحث لاتے ہیں اور باہم تجارت اور لین دین کرتے ہیں۔ علماء اور فقہاء مذہبی اور فقہی مسائل کو' سائنسدان سائنس میں تازہ ترین پیشقدمیوں کو' ادیب حضرات ادب اور لٹریچر کو' ماہرینِ مالیات امورِ مال کو' سیاستدان اور مدبّرین و ماہرینِ سیاست قومی اور بین الاقوامی سیاست کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔'' (ایضاً' تعارفی سطور صفحات ۱۶ تا ۲۷)

''نسلِ انسانی کی ہم کاری (League) کے تصوّر کو دراصل زیادہ مؤثر طور پر اسلام نے پروان چڑھایا ہے کیونکہ لیگ آف نیشنز جو دینِ محمدی کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی' کے نزدیک نسلِ انسانی کی مساوات اس قدر اہم ہے کہ اس نے دوسرے ادیان کے لوگوں کا سر شرم کے مارے جھکا دیا ہے۔'' (ایضاً' صفحات ۱۷ تا ۲۸)

''تمام مذاہبِ عالم میں اسلام نے کم از کم اپنے سماج میں رنگ و نسل اور قومیت کے امتیازات کو ختم کرنے میں خاصی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ صرف مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان خطِ فاصل کھینچ دیا گیا ہے۔ حج کے اِن اجتماعات نے بلا شک وشبہ خاطر خواہ نتیجہ کے حصول میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔ مزید برآں یہ اجتماعات مختلف مکاتبِ فکر کے خیالات کی اُن لوگوں میں تشہیر کا بہترین موقع مہیا کرتے ہیں جو اُن علاقوں سے آئے ہوتے ہیں جو رسل و رسائل کے جدید ذرائع سے آپس میں جڑے ہوئے نہیں ہیں اور پریس کی آواز بھی تا حال اُن تک نہیں پہنچ پائی۔ شمالی افریقہ میں سنوسی تحریک اپنے آغاز اور ابتدائی تشہیر میں اُس ارتباطِ باہمی کی رہینِ منّت ہے جو مکہ کے حج نے مہیا کیا ہے۔'' ("Islam.... A Way of Life ---- P. K. Hitti, p. 136)

''کوئی بھی مذہبی نابغہ (غیر معمولی ذہنی یا تخلیقی صلاحیت رکھنے والا) مسلمانوں کے ذہنوں میں اُن کی مشترک

زندگی اور باہمی انخوّت کے احساس کونقش کرنے کا تصور تک آج تک نہیں کر سکا۔ مشترک عبادت کا عظیم نظارہ یہاں ملتا ہے۔ افریقہ کے مغربی ساحل کا حبشی مشرقِ بعید سے آئے ہوئے عیسائی سے ملتا ہے۔ شائستہ اور مہذّب عثمانی ملائشی سمندر کے دُور دراز کونے سے آئے ہوئے اپنے مسلمان بھائی کو اُس بے آب و گیاہ جزیرہ عرب میں پہچان لیتا ہے۔'' ("Preaching of Islam" ... T.W. Arnold, p. 415)

سماجی/معاشرتی ماحول کا انسان کے اطوار و عادات پر اثر انداز ہونا ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کا ثبوت بُت پرست ملکہ سبا (بلقیس) جیسی عاقل و صاحبِ فہم خاتون میں ملتا ہے کہ بُت پرستی اُس کی دانش و فہم میں کمی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اُس وقت کے معاشرتی ماحول کے اثر کا نتیجہ تھی۔ اُسے بُت پرستی کی عادت اس لئے پڑی تھی کہ اُس نے آنکھ کھول کر اپنے اردگرد کفر ہی کفر دیکھا تھا اور اِسی وجہ سے وہ علانیہ طور پر اپنے موحّد ہونے کا اعلان نہ کر سکی تھی جس توحید کے پرچار کے لئے سلیمان علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِيْنَ ٥ (اَلنَّمل : ۴۳)

''اور اُسے غیر اللہ کی عبادت نے (اللہ کی عبادت سے) روک رکھا تھا اور وہ کافر قوم کی تھی۔'' (۲۷:۴۳)

'' معاشرتی ماحول کے حوالے سے اسلام کو یہ بات تسلیم ہے کہ انسان فطرتاً سماجی مخلوق ہے۔ وہ نہ تو تن تنہا اکیلا رہ سکتا ہے اور نہ ہی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو اکیلا پورا کر سکتا ہے بلکہ اُسے اس ضمن میں اپنے اَبنائے جنس کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ لفظ ''انسان'' (جس کا مصدر ''اُنس'' ہے) کا (بدیہی) معنی ہی محبت اور اُنس کرنے والے کے ہیں، اُنہیں حیاتِ باہمی، ترقی اور نمو کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے۔ کامیاب زندگی کی حقیقت کو پانے کے لئے ''تنازع للبقاء'' کی بجائے ''تعاون للبقاء'' ہونا چاہیئے۔ مؤخر الذکر (یعنی تعاون للبقاء) سے ایک خوش کن، دوستانہ اور کامیاب زندگی میسر آتی ہے جو ہر قسم کی عفونت اور غلاظت سے پاک ہوتی ہے جبکہ اوّل الذکر (یعنی تنازع للبقاء) دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور اپنا پیٹ بھرنا سکھاتی ہے۔ تعاون للبقاء میں بے غرضی، محبت و مودّت اور ہمدردی و غمگساری ہوتی ہے جبکہ تنازع للبقاء میں خود غرضی، بغض و نفرت اور استحصال ہوتے ہیں۔ اسلام تعاون للبقاء کی حوصلہ افزائی اور تنازع للبقاء کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔''

''اپنے روز مرّہ معاملات کی تنظیم کے لئے بنی نوعِ انسان کو قانون اور اُس قانون کو نافذ کرنے والے مختارِ کار (اتھارٹی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قانون عوام کی خواہشات کے مطابق اگر انسان کا بنایا ہوا ہو، تو اُس میں ہر قسم کے جھول اور خامیاں ہو سکتی ہیں، جیسا کہ قرآن مجید نے اس آیت میں اشارہ فرمایا:

وَاعْلَمُوْا أَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللهِ ۚ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ (اَلْحُجُرات : ۷)

''اور جانے رہو کہ تم میں رسول اللہ (موجود) ہیں۔ بہت سی باتیں اَیسی ہیں کہ اُن میں اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو تمہیں تکلیف پہنچے۔'' (۴۹ : ۷)

ہر خامی اور نقص سے خالی اور ہر طرح کا مکمل قانون صرف اور صرف الٰہی قانون ہی ہوسکتا ہے جس میں اللہ مقتدرِ اعلیٰ اور تمام اختیارات کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے اور اُس کی مشیّت یعنی قرآن اور سنت رسول قانونِ اعلیٰ ہے۔ اللہ کا نائب ہونے کی حیثیت سے انسان اِس مقتدرِ اعلیٰ ہستی کے احکامات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر ایک نائب اپنے سے برتر کے احکامات کو نظرانداز کردے اور اپنے ارادے اور خواہشات کو قانون کے طور پر عائد کرے تو وہ نائب نہیں رہتا بلکہ وہ ایک باغی ہوتا ہے جس نے اپنے آپ کو خود اس قابل بنا لیا ہے کہ اُسے منصب نیابت سے نکال باہر کیا جائے اور معزول کردیا جائے۔''

''انسان کے بنائے ہوئے قانون کو ضابطہ حیات کے طور پر تسلیم کرلینے سے انسان نائبِ خدا نہیں رہتا بلکہ ایسا کرنے میں اُس نے اللہ کے خلاف بغاوت کی ہے اور اس لئے وہ قرآنی فیصلہ کے مطابق ''کافر' ظالم اور فاسق'' ہے (بحوالہ سورۃ المَائِدة آیات ۴۴'۴۵'۴۷)۔

''دنیاوی مفادات پر مبنی ایسے ضابطہ کو قبول کرنے میں اُس نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کی ہے جو ظلم و تعدی' استحصال اور بے انصافی کا منبع ہے۔ لہٰذا اُس کے اس عمل نے ماحولیات کو حد درجہ تک خراب کردیا ہے۔ اللہ اور اس کے پیغمبر ﷺ کے خلاف جنگ کرنے میں وہ یقیناً خسارہ میں ہے۔ جب تک وہ دنیاوی مفادات پر مبنی ایسے نظام کو مسترد کرتے ہوئے مبنی بر انصاف اور فساد و غلاظت سے پاک زندگی کو اپنا نہیں لیتا' وہ پُرامن' پُرمسرّت ماحول میں نہیں رہ سکتا۔ قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ کو قانونِ اعلیٰ کے طور پر تسلیم کرنے اور اس کے نفاذ ہی سے اُس کی اپنے خالق و رازق اللہ سے مصالحت ہوسکتی ہے۔ انسان کے اِس باغیانہ رویّہ ہی نے ماحولیات کو پراگندہ اور آلودہ اور ناقابلِ برداشت بنادیا ہے۔''

'' اِس الٰہی نظام میں رئیسِ ریاست نائبِ خدا ہوتا ہے جو حدود اللہ سے تجاوز نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کے لئے شفقتِ پدری کا حامل اور اُن کا راہ نما ہوتا ہے اور اس ناطے سے وہ بہ دل و جان لگن اور خلوص کے ساتھ اُن کی خدمت کرتا ہے۔ اُس کی تمام تر کوشش شریعت کی قائم کردہ حدود کے اندر لوگوں کو خوش باش' خوشحال اور منظم رکھنے میں ہوتی ہے۔ ہر شخص کو انصاف اور مفت تعلیم کا حق پانے کی رسائی حاصل ہوتی ہے۔ تمام کلیدی اور ذمہ دار عہدے اہلیت اور تقویٰ کی بنیاد پر مستحق افراد کو تفویض کئے جاتے ہیں۔ سربراہِ مملکت بے سہارا' بے یار و مددگار لوگوں' یتیموں اور بیوگان کا نگران اور سرپرست ہوتا ہے۔ وہ (بیت المال سے) اُن لوگوں کا فدیہ ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے جن کے قاتلین نامعلوم ہیں اور وہ اُن لوگوں کا قرض (بیت المال سے) چکاتا ہے جو اس کی ادائیگی کے قابل نہیں ہیں۔''

''ان تمام خدمات کے عوض لوگ تمام قوانین اور ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے فرائض اپنی بہترین صلاحیتوں اور علم و ہنر کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ وہ حکومتی اثاثوں کو امانت سمجھتے ہیں اور مشکل وقت اور ہنگامی حالات میں حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ حکومت کے دوش بدوش وہ بدی' ظلم و تعدی' بے انصافی کے خلاف نبردآزما ہوتے ہیں'

انصاف، امن، نیکی اور راستی کی ترویج وتحفظ میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ ہر شہری دوسروں کے لئے مثل آئینہ ہوتا ہے اور کسی مبالغہ کے بغیر اور اُس کی عزت کو نقصان پہنچائے بغیر وہ خاموشی اور اطمینانِ قلبی کے ساتھ اُسے اُس کی خوبیوں اور خامیوں سے مطلع کرتا ہے۔ ایسے مثالی ماحول اور ایسے دوستانہ، برادرانہ اور پُر امن فضا میں رہنا گویا جنّتِ ارضی میں رہنا ہے جو ہر قسم کی عفونت اور گندگی سے پاک ہوگی۔'' ("Environment and Islam" --- Dr. Saeedullah Qazi, pp. 56-58)

(4) نفسیاتی ماحول : وہ اندرونی توانائیاں جو نفسِ انسانی کا جزوِ لازم ہوتی ہیں اور اس پر اثر انداز ہوتی ہیں، سب نفسیاتی ماحول میں شامل ہیں جس کے متعلق قرآن مجید یوں فرماتا ہے :

(۱) وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (الانعام : ۱۰۸)

''اور اُنہیں برا بھلا مت کہو جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے رہتے ہیں ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر اللہ کو براہِ جہل بُرا بھلا کہنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر طریق کے لوگوں کی نظر میں اُن کا عمل خوشنما بنا رکھا ہے۔'' (۶ : ۱۰۸)

آیتِ بالا کے آخری حصّہ میں انسانی نفسیات کے پہلو کو اجاگر کیا جا رہا ہے کہ جب ہر شخص کے نزدیک اُس کا طریق، عقیدہ اور طرزِ حیات ''ہم شا دیگرے نیست'' کے مصداق پسندیدہ اور صحیح ہے اور وہ اپنے ہی مزعومات و معتقدات اور اپنی آئیڈیالوجی ہی میں مست ہے تو وہ کیسے دوسرے کی بات کو سننے کے لئے تیار ہوگا۔ لہٰذا انسانی نفسیات کے اسی پہلو کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو حکمِ مذکور دیا گیا اور دوسری وجہ یہ کہ کہیں وہ لوگ تمہارے سچے خدا اور سچے دین کو ازراہِ انتقام بُرا بھلا نہ کہنے لگیں۔

آیت سے سدِّ ذرائع کا قانون اخذ کیا گیا کہ ''جو کام کسی برائی کا ذریعہ بنے، اُسے روکنا اور اُس کا نہ کرنا واجب ہے (بتوں کو برا بھلا کہنا ایک امرِ مباح ہے لیکن چونکہ اس سے برائی اور فساد کا خطرہ تھا، اس لئے اس سے روک دیا گیا)۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ بعض اوقات کسی حقدار کو اُس کا حق وصول کرنے سے اس لئے روک دیا جاتا ہے کہ اُس کی وجہ سے دین میں کسی ضرر کے پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔'' (تبیان القرآن، ج ۳، ص ۶۲۶)

(۲) وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (القصص : ۳۸)

''فرعون نے کہا: اے اہلِ دربار! میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لئے میرے سوا کوئی اور معبود ہے، پس اے ہامان! تو میرے لئے آگ جلا اور اُس پر اینٹیں پکوا، میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کر۔ شاید (اُس پر چڑھ کر) میں موسیٰ کے خدا کا سراغ لگاؤں اور میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔'' (۲۸:۳۸)

اونچا مینار تعمیر کرنے کا فرعونی منصوبہ پورا ہوا یا نہیں' اس کی بابت فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ فرعون نے یہ بات ایک نفسیاتی ماحول پیدا کرنے کے لئے کی تھی تا کہ لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی جائے کہ بادشاہ سلامت موسیٰ کے دعوٰی کی تحقیق کر رہے ہیں۔ جب تک اُس تحقیق کے نتائج سامنے نہ آ جائیں' ایک نووارد کی بات سن کر اپنے قدیم عقائد کو ترک کر دینا بڑی جلد بازی ہے۔ فرعون اچھی طرح یہ بات سمجھتا تھا کہ جب ایک مرتبہ موسیٰ کی دعوت کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی تو پھر کون اتنی زحمت اٹھا کر یہ پوچھنے آئے گا کہ جہاں پناہ! آپ نے جس تحقیق کا وعدہ کیا تھا' اُس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس بلند مینار کو تعمیر کرنے کا حکم آپ نے ہامان کو دیا تھا' وہ کہاں بنایا گیا۔ (تفسیر کبیر بحوالہ ضیاء القرآن' جلد سوم' صفحہ ۴۹۲)

(5) روحانی (مذہبی) ماحول : سماج کے وہ افراد جو روحانی اَقدار کے تحت سے پابند ہوتے ہیں' دراصل وہی لوگ انسانی اور اخلاقی اقدار کے حامل ہوتے ہیں۔ روحانی ماحول میں اخلاقی اقدار کی ترویج و ترقی کے لئے تمام افراد ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور اس طرح وہ اعلیٰ اخلاقی ضابطوں کے حصول میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے ماحول میں نہ تو کوئی دشمنی اور کشیدگی ہوتی ہے' نہ ہی بدخواہی' نہ ہی طعن و طنز یا بغض و کینہ' نہ کوئی دھمکی اور تخویف (بلیک میلنگ) اور نہ ہی ٹانگ کھینچنا ہوتا ہے۔ افرادِ معاشرہ کے نزدیک طاقت و منصب' نام و نمود کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ اس کہاوت (قولِ معروف) کا مطلب بخوبی سمجھتے ہیں کہ ''آج اگر آپ خوشحال ہیں تو دوسروں کی مدد کیجئے' (خدانخواستہ) اگر کل آپ غریب و محتاج ہو گئے تو دوسرے آپ کی مدد کریں گے۔'' اُن کی مساعی اور جِدّ و جُہد ایک ہی نکتہ کے گرد گھومتی ہیں اور وہ خالقِ کائنات کی رضا کا حصول یا کم از کم ''اپنی ذات سے پہلے دوسروں کی خدمت'' ہے۔ اپنے بھائیوں کی خدمت میں پیش آنے والے خطرات اور مشکلات سے وہ حوصلہ نہیں ہارتے۔ مصیبت میں وہ پریشان نہیں ہوتے اور جب دوسرے لوگ اُن سے بدسلوکی کرتے ہیں تو وہ غضبناک نہیں ہوتے۔ قرآن مجید ایسے مثالی ماحول کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے :۔

(۱) اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاس (آلِ عمران:۱۳۴)

''وہ جو فراغت اور تنگی (دونوں حالتوں میں) خرچ کرتے ہیں' اور غصّہ کے ضبط کرنے والے ہیں' اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔'' (۳: ۱۳۴)

''اہلِ تحقیق نے یہ خوب لکھا ہے کہ یہاں فَاقِد'' مِنَ الۡغَیۡظ ارشاد نہیں ہوا یعنی مدح اُس کی نہیں آئی کہ غصّہ سرے سے آتا ہی نہ ہو بلکہ اُس کی آئی ہے کہ غصّہ کو قابو میں رکھا جائے اور عقل جذبات کے اوپر حاکم رہے۔ غصّہ حرارتِ طبعی یا حمیّت سے پیدا ہوتا ہے' اُسے سرے سے فنا کر دینا اسلام کو ہرگز مقصود نہیں بلکہ مقصود اُسے حدود کے اندر رکھنا ہے۔ غصّہ مطلق صورت میں ہرگز ممنوع نہیں' نہ شرعاً گناہ کی بات اور نہ عقلاً مُضر ہے۔ بلکہ اگر حدود کے اندر رہے اور مناسب موقع پر پیدا ہو تو عیب نہیں' ہُنر ہے۔ غصّہ کے ضبط کر جانے کی فضیلتیں حدیثِ نبوی میں بہ کثرت آئی ہیں' مثلاً زبانِ رسالت نے فرمایا : مَنۡ کَظَمَ غَضۡبًا وَھُوَ یَقۡدِرُ عَلٰی اِنۡفَاذِہٖ مَلَأَ اللّٰہُ قَلۡبَہٗ اَمۡنًا

وَّاِیْمَانًا (یعنی قدرتِ نفاذ کے باوجود جو شخص اپنے غصہ کو روک لے تو اللہ اُس کا دل امن وایمان سے لبریز کر دے گا) اَلْعَافِیْنَ عَنِ النَّاس یعنی لوگوں کے قصوروں اور خطاؤں کو معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں کہ باوجود قدرت و استطاعت خطا وار سے انتقام نہیں لیتے بلکہ اُسے معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہ درجہ اَلْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ سے بلند تر ہے۔ وہ اگر محض ایک سلبی کیفیت تھی تو یہ ایک ایجابی مرتبہ ہے۔ پھر مُحسنین کا درجہ کاظمین و عافین دونوں سے بلند تر ہے یعنی عفو سے بھی آگے بڑھ کر یہ اور حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم کے موقع پر قرآن نے اکثر تدریج کو پیشِ نظر رکھا ہے جس کی بہترین مثال یہ آیت ہے۔ تینوں مقامات فضیلت کے ہیں لیکن یہ تیسرا مقام فاضل ترین ہے۔'' (عبدالماجد دریابادی' اردو حاشیہ صفحہ ۱۵۵)

(۲) وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (اَلْحَشر : ۹)

''اور وہ اپنے سینوں میں کوئی خلش اُس چیز کے بارے میں نہیں پاتے جو مہاجرین کو دے دی جائے اور اُنہیں اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود فاقہ میں ہوں۔'' (۵۹:۹)

''جہاں تک مذہبی ماحول کی بات ہے تو مسلمانوں کو قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کے راستہ سے ایک موافق مذہبی فضا مہیا کر دی گئی ہے تاکہ وہ تعلیماتِ اسلامی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ ہر مسلمان سے ایمان کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرائی کا تقاضا کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ کسی بھی قیمت پر اُن کا سودا نہ کریں۔ قرآن اور سنتِ رسول' ملک کا قانونِ اعلیٰ ہونا چاہئے اس لئے کہ شریعتِ اسلامی کے اصل مصادر قرآن' پھر سنتِ رسول اور بعدہ' صحابہ کرام کا اجتہاد ہے۔'' (سعید اللہ قاضی' صفحات ۵۵' ۵۶)

(6) مادیّت (لامذہبیت Secular) کا ماحول: قرآنی تقاضا کے برعکس مادیّت گزیدہ سماج کی جانب سے خاطر خواہ مثبت نتائج کی توقع نہیں ہو سکتی۔ یہ مادیّت گزیدہ لوگ اوپر بیان شدہ ''روحانی ماحول'' کے افراد کے اُلٹ ہوتے ہیں۔ یہ محو بالذات' مغرور و متکبر' خود غرض طبقہ ہوتا ہے جو طاقت و اختیار' عہدہ و منصب اور مالی منفعتوں کا بھوکا ہوتا ہے۔ اُن کی تمام تر دلچسپی اس بات میں ہوتی ہے کہ اُن کی ایک پائی بھی نہ جائے پائے اگر چہ اُن کے ساتھیوں کو لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہو جائے۔ انسان دوستی' محبت و مودّت' بھائی چارہ' انسانوں کی خیر خواہی' نفس کُشی اور قربانی کے ناموں سے وہ بیگانہ ہوتے ہیں۔ اپنے محروم القسمت اَبنائے جنس کے خرچ پر وہ عیاشانہ مشاغل میں سرمست رہتے ہیں۔ اُنہیں صرف اور صرف اپنی ذات کا خیال ہوتا ہے اور اُن کے دلوں میں دوسروں کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے اُن کا منتہائے مقصود دنیاوی مسرتیں اور لذتیں ہیں :

اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ۝ (الاحقاف : ۲۰)

''تم اپنی لذت کی (سب) چیزیں دنیا ہی میں حاصل کر چکے اور اُن کا خوب مزہ اُٹھا چکے' سو آج تمہیں ذلت کی سزا دی جائے گی' اس لئے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لئے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔'' (۲۰ : ۴۶)

مادیّت کے ماحول کا جو سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پیداوار ہے' نقشہ قرآن مجید نے اس طرح باندھا ہے:

(۱) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِيْنَo (الانعام : ۵۳)

''اور اس طرح ہم نے اُن میں سے ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے جس سے یہ لوگ کہیں گے کہ کیا ہمارے درمیان میں سے یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے اپنا فضل کیا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے خوب واقف نہیں ہے؟'' (۵۳ : ۶)

(۲) إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَo وَابْتَغِ فِيْمَا آتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَo قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَo فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوْتِيَ قَارُوْنُ إِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍo وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَا إِلَّا الصَّابِرُوْنَo (اَلْقَصَص : ۷۶ تا ۸۰)

''قارون موسٰی کی قوم میں سے تھا' سو اُس نے اُن کے خلاف گھمنڈ اختیار کیا اور ہم نے اُسے اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ اُس کی کنجیاں زور آوروں کی ایک جماعت کو گراں بار کر دیتی تھیں۔ جب اُس کی قوم نے اُسے کہا کہ اِترا مت' کہ اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے' اُس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر اور دُنیا سے (بھی) اپنا حصّہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے' تو بھی (بندوں کے ساتھ) حُسنِ سلوک سے پیش آ اور روئے زمین پر فساد مت پھیلا' بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ کہنے لگا: مجھے تو یہ سب میری ہنرمندی سے ملا ہے۔ کیا اُسے یہ خبر نہ تھی کہ اللہ اُس سے پہلے کی اُمتوں میں ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو طاقت میں بھی اُس سے بڑھے ہوئے تھے اور جمعیت میں بھی اور مجرموں سے اُن کے گناہوں کی بابت سوال نہیں کرنا پڑتا۔ پھر وہ اپنی قوم والوں کے سامنے اپنے تجمّل و آرائش کے ساتھ نکلا۔ جو لوگ دنیوی زندگی کے طالب تھے' بولے: کاش ہمیں بھی ایسا (ساز و سامان) ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے' بے شک وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ اور جن لوگوں کو

(دین کی) فہم عطا ہوئی تھی، وہ بولے: تمہارا ناس ہو، اللہ کے ہاں کا ثواب کہیں بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ تو صرف صبر کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔'' (۷۶ تا ۸۰ : ۲۸)

اوپر کی خط کشیدہ سطور میں دنیا داروں اور اللہ والوں کی ذہنیت کا تقابل قرآنِ حکیم نے کس مؤثر انداز میں پیش کیا ہے جن کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں اُخروی انعامات کے مقابل اِس دنیا کی منفعتوں کے خلاف زہر آلود نفرت بھر جاتی ہے اور اُس کا سر بے اختیاری طور پر اپنے خالق و مالک کے حضور جھک جاتا ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ علم و فن کی مہارتوں سمیت فانی انسان پر تمام نوازشات اُس خالقِ لم یزل کی طرف سے ہو رہی ہیں، کسی ذاتی غرض و غایت یا منفعت کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی مخلوقات پر بہت ہی مہربان اور شفیق ہے (بحوالہ قرآنی آیات ۲۰۷ : ۲ ؛ ۳۰ :۳)۔

(۳) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (یٰسٓ : ۴۷)

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے، اُس میں سے خرچ کرو تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھانے کو دیں جنہیں اگر اللہ چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دے دے، تم تو نری کھلی غلطی میں پڑے ہوئے ہو۔'' (۴۷ : ۳۶)

متکبرین رؤسائے قریش سے جو خالصتاً مادیّت گزیدہ تھے، جب کہا جاتا کہ غریبوں، مسکینوں کی مدد کرو (جو عموماً مسلمان تھے) تو وہ طنزیہ یہ جواب دیتے کہ ہم سے ان غریبوں کی مدد کو کہتے ہو حالانکہ تم یہ بھی کہتے ہو کہ تمہارا خدا رزّاقِ مطلق ہے۔ وہ جسے چاہے روزی دے تو وہ خود اُنہیں روزی کیوں نہیں دیتا؟ یہ طنز عجیب مہمل تھا۔ اللہ کی رزّاقی بھی تو اُس کی ہر صفت کی طرح اسی عالم اسباب میں انسانوں ہی کے واسطہ سے ظہور کرتی ہے۔ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کب تھا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں عادۃً رزّاق بلا واسطہ اور بلا ذریعہِ اسباب ہے۔''

(عبدالماجد دریابادی، اردو حاشیہ صفحہ نمبر ۸۸۸)

(۴) سورۃ الْقَلَم (۶۸) کی آیات ۱۷ تا ۳۳ میں بیان شدہ قصّہ کا ماحصل یہ ہے کہ جو اہلِ غفلت اپنی تدبیروں پر نازاں اور اہلِ حقوق کی حق تلفی میں لگے رہتے ہیں وہ آخر خود ہی خسارہ میں رہتے ہیں کیونکہ یہ باغ والے خدا فراموشی اور آخرت فراموشی کے ساتھ ساتھ مسکینوں، محتاجوں کے حصّہ کے بھی روادار نہ تھے۔

''__ماحول کی حفاظت__ : پچھلی چند صدیوں سے صنعتی اور سائنسی ترقی کو استعمال کرتے ہوئے یورپی اور امریکی اقوام نے جس بے رحمی سے زمینی ماحول کو نقصان پہنچایا ہے، اب اس سے انسان کی اپنی بقاء خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ ہزاروں قسم کی نباتاتی اور حیوانی زندگی ناپید ہو چکی ہے۔ ماحول کی اس قدر خرابی کے بعد اب جا کر دنیا میں یہ

احساس پیدا ہو رہا ہے کہ زمینی ماحول کو خراب ہونے سے بچایا جائے ورنہ زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ افسوس کہ انسان نے قرآن مجید کو نظرانداز کر رکھا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے چودہ صدیاں پہلے انسان کو وارننگ دی تھی:

وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا وَادۡعُوۡهُ خَوۡفًا وَّطَمَعًا (الاعراف : ۵۶)

''اور ملک میں اُس کی درستی کے بعد فساد نہ پھیلاؤ۔ اور اللہ کو ڈر کے ساتھ بھی اور آرزو کے ساتھ بھی پکارتے رہو۔'' (۵۶ : ۷)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماحول کو خراب کرنا نہ صرف ایک ظلم ہے بلکہ ایک بہت بڑا جرم بھی ہے جس کی سزا سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔'' (''قرآن پاک ایک چیلنج' ایک سائنسی معجزہ''۔۔۔میجر (ر) امیر افضل خان' صفحات ۱۴۷' ۱۴۸) جولائی ۲۰۰۸ء' دارالحکمت انٹرنیشنل اسلام آباد۔

انسانی زندگی میں ماحولیات کی اہمیت : قرآن مجید جو تمام نوعِ انسانی کا نجات دہندہ اور خیرخواہ ہے' نے مختلف مقامات پر ہمیں یہ سبق دیا ہے:

(۱) وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ٥ (البقرۃ: ۶۰ ؛ ھود: ۸۵ ؛ الشعراء : ۱۸۳)

''اور زمین پر فسادی بن کر مت پھرو۔'' (۶۰ :۲ ؛ ۸۵ : ۱۱ ؛ ۱۸۳ : ۲۶)

(۲) وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا وَادۡعُوۡهُ خَوۡفًا وَّطَمَعًا (الاعراف : ۵۶)

''اور ملک میں اُس کی درستی کے بعد فساد نہ پھیلاؤ۔ اور اللہ کو ڈر کے ساتھ بھی اور آرزو کے ساتھ بھی پکارتے رہو۔'' (۵۶ : ۷)

فَسَادٌ فی الارض کا معنی قائم شدہ خاطرخواہ نظام کو خراب کرنا ہے جس کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ یہ چیزوں کے اُس الٰہی نظام کو مکمل طور پر درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے جو اُس نے اپنی مخلوقات کی خوش آئند بقا اور مکمل توازن کا پروگرام انتہائی موافقت کے ساتھ بنایا ہے۔ اس توازنی ڈیزائن کے متعلق قرآن مجید سورۃ المُلک میں فرماتا ہے:

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ٥ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ ٥ (اَلۡمُلک : ۳' ۴)

''تو (خدائے) رحمٰن کی صنعت میں کوئی فتور نہیں دیکھے گا' سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے' کہیں تجھے کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ' نگاہ (ہی آخر) ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔'' (۳' ۴ : ۶۷)

فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ محققین نے کہا کہ یہ پہلی نظر عوام کی ہے جو صرف وجود اور حسنِ ظاہر دیکھ کر کمالِ صانع کے

قائل ہو جاتے ہیں۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ اہلِ نظر نے کہا کہ یہ دوسری نظر اہلِ نظر و اہلِ حکمت کی ہے جو ہر ہر مخلوق کے مصالح کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ جو نظمِ تکوینی موجود ہے اس سے بہتر ہونا محال تھا اور اس پر حرف گیری کی مجال نہیں۔ یَنقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ عارفین نے کہا کہ یہ تیسری نظر خواص اہلِ حق کی ہے جو اپنی نظر سے خود نادم ہو کر اپنے عجز و جہل کے معترف ہوتے ہیں۔ کَرَّتَیْن کا صیغہ تثنیہ محض اظہارِ تعدد کے لئے ہے' دو کا متعین عدد مراد نہیں (بیضاوی)۔

اِن آیات میں کافی معلوماتی سائنسی علم پوشیدہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق بہترین ڈیزائن میں پیدا کی گئی ہے جو اُس کے ماحول کے عین مطابق ہے۔ اگر کائناتی فطرت ایسی عمدہ اور منظم طور پر تخلیق کی گئی ہے تو اسے بگاڑنا انسانیت کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ اس لئے قرآن مجید ہمیں فساد فی الارض سے منع فرماتا ہے۔'' (''کتابِ زندگی''۔۔سلطان بشیر محمود' صفحہ ۴۳۰)

اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی یہ آخری کتاب تخریب کاروں کو فساد فی الارض کے مہیب نتائج سے بھی خبردار کرتی ہے' کبھی وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا * کے الفاظ میں' کبھی وَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ## کے پیرایہ میں' کبھی ذٰلِکُمْ خَیْرٌ'' لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ### کی ناصحانہ خیرخواہی میں تو کبھی فرعونِ مصر کے اُس ظلم و تعدی اور بالادستی کے بیان سے جو اُس نے اپنی رعایا پر روا کر رکھی تھیں۔ یہ بات ماہرینِ ماحولیات' تمام سائنسدانوں' غیر سائنسدانوں' ماہرینِ عمرانیات' سیاستدانوں اور حکمرانوں کے لئے فکر انگیز ہے کہ ہمیں زمین اور اس کے ماحول کی کماحقہٗ حفاظت کرنی چاہئے اور یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ زمینی ماحول کو اس کے خالق نے متوازن طور پر پیدا کیا ہے اور ہمیں اس کے توازن کو خراب نہیں کرنا چاہئے۔ بالخصوص قرآن پر ایمان رکھنے والوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ زمین اور اس کے فضائی ماحول کو مکدّر ہونے سے بچائے رکھیں۔''

''یہ خوفناک بات ہے کہ گزشتہ چار صدیوں سے مغربی تہذیب کے ابھرنے سے اُس کے لامذہبیت' تجارتی' صنعتی' سائنسی اور سیاسی مفادات نے زمین کے ماحولیاتی توازن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جس کا نتیجہ بہت سی جاندار انواع کا صفحۂ ہستی سے نابود ہو جانا ہے۔ یونیسکو کی شائع شدہ Biological Diversity نامی کتاب کے مطابق:

''اگلے بیس سے تیس سالوں کے دوران دنیا سے دس لاکھ سے زائد پودوں اور جانوروں کی انواع ناپید ہو جائیں گی جس کی بڑی وجہ انسان کی طرف سے کی گئی ماحولیاتی تبدیلیاں ہیں۔ ایک سو انواع کے ختم ہونے کی موجودہ شرح اُس شرح سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے جو عام حالات میں اُن کے ختم ہونے کی ہوتی ہے۔ ناپید ہونے کا یہ خطرہ پودوں اور جانوروں دونوں کے لئے ہے۔ چونکہ ارضی توازن بڑے ہی نازک طور سے کیا گیا ہے' اس لئے غیر متوقع چیزیں واقع ہو سکتی ہیں جس میں نوعِ انسانی کے وجود کا خطرہ بھی ہے۔''

---

*''اور ملک میں اُس کی درستی کے بعد فساد نہ پھیلاؤ''۔ (سورۃ الانعام' آیت ۸۵)

''اور دیکھ رکھو کہ فسادیوں کا کیسا انجام ہوا''۔ (سورۃ الانعام' آیت ۸۶)

''اگر تم ایمان والے ہو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' (سورۃ الانعام' آیت ۸۵)

''بالائی فضا میں اوزون (Ozone) میں کمی کی شکل میں خطرناک علامات اب سے بہت پہلے نظر آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اگر وہ منطقہ جہاں اوزون کی تہ خصوصاً قطبین (قطب شمالی وجنوبی) پر بہت پتلی ہوگئی ہے، بڑھتی رہی، تو اس خلا سے گزرنے والا اَن چھنا ورائے بنفشی اِشعاع (unfiltered ultraviolet radiation) زمینی زندگی کو بھون کر رکھ دے گا۔ علاوہ ازیں فضا میں مختلف قسم کی کیمیائی آلودگیوں کی وجہ سے تیزابیتی بوچھاڑوں نے دنیا کے بہت سے علاقوں میں نباتاتی زندگی کو ختم کرنا شروع کر دیا ہے اور کینیڈا اور یو ایس اے کی نہروں کو بحری زندگی کے لئے غیر موزوں بنا دیا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری گیسوں کی بڑھتی ہوئی سطح کے باعث فضا میں زمین کو ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح بہت سے سائنسدانوں نے پیشگوئی کی ہے کہ اگلے پچاس سے سو سالوں میں موسمیاتی حالات میں شدید تبدیلیاں واقع ہوں گی، گلیشیا ورقطبین کی برف پوش چوٹیاں خاصی حد تک پگھلیں گی جس کے نتیجہ میں ہالینڈ، بنگلہ دیش، چین اور کئی دوسرے ممالک کے زیریں، نشیبی علاقے بشمول کراچی اور نیو یارک سمندری پانی کے سیلاب کی زد میں ہوں گے۔''

''یہ تمام کچھ آج کی بلا جواز صنعتی تہذیب کا نتیجہ ہے جس پر مغربی اقوام نازاں اور مفتخر ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید نے سورۃ البَقَرَۃ کی آیت ۱۱ میں کہا ہے کہ ایسے بہت سے لوگ یہ بات بڑے طمطراق سے کہتے ہیں: اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (ارے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں)۔ یہ جواب بعینہٖ وہی ہے جو آج بھی خدا معلوم امت کے اندر کے کتنے منافقوں کی زبان پر ہے۔ دین میں رخنے رخنے قدم قدم پر ڈالتے جاتے ہیں اور زبان پر دعوے وہی تجدد کے، تجدید کے، اصلاح کے اور تعمیر کے ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر فرائض نام کو نہیں لیکن میلاد النبی ﷺ منانے کو فرض کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اسی طرح بعض غیر معتدل شعراء اور مقرر رسول اللہ ﷺ کے کمالات کو اللہ تعالیٰ سے بڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی نکلی ہوئی آنکھ کو دوبارہ لگا دیا اور آپ کے دستِ مبارک کی برکت سے اُس سے زیادہ نظر آنے لگا تو، وہ اُس واقعہ میں یہ نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ اللہ کی دی ہوئی آنکھ سے اِتنا نظر نہیں آتا تھا جتنا مصطفیٰ ﷺ کی لگائی ہوئی آنکھ سے آتا تھا۔ حالانکہ دونوں آنکھیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کردہ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلی آنکھ والدین کے واسطے سے ملی اور دوسری آنکھ سرکارِ ہر دو جہاں ﷺ کے دستِ پاک کے وسیلے سے ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح عقیدہ اور حبِّ رسول ﷺ کا صحیح معیار عطا فرمائے!

مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیماتِ قرآنی کو مضبوطی سے تھامنے ہی میں ہماری تمام معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی، تجارتی، روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا تریاق ہے جو تمام عالمِ انسانیت کو آج بری طرح درپیش ہیں۔

ایکالوجی (ECOSYSTEM): یہ حیاتیات کی وہ شاخ ہے جو اجسامِ نامیہ (Organisms) یعنی پودوں اور دوسری جاندار مخلوقات کے باہمی تعلق نیز قدرتی ماحول سے اُن کے تعلق کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس نظام کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ارضی زندگی میں سہولت پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے۔

''ایکوسسٹم کی تعریف میں حجم یا فاصلے کی کوئی حد اور قید نہیں۔ یہ صحرا اور جنگل کا ایک مربع کلو میٹر بھی ہوسکتا ہے۔ تالاب اور جوہڑ' شہر' کھیت اور چھوٹے چھوٹے نامیوں کا ایک بند ظرف خانہ (Container) مثلاً زندہ آبی پودوں یا جانوروں کے مطالعہ یا نمائش کے لئے بنایا ہوا مصنوعی شیشہ دار حوض (Aquarium) بھی ہوسکتا ہے۔ وسیع ترین ایکوسسٹم (Biosphere) ہے یعنی زمین کے بالائی پرت میں واقع علاقے جن میں زندہ وجود پائے جاتے ہیں' علاوہ ازیں تمام حیاتِ عالم اور اس سے مربوط کرۂ زمین کی ٹھوس سطح (Geosphere) اس میں شامل ہے۔''

''اس کائنات میں ہر چیز ایک متعیّن اور محدود وقت کے لئے اور ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو فنا اور عدم اُس چیز کا مقدر بن کے رہ جاتا ہے اور صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو دوام حاصل ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ'' فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ٥ (الاعراف : ۳۴)

''اور ہر امت کے لئے ایک میعاد مقرر ہے' سو جب اُن کی میعادِ مقررہ آجاتی ہے تو وہ ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔'' (۷ : ۳۴)

قرآن مجید ہماری توجہ اُس ماحولیاتی نظام (ایکوسسٹم) کی طرف مبذول کرتا ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کرۂ ارضی پر ہمارے خوش آئند اور خوشگوار وجود کے لئے تخلیق کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ٥ (آلِ عمران : ۱۹۱)

''یہ (اہلِ عقل و دانش) ایسے ہیں جو اللہ کو کھڑے' بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر (برابر) یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہمارے پالنہار! تو نے یہ سب لایعنی پیدا نہیں کیا ہے' تو (ہر عیب سے) پاک ہے' سو ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔'' (۱۹۱ : ۳)

''حقیقت تو یہ ہے کہ عذابِ الٰہی سے نجات کی فکرمندی اور تشویش و خوف ہی اِن تمام مناجات و حمد کا تعلق انسان سے جوڑتی ہے ورنہ انسان قدرت کے عجائبات اور حسن و جمال کے درمیان ایک خستہ حال مخلوق بن کے رہ جاتا۔ قادرِ مطلق کے فضل و کرم سے اُس کی اُمیدِ نجات کے ٹھوس پن کی بدولت اُس کا مقام اِن ارفع و اعلیٰ تجلّات سے بلند و بالا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ٥ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ'' مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْ يَعْمَلُوْنَ٥ (السجدة : ۱۶' ۱۷)

''اپنے پالنہار کو خوف اور اُمید سے پکارتے ہوئے اُن کے پہلو اُن کی خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں

اور جو کچھ ہم نے اُنہیں دے رکھا ہے' اُس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ سو کسی کو علم نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا (سامان) اُن کے لئے (خزانہ غیب میں) مخفی ہے۔ یہ اُن کے نیک اعمال کا صلہ ہے۔'' (۱۶'۱۷: ۳۲)

ماحولیات کے حوالہ سے پرندوں کا انسانوں کے ساتھ تعلق کو قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے:
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (الانعام: ۳۸)
''اور جو بھی جانور زمین پر چلنے والا ہے اور جو بھی پرندا اپنے دونوں بازوؤں سے اُڑنے والا ہے' وہ سب تمہاری ہی طرح کے گروہ ہیں۔'' (۳۸ : ۶)

<u>حیوانوں اور پرندوں کی انسانوں سے مماثلت کی وجوہ</u>: ملاحظہ ہوں صفحات ۲۷۶' ۲۷۷ (جلد اوّل)

''قدرت میں توانائی کی روانی کا ایک باقاعدہ قرینہ ہے۔ سورج جو تمام توانائی کا اصل منبع ہے' سے حاصل شدہ توانائی کو پودے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ ذخیرہ شدہ توانائی کو خرگوش' ہرن اور دوسرے مویشیوں جیسے سبزی خور جانور (Herbivores) براہِ راست اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔ اب اِن جانوروں کے جسم میں ذخیرہ شدہ توانائی کو گوشت خور جانوروں (Carnivores) کی ایک اور قسم اپنے استعمال میں لے آتی ہے جیسے شیر' اور چیتے۔ بچی کھچی توانائی لگڑ بگڑ اور گِدھوں جیسے مردار خور جانور (Scavengers) کے کام آ جاتی ہے۔ آخری کام بیکٹیریا یا نامی خوردبینی نامیہ کار رہ جاتا ہے۔''

''شکاری اور شکار کا ایک نہایت پیچیدہ اور اُلجھا ہوا سلسلہ ہے۔ مثلاً شکاری سانپ جو مینڈک کا شکار کر کے اُسے مار ڈالتا ہے' خود بھی تو عقاب (شکاری) کا شکار ہو سکتا ہے۔ دراصل پودوں اور جانوروں کے باہمی پیچیدہ تعلق کو Food Chain (کسی کھانے کی چیز میں رنگ یا ذائقے کے لئے ملاوٹ یا اضافہ) اور Food Web ہی ظاہر کرتے ہیں۔ <u>فطری ماحولیات (قشرِ ارض' پانی' ہوا) اور نامیاتی ماحولیات (پودے اور حیوانی زندگی) کے مابین یہ اور دوسرے تعلقات ماحولیات کے مطالعہ کی تشکیل کرتے ہیں۔</u>''

''ماحولیات کا انتہائی اہم پہلو جو مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے' وہ قدرت میں ''باہمی ارتباط اور وابستگی'' کا ہے' جس نے بالآخر ختم اور فنا ہونا ہے۔ اللہ کی آخری کتاب نے قدرت کے اس اٹل اصول کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے' مثلاً:

(۱) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آلِ عمران: ۱۸۵ ؛ الانبیاء: ۳۵ ؛ العنکبوت: ۵۷)
''ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' (۳:۱۸۵ ؛ ۲۱:۳۵ ؛ ۲۹ : ۵۷)
(۲) كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ'' إِلَّا وَجْهَهُ' لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ (القصص: ۸۸)
''اُس کی ذات کے سوا ہر شے فنا ہونے والی ہے' حکومت اُسی (ایک) کی ہے اور اُسی کی طرف تم (سب) لوٹائے جاؤ گے۔'' (۲۸ : ۸۸)

(۳) هُوَ أَمَاتَ وَ أَحيَاo (ألنَّجم : ۴۴)
"وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔" (۴۴ : ۵۳)
("The Holy Qur'an on Environment" --- Engr. Akhtar K. Bhatti, Dr. Gul-e-Jannat, pp. 66-67 Delhi, 1994.

ماحولیات کا روحانی پہلو : اِن دو آیات میں قرآن مجید کا بیان ملاحظہ ہو:
(۱) تِلْكَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (البقرة : ۲۵۲ ؛ آلِ عمران : ۱۰۸)
"یہ اللہ کی آیتیں ہیں، ہم اُنہیں آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں۔" (۲:۲۵۲ ؛ ۳:۱۰۸)
(۲) يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ (آلِ عمران : ۱۶۴ ؛ ألْجُمُعة : ۲)
"یہ (رسول) اللہ کی آیتیں اُنہیں پڑھ کر سناتا ہے۔" (۱۶۴ : ۳) ؛ (۲ : ۶۲)

درج بالا دونوں قسم کی آیات کو ایک ساتھ ملا کر پڑھنے سے (اللہ، رسول اور مخلوقات کے پیشِ نظر) یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُس کی مخلوق کے درمیان ایک ناقابلِ جدا واسطہ ہے جو اپنے رحمان ورحیم خالق و مالک سے لامتناہی نوازشات وعطیات کو حاصل کر کے اُنہیں اُس کی مخلوقات میں تقسیم کر رہی ہے۔ یہ واسطہ کوئی عام واسطہ نہیں بلکہ ایک عظیم واسطہ ہے اور ایسے کامل طور پر جُڑا ہوا ہے کہ جب وہ فیّاض اپنی شانِ کریمی سے کسی پر اپنے عطیات کی بارش کرنا چاہتا ہے تو اپنے محبوب علیہ السلام کو حکم فرماتا ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلاَتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (محبوب! اُن کے لئے ذرا دعا تو کر دیجئے، بلاشبہ آپ کی دعا اُن کے حق میں باعثِ تسکین ہے۔ سورۃ التوبۃ، آیت ۱۰۳) اور جب اُس کی مغفرت وبخشش کا بحرِ ذخّار اپنی پوری جولانی میں ہوتا ہے تو وہ اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کہتا ہے کہ اُن کی کوتاہیاں اور فروگزاشتیں معاف کر دیں اور اللہ سے اُن کی بخشش کی دعا کریں (بحوالہ سورہ آلِ عمران، آیت ۱۵۹) حالانکہ وہ اپنی مخلوقات کا بلاشرکتِ غیرے مختارِ کُل اور مالک ہونے کے ناطے سے اُنہیں پیغمبر علیہ السلام کے وسیلے کے بغیر بھی معاف کر سکتا تھا۔ آخر اس میں حکمت اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُس ارفع واعلیٰ عظمت کو اجاگر کرنے کی ہے جو اُنہیں اپنے رب کے حضور حاصل ہے اور اس طرح یہی عظمت وتوقیر ماحولیات کے روحانی پہلو کی تشکیل کرتی ہے۔

انسان کی اپنے ماحول سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت : اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے سے انسان پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر فیّاضانہ طور پر اپنی نوازشات وانعامات کا بارانِ رحمت کیا ہے، بالخصوص اُس کی ذہنی استعداد واہلیت، کہ اگر وہ اُن عطیات کو صحیح طور پر استعمال کرے تو وہ اپنے اندر کی دُنیا اور بیرونی دنیا کا بہ آسانی فاتح بن سکتا ہے۔ اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لئے اُسے اپنے ماحول سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔ اُس رحمان ورحیم خالق نے تمام قدرتی وسائل وذرائع حضرتِ انسان کے قدموں میں

ڈھیر کردیئے ہیں کہ وہ اُنہیں نہ صرف اپنی ذات کی منفعت اور بہتری کے لئے استعمال میں لائے بلکہ اپنے سماج کو بھی اُن سے فائدہ پہنچائے۔اس منفعت کا حصول صرف سعیِ پیہم اور سخت جدّ وجُہد ہی سے ممکن ہے تاکہ انسانی تہذیب و ثقافت اقدارِ صحیحہ سے مالا مال ہو جائے۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھے رہنا اُسے غربت' محرومی اور اقوامِ عالَم کی نظر میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہ دے گا۔

جب آدم علیہ السلام شیطانی وسوسہ کا شکار ہونے کے نتیجہ میں جنت سے زمین پر اتارے گئے تو ایسے تجاوز عن الحد کے موقع پر بھی اُس رحیم و کریم نے اُنہیں دنیا کی جاذبیتوں اور کششوں کے درمیان اکیلا بھیجنا برداشت نہ کیا بلکہ اُس نے آدم اور اُن کی اولاد سے اپنی راہ نمائی اور ہدایت گاہے گاہے بھیجنے کا وعدہ کیا (بحوالہ سورۃ البقرۃ' آیت ۳۸؛ سورۃ الاعراف' آیت ۳۵) کیونکہ دنیا کی ہنگامہ خیز سرگرمیِ حیات میں اُن کی اولاد کا پٹڑی سے اتر جانے کا قوی امکان تھا۔انسان کو لاتعداد برائیوں اور زندگی کی کجرویوں سے بچانے اور اُس کی دونوں دنیائیں قابلِ رشک حد تک بہتر بنانے کے لئے الٰہی راہ نمائی ہمیشہ اُسے صراطِ مستقیم دکھاتی رہی ہے جو رضائے الٰہی کی طرف لے جاتی ہے اور وہ ایسا ضابطہ ہے جو اُس کی تمام زندگی کو انسان کے خود اختراعی اور قیاسی نظریات کے اتھاہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے محفوظ رکھتا ہے۔اگر اِس الٰہی راہ نمائی کی صحیح جذبہ سے پیروی کی جائے تو یہ فرد اور سماج کے حقوق کے مابین خوش آئند توازن کے قیام کی ضمانت ہوگی جس میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

انسان کو یہ رہنمائی مہیا کرنے اور اُس کی روزمرّہ ضروریات کی تکمیل کے لئے اُس پر جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں نچھاور کرنے کے بعد اُسے عمل کے میدان میں آزاد چھوڑ دیا گیا کہ چاہے تو رحمانی زندگی بسر کر کے اپنے خالق و مالک کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرلے اور چاہے تو شیطانی راستہ اختیار کر کے اپنے خالق کو ناراض کرلے۔
فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (سورۃ الکھف : ۲۹)

یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی مشکلات و مصائب سے گھری ہوئی ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ٥ (سورۃُ البلد : ۴) کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقّت کے لئے پیدا کیا (۹۰ : ۴) یعنی انسان کو اپنے عجز و بے بسی کا مشاہدہ قدم قدم پر کرایا گیا۔اس سے طبیعت میں قدرتاً شکستگی پیدا ہونی چاہئے اور خود بینی اور خدا فراموشی کو تو پاس بھی نہ پھٹکنا چاہئے لیکن ناشکرا' بے قدرا انسان ان سارے واقعات سے مطلق سبق نہیں سیکھتا۔مؤمن کو تو ہر شے میں حکمتِ الٰہی کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ ربوبیّتِ مطلقہ پر اعتماد و اطمینان رکھ لیتا ہے۔

ایک انگریز مفکر لکھتا ہے :

"آفات اور پُر اَلم عنصر کے بغیر انسانی زندگی کا تصوّر تک نہیں ہوسکتا۔انسان جتنا ترقی یافتہ اور تکمیل کے

مراحل کے قریب ہوگا' اُسی قدر المناک آویزشوں کے امکانات زیادہ ہوں گے۔۔۔۔زیادہ خوفناک وہ المیے ہیں جو انسان کی اپنی نہاد اور فطرت میں گہرے طور پر رکھ دیئے گئے ہیں۔۔۔۔یہ یاس اور ناامیدی کے مظہر ہیں کیونکہ اُنہیں حیاتِ انسانی سے خارج کرنا تا حال انتہائی مشکل کام ہے۔'' ("Biological Tragedy of Woman"---Nemilov, pp. 14, 15)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کا اپنی ذات پر کنٹرول کئے بغیر فطرت کی توانائیوں پر کنٹرول حاصل کر لینا بھی اُسے محرومیوں کی طرف دھکیل دیتا ہے اور یہ بات اس حقیقت کی مظہر ہے کہ انسان کو جدّ وجُہد کئے بغیر آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا اور خاطر خواہ آسائش و آرام سے حظ اندوز ہونے کی کوشش اور اپنی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانا ایک لامتناہی عمل ہے جس کی کوئی حد نہیں۔آدم کے جنت سے خروج میں یہ نکتہ پنہاں تھا کہ یہ انسانی آزمائش کا دورانیہ ہوگا اور اُن لوگوں کے لئے مژدہ جانفزا ہوگا جو انسانی بہتری اور منفعت کے لئے قدرت کی توانائیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے اور وہ لوگ جو اِس جدّ وجہد اور قدرت کی توانائیوں سے استفادہ کرنے میں ناکام رہیں گے تو محرومی اور مصائب و آلام کی زندگی اُن کا مقدر ہوگی۔حیاتِ ارضی میں انسان کی آزمائش اطاعتِ الٰہی یا معصیتِ الٰہی میں ہے۔اطاعت شعار بندے اُس دائمی بادشاہت کے وارث ہوں گے جہاں سے شیطان نے آدم کو نکلوا دیا تھا۔

آدم علیہ السلام کا واقعہ بحوالہ سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰ اور سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۰' اعلیٰ مقام اور حیاتِ جاودانی کے لئے انسانی حرص کو بھی ظاہر کرتا ہے۔یہ جاذبیتیں اور کششیں اُسے ہمیشہ زندگی کے ناگوار طریقوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیلنے کا سبب بنیں گی۔عیسائیت کے نظریہ کے خلاف جس نے عورت ذات کی توہین و تذلیل میں بڑا کردار ادا کیا ہے' اس واقعہ کے قرآنی بیان نے عورت کے مقام کو اعلیٰ وارفع سطح تک لے جانے میں مدد کی ہے۔واقعہ کا یہ قرآنی بیان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ آدم اور حوّا علیہما السلام کا مقدر ایک ساتھ بندھا ہوا ہے اور اپنی نیابتِ الٰہی کے اس منصب میں اُن کا عروج و زوال بھی اکٹھا اور ایک ساتھ ہے۔لہٰذا یہ بات اُن دونوں کے مفاد میں ہے کہ اس زندگی کو حقیقی کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے وہ اکٹھے مل کر کام کریں۔

ایک اور قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے شروع میں اُن کی برہنگی کو ڈھانپنے کا انتظام خود کیا تھا لیکن جب حکمِ الٰہی کو وہ بھول گئے (بحوالہ سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۵) تو اُس نے وہ انتظام واپس لے لیا اور اُنہیں اُن کے حال پر (برہنہ) چھوڑ دیا گیا۔اس میں اس بات کو ظاہر کرنا تھا کہ جب تک وہ اپنے خالق و مالک کے فرمانبردار بن کر رہیں گے' اُس کی مدد اُن کے شاملِ حال رہے گی۔اُس کی راہ نمائی کو نظر انداز کرنے اور اغیار کے طریقوں کو اپنانے میں انسان ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے ذریعے اپنے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہ ظاہر تو خوشحال ہو سکتا ہے لیکن وہ کبھی بھی حقیقی خوشی اور ذہنی سکون نہیں پا سکے گا جو صرف اور صرف اطاعتِ الٰہی میں مضمر (پوشیدہ) ہے۔

آخری بات یہ کہ آدم نے شیطان پر اپنی اَخلاقی برتری کئی طرح سے ثابت کر دی کیونکہ (۱) آدم نے ارادتاً حکم عدولی نہیں کی تھی (بحوالہ سورہ طٰہٰ' آیت ۱۱۵) جبکہ شیطان نے دیدہ ودانستہ سرتابی اور بغاوت کی۔ (۲) جب آدم علیہ السلام کو اُن کی لغزش سے متنبہ کیا گیا تو اُنہوں نے کسی بدتمیزی یا غرور کا مظاہرہ نہیں کیا جیسا کہ شیطان نے کیا تھا بلکہ اپنی لغزش کا اعتراف کرتے ہوئے وہ فوراً رب تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوئے (بحوالہ سورۃ الاعراف' آیت ۲۳)۔ آدم کے اس عمل کا مطلب یہ ہے کہ انعام یافتہ وہ ہیں جو اپنے رب کے حضور عجز وانکساری کا اظہار کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے تو اُس کی رحمت اُنہیں اپنے دامنِ عافیت میں لے لیتی ہے جو صرف اُس کے مطیع وفرمانبردار بندوں کے لئے ہے اور جو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں پر ڈٹے نہیں رہتے۔ (سورہ آلِ عمران: ۱۳۵)

<u>نبی اکرم ﷺ اور ماحولیات</u> : کوئی بھی شخص اُن بے انتہا الٰہی نوازشات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کا فیضان دستِ قدرت نے بڑے ہی فیاضانہ طور پر ہمارے نبی مکرّم ﷺ پر کیا ہے' اس حقیقت کے باوجود کہ آپ نبی اُمّی مبعوث کئے گئے۔ آپ یتیم پیدا ہوئے اور چھ سال کی عمر میں آپ کی والدہ ماجدہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ چالیس سال کی عمر میں آپ نے گم کردہ راہ انسانیت کی راہنمائی کے لئے اپنے خالق سے وحی کا سلسلہ پانا شروع کیا۔ گوئٹے کے الفاظ میں'' آپ کی راہنمائی نے حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو ڈھانپ لیا تھا۔''

کچھ کوتاہ نظروں اور جہلاء کے نزدیک یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ ایک اُمّی انسان کیسے انسانیت کو ایک ایسا جامع اور عالمگیر ضابطہ اخلاق دے سکتا ہے جس نے اُن کے مقدّر کو بدل دیا اور اُن بربریت کے مجسموں اور صحرا کے ناقابلِ کنٹرول وحشیوں کو دنیا کا حکمران اور فرمانروا بنا دیا جس کی نظیر پوری تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔ یہ لوگ یہ بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ کثیرالانواع میدانوں میں قسما قسم کے علوم کا جاننا ''مَدِینَۃُ العِلْم'' (ﷺ) کا خصوصی استحقاق تھا جو اُن کے خالق ومالک نے اُنہیں عطا کیا تھا' کیونکہ خالق نے اُنہیں تاقیامت تمام عالم انسانیت کی ہدایت کے لئے منتخب کیا تھا اور اُن کثیرالانواع علوم کا جاننا آپ کی ضرورت تھا جو نسلِ انسانی کی راہنمائی کے لئے ناگزیر تھا۔ آپ کو قیامت تک کے تمام لوگوں کے لئے بہترین نمونہ کے طور پر منتخب کرنا تھا (سورۃ الاحزاب' آیت ۲۱) اور اِس اعزاز کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو مطلوبہ معلومات اور مناسب علم سے آراستہ کیا جائے۔ اِن قسما قسم کے علوم کا جاننا آپ کا کوئی کسبی عمل نہیں تھا بلکہ منجانب اللہ (وہبی) تھا اور آپ کے خالق کا آپ پر خصوصی انعام کے طور پر تھا۔ اسی حقیقت کے مدِّنظر یہ شبہ ذرا سا بھی باقی نہیں رہتا کہ اُس علم میں (معاذ اللہ) آپ اُس علیم وخبیر کے شریک وسہیم تھے۔ یہ لوگ اس بات پر بھی حیران ہیں کہ وہ سرکش اور انانیت پسند لوگ کیسے ہر وقت آپ کے حکم کی قربان گاہ پر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار رہتے تھے۔ یہ لوگ تھامس کارلائل کے اس جامع جواب کو بھول جاتے ہیں کہ:

''پیشتر اس کے کہ آپ لوگوں کو آپ کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالنے کی طرف مائل کریں' اُن کے دل جیتنے کی تلوار ہاتھ میں لیں۔''

آپ کی وسعتِ نظر کا اندازہ آپ کی اُن مختلف ہدایات و تعلیمات سے لگایا جا سکتا ہے جو اِس مادّی دنیا کے قدرتی وسائل کے تحفظ اور توجیہ سے متعلق ہیں۔ آپ نے درخت لگانے کی حوصلہ افزائی کی اور اُن کے غیر ضروری کاٹنے سے منع فرمایا۔ آپ اس کی اہمیت سے اس قدر واقف تھے کہ فوجی سپہ سالاران کو جنگ کے دوران عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے کی ممانعت میں یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ درختوں کو نہ کاٹا جائے اور قدرتی وسائل کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اس ضمن پروفیسر لورا وَیگلیئری رقمطراز ہیں :

''آپ اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے قتل سے گریز کرو، اُن لوگوں کے گھروں کو منہدم کرنے سے بچو جو تمہاری مزاحمت نہیں کرتے، اُن کے روزی کے وسائل کو تباہ نہ کرو، باثمر درختوں کو تباہ نہ کرو اور کھجور کے درختوں کو کسی قسم کا گزند پہنچانے سے باز رہو۔'' ("An Interpreta-tion of Islam"--- Prof. Laura Vaglieri, p. 28)

اور ریمنڈ لی روَنج اس ضمن کہتے ہیں :

''پیغمبر محمد ﷺ نے اپنے سپاہیوں سے کہا: بچوں کو قتل مت کرو۔ جب تم دشمن سے اُس کے اپنے ملک میں جنگ کرو تو وہاں کے پُر امن باشندوں پر تشدد مت کرو۔ کمزور عورتوں کے قتل سے باز رہو۔ شیر خوار بچوں اور بیمار لوگوں پر ترس کھاؤ۔ گھروں کو تباہ مت کرو، کھیتوں کو تاراج مت کرو، پھلوں کے باغوں کو مت اُجاڑو اور نخلستان کے درختوں کو مت کاٹو۔'' ("Viede Muhamet" --- Raymond Lerounge p. 164, Paris, 1939)

''درختوں کے اُگانے کو آپ نے خاص اہمیت دی اور یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیج بوتے ہوئے قیامت کے قائم ہونے کا شور سن لے تو وہ پہلے درخت لگانے کے عمل کو پورا کر لے اور پھر اپنے تحفظ کو دوڑے۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مردہ جانور کی کھال کو گندہ ہونے کے لئے نہ چھوڑ دیں بلکہ آئندہ استعمال کے لئے اُس کی دباغت کر لیا کریں (مسند احمد، مالک اور ابوداؤد بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ، جلد ۸، صفحہ ۴۹۹)۔ آپ نے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے کھیتوں میں فالتو پانی کو نہ روکا کریں جس سے زمین کی جڑی بوٹیوں کا اُگنا رک جائے (صحیح بخاری، صحیح مسلم)۔ قدرتی ذرائع کے تحفظ کا آپ کو اس حد تک خیال تھا کہ آپ نے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ وضو میں ضرورت سے زائد پانی استعمال نہ کیا کریں۔ ایک مرتبہ آپ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے جبکہ وہ وضو کر رہے تھے۔ آپ نے اُن سے پوچھا: وضو میں اس قدر مبالغہ سے پانی کے استعمال کا کیا مطلب ہے؟ اُنہوں نے عرض کی: کیا وضو میں بھی پانی کا استعمال مبالغہ سے ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں! اگرچہ تم بہتے ہوئے دریا کے کنارے ہی وضو کیوں نہ کر رہے ہو۔'' (مسند احمد، ابن ماجہ بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ)

وضو میں پانی کے استعمال کے معاملہ میں حضرت عمرو بن العاص کو پیغمبر علیہ السلام کے اس جواب کی گہرائی اور اہمیت پر ذرا غور تو کیجئے کہ تمام قدرتی ذرائع و وسائل کے با کفایت استعمال اور اُن کے خواہ مخواہ ضیاع سے گریز کا آپ کو کس قدر خیال تھا۔ قرآن مجید بھی قدرتی ذرائع کے صحیح استعمال پر زور دیتا ہے اور قدرتی دولت کے غیر ضروری ضیاع سے روکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يَآيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ٥ (البقرۃ: ۱۶۸)

''لوگو! زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے' اُس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو' کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔'' (۱۶۸ : ۲)

اس لئے نسلِ حاضرہ کو آنے والی نسلوں کے حصّہ کو غیر ضروری اور فضول استعمال سے تباہ و برباد نہ کرنا چاہئے۔ سورۃ الاعراف میں حکم دیا گیا:۔

يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ٥ (الاعراف: ۳۱)

''اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور کھاؤ پیو لیکن اِسراف سے کام نہ لو بے شک وہ (اللہ) فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۳۱ : ۷)

یہ آیت بڑی تاکید اور زور کے ساتھ اس بات کا حکم دے رہی ہے کہ مقاماتِ عبادت میں خوبصورت لباس کے پہننے سے حظ اندوز ہوا کرو۔ ''زِینَۃ'' کا لفظ جسمانی اور اخلاقی ہر لحاظ سے حسن و جمال کو شامل ہے لیکن اِس بات کا خیال رہے کہ جائز اور حلال چیزوں کے استعمال میں بھی ضیاع' اسراف (فضول خرچی) اور تجاوز عن الحد (مبالغہ) سے کام نہ لیا جائے۔ جیسا کہ آیت سے معلوم ہوا کہ ضیاع' اللہ تبارک و تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں اور وہ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا۔''

''انسان کو اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ زندگی سے حظ اندوز ضرور ہو لیکن اپنے اعمال و افعال میں محتاط رہے اور اپنا محاسبہ کرتا رہے کیونکہ اپنے اعمال و افعال کی جوابدہی کے لئے اُسے بہر حال رب تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اُسے صحیح گزر بسر اور شائستہ زندگی گزارنے کی حدود کو پھاندنا نہیں چاہئے۔ اُسے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اُس سے پہلے بھی نسلیں ہو چکی ہیں اور اُس کے بعد بھی کئی نسلیں آئیں گی۔ جو کچھ اُس کا اپنا ہے' صرف اُسی کا اپنے کو جائز مالک سمجھنا چاہئے لیکن آنے والی نسلوں کے لئے اُن کا حصّہ اُن کے حق میں چھوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ بھی اس کرۂ ارضی پر شائستہ زندگی گزار سکیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ' جلد ہشتم' صفحہ ۵۰۰)

(۳۹) احوالِ حشر و نشر (ESCHATOLOGY)

(اس موضوع کا تعلق روزِ قیامت سے ہے جب تمام لوگ اپنے اعمال و افعال کی جوابدہی کے لئے رب تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے)۔

ابتدائی مکی زندگی میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تبلیغ کے لئے دو اہم پیغامات دیے گئے جن میں سے ایک تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی وحدانیت کا تھا جس کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت ۳ میں، سورہ یونس کی آیات ۳۱، ۳۲، ۳۴، ۳۵، ۵۵، ۶۶ تا ۶۸، ۱۰۴ تا ۱۰۹ میں، سورہ ھود کی آیات ۱۴، ۲۶ میں، سورۃ النحل کی آیت ۲۲ میں، سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۸ میں، سورۃ الانبیاء کی آیات ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۲۹، ۴۲، ۵۲ تا ۷۰، ۹۸، ۹۹، ۱۰۸ میں، سورۃ المومنون کی آیات ۸۴ تا ۹۲ میں، سورۃ الفرقان کی آیت دوم میں، سورۃ الشعراء کی آیات ۲۴، ۴۷، ۴۸ میں، سورۃ النمل کی آیات ۲۶، ۴۴، ۶۰ تا ۶۵ میں، سورۃ القصص کی آیات ۳۰، ۶۸، ۷۰ تا ۷۲، ۸۸ میں، سورۃ العنکبوت کی آیات ۱۶، ۱۷، ۲۰، ۲۲، ۴۱، ۴۲، ۴۴، ۶۰ تا ۶۳، ۶۵ میں، سورۃ الروم کی آیات ۸ تا ۳۳، ۴۰، ۴۳، ۴۶، ۴۸ تا ۵۱، ۵۴ میں، سورہ لقمان کی آیات ۱۱، ۱۳، ۲۰ تا ۲۲، ۲۵ تا ۳۴، سورۃ السجدۃ کی آیات ۴ تا ۹ میں، سورہ سبا کی آیات اوّل و دوم، سورۃ الزخرف کی آیات ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۶، ۲۷، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۵۸، ۵۹، ۶۴، ۸۱، ۸۲، ۸۷ میں، سورۃ الدخان کی آیات ۷، ۸، ۱۸ تا ۲۲ میں، اور سورۃ الاخلاص کی آیات ۱ تا ۴ وغیرہ میں ہوا۔

دوسرا پیغام روزِ قیامت میں لوگوں کا رب کے حضور اپنے اعمال و افعال کی جوابدہی کے لئے پیش ہونے کا تھا جس کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت ۶۰، ۱۲۴، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵ میں، سورۃ الاعراف کی آیات ۶ تا ۹، ۲۹ میں، سورہ یونس کی آیات ۲۳، ۳۰ میں، سورہ ھود کی آیات ۴، ۸، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۲۱، ۱۲۲ میں، سورۃ الرعد کی آیت ۴۲ میں، سورہ ابراہیم کی آیات ۳۱، ۵۱ میں، سورۃ الحجر کی آیت ۹۲ میں، سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۱۳، ۱۴، ۳۶ میں، سورۃ الکھف کی آیات ۴۸، ۴۹ میں، سورہ مریم کی آیات ۳۹، ۸۵، ۸۶، ۹۵، ۹۶ میں، سورہ طٰہٰ کی آیات ۱۱۱، ۱۱۲ میں، سورۃ الانبیاء کی اوّل آیت میں، سورۃ المومنون کی آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳، ۱۱۵ میں، سورۃ النور کی آیات ۲۴، ۴۲، ۶۴ میں، سورۃ العنکبوت کی آیات ۲۱، ۵۷، ۵۸ میں، سورہ لقمان کی آیت ۲۳ میں، سورہ سبا کی آیات ۴، ۵ میں، سورہ فاطر کی آیات ۵ تا ۷، ۳۰ میں، سورہ یٰسٓ کی آیات ۳۲، ۵۳، ۵۴ میں، سورۃ الصافات کی آیات ۲۰ تا ۲۴ میں، سورۃ الزمر کی آیات ۵۴ تا ۶۱، ۷۱ تا ۷۵ میں، سورہ غافر کی آیات ۱۷، ۱۸ میں، سورۃ الشوریٰ کی آیات ۲۰، ۲۲ میں، سورہ ق کی آیت ۱۸ میں، اور سورۃ الانفطار کی آیات ۱۰ تا ۱۲ وغیرہ میں ہوا۔

اِن دونوں پیغامات کا باہمی تعلق ایسا اٹوٹ انگ ہے کہ قرآن مجید بہت سے مقامات پر کہتا ہے کہ ایمان

باللہ کا دوسرا نام ایمان بالآخرت ہے جس دن تمام مخلوق دوبارہ زندہ کی جائے گی اور جوابدہی کے لئے پیش ہوگی۔ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے میں اخلاقی راست روی کی ضرورت پنہاں ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد دوم' صفحہ ۴۴)

معادیات (حشر و نشر) کی حقیقتوں کے بارے میں قرآنی بیانات بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں۔ قرآن مجید وقوعِ قیامت اور اُس دن کی ہولناکیوں اور بشارتوں دونوں کا ذکر ایسی کثرت اور قطعیت کے ساتھ (وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ یعنی یہ ہمارے ذمّے وعدہ ہے' ہم ضرور اسے کر کے رہیں گے۔ سورۃ الانبیاء' آیت ۱۰۴) اِسی لئے کرتا ہے کہ مخاطبین کے دل میں عقیدۂ آخرت راسخ ہو جائے۔ ساری نیکیوں کی جڑ اور بنیاد یہی ہے کہ عقیدۂ آخرت محض ایک نظریہ یا وہم وگمان کی طرح نہ رہے بلکہ کامل وثوق کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور قال حال بن جائے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دُنیا کا یوم الآخرۃ کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے اور وہ دنیا دارالجزاء ہے اور یہ کہ اس زندگی میں لوگوں کے آزادانہ اختیار سے کئے گئے اعمال اُن کی اُخروی تقدیر کو متعیّن کرتے ہیں۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس دنیا کی لذتیں فانی اور فضول ہیں (بحوالہ سورہ آلِ عمران' آیت ۱۸۵؛ سورۃ النساء' آیت ۷۷؛ سورۃ الانعام' آیت ۳۲؛ سورۃ النحل' آیت ۹۶؛ سورۃ العنکبوت' آیت ۶۴؛ سورہ لقمان' آیت ۳۳؛ سورہ فاطر' آیت ۵؛ سورۃ الحدید' آیت ۲۰) جبکہ دارِ آخرت دائم اور حقیقی مسرتوں کی زندگی ہے۔ بہت سے شارحین کے نزدیک اس دنیا کی مسرّتوں اور آخرت کی مسرتوں میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر مسرتوں کے ساتھ دکھ درد جڑا ہوا ہے جبکہ مؤخر الذکر کے ساتھ یہ بات نہیں ہے' اوّل الذکر کی مسرتیں فانی اور بدلنے والی ہیں جبکہ مؤخر الذکر کی مسرتیں قائم و دائم ہیں۔

<u>انسان کا ابتدائی مذہب۔۔۔ توحید یا شرک؟</u> سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ (آیتِ میثاق) ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان کی فطرت میں روزِ ازل ہی سے توحید شناسی اور توحید پرستی راسخ کر دی تھی اور وہ ہر بشر کی سرشت میں رس بس چکی ہے۔ اگر فطرت مسخ نہیں ہو چکی تو ایک خالق و رازق و مربّی کا اعتراف ہر فطرتِ سلیمہ کا جزو لاینفک ہے۔ یہاں قرآن نے گویا واضح کر دیا کہ نسلِ انسانی کا اصل اور ابتدائی دین توحید ہے اور شرک بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ''دانایانِ فرنگ'' ابھی چند سال پہلے بڑے ہی شدّ و مد کے ساتھ اس کے برعکس کہہ رہے تھے کہ نسلِ انسانی کا ابتدائی دین شرک ہے اور توحید تک تو انسان بہت بعد کو رفتہ رفتہ پہنچا ہے لیکن اب اُن کے ماہرینِ فن (Ethnologists) کی آنکھیں کھلی ہیں اور اب علانیہ اقرار ہونے لگا ہے کہ انسان کا ابتدائی دین توحید ہی تھا۔ (عبدالماجد دریابادی' صفحہ ۳۶۶)

قرآنِ حکیم کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام زندگی تخلیق اور تخلیقِ نَو (Re-creation) کا عمل ہے۔ چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر لحظہ مخلوقات کو عدم سے وجود میں لاتا رہتا ہے' لہٰذا اُس کے لئے روزِ محشر کو زیادہ ڈرامائی طور پر ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے:

وَقَالُوٓا أَءِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَءِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ٥ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ٥ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا ٥ (الاسراء: ۴۹ تا ۵۱)

''وہ (کفار) کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا اور جمع کئے جائیں گے۔آپ کہہ دیجئے کہ تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ یا کوئی اور چیز جو تمہارے خیال میں بہت ہی بعید ہو' پھر وہ کہیں گے کہ کون ہمیں دوبارہ جلائے گا؟ آپ کہہ دیجئے کہ وہ وہی ہے جس نے تمہیں اوّل بار پیدا کیا تھا۔ پھر وہ آپ کے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ (زندہ ہونا) ہوگا کب؟ آپ کہہ دیجئے کہ عجب نہیں کہ یہ وقت قریب ہی آپہنچا ہو۔'' #(۴۹ تا ۵۱ : ۱۷)

سر کی یہ حرکت بطور انکار و اعراض ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ منکر جب دلائل میں لاجواب ہو جاتا ہے تو وہ بات کا رخ ہی بدل دیتا ہے۔نَغض کے لفظی معنی اوپر نیچے یا نیچے اوپر حرکت دینے کے ہیں۔

<u>حیاتِ انسانی اور موت</u> : قرآن مجید نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر ذی نفس کا ایک خاص اور مقررہ عرصہ حیات ہے خواہ وہ افراد ہوں یا اقوام اور اس کے لئے قرآنِ حکیم نے اَجَل کا لفظ استعمال کیا ہے۔مندرجہ ذیل دونوں آیات میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو دودفعہ مارتا ہے اور دودفعہ جلاتا ہے:

(۱) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ٥
''تم اللہ کا انکار کر بھی کیسے سکتے ہو جبکہ تم بے جان تھے' سو اُس نے تمہیں جاندار کیا' پھر وہی تمہیں موت دے گا' پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا' پھر اُسی کی طرف تم واپس کئے جاؤ گے۔'' (۲۸ : ۲)

(۲) قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ٥
''وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دوبار مُردہ رکھا اور دوبار زندگی دی' سو ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں تو کیا نکلنے کی کوئی صورت ہے؟'' (المؤمن : ۱۱)

دو مُردہ حالتوں میں سے ایک تو یہی موت متعارف ہے۔دوسرے قبل ولادت کی بے جان حالت یا جمادیت کی حالت۔دو زندگیوں سے مراد ایک زندگی دنیا کی اور دوسری آخرت کی۔

<u>سورۃ الانعام کی آیت ۹۳ میں موت کو سیلِ آب کی قسم میں دکھایا گیا ہے جبکہ فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا کر مرنے</u>

نوٹ: ''یہاں فرمایا گیا اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (قیامت قریب ہی ہے)۔اِس فرمان کو چودہ صدیاں تو گزر چکیں' ابھی تک تو آثار بھی نہیں آئے تو قیامت قریب کیسے ہوئی؟ یہ اعتراض امام فخرالدین رازی کے زمانے میں کیا گیا جبکہ اُس وقت چھ سو سال گزر رہے تھے۔اس کا جواب امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا کہ قریب ہونا دنیا کی پوری مدت کے لحاظ سے ہے۔نبی کریم ﷺ کے زمانے تک دنیا کی زیادہ مدت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی' ہزاروں سال گزر چکی' اب تھوڑی باقی ہے اس لئے قریبًا کہنا بالکل درست ہے۔دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ قیامِ دنیا کا مقصد پورا ہو چکا ہے یعنی نبوّت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔اب تو صرف قیامت کا ہی انتظار ہے جس میں اس سلسلے کا نتیجہ ظاہر ہونا ہے یعنی قریبًا ہے انتظار میں۔اس کے سوا اَب کسی اور کا انتظار نہیں رہا۔'' (تفسیر نعیمی' ج ۱۵' ص ۲۳۲)

مرنے والے سے کہیں گے کہ روح ہمارے سپرد کرو جبکہ سورۃُ الواقِعة کی آیت ۸۳ میں مرنے والے کی روح کا اُس کے نرخرے تک آنے کا بیان ہے۔ اِس سوال کے جواب میں کہ آیا مُردے میں کچھ ہوشیاری کی حالت بھی ہوتی ہے' سورہ فاطر کی آیت ۲۲ اشارتاً بتاتی ہے کہ زندہ اور مُردہ برابر نہیں ہو سکتے اور یہ کہ جب اللہ تعالیٰ جسے چاہے' اپنی قدرتِ کاملہ سے سُنوا سکتا ہے' تو زندہ لوگ قبروں میں مدفون مُردوں کو الٰہی طاقت کے بغیر نہیں سنوا سکتے۔ (مثلاً سورۃ الاعراف کی آیت ۷۹ اور ۹۳ جب حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہما السلام نے اپنے دشمن مُردوں کو بامقصد طور پر باذنِ الٰہی خطاب کیا تھا)۔

کلمة الحق کی سربلندی میں مارے گئے لوگ شہید ہیں اور حیاتِ جاودانی (ہمیشہ کی زندگی) پا گئے ہیں (سورۃ البقرۃ' آیت ۱۵۴' سورہ آلِ عمران' آیات ۱۶۹' ۱۷۰) اور وہ اللہ کے انعامات و نوازشات سے مستفید ہو رہے ہیں (سورہ آلِ عمران' آیات ۱۷۰' ۱۷۱ ؛ سورۃ الحج' آیات ۵۸' ۵۹)۔ سورہ غافر کی آیات ۴۶ تا ۴۹ اور سورہ نوح کی آیت ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونِ مصر' اُس کے ساتھی' نوح علیہ السلام کی قوم کے مشرکین پہلے ہی نارِ جہنم میں پہنچے ہوئے ہیں۔ سورۃ الانفال کی آیت ۵۰ اور سورہ محمد کی آیت ۲۷ میں فرشتوں کو کافروں کی روح قبض کرتے وقت اُن کے منہ اور پشتوں پر ضرب لگاتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو نارِ جہنم میں اُنہیں سپرد کرنے کا ابتدائیہ ہے۔

سات مختلف مقامات پر بروزِ قیامت قرآن مجید آسمانوں کے پھٹ جانے اور دو آیات میں آسمان کے لپیٹنے کا ذکر کرتا ہے اِس اشارہ کے ساتھ کہ مُردوں کا زندہ ہونا اور روزِ حساب واقع ہونے والے ہیں۔ ایک مقام پر قیامت کی ہولناکی کے بیان میں اُن آٹھ فرشتوں کی تابندہ تصویر شامل ہے جو اپنے اوپر عرشِ الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں (سورہ الحآقة: ۱۷)۔ روزِ محشر کے لئے قرآن مجید مختلف الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتا ہے' مثلاً :

(۱) يَومُ الدِّين (روزِ جزا و سزا) (سورة الفاتحة : ۴ ؛ سورة المطفّفين : ۱۱)
(۲) يوم" مُّحِيط (گھیر لینے والا دن) (سورہ هُود : ۸۴)
(۳) يَوم" مَّجْمُوع (جمع ہونے کا دن) (سورہ هُود : ۱۰۳)
(۴) يومُ الْحَسْرة (حسرت و ندامت کا دن) (سورہ مریم : ۳۹)
(۵) يَومُ الحساب (سورہ صٓ : ۲۶)
(۶) يَوم الوقت المعلوم (سورہ صٓ : ۸۱)
(۷) يومُ الآزِفة (قریبی مصیبت والا دن) (سورةُ المؤمن : ۱۸)
(۸) يومُ الجمع (اکٹھا ہونے کا دن) (سورة التَّغَابُن : ۹)
(۹) يومُ التَّغابُن (نفع و نقصان کے ظاہر ہونے کا دن) (سورة التَّغَابُن : ۹)
(۱۰) أَلْحَآقّة (ہو کے رہنے والی) (سورة الحآقّة : ۱' ۲)
(۱۱) يومُ القِيٰمة (روزِ قیامت) (سورة القيٰمة : ۱)
(۱۲) يومُ الفَصْل (فیصلے کا دن) (سورة المُرسَلات : ۳۸)

(۱۳) یَومُ التَّنَادِ (پکار کا دن) (سورۃ المؤمن : ۳۲)
(۱۴) نَبَاٍ عَظِیم (بڑا واقعہ) (سورۃ النّبا : ۲)
(۱۵) یَوم" عظیم (بڑا سخت دن) (سورۃ المطففین : ۵)
(۱۶) اَلْغَاشِیة (محیط عام واقعہ) (سورۃ الغاشیۃ : ۱)
(۱۷) اَلْقَارِعَة (کھڑکھڑانے والی) (سورۃ القارعۃ : ۱، ۲)
(۱۸) اَلسَّاعَة (وہ مخصوص گھڑی) (سورۃ الروم : ۱۲، ۱۴، ۵۵)

(Encyclopaedia of the Qur'an, Vol. 2, pp. 45-48)

اِن بہت سے ناموں میں جو نام لائقِ غور ہے وہ" یوم" مُحِیط (گھیر لینے والا دن) ہے جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ فرمائیں گے اور اُن کے اعمال کی جوابدہی کے لئے اُنہیں اپنے حضور پیش کریں گے۔

قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی کیونکہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (سورۃ الاعراف' آیت ۱۸۷) اگر چہ اس کی اَشراط اور علامات کتبِ حدیث میں موجود ہیں اور اُن میں سے تقریباً تمام علامات پوری ہو چکی ہیں۔ وقتِ قیامت زندگی کی تمام سرگرمیاں رک جائیں گی۔ قیامت کی ہولناکیوں کو بیان کرنے میں قرآن مجید کا بیان واضح ہے۔ وہ ہولناکیاں دنیا کی خوش آہنگی کو دگرگوں کر دیں گی جیسا کہ اِن آیات سے ظاہر ہے:

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ o وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ o وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ o وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ o وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ o وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ o وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ o وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ o بِاَىِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ o وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ o وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ o وَاِذَا الۡجَحِيۡمُ سُعِّرَتۡ o وَاِذَا الۡجَـنَّةُ اُزۡلِفَتۡ o عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ o (التّکویر : ۱ تا ۱۴)

"جب آفتاب لپیٹ لیا جائے گا۔ جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ جب پہاڑ اُکھیڑ دیئے جائیں گے۔ جب اونٹنیاں چھٹی پھرنے لگیں گی۔ جب وحشی جانور یکجا کر دیئے جائیں گے۔ جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔ جب جانیں (جسموں) سے جوڑی جائیں گی۔ جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی۔ جب اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے۔ جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔ جب دوزخ خوب دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب کر دی جائے گی (تو اُس دن) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا (اعمال) لے کر آیا ہے۔" (۱ تا ۱۴ : ۸۱)

"جب آفتاب لپیٹ لیا جائے گا"۔ آفتاب کے طلوع ہونے پر اُس کی کرنیں اندھیروں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو آناً فاناً منور کر دیتی ہیں لیکن اُس روز اُس کی نور افشانی کرنے والی کرنیں اُس کے گرد لپیٹ دی جائیں گی اور جب یہ منبع نور بے نور ہو جائے گا تو اُس وقت جو اندھیرا پھیلے گا وہ کس قدر گہرا اور کتنا بھیانک ہوگا! اس کا تصوّر ہی ہوش رُبا ہے۔

''جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔'' وہ قانونِ کشش جو ہر ستارے کو اپنے مقام پر اور ہر سیارہ کو اپنے مدار میں روکے ہوئے ہے' وہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا۔ ستارے اپنی اپنی جگہ سے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ بعض نے اِنْکَدَرَتْ کا معنی بے نور ہونا کیا ہے یعنی ستاروں کی چمک ختم ہو جائے گی۔

''جب پہاڑ اُکھیڑ دیے جائیں گے۔'' کششِ ثقل کے فنا ہونے سے پہاڑوں کا وزن باقی نہیں رہے گا۔ ہوا کے جھونکے روئی کے گالوں کی طرح اُنہیں فضا میں اُڑانے لگیں گے۔ انجام کار اُن کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا جیسا کہ سورۃ القارِعۃ کی آیت پنجم میں بیان ہوا۔

''جب اونٹنیاں چُھٹی پھریں گی۔'' عِشَار اُس گابھن اونٹنی کو بھی کہتے ہیں جسے دسواں مہینہ ہوا اور وہ جلد ہی ایک بچے کو جنم دینے کے ساتھ شیر دار ہونے والی ہو۔ اہلِ عرب کو ویسے ہی اونٹ بڑے عزیز ہوتے ہیں' خصوصاً وہ اونٹنی جس کے حمل کو دس ماہ گزر چکے ہوں' اُن کے نزدیک وہ متاعِ گراں بہا شمار ہوتی ہے۔ وہ اُس کی حفاظت اور رکھوالی پوری توجہ سے کرتے ہیں لیکن قیامت کے روز لوگوں کی بدحواسی کا یہ حال ہو گا کہ ایسی قیمتی چیز کا بھی کوئی پُرسانِ حال نہ ہو گا اور ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہو گی۔

''جب وحشی جانور یکجا کر دیے جائیں گے۔'' صرف انسان ہی بدحواس نہ ہوں گے بلکہ جنگلی جانور جو انسان کی آواز سے بدکتے اور اُس کے سائے سے دُور بھاگتے ہیں' وہ بھی جنگل بیابان چھوڑ کر شہروں میں آگھسیں گے۔ نہ کوئی گدھا کسی کو دولتیاں مارے گا' نہ کوئی سانپ کسی کو ڈسے گا اور نہ کسی شیر کو کسی شکار پھاڑنے کی ہوش ہو گی۔ سب دُم دبائے اوپر تلے ایک جگہ جمع ہوں گے۔''

''جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے۔'' سمندروں میں اُس دن پانی کی لہریں نہیں' آگ کے شعلے اُٹھ رہے ہوں گے۔ پانی سے شعلوں کا اُٹھنا تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر پانی کے اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالی جائے تو تعجب اس پر نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے آگ بھڑکے گی بلکہ حیرت اس پر ہو گی کہ پانی ڈالنے سے آگ بجھ کیوں جاتی ہے۔ پانی دو گیسوں یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔ ان میں سے ایک گیس بھڑکانے والی ہے اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب اُنہیں اکٹھا کیا جائے تو یہ آگ کی صورت اختیار کر لیں لیکن قادرِ مُطلق نے اُن کے مرکب کو پانی کی شکل دے دی اور اُس میں آگ بجھانے کی تاثیر رکھ دی۔ قیامت کے دن جب دوسرے تکوینی ضابطے بالائے طاق رکھ دیے جائیں گے' سورج' ستارے اور پہاڑ کیا سے کیا بن جائیں گے' پانی کے اس ضابطے پر بھی قلمِ تنسیخ کھینچ دیا جائے گا۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئیں گی اور اُن کے بے پایاں ذخائر جو سمندروں میں پانی کی صورت میں آج ٹھاٹھیں مار رہے ہیں' وہ بھڑکتے شعلے بن جائیں گے۔

''جب جانیں (جسموں) سے جوڑی جائیں گی۔'' یعنی اعمال واخلاق کے مطابق انسانوں کی گروہ بندی کی

جائے گی۔ مقربین کا ایک گروہ ہوگا' اصحابِ یمین ایک پرچم تلے اکٹھے ہوں گے اور اصحابِ شمال کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔

''جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی۔'' یہ نہیں فرمایا گیا کہ اُس کے سنگ دل باپ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی بچی کو کیوں زندہ درگور کیا بلکہ فرمایا کہ اُس بچی سے پوچھا جائے گا کیونکہ یہ باپ جس نے اپنی بے گناہ بچی پر ایسا ظلم کیا ہے' نگاہِ خداوندی میں اِس قابل ہی نہیں کہ اُسے خطاب کیا جائے (روح المعانی) یعنی اس انداز سے اپنے غصّے اور ناراضگی کی انتہا کا اظہار کیا گیا' اُسے مخاطب بنانے کے درجے سے ہی گرا دیا گیا اور اُسے رسوا کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔ نیز ظالم سے اگر اُس کے ظلم کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ اس کے لئے کئی حیلے بہانے تراشنے لگتا ہے۔ اس لئے مناسب یہی تھا کہ مظلوم سے پوچھا جائے تاکہ وہ اپنے غم والم کی داستان بیان کرے۔

اِس میں ایک اور حکمت بھی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں کئی مظلوم ہوتے ہیں جنہیں ظلماً قتل کیا جاتا ہے لیکن اُن کا انتقام لینے کے لئے کئی تلواریں بے نیام ہو جاتی ہیں یا کم از کم اُن کی مظلومیت پر رنج و غم کے آنسو تو بہائے جاتے ہیں اور یہ ایسی مظلومہ تھی جس پر ظلم اُس کے ماں باپ نے کیا۔ اُس کی مظلومیت پر کسی نے صدائے احتجاج بھی بلند نہ کی' اُس کی جواں مرگی پر کوئی آنکھ نمناک تک نہ ہوئی بلکہ الٹا اطمینان کا سانس لیا گیا' اُس کے قاتل پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے گئے' اُسے ''غیرتمند'' اور اپنے ''خاندان کی ناموس کے پاسبان'' کا خطاب دیا گیا۔ کیا مظلومیت میں اس کا کوئی ہمسر ہے؟ اگر ایسی معصوم' ستم رسیدہ بچی کی دلجوئی اُس کا پروردگار بھی نہ کرے تو اور کون کرے گا؟

اِس سوال میں قیامت کے برپا کرنے کی حکمت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تم خود سوچو کہ اگر قیامت برپا نہ ہو تو کیا اس مظلومہ کی دادرسی کی کوئی اور صورت ہو سکتی ہے۔ اگر اتنا بڑا دلوں کو لرزا دینے والا ظالم محاسبہ سے بچ جائے تو اس سے بُری اندھیر گردی اور کیا ہو سکتی ہے! وہاں اندھیر گردی اور جور و ستم نہیں بلکہ عدل و انصاف ہے۔

''جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔'' آج انسان چرخ نیلوفری کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو اُس کے جلال و جمال کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے لیکن اُس دن جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی یعنی جب آسمان کے اوپر کی چیزیں بھی بے پردہ نظر آنے لگیں تو جلال و جمال سب فنا ہو جائے گا اور اُس کے چپے چپے سے وحشت برسنے لگے گی۔

اُس دن غفلت کے سارے پردے اُٹھ جائیں گے اور ہر قسم کا خمار اتر جائے گا اور ہر شخص کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اُس نے اپنی زندگی میں کیا کھویا' کیا پایا؟ اُس کے نیک و بد سب اعمال اُسے اپنے سامنے نظر آنے لگیں گے۔ یہ علم ایسا یقینی اور قطعی ہوگا کہ اس کے بعد کسی مزید قیل و قال اور چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں رہے گی اور ہر شخص کو اپنا انجام سامنے نظر آنے لگے گا۔

دَآبَّۃُ الْاَرْض: سورۃ النّمل کی آیت ۸۲ دابۃُ الارض کی بابت بتاتی ہے جو قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہوگی۔ اس کے خروج پر قرآن مجید کے علاوہ حدیثِ پاک میں بھی نصِ صریح موجود ہے۔ لہٰذا اس پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ٥ (اَلنَّمل : ۸۲)

''اور جب عذاب کا قول اُن لوگوں پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم اُن کے لئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو اُن سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں لاتے تھے۔'' (۲۷:۸۲)

''قربِ قیامت کی بہت سی علامات احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اُس وقت بہت سی عجیب وغریب چیزوں کا ظہور ہوگا اور عجیب چیزوں کا خاصہ یہ ہے کہ اپنے ظہور سے پہلے وہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ ریل، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، وائر لیس، ٹیلیویژن، انٹرنیٹ وغیرہ تمام مادّی ایجادیں پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ جب ظہور میں آئیں تب سمجھ میں آئیں۔ جس قسم کے جانور کا یہاں ذکر ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ظہور بالکل آخر میں ہوگا اور خود الفاظِ قرآن بھی یہی چاہ رہے ہیں۔ حدیث میں اس عجیب ترین حیوان کا نام ''جساسہ'' آیا ہے۔ کافر اُس وقت بالاضطرار اِس خارقِ عظیم کی تصدیق کریں گے لیکن ظاہر ہے کہ اضطراری تصدیق مقبول نہ ہوگی۔ اَلْقَول یہاں عذاب وقیامتِ موعود کے معنیٰ میں ہے۔ آیت میں مِـــنَ الْاَرْض کا لفظ بہت قابلِ غور ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس حیوان کی پیدائش عام حیوانات کی طرح بہ طریق توالد وتناسل نہ ہوگی بلکہ یہ از خود پیدا ہو جائے گا۔'' (دریابادی، ص ۷۷۷)

''وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم کا معنیٰ وَجَبَ الْوَعِيْدُ عَلَيْهِمْ یعنی اُن پر عذاب ثابت ہوگیا ہے، جب لوگ گناہوں میں سرکش ہو جائیں گے، والدین کی نافرمانی کرنے لگیں گے، آیاتِ الٰہی سے رُوگردانی کریں گے، قرآن مجید میں غور وفکر کرنا چھوڑ دیں گے، احکاماتِ الٰہی پر عمل نہیں کریں گے اور گناہوں میں اس قدر غرق ہو جائیں گے کہ اُن کے دلوں پر کوئی وعظ ونصیحت اثر نہیں کر سکے گا اور نہ ہی یادِ آخرت اور قیامت کا تذکرہ اُنہیں اس گمراہی اور بے راہ روی سے باز رکھ سکے گا۔ غرضیکہ وہ کسی پہلو راہِ راست کی طرف آنے کو تیار نہ ہوں گے اور وہ اس حد تک نافرمان اور باغی ہو جائیں گے تو پھر اُن پر اِتمامِ حجت ہو چکی اور اللہ کا قہر وغضب اُن پر برقِ آسمانی بن کر ٹوٹے گا جس کے بارے میں آیت مذکور ارشاد ہوا۔''

''یہ چوپایہ عقلمند ہوگا اور بڑی فصاحت کے ساتھ کلام کرے گا، یہ اس لئے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ چوپایہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی ہے کیونکہ اتنا تو لوگوں کو بہ ظاہر معلوم ہوتا ہی ہے کہ چوپائے عادتاً عقل رکھنے والے اور کلامِ فصیح کرنے والے نہیں ہوا کرتے۔'' (''اَلتَّذْكِرَة فی احوال الموتٰی و امور الآخرة'' لامام شمس الدین القرطبی: اردو ترجمہ از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی، ج ۲، ص ۶۵۱)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ "دآبۃُ الارض ایک عظیم الجثہ جانور ہے جو صفا پہاڑی کے شگاف سے برآمد ہوگا اور وہ نکل کر انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دے گا: مسلم اور غیر مسلم۔ کوئی بھی شخص اُس کی دسترس سے باہر نہیں ہوگا۔ اُس کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی۔ وہ ہر مؤمن کی پیشانی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے نشان لگا کر اُسے روشن کر دے گا اور کافر کے چہرے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی سے نشان لگا کر اُسے سیاہ کر دے گا۔ تمام مؤمن اور کافر اس طرح متمیز ہو جائیں گے کہ خرید و فروخت اور کھانے پینے کے وقت لوگ ایک دوسرے کو اے مؤمن! اور اے کافر! کہہ کر بلائیں گے۔ دآبۃُ الارض ہر شخص کو اُس کا نام لے کر جنت یا جہنم کی بشارت یا وعید سنائے گا۔" (تفسیر ابن کثیر، ج ۵، ص ص ۲۵۸-۲۵۶ مطبوعہ ادارہ اندلس)

"امام ثعلبی، امام ماوردی اور دوسرے ائمہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ دآبۃُ الارض یعنی یہ ارضی جانور تمام حیوانات کی صورتوں کا جامع ہوگا: اُس کا سر بیل کے سر جیسا ہوگا، اُس کی آنکھیں خنزیر کی آنکھوں سے مشابہ ہوں گی، اُس کے کان ہاتھی کے کانوں جیسے ہوں گے، سینگ بارہ سنگھا کے سینگوں جیسے ہوں گے، اُس کی گردن شتر مرغ جیسی ہوگی، اُس کا سینہ شیر کے سینہ سے مشابہ ہوگا، اُس کا رنگ چیتے جیسا ہوگا، اُس کی کمر جنگلی بلّے کی کمر جیسی ہوگی، دُم چھترے اور دُنبے جیسی ہوگی، اُس کی ٹانگیں اونٹ کی ٹانگوں جیسی ہوگی۔ اُس کے اعضاء کے ہر دو جوڑوں کے درمیان کا فاصلہ بارہ ہاتھ کے برابر ہوگا (یعنی ۱۸ فٹ جس کے چھ گز بنتے ہیں)" (ایضاً ص ۶۵۵)

وقوعِ قیامت پر عقلی دلائل : صاحبِ تبیان القرآن، علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں :

"ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ظلم کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور اُنہیں اُن کے ظلم پر کوئی سزا نہیں ملتی اور بعض لوگ ظلم سہتے سہتے مر جاتے ہیں اور اُنہیں اُن کی مظلومیت پر کوئی جزاء نہیں ملتی۔ اگر اس جہان کے بعد کوئی اور جہان نہ ہو تو ظالم سزا کے بغیر اور مظلوم جزاء کے بغیر رہ جائے گا اور یہ چیز اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہوا کہ اس عالم کے بعد کوئی اور عالم ہو جس میں ظالم کو سزا اور مظلوم کو جزاء دی جائے۔ اور سزا و جزاء کے برپا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس عالم کو بالکل ختم کر دیا جائے کیونکہ جزاء اور سزا اُس وقت جاری ہو سکتے ہیں جب بندوں کے اعمال ختم ہو جائیں اور جب تک تمام انسان اور یہ کائنات ختم نہیں ہو جاتی لوگوں کے اعمال کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ ایک شخص مسجد میں کنواں بنا کر مر جاتا ہے تو جب تک اس مسجد میں نماز پڑھی جاتی رہے گی اور جب تک اُس کنویں سے پانی پیا جاتا رہے گا، اُس شخص کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ اسی طرح کوئی شخص بت خانہ یا شراب خانہ بنا کر مر گیا تو جب تک وہاں بت پرستی یا شراب نوشی ہوتی رہے گی، اُس کے نامہ اعمال میں برائیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ اس لئے جب تک یہ دنیا اور اس دنیا میں انسان موجود ہیں، اُس وقت تک لوگوں کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہو سکتا اور لوگوں کے نامہ اعمال کو مکمل کرنے کے لئے دنیا اور دنیا والوں کو مکمل طور پر ختم کرنا ضروری ہے اور اسی کا نام قیامت ہے۔"

''خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جزاء اور سزا کا نظام قائم کیا جائے اور جزاء وسزا کو نافذ کرنے سے پہلے قیامت کا قائم کرنا ضروری ہے۔'' [اَلتَّذکِرۃ فی أحوالِ المَوتٰی وأمور الآخِرۃ (اردو ترجمہ) جلد اوّل' صفحات ۳۶' ۳۷]

''وقوعِ قیامت پر شرعی دلائل : یہ دنیا دارالامتحان ہے جس میں انسان امتحان دینے والا اور اللہ تعالیٰ ممتحن ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا لیکن نیک اور بد' اطاعت گزار اور نافرمان' موافق اور مخالف' مؤمن اور کافر میں فرق کرنا ضروری ہے اور یہ فرق صرف قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

(۱) اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِo (صٓ : ۲۸)

''کیا ہم ایمان والوں اور نیکوکاروں کو فسادیوں کی طرح کردیں گے؟ یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کردیں گے؟'' (۳۸ : ۲۸)

(۲) اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَo (الجاثیۃ : ۲۱)

''کیا بُرے کام کرنے والوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ ہم انہیں ایمان والوں اور نیکوکاروں کی طرح کردیں گے کہ (ان سب کی) زندگی اور موت برابر ہو جائے؟ وہ کیسا ہی بُرا فیصلہ کرتے ہیں!''

(۳) لِيَجۡزِىَ الَّذِيۡنَ اَسَآءُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا وَيَجۡزِىَ الَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا بِالۡحُسۡنٰىo (النّجم : ۳۱)

''تاکہ اللہ بُرے کام والوں کو اُن کی سزا دے اور نیکی کرنے والوں کو اچھی جزا دے۔''

(۴) اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَo مَا لَكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَo (القلم : ۳۵' ۳۶)

''کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں جیسا بنادیں گے' تمہیں کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو!''

''دنیا میں راحت اور مصیبت کا آنا مکمل جزاء اور سزا نہیں ہے : ہر چند کہ بعض لوگوں کو دنیا میں ہی اُن کی بدعملیوں کی سزا مل جاتی ہے مثلاً اُن کا مالی نقصان ہو جاتا ہے یا وہ ہولناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن یہ اُن کی بدعملیوں کی پوری پوری سزا نہیں ہوتی۔ اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں کہ وہ ساری عمر عیش پرستی' ہولناکیوں اور ظلم وستم میں گزار دیتے ہیں۔ پھر اچانک اُن پر مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے اور اُن کی دولت اور طاقت کا نشہ کافور ہو جاتا ہے لیکن اُن کے جرائم کے مقابلہ میں یہ بہت کم سزا ہے۔ اس لئے اُن کی مکمل سزا کے لئے ایک اور جہان کی ضرورت ہے۔ جہاں قیامت کے بعد انہیں پوری پوری سزا ملے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:۔

وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰى دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَo (السّجدۃ : ۲۱)

''ہم انہیں بڑے عذاب سے پہلے (دنیا میں) ہلکا عذاب ضرور بالضرور چکھائیں گے تاکہ وہ باز آجائیں۔''

نفخِ صور' حشر ونشر اور قیامت : صُور کے اعصاب شکن' تند و تیز دھماکے کا ذکر جو روزِ قیامت کے وقوع

کا اشارہ ہوگا' قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے' کہیں صُوْر (سورۃ الحاقّۃ : ۱۳) کے نام سے اور کہیں ناقُور (سورۃ المدّثّر: ۸) کے نام سے۔ اِن بیانات میں قرآنی نقش گری بڑی بارُعب ہے جیسا کہ درج ذیل آیات سے ظاہر ہے جو نفخۂ اُولیٰ سے متعلق ہیں البتہ ذیل کی پہلی آیت (۶۸) میں دونوں نفخوں کا بیان ہے :

(۱) وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○ (الزُّمَر : ۶۸)

''اور صُور پھونکا جائے گا تو اُن سب کے ہوش اُڑ جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اُس کے جسے اللہ چاہے۔ پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے گا جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے رہ جائیں گے۔'' (۳۹:۶۸)

مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلی بار صور مخلوق کی موت کے لئے پھونکا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی حالت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ یعنی ابوجہل اور اُس کے ساتھی صرف ایک چیخ اور زوردار دھماکے کے منتظر ہیں۔ اس سے مراد نفخہ اُولیٰ ہے جس سے سارے کفار ہلاک ہو جائیں گے۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روزِ قیامت سے قبل کافروں پر اونگھ طاری ہوگی جس میں وہ نیند کا مزہ پائیں گے۔ پھر جب اہلِ قبور کو اٹھانے کے لئے چیخ دار آواز پڑے گی تو سب گھبرائے ہوئے جلدی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور سر اٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے بول پڑیں گے:

يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسٓ : ۵۲)

''ہائے ہماری خرابی! کس نے ہمیں نیند سے جگا دیا۔'' (۳۶: ۵۲)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کفار یہ بات اس لئے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دونوں نفخوں کے درمیان اُن سے عذاب اُٹھا دے گا اور اتنا زمانہ وہ سوتے رہیں گے اور نفخہ ثانیہ کے بعد جب اٹھائے جائیں گے اور قیامت کی ہولناکیاں دیکھیں گے تو اس طرح چیخ اٹھیں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کفار جہنم اور اس کے عذاب کو دیکھیں گے تو اُس کے مقابلہ میں عذابِ قبر اُنہیں ہلکا اور سہل معلوم ہوگا۔ اور اُس وقت فرشتے یا مؤمنین اُن کفار سے کہیں گے: هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یہ ہے وہ جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ فرمایا تھا) اور ایک قول کے مطابق اس مقولہ کے قائل خود کافر ہوں گے کہ وہ اُٹھنے کے بعد باہم ایک دوسرے سے یہ کہیں گے لیکن ہم نے اُنہیں جھٹلایا تھا لیکن اُس وقت کا اقرار اُنہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔ پھر سب کو حکم ہوگا کہ حساب کے لئے موقف کی طرف چل دو اور وہاں جمع ہو جاؤ۔

(۲) فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ○ وَّ حُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ○ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ○ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ○ (اَلْحَآقَّة : ۱۳ تا ۱۶)

''جب صُور یکبارگی پھونک دیا جائے گا اور زمین اور پہاڑ اٹھالئے جائیں گے' یہ دونوں ایک دفعہ میں

ریزہ ریزہ کردئے جائیں گے تو اُس دن وہ ہونے والی چیز ہو کے رہے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اُس دن بالکل بودا ہوگا۔'' (۱۳ تا ۱۶ : ۶۹)

نفخہ اُولیٰ کی دہشتناک آواز سے تمام دنیاوی کاروبار معطّل ہو کے رہ جائیں گے اور رب تعالیٰ کی ذات کے سوا تمام جاندار اور بے جان چیزیں فنا ہو جائیں گی جیسا کہ سورۃ اَلْقَصَص کی (آخری) آیت ۸۸ اور سورہ اَلرَّحمٰن کی آیات ۲۶،۲۷ میں ارشاد ہوا۔ توحید الٰہی کو بہ تاکید منوانے اور جتانے کے لئے موت کا ہونا ضروری تھا اور دوبارہ زندگی کا ملنا اس لئے ضروری ہوا تا کہ الٰہی انصاف ظالم کی گردن تک پہنچ سکے اور مظلوم کی دادرسی کر سکے۔ دہشت اور ہول کا وہ انتہائی وقت یقیناً ہوگا لیکن اہلِ ایمان کو دہشت کیوں ہونے لگی۔ اُنہیں تو خوابِ موت سے جاگتے ہی تسکین، تشفی اور دلدہی کے لئے فرشتے مل جائیں گے جو اعزاز و اِکرام سے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۳ میں فرمایا :

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○
''اُنہیں بڑی گھبراہٹ ذرا بھی غم میں نہ ڈالے گی اور اُن کا استقبال تو فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کریں گے کہ یہ ہے آپ کا وہ دن جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔'' (۱۰۳ : ۲۱)

عالَمِ برزخ : ''بـــــرزخ'' کا لفظی معنیٰ دو چیزوں کے درمیان پردہ اور آڑ کا ہے اور یہ لفظ سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۰۰ اور سورۃ الفُرقان کی آیت ۵۳ میں استعمال ہوا ہے۔ تابعی مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''برزخ'' وقتِ موت سے وقتِ حشرِ اجساد (دوبارہ زندہ کیا جانا) تک کی مدت کو کہتے ہیں۔

نفخہ ثانیہ : جیسا کہ بیان ہوا کہ نفخہ اوّل پر تو تمام مخلوقات فنا کی نذر ہو جائے گی۔ لیکن دوسرے نفخہ پر وہ اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے اعمال کے میزان اور جوابدہی کے لئے ربِّ ذوالجلال کے حضور حاضری کے لئے چل دیں گے جس کا ذکر قرآن مجید کی کئی آیات میں ہوا۔ مثلاً :

(۱) يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ (الاسراء : ۵۲)
''جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اُس کی حمد کرتے چلے آؤ گے۔'' (۵۲ : ۱۷)

(۲) فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ○ (المؤمنون : ۱۰۱)
''جب صور پھونکا جائے گا تو نہ اُن میں رشتے رہیں گے اور نہ اُس دن (کوئی) ایک دوسرے کی بات پوچھے گا۔''

(۳) وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ○ (یٰسٓ : ۵۱)
''اور صور پھونکا جائے گا جبھی وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف دوڑتے چلیں گے۔'' (۵۱ : ۳۶)

(۴) إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ○ (یٰسٓ : ۵۳)
''وہ تو ایک ہولناک آواز ہی ہوگی اور سب کے سب فوراً ہمارے رُوبرو حاضر ہو جائیں گے۔''

(۵) يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًاo (أَلنَّبا : ۱۸)
''جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوجوں کی فوجیں۔'' (۱۸ : ۷۸)

سورۂ القلم کی آیت ۴۲ الٰہی اظہار کی عجیب کیفیت کو آشکار کرتی ہے:
يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَo (القلم : ۴۲)
''جس دن پنڈلی کی تجلّی فرمائی جائے گی اور سجدہ کی طرف بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔''

ٹخنے اور گھٹنے کی درمیانی جگہ کو عربی میں سَاق کہتے ہیں اور کَشف ساق شدت اور سختی سے کنایہ ہے۔ جب کسی معاملہ کی شدت اور ہولناکی کی خبر دینا ہو تو ''ساق'' کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے:
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِo (سورۃ القیامۃ : ۲۹)
''یعنی دنیا کی آخری شدت، روزِ قیامت کی پہلی شدت سے لپٹ جائے گی۔'' (۲۹ : ۷۵)

اس محاورہ کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ روزِ قیامت جب حالات بڑے تکلیف دِہ اور ہولناک ہو جائیں گے اور ہر شخص جلالِ خداوندی سے لرزہ براندام ہوگا اور دل خوف سے دھڑک رہے ہوں گے، اُس وقت لوگوں کے ایمان یا کفر، خلوص یا نفاق کو ظاہر کرنے کے لئے اُنہیں حکم دیا جائے گا کہ آؤ سب اپنے رب کو سجدہ کرو۔ جن کے دلوں میں ایمان اور اخلاص ہوگا، وہ فوراً سربسجود ہو جائیں گے لیکن کافر اور منافق سجدہ کرنے کے لئے بہت زور لگائیں گے کہ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جائیں لیکن اُن کی کمر اکڑ جائے گی اور بڑی کوشش کے باوجود بھی سجدہ نہ کر سکیں گے۔ اس رسوائی پر اُن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور اُن کے کھوکھلے دعووں کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ جائے گا۔

''سَاق'' کسی چیز کی اصل کو بھی کہتے ہیں جس پر وہ قائم ہو جیسے درخت کے تنے اور انسان کی ٹانگ کو سَاق کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تمام لوگوں کے اعمال کی اصل کو کھولا جائے گا اور تمام حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ساق سے مراد نورِ عظیم ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کی ہے (مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۷۲۸۳)۔

اِس سجدہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قیامت تو دارالجزاء ہے، دارالعمل نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مکلّف ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حصولِ لذّت اور حصولِ تقرب کے لئے سجدہ کریں گے۔

<u>اَلْحِسَاب (جوابدہی کا وقت)</u>: وقتِ حساب کی آمد قرآن مجید کا مستقل موضوع ہے جس کے مطابق ہر ہر فرد کو اپنے اعمال و افعال کا ضرور بالضرور جواب دینا ہوگا۔ نامہ ہائے اعمال جو اُس وقت تک عالمِ غیب میں فرشتوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوگا، حشر میں کھول کر ہر بندہ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، کیونکہ:

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ٥ (یٰسٓ : ۱۲)
''اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں درج کر رکھا ہے۔'' (۱۲ : ۳۶)

اور اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا٥ (الاسراء : ۱۴)
''لے اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے تو خود ہی اپنے حق میں حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔'' (۱۷:۱۴)

اور جیسا کہ اس سے قبل کی آیت (۱۳) میں کہا گیا کہ ہر انسان کا عمل ہم نے اُس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے یعنی ہر حال میں ہم نے اُس کے عمل کو اس کے ساتھ غیر منفک جزء کے طور پر لازم کر دیا ہے کہ محاورہ عرب میں اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ شدتِ لزوم اور کمال ربط کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ آیت میں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ ہر آدمی اپنے اچھے بُرے اعمال کے واسطہ سے اپنے مقدر کا خود معمار ہے۔ سورۃ الحاقۃ (۶۹) کی اِن آیات نے معاملہ کی حقیقت کو مزید طشت از بام کر دیا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَاۗؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ٥ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ٥ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ٥ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ٥ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ٥ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْۗئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ٥ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ٥ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ٥ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ٥ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ٥ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ٥ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ٥ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ٥ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ٥ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ٥ (اَلْحَاۗقَّةُ : ۱۹ تا ۳۴)

''تو جس شخص کا نامہ اعمال اُس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا لو! میرا نامہ اعمال پڑھ لو۔ میں تو جانتے ہوئے تھا کہ مجھے میرا حساب ضرور پیش آنے والا ہے تو وہ شخص خوب مزے کی زندگی میں ہوگا' بہشتِ بریں میں ہوگا جس کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے' کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اُن اعمال کے بدلہ میں جو تم گزشتہ ایام میں کر چکے ہو۔ اور رہا وہ جس کا نامہ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا: کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجھے میرا نامہ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے' کاش موت ہی خاتمہ کر چکی ہوتی۔ میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔ میرا جاہ (بھی) مجھ سے گیا گزرا ہوا۔ اُسے پکڑو اور اُسے طوق پہناؤ' پھر اُسے دوزخ میں داخل کر دو' پھر اُسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستر گز ہے۔ اُس کا ایمان ہی خدائے بزرگ پر نہ تھا اور نہ وہ غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔''

(۱۹ تا ۳۴ : ۶۹)

قرآن مجید میں ''میزان'' جمع کے لفظ ''موازین'' کے لفظ کے ساتھ ذکر ہوا ہے (سورۃ الانبیاء: ۴۷) جبکہ حدیثِ پاک میں مفرد اور جمع دونوں طرح آیا ہے اس لئے اختلاف ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کئی میزان ہوں۔ بہر حال ''میزان'' روزِ حشر کی نہایت اہم صداقتوں میں سے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میزان ایک ہو لیکن اُسے تعبیر جمع کے صیغہ سے کیا گیا ہو۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء میں ہے: كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ٥ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ٥ حالانکہ

(۵) يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًاO (ألنّبا : ۱۸)
''جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوجوں کی فوجیں۔'' (۱۸ : ۷۸)

سورۂ القلم کی آیت ۴۲ الٰہی اظہار کی عجیب کیفیت کو آشکار کرتی ہے:
يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلاَ يَسْتَطِيْعُوْنَ O (القلم : ۴۲)
''جس دن پنڈلی کی تجلّی فرمائی جائے گی اور سجدہ کی طرف بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔''

ٹخنے اور گھٹنے کی درمیانی جگہ کو عربی میں سَـــاق کہتے ہیں اور کَشف سـاق شدت اور سختی سے کنایہ ہے۔ جب کسی معاملہ کی شدت اور ہولناکی کی خبر دینا ہو تو ''ساق'' کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے:
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِO (سُوْرة القيامة : ۲۹)
''یعنی دنیا کی آخری شدت، روزِ قیامت کی پہلی شدت سے لپٹ جائے گی۔'' (۲۹ : ۷۵)

اس محاورہ کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ روزِ قیامت جب حالات بڑے تکلیف دِہ اور ہولناک ہو جائیں گے اور ہر شخص جلالِ خداوندی سے لرزہ براندام ہوگا اور دل خوف سے دھڑک رہے ہوں گے، اُس وقت لوگوں کے ایمان یا کفر، خلوص یا نفاق کو ظاہر کرنے کے لئے اُنہیں حکم دیا جائے گا کہ آؤ سب اپنے رب کو سجدہ کرو۔ جن کے دلوں میں ایمان اور اخلاص ہوگا، وہ فوراً سربسجود ہو جائیں گے لیکن کافر اور منافق سجدہ کرنے کے لئے بہت زور لگائیں کہ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جائیں لیکن اُن کی کمر اکڑ جائے گی اور بڑی کوشش کے باوجود بھی سجدہ نہ کر سکیں گے۔ اس رسوائی پر اُن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور اُن کے کھوکھلے دعووں کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ جائے گا۔

''سَـــــاق'' کسی چیز کی اصل کو بھی کہتے ہیں جس پر وہ قائم ہو جیسے درخت کے تنے اور انسان کی ٹانگ کو سَاق کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تمام لوگوں کے اعمال کی اصل کو کھولا جائے گا اور تمام حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ساق سے مراد نورِ عظیم ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کی ہے (مسند ابو یعلی رقم الحدیث: ۷۲۸۳)۔

اس سجدہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قیامت تو دار الجزاء ہے، دار العمل نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مکلّف ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حصولِ لذّت اور حصولِ تقرب کے لئے سجدہ کریں گے۔

اَلْحِســـاب (جوابدہی کا وقت) : وقتِ حساب کی آمد قرآن مجید کا مستقل موضوع ہے جس کے مطابق ہر ہر فرد کو اپنے اعمال و افعال کا ضرور بالضرور جواب دینا ہوگا۔ نامہ ہائے اعمال جو اُس وقت تک عالمِ غیب میں فرشتوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوگا، حشر میں کھول کر ہر بندہ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، کیونکہ :

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ○ (يٰسٓ : ۱۲)
''اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں درج کر رکھا ہے۔'' (۳۶ : ۱۲)
اور اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ○ (الاسراء : ۱۴)
''لے اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے' تو خود ہی اپنے حق میں حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔'' (۱۷:۱۴)

اور جیسا کہ اس سے قبل کی آیت (۱۳) میں کہا گیا کہ ہر انسان کا عمل ہم نے اُس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے یعنی ہر حال میں ہم نے اُس کے عمل کو اس کے ساتھ غیر منفک جزء کے طور پر لازم کر دیا ہے کہ محاورہ عرب میں اَلْزَمْنٰهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ شدتِ لزوم اور کمال ربط کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ آیت میں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ ہر آدمی اپنے اچھے بُرے اعمال کے واسطہ سے اپنے مقدر کا خود معمار ہے۔ سورۃ الحاقۃ (۶۹) کی اِن آیات نے معاملہ کی حقیقت کو مزید طشت از بام کر دیا ہے:

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ○ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ○ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ○ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ○ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يٰلَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ○ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ○ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ○ مَا أَغْنٰى عَنِّي مَالِيَهْ ○ هَلَكَ عَنِّي سُلْطٰنِيَهْ ○ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ○ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ○ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ○ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ ○ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ○ (اَلْحَاقَّة : ۱۹ تا ۳۴)

''تو جس شخص کا نامہ اعمال اُس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا لو! میرا نامہ اعمال پڑھ لو۔ میں تو جانے ہوئے تھا کہ مجھے میرا حساب ضرور پیش آنے والا ہے تو وہ شخص خوب مزے کی زندگی میں ہوگا' بہشتِ بریں میں ہوگا جس کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے' کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اُن اعمال کے بدلہ میں جو تم گزشتہ ایام میں کر چکے ہو۔ اور رہا وہ جس کا نامہ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا : کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجھے میرا نامہ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے' کاش موت ہی خاتمہ کر چکی ہوتی۔ میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔ میرا جاہ (بھی) مجھ سے گیا گزرا ہوا۔ اُسے پکڑو اور اُسے طوق پہناؤ' پھر اُسے دوزخ میں داخل کر دو' پھر اُسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستر گز ہے۔ اُس کا ایمان ہی خدائے بزرگ پر نہ تھا اور نہ وہ غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔''
(۱۹تا۳۴ : ۶۹)

قرآن مجید میں ''میزان'' جمع کے لفظ ''موازین'' کے لفظ کے ساتھ ذکر ہوا ہے (سورۃ الانبیاء:۴۷) جبکہ حدیث پاک میں مفرد اور جمع دونوں طرح آیا ہے اس لئے اختلاف ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کئی میزان ہوں۔ بہر حال ''میزان'' روزِ حشر کی نہایت اہم صداقتوں میں سے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میزان ایک ہو لیکن اُسے تعبیر جمع کے صیغہ سے کیا گیا ہو۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء میں ہے : كَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِينَ ○ كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ○ حالانکہ

رسول ایک ہی ہیں جنہیں قومِ عاد نے جھٹلایا تھا اور اسی طرح قومِ ثمود نے ایک رسول کو جھٹلایا مگر ایک رسول کو جمع کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے ''مُرسَلین'' فرمایا گیا ہے۔ یہی حال میزان اور موازین کا ہے۔

میزان کو مجازی معنیٰ میں لینے کی تردید: علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ اگر میزان کو مجازی معنیٰ میں لیا جائے جیسا کہ بعض علماء سے منقول ہے تو پھر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ''پُل صراط'' سے مراد ''دینِ حق'' ہے اور جنت اور دوزخ سے مراد کھ' تکلیف اور خوشی اور فرحت ہے جو روح پر وارد ہوتی ہیں اور شیاطین اور جنّوں سے مراد اخلاقِ مذمومہ ہیں اور ملائکہ نام ہے قوائے محمود کا یعنی شر کی قوت کا نام جنّ رکھ دیا گیا ہے اور قوّتِ خیر کو ملائکہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ یہ سب باطل اور فاسد ہے کیونکہ یہ صادق و مصدوق نبی ﷺ کی حدیثِ مبارکہ سے مردود ہے اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: فَیُعطٰی صَحِیفَةُ حَسَنَاتِهٖ (اُسے اُس کی نیکیوں کا صحیفہ دیا جائے گا) اور فَیُخرَجُ لَهٗ بطَاقَة'' (اُس کا نامہ عمل نکالا جائے گا) اور یہ میزانِ حقیقی پر دلیل ہے اور موزون یعنی جس چیز کا وزن کیا جائے گا وہ صحیفہ ہائے اعمال ہوں گے۔(''اَلتَّذکِرة فِی احوال الموتٰی و أمور الآخرة'' لشمس الدین قرطبی ترجمہ: غلام نصیرالدین گولڑوی' ج ۲' ص ۴۲)

''آخرت میں میرٹ کی بنیاد پر درجہ بندی: ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ آخرت میں لوگوں کے تین طبقات ہوں گے: (۱) پہلا طبقہ ایسے متقی اور پرہیزگاروں کا ہوگا جو کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ (۲) دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا ہوگا جن کے اعمال ملے جلے ہوں گے۔ اُنہوں نے نیک کام بھی کئے ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ فواحش اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی کیا ہوگا۔ (۳) تیسرا طبقہ کفار کا ہوگا۔''

''نیک لوگوں کے نیک کاموں کو روشن اور جگمگاتے ہوئے پلڑائے میزان میں رکھا جائے گا اور اگر اُن کے صغیرہ گناہ بھی ہوئے تو اُنہیں دوسرے پلڑے میں ڈال دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن صغائر کا وزن نہیں ہوگا اور نیکیوں والا پلڑا مسلسل بھاری رہے گا یہاں تک کہ صغائر کی ظلمت کافور ہو جائے گی اور صغائر کی اس کالک اور سیاہی کے اُڑ جانے سے گناہوں والا پلڑا خالی رہ جائے گا۔''

''جن لوگوں کے اعمال ملے جلے اور مخلوط ہوں گے' اُن کی نیکیوں کو روشن پلڑے میں اور اُن کے گناہوں کو تاریک پلڑے میں رکھا جائے گا تو اُن کے کبائر کا بوجھ ہوگا۔ اگر تو اُن کی نیکیوں کا وزن برائیوں سے بڑھ گیا' چاہے ایک کھجور برابر ہی ہو تو وہ جنتی ہوگا اور اگر گناہوں کا پلڑا بھاری ہوا اگرچہ ذرّہ برابر ہی ہو تو وہ دوزخ میں جائے گا اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے اُسے معاف فرما دے اور اگر اُس کے گناہ اور نیکیاں دونوں برابر اور مساوی ہوئے تو وہ جنت اور جہنم کے درمیان مقامِ اعراف میں ٹھہرے گا۔'' (ایضاً ص ۴۳) جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیات ۴۶' ۴۷' ۴۸ میں ہوا۔

اس طرح ''مِیـــزان''اس دنیاوی زندگی میں احساسِ ذمہ داری اور حق و انصاف کے مابین تطبیق اور ہم آہنگی کا نام ہے۔ الٰہی فیصلہ میں نرمی اور رعایت کرنے یا اُس کے نفاذ میں التواء سے متعلق کسی قسم کے احتجاج یا عذر خواہی کی گنجائش نہیں ہوگی۔ فیصلہ اپنی قطعیت میں حتمی اور حرفِ آخر ہوگا اور بندے کے اَعمال کا براہِ راست نتیجہ ہوگا۔ صادر شدہ فیصلہ کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بندے کے اپنے اعضاء و جوارح گواہی دیں گے اور اُن کی کل روئدادِ زندگی رتی رتی حق تعالیٰ کے سامنے اُنہی کے ہاتھوں پیروں کی زبانی پیش ہوگی:۔

(۱) يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (اَلنُّور: ۲۴)

''اُس دن اُن کے خلاف اُن کی زبانیں' اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے اُن کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے۔'' (۲۴ : ۲۴)

(۲) اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (یٰسٓ)

''آج ہم اُن کے منہ وں پر مُہر لگا دیں گے اور ہم سے اُن کے ہاتھ کلام کریں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے رہتے تھے۔'' (۶۵ : ۳۶)

(۳) حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

''یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو اُن کے کان' اُن کی آنکھیں اور اُن کی جلدیں اُن کے خلاف اُن کے اعمال کی گواہی دیں گے۔'' (سورہ فُصِّلَت ۲۰ : ۴۱)

<u>مقامِ اَعراف</u>: اَعـــراف کے لفظی معنٰی بلند چیز کے ہیں۔ اصطلاح میں یہ اُن لوگوں کا مقام ہوگا جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اور وہ (Waiting List) میں ہوں گے۔ جنت میں جانے کی اُن کی آرزو پوری کر دی جائے گی اور وہ مولائے کریم کے فضل و کرم سے بالآخر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اُن کی بابت قرآن مجید فرماتا ہے:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَن سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۝ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ۝ (الاعراف: ۴۶ تا ۴۸)

''اور اُن دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اَعراف کے اوپر (بہت سے) لوگ ہوں گے' وہ سب کو اُن کے قیافہ سے پہچانیں گے اور اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو اور (ابھی) یہ لوگ اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اگرچہ وہ اس کے آرزومند ہوں گے۔ اور جب اُن کی نگاہیں اہلِ دوزخ کی طرف جا پھریں گی تو بول اُٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں (ان) ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کرنا۔ اور اعراف والے (بہت سے) اشخاص کو پکاریں گے جنہیں وہ اُن کے قیافہ سے پہچانیں گے اور کہیں گے تمہارا جتھا اور تمہارا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا کچھ کام نہ آیا۔'' (۴۶ تا ۴۸ : ۷)

پُل ''صِراط'' : قرآن مجید میں کہیں اِس پُل کا ذکر نہیں ہے۔ تاہم اُس میں لفظ ''صِراط'' (بمعنیٰ راہ اور راستہ) بالخصوص ''صِراطِ مُستقیم'' کے ذکر میں بکثرت آیا ہے (بحوالہ سورۃ الفاتحہ کی آیت ۶ ؛ سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۱ ؛ سورہ ھُود کی آیت ۵۶ ؛ سورہ یٰس کی آیت ۴)۔ اِن تذکروں میں صرف دو آیات (سورہ یٰس: ۶۶ ؛ سورۃ الصافات: ۲۳) کا حوالہ جہنم پر کے پُل کے تصوّر کے طور پر آیا ہے' اوّل الذکر (۳۶:۶۶) غیر معیّن ہے۔ مؤخر الذکر (۳۷:۲۳) یعنی صراط الجحِیم میں پُل کا حوالہ ہے اور اسے اسلامی روایت میں جہنم کی بالائی تہہ کی علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ معادیات (حشر و نشر) کا لٹریچر اکثر اس بات کی توثیق میں ہے کہ جن لوگوں کا نہ تو ایمان ہے اور نہ ہی اُن کے اچھے عمل ہیں' وہ اس پُل کو تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک پائیں گے اور یہ کہ اُن کا اس سے نیچے گرنا جہنم سے نا قابلِ فرار ہوگا۔ تاہم مخلصین و مؤمنین اُس وسیع پُل سے بہ آسانی اور بہ سرعت گزر جائیں گے جسے سب سے پہلے نبیِ اکرم ﷺ اور پھر اُن کی اُمت عبور کرے گی۔''
(انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد دوئم' صفحہ ۴۹)

روایات میں آیا کہ قیامت کے دن لوگوں کا پُل صراط پر سے گزر اُن کے ایمان اور اعمال کے مطابق ہوگا۔ کوئی پلک جھپکنے کی مقدار میں' کوئی تیر کی طرح' کوئی تیز اُڑان والے پرندے کی طرح' کوئی عمدہ نسل کے گھوڑے کی رفتار سے' کوئی آدمی کے دوڑنے کی رفتار سے اور کوئی آہستہ چلنے کی رفتار سے گزر جائے گا یہاں تک کہ آخری نجات یافتہ شخص سُرین کے بل گھسٹتا ہوا گزرے گا۔ یہ شخص اللہ تبارک وتعالیٰ سے عرض کرے گا: اے پالنہار! میری رفتار اتنی سست اور کم کیوں ہے؟ جواب ملے گا کیونکہ تیرے عمل کمزور ہیں (اور رفتار میں تیزی اعمال کی قوّت سے پیدا ہوتی ہے)۔'' (اردو ترجمہ ''سفرِ آخرت کی منازل'' از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' جلد دوم' صفحہ ۷۱)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا : قیامت کے دن جب لوگ پُل صراط کے کنارے پر ہوں گے تو اُس وقت عرش کے نیچے سے ایک فرشتہ آواز دے گا: اے شہنشاہِ جبّار عزّ وجلّ کی مخلوق! تم پُل پر سے گزر جاؤ۔ تم میں سے جو ظالم اور نافرمان ہے' وہ رُک جائے۔ ہائے اُس گھڑی سے خدا کی پناہ! وہ کتنی خوفناک گھڑی ہوگی اور اُس وقت گرمی کس قدر سخت ہوگی! جو لوگ دنیا میں کمزور اور ذلیل تھے وہ آگے ہوں گے اور جو دنیا میں طاقتور اور مرتبہ و منصب والے تھے' پیچھے ہوں گے۔ پھر اس ترتیب کے بعد تمام لوگوں کو پُل صراط سے گزرنے کی اجازت دے دی جائے گی (اور چلنے کا سگنل ہو جائے گا) اور لوگ اپنے اعمال کے مطابق گزریں گے۔ کوئی روشنی میں چلے گا اور کوئی تاریکی میں ہوگا۔ پُل صراط پر میری اُمّت جب آندھی جیسی تیزی کے ساتھ گزر رہی ہوگی تو وہ مجھے پکاریں گے اور میں اپنی اُمّت کی ہلاکت اور نقصان کے ڈر اور اندیشہ کی وجہ سے فوراً اُس طرف دوڑوں گا اور جبریل علیہ السلام مجھے میری کمر سے پکڑے ہوئے ہوں گے اور میں بلند آواز سے پکاروں گا: ''رَبِّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ'' (اے پروردگار! میری اُمّت' میری اُمّت) آج میں تجھ سے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں مانگتا' بس میری اُمّت کو بچا لے اور فرشتے پُل صِراط کے دائیں بائیں کنارے کھڑے پکاریں گے: ''رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ'' (اے پروردگار! سلامتی' سلامتی) بڑا خوفناک منظر ہوگا۔

نافرمان لوگ دائیں بائیں گر رہے ہوں گے' سیاہ ملائکہ اُنہیں پکڑ کر زنجیروں اور طوقوں میں جکڑ دیں گے اور سخت لہجے سے کہہ رہے ہوں گے: کیا تمہیں بُرے کام کرنے سے روکا نہیں گیا تھا؟ کیا تمہیں دوزخ کا خوف نہیں دلایا گیا تھا؟ کیا تمہیں ہر طرح سے ڈرایا نہیں گیا تھا؟ کیا تمہارے پاس نبی مختار تشریف نہ لائے تھے؟ ابوالفرج ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو اپنی کتاب ''رَوضَۃُ المُشتَاقِ وَالطَّرِیقُ اِلَی المَلِکِ الخَلَّاقِ'' میں نقل کیا ہے۔''
(بحوالہ 'سفرِ آخرت کی منازل' از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ۴۷)

''پُل صراط کا تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہونے کا مفہوم: بعض علماء نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ پُل صراط پر سے گزریں گے تو اُنہیں اپنے گناہوں اور نیکیوں کے مطابق آسانی وسہولت اور تنگی ومشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ ایک قاعدہ اور رسم جاری ہے کہ اگر کسی گہری اور پوشیدہ بات کو بیان کرنا ہو تو اُسے اس طرح تعبیر کرتے ہیں اور اُس کی مثال بیان کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو بال سے زیادہ باریک بات ہے۔ باقی حقیقتِ حال کو اللہ تعالیٰ بخوبی جاننے والا ہے۔''

''اَحَدُّ مِنَ السَّیفِ'' (تلوار سے زیادہ تیز ہونے) کا معنی: پُل صراط کا تلوار سے زیادہ تیز ہونا اور بال سے زیادہ باریک ہونا اس لئے درست نہیں ہوسکتا کہ حدیث پاک میں پُل صراط کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ اس کے دونوں کناروں پر ملائکہ کھڑے ہوں گے اور اُس کے دونوں کناروں پر خاردار جھاڑی کی طرح لوہے کی کانٹے دار سلاخیں لگائی گئی ہوں گی جن کے سرے مُڑے ہوئے ہوں گے۔ بعض لوگ اُن میں اُلجھ کر نیچے گر جائیں گے اور بعض زخمی ہو جائیں گے۔ بعض لوگ اُس پر پیٹ کے بل چلیں گے اور بعض پھسل کر گر جائیں گے پھر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس پُل پر سے گزرنے والوں میں سے بعض کے لئے اتنی روشنی ہوگی جتنی جگہ اُن کے دو پیر گھیر لیتے ہیں۔ لہٰذا اس بات میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ پُل صراط کے اوپر سے گزرنے والوں کے لئے پُل پر پاؤں دھرنے کی جگہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ پُل صراط کے بال جیسا باریک ہونے کی حالت میں اِن تمام امور کا ہونا ممکن نہیں ہوگا اور بعض حُفّاظِ حدیث سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ لفظ ثابت نہیں ہے۔''

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ قائل کا یہ قول مردود ہے اور اس باب کی احادیث اس قول کی تردید کرتی ہیں۔ احادیثِ مبارکہ میں جو بیان ہوا ہے کہ پُل صراط تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے' اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ذاتِ پاک ہوا میں پرندے کو روک لینے پر قدرت رکھتی ہے' وہ اس پر بھی قادر ہے کہ بال سے باریک پُل صراط پر مخلوق کو ٹھہرائے اور اس کو چلنے اور دوڑنے کی طاقت عطا فرمائے۔ لہٰذا جب لفظ کے حقیقی معنی کے مراد لینے میں کوئی مشکل امر نہیں ہے تو حقیقت ہی مراد ہوگی اور خواہ مخواہ حقیقت کو چھوڑ کر لفظ کو اُس کے مجازی معنی پر محمول کرنا کسی طور جائز نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ اس سلسلہ میں بہ کثرت احادیث اور عادل اور ثقہ ائمہ کے آثار وارد ہو چکے ہیں۔'' (ایضاً' جلد دوئم' صفحہ ۴۷' ۴۸)

جہنم کے مختلف نام : قرآن نے مختلف مقامات پر جہنم کے سات نام بیان کئے ہیں :۔
(۱) سَعِیْر (سورۃ النساء : ۱۰، ۵۵ ؛ سورۃ الفرقان : ۱۱ ؛ سورۃ الاسراء : ۹۷)
(۲) جہنّم (سورۃ البقرۃ : ۲۰۶ ؛ آلِ عمران : ۱۲، ۶۲، ۱۶۷ ؛ النّساء : ۹۳، ۹۷، ۱۱۵)
(۳) جَحِیم (البقرۃ : ۱۱۹ ؛ المائدۃ : ۱۰، ۸۶ ؛ التوبۃ : ۱۱۳ ؛ الحج : ۵۱ ؛ الشعراء : ۹۱)
(۴) لَظٰی (المعارج : ۱۵)
(۵) سَقَر (القَمَر : ۴۸ ؛ المُدّثّر : ۲۶، ۲۷، ۴۲)
(۶) ھَاوِیَۃ (القارعۃ : ۹)
(۷) حُطَمَۃ (الھُمَزَۃ : ۴، ۵)

کافروں کے ٹھکانے کے لئے قرآن نے بالعموم نَـار (بمعنیٰ آگ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔قرآن مجید نارِ جہنم کے طبقات کی تفصیل کے بارے میں خاموش ہے۔سورۃ الحِجر کی آیت ۴۴ صرف اتنا بتاتی ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے الگ الگ حصّے ہیں۔ممکن ہے کہ دروازوں کی یہ تعداد استحقاقِ عذاب کے لحاظ سے سات طبقوں کے اظہار کے لئے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ محض خلود (ہمیشہ کے لئے رہنا) مراد ہو اور اس سے مقصود دوزخ میں داخل ہونے والوں کی کثرتِ تعداد کا اظہار ہو (تفسیر بیضاوی)۔جہنم کے دروازوں پر اُنّیس انتہائی تندرُو' سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو حکمِ الٰہی کی تعمیل سے ذرّہ بھر غفلت نہیں برتتے (بحوالہ سورۃ التـحـریـم آیت ۶ ؛ سورۃ الـمُـدّثّـر' آیت ۳۰)۔بعض اوقات جہـنّـم کا لفظ بہ حیثیت مجموعی آگ کے مفہوم میں اور بعض اوقات اُس کے بالائی طبقے کے معنیٰ میں آتا ہے۔جہـنّـم کی تہہ میں زَقُّـوم نامی ایک ہیبت ناک درخت اُگتا ہے (بحوالہ سورۃ الـصّـافّات' آیت ۶۲ ؛ سورۃ الـدُّخان' آیت ۴۳) جس کے پھول شیاطین کے سر ہیں اور جو اللہ کے باغیوں کا کھاج ہوں گے۔''

جہنم کی ہولناکیاں : جہنم کی اذیتوں کی بابت قرآن مجید کچھ مخصوص اشارات دیتا ہے مثلاً :
(۱) اُس کے شعلے سخت غضبناک اور اس کا غیظ وغضب سسکیاں لینا اور دھاڑنا ہے (سورۃ الفُرقان :۱۲)
(۲) اُس کا پانی سخت کھولتا ہوا ہے (سورۃ الرحمٰن :۴۴ ؛ سورۃ الواقعۃ :۵۴)
(۳) اُس میں لُو کی لپٹ اور سیاہ دھوئیں کے سائے ہیں (سورۃ الواقعۃ : ۴۲، ۴۳)
(۴) اُس کے دھاڑنے میں یوں لگتا ہے کہ غیظ وغضب میں وہ ابھی پھٹنے کو ہے (سورۃ المُلک : ۷، ۸)
(۵) مرَدودوں اور راندہِ درگاہ لوگوں کے لئے اعلان ہوگا: خُـذُوْہُ فَـغُلُّوْہُ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْہُ ۝ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْہُ ۝ (اُسے پکڑو اور اُسے طوق پہناؤ' پھر اُسے دوزخ میں داخل کردو' پھر اُسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستّر گز ہے) (سورۃُ الحاقّۃ : ۳۰ تا ۳۲)
(۶) اہلِ جہنم کا لباس تارکول کا ہوگا اور آگ اُن کے چہروں پر چھا رہی ہوگی (سورۃ الحِجر :۵۰)

(۷) آگ اُن کے چہروں کو جلا دے گی اور اس میں اُن کے دانت نکلے ہوئے' منہ بگڑے ہوں گے۔
(سورۃ المؤمنون:۱۰۴)
(۸) وہ سسکیاں لے رہے ہوں گے' آہیں بھر رہے ہوں گے اور اپنی قسمت کو کوس رہے ہوں گے۔(ھود)
(۹) آگ میں بھونی ہوئی اُن کی جلدوں کو بدل کر ہمیشہ دوسری نئی کر دیا جائے گا تاکہ وہ برابر عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ (سورۃ النساء : ۵۶)
(۱۰) وہ پیپ لہو کا پانی پئیں گے جو اُن کے حلق سے نہ اترے گا اور اگرچہ اُن کے چاروں طرف موت ہی موت ہوگی لیکن موت اُنہیں آئے گی نہیں۔ (سورہ ابراھیم : ۱۶' ۱۷)
(۱۱) اُن کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے' اُن کے سروں کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا جس سے اُن کے پیٹ کی چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی اور اُن کے مارنے کے لئے گرز ہوں گے۔(الحج:۱۹۔۲۱)
(۱۲) جب بھی وہ اس سے باہر نکلنا چاہیں گے' اُسی میں دھکیل دئے جائیں گے۔(سورۃ الحج:۲۲)
(۱۳) یہ چار آیات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم کے پیٹ کو اُس کی گہرائی تک بھر دے گا :
سورۃ الاعراف:۱۸؛ سورہ ھُود:۱۱۹ ؛ سورۃ الاسراء : ۶۳ ؛ سورہ صٓ : ۸۵)
(۱۴) جہنم کے انگارے اپنی بڑائی کے لحاظ سے بڑے بڑے محل جیسے ہوں گے۔(سورۃ المُرسلات:۳۲)
(۱۵) جہنم ایسی بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو کھال اُدھیڑ دینے والی ہے۔(سورۃ المعارج :۱۵' ۱۶)

''جہنم کی گہرائی اور اس کی حدّت : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ نے ایک گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔آپ نے پوچھا: تمہیں معلوم ہے یہ کیسی آواز تھی؟ ہم نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا یہ ایک پتھر ہے جسے ستر سال پہلے جہنم میں پھینکا گیا تھا' وہ اب تک اُس میں گر رہا تھا اور اب اُس کی گہرائی میں پہنچا ہے۔'' (صحیح مسلم: کتاب الجنۃ والنار؛ مسند احمد ج ۲' ص ۳۷۱؛ ابن حبان ج ۹' ص ۲۷۸؛ ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۵۹۹۵)

''حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر بیل کی ناک کے سوراخ جتنی جگہ جہنم کی آگ کے لئے کھول دی جائے اور وہ سوراخ مشرق میں ہو اور ایک شخص مغرب میں ہو تو اتنی دُور سے بھی اُس کی گرمی کی وجہ سے آدمی کا دماغ کھولنے لگ جائے گا اور پگھل کر بہہ جائے گا۔اور جہنم جب جوش مارے اور چنگھاڑے تو کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبی مُرسَل نہیں ہوگا مگر اپنے گھٹنوں کے بل گر جائے گا اور نَفسِیِ نَفسِیِ پکارے گا۔'' (''سفرِ آخرت کی منازل'' (اردو ترجمہ) از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ص ۱۷۶' ۱۷۷)

دوزخ میں جلنے والے پتھروں کا بیان : سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۴ میں ارشاد ہوا کہ اگر تم اِس قرآن کا مقابل نہ لا سکے اور تم ہرگز لا بھی نہ سکو گے تو اُس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اِن پتھروں

سے مراد بُت ہیں جنہیں بنا کر اُنہوں نے اُن کی پرستش کی تھی۔ قرآن مجید میں ہے :

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (سورۃ الانبیاء : ۹۸)

''بے شک تم اور جن بتوں کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو' وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔'' (۲۱:۹۸)

بتوں کو اس لئے آگ میں ڈالا جائے گا تا کہ مشرکین کی زیادہ ذلت اور رسوائی ہو اور یہ واضح ہو کہ جن بتوں کو وہ اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے' وہ خود اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکتے یا اس لئے کہ اُن کے جرم اور شرک کا منشا یہ بت تھے' اس لئے ان بتوں کو عذاب دیا جائے گا۔ جس طرح جو شخص سونے چاندی کی محبت کی وجہ سے اُن کی زکوٰۃ نہ نکالے' سونا چاندی تپا کر اُن سے اُس کی پیشانی' پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (بحوالہ سورۃ التوبۃ : ۳۵)

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (سورہ مریم :۷۱) کی تفسیر احادیث مبارکہ کی روشنی میں :

''اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر سے نہ ہو۔'' لفظ ''وارد'' کے معنی اور تفسیر میں علمائے مفسرین کے متعدد اقوال ہیں : گزرنا' داخل ہونا' بخار' دیکھنا' جھانکنا' قریب سے مطلع ہونا۔

(۱) ''حضرات ابنِ عباس' عبداللہ بن مسعود اور کعب الاحبار رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ''وُرود'' سے مراد پُل صراط کے اوپر سے گزرنا ہے۔ حضرت سدی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً یہی معنی روایت کیا ہے۔

(۲) ''وُرود'' کا دوسرا معنیٰ داخل ہونے کا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی نیک اور بد باقی نہیں رہے گا مگر وہ جہنم میں داخل ہوگا نافرمان لوگ اپنے جرائم کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے جبکہ اولیاء اور نیکوکاروں کا جانا وہاں اپنوں کی شفاعت کے لئے ہوگا اور وہ اُن اولیاء اور مؤمنوں پر اس طرح ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ○ (مریم : ۷۲) یعنی ''پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔'' (مسند احمد' ج ۳' ص ۳۲۹' مستدرک للحاکم' ج ۴' ص ۵۸۷)

''حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے آیت وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی تفسیر میں فرمایا کہ جہنم میں وارد ہونے سے مراد ہے کہ جہنم کو لوگوں کے لئے بچھا دیا جائے گا گویا کہ وہ پگھلی ہوئی ہے۔ جب نیک اور بُرے تمام لوگ اس پر قدم جما کر ٹھہر جائیں گے تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: اے جہنم! اُن لوگوں کو پکڑ لے جو تیرے لئے ہیں اور جو میرے ہیں اُنہیں چھوڑ دے۔ چنانچہ جتنے لوگ جہنم کے سزاوار ہوں گے وہ پُل صراط سے نیچے دھنس کر غرق ہو جائیں گے اور یقیناً جہنم اہلِ جہنم کو اس طرح پہچانے گی جس طرح کوئی باپ بھی اپنے بچوں کو کیا پہچانتا ہوگا؟''

(۳) حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا جہنم میں وارد ہونا بس یہی ہے کہ دنیا میں اُنہیں جو بخار وغیرہ ہو، وہ جہنم سے اُن کا حصّہ ہے اور اب وہ جہنم میں داخل نہیں ہوں گے۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بیمار کی عیادت کرنے تشریف لے گئے جسے بخار تھا۔ آپ نے اُسے فرمایا: تجھے خوشخبری ہو، بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بخار میری پیدا کردہ آگ ہے جسے میں اپنے مؤمن بندے پر دنیا میں اس لئے مسلط کرتا ہوں کہ یہ بخار آتشِ جہنم میں اس کا حصّہ بن جائے۔''
(ترمذی: رقم الحدیث ۲۰۸۸ ؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۴۷۰ ؛ مسند احمد ج ۲، ص ۴۴۰ ؛ مستدرک للحاکم ج ۱، ص ۳۴۵ ؛ حلیۃ الاولیاء ج ۶، ص ۵۴ بحوالہ اردو ترجمہ مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی، ج ۲، ص ۷۶)

(۴) ورود کا چوتھا معنیٰ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ قبر میں بندے کا دوزخ کی طرف نظر کرنا اور دیکھنا مراد ہے اور فلاح پانے والا کامیاب شخص اس سے نجات پانے والا ہے اور اگر کسی شخص کا اُس میں داخل ہونا ہی مقدر ہو چکا ہے تو وہ اُس میں داخل تو ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یا کسی کی شفاعت سے یا کسی اور سبب سے آخر کار آگ سے نکل کر جنت میں آجائے گا۔ اس کی دلیل کہ قبر میں آدمی کو دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس میں ہے کہ تم میں سے جو شخص فوت ہوتا ہے تو (قبر میں) صبح وشام اُس پر اُس کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۵) ورود سے مراد جہنم پر جھانکنا، اُس پر مطلع ہونا اور اُس کے قریب ہونا ہے (اس کے اندر گھسنا نہیں ہے) اور وہ اس طرح ہوگا کہ لوگ جب حساب کی جگہ حاضر ہوں گے جو جہنم کے قریب ہوگی، احتساب کی حالت میں اُس مقام سے لوگ جہنم کو نزدیک سے دیکھیں گے، پھر پرہیز گاروں کو اللہ تعالیٰ اس جہنم سے جسے وہ دیکھ چکے ہوں گے، نجات دے گا اور اُنہیں جنت کی طرف بھیج دیا جائے گا جبکہ ظالموں کے متعلق اللہ تعالیٰ حکم کرے گا کہ اُنہیں آتشِ جہنم میں پھینک دو۔ لفظ ورود کا معنیٰ جھانکنا، قریب ہونا اور اندر داخل نہ ہونا قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوا: وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ (یعنی جب موسیٰ علیہ السلام مدین کے چشمہ کے پاس آئے)

(۶) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ عزّ وجلّ کے قول وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا میں ولید بن مغیرہ اور اُبی بن خلف وغیرہ جیسے کافروں کو خطاب ہے۔

<u>دوزخ کے قول هَلْ مِنْ مَّزِيْد (سورہ قٓ: ۳۰) کی تاویلات</u> : دوزخ کہے گی: هَلْ مِنْ مَّزِيْد (کیا کچھ اور بھی ہے؟)۔ اس کے مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہنم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے بھر دے گا تو جب اس میں جنّ اور انسان ڈال دے گا تو وہ کہے گی کہ کیا کچھ اور مزید بھی میرے اندر ڈالا جائے گا یعنی اب تو میرا پیٹ بھر گیا، مزید گنجائش نہیں۔ حضرت مجاہد اور دوسرے محدّثین سے یہی تفسیر منقول ہے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ جہنم کہے گی: میرے لئے زیادہ کرو یعنی جہنم اہلِ جہنم پر سخت غیظ وغضب اور جوش میں ہوگی اور غصہ میں ایسا کہے گی جیسا کہ سورۃ المُلک کی آیات ۷،۸ میں آیا: وَهِيَ تَفُوْرُo تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (اور وہ ایسا جوش مار رہی ہوگی کہ گویا ابھی شدتِ غضب سے پھٹ جائے گی۔)

دوزخ میں اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کی توجیہ : جہنم کہے گی: کیا کچھ اور ہیں؟ حتّٰی کی رب العزت اُس میں اپنا قدم رکھیں گے (حَتّٰى يَضَعَ فِيْهَا قَدَمَهٗ) جس سے دوزخ کا بعض حصہ بعض سے مل جائے گا اور وہ عرض کرے گی: ''بس بس! تیری عزت اور کرم کی قسم!'' قدم اور پیر اُن لوگوں سے استعارہ ہے جن کا دخول جہنم میں متاخر ہوگا' کیونکہ جہنمی فوج درفوج جہنم میں داخل ہوں گے اور اُن کی بہت سی جماعتیں ہوں گی اور جہنم کے پہرے دار اُن کا انتظار کر رہے ہوں گے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ o(أَلْمُلْك : ۸)

''جب کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا تو اُس کے محافظ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس ڈرانے والا (یعنی نبی یا رسول) نہیں آیا تھا؟'' (۶۷ : ۸)

اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ ''دوزخ میں لوگوں کو مسلسل ڈالا جائے گا اور پہرے دار سب سے متاخر لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں گے کیونکہ اُنہیں جہنمیوں کے ناموں اور اُن کی صفات کا علم ہوگا اور ہر پہرے دار اپنے متعلقہ گروہ کا منتظر ہوگا۔ اور جب ہر پہرے دار کے پاس پہنچنے والے اَفراد پورے ہو جائیں گے اور ان میں سے کوئی باقی نہیں بچے گا تو وہ کہیں گے: بس بس! یعنی ہمارے اعداد وشمار پورے ہو چکے۔ پھر جہنم جہنمیوں پر سمٹ کر تنگ ہو جائے گی۔ سو اس میں داخل ہونے والی جماعت کو قدم رکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔'' (ایضاً' ص ۲۲۹)

دوزخیوں کا لباس اور کھانا پینا: اُن کے لباس کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

(۱) سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (ابراهيم : ۵۰)

''اُن کے کرتے (آگ بھڑکانے والے روغن) تارکول کے ہوں گے۔''

(۲) فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ (الحج : ۱۹)

''کافروں کے لئے آگ کے لباس تیار کر دیئے گئے ہیں۔''

اُن کے ماکولات اور مشروبات کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

(۱) إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ o طَعَامُ الْأَثِيْمِ o كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ o (أَلْدُخان: ۴۳ تا ۴۵)

''بے شک تھوہر کا درخت گنہگاروں کا کھانا ہوگا' پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں جوش مارے گا۔''

(۲) وَإِنْ يَّسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ (الکھف: ۲۹)
''اور اگر (شدتِ پیاس کی وجہ سے) وہ فریاد کریں تو اُن کی فریاد رسی (اُس) پانی سے ہوگی جو پگھلائے تانبے کی طرح ہوگا' (اُن کے) منہ بھون دے گا' کیا ہی بُرا پینا ہوگا۔'' (۱۸:۲۹)

(۳) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ٥ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ٥ لَّا يَأْكُلُهٗ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ٥
''تو آج یہاں اُس کا کوئی دوست نہیں (جو اُسے کوئی فائدہ دے یا شفاعت کرے) اور نہ کچھ کھانے کو مگر دوزخیوں کا پیپ' اُسے خطا کار ہی کھائیں گے۔'' (الحآقّۃ: ۳۵'۳۶)

(۴) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ٥ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ٥ جَزَآءً وِّفَاقًا ٥ (اَلنّبا: ۲۴ تا ۲۶)
''وہ اس میں نہ کسی قسم کی ٹھنڈک کا مزہ پائیں گے اور نہ کچھ پینے کو مگر کھولتا پانی اور دوزخیوں کا جلتا پیپ' جیسے کو تیسا بدلہ (یعنی جیسے کفر بدترین جرم ہے' ویسا ہی اُنہیں سخت ترین عذاب ہوگا)۔''

(۵) تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ٥ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ٥ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ٥
''وہ کھولتے پانی کے چشمے سے پلائے جائیں گے۔ اُن کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا سوائے خار دار خشک زہریلے درخت کے جو نہ بدن کو موٹا کرے اور نہ بھوک مٹائے۔'' (الغاشیۃ: ۵ تا ۷)

دوزخیوں اور جنتیوں کا ہمیشہ ہمیشہ دوزخ اور جنت میں رہنا: قرآن مجید نے اِن ہر دو طبقات کے لئے جہنم اور جنت میں رہنے کے عرصہ کو خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا کے الفاظ سے معنون کیا ہے (دوزخیوں کے لئے سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۵ اور جنتیوں کے لئے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۹)۔ اس کے علاوہ کتبِ احادیث میں بھی یہ مضمون کافی دفعہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً:

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن موت کو لا کر پُل صراط پر کھڑا کیا جائے گا' پھر آواز دی جائے گی ''اے اہلِ جنت!'' تو وہ خوف سے گھبرائے اور سہمے ہوئے جھانکیں گے کہ اُن کے نکالے جانے کا حکم تو نہیں۔ اسی طرح اہلِ جہنم کو آواز دی جائے گی' وہ خوش ہو کر اُدھر متوجہ ہوں گے کہ شاید اُن کی نجات کا حکم ہے۔ اتنے میں حکم ہوگا کہ ''تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟'' لوگ کہیں گے: ''جی ہاں! یہ موت ہے''۔ تب اُسے ذبح کر کے کہا جائے گا: اب کوئی موت نہیں' ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔'' (مسند احمد' ج ۲' ص ۳۳۷ ؛ ابن ماجہ' رقم الحدیث: ۴۳۲۷ ؛ ترمذی' رقم الحدیث: ۲۵۵۷)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ ائمہ اہلِ علم اور علمائے محدثین حضرت سفیان ثوری' مالک بن انس' ابنِ مبارک' ابن عُیینہ' وکیع اور دوسرے اہلِ علم ایسی احادیث میں تاویل کے قائل نہیں۔ ائمہ محدثین کا مختار مذہب بھی یہی ہے کہ ایسی احادیث کو روایت کیا جائے اور اُن پر ایمان لایا جائے لیکن اُن کی تاویل اور تفسیر نہیں کی جائے گی اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ موت تو ایک عرض ہے' جسم نہیں ہے' اُسے ذبح کرنا کس طرح متصوّر ہوگا؟ اور اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ اعمال کو کس طرح تولا جائے؟ ائمہ حدیث کا مذہب مختار یہی ہے کہ اس طرح کے سوال کرنا جائز نہیں۔ ایسی احادیث کے ظاہر پر ایمان رکھنا چاہیے۔

روزِ قیامت شفاعت کا بیان : لفظ ''شفاعت'' کی مختلف شکلیں قرآن مجید میں ۲۹ بار آئی ہیں۔

منکرینِ شفاعت کے شفاعت پر اعتراضات اور اُن کے جوابات : (۱) منکرینِ شفاعت اپنے موقف کی تائید میں کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن کسی قسم کی شفاعت گنہگاروں کے کام نہ آئے گی اور وہ اپنی بدعملیوں کا خمیازہ بہر حال بھگت کے رہیں گے۔ چند آیات حسب ذیل ہیں:

(۱) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ٥ (سورۃ البقرۃ : ۱۲۳)

''اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، نہ اُس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا، نہ اُسے سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ اُنہیں مدد ہی پہنچ سکے گی۔'' (۱۲۳ : ۲)

آیت کا شانِ نزول اُس اسرائیلی عقیدہ کی تردید ہے جو آج تک جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے: ''بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بناء پر بخش دیے جائیں گے خواہ اعمال کیسے ہی ہوں۔'' (جلد ۶، صفحہ ۱۷)۔ شفاعت اور ایک شفیعِ مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔ غرض ساری آیت میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدہ کفّارہ پر ہے کہ ایمان نہ رکھنے والوں کو کسی طرف سے مدد اور نصرت بھی نہ پہنچے گی کہ سزا میں کچھ تخفیف ہو سکے چہ جائیکہ نجاتِ کامل ہو سکے۔

(۲) لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا٥ (مریم : ۸۷)

''شفاعت کا اختیار کوئی بھی نہ رکھے گا سوائے اُس کے جس نے خدائے رحمان سے اجازت لے رکھی ہے۔'' (۸۷ : ۱۹)

استثناء کے لفظ اِلَّا ہی میں شفاعت کا حق ہونا ثابت ہے۔ آیت الکرسی (۲۵۵ : ۲) میں بھی تو یہی کہا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کا حق حاصل نہیں۔ اجازت (اِذن) ملنے سے شفاعت کا واقع ہونا اور حق ہونا ثابت ہو گیا اور بروئے احادیثِ مبارکہ وہ اپنے فضلِ خاص سے اپنے خاص الخاص بندوں کو سفارش کی اجازت مرحمت فرمائے گا اور اِن بندوں میں نبی مکرم ﷺ سے بڑھ کر اور کون اُس کا خاص الخاص بندہ ہوگا!

(۳) قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (الزُّمر : ۴۴)

''آپ فرما دیجئے کہ سفارش تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔'' (۴۴ : ۳۹)

مشرک قوموں نے تو علی العموم اور مسیحیوں نے بالخصوص شفاعت کو بھی ایک شعبہ الوہیت کا قرار دے کر مستقلاً

ایک قادر اور متصرف ہستی سمجھ لیا ہے اور عملاً اُسی سے اپنا تعلق جوڑے رکھنا کافی سمجھتے ہیں جس کے بعد خالقِ کائنات سے تعلق قائم رکھنے کی بھی اُنہیں چنداں ضرورت نہیں۔ اس معنیٰ اور مفہوم کے ساتھ شفاعت تمام تر مشرکانہ عقیدہ ہے اور قرآن حکیم نے اسی معنیٰ میں کسی غیر اللہ کے شافع ہونے سے قطعی طور پر انکار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اختیار و تصرف یکسر حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ خالق سے یکسر بے نیاز ہو کر اُس کی مخلوق کے سایہ میں پناہ ڈھونڈنا کہاں کی توحید ہے؟

(۴) فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ٥ (اَلْمُدَّثِّر : ۴۸)
''سو اُنہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش (کوئی) نفع نہ دے گی۔'' (۴۸ : ۷۴)

آیت کفار کے بارے میں ہے اور مراد یہ ہے کہ ایسوں کی شفاعت جب سرے سے ہوگی ہی نہیں تو کارگر کیا ہوگی! فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت سے مؤمنین کے حق میں شفاعت کا ثبوت ملتا ہے (تفسیر مدارک) بلکہ اہلِ سنت نے تو یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں فساقِ امت تک کی شفاعت کا اثبات موجود ہے (تفسیر کبیر بحوالہ عبدالماجد دریابادی)

اپنے موقف کی تائید میں منکرینِ شفاعت سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۴ کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس میں مؤمنین تک کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اُس دن کوئی سودے بازی، کوئی دوستی اور کوئی سفارش کام نہ آئے گی:

(۵) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْم" لَّا بَيْع" فِيهِ وَلَا خُلَّة" وَّلَا شَفَاعَة" وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٥ (اَلْبَقَرَة : ۲۵۴)
''ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے، اُس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت، نہ دوستی اور نہ سفارش کام آئے گی اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔'' (۲۵۴ : ۲)

آیت کے ابتدائی الفاظ زکوٰۃ و خیرات کی ترغیب سے متعلق ہیں جس کے منکر کافر ہیں۔ مؤمنین کو یہاں خطاب ہے کہ زکوٰۃ سے روگردانی کر کے کہیں وہ کفار کے زمرے میں شامل نہ ہو جائیں اور شفاعت سے کافر تو کبھی بھی مستفید اور بہرہ مند نہ ہوں گے کہ وہ تا اُبد محروم القسمت ہیں۔ جیسا کہ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ نے ظاہر کر دیا۔

(۶) لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرۃ : ۲۸۶)
''(ہر جان کو) وہی کچھ ملے گا جو اُس نے کمایا اور اُس پر وہی کچھ پڑے گا جو اُس نے کمایا۔'' (۲۸۶ ۲)

آیت کا تعلق عمل کے ارتکاب اور اُس کے نتائج سے ہے نہ کہ مسئلہ شفاعت سے۔

(۷) لَا تَزِرُ وَازِرَة" وِّزْرَ أُخْرَىٰ (الانعام : ۱۶۴ ؛ فاطر : ۱۸ ؛ النَّجم : ۳۸)
''کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔'' (۱۶۴ : ۶ ؛ ۱۸ : ۳۵ ؛ ۳۸ : ۵۳)

اس کے جواب میں امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کفار کے اُس قول کے جواب میں ہے جس میں انہوں نے ایمان والوں سے کہا تھا: اِتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ (العنکبوت : ۱۲) (ہماری راہ چلو اور تمہارے گناہ ہمارے ذمّہ ہوں گے)۔

(۸) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰي ٥ (اَلنَّجم : ۳۹)
''انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔'' (۵۳ : ۳۹)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے وہ اُس کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور اُس عمل میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اُن اعمال کے نتائج صرف اُن اعمال کے کرنے والے کے لئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت کا تعلق بھی شفاعت کے معاملے سے بالکل نہیں ہے۔

یہ اور اِس قسم کی آیات جن میں شفاعت کا انکار کیا گیا ہے' سب کفار اور دشمنانِ خدا سے متعلق ہیں اور محبوبین اور مقربینِ بارگاہِ الٰہی سے اُن کا کچھ بھی تعلق نہیں۔ سورۃ المؤمن میں قرآن مجید نے اس نکتے کو واضح کر دیا:
مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ٥ (المؤمن : ۱۸)
''ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات مان لی جائے۔'' (۴۰ : ۱۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ذیل کی حدیث مسئلہ شفاعت کے حق ہونے میں ایک معقول اور مُسکت (خاموش کر دینے والی) دلیل ہے جس میں نبی محترم ومکرّم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ' اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْا لَهٗ' (صحیح مسلم: کتاب الوصایا؛ سنن ابی داؤد: کتاب الوصایا ؛ نسائی : کتاب الوصایا ؛ ترمذی ؛ مسند احمد بن حنبل)
''جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اُس کا عمل اُس سے منقطع ہو جاتا ہے' سوائے اُن تین کے جو اُس سے جدا نہیں ہوتے: صدقہ جاریہ' وہ علم جس سے انسان فائدہ اُٹھاتے رہیں اور وہ نیک اولاد جو اُس کی بخشش کی دعا کرتے رہیں۔''

جب اولاد کی نیکیاں اُن کے والدین کے لئے موجبِ نجات ہیں تو ثابت ہوا کہ ایک آدمی کے نیک اعمال سے دوسروں کو فائدہ ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا حدیث میں پہلے دو عمل متوفی کے ذاتی عمل ہیں لیکن اُس کی اولاد کے نیک اعمال تو اُس کے ذاتی نہیں ہیں' اس کے باوجود اُسے اُن کا فائدہ مل رہا ہے۔ لہٰذا اُن لوگوں کو جو اُس رحیم وکریم آقا کے رحم وکرم کی حد بندی کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں' اپنے رویّہ پر شرم آنی چاہئے جو اسلام کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

انکارِ شفاعت میں اعتدال کا عنصر (Mitigating Element) : قرآن مجید کی کچھ دیگر آیات میں ''انکارِ شفاعت'' میں اعتدال کا عنصر نکلتا ہے۔اس کی مثالیں وہ لوگ اور فرشتے ہیں جن سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے جنہیں باذنِ الٰہی شفاعت کا اختیار دیا گیا ہے۔ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَالرَّحْمٰنِ عَهْدًاo (مریم : ۸۷)

''شفاعت کا اختیار کوئی بھی نہ رکھے گا سوائے اُس کے جس نے خدائے رحمان سے اجازت لے رکھی ہے۔''

(۲) وَلَا يَمْلِكُوْنَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَo (الزُّخرُف : ۸۶)

''اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں اُنہیں تو سفارش تک کا اختیار نہیں' ہاں جن لوگوں نے حق کا اقرار کیا اور وہ تصدیق بھی کرتے رہے (کہ خدائے واحد کے سوا کوئی شفاعت کا مختار نہیں' وہ البتہ سفارش کر سکیں گے۔)'' (۸۶ : ۴۳)

(۳) وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰىo (اَلنَّجم : ۲۶)

''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ اُن کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر ہاں' بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے دے جس کے لئے وہ چاہے اور اُس کی رضا ہو۔'' (۲۶ : ۵۳)

يَرْضٰى کی قید غالباً اس لئے بڑھا دی کہ کہیں دنیا والوں کی طرح وہاں بھی یہ نہ قیاس کیا جائے کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کو بھی کسی کی مروّت ولحاظ یا خوف سے اپنی مرضی کے خلاف اجازت دے دینا پڑتی ہے۔ (ماجدی)

مندرجہ ذیل آیات بھی انکارِ شفاعت میں اعتدال کی حیثیت رکھتی ہیں:

(۱) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَo اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍo (الشُّعراء : ۸۸' ۸۹)

''جس دن نہ مال کام آئے گا' نہ اولاد مگر ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے۔'' (۲۶:۸۹'۸۸)

(۲) وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰىo (اَلنَّجم : ۲۶)

''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ اُن کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر ہاں' بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے دے جس کے لئے وہ چاہے اور اُس کی رضا ہو۔'' (۲۶ : ۵۳)

نبی اکرم ﷺ کی اہلِ محشر کے لئے شفاعت : اکثر مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کا اذن ملنے کا ذکر جن آیاتِ قرآنی میں ہوا ہے' اُس میں اشارہ خاتم المرسلین ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے ہے جو اپنی گنہگار امت کی بخشش کے لئے رب کے حضور شفاعت کریں گے جس کی تائید سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹

اور سورہ محمد کی آیت ۱۹ کرتی ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب علیہ السلام کو مومنین کی بخشش کی دعا کرنے کا فرمارہے ہیں۔ پیغمبر علیہ السلام کو اپنے رب کی طرف سے ''مقامِ محمود'' کا عطا کیا جانا شفاعتِ کبریٰ کا دوسرا نام ہے جہاں متمکن ہوکر آپ اپنی گنہگار امت کی نجات اور بخشش کے لئے شفاعت کریں گے۔ اس طرح انتہائی گنہگار بھی آپ کی سفارش سے نجات پاجائے گا۔

مقامِ محمود احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں : مقامِ محمود جس کا ذکر سورۃ الاسراء کی آیت ۷۹ میں ہوا' آپ کی عرش نشینی کا نام ہے۔ اُس مقام میں آپ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بجالائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب مخلوقات پر رفعت وسربلندی بخشی یا اللہ تعالیٰ آپ کی حمد وثنا فرمائے گا یعنی آپ کو اُس مقام بلند اور منصب عالی پر فائز فرما کر آپ کی رفعتِ مقام اور عظمتِ شان کو ظاہر فرمائے گا اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثنائے مصطفیٰ ﷺ ہے۔ اس ضمن میں احادیثِ کثیرہ میں سے چند ایک درجِ ذیل ہیں :۔

(۱) آپ نے فرمایا کہ میرے پاس جبریل یہ خبر لے کر آئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ یا تو میں اپنی نصف امت بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں لے جاؤں' یا پھر اپنی امت کے لئے شفاعت کروں۔ تو میں نے شفاعت کو منتخب کیا اور یہ شفاعت اُس شخص کے لئے ہے جس کی موت ایمان پر ہوئی اور اُس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔ (ابن ماجہ' ترمذی)

(۲) ایک اور حدیث کے مطابق. نبی علیہ السلام اپنے دستِ مبارک اوپر کو اٹھاتے ہوئے اور گریہ وزاری کرتے ہوئے رب کے حضور عرض کرتے ہیں: ''اے اللہ! میری امت! میری امّت۔'' اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو آپ کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا : اِنَّا سَنُرْضِيكَ فِى أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوءُ كَ (ہم آپ کو آپ کی اُمّت کے بارے میں راضی کر کے رہیں گے اور آپ کو اُداس نہیں کریں گے) (بخاری' مسلم' تفسیر نعیمی ج ۱' ص ۳۹۸)

(۳) حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ وہ روزِ قیامت میرے لئے اللہ سے سفارش کریں جس کا آپ نے وعدہ فرمالیا۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اُس دن میں آپ کو کہاں ملوں۔ فرمایا کہ سب سے پہلے پُل صراط پر۔ پھر میں نے پوچھا: اگر آپ کو وہاں نہ پاؤں تو پھر کہاں؟ فرمایا کہ پھر تم مجھے میزان پر پاؤ گے (میزان وہ مقام ہے جہاں لوگوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا)۔ میں نے پھر پوچھا: اگر وہاں بھی آپ کو نہ پاؤں تو پھر کہاں؟ اس پر آپ نے فرمایا: پھر تم مجھے حوضِ کوثر پر پاؤ گے' کیونکہ میں ان تین جگہوں میں سے کسی ایک سے بھی جدا نہ ہوں گا۔

(۴) ایک اور حدیث کی رُو سے نبی اکرم ﷺ قیامت کے دن لوگوں کے امام ہوں گے اور آپ ہی کو جنت

کے دروازے کھولنے کا اعزاز حاصل ہوگا (صحیح مسلم)۔ سب سے پہلے آپ شفاعت کریں گے اور آپ کی اُمّت کی تعداد باقی انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں سے کہیں زیادہ ہوگی (صحیح مسلم)۔

(۵) ایک مستند صحیح حدیث میں آپ نے فرمایا:

مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ

''جس نے میری قبرِ انور کی زیارت کی اُس کی شفاعت کرنا مجھ پر واجب ہوگیا۔''

(۶) اسی طرح آپ نے ایک مقام پر فرمایا:

شَفَاعَتِیْ لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِیْ

''میری شفاعت میری اُمّت کے کبیرہ گناہوں والوں کے لئے ہوگی۔''

(۷) ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ہر نبی کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک دعا ملتی ہے۔ سب نے اپنی دعائیں یہاں استعمال کرلیں مگر میں نے اپنی دعا محفوظ رکھی ہے۔ اس سے قیامت کے دن اپنی اُمّت کی شفاعت کروں گا اور یہ شفاعت میرے ہر اُس اُمّتی کو پہنچے گی جو مومن ہو کر مرے۔ (تفسیر نعیمی۔۔۔ مفتی احمد یار خان، ج ۱، ص ۴۰۰)

<u>جناب ابوطالب کے لئے آپ کی شفاعت</u>: علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عذاب میں تخفیف کے لئے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام شفاعت فرمائیں گے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے لئے شفاعت فرمائیں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرّم ﷺ کے سامنے اُن کے چچا ابوطالب کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا: قیامت کے دن میری شفاعت سے اُسے فائدہ پہنچے گا، اُسے دوزخ کے سب سے بالائی طبقہ میں لایا جائے گا جہاں آگ صرف اُن کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس کی شدت سے اُس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔ (صحیح بخاری، ج ۱۱، ص ۴۱۷ ؛ صحیح مسلم، ج ۳، ص ۸۵ ؛ مسند احمد، ج ۳، ص ص ۵۵ تا ۵۹ ؛ ابن حبان، ج ۸، ص ۵۶ ؛ دلائل النبوۃ للبیہقی، ج ۲، ص ۳۴۷)

انہی سے دوسری روایت اس طرح ہے: ''اہلِ نار میں سب سے کم عذاب ابوطالب کو ہوگا، اُسے آگ کی دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جن کی حرارت سے دماغ کھولے گا۔'' (صحیح مسلم، بحوالہ غلام نصیر الدین، ج ۱، ص ۴۵۷)

قیامت کے دن لوگ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں حضرات آدم، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس

شفاعت کی درخواست کرنے جائیں گے مگر وہ سب انکار کر دیں گے۔ بالآخر وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جائیں گے اور اُن سے شفاعت کرنے کی درخواست کریں گے۔ آپ فرمائیں گے اَنَا لَهَا اَنَا لَهَا کہ یہ میرا ہی منصب ہے' یہ میرا ہی منصب ہے۔ پس میں اٹھوں گا اور میرے پیچھے میری امت ہوگی' وضو کے اثر سے اُن کے چہرے اور دیگر اعضائے وضو چمک دمک رہے ہوں گے۔ آپ فرمائیں گے :

فَنَحْنُ الآخِرُوْنَ الأَوَّلُوْنَ وَأَوَّلُ مَنْ يُحَاسَبُ وَيُفَرَّجُ لَنَا فِي الأُمَمِ عَنْ طَرِيْقِنَا وَيَقُوْلُوْنَ كَادَتْ هٰذِهِ الأُمَّةُ أَنْ تَكُوْنَ أَنْبِيَاءَ كُلُّهَا وجعلتُ أَوَّل النَّبِيِّين خَلْقًا وَآخِرُهُمْ بَعْثًا

''ہم ہی (جنت میں داخل ہونے اور سعادت میں) پہلے ہیں اور ہم ہی (بہ لحاظ وجود) آخری ہیں اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اِسی اُمّتِ مصطفویہ سے حساب کا آغاز فرمائے گا اور ہمارے ذریعے ہی تمام اُمتوں کی مشکل کشائی ہوگی۔ لوگ محشر میں امتِ مصطفیٰ ﷺ کی یہ عظمتِ شان دیکھ کر پکار اُٹھیں گے: قریب ہے کہ یہ امت تو ساری کی ساری نبی ہوتی۔'' (ایضاً' ج۱' ص ۴۵۰)

یعنی اس امت پر لوگ رشک کریں گے کہ ان میں تو نبیوں والے اوصاف پائے جاتے ہیں۔

<u>نبی اکرم ﷺ کے علاوہ دیگر لوگوں کی شفاعت</u> : کچھ احادیث مبارکہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کو قیامت کے دن اپنے حضور شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے گا۔ احادیث ملاحظہ ہوں :

(۱) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلاَثَة'' : اَلأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ (ابن ماجه ؛ مشكوة : باب الحوض والشّفاعة)

''حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تین قسم کے لوگ شفاعت کریں گے: انبیاء و مرسلین' علماء اور شہید لوگ۔''

(۲) عَنْ أَبِي سَعِيْد رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : إِنَّ مِنْ أُمَّتِي مَنْ يَشْفَعُ لِلْغِنَامِ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَشْفَعُ لِلْقَبِيْلَةِ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰى يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (ترمذی' مشکوٰۃ)

''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت کے کچھ لوگ کچھ طبقات کی سفارش کریں گے' اُن میں سے کچھ قبیلے کی سفارش کریں گے' کچھ لوگ عُصبہ # کی سفارش کریں گے جبکہ کچھ لوگ صرف ایک آدمی کی سفارش کریں گے اور اس طرح تمام امت جنت میں داخل ہو جائے گی۔''

(۳) ایک موقع پر نبی ﷺ نے حضرت اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا:
لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّه' فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَسْتَغْفِرَلَكَ فَافْعَلْ (صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة بحوالہ "Islamic Concept of Intermediation" p. 333

عُصبة دس سے چالیس تک کے انسانوں' پرندوں یا جانوروں کے گروہ کو کہا جاتا ہے۔ (القاموس المحیط لمجد الدین فیروز آبادی' جلد اوّل' ص ۱۰۵' طبع چہارم' دار المامون مصر ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء)

''اگر وہ اللہ کی قسم کھالے تو اللہ اُس کی قسم کو پورا فرمائے گا۔ اگر تم اُس سے اپنی نجات اور بخشش کی دعا کی درخواست کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔''

اولیائے کرام کی شفاعت : امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۴۵۰ھ۔۵۰۵ھ/۱۰۵۸ء۔۱۱۱۱ء) اپنی کتاب ''اِحیاءِ علوم الدین'' میں لکھتے ہیں کہ روزِ قیامت اللہ بزرگ و برتر نبیوں' صدّیقین' صالحین اور علماء کی شفاعت قبول فرمائے گا۔ ہر وہ شخص جو اللہ کا پسندیدہ ہے' اُسے اپنے رشتہ داروں' دوستوں اور لواحقین کے حق میں بخشش کی شفاعت کرنے کی اجازت ہوگی۔

پیغمبر علیہ السلام اور اولیاء و صالحین کی شفاعت کے معنیٰ : وہ لوگ جو عقیدۂ شفاعت کو ''شرک'' بتاتے ہیں' یا تو علم کی کمی کی وجہ سے یا اللہ تعالیٰ کی مقدس اور بزرگ ہستیوں کے خلاف بغض اور کینے کی وجہ سے سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ گھاس کے سبز رنگ اور چرخِ نیلگوں کی نیلاہٹ کی طرح یہ بات حق اور سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام نوازشات کا منبع ہے اور کوئی بھی مخلوق اس اختیارِ الٰہی کو اپنی طرف منسوب نہیں کر سکتی۔ لیکن چونکہ پیغمبر اور اولیاء اُس کی مخلص' تابعدار مخلوق ہونے کے باعث اُس کے منتخب شدہ ہیں اور وہ اُن سے ہر طرح راضی ہے' اس لئے اُس نے اُنہیں اپنے حضور شفیع ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اور اولیائے کرام کو شفیع سمجھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ ہستیاں طالب کو وہ سب کچھ دینے میں خود مختار اور مختارِ کل ہیں' چاہے اللہ تعالیٰ نہ بھی چاہے۔ ایسا عقیدہ توفی الواقع صریحاً کفر ہے اور کوئی بھی راست رَو اور نیک مسلمان اس کی تائید نہیں کرے گا۔

انبیاء و رسولوں وغیرہ کی شفاعت کا مطلب یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ پیغمبر بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نوازشاتِ الٰہی کے عطا کرنے اور تقسیم کرنے میں خود مختار نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہ وہ نوازشات اُس کے اپنے ذاتی کسب کے ہیں۔ بلکہ عقیدۂ شفاعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نوازشات اور عطیات موہوبہ یعنی اللہ کے عطا کردہ ہیں نہ کہ کسبی اور آپ اُن فیوض و برکات کو اپنے خالق و مالک کی رضا اور منشا کے مطابق اُس کی مخلوق میں تقسیم فرما دیتے ہیں۔ اِسی حقیقت کے اظہار میں تاجدارِ ہر عالم ﷺ نے فرمایا : اَللّٰہُ مُعْطِیْ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِم '' یعنی عطا کرنے والا تو اللہ ہے' دراصل میں تو تقسیم کرنے والا ہوں۔''

تاریخ گواہ ہے کہ ابنِ تیمیہ پہلا شخص تھا جس نے عقیدۂ شفاعت کی تردید اور پیغمبروں اور اولیائے کرام کے مزاراتِ مقدسہ پر جانے کی ممانعت کے خود اختراعی عقیدے کا پرچار کیا جس کے متعلق پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا۔ اُس نے تو کھلے الفاظ میں فتویٰ دے دیا کہ حضور سید المرسلین ﷺ کے روضہ شریف کی زیارت کے قصد سے سفر کرنا گناہ کا کام ہے جس میں نماز قصر نہ کرنی چاہئے۔ بنابریں زائرین کے علاوہ فرشتے بھی جو ہر روز صبح و شام آسمان سے اتر کر روضہ شریف پر حاضر ہوتے اور درود شریف پڑھتے ہیں' (معاذ اللہ) اسی گناہ میں مبتلا ہیں۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں انتہا درجے کی گستاخی ہے۔

''ابنِ تیمیہ کے اس فتویٰ کے خلاف شام ومصر میں بڑا فتنہ برپا ہوا۔علمائے دین سے فتویٰ مذکور کی شرعی حیثیت کے متعلق استفسار کیا گیا۔علامہ برہان بن کاح فزاری نے قریبًا چالیس سطر کا مضمون لکھ کر اُسے کافر بتایا اور علامہ شہاب بن جہبل نے اس کی تائید کی۔مصر میں یہی فتویٰ مذاہب اربعہ کے چاروں قضاۃ پر پیش کیا گیا۔بدر بن جماعۃ شافعی' محمد بن ابی بکر مالکی اور احمد بن عمر مقدسی نے لکھ دیا کہ ابن تیمیہ کو ایسے فتاویٰ باطلہ سے بزجر وتوبیخ منع کیا جائے ورنہ اُسے قید کیا جائے۔عوام اور علماء میں ابنِ تیمیہ کے خلاف نفرت اور سخت غم وغصہ کی ناقابلِ کنٹرول لہر کے نتیجہ میں اُسے شعبان ۷۲۶ھ میں دمشق کے ایک قلعہ میں قید کردیا گیا جہاں قید ہی میں ۲۰ ذیقعدہ ۷۲۸ھ کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوا۔'' (''سیرتِ رسولِ عربی''۔۔۔نور بخش توکلی' صفحات ۵۳۱' ۵۳۲) اردو بازار' لاہور۔

خلاصہ کلام یہ کہ عقیدہ شفاعت قرآن وحدیث سے صراحتًا واشارۃً ثابت ہے اور اس کے انکار سے قرآن و حدیث کا انکار لازم آتا ہے جو بذاتِ خود کفر اور ضلالت ہے۔نیز سورۃ الضُّحٰی کی آیت پنجم کا کیا مطلب لیجئے گا جس میں رب تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کو راضی کرنے کا بایں الفاظ وعدہ کررکھا ہے: وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ''آپ کا ربِّ جلیل آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہوجائیں گے۔'' اور جس کی بابت زبانِ رسالت علیہ التحیۃ والسلام نے فرمایا: أَشْفَعُ رَبِّيْ لِأُمَّتِيْ حَتّٰى يُنَادِيْ رَبِّيْ أَرَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ ! فَأَقُوْلُ: نَعَمْ يَا رَبِّ رَضِيْتُ (میں اپنی امت کے لئے اپنے رب سے برابر شفاعت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میرا رب مجھے ندا فرمائے گا اور پوچھے گا: اے محمد! کیا آپ راضی ہوگئے؟ میں عرض کروں گا: ہاں میرے رب! میں راضی ہوگیا۔) اور حضور علیہ السلام کے راضی ہونے کا مطلب یہی ہے کہ آپ اپنے آخری امّتی تک کی شفاعت کرکے اُسے نارِ جہنم سے بچا کے جنت میں داخل کرادیں۔

''جَنّت'': لفظ ''جنّت'' اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل اور کثیر دونوں پر ہوتا ہے اس لئے کبھی جنت کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی جنّات۔اسی طرح جنتِ عدن اور جنّاتِ عدن کیونکہ ''عدن'' کا معنٰی ہے اقامت اور تمام جنتیں دارالاقامۃ ہیں جیسے تمام جنتیں مؤمنین کے لئے ماویٰ ہیں۔اسی طرح دارالخلد اور دارالسلام کا معنٰی سمجھنا چاہئے کہ تمام جنتیں ہمیشہ رہنے کا گھر ہیں اور خوف وحزن سے سلامتی کی جگہ ہیں اور یوں ہی جنت النعیم اور جنات النعیم کو سمجھ لیجئے کہ تمام جنتیں بھانت بھانت کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے قرآن مجید کے مختلف مقامات پر جنّت اور اس کی نعمتوں کا ذکر اس انداز سے فرمایا ہے کہ جیسے آدمی اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ویسے تو جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر کئی سورتوں میں آیا ہے لیکن ذیل کی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کا بیان آیا ہے : سورۃ الرحمٰن' سورۃ الواقعۃ' سورۃ الدّھر' سورۃ الغاشیۃ۔اسی طرح احادیثِ مبارکہ میں بھی تفصیل کے ساتھ جنت کی صفت اور اس کی نعمتوں کا بیان آیا ہے۔

دنیا میں اہلِ جنت کی صفات : ابنِ وہب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابنِ زید رضی اللہ عنہ کو یہ

فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کی صفت وحالت بیان کرتے ہوئے فرمایا: اہلِ جنت دنیا میں گریہ زاری کرنے، غم زدہ رہنے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں جس کے بعد اللہ تعالیٰ اُنہیں آخرت میں خوشیاں اور نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ پھر اُنہوں نے اللہ عزّ وجلّ کا یہ ارشادِ مبارک پڑھا:

اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ أَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ٥ (الطُّور : ۲۶)

''بے شک ہم اس سے پہلے اپنے گھروں میں سہمے سہمے رہتے تھے۔''

اور اہلِ جہنم کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دنیا میں خوش تھے اور اپنی خوشحالی اور امیری کی ترنگ میں غریب مؤمنوں کا مذاق اُڑاتے اور اُن پر ہنستے تھے۔ اُن کی اس حالت کی بابت فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ أَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ٥ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ٥ (الانشقاق : ۱۳، ۱۴)

''بے شک وہ اپنے گھر میں خوش تھا اور سمجھتا تھا کہ اُسے (اپنے رب کی طرف) لوٹنا نہیں۔''

<u>جنّت کے درجات</u>: کے بارے میں سورۃ الرَّحمٰن میں ارشاد ہوا:

(۱) وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۴۶)

''اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے، اُس کے لئے دو جنتیں ہیں۔''

(۲) وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۶۲)

''اور اُن کے سوا دو جنّتیں ہیں۔''

''ابنِ جُریج کہتے ہیں کہ یہ چار جنتیں ہیں۔ آیت بالا ۶۲ کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو شخص اپنے رب کے حضور حساب کے لئے کھڑا ہونے سے ڈرا اُس کے لئے پہلی دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنّتیں ہیں جو مرتبہ میں پہلی دو جنتوں سے کم ہیں اور امام الماوردی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بالائی حصہ میں دو جنّتیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے مخصوص ہوں اور زیریں حصہ والی دو جنّتیں ان اہلِ جنت کے خدمتگار غلاموں اور حوروں کے لئے ہوں اور وہ جنّتیں اس لئے ہیں تاکہ حوریں اور خدمتگار لڑکے الگ الگ رہیں اور مرد وزَن کا اختلاط نہ ہو۔''

<u>چاروں جنتوں میں فرق</u>: یہ بھی سورۃ الرحمٰن ہی میں بیان ہوا:

<u>پہلا فرق</u>: پہلی دو جنتوں کی تعریف میں فرمایا:

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۵۰)

''ان میں دو چشمے جاری ہیں: ایک میٹھے پانی کا، دوسرا شرابِ طہور کا یا یک تسنیم کا دوسرا سلسبیل کا)

اور دوسری دو جنتوں کی تعریف میں ارشاد فرمایا:

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۶۶)

''ان میں دو چھلکتے ہوئے چشمے ہیں۔'' (یعنی پانی چھلکتا ہوگا، بہتا نہیں ہوگا)

دوسرا فرق : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں فرمایا :

فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ٥ (ألرَّحْمٰن : ۵۲)

''ان میں ہر میوہ دو قسم کا ہے۔'' (یعنی تازہ اور خشک)

اور دوسری دو جنتوں کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا :

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ٥ (ألرَّحْمٰن : ۶۸)

''ان میں میوے، کھجوریں اور انار ہیں۔'' (یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ہر قسم کے میوے)

تیسرا فرق : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں ارشاد فرمایا :

مُتَّكِئِينَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ (ألرَّحْمٰن : ۵۴)

''ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کا اُستر دبیز ریشم کا ہے۔''

اور دوسری دو جنتوں کے وصف میں فرمایا:

مُتَّكِئِينَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ (ألرَّحْمٰن :۷۶)

''سبز بچھونوں اور منقش چاندنیوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔''

چوتھا فرق : پہلی دو جنتوں میں جو خوبصورت، موٹی موٹی آنکھوں والی گورے رنگ کی حوریں ہیں، اُن کی تعریف میں فرمایا:

كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ٥ (ألرَّحْمٰن : ۵۸)

''گویا وہ (صفائی اور خوش رنگی میں) لعل اور مونگا ہیں۔''

اور دوسری دو جنتوں کے وصف میں فرمایا:

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ٥(ألرَّحْمٰن : ۷۰)

''اُن میں عادت کی نیک، صورت کی اچھی عورتیں ہیں۔''

(اور ہر خوبصورت کا حُسن اور خوبصورتی یاقوت اور مرجان یعنی لعل اور مونگے کی خوبصورتی اور حسن جیسا تو نہیں ہو سکتا۔)

پانچواں فرق : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں فرمایا :

ذَوَاتَا أَفْنَانٍ ٥(ألرَّحْمٰن : ۴۸)

''بہت سی ڈالیوں والیاں۔'' (اور ہر شاخ پر قسم قسم کے میوے)

اور دوسری دو جنتوں کے وصف میں فرمایا:

مُدْهَآمَّتٰنِ٥ (ألرَّحْمٰن : ۶۴)

''گہرے سبز رنگ سے سیاہی کی جھلک دے رہی ہیں۔''

''ایک اِشکال اور اس کا جواب: کیا وجہ ہے کہ پہلی دو جنتوں کے مکینوں کا تو ذکر کیا گیا لیکن دوسری دو جنتوں میں کون لوگ داخل ہوں گے' اُن کا ذکر نہیں کیا؟ جواب یہ ہے کہ چاروں جنتیں اہلِ خوف ہی کے لئے ہیں مگر یہ کہ ان اہلِ خوف کے مختلف مراتب اور درجات ہوں گے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ پہلی دو جنتیں اُن کے لئے ہیں جو اللہ تعالٰی سے ڈرنے اور حساب کے لئے اُس کے حضور کھڑے ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہیں اور دوسری دو جنتیں اُن بندوں کے لئے ہوں گی جو خوفِ خدا رکھنے والے تو ہیں مگر پہلوں کی نسبت اُن کا مرتبہ کم ہے۔''
(اردو ترجمہ ''سفرِ آخرت کی منازل'' از علامہ غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ص ۲۵۲' ۲۵۴' ۲۵۵)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں۔ ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اِتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ فردوس سب سے اوپر والا درجہ ہے۔ اس سے اوپر رحمان کا عرش ہے جس سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔ جب تم اللہ تعالٰی سے سوال کرو تو جنتِ فردوس کا سوال کرو۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۳۱؛ ترمذی رقم الحدیث ۲۵۲۹؛ مسند احمد ج ۵' ص ۳۱۶)

جنت کے ایک درجہ کی وسعت: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں اور ایک ایک درجہ اتنا وسیع ہے کہ اگر تمام جہان اُس کے کسی ایک درجہ میں جمع ہو جائیں تو سما سکتے ہیں کہ اس میں اتنی گنجائش ہے۔ (ترمذی رقم الحدیث: ۲۵۳۲)

جنت کے دروازے: اللہ بزرگ و برتر کا ارشادِ گرامی ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (اَلزُّمَر: ۷۳)

''یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اُس کے دروازے کھلے ہوں گے۔''

جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرے' پھر یہ کلمہ پڑھے: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ' تو اُس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جاتے ہیں' جس دروازے سے چاہے' جنت میں داخل ہو جائے۔ (صحیح مسلم ج ۳' ص ۱۱۸؛ مسند احمد ج ۴' ص ص ۱۴۶ تا ۱۵۳؛ مستدرک للحاکم ج ۲' ص ۳۹۹؛ ابن حبان ج ۲' ص ۱۹۳)

بعض علماء سے اِن دروازوں کی تعیین کا قول بھی منقول ہے۔ اُنہوں نے اپنے موقف پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام مالک نے مؤطا میں اور امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے مال میں سے ایک جوڑا اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو جنت میں اس کے لئے ندا کی جائے گی: اے اللہ کے بندے! یہ نیکی ہے پس جو شخص نمازیوں میں سے ہوگا اُسے ''باب الصلوٰۃ'' سے پکارا جائے گا' جو مجاہدوں میں سے ہوگا اُسے ''باب الجہاد'' سے پکارا جائے

گا' جو صدقہ دینے والا ہوگا اُسے ''باب الصدقۃ'' سے پکارا جائے گا' جو روزہ داروں میں سے ہوگا' اُسے ''باب الریان'' سے پکارا جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کسی شخص کو اِن تمام دروازوں سے پکارے جانے کی ضرورت تو نہیں ہے' پھر بھی کوئی ایسا شخص ہوگا جسے اِن تمام دروازوں سے بلایا جائے گا؟'' فرمایا: ہاں اور مجھے امید ہے کہ تم اُن میں سے ہوگے۔'' (صحیح بخاری ج ۴' ص ۱۱۱؛ صحیح مسلم: کتاب الزکوۃ؛ ترمذی رقم الحدیث ۳۶۷۴؛ مسند احمد ج ۴' ص ۳۸۶؛ مؤطا امام مالک ج ۲' ص ۳۶۹' ابن حبان ج ۱' ص ۲۶۳' البیہقی ج ۹' ص ۱۷۱)

<u>جنت کے دروازوں کی وسعت:</u> حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے' جنت کے دروازوں کے کواڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا فاصلہ مکہ اور مقامِ ہجر کے درمیان' یا مکہ اور مقام بصریٰ کے درمیان ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب الایمان)

<u>جنت کے درخت:</u> سورۃ الواقعۃ کی آیت ۳۰ وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (اور ہمیشہ کے سائے میں) کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ میں ایک سوار ستر (۷۰) یا فرمایا کہ سو (۱۰۰) سال تک چلتا رہے تو وہ سایہ ختم نہ ہو۔ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کو جب یہ حدیث پہنچی تو اُنہوں نے فرمایا: یہ سچ ہے' قسم ہے اُس ذات کی جس نے موسیٰ بن عمران پر تورات اتاری اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر قرآن پاک نازل فرمایا ہے' اگر کوئی شخص چار یا پانچ سال کی عمر کے اونٹ پر سوار ہو کر اُس درخت کی جڑ سے سفر کرنا شروع کرے تو اُس کی شاخوں اور اُس کے سایہ کے اختتام تک پہنچ نہیں پائے گا کہ اس کا اونٹ بوڑھا ہو کر گر جائے گا۔ یہ درخت اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے لگایا ہے اور اس میں اپنی طرف سے روح ڈالی ہے اور اس کا احاطہ اور صحن جنت کی چار دیواری سے بھی پرے تک پھیلا ہوا ہے اور جنت کی تمام نہروں کا اصل سرچشمہ یہی درخت ہے اور اسی درخت کے مُڈ اور جڑ سے سب نہریں پھوٹتی ہیں۔ (صحیح بخاری ج ۶' ص ۳۱۹؛ صحیح مسلم ج ۱۷' ص ۱۶۸؛ ترمذی رقم الحدیث: ۲۵۲۳؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۳۵؛ مسند احمد ج ۲' ص ۴۰۴؛ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۸۷۶؛ ابن حبان ج ۹' ص ۲۵۰؛ الدارمی ج ۲' ص ۳۳۸؛ حلیۃ الاولیاء ج ۹' ص ۳۰؛ البغوی ج ۱۵' ص ۲۰۷)

<u>جنت کی بیری کا درخت:</u> حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ کے ذکر میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سوار اُس کی شاخوں کے سائے میں سو سال چل سکتا ہے یا فرمایا کہ اس کے سائے میں سو سوار آرام کر سکتے ہیں۔ اس میں سونے کے آشیانے ہیں اور اس کے پھل مٹکوں جتنے ہیں (صحیح بخاری ج ۱' ص ۴۵۸؛ صحیح مسلم' ج ۱۳' ص ۲۱۴؛ ترمذی ج ۸' ص ۵۶۳؛ نسائی ج ۱'

ص ۲۱۷ : مسند احمد ج ۳، ص ۱۴۸ ؛ ابن حبان، ج ۹، ص ۲۵۱ ؛ ابن ابی شیبہ رقم الحدیث ۱۵۸۱۲ ؛ دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۳۷۶-۳۸۲)

حضرت سلیم بن عامر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک دیہاتی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک اذیت دینے والے درخت کا ذکر فرمایا ہے اور میں تو یہ خیال کرتا تھا کہ جنت میں کوئی درخت ایسا نہیں جس سے کسی جنتی کو کوئی تکلیف پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ کون سا درخت ہے؟ اُس نے عرض کی: بیری کا درخت کہ اُس کے کانٹوں سے اذیّت پہنچتی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (سورۃ الواقعۃ: ۲۸) ''بغیر کانٹوں والی بیریوں میں''۔ جنت کی بیری کے کانٹے دُور کرکے ہر کانٹے کی جگہ پھل لگا دیا گیا ہے اور اس میں ہر کانٹے کی جگہ پھل ہی نکلتا ہے۔ جنت کی بیری پر مختلف ذائقوں والے بہتر (۷۲) قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور ہر قسم کا ذائقہ دوسرے سے الگ ہوگا۔ (مجمع الزوائد للبیہقی، ج ۱۰، ص ۴۱۴ ؛ حلیۃ الاولیاء ج ۶، ص ۱۰۳)

''جنت کی کھجور جڑ سے شاخوں تک پھل سے لدی ہوئی ہے اور اس کے پھل مٹکوں جتنے ہیں۔ جب اس کا پھل توڑا جائے گا، اُسی وقت اُس کی جگہ دوبارہ پھل لگ جائے گا۔ جنت کا پانی بغیر کھالوں کے بہتا ہے۔ جنت کے پھلوں کے خوشے بارہ ہاتھ کی مقدار کے برابر ہوں گے۔''

''جنت کا درخت طُوبیٰ: حضرت امام باہلی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے۔ جنت کا کوئی گھر ایسا نہیں جس میں اس درخت کی شاخ نہ پہنچتی ہو اور کوئی خوبصورت پرندہ ایسا نہ ہوگا جس کا آشیانہ اس درخت کی شاخوں پر نہ ہو اور کوئی پھل ایسا نہ ہوگا جو طوبیٰ پر لگا ہوا نہ ہو۔'' (''سفرِ آخرت کی منازل''۔۔۔اردو ترجمہ از علامہ غلام نصیر الدین گولڑوی، ج ۲، ص ۲۷۰)

کدو اور تربوز جنتی پیداوار ہیں: ''حضرت علی کرّم اللہ وجھہ، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تربوز کھایا کرو اور اُسے ایک معمولی چیز نہ سمجھو۔ یہ بڑی عظیم نعمت ہے اور اس کا پانی اور مٹھاس دونوں جنت میں سے ہیں۔ جو شخص اسے ایک بار کھاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ میں ستر دوائیں داخل فرماتا ہے اور ستر بیماریاں دُور فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر لقمہ کے بدلے اُس کے لئے دس نیکیاں لکھتا ہے، اُس کے دس گناہ مٹا دیتا ہے اور دس درجے بلند فرما دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی: وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (سورہ الصافّات: ۱۴۶) ''اور ہم نے اُس (یونس علیہ السلام) پر کدو کا درخت اُگایا۔'' پھر آپ نے فرمایا: کدو اور تربوز جنت کی ترکاریوں اور پھلوں میں سے ہیں۔

نوٹ: کدو کی بیل ہوتی ہے جو زمین پر پھیلتی ہے مگر یہ یونس علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس بیل کی قد والے درختوں کی طرح شاخ تھی اور اس کے بڑے بڑے پتوں کے سایہ میں آپ آرام فرماتے تھے۔ (''الموضوعات'' لابن الجوزی، ج ۲، ص ۲۸۶، بحوالہ غلام نصیر الدین، ج ۲، ص ص ۲۷۰، ۲۷۱)

<u>جنت کے درختوں کی نوعیت</u> : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ہر درخت کا تنا سونے کا ہے۔(ترمذی رقم الحدیث: ۲۵۲۵ ؛ابن حبان ج ۹' ص ۲۵۰)

<u>جنّتیوں کے لباس</u> : ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ o (سورة الحج : ۲۳)

''اور جنت میں اُن کا لباس ریشم کا ہے۔''

(۲) يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّإِسْتَبْرَقٍ (الکھف : ۳۱)

''اُس میں اُنہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سبز رنگ کے باریک اور دبیز کپڑے پہنیں گے۔''

(۳) عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّإِسْتَبْرَقٌ (اَلدّھر : ۲۱)

''اُن (جنتیوں) پر باریک ریشم کے اور دبیز ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے۔''

<u>''سبز رنگ کو مخصوص کرنے کی وجہ</u> : مفسرین فرماتے ہیں کہ سبز رنگ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نظر کے لئے موزوں اور اس کے لئے موافق وسازگار ہے۔سیاہ رنگ غصہ پیدا کرتا ہے۔سبز رنگ سیاہ اور سفید دونوں رنگوں کی درمیانی اور اعتدالی کیفیت کا حامل رنگ ہے جس پر نظر ٹھہرتی ہے اور انتشارِ نظر کا موجب نہیں بنتا۔اس لئے اِس معتدل رنگ کو جنتیوں کے لباس کے لئے خاص کیا گیا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۴۳)

<u>جنت کا موسم اور درجہ حرارت</u> : سورۃ الدّھر میں ارشادِ پاک ہوا :

لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا o (الدّھر: ۱۳)

''وہ جنت میں نہ تپش پائیں گے اور نہ سردی۔''

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہاں کا موسم نہ ہی گرم اور نہ ہی سرد ہوگا بلکہ انسان کی حس اور طبیعت کے مطابق وموافق انتہائی خوش کن اور من بھاتا ہوگا۔

جنتیوں کی خوشیوں اور مسرّتوں کے مناظر کا نقشہ قرآن مجید میں حیرت انگیز اور بے مثالی انداز میں کھینچا گیا ہے۔اُنہیں وہاں انتہائی پُر اطمینان' پُر امن اور ہر خطرے سے محفوظ دکھایا گیا ہے جہاں وہ کوئی فضول اور تہذیب و اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں سنیں گے اور امن کا ماحول پائیں گے۔ارشادِ پاک ہوا :

(۱) اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ o اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ o وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ o لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ o (الحِجر : ۴۵ تا ۴۸)

''بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے' (کہا جائے گا کہ) اُن میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو اور جو کچھ اُن کے دلوں میں کینہ ہوگا' اُسے ہم نکال باہر کریں گے۔ سب بھائی بھائی کی طرح آمنے سامنے تختوں پر براجمان ہوں گے۔ اُس میں نہ اُنہیں کوئی تکلیف چھوئے گی اور نہ وہ اس میں سے (کبھی) نکالے جائیں گے۔'' (۴۵ تا ۴۸ : ۱۵)

(۲) لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا o (مریم : ۶۲)

''اُس جنت میں وہ کوئی فضول بات نہ سنیں گے ہاں البتہ سلام کی آوازیں سنیں گے اور اُنہیں اس میں اُن کا کھانا صبح وشام ملتا رہے گا۔'' (۶۲ : ۱۹)

اردو محاورہ میں صبح وشام سے ایک مراد دوام (ہمیشگی) کی ہوتی ہے نہ کہ طلوع وغروبِ آفتاب کے دو متعیّن وقت۔ جنت میں ظلمت ہی سرے سے کہاں ہوگی جس سے یہ متعارف صبح وشام پیدا ہوتے ہیں ع

چسکا پڑا ہے جام کا' شغل ہے صبح وشام کا (ماجدی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنتی لوگ جنت میں کھائیں اور پئیں گے' وہ اس میں نہ تو تھوکیں گے اور نہ پیشاب کریں گے' نہ رفع حاجت کریں گے اور نہ ناک صاف کریں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: پھر اُن کا کھانا کہاں جائے گا؟ فرمایا: کھانے پینے کے بعد اُن کے جسم سے پسینہ بہے گا اور اس کے ساتھ ہی اُن کا پیٹ فارغ اور خالی ہو جائے گا۔ (مسند احمد ج ۴' ص ۳۷۱ ؛ سنن دارمی ج ۲' ص ۳۳۴ ؛ ابن ابی شیبہ ج ۱۳' ص ۱۰۸ ؛ حِلیۃ الاولیاء ج ۸' ص ۱۱۶)

اہلِ جنت کی خوش عیشی کی تکمیل کے لئے دوسری لذتوں کے ساتھ مواصلت کا ذکر بھی ضروری تھا۔ سورۃ الواقعۃ کی آیات ۳۵ تا ۳۸ میں بتایا کہ جنت کی عورتوں کی (بہ شمول حورانِ جنت اور اِس دنیا کی جنتی بیویاں) بناوٹ حیرت انگیز ہوگی۔ اُن کا شباب' اُن کا حسن و جمال' دلکشی اور اہلِ جنت کے ساتھ اُن کی ہم عمری یہ سب چیزیں مستقل' پائدار اور دائمی ہوں گی اور اس دنیا کی نعمتوں کی طرح فنا پذیر نہ ہوں گی:۔

إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً o فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا o عُرُبًا أَتْرَابًا o لِّأَصْحَابِ الْيَمِينِ o (الواقعۃ:۳۵۔۳۸)

''بے شک ہم نے اُن عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے یعنی ہم نے ایسا بنا دیا ہے کہ وہ کنواری رہیں گی اور دائیں والوں کے لئے محبوبہ اور ہم عمر رہیں گی۔'' (۳۵ تا ۳۸ : ۵۶)

اُن کے بارے میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے سوال کرنے پر ختمی مرتبت آقا ﷺ نے فرمایا: اے اُمّ سلمہ! ان سے مراد دُنیا ہی کی بیویاں ہیں۔ اگرچہ وفات کے وقت وہ بوڑھی تھیں' اُن کے بال سفید تھے' اُن کی بینائی کمزور تھی' آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ساری ہم عمر ہوں گی۔ (ضیاء القرآن)

عُرُب'' کا واحد عَرُوب'' ہے۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ وہ عورت ہے جو ناز و انداز اور خوش گفتاری سے اپنی محبت کا اظہار اپنے خاوند سے کرے۔ یہ عورت کی ایسی صفت ہے جس میں اس کی نسوانیت کی ساری خوبیاں سمٹ آتی ہیں۔ حسین و جمیل بھی ہو' ناز و اَدا والی بھی ہو' خوش گفتار بھی ہو' ہنس مکھ بھی اور اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور اپنی چاہت کو چُھپانے والی نہ ہو بلکہ اس کا اظہار کرنے والی ہو۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۹۲)

اِن انعامات کے علاوہ قرآن مجید نے اہلِ جنت کے لئے کچھ اور نوازشات کا بھی ذکر فرمایا مثلاً:

(۱) اُن کے لئے موت نہیں ہوگی اور وہ حیاتِ جاودانی سے حظ اندوز ہوتے رہیں گے۔ (الدُّخان: ۵۶)

(۲) وہ مہذّب گفتگو سے حظ اندوز ہوتے رہیں گے (الرَّعد : ۲۴)

(۳) پرندوں کے گوشت سے لطف اندوزی' لمبے لمبے سایوں' پانی کی آبشاروں' پھلوں کی بہتات میں وہ زندگی بسر کریں گے جو نہ ختم ہوں گے اور نہ اُن سے روکا جائے گا۔ اونچے اونچے پلنگوں پر بستر بچھے ہوں گے (سورۃ الواقعۃ: ۲۱' ۳۰ تا ۳۴)

(۴) بہتی ہوئی شراب سے لبریز سفید' پینے والوں کے حق میں خوب لذیذ اُن پر جام دَور کرے گا جس سے نہ چکر آئے گا اور نہ اس سے وہ بہکی بہکی باتیں کریں گے۔ (سورۃ الصّافّات: ۴۵ تا ۴۷)

(۵) بڑی سے بڑی انفرادی اور مادّی لذّتیں بھی اہلِ جنت کے لئے کافی نہ ہوں گی۔ ہم مشربوں' دوستوں اور عزیزوں کے اجتماع کا لطف ان لذّتوں کو دوبالا کردے گا۔ (سورۃ الصّافات: ۵۰)

(۶) اہلِ جنت سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے' اُن کے پاس لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے' آب خورے' آفتابے اور بہتی ہوئی شراب سے لبریز جام لے کر آمد و رفت رکھیں گے۔ (سورۃ الواقعۃ: ۱۵ تا ۱۸)

(۷) جنت کے پھلوں کے گچھے جھکا کر نیچے کر دئے جائیں گے تاکہ وہ کھڑے' بیٹھے' لیٹے ہر حال میں بہ آسانی پھل لے سکیں۔ (سورۃ الدّھر: ۱۴)

(۸) اہلِ جنت کو پانی کی ضرورت پڑنے پر ایسا نہ ہوگا کہ اپنے بالا خانوں سے نیچے اتر کر اُنہیں مشکیزہ یا گھڑا بھر کر لانا پڑے بلکہ جدھر اشارہ کریں گے' اُس چشمہ کا پانی وہاں بہتا چلا جائے گا۔ کوئی بلندی و پستی' کوئی گڑھا اور وادی اُس پانی کے رواں ہونے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ (سورۃ الدھر: ۶)

(۹) اہلِ جنت کو ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جو سر بمہر کر کے رکھی ہوئی ہے۔ (المطففین: ۲۵' ۲۶)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیتِ کریمہ خِتَامُہ' مِسْكٌ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ چاندی کی مثل سفید شراب ہے اور پینے والے اس خاص شراب کو سب سے آخر میں پئیں گے۔ اُس کی خوشبو کا یہ عالم ہے کہ اگر دنیا کا کوئی آدمی اس شراب کے مٹکے میں اپنا ہاتھ ڈال کر نکال لے تو دنیا بھر کے ذی روح اُس کی خوشبو محسوس کریں یعنی پوری دنیا کو اُس کی خوشبو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پورے عالم کی فضا معطر ہو کے رہ جائے۔ اس نتھری ہوئی اور خوشبودار شراب کا ذکر فرمانے کے بعد اُس کے حصول کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَo (المطفّفین : ۲۶)
''اور للچانے والوں کو اسی پر للچانا چاہئے (دنیا میں نیک کاموں میں سبقت کر کے)

(۱۰) اہلِ جنت کے چہرے بارونق ہوں گے' عالیشان جنت میں وہ اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے۔ جنت میں اونچے اونچے تخت بچھے ہوں گے' ساغر قرینے سے رکھے ہوں گے' گاؤتکیے قطار در قطار لگے ہوں گے اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے۔ (سورۃ الغاشیۃ : ۸' ۹' ۱۰' ۱۳ تا ۱۶)

یہ حظ اندوزیاں اور شادمانیاں انسانی سوچ اور تصوّر سے ماوراء ہیں خواہ وہ تصوّر کے کتنے ہی گھوڑے کیوں نہ دوڑائے' اُن لطف اندوزیوں تک پہنچ ہی نہیں سکتا جو اہلِ جنت کے لئے چھپا کے رکھی گئی ہیں :
فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَo (السجدۃ : ۱۷)
''سو کسی کو علم نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا (سامان) اُن کے لئے خزانۂ غیب میں مخفی ہے' یہ صلہ ہے اُن کے (نیک) اعمال کا۔'' (۱۷ : ۳۲)

حقیقۃً جنت کی نعمتوں کا پورا اندازہ انسان کو اپنے ناسوتی حواس کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے یہ جو حدیثِ قدسی مختلف طریقوں سے مروی ہوئی ہے کہ قَالَ اللّٰهُ اَعْدَدْتُّ لِعِبَادِیَ الصّٰلِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے' نہ کسی کان نے سنا ہے اور جو نہ کسی انسان کے دل میں گزری ہیں) وہ گویا ٹھیک اِسی آیت کی تفسیر ہے۔

''ادنیٰ جنتی کا مرتبہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے کم درجے کا جنتی وہ ہوگا جس کے اَسّی ہزار خادم اور بہتر (۷۲) بیویاں ہوں گی۔ (ترمذی رقم الحدیث : ۱۵۶۲ ؛ مسند احمد ج ۳' ص ۷۶ ؛ ابن حبان رقم الحدیث : ۲۶۳۸)

ایک اُلجھاؤ اور اُس کا سُلجھاؤ : ''اِس باب کی ایک حدیث میں ہے کہ جنتیوں کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اور اُن کی اگربتیاں عُود کی ہوں گی۔ اب اِشکال یہ ہے کہ جنتیوں کے نہ تو بال بکھریں' اُلجھیں گے' نہ میلے کچیلے ہوں گے کہ اُنہیں سنوارنے اور کنگھا کرنے کی ضرورت پڑے' اسی طرح اُن کا پسینہ خالص مشک ہوگا پھر اُنہیں اگربتیوں اور دھونیوں کی کیا حاجت ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ جنت کی یہ ساری نعمتیں اور قسم قسم کے لباس اس لئے نہیں کہ کسی تکلیف اور اَلم کو دُور کرنے کے لئے ہوں گے بلکہ لذت کے لئے ہوں گے تاکہ وہ نئی نئی لذت اور مزے سے لطف اندوز ہوتے رہیں اور مسلسل اور پے در پے نعمتوں سے حظ اُٹھائیں۔'' (اردو ترجمہ مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ص ۳۰۲' ۳۰۳)

مذکورہ بالا مادّی حظ اندوزیوں اور مسرّتوں کے علاوہ ایک اور قسم کی مسرت کے حوالہ جات بھی قرآن مجید میں ہیں جو اُن مادّی مسرتوں سے کہیں بڑھ کر اور اعلیٰ و اَرفع ہے۔ جنات الفردوس اور جنات النعیم کی لطف اندوزیوں سے بڑھ کر رضا اور خوشنودِ الٰہی ہے جس کا ذکر سورۃ التوبۃ میں یوں ہوا :

وَرِضْوَان" مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَالْفَوزُ الْعَظِيْمُ○ (أَلتَّوبة : ٧٢)

''اور اللہ کی رضا مندی سب (نعمتوں) سے بڑھ کر ہے' بڑی کامیابی یہی ہے۔'' (۹:۷۲)

''صوفیائے عارفین نے لکھا ہے کہ جنت میں دیدارِ الٰہی گو ایک عظیم الشان نعمت ہے لیکن یہ لذت تو صرف عاشقوں اور دیدار کرنے والوں کے نقطۂ خیال سے ہے۔ عاشق کے لئے بے شک دیدارِ محبوب سے بڑھ کر لذیذ نعمت اور کیا ہوسکتی ہے لیکن محبوب کی رضا تو اس سے بھی بڑھ کر لطیف و لذیذ ہے اور محبوبِ حقیقی کی رضا صرف تعمیلِ احکام اور ادائے فرائض میں ہے۔'' (ماجدی' حاشیہ صفحہ ۴۱۴ اُردو)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتیوں کو سلام کا تحفہ : سورہ یٰسٓ میں ارشادِ خداوندی ہے:

سَلَام" قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْم○ (يٰسٓ : ۵۸)

''اُن پر رحمت والے رب کی طرف سے سلام ہوگا۔''

اس آیت کی تفسیر زبانِ رسالت مآب ﷺ کی طرف سے ملاحظہ ہو: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت اہلِ جنت اپنی نعمتوں کی لطف اندوزیوں میں مشغول ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نور چمکے گا۔ جب وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اُنہیں معلوم ہوگا کہ اُن کا ربّ کریم اُن کی طرف نظرِ کرم فرما رہا ہے' ارشاد ہوگا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّة اور سَلَام" قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْم کا یہی مطلب ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کی طرف دیکھے گا اور وہ اُس کی طرف دیکھتے رہیں گے۔ محویت کا یہ عالم ہوگا کہ جب وہ جمالِ حقیقی کا دیدار کر رہے ہوں گے تو جنت کی کسی دوسری نعمت کا اُنہیں خیال تک نہیں رہے گا یہاں تک کہ حُسنِ حقیقی پردہ فرمائے گا لیکن اس کا نور اور اس کی برکت اُن پر اور اُن کے مکانوں پر ضیاء بار رہے گی۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۴ ؛ موضوعات لابن جوزی ج ۳' ص ۲۶۱)

قولِ باری تعالیٰ وَلَدَيْنَا مَزِيد" اور لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَة'' کی تفسیر :

سورہ قٓ کی آیت ۳۵ اِس طرح ہے : لَهُمْ مَّا يَشَآءُ وْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْد" (اہلِ جنت کو وہاں سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنتی ہر جمعہ کو اپنے رب کریم کا دیدار کریں گے اور وہ کافور کے ایسے ٹیلے پر بیٹھیں

گے جس کے کنارے دکھائی نہیں دیں گے اور ان ٹیلوں کے درمیان ایک نہر چلتی ہے جس کے دونوں کنارے مُشک کے ہیں اور نہر کے کنارے بیٹھی اتنی خوبصورت آواز میں قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہیں کہ ایسا حُسنِ قرآت کا مظاہرہ کبھی نہ اگلوں نے سنا ہے اور نہ پچھلوں نے۔ پھر جب جنتی اپنے گھر کی طرف چلیں گے تو ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے' موتیوں کے پلوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوں گے۔''

قیامت کے دن **دیدارِ الٰہی** کے بارے میں معتزلہ کا موقف یہ ہے کہ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ ایک غیر ماڈی ہستی ہے اس لئے وہ نظر نہیں آ سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ وہ نظر آ سکتا ہے' اُسے انسان کی طرح سمجھنے کے ہم معنیٰ ہوگا (اور نظریہ تجسیمیت Anthropomorphism اسی کا نام ہے)۔ وہ اپنے موقف کی تائید میں سورۃ الانعام کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ جس کا معنیٰ وہ غلط طور پر یہ کرتے ہیں کہ آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں جبکہ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ قولِ باری تعالیٰ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ'' کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اس آیتِ کریمہ میں ''زِيَادَةٌ'' سے مراد اللہ عزّ وجلّ کی ذات کا دیدار کرنا ہے اور اہلِ جنت کے نزدیک جمعہ کے دن دیدارِ الٰہی کے انعام سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہ ہوگی اور اس کا نام ''یومُ المزید'' بھی ہے۔

<u>دیدارِ الٰہی کے متعلق قرآنی آیات</u> : حسب ذیل ہیں :

(۱) وَجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (القیامۃ : ۲۲' ۲۳)

''اُس دن کتنے ہی چہرے تروتازہ ہوں گے' اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' (۲۲'۲۳:۷۵)

(۲) كَلَّآ إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (اَلْمُطَفِّفِین : ۱۵)

''بے شک کفار اُس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور محروم ہوں گے۔'' (۱۵ : ۸۳)

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ مسلمان رب کے دیدار سے محروم نہیں رہیں گے۔

(۳) اگر دیدارِ الٰہی ناممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام اللہ سے اُس کے دیدار کا سوال نہ کرتے (بحوالہ سورۃ الاعراف:۱۴۳)

(۴) وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حٰم السجدۃ : ۳۱)

''اور تمہارے لئے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور اس میں تمہارے لئے ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے۔''

نیک اور صاف دل لوگ جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار طلب کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ جنت میں اُن کی ہر خواہش پوری فرمائے گا' سو یہ آیت جنت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار ہونے کی دلیل ہے۔

(۵) لَا تُدْرِکُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (الانعام : ۱۰۳)
''آنکھیں اُس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کا احاطہ کرتا ہے۔'' (۶ : ۱۰۳)

دیدارِ الٰہی کی بابت سیدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا موقف: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آیتِ مذکورہ بالا سے استنباط کر کے دیدارِ الٰہی کی قائل نہیں تھیں لیکن ہمارا استدلال اُس قوی حدیث سے ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ خُلّت حضرت ابراہیم کے لئے ہو' کلام حضرت موسیٰ کے لئے ہو اور دیدار سیدنا محمد ﷺ کے لئے ہو؟ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ کیا سیدنا محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو اُنہوں نے کہا: ہاں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو آقائے ہر جہاں ﷺ نے ''حِبْرُ الامّت'' کا لقب عطا فرمایا اور اسی وجہ سے کبار صحابہ تک مشکل مسائل میں اُن کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اس مسئلہ میں سیدہ عائشہ صدّیقہ کے اختلافِ رائے سے کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ سیدہ نے نبی ﷺ سے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہو کہ میں نے اپنے رب کو نہیں دیکھا بلکہ اُنہوں نے خود قرآن مجید سے اس مسئلہ کا استنباط کیا ہے اور جب صحابی کا قول کسی دوسرے صحابی کے قول کے خلاف ہو تو اُس کا قول حجت نہیں ہوتا اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ رؤیت ثابت ہے تو اس روایت کو قبول کرنا واجب ہے۔
(''تبیان القرآن''۔۔۔علامہ غلام رسول سعیدی' جلد سوئم' ص ۶۲۱)

سورۃ الانعام کی محولہ بالا آیت ۱۰۳ کے جواب میں دیدارِ الٰہی کے ثبوت میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ آیت مذکورہ میں لفظ لَا تُدْرِکُهُ آیا ہے جو ''اِدراک'' (بمعنیٰ احاطہ کرنا) سے ہے' نہ کہ لَا تَنْظُرُ۔ اور اس لحاظ سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ آنکھیں اُس کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔ ظاہر ہے کہ رب کی ذات ایسی نہیں کہ کسی کے احاطہ میں آجائے اور یہ معلوم کرلیا جائے کہ رب کا حجم' قد وقامت' ڈیل ڈول اور جسامت وغیرہ کیا ہے کہ یہ بات معبودیت کے خلاف ہے۔ احاطہ کرنے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ لہٰذا ''احاطہ کرنا'' ہی صحیح ترجمہ ہے۔

احادیث مبارکہ سے ثبوت: حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ (صحیح بخاری ج ۱' رقم الحدیث: ۵۵۴ ؛ صحیح مسلم ؛ سنن ابی داؤد ج ۴' رقم الحدیث: ۴۷۲۹ ؛ سنن ابن ماجہ ج ۱' رقم الحدیث: ۱۷۷)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس کی بابت سوال کیا گیا تو اُنہوں نے حضرت ابن عباس کی حدیث کے مطابق بار بار یہی کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا ہے یہاں تک کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سانس منقطع ہوگئی۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں دکھائی نہیں دیتا کیونکہ وہ باقی ہے اور فانی آنکھوں سے باقی کو نہیں دیکھا جا سکتا اور جب مسلمان آخرت میں پہنچیں گے تو اُنہیں باقی رہنے والی آنکھیں دی جائیں گے تو باقی آنکھوں سے باقی ذات کو دیکھ لیں گے۔

آیا جنت اور جہنم پہلے ہی سے موجود ہیں؟ آدم اور حوا علیہا السلام چونکہ جنت میں رہتے رہے ہیں اس لئے جنت وجہنم کے وجود کا پہلے ہی سے ہونا ایک کھلی حقیقت اور اٹل صداقت ہے۔

زمین اور آسمان کے تبدیل ہونے میں حکمت : ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَالْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (سورہ ابراھیم : ۴۸)

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دیا جائے گا۔)''(۱۴:۴۸)

''یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر دلیل ہے جس میں قیامت کی جزئیات کی اس لئے خبر دی ہے تاکہ سننے والے کو پہلے سے بصیرت حاصل ہو اور قیامت کی ہولناکیوں کا اُسے پہلے سے علم ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو ان ہولناک چیزوں کے لئے تیار کر لے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ تمام امور اچانک پیش آ جائیں۔ حدیثِ پاک میں بھی یہ مضمون آیا ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ میدانِ حشر کی زمین اس موجودہ زمین سے بہت بڑی ہوگی اور زمین کی ان صفات میں یہ حکمت ہے کہ جس زمین میں حساب وکتاب ہوگا' وہ ظلم اور گناہوں سے پاک ہو اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے مؤمن بندوں پر جو تجلّی فرمائے گا' وہ ایسی زمین ہو جو اُس تجلّی کی عظمت کے لائق ہو۔ کیونکہ اُس زمین میں صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کا حکم ہوگا۔ پس اس کے مناسب یہ ہے کہ وہ زمین بھی خالص اُس کے لئے ہو (یعنی اُس میں مجازاً بھی کسی اور کا حکم نافذ نہ ہو)۔'' (''تبیان القرآن'' از علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ششم' ص ۲۲۴)

کیا زمین وآسمان کی تبدیلی سے مراد ذات کی تبدیلی ہے یا فقط اُن کی صفات کی تبدیلی؟

''جیسا کہ آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ یہ زمین اور یہ آسمان بدل دیئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اُن کی جگہ دوسری زمین اور آسمان پیدا فرمائے گا' تبدیلی کے وقت لوگ ''پُل صراط'' پر ٹھہریں گے اور اس کے بعد پھر نئی زمین پر آ جائیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اکثر لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ زمین کی تبدیلی سے مراد اُس کی صفات کا بدل جانا ہے اس طرح کہ اس کے نشیب وفراز کو ہموار کر دیا جائے گا' پہاڑوں کو ختم کر کے زمین کو بچھا دیا جائے گا (اور زمین کی اِسی ہمواری اور برابری کا نام تبدیلی ہے)

علامہ قرطبی نے التذکرۃ فی اسور الآخرۃ میں صاحب الافصاح سے نقل کیا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کا

تبدیل کرنا دو مرتبہ ہوگا۔ پہلے صور پھونکنے کے وقت صرف اُن کی صفات تبدیل ہوں گی' پس ستارے منتشر ہو جائیں گے' سورج اور چاند کو گہن لگ جائے گا' آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا اور سروں سے کھینچ لیا جائے گا' پہاڑ چلنے لگیں گے اور زمین میں تموّج ہوگا' سمندر آگ بن جائیں گے۔ پھر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک زمین پھٹ جائے گی' پھر اُس کی بنیاد اور ہیئت بدل جائے گی۔ پھر اس کے بعد صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ بیہوش ہو جائیں گے' آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا اور زمین کو پھیلا دیا جائے گا اور آسمان کو دوسرے آسمان سے بدل دیا جائے گا جس کا ذکر سورۃ الزُّمَر کی آیت ۶۸ میں ہوا۔'' (ایضاً ص ۲۲۶)

''آسمان کی تبدیلی: خلاصہ یہ ہے کہ پہلی بار زمین کی صفات کو تبدیل کیا جائے گا اور اُسے چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا اور دوسری بار زمین کے مادّے اور اُس کی ذات کو بدل دیا جائے گا۔ پہلے وہ مٹی کی تھی اور اب اُسے سفید روٹی بنا دیا جائے گا۔ یہ تو زمین کی تبدیلی تھی۔ آسمان کی تبدیلی کے متعلق علامہ قرطبی نے لکھا ہے جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے جھڑ جائیں گے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور ابن الانباری نے یہ کہا ہے کہ آسمان دھواں بن جائے گا' سمندر آگ بن جائیں گے۔ آسمان کو اس طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح وثیقہ (اسٹامپ پیپر) کو لپیٹ دیا جاتا ہے (بحوالہ سورۃ الانبیاء' آیت ۱۰۴)۔''

''قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ یہ زمین ہے' اسی جگہ میدانِ حشر قائم ہوگا لیکن اس زمین کا مادّہ اور اُس کی ذات وصفات یہ نہیں ہوں گی۔ پہلے اس زمین کو ہموار کر دیا جائے گا اور دوسرے صور کے پھونکے جانے کے وقت یہ زمین میدہ کی روٹی بنا دی جائے گی۔'' (ایضاً ص ۲۲۶)

''سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۳۳ اور سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ سے معلوم ہوا کہ جنت کا صرف عرض (چوڑائی) ہی تمام آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ علم الافلاک کی جدید تحقیق کے مطابق صرف ایک آسمان لاکھوں کہکشاؤں پر مشتمل ہے اور ہر کہکشاں میں ایک سو اَرب ستارے ہیں۔ صرف ایک کہکشاں کی چوڑائی اس قدر وسیع ہے کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرنے والی روشنی کو کہکشاں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں تقریباً بیس ہزار سال لگتے ہیں۔ یہ صرف ایک کہکشاں کا حال ہے۔ اب تمام آسمانوں کے حجم (سائز) کا اندازہ کر کے اس نئی کائنات میں اُس جنت کے حجم کا تصوّر کر لیجیے جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ ان تمام سے وسعت میں کہیں زیادہ ہے۔''

''اسی طرح جہنم اور مقامِ اعراف کے حجم (سائز) بھی بہت وسیع ہیں اور اس طرح نئی قائم شدہ کائنات کا تمام ضابطہ ہر قسم کے تصور سے ماوراء ہے۔'' ("Doomsday and Life after Death" ... Sultan Bashir Mahmood, pp. 144-145)

أشراطُ السَّاعة (قیامت کی علامات) میں سے ایک علامت وقتِ آخر میں یاجوج ماجوج (بحوالہ سورۃالکہف: آیت۹۴، سورۃالانبیاء: آیت ۹۶) کا خروج، مہدی علیہ السلام اور دجّال کا ظہور اور عیسٰی علیہ السلام کی تشریف آوری ہے۔

یاجوج وماجوج: سورۃالکہف کی آیت ۹۴ میں مذکور بیان کے مطابق یاجوج ماجوج، تخریب کاری کے نمائندے ہیں۔ یہ لوگ فصلِ ربیع میں نکلتے تھے اور اپنے قریبی علاقوں میں بسنے والے انسانوں کی کھیتیوں کو اُجاڑتے اور جو ہاتھ لگتا سب کھا جاتے۔ سبزے کا تو کہیں نام ونشان نہ چھوڑتے، باقی جو خشک جنس اور اناج ملتا، اُسے اپنے ساتھ اُٹھا لے جاتے تھے۔ تب اُس منطقہ کے لوگوں نے ذوالقرنین سے اِن دہشت گرد کافروں کی شکایت کرتے ہوئے درخواست کی اور کہا: فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا٥ قَالَ مَامَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ" فَأَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ٥ (ألکهف: ۹۴، ۹۵)

''تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ مال مقرر کر دیں، اس پر کہ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک دیوار بنا دیں؟ آپ نے کہا: وہ جس پر مجھے میرے رب نے قدرت اور ہمت دی ہے، بہتر ہے۔ تو قوت سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور اُن کے درمیان ایک مضبوط آڑ بنا دوں۔'' (۹۴،۹۵ : ۱۸)

آپ نے فرمایا کہ مجھے مال کی حاجت نہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کا مال وافر مقدار میں عطا کیا ہے۔ بس تم وہ کام کرو جس کا میں تم سے کہوں۔ اُنہوں نے عرض کیا: پھر ہمارے متعلق کیا خدمت ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

آتُوْنِىْ زُبَرَالْحَدِيْدِ حَتّٰى إِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰى إِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا٥فَمَا اسْطَاعُوْا أَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَااسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا٥ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ" مِّنْ رَّبِّىْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ (ألکهف: ۹۶ تا ۹۸)

''تم میرے پاس لوہے کے تختے لاؤ، یہاں تک کہ جب وہ دیوار دونوں پہاڑوں کے کناروں سے برابر کر دی تو کہا: دھونکو (آگ جلاؤ) یہاں تک کہ جب اُسے آگ کر دیا تو کہا: لاؤ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا اُنڈیل دوں کہ یاجوج وماجوج اُس پر چڑھ نہ سکیں اور نہ اس میں سوراخ کر سکیں۔ کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے، پھر میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اُسے پاش پاش کر دے گا۔'' (۹۶تا۹۸ : ۱۸)

یعنی آپ نے بنیاد کھدوائی، جب وہ پانی تک پہنچی تو اس میں بڑے بڑے پتھر پگھلائے ہوئے تانبے سے جمائے اور لوہے کے تختے اوپر نیچے چن کر اُن کے درمیان لکڑی اور کوئلہ بھروا دیا اور آگ دے دی۔ اس طرح یہ دیوار پہاڑ کی بلندی تک اوپر کر دی گئی اور دونوں پہاڑوں کے درمیان کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی۔ اوپر سے پگھلا ہوا تانبا دیوار میں پلا دیا گیا۔ یہ سب مل کر ایک سخت جسم بن گیا۔

''حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یاجوج ماجوج جہنم کی مخلوق ہے۔ اُن میں کوئی ایمان

والا نہیں ہے۔ اُن کی تین قسمیں ہیں: ایک بہت چھوٹے قد کے ہیں اور اُن کا طول ایک بالشت ہے' دوسری قسم کے دو بالشت کے ہیں اور تیسری قسم وہ ہے جن کا طول اور عرض برابر ہے اور یہ سب یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔''

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یاجوج اور ماجوج ہر روز اپنی دیوار کھودتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ باہر نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: چلو واپس چلتے ہیں' باقی کل آکر کھودیں گے۔ اللہ تعالیٰ پھر اُسے پہلی حالت پر کر دیتا ہے بلکہ وہ پہلے سے زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب اُن کی مدت پوری ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کو لوگوں پر اُن کا خروج کرنا منظور ہوگا تو قدرت کی طرف سے اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی جائے گی کہ وہ کہیں گے: انشاء اللہ اب کل کھودیں گے۔ جب صبح ہوگی اور یہ واپس آکر دیکھیں گے تو دیوار اپنی اُسی حالت پر ہوگی جس پر وہ کھودتے وقت چھوڑ گئے تھے۔ اب وہ باقی ماندہ کھود ڈالیں گے اور باہر نکل پڑیں گے۔ وہ سمندر کا سارا پانی پی جائیں گے اور جو بھی چیز اُنہیں نظر آئے گی اُسے تباہ کر ڈالیں گے۔ مسلمان اپنے قلعوں میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔ یاجوج ماجوج زمین میں پھیل جائیں گے اور پھر آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے اہلِ زمین پر غلبہ پانے کے بعد اب آسمان والوں پر بھی غلبہ پا لیا ہے کیونکہ اُن کے تیر خون آلود ہو کر واپس ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کی گردنوں میں کیڑے پیدا کر دے گا جس سے وہ ہلاک ہو جائیں گے حتیٰ کہ زمین کی آب و ہوا اُن کی بدبو اور تعفّن سے مکدر ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک خاص قسم کے پرندوں کو بھیجے گا جو اُن کی لاشوں کو گھسیٹ کر سمندر میں پھینک دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے چالیس دن تک بارشیں ہوتی رہیں گی اور زمین سبزے سے ہری بھری ہو جائے گی۔'' (ترمذی' جلد ۲' ص ۱۹۷ ؛ مسند احمد ج ۲' ص ۵۱۰' ۵۱۱؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۸۰' بحوالہ التذکرۃ فی امور الآخرۃ لامام قرطبی' اردو ترجمہ ''سفرِ آخرت کی منازل'' جلد ۲' ص ص ۶۴۳' ۶۴۴)

دجّال کا ظہور: دجّال کے وجود اور اُس کے خروج پر ایمان رکھنا حق ہے۔ تمام اہلِ سنت اور جمہور فقہاء اور محدّثین کا یہی مذہب ہے۔ دجّال کے ہاتھوں پر جو امورِ خارقہ ظاہر ہوں گے وہ اُس کی حیلہ سازی اور شعبدہ بازی ہوگی کیونکہ اگر یہ امورِ خارقہ صحیح ہوں تو اس سے جھوٹے اور سچے میں اشتباہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ نبوّت کا دعویٰ نہیں بلکہ الوہیت کا دعویٰ کرے گا۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِاَعْوَرَ (دجّال تو ایک آنکھ سے کانا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے) اس لحاظ سے دجّال اپنے دعویٰ الوہیت میں خود آپ اپنا مکذّب ہوگا کیونکہ وہ اپنی ذات سے اس نقص کو دُور کرنے میں بے بس ہوگا۔ نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا: مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْہِ کَافِرٌ'' یَقْرَأُہٗ' کُلُّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَۃٍ کَاتِبٍ'' اَوْغَیْرُ کَاتِبٍ (اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوا ہوگا۔ اُسے ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت خواہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں' پڑھ لیں گے۔) مؤمن کے صرف ہوشیار اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ کسی مؤمن کو اُس کے دعویٰ کے جھوٹا ہونے کے متعلق کوئی شک نہیں رہے گا۔ غرض دجّال فتنہ اور امتحان ہوگا۔ (التذکرۃ لامام قرطبی اردو ترجمہ ج ۲' ص ۶۰۱)

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دجّال مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کے سوا تمام شہروں میں داخل ہوگا۔ (صحیح بخاری، ج ۱۳، ص ۱۰۱ ؛ صحیح مسلم ج ۱۸، ص ۸۵ ؛ مسند احمد ج ۵، ص ۴۱)

''حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دجّال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دجّال جب نکلے گا تو خدائی کا دعویٰ کرے گا، سو جس نے اُس کی تصدیق کی اور اُس کے پیچھے لگ گیا اور اُس کے دعویٰ کو سچا مان لیا تو ایسے شخص کو اس کے سابقہ نیک عمل جو اُس نے کئے تھے کوئی فائدہ نہیں دیں گے اور جو شخص دجّال کے دعوائے اُلوہیّت کو ماننے سے انکار کردے گا اور اُسے جھوٹا سمجھے گا، تو اُس کے کسی گزشتہ عمل پر اُسے سزا نہیں دی جائے گی اور وہ مکہ و مدینہ اور بیت المقدس کو چھوڑ کر تمام روئے زمین پر نمودار ہوگا اور مسلمانوں کو بیت المقدس میں بند کردے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ دجّال اور اُس کے لشکروں کو شکست دے گا حتیٰ کہ باغ کی دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکاریں گی: اے مسلمانو! یہ رہا کافر جو آڑ میں چھپا بیٹھا ہے اور کہے گا کہ اسے قتل کردو۔'' (مسند احمد ج ۵، ص ۱۶، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵، ص ۱۵۱ بحوالہ التّذکرۃ لقرطبی اردو ترجمہ، ج ۲، ص ۶۰۳)

حضرت اسماء بنتِ یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دجّال زمین میں چالیس سال ٹھہرے گا۔ ایک سال ایک ماہ کی طرح ہوگا، ایک ماہ ہفتہ بھر کی مثل ہوگا اور ہفتہ ایک روز کی مثل اور ایک روز ایک گھنٹے کے برابر ہوگا اور ایک گھنٹہ آگ میں کھجور کی ایک سوکھی شاخ کے جل کر بجھنے کے برابر ہوگا۔'' (مسند احمد ج ۶، ص ۴۵۴ ؛ مصنف عبدالرزاق ج ۱۱، ص ۳۹۲ ؛ البغوی ج ۱۵، ص ۶۲ ؛ المجمع الزوائد للہیثمی ج ۷، ص ۳۴۷)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دجّال کے متعلق سنے تو وہ اُس سے دُور رہے۔ بخدا ایک آدمی اُس کے پاس آئے گا اور وہ اپنے متعلق خیال کرتا ہوگا کہ وہ مؤمن ہے مگر وہ دجّال کے ان شکوک وشبہات کی وجہ سے اُس کے پیچھے لگ جائے گا۔ (ابو داؤد ج ۱۱، ص ۴۴۲ ؛ مسند احمد ج ۴، ص ۴۳۱ ؛ المستدرک للحاکم ج ۴، ص ۵۳۱ ؛ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵، ص ۱۲۹)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا کہ وہ کذّاب جس وقت حضرت عیسٰی بن مریم علیہ السلام کو دیکھے گا تو اس طرح پگھل جائے گا جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔ پھر عیسٰی علیہ السلام جہاد کریں گے حتیٰ کہ درخت اور پتھر پکاریں گے: اے روح اللہ! یہ یہودی ہے۔ پس حضرت عیسٰی علیہ السلام دجّال کے متبعین میں سے کسی ایک کو بھی قتل کئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ (مسند احمد ج ۳، ص ۳۶۷ ؛ المستدرک للحاکم ج ۴، ص ۵۳۰)

نوٹ : خوب خیال رہے کہ جو خدا ہونے کا دعویٰ کرے، اُس کے ہاتھ پر عجیب وغریب کرشمے ظاہر ہوسکتے ہیں کیونکہ الوہیت مشتبہ ہوسکتی ہی نہیں مگر جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اُس کے ہاتھ پر کوئی کرشمہ اور خرقِ عادت کا کوئی امر ظاہر نہیں ہوسکتا ورنہ نبوت مشتبہ ہوجائے۔ دجّال اگر دعویٰ نبوّت کرے تو کوئی عجوبہ یا معجزہ نہیں دکھا سکتا۔

امام مہدی علیہ السلام : اُن کا خروج اور ظہور احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے اور حضور علیہ السلام نے اس پر تصیص فرمائی کہ امام مہدی میری عترت اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد سے ہوں گے۔ فرمایا کہ حالات بہت خراب ہوں گے حتی کہ آدمی کو ظلم سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی۔ انہی حالات میں اللہ تعالیٰ میرے اہلِ بیت سے ایک ایسا مردِ خدا پیدا کرے گا جس کے سبب سے زمین عدل وانصاف سے بھر جائے گی جس طرح وہ پہلے ظلم اور زیادتی سے بھری پڑی تھی۔ آسمان کے رہنے والے اور زمین پر بسنے والے سب اُس سے خوش ہوں گے۔ (اُس بابرکت زمانہ میں) آسمان کھل کر برسے گا یہاں تک کہ پانی کا ایک قطرہ تک باقی نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اُسے موسلا دھار بارش کی صورت میں زمین پر اُنڈیل دے گا اور زمین بھی اپنے نباتی کردار میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے گی۔ (اللہ کے فضل وکرم سے) ہر قسم کی پیداوار ہوگی' زمین اپنے اندر کچھ نہ رکھے گی اور سب کچھ باہر اگل دے گی۔ (زندگی بڑی پُر لطف ہوگی) حتی کہ جو لوگ اُس وقت بقیدِ حیات ہوں گے وہ اس امن وامان اور خوشحال زندگی کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ کبھی موت نہ آئے اور کبھی مرنا نہ ہو۔'' (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱' ص ۳۷۱؛ البغوی ج ۱۵' ص ۸۵)

''امام مہدی سات سال تک حکومت کریں گے۔ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلیں گے اور سرزمینِ فلسطین پر ''بابِ لُد'' کے پاس دجّال کے قتل میں اُن کی مدد کریں گے اور وہ اس اُمت کی امامت فرمائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام اُن کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔'' (التذکرۃ لامام قرطبی اردو ترجمہ ج ۲' ص ۵۱۸)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد لَا مَھْدِیَّ اِلَّا عِیْسٰی (اور عیسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کوئی مہدی نہیں ہے) کا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے اَیْ لَا مَھْدِیَّ کَامِلاً مَّعْصُوْمًا اِلَّا عِیْسٰی (کامل اور معصوم مہدی تو عیسیٰ علیہ السلام ہیں)۔ اگر یہ احتمال مان لیا جائے تو احادیث میں تطبیق پیدا ہو جائے گی اور کوئی تعارض (ٹکراؤ) باقی نہیں رہے گا۔'' (ایضاً)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام سے مروی ہے کہ آخر زمانہ میں مغربِ اقصیٰ سے امام مہدی کا ظہور ہوگا اور اُن کے آگے چالیس میل کی مسافت تک فتح ونصرت ہوتی چلی جائے گی۔ اُن کے لشکریوں کے جھنڈے سفید اور زرد رنگ کے ہوں گے جن پر اسمِ اعظم ''اَللہ'' لکھا ہوگا۔ امام مہدی کے لشکر کے کسی دستے کو بھی شکست نہیں ہوگی اور یہ علمبردار دستے مغرب کی طرف سے ساحلِ سمندر کے ساتھ واقع ''ماسنہ'' نامی ایک موضع سے اُٹھیں گے اور آگے بڑھتے جائیں گے۔ ان جھنڈوں کو اٹھانے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتح ونصرت اور کامرانی کا اِس آیت میں پختہ وعدہ فرمایا ہے: اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلۃ: ۲۲) ''یہ اللہ کی جماعت ہے' سنتے ہو کہ اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے۔'' اُن کی پہلی بیعت مغربِ اقصیٰ میں ہوگی اور دوسری بیعت رکن اور مقامِ ابراہیم کے درمیان مکہ معظمہ میں ہوگی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: اللہ کی قسم! ابنِ مریم حاکمِ عادل ہو کر ضرور اتریں گے' وہ بلا شبہ صلیب کو توڑیں گے' خنزیر کو ہلاک کریں گے' جزیہ معاف کر دیں گے' اونٹنیوں کو آزاد چھوڑ دیں گے جن پر کام کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا یا اُن پر زکوٰۃ وصول کرنے والے ساعی کو روانہ نہیں کیا جائے گا۔ کینے' بغض اور حسد جاتے رہیں گے' لوگوں کو مال لینے کو بلایا جائے گا تو کوئی شخص مال قبول کرنے والا نہیں ہوگا۔'' (صحیح مسلم ج ۲' ص ۱۹۲؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۷۸ : مسند احمد ج ۲۴' ص ۸۹ ؛ ابن حبان ج ۸' ص ۲۸۸ ؛ ابوعوانہ ج ۱' ص ۱۰۴)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام زمین کی طرف اتریں گے۔ جس وقت تم اُنہیں دیکھو تو پہچان لینا کہ اُن کا رنگ سرخی اور سفیدی مائل ہوگا۔ وہ دو میناروں کے درمیان اُتریں گے' اُن کے سر سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے۔ وہ پینتالیس سال دنیا میں ٹھہریں گے' عرب سے ایک عورت کے ساتھ نکاح کریں گے اور یہ نکاح آپ دجّال کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بعد فرمائیں گے۔ آپ کے اولاد پیدا ہوگی۔ پھر آپ وفات پائیں گے اور میرے ساتھ میرے مقبرہ میں دفن کئے جائیں گے۔ (تو ہم اور عیسیٰ ابنِ مریم' ابوبکر اور عمر کے درمیان سے ایک مقبرہ سے اٹھیں گے)۔ اس کے بعد اُمّت کے اچھے لوگ فوت ہو جائیں گے اور برے لوگ باقی رہ جائیں گے۔ اہلِ ایمان بہت قلیل تعداد میں باقی رہ جائیں گے اور اسی زمانہ پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشادِ مبارک صادق آتا ہے :

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَّ سَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ

''اسلام اپنے ابتدائی دَور میں غریب اور اجنبی تھا اور عنقریب پھر اپنی ابتدائی حالت کی طرف لوٹے گا اور وہ غریب واجنبی ہوگا۔'' (''التذکرۃ'' لامام قرطبی' اردو ترجمہ ج ۲' ص ۶۱۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعتِ محمدیہ کو برقرار رکھیں گے اور اسی شریعت کی تجدید و اِحیاء کے لئے مجدّد کی حیثیت سے نازل ہوں گے کیونکہ یہ شریعت تمام شرائع سے آخری شریعت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انصاف کرنے والے حاکم کی حیثیت سے نازل ہوں گے اور جب آپ حکم اور فیصلہ کرنے والے ہوئے تو پھر اُس وقت مسلمانوں کے سلطان آپ ہی ہوں گے۔ آپ کے نزول کے وقت مسلمانوں کا کوئی امام' قاضی اور مفتی نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو لوگوں سے اُٹھا لیا ہوگا اور لوگ علم سے خالی ہو چکے ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر اترنے سے پہلے اُن تمام باتوں کا علم حاصل کر لیں گے جن کی شریعتِ محمدیہ کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کے لئے حاجت ہوگی۔ اہلِ ایمان جو اُس زمانہ میں موجود ہوں گے' آپ کے پاس اکٹھے ہو جائیں گے اور سب مل کر اُنہیں اپنا حاکم اور فیصلہ کرنے والا مقرر کر لیں گے کیونکہ اُس وقت اور کوئی بھی اس کی صلاحیت رکھنے والا موجود نہیں ہوگا۔

<u>کسی اور وقت کی بجائے اُس وقت میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حکمت</u> : (۱) عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اُٹھائے جانے کے وقت سے لے کر آج تک یہودیت کا علم بلند نہیں ہو سکا اور اُن کی تنہا اپنے بل بوتے پر کہیں حکومت قائم نہیں ہو سکی اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نہ تو اُن کی سلطنت قائم ہو سکی ہے اور نہ ہی اُنہیں

اکیلے کہیں قوت وشوکت حاصل ہوسکی ہے اور وہ برابر اسی طرح رہیں گے حتی کہ قربِ قیامت میں دجّال کا ظہور ہوگا جو سب جادوگروں میں بڑا جادوگر ہوگا۔ یہود اُس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ یہود دجّال کے سہارے مسلمانوں سے انتقام لیں گے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے اُس شخصیت کو جن کے متعلق اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اُسے قتل کر دیا تھا' اُن کے لئے اور اُن کے علاوہ دیگر مخالفین کے لئے جو اُس وقت زندہ ہوں گے' ظاہر فرما دے گا اور اُن کے بڑے (دجّال) پر غلبہ اور نصرت عطا فرمائے گا۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام دجّال کو اور اُس کے لشکر کو جو یہودی ہوں گے' اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ مل کر شکست دیں گے۔ اُس دن یہود بھاگنے کی کوئی راہ نہیں پائیں گے اور اگر اُن میں سے کوئی شخص کسی درخت یا پتھر یا دیوار وغیرہ کے پیچھے چھپا ہوگا تو وہ درخت' پتھر اور دیوار آواز دے کر عیسیٰ علیہ السلام کو باخبر کرے گا کہ اے روح اللہ! میرے پیچھے ایک یہودی چھپا بیٹھا ہے' اُسے قتل کر دو۔ سو وہ یا تو مسلمان ہو جائے گا یا پھر اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح یہود کے علاوہ دوسرے کفار کا معاملہ ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی اس دھرتی پر کوئی کافر باقی نہ رہے گا۔''

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا اُس وقتِ مخصوص میں آسمان سے زمین پر اتارا جانا اس وجہ سے ہو کہ اُن کی وفات کا وقت قریب ہوگا۔ کسی خاکی مخلوق پر آسمان میں اُس پر موت طاری کرنا مناسب اور لائق نہیں ہے بلکہ قانونِ الٰہی اسی طرح جاری ہے کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق پر اللہ عزّ وجلّ زمین میں ہی اُس پر موت وارد کرتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ۝ (طٰہٰ : ۵۵)

''ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اُسی میں پھر تمہیں لے جائیں گے اور اُسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔''

اُنہی دنوں دجّال بابِ لُد پر پہنچے گا اور چونکہ دجّال کے فتنہ کی خبر پھیل چکی ہوگی اور اُس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ وہ رب ہونے کا دعویٰ کرے گا۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی شخص اس کے خلاف قتال کے لئے نہیں اُٹھے گا کیونکہ وہ قلت میں ہوں گے۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام اِس فتنہ کی سرکوبی کے لئے سب سے زیادہ حق دار ہوں گے۔ آپ کے ہاتھ سے اُس کی ہلاکت واقع ہوگی۔

(۳) اُس وقت آپ کے نزول کی تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انجیلِ مقدّس میں اُمتِ محمد ﷺ کی فضیلت کا بیان موجود ہے اور قرآنِ حکیم میں بھی یہ الفاظِ مبارکہ موجود ہیں:

ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ ۖ وَمَثَلُهُمۡ فِى الۡاِنۡجِيۡلِ (سورۃ الفتح : ۲۹)

''یہ اُن کی صفت توریت میں ہے اور اُن کی صفت انجیل میں ہے۔''

تو عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں امتِ محمد ﷺ میں سے بنا دے۔ چنانچہ اُن کی دعا قبول ہوئی اور اُنہیں آسمان کی طرف اُٹھا لیا یہاں تک کہ وقتِ آخر میں آپ مجدّد کی حیثیت سے زمین پر اتریں گے اور محمد ﷺ کے دینِ اسلام کی جو مٹ چکا ہوگا' تجدید اور اِحیاء فرمائیں گے۔

اپنے دنیاوی مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہم حیات بعداز موت کو بھول جاتے ہیں : قرآن مجید ہمارے اپنے مفاد کی خاطر ہمیں بار بار اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اگلی زندگی میں داخل ہونے کے لئے ہمیں اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک پر کامل ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ ایسے اعمالِ صالحہ کے زادِراہ کے ساتھ تیار کرنا چاہئے جو اُس کی خوشنودی اور رضا کا موجب ہوں۔ اپنے وجود کے اس لمبے سفر میں اس دنیا کی زندگی اگلی دنیا کی زندگی کے لئے تیاری کا عرصہ ہے۔

''یہ بات تعجب انگیز ہے کہ ہم اس دنیا کے مستقبل کی بہتری کے لئے اتنے لمبے چوڑے منصوبے بناتے ہیں جبکہ بعداز موت کی زندگی کو ہم بھول جاتے ہیں۔ ہم اپنی تمام کوششوں کو اپنی مادّی اور جسمانی آسائشوں کے حصول میں لگادیتے ہیں لیکن ہم اپنی روح اور اس کے تقاضوں کو بھول جاتے ہیں جو ہماری اصل ذات ہے۔ دیکھا جائے تو ایسا کرنے میں ہم خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں اور اپنے دائمی فلاح و بہبود کے خلاف کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر ہمیں صرف ایک دن کے لئے اپنے گھر سے باہر جانا پڑے تو اس کے لئے ہم کیا کچھ منصوبہ نہیں بناتے لیکن عجیب تر ہے یہ بات کہ اپنے دائمی گھر کو سفر کے لئے ہمیں ذرّہ بھر پروا نہیں ہے۔''

''کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو غیر نامی علوم (Physical Sciences) کے پروفیسروں کے نظریات کو من و عن مان لیتے ہیں اور اُن پر یقین کر لیتے ہیں لیکن نبیوں اور رسولوں کی باتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ وہ رسول جو ہمارے حقیقی خیر خواہ ہیں اور جنہوں نے اپنی تمام زندگیاں زندگی کی دائمی صداقتوں کی تلاش میں گزار دیں۔ کیا یہ بات معمولی سوجھ بوجھ کو بھی اپیل کرتی ہے؟ قرآن مجید دنیا کی بے ثباتی اور فنا پذیری پر یوں زور دیتا ہے:۔

اِعْلَمُوْا أَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِب" وَّلَهْو" وَّزِيْنَة" وَّتَفَاخُر" بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُر" فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُه' ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَاب" شَدِيْد" وَّمَغْفِرَة" مِّنَ اللهِ وَرِضْوَان" وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○ (الحدید : ۲۰)

''خوب جان لو کہ دنیاوی زندگی محض ایک کھیل کود' (ظاہری) خوشنمائی' ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے پر اپنی برتری جتانا ہے گویا کہ مینہ ہے کہ اُس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے' پھر خشک ہو جاتی ہے' سو تو اُسے زرد دیکھتا ہے' پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذاب شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی اور دنیاوی زندگی محض دھوکے کا سامان ہے۔''

دُنیاوی زندگی کے دامن میں جو رنگین کھلونے ہیں' اُن میں سے ایک ایک کا ذکر کر کے انسان کو جھنجھوڑا اور اس سے دریافت کیا کہ اِن کھلونوں میں سے کوئی کھلونا اتنا قیمتی ہے کہ اُسے اس زندگی کا حاصل قرار دیا جا سکے؟ اگر نہیں تو پھر قرینِ دانشمندی یہ ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرے۔ فرمایا کہ دنیوی زندگی عبارت ہے لہو و لعب سے جو بچوں کا کام ہے' زینت و آرائش سے جو عورتوں کا شیوہ ہے' تفاخر و تکاثر سے جس میں احمق و نادان ہی اپنے آپ کو مشغول رکھ سکتا ہے!!

(۴۰) علم الاخلاق (ETHICS)

''یہ فلسفہ کی وہ شاخ ہے جو غلط اور صحیح' اچھے اور بُرے میں اخلاقی فیصلوں سے بحث کرتی ہے۔ یورپ میں ایک منظم علمی مطالعہ کے طور پر اس کا آغاز پانچویں صدی قبل مسیح میں سقراط سے ہوا لیکن اس سے بہت پہلے ہندوستان اور چین میں اخلاقیات میں گہرے مطالعہ کا آغاز ہو چکا تھا۔'' (Hutchinson 20th Century Encyclopaedia, 7th edition, p. 469)

اسلامی اَخلاقیات کی بنیاد باہمی بھائی چارے اور اخوت پر ہے خواہ یہ اخوت رشتہ داری کی بنیاد پر ہو' یا عالمگیر بھائی چارے کی یا عقیدے کی بنیاد پر۔ یہ بات خوب ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کو ہر شعبہ حیات میں یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی معاملات میں انتہائی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو برقرار رکھنے کی تاکید کی ہے۔

(الف) حیاتیاتی ونباتاتی اخلاقیات (BIOETHICS)

اسلامی ضابطہِ حیات صرف نسلِ انسانی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اللہ کی تمام جاندار اور بے جان مخلوقات پر پھیلا ہوا ہے۔ جس طرح اسلام نے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ اخلاقی ضابطے مقرر کئے ہیں' اِسی طرح وہ نباتاتی اور حیوانی مخلوقات سے متعلق ضوابط اور اصول وضع کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہا جسے سائنسی اصطلاح میں حیاتیاتی ونباتاتی اَخلاقیات (Bioethics) کا نام دیا جاتا ہے۔

(1) نباتاتی اخلاقیات (Botanical Ethics) کے متعلق قرآن مجید میں کافی اشارات ملتے ہیں' مثلاً:

(۱) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰـكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ (الاسراء : ۴۴)

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ بھی اُن میں موجود ہے' اُسی کی پاکی بیان کرتے ہیں اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اُس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو مگر تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔''

(۲) كُلٌّ ''قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ' وَتَسْبِيْحَهٗ' (اَلنّور : ۴۱)

''ہر ایک کو اپنی اپنی دعا اور اپنی اپنی تسبیح معلوم ہے۔'' (۴۱ : ۲۴)

''ضروری نہیں کہ حمد وثنا الفاظ میں ہی ہو کیونکہ زبان سے ادائیگیِ الفاظ جس سے ہم متعارف ہیں' صرف انسان کا خاصہ ہے۔ لیکن دوسری مخلوقات کی حرکات وسکنات اور اظہارِ ذات کے کئی دوسرے طریقے رب تعالیٰ کی قدوسیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا اعلان کرتے ہیں۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۳۰۱۷)

(۳) وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ٥ (الرَّحمٰن : ۶)
''اور سبزیاں (بیلیں) اور درخت دونوں اُسی کے مطیع ہیں۔'' (۶ : ۵۵)

اَلنَّجْمُ وہ پودا جس میں تنا نہ ہو مثلاً گھاس' ترکاریاں' بیلدار درخت وغیرہ۔ دنیا میں شرک کا ایک بڑا مظہر شجر پرستی اور نباتات پرستی بھی رہا ہے۔ آیت اُس کی جڑ کاٹ رہی ہے۔ (ماجدی)

''اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ تمام سامی علاقوں میں درختوں کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔''
("Religions of the Semites" ... Robertson Smith, p. 185)

''قدیم یونانی دنیا میں مقدس درختوں کی پرستش اکثر مذاہب کا حصہ رہا ہے۔''
(Hastings' Dictionary of the Bible": Vol. V, p. 113)

''سائنس کے مسلّمہ حقائق بتاتے ہیں کہ کائنات کی (بہ ظاہر) بے جان چیزوں میں بھی روح ہے جو اپنے خالق کی حمد وثنا کرتی ہے کیونکہ تمام فطرت اُس کی قدرتِ مطلقہ' عقل و دانش اور فلاح وخیر پر گواہ ہے۔ یہ بے قدرا اور ناشکرا فانی انسان ہی ہے جس کا اپنی فطرتِ سلیمہ کے خلاف چلتے ہوئے خالقِ حقیقی پر ایمان نہیں رہا محض اس وجہ سے کہ اُس خالق نے اپنے فضل وکرم سے اُسے محدود حد تک عمل کی آزادی اور اختیار عطا کیا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی نباتاتی اخلاقیات یہ ہے کہ انسان کا اِن مخلوقات سے تعلق پرستش اور عبادت کا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اُن کے مقصدِ تخلیق کو سمجھ کر انہیں مناسب طور پر اپنے استعمال میں لانا چاہئے (اس لئے کہ انسان کو رب تعالیٰ نے جملہ مخلوقات کا مخدوم بنایا ہے نہ کہ اُن کا خادم)۔ وہ مخلوقات نہ تو کسی طور اپنے اندر الوہیت کا درجہ رکھتی ہیں اور نہ ہی اُن میں کوئی الٰہی روح کارفرما ہے' بلکہ وہ تو محض خالق کی مخلوق ہیں' اُس کی مطیع وفرمانبردار ہیں اور اُس کی حمد وثنا میں مشغول ہیں۔ لہٰذا وہ دیوی یا دیوتا ہرگز نہیں ہیں اور کسی طرح بھی اُن کی عبادت نہیں کی جا سکتی۔ علاوہ ازیں اُلوہیت تو کسی وقت بھی عدم (نہ ہونا) کو جانتی ہی نہیں کیونکہ وہ لامتناہی ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا جبکہ نباتاتی عالم فانی ہے۔ ایک وقت میں اُس کا وجود ہوتا ہے تو دوسرے وقت میں وہ فنا اور عدم کا شکار ہو کے رہ جاتا ہے اور فنا کی اس خصوصیت میں ایک ایسا خلا ہے جو اُن کے معبود ہونے کی نفی کرتا ہے۔ یہی مضمون ذیل کی آیتِ قرآنی میں بیان ہوا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُوَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُلَاتَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ٥ (حٰمٓ السجدة : ۳۷)
''اور اُس کی نشانیوں میں رات اور دن' سورج اور چاند ہیں۔ پس تم نہ سورج کو پوجو اور نہ چاند کو بلکہ صرف اللہ ہی کو پوجو جس نے ان سب کو پیدا کیا اگر تم واقعی اُس کے پرستار ہو۔'' (۳۷ : ۴۱)

تمام مخلوقات نتیجہ (Effect) ہیں اور اُن کا سبب اللہ تعالیٰ ہے۔ تو یہ کس قدر نادانی کی بات ہے کہ سبب کو نظر

انداز کر کے اُس کے نتیجہ کی تعظیم و تقدیس کی جائے۔ پرستش اور سجدہ ریزی کی مستحق تو صرف وہی ذات ہے جو ہر جگہ' ہر وقت موجود ہے' نہ کہ وہ مخلوقات جو کسی وقت تو موجود ہوتی ہیں اور کسی وقت نہیں۔ موجود نہ ہونا مخلوقات کا خاصہ ہے اور کسی طور پر بھی یہ خاصہ معبودیت اور الوہیت کے شایانِ شان نہیں۔

جس طرح نباتاتی مخلوق کی پرستش کی ممانعت ہے' اُسی طرح اُن کے بے دریغ کاٹنے اور چٹیل (Deforestation) بنانے کو بھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔ تاہم تحقیقی مقاصد اور دوسرے انسانی مفاداتی مقاصد جن کی اہمیت تسلیم ہے' مستثنیات میں ہیں اور قرآن مجید اُن کے مثبت مفاد کے استعمال میں لانے کی ترغیب دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت اِسی مضمون کی حامل ہے:-

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجاثیة : ۱۳)

''اور جو کچھ بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہے اُس نے سب کو اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخّر کیا۔''

(2) حیواناتی (Zoological) اخلاقیات : ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ٥ (الحج : ۳۶)

''ہم نے اسی طرح اُن (جانوروں) کو تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔'' (۲۲ : ۳۶)

''تاکہ تم شکر ادا کرو'' کا ایک مطلب اُن بے زبان' قابلِ رحم جانوروں پر مشفقانہ اور مہربان رویّے کا اظہار بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے :

اِرْحَمِ الْحَيَوَانَ فَإِنَّه' لَا يَنْطِقُ (جانوروں پر ترس کھاؤ اس لئے کہ وہ بے زبان ہیں۔)

بار برداری کے جانوروں کی بابت آپ نے فرمایا :

''اُن پر اُن کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالو اور اُن کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔''

جاندار مخلوق کا آگ میں جلانا ظالمانہ' سنگدلانہ اور وحشیانہ جرم ہے جس کی اجازت جانی دشمن کے لئے بھی نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آگ میں جلانا آگ کے پیدا کرنے والے کا حق ہے۔ اسی طرح تمام حالات میں مُثلہ یعنی اعضاء کی قطع و برید (Mutilation) کی بھی ممانعت ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

اِيَّاكُمْ وَالْمُثْلَةَ وَلَوْ بِالْكَلْبِ الْعَقُوْرِ (مُثلہ سے بچو اگرچہ باؤلا کتا ہی کیوں نہ ہو۔)

اُن جانوروں کی بابت جو انسانی استعمال کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایات واضح اور غیر مبہم ہیں جن میں آپ نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْيُرِحْ أَحَدُكُمْ ذَبِيْحَتَهُ، وَلْيُحِدَّ شَفْرَتَهُ، (صحیح مسلم)

''بے شک اللہ نے ہر چیز پر احسان فرض کر دیا ہے۔ جب تم قتل کرو تو اچھے انداز سے قتل کرو اور جب تم جانور ذبح کرو تو اچھے انداز سے ذبح کرو اور چاہئے کہ اپنے ذبیحہ کو راحت دو اور اپنی چھری کو تیز کر لو۔''

ذبح ہونے والے جانور کو راحت دینا کئی طرح سے ہے: (۱) اس کے ٹھنڈا ہونے سے پہلے نہ تو اُس کی کھال اتاری جائے اور نہ ہی اُس کا کوئی عضو کاٹا جائے۔ (۲) بھوکا پیاسا رکھ کر اُسے ذبح نہ کیا جائے۔ (۳) جانور کے سامنے کسی دوسرے جانور کو ذبح نہ کیا جائے تاکہ وہ مرنے سے پہلے نہ مر جائے اور اس طرح دوہری موت کا مزانہ چکھے۔ (۴) جانور کے سامنے چھری کو تیز نہ کیا جائے۔

ایک مرتبہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک آدمی کو بکری کو اس کے کانوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اُسے ہدایت کی کہ وہ اُسے کانوں سے پکڑنے کی بجائے اُس کی گردن سے پکڑے تاکہ اُسے تکلیف نہ ہو۔

تراشیدہ ناخنوں کے ساتھ جانور کو دوہنا بھی اُسے راحت و آرام پہنچانا ہے۔ جانور پر سوار ہوتے ہوئے اُسے خواہ مخواہ تیز دوڑانا نہیں چاہئے۔ اُس کے چارے پانی کا خیال رکھنا یہ تمام کچھ جانور کو راحت پہنچانے کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک انگریز شاعر ایس۔ ٹی۔ کالرج کے الفاظ میں:

''عبادت تو اُسی کی اچھی ہے جو انسانوں' پرندوں اور حیوانوں سے خاصی محبت رکھتا ہے۔''

("The Rime of the Ancient Mariner" Part VII) ... S.T. Coleridge.

(ب) انسانی اخلاقیات (HUMAN ETHICS)

(1) تمام معاہدوں' عہد و پیمان اور اقرار ناموں کی تکمیل و تعمیل: جس پر قرآن مجید نے خاصا زور دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

(۱) أَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرة: ۴۰)

''مجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو تو میں تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کروں۔'' (۲: ۴۰)

(۲) يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدة: ۱)

''ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔'' (۵: ۱)

(۳) اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ٥ (الرَّعد: ۲۰)

''وہ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے رہتے ہیں اور اُس پیمان کو توڑتے نہیں' (قابلِ تحسین ہیں)۔'' (۱۳: ۲۰)

(2) عبادتِ الٰہی اور والدین کی بے غرض، نہایت وفادار اطاعت وخدمت: یہ نکتہ خاصا اہم ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے والدین کی اطاعت وخدمت کا ذکر ہر جگہ اپنی عبادت کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (النساء: ۳۶)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اُس کا شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک رکھو۔''

(۲) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (الاسراء: ۲۳)

''اور آپ کے پروردگار نے حکم دے رکھا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک رکھو۔'' (۲۳ : ۱۷)

(۳) اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ o وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ (لقمٰن: ۱۳، ۱۴)

''بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے اور ہم نے انسان کو اُس کے والدین کے متعلق تاکید کر دی ہے۔''

اِس قرآنی ضابطے کا تقابل مغرب کے عائلی نظام کے جدید طریقوں سے کیجئے:

''ایسے سماج میں جو لازمی طور پر تکنیکی ہے اور اُسے انتہائی تیز رفتاری سے خالصتاً میکانی سطور پر منظم کیا جا رہا ہے، ایک لڑکے کا اپنے والد کے ساتھ رویہ کسی بڑی سماجی اہمیت کا حامل نہیں۔۔۔ نتیجتاً یورپ کا والد اپنے لڑکے پر اپنی مختار کاری دن بدن کھوتا جا رہا ہے اور لڑکے کا اپنے والد کے لئے احترام کم ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کے باہمی تعلقات تمام عملی مقاصد کے لئے تیز رفتاری سے ختم ہو رہے ہیں اور اس عمل میں اُس میکانی سماج کا عمل دخل ہے جس کا کام ہی یہی ہے کہ ایک فرد کے دوسرے فرد پر حقوق کو ختم کیا جائے اور اس تصور کے منطقی ارتقاء میں اُن اصولوں اور ضابطوں کو بھی ختم کرنا ہے جو عائلی تعلق داری سے پیدا ہوتے ہیں۔''
("Islam on the Crossroads" ... Leopold Asad, pp. 47, 48)

''درحقیقت تمام قانون سازی کے نوشتوں میں احترامِ والدین خصوصی مقام کا حامل ہے۔ قرآن میں فرزندانہ تابعداری کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔''
("A Short History of Christianity"
... Roberts J.M. p. 46)

(3) فضول مشاغل اور تکبر وتفاخر سے پرہیز: زندگی انتہائی قیمتی چیز ہے جو بار بار نہیں ملتی۔ اسلام نے اسے فضول مشاغل میں صَرف کرنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے:

(۱) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا o وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا

''اور اُس چیز کے پیچھے نہ ہو لیا کر جس کی بابت تجھے علم (صحیح) نہ ہو، بے شک کان اور آنکھ اور دل ان کی پوچھ ہر شخص سے ہوگی۔ اور زمین پر اکڑ کر نہ چلا کر، تو نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتا ہے۔'' (الاسراء: ۳۶، ۳۷)

آیت کے ابتدائی حصہ میں بغیر علم کے ظن' قیافہ اور گمان کی بنیاد پر عمل کرنے کی ممانعت ہے۔

(۲) قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۞ (اَلْمُؤْمِنُوْن : ۱۔۳)
''یقیناً وہ مومن فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں اور جو لغویات سے منہ موڑنے والے ہیں۔'' (۱تا۳ : ۲۳)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہر لغویات سے بچنے کا ذکر خشوعِ صلوٰۃ کے فوراً بعد اور حکمِ زکوٰۃ سے قبل آنے میں راز یہ ہے کہ لغویات سے اجتناب نماز کی عین تکمیل کرنے والا ہے۔

(۳) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ۞۔۔۔۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۞ (الفرقان)
''اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب اُن سے جہالت والے لوگ بات چیت کرتے ہیں تو وہ (اُن سے) سلام (متارکت) کہہ دیتے ہیں۔۔۔ اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور جب وہ لغو مشغلوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریفانہ گزر جاتے ہیں۔'' (۶۳' ۷۲ : ۲۵)

(۴) وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۞ (لقمٰن : ۱۸)
''اور لوگوں سے اپنا رُخ مت پھیر اور زمین پر اکڑ کر مت چل' بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے' فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (۱۸ : ۳۱)

(4) آدم خوری (یعنی غیبت) سے ممانعت : سورۃ الحُجرات میں فرمایا :
لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ
''تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے' کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ تم تو اسے ناپسند کرتے ہو۔'' (۱۲ : ۴۹)

غیبت کیا ہے؟ زبانِ رسالت ﷺ نے فرمایا : تیرا اپنے بھائی کا ایسے انداز میں ذکر کرنا جسے وہ پسند نہ کرے۔ صحابہ نے پوچھا کہ اگر میرے بھائی میں وہ چیز موجود ہو جس کا میں ذکر کروں؟ فرمایا: اگر اُس میں وہ چیز موجود ہو جس کا تو نے ذکر کیا تو یقیناً تو نے اُس کی غیبت کی اور اگر اُس میں وہ بات نہیں تو تو نے اُس پر بہتان باندھا۔

(5) خرچ کرنے میں اعتدال: یہ اعتدال انسان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں بہت ہی ممد ثابت ہوتا ہے۔اسی لئے صاحب قرآن ﷺ نے فرمایا: مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ کہ وہ شخص کبھی تنگ دست اور غریب و محتاج نہیں ہوا جس نے میانہ روی اور اعتدال سے کام لیا اور ایک مختصر آیتِ قرآنی میں صحیح معاشیاتِ ملّی و انفرادی کا اصل اُصول بیان کر دیا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا٥ (الفُرقان : ٦٧)

''اور وہ لوگ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں (بلکہ) اس کے درمیان (اُن کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے۔'' (٦٧ : ٢٥)

(ج) ذاتی اخلاقیات (Ethics of Self): اس اخلاقیات کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔

(۱) خودداری: ہر معقول انسان باعزت زندگی گزارنا چاہتا ہے اور علمِ نفسیات کی اصطلاح میں اس احساس کو ''خودداری'' کہا جاتا ہے۔شکل و ہیئت' قد و قامت اور ذہنی صلاحیتوں میں کوئی بھی مخلوق کائنات انسان کے ہم پلہ اور ہم پایہ نہیں۔اُسے جملہ مخلوقات سے اوپر عزت و تکریم کا مرتبہ عطا کیا گیا اور کائنات کی ہر چیز کو صرف اُسی کے مفاد اور تصرف کے لئے بنایا گیا۔قرآن مجید نے اس ناقابلِ تردید حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا٥ (الاسراء : ٧٠)

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے اور ہم نے اُنہیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے اُنہیں نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے اُنہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔'' (۱۷:۷۰)

اِس خداداد عظیم اعزاز و اکرام کے پیشِ نظر انسان کا یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اُسے ہر وقت اپنے اُن فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس رہے جن کا بوجھ اُس کے کندھوں پر ڈال کر اُسے یہاں بھیجا گیا ہے۔اُس کے لئے ایسے کام کرنا مناسب نہیں جو اُسے اپنے خالق اور ابنائے جنس کی نظروں میں ذلیل کر دیں۔اسلام اپنے ماننے والوں سے نیکی کے کاموں میں بھی معتدل اور متوازن رہنے کی توقع کرتا ہے۔مثلاً مذہبی رسوم و فرائض کی ادائی میں مسلمان کو اپنی صحت کا پورا خیال رکھنا چاہئے اور اپنی طاقت سے بڑھ کر ریاضت و مشقت نہیں کرنی چاہئے۔ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ آپ کے کچھ صحابہ نے کئی راتیں اللہ کی عبادت اور سجدہ ریزی میں اور دن لگاتار روزے رکھنے میں گزار دیئے ہیں۔چونکہ اُن کا یہ عمل رہبانیت اور ترکِ دنیا کے مشابہ تھا جس کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں' اس لئے نبیِ مکرّم ﷺ نے اُن کے اس عمل کو نہیں سراہا بلکہ اُنہیں یوں نصیحت فرمائی:

''دیکھو! تمہاری اپنی ذات اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔''

اور یہ نصیحت قرآن مجید کے اس فرمودے کے بالکل مطابق ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرة:٢٨٦) کہ اللہ تعالیٰ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اُس کی بساط کے مطابق۔

کچھ مذاہب کے نزدیک خوشنما جسم اور تنومند صحت روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اسلام ایسے غلط نظریہ کی تردید کرتا ہے اور اِس بات کا قائل ہے کہ وہ روحانی رفعت کے حصول میں ممد و معاون اور سازگار ہیں۔ عاقلانہ قول کہ ''صحت مند ذہن صحتمند جسم میں ہوتا ہے'' اسلامی روح کے عین موافق و مطابق ہے۔ سورۃ المائدۃ میں قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو قادرِ مطلق کے اُن انعامات کو اپنے استعمال میں لانے کی تلقین کرتا ہے جن کا اُس نے فیاضانہ طور پر اُن پر فیضان کیا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَٰتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ٥ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَٰلًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِيٓ أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ ٥ (المائدۃ : ۸۷، ۸۸)

''ایمان والو! اپنے اوپر اُن پاکیزہ چیزوں کو جو اللہ نے تمہارے لئے جائز کی ہیں، حرام نہ کرلو اور حدود سے آگے نہ نکلو کہ اللہ حدود سے آگے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے جو کچھ تمہیں حلال، پاکیزہ چیزیں دے رکھی ہیں، اُن میں سے کھاؤ (پیو) اور اُسی اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔''

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن مجید ہم سے عزتِ نفس کی توقع رکھتا ہے اور ہمیں ہدایت کرتا ہے کہ ہم اپنے جسم کے حقوق کی معتدلانہ طور پر حفاظت کریں۔

(۲) نظم وضبط: اصول وضوابط کی پاسداری اور شائستہ رویّہ ''نظم وضبط'' کا دوسرا نام ہے۔ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو احکاماتِ الٰہی کی پابندی کرنے اور اس طرح تمام شعبہ ہائے حیات میں نظم وضبط قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ہمارے اردگرد کے تمام مظاہرِ فطرت اُس نظم وضبط کی عمدہ مثال ہیں جو حکیمِ مطلق رزّاق نے قائم کر رکھا ہے اور اُن سے اخلاقی اصول اخذ کرنے کا ہمیں خاصا موقع ملتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

(ا) وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ٥ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ٥ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ٥ (یٰسٓ : ۳۸ تا ۴۰)

''اور آفتاب اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے، یہ زبردست اور علم والے خدا کا اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے اور (ایک نشانی) چاند بھی کہ ہم نے اُس کے لئے منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح رہ جاتا ہے۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔'' (۳۸ تا ۴۰ : ۳۶)

''اگرچہ سورج اور چاند دونوں منطقۃ البروج کی پٹی (Zodiac Belt) کو عبور کرتے ہیں اور اُن کی حرکات مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو کبھی بھی پکڑ نہیں سکتے۔ جب سورج اور چاند ایک ہی سمت میں اور زمین کی سیدھ میں ہوں تو سورج گرہن ہوتا ہے اور جب مخالف سمتوں میں ایک سیدھ میں ہوں تو چاند گرہن ہوتا ہے لیکن کبھی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ اُن کے ضوابط و اصول اللہ کے متعین کردہ ہیں جو علم الافلاک میں مطالعہ کا مضمون بنتے ہیں۔

اسی طرح رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آتے جاتے ہیں لیکن متضاد اور باہم مخالف ہونے کے باوجود اُن میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ اور یہ چیز نیکی اور بدی' صداقت اور جھوٹ جیسی باہم مخالف قدروں کا مناسب نشان ہے۔
(عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۳۹۸۶)

(۲) اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ○ (الرّحمٰن : ۵)
''سورج اور چاند (کمپیوٹر شدہ) حساب کے پابند ہیں۔'' (۵ : ۵۵)

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی اُن لوگوں کے لئے عظیم محبت کو بھی بیان کرتا ہے جو میدانِ جنگ میں اپنے آپ کو اچھے نظم وضبط کے فوجی ثابت کرتے ہیں جو دشمن پر فتح و کامرانی پانے کی لازمی اور ناگزیر شرط ہے:
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ○ (الصّف : ۴)
''اللہ تو ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔'' (۴ : ۶۱)

اپنے غصہ اور مزاج کو قابو میں رکھنا منظم شخصیت کی صفت ہے۔ انسانیت کے محسنِ اعظم حضرت محمد ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو مزاج اور غصہ کو قابو میں رکھنے کی اس طرح تاکید کی ہے:
''جو شخص اپنے مزاج اور غصہ کو قابو میں رکھتا ہے' اللہ اُس کی لغزشوں کو چھپاتا ہے۔''

کھیل کود بچوں میں نظم وضبط کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو بچوں کے لئے کھیل کود اور غیر نصابی سرگرمیوں کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت دینے کی بھی ہدایت کی ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''بچے کا یہ حق ہے کہ اُس کا والد اُسے لکھنا' پڑھنا' تیرنا اور تیراندازی سکھائے۔''

یہ تمام حوالہ جات اِس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ مسلمان کے کردار کے لئے نظم وضبط ایک بنیادی صفت ہے اور اس لئے یہ ذاتی اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔

(د) سماجی زندگی کی اخلاقیات : ''سماجی رمعاشرتی اخلاقیات کا انتہائی اہم اور توانا عنصر جو اسلام نے دیا' وہ ہمہ گیر مساوات (Egalitarianism) کا ہے جس کی رُو سے تمام افرادِ معاشرہ رنگ ونسل یا معاشرتی اقتصادی حیثیت سے قطع نظر سماج میں برابر کے حصہ دار ہیں۔'' (انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا' جلد ۱۲' ص ۶۶۹)۔ اس ضمن میں قرآن مجید فرماتا ہے :

(۱) اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ○ (البقرۃ: ۴۴)
''کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتابِ الٰہی پڑھتے رہتے ہو' تو کیا تم عقل سے کام (ہی) نہیں لیتے؟'' (۴۴ : ۲)

(۲) وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ آتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوْا وَ الصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥(البقرة:۱۷۷)
''اور اللہ کی محبت میں مال خرچ کرے قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' راہ گیروں اور سائلوں پر اور گردنوں کے آزاد کر دینے میں' اور نماز کی پابندی کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ وعدہ کر لیتے ہیں اور تنگی میں' بیماری میں' اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے' یہی لوگ ہیں جو سچے اترے اور یہی لوگ تو متقی ہیں۔'' (۲ : ۱۷۷)

اس آیت کے باب میں تو حدیثِ نبوی میں یہاں تک صراحت موجود ہے کہ مَنْ عَمِلَ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ ''جس نے اس آیت پر عمل کر لیا' اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔'' اور محققین کا قول ہے کہ یہ آیت اہم ترین آیتوں میں سے ہے اور اس کے اندر دین وشریعت کے سولہ احکام آ گئے ہیں (تفسیر قرطبی)۔ بعض صوفیوں نے آیت کے اجزاء کی جامعیت پر نظر کر کے کہا ہے کہ آیت شریعت وطریقت کی اصل ہے۔ خیر یہ باتیں تو اپنوں کی تھیں۔ فرنگیوں میں سے ایک ذات شریف پادری Wherry نامی ہوئے ہیں' مسلمانوں اور اسلام کے بڑے ہی ''عنایت فرما''۔ سفید ڈاڑھی کے بال اسلام کی عداوت ہی میں سفید کیے۔ Sale کے انگریزی ترجمہِ قرآن پر تفسیر کا اضافہ اُسی کے قلم سے ہے۔ اس آیت پر پہنچ کر قدرتِ خداوندی اُس کے قلم سے یوں لکھواتی ہے:

''یہ آیت قرآن کی بلند ترین آیتوں میں ہے۔۔۔ ذاتِ باری پر ایمان اور نوعِ انسانی کے ساتھ حسنِ سلوک۔ اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہر اصلی بتایا گیا ہے۔ اس میں لُبِّ لباب عقائد اور اعمال کا آ گیا۔'' [بحوالہ تفسیر ماجدی (اُردو) صفحہ ۶۶' نوٹ : ۶۴۳]

(۳) يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ أَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَأَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ٥(البقرة)
''مومنو! تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلہ میں آزاد' غلام کے بدلہ میں غلام' عورت کے بدلہ میں عورت' ہاں جس کسی کو اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے تو معقول (اور نرم) طریق پر مطالبہ کرنا چاہئے اور مطالبہ کو اُس (فریق) کے پاس بہ خوبی پہنچا دینا چاہئے' یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے' سو اس کے بعد جو کوئی بھی زیادتی کرے گا' اُس کے لئے (آخرت میں) دردناک عذاب ہے۔'' (۲ : ۱۷۸)

لفظ مِنْ أَخِيْهِ کی بلاغت ومعنویت سر دُھننے کے لائق ہے۔ قتل سے بڑھ کر شدید ہیجان' جذباتِ انتقام و اشتعال پذیری کا موقع اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اس انتہائی جذباتی موقع پر بھی یہ لفظ لا کر بتا دیا کہ قاتل باوجود اتنے سنگین

جرم کے کافر نہیں ہو جاتا' وہ بہر حال تمہارا اسلامی بھائی تو ہے۔ اگر معاف کر دو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے دل پھر جڑ جائیں اور اسلامی معاشرے کے دامن میں جو چاک پڑ گیا ہے' اُسے پھر سے سی دیا جائے۔ ربّ ذوالجلال والاکرام کے کلامِ مقدّس کی یہی لطافتیں تو تھیں جنہوں نے عرب کے سرکشوں کو مطیع بنا دیا تھا۔''

آیت میں شَیْءٌ'' کا لفظ بھی اہم ہے۔ یعنی سزائے واجب کا کچھ حصّہ چھوڑ دیا جائے نہ کہ تمام تر معاف کر دیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ مقتول کے عزیز اور وارث اگر قاتل کو سزائے قتل نہ دینا چاہیں بلکہ اُسے کوئی ہلکی سزا دے کر یا خوں بہا کی پوری رقم میں سے کچھ حصّہ اُسے معاف کر کے اُسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہوں۔

''اِعتداء یعنی زیادتی کی صورتیں کئی ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ مقتول کے وارث خوںبہا وصول کر لینے کے بعد بھی انتقام لینے کی کوشش کریں یا قاتل خوںبہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اُس کے ساتھ کیا ہے' اُس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔'' (تفہیم القرآن از ابوالاعلیٰ مودودی' ج ۱' ص ۱۳۹)

(۴) وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ٥ (البقرة : ۱۷۹)
''اے عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے کہ تم اِس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔'' (۲ : ۱۷۹)

''جس طرح جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا' اُسی طرح ایک دوسرا گروہ عفو و درگزر کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اُس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اُسے ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دنیا کے متعدد ملکوں نے اُسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہلِ عقل کو مخاطب کر کے تنبیہ کرتا ہے کہ قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو محترم ٹھہراتی ہے' وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔'' (تفہیم القرآن) ''لہٰذا قانونِ قصاص عین عدل و مساوات کا قانون ہے اور ہیئتِ اجتماعی کے نظم و قیامِ راستی کا بہترین ضامن و کفیل کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے اور طاقتور اور کمزور سب کے حقوق کا تحفظ ہو جائے۔ امت کے مختلف طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اطمینان و دلجمعی پیدا کرنے والا درحقیقت یہی قانون ہے اور جب تک اس قانون پر عملدرآمد ہوتا رہے گا' اس قانون کی روح امت میں سرایت کر جائے گی تو ساری قوم کا مزاج صالح ہو جائے گا اور آئین پسندی' باہم صلح و سازگاری' خدمت و معاونت جزوِ زندگی بن جائیں گی اور اُمت دیکھتے ہی دیکھتے صالحین و اَبرار' اُمّتِ عادلہ کہلانے کی مصداق بن جائے گی۔'' (ماجدی)

(۵) <u>معاشرہ میں ہر قسم کی دھوکا دہی اور بے ایمانی کے روابط کی بندش</u>: ارشادِ خداوندی ہے:
وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ (البقرة : ۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اُڑاؤ اور نہ اُسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصّہ تم گناہ سے کھا جاؤ درآنحالیکہ تم جان رہے ہو۔'' (۱۸۸ : ۲)

(٦) مسلمان عزتِ نفس اور خودداری کا نمونہ : اس ضمن میں اسلام نے بھیک مانگنے کی مذمت کی ہے اور فرمایا ہے :

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَايَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا (البقرة : ٢٧٣)

''(اصل) حق اُن حاجتمندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں گِھر گئے ہیں' وہ ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے' ناواقف اُنہیں اُن کے سوال نہ کرنے کے باعث مالدار خیال کرتا ہے۔ (اے حبیب!) آپ اُنہیں اُن کی صورت سے پہچانتے ہیں' وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگا کرتے۔'' (۲:۲۷۳)

آیت کے مصداق ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دین میں مشغول ہیں کہ علمِ دین میں جس مشغولی اور انہماک کی ضرورت ہے' اُس کے ساتھ اگر فکرِ معاش کی مصروفیت کو جمع کر لیا جائے تو علمِ دین کی خدمت ناتمام رہ جائے گی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِلْحَاف یعنی لگ لپٹ کر مانگنے کی عادت بُری ہے اور بعض محققین نے معنی مطلقاً سوال نہ کرنے کا کیا ہے۔

بھیک مانگنے کی مذمّت میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

(۱) لَانْ يَغْدُوْا أَحَدُكُمْ فَيَحْتَطِبَ عَلٰى ظَهْرِهٖ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ وَيَسْتَغْنِيْ بِهٖ مِنَ النَّاسِ خَيْرٌ لَّهٗ' مِنْ أَنْ يَّسْأَلَ رَجُلًا أَعْطَاهُ أَوْ مَنَعَهٗ'

''اگر کوئی شخص ہر صبح لکڑیاں چن کر پیٹھ پر اُٹھا لائے اور اُس کی قیمت سے جو ملے' خیرات بھی کرے اور خود بھی کھائے' یہ اس سے بہت بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے۔ کسی کا دل چاہے تو کچھ دے دے اور چاہے تو انکار کر دے۔''

(۲) مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ مِنْهُ أَوْلِيَسْتَكْثِرْ

''جو شخص لوگوں سے مال جمع کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہے' وہ انگارے جمع کرتا ہے' تھوڑے انگارے جمع کرے یا زیادہ' یہ اُس کی اپنی مرضی ہے۔''

(۷) انسانیت اور انسانی ہمدردی اور خیر اندیشی کا عملی سبق : قرآن مجید نے اسے مقروض اور قرضخواہ کے باہمی تعلق کے ضمن میں بیان کیا ہے:۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ" اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ" لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥ (البقرۃ: ۲۸۰)

''اور اگر مقروض تنگدست ہے تو اُس کے لئے آسودہ حالی تک مہلت ہے اور اگر معاف کر دو تو تمہارے حق میں (اور بھی) بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔'' (۲۸۰ : ۲)

آیت صاف بتا رہی ہے کہ اسلامی نظامِ معاشیات کی بنیاد مادیّت سے کہیں بڑھ کر انسانیت وروحانیت اور تقوائے الٰہی پر رکھی گئی ہے اور یہ خصوصیت اُسے دنیا کے قدیم وجدید سارے معاشی نظاموں سے ممتاز کئے ہوئے ہے۔

(۸) اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ o (آلِ عمران : ۱۳۴)

''وہ جو فراغت اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں' اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں' اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ ایسے ہی احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

نوٹ : تشریح کے لئے رجوع کیجئے صفحات ۱۱۶۵' ۱۱۶۶ (جلد ہذا)

(۹) <u>قرابتداروں' یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کا تحفظ</u> : درحقیقت شریعتِ اسلامی نے اُمّت کے نظامِ اجتماعی کا سنگِ بنیاد قرابت یا رَحِم ہی کو قرار دیا ہے۔ سورۃ النساء کی ابتدائی آیات میں اُن کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ساتھ یتامیٰ اور مساکین کے حقوق کو بھی تحفظ دیا گیا، چنانچہ فرمایا:

(i) وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَالۡاَرۡحَامَ---- وَآتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَہُمۡ وَلَاتَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِکُمۡ اِنَّہٗ کَانَ حُوۡبًا کَبِیۡرًا o (النّساء : ۱' ۲)

''اور اللہ کا خوف اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتداروں کے باب میں بھی (خوفِ خدا کو اختیار کرو) -- اور یتیموں کو اُن کا مال پہنچا دو اور عمدہ چیز کو گندی چیز سے تبدیل نہ کرو اور اُن کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ کہ وہ بہت بڑا گناہ ہے۔'' (۱' ۲ : ۴)

(ii) وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَہَآءَ اَمۡوَالَکُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ قِیٰمًا وَّارۡزُقُوۡہُمۡ فِیۡہَا وَاکۡسُوۡہُمۡ وَقُوۡلُوۡا لَہُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا o وَابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡہُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ اَمۡوَالَہُمۡ وَلَا تَاۡکُلُوۡہَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا وَمَنۡ کَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ وَمَنۡ کَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡکُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡہِمۡ اَمۡوَالَہُمۡ فَاَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِمۡ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا o (النّساء : ۵' ۶)

''اور اپنا مال کم عقلوں کو نہ دے دو جسے اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے اور اُس مال میں سے اُنہیں کھلاتے پلاتے رہو اور اُن سے بھلائی کی بات کہتے رہو۔ اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ عمرِ نکاح کو پہنچ جائیں تو اگر تم اُن میں ہوشمندی دیکھ لو تو اُن کا مال اُن کے حوالے کر دو اور مال کو اِسراف سے اور اس خیال سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے مت کھا ڈالو' تو جو سرپرست خوشحال ہو تو اُسے چاہئے کہ (یتیموں کے مال سے) پرہیز کرے اور جو سرپرست فقیر ہو تو وہ مناسب مقدار سے کھالے' پھر جب تم اُن کے مال اُنہیں لوٹاؤ تو اُن پر گواہ بنالیا کرو اور حساب لینے والا اللہ کافی ہے۔''

’’آیت میں دو لفظ ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اَمْوَالَهُمْ (اُن کے مال) کی بجائے اَمْوَالَكُمْ فرمایا کہ یتیموں کا مال اگرچہ اُنہی کا ہے لیکن کیونکہ وہ اور تم سب ایک ملت کے فرد ہو اس لئے گویا وہ مال تمہارا ہی ہے۔ اس کی حفاظت اور نگہداشت بالکل یوں کرو جیسے اپنے مال کی کرتے ہو۔ وحدتِ ملّی اور تکافلِ اجتماعی کا یہ وہ محبت آفرین سبق ہے جس کی طرف قرآن ہر مناسب موقع پر ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ دوسرا غور طلب امر آیت کے الفاظ اَلَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَكُمْ قِیَامًا ہیں یعنی مال جسے اللہ تعالیٰ نے تمہاری زندگی کا سہارا بنایا ہے۔ اِن الفاظ سے مال کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اظہار مقصود ہے یعنی مال فضول اور قابلِ نفرت چیز نہیں بلکہ یہ تو تمہاری معاشی خوشحالی اور ترقی کا ستون ہے۔ اگر تم اسے بے جا خرچ کر دیا کرو گے تو تمہیں معاشی اور اقتصادی فارغ البالی نصیب نہیں ہو سکے گی لہٰذا اسے سنبھال کر رکھو اور سوچ سمجھ کر خرچ کیا کرو۔‘‘ (ضیاء القرآن‘ جلد اوّل‘ صفحہ ۳۱۹)

(iii) وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاo وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًاo اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًاo (اَلنِّساء : ۸ تا ۱۰)

’’اور جب تقسیم (ورثہ) کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار‘ یتیم بچے اور مسکین حاضر ہوں تو اُنہیں بھی اس میں سے دو اور اُن سے اچھی بات کہو۔ اور چاہیئے کہ یتیموں کے سرپرست ڈریں (اور سوچیں) کہ اگر وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے چھوڑ جاتے تو وہ اُن کے متعلق کتنے فکرمند ہوتے‘ پس چاہیئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور بالکل درست بات کہیں۔ بے شک وہ لوگ جو ناحق یتیموں کے مال کھاتے ہیں تو دراصل وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھا رہے ہیں اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں جھونکے جائیں گے۔‘‘ (۸ تا ۱۰ : ۴)

(iv) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًاo (اَلنِّساء : ۲۹)

’’ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو‘ بے شک اللہ تمہارے حق میں بڑا مہربان ہے۔‘‘

(v) وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًاo (اَلنِّساء : ۳۲)

’’تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے‘ مردوں کے لئے اُن کے اعمال کا اور عورتوں کے لئے اُن کے اعمال کا حصّہ (ثابت) ہے اور اللہ سے اُس کا فضل طلب کرتے رہا کرو‘ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔‘‘ (۳۲ : ۴)

(vi) إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًاo (اَلنِّساء : ۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کر دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، اللہ تمہیں کیا ہی اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک وہ بڑا سننے والا، بڑا دیکھنے والا ہے۔''

امانتوں میں سرکاری عہدے اور منصب بھی شامل ہیں جن کا باصلاحیت اور اہل لوگوں کے سپرد کیا جانا حکومتِ وقت کا فرضِ اوّلیں ہے کہ اسی سے معاشرے کا خوش آہنگ نظم وضبط قائم ہوتا ہے اور حق وانصاف کا دَور دورہ ہوتا ہے۔ قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی بتائی کہ عہدے اور مناصب نااہل اور غیر مستحق افراد کو دئے جائیں گے اور یہ کہ شریر کی شرارت سے بچنے کے لئے اُس کی (بہ ظاہر) عزت وتکریم ہوگی اور اُسے سلام کیا جائے گا۔

(vii) وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا (اَلنِّساء : ۸۶)

''اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو یا اُسی کو لوٹا دو۔'' (۸۶ : ۴)

سلام کا جواب دینا اگرچہ معاشرت کی جزئیات میں سے ہے لیکن اسلام کو یہ بات بھی گوارا نہیں کہ ایسی جزئیات کو معمولی سمجھ کر انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ سلام کے جواب میں سلام تو بہرحال واجب ہے۔ اس کے بعد دو اختیار دئے گئے ہیں: ایک یہ کہ جوابِ سلام، سلام سے بہتر ہو اور دوسرے یہ کہ اُنہیں الفاظ میں ہو۔ حدیثِ مبارکہ اور صحابہ کرام وتابعین کے عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے والا اگر مسلمان ہے تو اُس کا جواب الفاظ کی زیادتی کے ساتھ دیا جائے اور اگر غیر مسلم ہے تو صرف وَعَلَيْكُمْ کے لفظ میں جواب دیا جائے۔

سلام کے بارے میں ایک نومسلم خاتون لکھتی ہیں:

''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کے نرم ولطیف الفاظ کانوں کے لئے موسیقی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُس تیزی اور براقی کے دیکھنے میں جس میں دو دوست ایک دوسرے کو سلام میں پہل کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، بڑی خوش آئند بات ہے۔۔۔۔ آقا اور غلام، امیر وغریب، خواندہ اور ناخواندہ ایک دوسرے کو ایسے وقار وتمکنت کے ساتھ ہدیہ سلام پیش کرتے ہیں جس میں کسی بھی فریق کی عزتِ نفس اور خودداری کو ذرا بھی دھچکا نہیں لگتا۔'' ("Pilgrimage to Mecca" ... Lady Cobbold, p. 60)

(viii) <u>اسلامی معاشرہ میں کمینی فطرت کے افراد کی کوئی گنجائش نہیں</u>: کہ قرآن نے فرمادیا ہے:

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّإِثْمًا مُّبِيْنًاo (اَلنِّساء : ۱۱۲)

''جو کوئی کسی قصور یا گناہ کا ارتکاب کرے، پھر اُس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو دراصل اُس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا۔'' (۱۱۲ : ۴)

(ix) قانون کی بالادستی اور حق و انصاف کی حکمرانی اسلامی معاشرہ کا طغرائے امتیاز:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ إِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْفَقِيْرًافَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا وَإِنْ تَلْوٗا أَوْتُعْرِضُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ٥ (أَلنِّساء : ۱۳۵)

''مؤمنو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو' چاہے وہ تمہارے اپنے یا تمہارے والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی ہو۔ اگر وہ امیر یا مفلس ہے تو اللہ (بہر حال) دونوں سے زیادہ حق دار ہے' تو خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کجی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔''

(x) انتقام لینا اگر ضروری ہو تو وہ متوازن اور جرم کی مناسبت سے ہو لیکن عفو و درگزر بہتر ہیں

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ ٥ (أَلنَّحل:۱۲۶)

''اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو اُنہیں اُتنا ہی دکھ پہنچاؤ جتنا دکھ اُنہوں نے تمہیں پہنچایا ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت ہی اچھا ہے۔'' (۱۲۶ : ۱۶)

(xi) قتلِ ناحق کی ممانعت : جب تک وجوبِ قتل یا جوازِ قتل کا کوئی شرعی سبب موجود نہ ہو' اُس وقت تک قتل ہرگز جائز نہ ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِى الْقَتْلِ إِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ٥ (الاسراء : ۳۳)

''اور جس شخص کی جان کو اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے' اُسے قتل مت کرو' ہاں مگر حق پر' اور جو کوئی ناحق قتل کیا جائے گا' سو ہم نے اُس کے وارث کو (حقِ قصاص کا) اختیار دے دیا ہے' سو اُسے چاہئے کہ قتل کے بارے میں حد سے آگے نہ بڑے' بے شک وہ شخص طرفداری کے قابل ہے۔''

یعنی مظلوم مقتول کی حمایت و نصرت پر تو قانونِ شریعت خود ہی آمادہ ہے اور اسلامی حکومت خود ہی مقتولِ مظلوم کے معاملہ میں مدعی ہوتی ہے تو پھر ایسے شخص کے وارثوں پر یہ شامت کیسی کہ وہ خواہ مخواہ حدودِ شرع سے تجاوز کریں!

(xii) صبر و تحمل : انسان خطا کا پتلا ہے اور اس سے نہ صرف اپنی ذات کے بارے میں بلکہ اپنے اَبنائے جنس کے حقوق کے بارے میں بھی اُس سے کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے موقعوں پر ہمیں تلقین کی کہ کس کس کی زیادتی پر کڑھتے رہو گے! لہٰذا صبر سے کام لو کیونکہ:

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُوْنَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ٥ (الفرقان : ۲۰)

''اور ہم نے تم میں ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے تو اَب بھی صبر کرو گے؟ اور آپ کا پروردگار خوب دیکھنے والا ہے۔'' (۲۰ : ۲۵)

قرآن مجید نے صبر و رضا کا ثوابِ عظیم یوں بیان کیا :

اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حَسَابٍ o (الزُّمَر: ۱۰)

''ثابت قدم رہنے والوں کو اجر بے شمار و بے حساب ملے گا۔'' (۳۹ : ۱۰)

حضرت مسطح رضی اللہ عنہ جنابِ ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے' عیال دار اور تنگدست تھے اور جنابِ صدّیق اُن کی مالی معاونت فرمایا کرتے تھے۔ واقعہ اِفک میں منافقوں کی طرف سے سیدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بہتان طرازی کی مہم میں مسطح نے خوب حصّہ لیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد ہونے کی حیثیت سے جنابِ صدّیق کے لئے یہ قدرتی بات تھی کہ وہ مسطح کی معاونت بند کردیں۔ لیکن اس معمولی سی سزا کو بھی رب تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور حکم ہوا کہ وہ اسلام کی تعلیم کردہ اپنی اخلاقی رفعت و بلندی کو برقرار رکھتے ہوئے مسطح کی امداد کو جاری رکھیں اور فرمایا: ''کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں کو معاف فرمادے؟'' (بحوالہ سورۃ النور' آیت ۲۲)۔

(xiii) <u>شرم و حیا اور پاکیزگی کردار</u> : شرم و حیا ایک جامع اصطلاح ہے اور یہ صفت فضول اور نازیبا قسم کی گفتگو' مخربِ اخلاق مذاق' علمی تفاخر کے بے فائدہ اظہار' اور زنا جیسے کبیرہ گناہوں سے اجتناب کو شامل ہے۔ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو اپنے کردار میں شرم و حیا اور انکساری کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ مؤمن کی خصوصیات کی وضاحت میں وہ بتاتا ہے کہ شرم و حیا مؤمن کی لازمی صفت ہوتی ہے۔ سورۃ المؤمنون کی ابتدا میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمان کے کردار کے امتیازی خصائص کو بیان کیا ہے۔ اِن خصائص میں لغو اور فضول قسم کی گفتگو سے پرہیز کو مؤمن کی بنیادی صفت بتایا گیا ہے۔

''سورۃ الاسراء کی آیت ۳۲ میں یہ نہیں کہا گیا کہ زنا مت کرو بلکہ فرمایا کہ ''زنا کے قریب نہ جاؤ'' اور اس انداز کے پیرایہ میں اُن تمام راہوں اور ذرائع کا سدِّ باب کردیا گیا ہے جو زنا کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ اسلام کے اس نہایت سادہ انداز کا تقابل آج کے مغرب کی غیر صحتمندانہ اخلاقیات سے کیا جاسکتا ہے۔ مغربِ جدید میں جنسی وفاداری اور ضبطِ نفس بہت تیزی سے قصّہ پارینہ بنتے جارہے ہیں۔'' ("Islam on the Crossroads" --- Leopold Asad, p. 48)

''زناکاری انگلستان اور امریکہ دونوں ممالک میں گزشتہ چند سالوں سے ایک فیشن بن کے رہ گئی ہے۔'' ("History of Prostitution" ... Scott, p. 226)

''زنا بذاتِ خود نہ صرف ایک شرمناک فعل ہے اور خودداری اور شرفِ انسانیت سے بعید ہے بلکہ یہ قبیح فعل کئی برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ عائلی زندگی کی بنیاد کے لئے یہ تباہ کن ہے' اس کا نتیجہ پیدا شدہ یا پیدا ہونے والے بچوں کے مفادات کے خلاف ہوتا ہے۔ قتل و غارت اس کا لازمہ ہے اور عزت و ناموس اور جائداد کی تباہی اور سماجی بندھنوں کا ڈھیلا پڑ جانا اس کے نمایاں رذائل ہیں۔ لہٰذا اسے گناہ سمجھتے ہوئے نہ صرف اس سے گریز کیا جائے بلکہ اس کی طرف برانگیختہ کرنے والے تمام اسباب اور راہوں سے گریز کیا جائے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۲۲۱۵)

قرآن مجید اُن لوگوں کو تاکیداً تنبیہ کرتا ہے جو فحش اور بے حیائی کے کاموں کا مسلم معاشرے میں پرچار کرتے اور اُنہیں مشتہر کرتے ہیں۔ سورۃ النور کی آیت ۱۹ میں فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ'' أَلِيمٌ'' فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ مؤمنین کے درمیان بے حیائی کا چرچا رہے' اُن کے لئے دنیا میں اور آخرت میں سزائے دردناک ہے۔'' (۱۹ : ۲۴)

''بوس و کنار جو دوستانہ ربط اور رغبت و موانست کی جبلّتی علامت ہے' نے قدیم زمانہ سے عیسائیت کے گرجا گھر کی زندگی اور عبادت میں مقام بنالیا ہے جس کے شرمناک استعمال نے گرجا گھروں میں بدی اور گناہ کے خلاف گاہے گاہے گونج پیدا کی ہے۔'' ...("Dictionary of Christian Antiquities"
Smith and Cheetham, Vol. II, p. 902)

بدکاری کا سب سے خطرناک راستہ نظربازی ہے۔ نگاہ کی بے راہروی کے باعث ہی اکثر لغزشیں ہوتی ہیں اس لئے سب سے پہلے قرآن مجید نے اس راستے کو بند کیا۔ مَردوں کو حکم دیا کہ اپنی نگاہ نیچی رکھو اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرو۔ جب نگاہ کسی نامحرم کی طرف نہیں اٹھے گی تو دل میں اس کی طرف کشش پیدا نہ ہوگی۔ جب کشش ہی ناپید ہوگی تو بدفعلی کا ارتکاب ہی بعید از قیاس ہوگا۔ سورۃ النُّور کی آیت ۳۰' ۳۱ میں آنکھوں کو مطلقاً بند رکھنے کا حکم نہیں ہوا بلکہ اُس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے سے روکا گیا ہے جس کی طرف دیکھنا حرام ہے۔ چند ارشاداتِ نبوی ملاحظہ ہوں:

(۱) مَنْ يَكْفُلُ لِي مَابَيْنَ لَحْيَيْهِ وَبَيْنَ رِجْلَيْهِ أَكْفُلُ لَهُ الْجَنَّةَ

''جو شخص مجھے دو باتوں کی ضمانت دے کہ جو اُس کے دو جبڑوں کے درمیان یعنی زبان اور جو اُس کی دو ٹانگوں کے درمیان ہے تو میں اُسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

(۲) إِنَّ النَّظَرَ سَهم'' مِّنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ مَسْمُوم'' مَنْ تَرَكَه' مَخَافَتِي أَبْدَلْتُه' إِيمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهَا فِي قَلْبِه

''نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔ جو شخص اُسے میرے (یعنی اللہ) کے خوف سے ترک کرتا ہے' میں اُسے ایمان کی نعمت بخشوں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں پائے گا۔''

طبیعت میں ہیجان پیدا کرنے والے اور جذباتِ شہوت کو مشتعل کرنے والے اسباب سے نہ روکنا اور اُنہیں کھلی چھٹی دے دینا اور پھر یہ توقع رکھنا کہ ہم اپنے قانون کی قوت سے لوگوں کو برائی سے بچالیں گے' بڑی ہی نادانی کی بات ہے۔ آگ لگا کر اُسے بجھانے کی ناکام کوشش سے کیا یہ بہتر نہیں کہ آگ لگانے کی حماقت ہی نہ کی جائے؟

بے حیائی اور بدکاری کی راہ کھلنے کی ایک اور صورت یہ بھی ہے کہ عورت پازیب وغیرہ پہن کر مَردوں کے مجمع میں دانستہ اپنے پاؤں زمین پر مارے تاکہ مرد پازیب کی جھنکار سن کر اُس کی طرف متوجہ ہوں جو انتہائی بے شرمی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ قرآن مجید نے ایسی اشتعال انگیز حرکت پر قدغن لگاتے ہوئے حکم دیا کہ ہر وہ چیز جو نامحرموں کو غیر عورت کی طرف دیکھنے کی طرف مائل کرے اور اُسے اُن کی توجہ کا مرکز بنا دے' ممنوع اور حرام ہے۔ عورت کا بھڑکیلے لباس پہن کر یا تیز خوشبو لگا کر مجمع عام میں آنا جانا بھی اسی ضمن میں آتا ہے (سورۃ النور' آیت ۳۱)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو آتے ہوئے دیکھا جس سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ آپ نے اُسے فرمایا: اے خداوندِ جبار کی بندی! کیا تو مسجد سے آ رہی ہے؟ اُس نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے پوچھا: کیا تو نے خوشبو لگا رکھی ہے؟ اُس نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اُس عورت کی نماز قبول نہیں کرتا جو مسجد میں تیز خوشبو لگا کر جائے جب تک وہ گھر لوٹ کر غسلِ جنابت نہ کرے۔

وہ عورتیں جو زرق برق کے بھڑکیلے لباس پہن کر خراماں خراماں مٹکتی ہوئی اجنبی مَردوں کے پاس آتی جاتی ہیں دخترانِ اسلام اُن کے متعلق اپنے پیارے رسولِ کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی سن لیں جس کی راویہ میمونہ بنتِ سعد ہیں:

''جو عورت آراستہ پیراستہ ہو کر نامحرموں میں اِترا اِترا کر چلتی ہے' قیامت کے دن وہ مجسم تاریکی ہوگی جہاں نور کی کرن تک نہ ہوگی۔'' (ترمذی) بحوالہ ''ضیاء القرآن'' از کرم شاہ الازہری' جلد سوم' ص ص ۳۱۹' ۳۲۰)

مسلم اخلاقیات میں شرم و حیا کی اہمیت ازروئے احادیث: تاریخ کے اوراق نبیِ اکرم ﷺ کی مثالی شرم و حیا کے گواہ ہیں اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آپ کنواری' پاکیزہ کردار کی لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ آپ نے معاشرہ سے تمام بداَطواریوں کو اُن کی جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی تعمیل میں آپ نے اپنی ازواجِ مطہرات' بیٹیوں اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو حکم دیا کہ وہ کھلے چہرہ کے ساتھ باہر نہ نکلا کریں۔ شرم و حیا سے متعلق آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

(۱) حیا جزوِ ایمان ہے۔

(۲) ہر دین و مذہب میں کوئی نہ کوئی اَخلاقیات کی بات ہوتی ہے۔ اسلام کی اَخلاقیات حیا ہے۔

(۳) حیا اور ایمان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُن میں سے ایک رخصت ہو جائے تو دوسرا خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔

(۴) حیا تمام کی تمام نیکی ہی نیکی ہے۔
(۵) حیا اور مختصر کلامی اسلام کے دو خصائص ہیں۔
(۶) حیا تمام الہامی مذاہب کی قدرِ مشترک رہی ہے۔
(۷) جب تم سے حیا جاتی رہے' تو جو جی میں آئے کرو۔

مغربی تہذیب: مغرب کے لوگ جو اپنے آپ کے انتہائی جدّت پسند' ترقی یافتہ' مہذّب وشائستہ' عمدہ و نفیس' صاف ستھری عادات کے حامل' اچھے تعلیم یافتہ اور اقوام عالم میں آداب شناس ہونے کے مدّعی ہیں' اُنہیں اُن کے اپنے سماجی نظام کے تناظر میں دیکھ لیجئے۔ اُن سے اخذ کئے گئے نتائج کو میں اپنے قارئین کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں:

''اُن کے نزدیک آزادی کا کیا مفہوم ہے؟ اگر والد اپنے بچوں کو مارتا ہے تو بچے اپنے والد کو سزا دلوانے کے لئے پولیس کو بلا لیتے ہیں۔ وہاں لڑکے' لڑکیاں آزاد ہیں اور شترِ بے مہار کی سی زندگی گزارتے ہیں اور یہ ایک کلیہ ہے کہ جب لوگوں پر سے کنٹرول اٹھ جائے تو وہ گم کردہ راہ ہو جاتے ہیں۔ آزادیٔ جنس سے وہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جو اکثر ناپختہ اور قبل از وقت (Premature) ہوتی ہے اور صحت و کردار کے لئے مُضر ہوتی ہے۔ اُن کے قانون میں یہ بات ہے کہ غیر فطری جنسی عمل (اغلام بازی) جرم ہی نہیں ہے اور یہ چیز اَب اُن کی تہذیب کا حصّہ بن چکی ہے جس سے آزادانہ جنسی ثقافت پنپ رہی ہے۔ انسانیت کی تذلیل میں وہ تمام حدود پھاند چکے ہیں اور اس ذلت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ اُنہوں نے ''ہائیڈ پارک'' نامی ایک جگہ بنائی ہے جہاں ہر چیز کھلی ڈھلی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں کھلے بندوں اسی طرح جنسی عمل میں مصروف نظر آتے ہیں جس طرح ہم کتے اور کتیا کو ایک عام شاہراہ میں جفتی کرتے دیکھتے ہیں۔ کھلے بندوں بوس و کنار اور گلے لگنے کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ یہ عملیات جنگلی درندوں کی ہی ہوتی ہیں۔''

''معاملے کی حد اور انتہا تہذیبِ جدید کی تصویر کا ایک اور رُخ ہے۔ وہاں کے پادریوں کا کہنا ہے کہ ''قانون میں کبھی کوئی خطا نہیں ہوتی اور نہ ہی بادشاہ کسی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔'' ملکہ مَیری اپنے ٹانگے گھوڑے کے پہیوں اور بانسوں کے ساتھ چھری کے لمبے لمبے پھَل لگا دیتی اور ٹانگے کو تیز چلانے کا حکم دیتی۔ یہ پھَل (بلیڈ) کئی بچوں' مَردوں اور عورتوں کو زخمی کرتے جو کراہ کراہ کر سڑک پر گر پڑتے تھے۔ وہ اکثر زخمی اور خون آلود ہو کر لوگوں کو مدد کے لئے پکارتے اور یہ تمام دلدوز نظارہ ملکہ ''معظمہ'' کی لطف اندوزی اور خوشی و مسرت کا سماں ہوتا تھا جبکہ فی الحقیقت یہ سارا عمل ملکہ کا اپنے عوام پر ظلم و تشدد کی ایک قسم تھا۔ اُسی ملکہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کی لاشوں کو اُن کی قبروں سے کھدواتی' اُنہیں کوڑے مارنے کی سزا دے کر پھر انہیں دفن کرا دیتی۔''

''اب میں ایک اور تاریخی واقعہ کا حوالہ دیتا ہوں جو مغربی تہذیب کا عکاس ہے:

''ہندوستان کے بٹوارے سے پہلے کے دنوں میں امرتسر کے مقام پر جلیانوالہ باغ میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کے لوگوں کو منتشر کرنے کے لئے جرنیل ڈائر نے گولیاں چلا دیں جس سے لوگوں نے مختلف اطراف کو بھاگنا

شروع کر دیا۔ ظالم اور سنگدل جرنیل ڈائر نے لوگوں کی پشتوں پر گولیاں برسانا جاری رکھا جبکہ وہ پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے۔ اس موقع پر اُس نے یہ بیان دیا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ گولیاں کیسے بہتر طور پر آگ برساتی ہیں۔ بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ ''انگریز کو اپنے آپ کو مہذّب کہلوانے کا کوئی حق نہیں ہے۔''
(محمد علی ہادی مرحوم ۔۔۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ملتان ۔۔۔ کی تحریر سے ایک اقتباس)

(xiv) برائی کا بدلہ اچھائی سے دینا (''اُدلے کا بدلہ'' سے بہتر اصول): اسلامی معاشرے میں بھائی چارے اور پیار و محبت کی خوش کن فضا کو قائم کرنے کے لئے قرآن نے فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ ''كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ'' حَمِیْمٌ ٥ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ ٥ (فُصِّلت: ۳۴، ۳۵)

''نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتے' آپ نیکی سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے تو پھر یہ ہوگا کہ جس شخص میں اور آپ میں عداوت ہے' وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی جانی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ بات اُنہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے رہتے ہیں اور اُسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہوتا ہے۔'' (۴۱:۳۴، ۳۵)

بدی کا بدلہ بدی سے دینے میں دشمنی بڑھتی ہے اور اس کا بدلہ نیکی سے کرنے میں (بہ شرطِ سلامتِ طبع) دشمنی گھٹتی ہے۔ کَـأَنَّــہٗ' کے لفظ نے یہ صاف کر دیا کہ یہ ضروری نہیں کہ اس برتاؤ کے بعد وہ دشمن دوست بن جائے' البتہ دوست کے مشابہ ضرور ہو جائے گا۔ مشہور غیر مسلم لیڈر گاندھی جی نے جو اپنا فلسفہِ شانتی اور اہِمسا کا چلایا' عجب نہیں کہ اُس کا ماخذِ اصلی یہی آیاتِ قرآن ہوں۔

آیاتِ مذکورہ میں تمام داعیانِ حق کو ارشاد ہو رہا ہے کہ جس جنگ میں تم شریک ہو' اُسے جیتنے کا واحد گُر یہ ہے کہ لوگ تم سے برائی کریں تو تم اُس کا بدلہ صرف نیکی سے نہیں بلکہ بہترین نیکی سے دو۔ لوگ تم پر پتھر برسائیں۔ پتھر کھا کر پتھر نہ مارنا نیکی تو ہے لیکن اُن پر پھول برسانا تمہارا شیوہ ہونا چاہئے۔ لوگ تمہیں گالیاں دیں' تم پر جھوٹے بہتان تراشیں' تمہارے خلاف غلط الزامات لگائیں اور پھیلائیں اور تم چپ رہو' تو یہ بھی قابلِ تعریف بات ہے لیکن لطف تو تب ہے کہ تم رات کو اُٹھ اُٹھ کر سجدہ میں سرِ نیاز رکھ کر اُن کی ہدایت پذیری کے لئے دعائیں مانگو۔

سیّدنا علی المرتضٰی کے خادم قنبر کو کسی نے گالی دی۔ آپ سن رہے تھے۔ قنبر کو بلند آواز کر کے فرمایا: اے قنبر! اپنے گالی دینے والے کو چھوڑ دو اور اُسے بھلا دو۔ اس طرح تو رحمان کو راضی کرے گا اور شیطان کو غضبناک کرے گا اور اپنے گالی دینے والے کو سزا دے گا کیونکہ بیوقوف کی سزا یہی ہے کہ اُس سے الجھنے کی بجائے خاموش رہا جائے۔

(xv) قانونِ عدل اور قانونِ فضل: اس ضمن میں قرآن مجید نے فرمایا:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ o وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ o (الشوریٰ : ۴۰' ۴۱)

''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ لیکن جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرلے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمہ رہا' بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ (برابر کا) لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔'' (۴۰' ۴۱ : ۴۲)

قانونِ عدل تو یہ ہے کہ جو جیسا کرے گا' ویسا پائے گا، مثلاً دانت کا بدلہ دانت اور آنکھ کا بدلہ آنکھ لیکن یہاں یہ بھی شرط ہے کہ وہ شے فی نفسہٖ ممنوع اور حرام نہ ہو۔ مثلاً لُوٹ کا بدلہ لُوٹ اور زنا کے عوض زنا کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اور قانونِ فضل' رحم و رعایت کا قانون ہے۔ آیت سے انتقام کا صرف جواز نکلتا ہے نہ کہ اُس کا لازمی حکم۔

(xvi) خدمتِ خلق ہر قسم کے طمع سے دُور اور رضائے الٰہی کے لئے ہو: کہ یہی اعلیٰ اخلاقی قدر ہے

(i) وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ o (المدّثر : ٦)

''اور کسی کو اس غرض سے مت دیجئے کہ زیادہ معاوضہ ملے۔'' (٦ : ۷۴)

اس کا ایک مطلب اپنے اعمال کو کثیر جاننے یا اُن کے عوض میں رجوعِ خلق یا مدح کی آس لگائے رہنا بھی ممکن ہے

(ii) وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّأَسِيْرًا o اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا o (الدھر : ۸' ۹)

''اور وہ اللہ کی رضا کی خاطر مسکینوں' یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے رہتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تو بس اللہ کی خوشنودی کے لئے تمہیں کھانا کھلاتے ہیں' نہ تم سے اس کا عوض چاہیں اور نہ شکریہ۔''

''مسکین و یتیم تو اُس وقت مسلمانوں میں بھی تھے لیکن ''اسیر'' (قیدی) تو نزولِ آیت کے وقت بہرحال مشرکین ہی تھے۔ اس سے یہ مسئلہ نکلا کہ غیر مسلم قیدیوں کی امداد و اعانت بھی موجبِ اجرِ آخرت ہے اگرچہ بعض فقہاء نے اس میں کچھ قیدیں لگا دی ہیں۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۱۱۶۲)

(xvii) ہر خبر کو بغیر تحقیق یونہی نہیں اُڑا دینا چاہیئے: سورۃ الحُجُرات کی آیت ٦ میں مؤمنوں کو حکم ہوا کہ ''اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تم تحقیق کر لیا کرو' ایسا نہ ہو کہ کہیں تم نادانی سے کسی قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ۔''

فقہاء مفسرین نے لکھا کہ اس اجمالی حکمِ تحقیق کے اندر چند تفصیلات ہیں: (۱) تحقیق واجب: مثلاً خلیفہ

جب یہ سنے کہ فلاں شخص مرتد ہو رہا ہے یا فلاں شخص قتل و غارت کا اِقدام کر رہا ہے' وغیرہ تو ایسے موقع پر تحقیق نہ کرنے سے کسی واجب کا رہ جانا لازم آتا ہے۔ (۲) تحقیق جائز : مثلاً کسی نے یہ سنا کہ فلاں شخص مجھے مالی یا جسمانی ضرر پہنچانا چاہتا ہے تو دفعِ ضرر کے لئے ایسے مواقع پر تحقیق جائز ہے۔ (۳) تحقیق حرام : مثلاً کسی کے متعلق یہ سنا کہ وہ خفیہ شراب پیتا ہے' ایسے موقع پر تحقیق نہ کرنے سے اپنا کوئی نقصان نہیں اور تحقیق کرنے سے اُس شخص کی رسوائی اور ذلت ہوتی ہے لہٰذا ایسی تحقیق حرام ہے۔

(xviii) دو مسلمان لڑنے والے گروہوں میں صلح کرادینا عملِ خیر ہے : سورۃ الحُجرات میں ارشاد ہوا :

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى أَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ أَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ٥ (الحُجُرات : ۹)

''اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کرنے لگیں تو اُن کے درمیان صلح کرادیا کرو' پھر اگر اُن میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اُس سے لڑو جو زیادتی کررہا ہے یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرلے' پھر اگر وہ رجوع کرلے تو اُن کے درمیان عدل کی ساتھ صلح کرادو اور انصاف کا خیال رکھو' بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (۹ : ۴۹)

یہ بات خوب ذہن نشین رہے کہ جنگ و جدل کرنے والے اِن دونوں گروہوں کو ایک کے ناحق پر ہونے کے باوجود قرآن مجید ''مؤمن'' ہی کہتا ہے۔ قتال اور پھر بغاوت سے بڑھ کر شدید جرم اور کونسا ہوسکتا ہے؟ اس کے باوجود بھی باغی بہر حال مؤمن ہی رہتا ہے اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوجاتا (تفسیر کبیر بحوالہ ماجدی)

(xix) احترامِ آدمیت : جانوروں کے برعکس انسان جذبات واحساسات کا مرقّع ہے۔ طنز اور طعن و تشنیع اُس کے آئینۂ دل کو غبار آلود کردیتے ہیں جس سے اُس کے دل میں اپنے ابنائے جنس کے لئے وہ محبت اور مودّت نہیں رہتی جس کا قرآن تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے قرآن نے موقع بہ موقع احترامِ آدمیت کا سبق دیا ہے۔ فرمایا

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ (الحُجرات : ۱۱)

''مؤمنو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارا کرو۔'' (۱۱ : ۴۹)

دوسرے پر ہنسی' تمسخر اور طنز کی بنیاد عموماً یہی ہوا کرتی ہے کہ دوسرے میں فلاں فلاں عیب ہیں اور ہم اُن عیوب سے مبرّا ہیں۔ قرآن مجید نے انتہائی حکیمانہ ژرف نگاہی کے ساتھ اس بنیاد پر ضربِ کاری لگا کر اس عمارت کو

ہی ڈھا دیا۔ انسان کو اگر اپنا عیب دار' داغدار ہونا یاد آ جائے تو دوسرے پر زبان کھولنے کی کبھی ہمت ہی نہ پڑے۔ فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ کسی کو عیب دار نام سے یاد کرنا صرف اس صورت میں حرام ہے جب وہ بلاغرض صحیح ہو لیکن اگر کوئی شخص پکارا اور پہچانا ہی ایسے نام سے جاتا ہے اور اس میں وہ اپنی کوئی توہین محسوس نہیں کرتا تو اُسے اس کے ظاہر میں عیب دار نام سے یاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مثلاً حکیم نابینا' لنگڑے حافظ' گنجے وکیل وغیرہ۔ اَلقاب کے یہاں معنی بُرے نام کے ہیں یعنی کسی شخص کو ایسے نام سے پکارنا جو اُسے ناگوار ہو۔

احترامِ آدمیت کے سلسلہ میں محسنِ انسانیت ﷺ کے یہ فرمودات بھی ملاحظہ ہوں جن میں آپ نے فرمایا:

(۱) مَنْ أَشَارَ إِلٰى أَخِيْهِ بِحَدِيْدَةٍ فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَلْعَنُهُ' حَتّٰى يَدَعَه' وَإِنْ كَانَ أَخَاهُ لِأَبِيْهِ وَأُمِّهٖ

(صحیح مسلم : کتاب البرّ والصّلة' رقم الحدیث : ۶۶۲۵)

''جس کسی نے اپنے بھائی کی طرف کسی آلے سے اشارہ کیا' تو فرشتے اُس پر اُس وقت تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ اشارہ کرنے سے رک نہ جائے اگرچہ وہ اُس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو۔''

(۲) مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيْحَهَا يُوْجَدُ مِنْ مَّسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا

(صحیح البخاری : کتاب الجزیة' حدیث : ۳۱۶۶)

''جس کسی نے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کیا جس سے اُس کی حفاظت کا معاہدہ ہو چکا ہے' وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا اگرچہ اُس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے سونگھی جا سکتی ہے۔''

(xx) <u>اُمراء کی دولت پر غرباء ومساکین کا حق ہے</u>: قرآن نے فرمایا کہ امراء اور خوشحال لوگ صدقات وخیرات اور زکوٰۃ کے ذریعے غرباء اور حاجتمندوں کی مدد کر کے اُن پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ ایک طرف جہاں وہ اپنی عاقبت کو سنوارتے ہیں' وہاں وہ اُن غرباء کا حق اُنہیں سونپتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کی آیات :

(۱) وَفِيْٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ" لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○ (اَلذّٰرِيٰت : ۱۹)

• ''اور اُن کے مالوں میں سوالی اور غیر سوالی کا حق رہتا ہے۔'' (۱۹ : ۵۱)

(۲) وَالَّذِيْنَ فِيْٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ "مَّعْلُوْمٌ"○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○ (المعارج : ۲۴' ۲۵)

''اور جو اپنے مالوں میں سوالی اور بے سوالی (سب کا) جانا ہوا حق رکھے ہیں۔'' (۲۴'۲۵ : ۷۰)

<u>زکوٰۃ ۔۔ اسلامی نظامِ معیشت میں ایک انتہائی اہم عامل</u> : لفظِ زکوٰۃ کا مادّہ ز-ک-و (زَکُو") ہے اور اسی سے تَزْکِيَة کا لفظ ہے بمعنیٰ پاکیزگی' صفائی اور افزائش۔ شریعتِ اسلامی میں یہ رقم کی ایک معین مقدار ہے جو ایک صاحب نصاب مسلمان' غریب اور نادار شخص کو سال بہ سال دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں زکوٰۃ کی ادائی کی بہت سی آیات ہیں جن میں اُن لوگوں کے لئے شدید تنبیہ اور وعید ہے جو دولت کو اکٹھا کر کے رکھتے ہیں اور اُسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے۔

زکوٰۃ کی اہمیت از روئے احادیث: زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم سال ۲ ہجری میں آیا جس کے بعد نبی کریم ﷺ نے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم کے لئے خصوصی انتظامات فرمائے۔ زکوٰۃ اسلام کا تیسرا بنیادی ستون ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مندرجہ ذیل فرمودات زکوٰۃ کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ فرمایا:

(۱) زکوٰۃ اسلام کے خزانے کا پُل ہے۔ (اَلزَّکوٰۃُ قَنطَرَۃُ الْاِسْلَامُ)

(۲) حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے ہوئے نبی علیہ السلام نے یوں نصیحت فرمائی کہ ''یمن کے لوگوں سے کہہ دو کہ اُن کے امراء سے زکوٰۃ اکٹھی کر کے اُن کے غرباء و مساکین میں تقسیم کی جائے گی۔''

(۳) ایک مرتبہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے لئے روزِ حساب میں زہریلے سانپوں سے کاٹے جانے کی سزا سنائی۔ آپ نے فرمایا کہ سانپ اُسے ڈسیں گے اور اُسے بار بار یہ کہیں گے کہ میں ہی تمہارا مال ہوں اور میں ہی تمہارا وہ ذخیرہ ہوں جسے تم جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے اور اُس کی زکوٰۃ نہیں دیتے تھے۔

(۴) خلیفہِ اوّل جناب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہِ خلافت میں کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے اُن کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا اعلان فرمایا۔ اگرچہ یہ منکرینِ زکوٰۃ نماز کے پابند تھے اور اسلام اور نبی علیہ السلام کی ختمِ نبوّت پر اُن کا عقیدہ پختہ تھا' اس کے باوجود انہیں مرتد قرار دیا گیا۔ اِن مرتدین کے خلاف اپنے اٹھائے گئے اِقدام کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''بخدا میں اُن کے خلاف جنگ کروں گا جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن زکوٰۃ دینے سے انکاری ہیں۔''

زکوٰۃ کے فائدے: فرد اور سماج دونوں کے لئے زکوٰۃ کے بہت زیادہ فوائد ہیں۔ چند ایک اقتصادی' معاشرتی اور اخلاقی فوائد کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

(۱) زکوٰۃ ادا کرنے سے حرص ولالچ' خودغرضی اور بخل کے منفی جذبات کا خاتمہ ہو کر تزکیہ نفس ہو جاتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ معاشرہ سے طبقاتی کشمکش کا خاتمہ کرتی ہے کیونکہ سماج کے امراء غریب بھائیوں کے خیرخواہ ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غرباء کے دلوں میں امراء کے لئے بھائی چارے اور پیار و محبت کے جذبات ہوتے ہیں۔

(۳) زکوٰۃ معاشرے کی ایک ہی طبقے میں ارتکازِ دولت کو روکتی ہے کیونکہ اُمراء کی جانب سے غرباء کی طرف دولت کی روانی جاری رہتی ہے۔ قرآن مجید اسی حقیقت کو سورۃ الحشر کی آیت ے میں یوں بیان کرتا ہے: کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (تاکہ وہ مال تمہارے تونگروں ہی کے قبضہ کا ہو کے نہ رہ جائے)۔

(۴) زکوٰۃ کی مد غرباء اور محتاجوں کو مالی ذرائع مہیا کرتی ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استعدادِ کار کو ترقی دیں اور اس طرح سماج کے مفید رکن بن جائیں کیونکہ مالی ذرائع مہیا نہ ہونے سے وہ مفید شہری نہیں بن سکتے۔

(۵) زکوٰۃ کی مد افرادِ معاشرہ کے درمیان اخوت اور بھائی چارہ کی فضا پیدا کرتی ہے جس سے معاشرہ کا استحکام خود بخود اصلاح پذیر ہو جاتا ہے۔

(۶) دولت کی غیر منصفانہ تقسیم معاشرے کو دشمن طبقات میں تقسیم کرتی ہے جس کے نتیجہ میں اقتصادی عدمِ مساوات کے باعث اُن طبقات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ ٹکراؤ اور تصادم اشتراکی نظام سے ملتے جلتے ظالمانہ انقلاب کو جنم دیتا ہے۔ زکوٰۃ ایسے انقلابات کو روک دیتی ہے۔

(۷) لوگوں میں معاشرتی اور اقتصادی مساوات کے قائم کرنے میں زکوٰۃ ایک مثبت اور منطقی کوشش ہے۔

(۸) حکومت عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں کی تکمیل زکوٰۃ اکٹھا کرنے سے کر سکتی ہے۔ نئے کرنسی نوٹ چھاپنے کی بجائے اُس کی مالی ضروریات کی تکمیل زکوٰۃ کی مد میں سے ہو سکتی ہے اور اس طرح ملک کو افراطِ زر کے منفی اثرات سے بچایا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ نظام زکوٰۃ ایک مسلمان کو مستقبل کے تفکرات سے آزاد کرتی ہے۔ ''آج آپ خوشحال ہیں' اس لئے دوسروں کی مدد کیجئے۔ کل کو اگر آپ غریب و نادار ہو گئے' تو دوسرے آپ کی مدد کریں گے۔''

(xxi) سماجی خدمت کا آغاز قرآن مجید نے کیا: زکوٰۃ کے ضمن میں درج بالا آیاتِ قرآنی کے علاوہ درج ذیل آیات بھی شامل کر لیجئے جن میں سماجی خدمت کے اصول کو بیان کیا گیا ہے:

(۱) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ'' عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ (اَلْبَقَرَة: ۲۷۴)

''جو لوگ اپنے مال رات اور دن' پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے رہتے ہیں' اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے' نہ اُنہیں کوئی خوف ہے اور نہ وہ اداس ہوں گے۔'' (۲۷۴ : ۲)

(۲) وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران)

''اور تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے' بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے۔'' (۱۰۴ : ۳)

(۳) اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ'' كَرِيْمٌ''○ (اَلْحَدِيْد: ۱۸)

''خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں (یہ جو) اللہ کو خلوص کے ساتھ (قرضہ دیں)# تو وہ خیرات بلاشبہ اُن کے لئے بڑھا دی جائے گی اور اُن کے لئے پسندیدہ اجر ہے۔'' (۱۸ : ۵۷)

(۴) يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَة'' (اَلْحَشر : ۹)

''وہ دوسروں کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود فاقہ میں ہی ہوں۔'' (۹ : ۵۹)

(۵) وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّأَسِيْرًاo اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًاo (اَلدَّهر : ۸، ۹)

''اور وہ اللہ کی رضا کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے رہتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تو بس اللہ کی خوشنودی کے لئے تمہیں کھانا کھلاتے ہیں، نہ تم سے اس کا عوض چاہیں اور نہ شکریہ۔''

خدمتِ خلق کے سلسلہ میں آقائے نامدار علیہ التحیۃ والسلام نے فرمایا :

خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ (بہتر آدمی وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے)

(xxii) نجی گفتگو میں نیکی اور بے غرضی کا عنصر :

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَo (اَلْمُجادلة : ۹)

''مؤمنو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو، اور نیکی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشی کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے۔'' (۹ : ۵۸)

(xxiii) آدابِ مجلس کی تعلیم :

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (اَلْمُجادلة : ۱۱)

''مؤمنو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو جگہ کھول دیا کرو، اللہ تمہیں جگہ دے گا اور جب کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو، اللہ تم میں ایمان والوں کے اور اہلِ علم کے مراتب بلند کرے گا۔'' (۱۱ : ۵۸)

(xxiv) قول و فعل میں مکمل مطابقت: اسلام ہر مسلمان کو عملی انسان، سیرت کا پختہ اور کردار کا مضبوط اور مجاہد بنانا چاہتا ہے اور نفاق بلکہ شائبہ نفاق سے بھی دُور رکھنا چاہتا ہے اسی لئے وہ قول و عمل کی مطابقت پر شدت سے مصر ہے۔

اصطلاحِ شریعت میں قرضِ حسنہ ایسے مال کو کہتے ہیں جو حلال کمائی سے خوشدلی اور خلوصِ نیت کے ساتھ ضرورتمند کو صرف رضائے الٰہی کی خاطر دیا جائے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُوْنَ مَالاَ تَفْعَلُوْنَ٥ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَالاَتَفْعَلُوْنَ٥ (اَلصَّفّ)
''اے اہلِ ایمان! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔'' (۲'۳ : ۶۱)

(ر) **تجارتی اخلاقیات** : کسی بھی معاشرے کی معیشت میں کاروبار اور تجارت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کاروبار اور لوگوں کا آپس کا لین دین صحیح' پُرخلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہو تو معاشرے کو مسائل کا سامنا نہیں ہوگا اور اس طرح پوری کاروباری دنیا میں خوش آہنگی' نیک خیالی اور امن کا دَور دَورہ ہوگا۔ باہمی لین دین کے اور تجارتی اُفق کو ہر قسم کی دُھند سے بچانے کے لئے قرآن مجید نے جگہ بہ جگہ اصول وضوابط عطا کئے ہیں۔ عالمگیر ہدایت وراہ نمائی کا حق اگر کسی کتاب کو پہنچتا ہے تو بلا شک وشبہ اللہ کی یہی آخری کتاب ہوسکتی ہے۔

(۱) معاہدہ اور پیمان کو بہر صورت تحریری شکل میں آنا چاہئے: سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :
وَلاَ تَسْئَمُوْا أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا أَوْ كَبِيْرًا اِلٰى أَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَاللهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ أَدْنٰى أَلاَّ تَرْتَابُوْا اِلاَّ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ'' أَلاَّ تَكْتُبُوْهَا وَأَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلاَ يُضَآرَّ كَاتِبٌ'' وَّلاَ شَهِيْدٌ'' (البقرة : ۲۸۲)
''معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' میعاد کی تعیین کے ساتھ اُس کی دستاویز لکھوا لینے میں غفلت نہ کیا کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی بر انصاف ہے۔ اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور تمہارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین تم لوگ آپس میں دست بدست کرتے ہو' اُسے اگر نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں اور تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو' کاتب اور گواہ کو نقصان نہ دیا جائے۔'' (۲۸۲ : ۲)

''آیت کا پہلا حصّہ اُن معاملات سے متعلق ہے جن میں رقم کی ادائی بعد میں ہوتی ہے جبکہ اس کا دوسرا حصّہ اُن معاملات سے متعلق ہے جن میں رقم کی ادائی اور سامان کی سپردگی موقع پر ہوتی ہے۔ اوّل الذکر کی مثال یہ ہے کہ سامان ابھی دے دیا گیا اور رقم کی ادائی کا وعدہ بعد کا کیا گیا' یا یہ کہ رقم ابھی ادا کردی گئی اور مال کی مستقبل میں سپردگی کا معاہدہ طے پایا۔ ایسی صورتوں میں تحریری دستاویز کر لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مؤخر الذکر قسم یعنی رقم کی فوری ادائی اور مال کی موقع پر سپردگی میں تحریری دستاویز کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایسے معاملات میں زبانی گواہ ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۳۲۹)

(۲) صحیح ناپ تول اور دیانتداری کا لین دین۔۔ کاروباری اخلاقیات کا ناگزیر اصول: جو تمام اَدیانِ سابقہ میں بھی ایک مشترک اصول رہا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے پیغمبروں کی زبانی فرمایا۔
نوٹ :تشریح کے لئے رجوع کیجئے صفحات ۶۲۲ تا ۶۲۷ (جلد دوم)۔

(ز) **ازدواجی اخلاقیات** : عدل وانصاف، نیک نیتی، حسنِ سلوک اور عمدہ بود و باش اسلام کے ازدواجی ضابطے کی روح ہے۔ ازدواجی تعلقات سے متعلق اسلامی قوانین کا بیوی کی خوشی و شادمانی اور اُس کی فلاح و بہبود کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ نکاح وطلاق، مہر، رضاعت غرض ازدواج کے ہر شعبہ میں قرآنی / اسلامی تعلیمات جامعیت کے ساتھ موجود ہیں۔

میاں بیوی کے ازدواجی تعلق کے سلسلہ میں قرآن مجید نے جاہلیت کے اس زعم کی دھجیاں اُڑا دیں اور بتایا کہ عورت بے حقی نہیں ہے۔ مرد عورت کا مالک نہیں اور وہ اُس کی کنیز یا باندی نہیں بلکہ اُس کے بھی اپنے خاوند پر اُسی سطح کے حقوق ہیں جس طرح کہ اُس کے خاوند کے اُس پر حقوق ہیں (سورۃ البقرۃ، آیت ۲۲۸)۔ حقوقِ نسواں کی یہ بات عرب کے ایک اُمی کی زبان پر رب تعالیٰ اُس وقت لا رہا ہے جبکہ پوری دنیا اِس تخیل سے ناواقف تھی اور یہودیت اور نصرانیت کی مذہبی دنیا میں تو عورت گویا ہر بُرائی کا سرچشمہ اور ذلت وحقارت کا ایک مرقع تھی۔ تاجدارِ انسانیت ﷺ نے فرمایا: خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَھْلِہٖ (تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے حق میں بہتر ہے)۔ فرموداتِ قرآنی ملاحظہ ہوں :

(ا) هُنَّ لِبَاس" لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاس" لَّهُنَّ (البقرۃ : ۱۸۷)

''وہ (عورتیں) تمہارے لئے اور تم اُن کے لئے لباس ہو۔'' (۱۸۷ : ۲)

اِس اِجمال کی ذرا تفصیل ملاحظہ ہو :

(i) میاں بیوی کا باہمی قرب واتصال ایسا ہی ہے جیسے جسم اور لباس کا۔

(ii) دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے جیسے لباس اور جسم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

(iii) دونوں ایک دوسرے کے اسی طرح محتاج ہیں جیسے انسان لباس کا محتاج ہے۔

(iv) دونوں ایک دوسرے کے لئے ایسے ہی موجبِ تسکین ہیں جیسے لباس انسان کے لئے ہے۔

(v) لباس جسم کے حسن وخوبی کو ابھارتا ہے۔ میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا ہونا چاہئے۔

(vi) بوقتِ جماع دونوں ایک دوسرے سے یوں ملتے ہیں جیسے جسم سے لباس ملتا ہے۔

(vii) نکاح کی وجہ سے میاں بیوی لوگوں کے طعنوں اور الزام تراشیوں سے ایسے محفوظ ہو گئے جیسے لباس کی وجہ سے جسم موسمی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

(viii) انسان کے حق میں لباس کا ایک وصفِ امتیازی اُس کی پردہ پوشی ہے جس طرح لباس جسم کے عیوب کو چھپاتا ہے۔ تشبیہ سے خاص اشارہ اِسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہئے۔ میاں بیوی کے درمیان جو انتہائی گہرا رشتہ ہوتا ہے، اُس کی بنا پر ظاہر ہے کہ جتنا موقع ایک کو دوسرے کے جسمانی، اَخلاقی، روحانی عیبوں اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے اُتنا نہ کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو اور نہ ایک کا کوئی راز دوسرے سے چھپا رہ سکتا ہے۔ اس صورت میں عورت کے اخلاق کا کمال یہی ہے کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے، اُس پر صبر کرے اور اُسے بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرے۔ اسی طرح مرد کے کمالِ اخلاق کی یہی معراج ہے! ---- دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بغیر کسی شدید

اور پُر تعب مجاہدہ میں ڈالے ہوئے روزمرّہ کے لطیف و آسان مجاہدات کے ذریعے بتا دیا۔ یہ اُس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی محققین کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اُس میں عورت کی تحقیر کی گئی! اس سے بڑھ کر کونسا سخت جھوٹ ہوگا اور اس سے بڑھ کر صریح کونسا اتہام ہوگا؟ منوسمرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں' عہدِ عتیق و جدید والے یہودی و نصرانی مذہبوں سے سوال ہے کہ اُن کے سارے دفترِ کتب و اسفار میں زن و شو کے باہمی تعلق' محبت و اعتماد کے باب میں کون سی تعلیم اس درجہ کی ہے؟'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۱۷۱)

(۲) وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء : ۱۹)

''اور بیویوں کے ساتھ خوش اُسلوبی سے گزر بسر کیا کرو۔'' (۱۱۹ : ۴)

حُسنِ معاشرت کا یہ بنیادی' مرکزی اور کلیدی حکم سہاگنوں' بیواؤں' طلاقنوں سب کے معاملہ میں واجب العمل ہے اور یہ ہدایت اُس مذہب کی ہے جو کتنے ہی کور چشم مسیحیوں' آریوں وغیرہ کے نزدیک عورت کے حق میں (العیاذ باللہ) ظالم ہے۔ (ماجدی اردو صفحہ ۱۸۵)

(۳) وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا○

''تم بیویوں کو اُن کے مہر خوشدلی سے دے دیا کرو لیکن اگر وہ خوش دلی سے تمہارے لئے اس میں کوئی حصّہ چھوڑ دیں تو تم اُسے مزیدار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔'' (۴ : ۴)

شریعتِ اسلامی میں مہر' بیوی کی وہ قیمت نہیں جو شوہر اُس کے سرپرستوں کو دے کر اُن سے بیوی حاصل کرتا ہے بلکہ مہر بطور ایک نذرانہ کے ہے جو شوہر بہ غرض اکرام و اعزاز براہِ راست بیوی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔ بیوی اگر شوہر سے مہر وصول کر کے پھر اُسے واپس کر دے تو اُسے ''ہبہ'' کہیں گے اور اگر لئے بغیر پہلے ہی معاف کر دے تو اس کا نام اصطلاحِ فقہ میں ''ابراء'' ہے۔ شرعاً دونوں صورتیں درست ہیں۔ بیویوں کی طرف سے یہ ابراء بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اور شوہر کے کسی مکر و فریب کے بغیر ہونا چاہئے۔ مہر اگر کسی جبر یا فریب سے معاف کرایا گیا ہے تو قاضی اور عدالت کے ہاں سے جو بھی فیصلہ ہو جائے' عنداللہ معاف نہیں سمجھا جائے گا۔ مہر کی اہمیت اور ادائے مہر کی تاکید شریعت میں بالکل ظاہر ہے مگر افسوس ہے کہ اُمت کا عمل اس کے برعکس ہے اور مہر کو محض ایک وہمی اور فرضی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔

(۴) وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّآتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا○ وَكَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُكُمْ اِلٰی بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا○ (النساء : ۲۱)

''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اُس بیوی کو (مال کا) انبار دے چکے ہو'

تو اُس میں سے کچھ بھی واپس مت لو' کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اُسے (واپس) لو گے؟ اور تم اُسے واپس لے بھی کیسے سکتے ہو جبکہ ایک دوسرے سے خلوت کر چکے ہو اور وہ (بیویاں) تم سے ایک مضبوط اقرار لے چکی ہیں۔'' (۴ : ۲۱)

(۵) وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (۲ : ۲۳۳)

''مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں' (یہ مدت) اُس کے لئے ہے جو رضاعت مکمل کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے اُس کے ذمہ ہے اُن (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق' کسی کو حکم نہیں دیا جاتا بہ جز اُس کی برداشت کے بقدر' کسی ماں کو اُس کے بچہ کے باعث تکلیف نہ پہنچائی جائے اور نہ کسی باپ کو اُس کے بچہ کے باعث تکلیف پہنچائی جائے اور اسی طرح (کا انتظام) وارث کے ذمہ بھی ہے' پھر اگر دونوں اپنی باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور دایہ کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم جو کچھ اُنہیں دینا ہے' دستور کے موافق اُن کے حوالے کر دو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۲ : ۲۳۳)

(۶) اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء : ۳۴)

''مرد عورتوں پر قوّام ہیں اس بناء پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے' سو نیک بیویاں اطاعت کرنے والی اور پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔'' (۴ : ۳۴)

(۷) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (الاعراف: ۱۸۹)

''وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اُس سے تسکین حاصل کرے۔'' (۷ : ۱۸۹)

(۸) وَمِنْ آيٰتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی۔''

گویا عورت کی پیدائش کی غرض ہی یہی ہے کہ مرد اُس سے راحت و سکون حاصل کرے اور یہ کہ رشتہ ازدواج پیار و محبت اور ایثار پر مبنی ہے نہ کہ نفرت اور لڑائی جھگڑے پر اور اسی میں ازدواجی اخلاقیات کا اہم پہلو مضمر ہے۔

(۹) اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ وَاِنۡ كُنَّ اُولٰتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَـكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰىؕ لِيُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سَعَتِهٖ وَمَنۡ قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡيُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ (الطلاق : ۶، ۷)

''اُن (مطلّقات) کو اپنی حیثیت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور تنگ کرنے کے لئے اُنہیں تکلیف نہ پہنچاؤ اور اگر وہ حمل والیاں ہوں تو اُنہیں اُن کے وضعِ حمل تک خرچ دیتے رہو، پھر وہ اگر تمہارے لئے رضاعت کریں تو اُنہیں اُن کی اجرت دو اور باہم مناسب طور پر طے کر لیا کرو اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو رضاعت کوئی دوسری کرے گی۔ وسعت والے کو خرچ اپنی وسعت کے مطابق کرنا چاہئے اور جس کی آمدنی کم ہو تو اُسے چاہئے کہ اللہ نے جتنا اُسے دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرے۔'' (۶، ۷ : ۶۵)

''جدائی کے معًا بعد بھی شریعت کا حکم ہے کہ عدت بھر سابق بیوی کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا جائے۔ عام مطلقہ بیویوں کے لئے عدّت کی میعاد تین ماہ کی ہے لیکن اگر بیوی حاملہ ہے تو اُس کی میعادِ عدّت وضعِ حمل ہے۔ بچہ اگر دوسرے ہی دن پیدا ہو جائے تو عدّت اُسی وقت ختم ہو جائے گی اور زچگی کے انتظار میں اگر چھ ماہ لگ جائیں، جب بھی عدت ختم نہ ہو گی، قائم رہے گی۔ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ یعنی مطلقہ بیویوں کی رہائش کے لئے صرف مکان ہی نہیں دینا بلکہ عدت بھر اُن کے کھانے پینے وغیرہ کے ضروری مصارف بھی شوہر کے ذمّہ واجب ہیں۔۔۔ یہ ہیں اُس شریعت کے احکام جسے ظالموں نے ''سخت'' مشہور کر رکھا ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی شریعت ہر مخلوق کے حق میں عدل کرنے والی اور کمزوروں کے حق میں رحیم و شفیق اسلامی شریعت سے بڑھ کر نہیں مل سکتی۔'' (ماجدی ص ۱۱۱۸)

(س) **خانگی اخلاقیات (Domestic Ethics)**: انسان کا گھر اُس کا خلوت خانہ ہے جہاں وہ بے تکلفی سے وقت بسر کرتا ہے۔ اگر یہاں بھی ہر شخص کو بلا اجازت، بے دھڑک آ گھسنے کی آزادی ہو تو انسان گھر میں وہ راحت و آرام نہیں پا سکے گا جس کی تلاش میں وہ باہر سے تھکا ماندہ آتا ہے۔ اس لئے گھر کے سکون و آرام کے قائم رکھنے کے لئے قرآن مجید نے کچھ اصول و ضوابط مقرر کئے ہیں جن کی پابندی سے اہلِ خانہ کی عصمت و آبرو بھی محفوظ رہے گی اور وہاں خاطر خواہ آرام و سکون بھی مل سکے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

(۱) يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ بُيُوۡتِكُمۡ حَتّٰى تَسۡتَاۡنِسُوۡا وَتُسَلِّمُوۡا عَلٰٓى اَهۡلِهَا‌ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ۝ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا حَتّٰى يُؤۡذَنَ لَـكُمۡ‌ وَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا‌ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ۝ (النور)

''مؤمنو! اپنے گھروں کے سوا (دوسروں کے) گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک تم اُن گھروں میں رہنے والوں سے اجازت نہ لے لو اور سلام نہ کر لو' تمہارے لئے یہی بہتر ہے تاکہ تم (اُس کی نعمتوں میں) غور و فکر کرو۔ پھر اگر تم اُن گھروں میں کسی کو نہ پاؤ (جو تمہیں اجازت دے) تو اُن میں داخل نہ ہو یہاں تک کہ تمہیں اجازت دی جائے اور اگر تمہیں کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جایا کرو۔ یہ (طرزِ معاشرت) تمہارے لئے بہت پاکیزہ ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جاننے والا ہے۔'' (۲۷'۲۸:۲۴)

''اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ (۱) سلام بھی کہے' داخل ہونے کی اجازت بھی طلب کرے اور اپنا نام بھی بتائے۔ صرف یہ کہنا کہ ''میں ہوں'' درست نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا ہے۔ (۲) حضور علیہ السلام کا یہ معمول تھا کہ جب اجازت طلب فرماتے تو دروازہ کے سامنے کھڑے نہ ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تاکہ دروازہ کھلنے پر گھر کی بے پردگی نہ ہو۔ دروازے کو کھٹکھٹانا بھی اجازت طلب کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ آجکل کئی گھروں میں گھنٹی لگی ہوتی ہے۔ اُسے بجا کر بھی اجازت طلب کرنا درست ہے۔ (۳) زیادہ سے زیادہ تین بار اجازت طلب کرنی چاہئے۔ اگر تیسری بار بھی جواب نہ آئے تو واپس چلا آئے کیونکہ اس سے زیادہ اجازت طلب کرنا صاحب خانہ کو پریشان کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اُس وقت ایسے کام میں مصروف ہو جسے وہ منقطع نہ کر سکتا ہو۔ یہاں گھر کے تقدس کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر و منزلت کا سبق دیا جا رہا ہے یعنی مؤمن کی زندگی اتنی بیکار اور بے مصرف تو نہیں ہوتی کہ جس وقت کوئی چاہے اُس کے اوقات میں دخیل ہو جائے اور نہ اُس کے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے کہ ہر وقت آپ کے لئے گوش بر آواز رہے۔ جو وقت اُس نے مطالعہ یا کسی مخصوص کام کے لئے مقرر کر رکھا ہے' اُس میں اُسے کام کرنے دو' اُس کی مصروفیتوں کا احترام کرو اور اگر اُس نے اپنی کسی مجبوری کے باعث معذرت کی ہے' تو خندہ پیشانی سے اُس کی معذرت خواہی کو قبول کر لو۔''

''جس گھر میں ماں یا بہن رہائش پذیر ہو' وہاں جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کر لینی چاہئے۔ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے گھر میں جہاں اُس کی اہلیہ ہو' اطلاع دئے بغیر داخل نہ ہو بلکہ پاؤں کی آہٹ کرنے سے یا کھنکھارنے سے اپنی آمد کی اطلاع دے دے۔ ممکن ہے کوئی اجنبیہ عورت گھر میں اُس کی بیوی سے ملنے آئی ہو۔''

''ایک مرتبہ ختمی مرتبت رسول اللہ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور طلب اجازت کے لئے فرمایا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ سعد نے سن لیا اور آہستہ سے وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ کہہ دیا۔ حضور علیہ السلام نے دوسری بار سلام فرمایا۔ سعد نے پھر بھی چپکے سے جواب دیا۔ تیسری بار بھی حضور علیہ السلام کو سعد نے وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ کہہ دیا۔ جواب نہ ملنے پر آپ واپس تشریف لے جانے لگے تو سعد دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! آپ نے جتنی بار سلام فرمایا میں نے سنا اور جواب دیا۔ میری خاموشی کا مقصد یہ تھا کہ آپ مجھے بار بار سلام فرمائیں اور مجھے اُس کی برکت حاصل ہو۔''

اسلام نے صرف بلا اجازت داخل ہونے پر ہی پابندی نہیں لگائی بلکہ بلا اجازت کسی کے گھر میں جھانکنا بھی ممنوع قرار دیا ہے۔آپ کا ارشادِ گرامی ہے: ''جو شخص دوسروں کے گھر میں اُن کی اجازت کے بغیر جھانکے' اُن کے لئے جائز ہے کہ وہ اُس کی آنکھ نکال دیں۔ (صحیح مسلم' بحوالہ ضیاء القرآن' جلد سوم' صفحات ۳۰۹ تا ۳۱۱)

(۲) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ " أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ " لَّكُمْ (ألنُّور : ۲۹)
''تم پر کوئی حرج نہیں اگر تم ایسے گھروں میں داخل ہو جن میں کوئی (مستقل طور پر) آباد نہیں' جن میں تمہارا سامان رکھا ہے۔'' (۲۹ : ۲۴)

اس سے مراد سرائے' مہمان خانہ اور ہوٹل وغیرہ ہیں جہاں ہر وقت آنے جانے کی عام اجازت ہوتی ہے۔

(۳) لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ " وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ " وَّلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ " وَّلَا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَاءِ كُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهٰتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمّٰتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خٰلٰتِكُمْ أَوْمَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَه' أَوْصَدِيقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ " أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِاللهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً (ألنُّور : ٦١)
''نہ اندھے پر' نہ لنگڑے پر' نہ بیمار پر اور نہ تم پر کوئی حرج ہے اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جن گھروں کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے' اگر تم سب مل کر یا الگ الگ ہو کر کھاؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں' پھر جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنوں کو سلامتی کی وہ دُعا دو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے جو بڑی بابرکت اور پاکیزہ ہے۔'' (۲۴:٦١)

اگر کوئی شخص نابینا' لنگڑا اور بیمار ہے تو اُس پر ایسے افعال کا ادا کرنا ضروری نہیں جس سے اُسے تکلیف ہوتی ہو۔اسی لئے جمعہ' جہاد وغیرہ سے یہ لوگ مستثنیٰ قرار دئے گئے ہیں۔آگے یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ رشتہ دار یا احباب جن سے بے تکلفی ہو' اگر اُن کے ہاں سے کھایا جائے تو اُن کے لئے فرحت اور عزت کا موجب ہو تو ایسے قریبی رشتہ داروں اور بے تکلف دوستوں کے ہاں سے کوئی چیز کھا لینا جائز ہے لیکن اگر وہ رشتہ دار یا دوست اس چیز کو ناپسند کریں تو پھر بلا اجازت اُن کے ہاں سے کچھ کھانا درست نہیں جیسے متعدد احادیث سے واضح ہے۔جب انسان کسی گھر میں داخل ہو تو اُس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہاں پہلے سے کوئی مسلمان موجود ہے تو کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُه' اور اگر وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تو کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللهِ الصّٰلِحِيْنَ اور اگر وہاں کوئی غیر مسلم رہائش پذیر ہو تو کہے اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔

(ش) **بین الاقوامی تعلقات سے متعلق اَخلاقیات**: ان کے متعلق قرآن مجید نے فرمایا:

(۱) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ (اَلمائدۃ: ۸)

"مؤمنو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ گواہی دینے والے بنو اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اُس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کیا کرو کہ وہ تقوٰی سے بہت قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔" (۸ : ۵)

معلوم ہوا کہ کافر کا کفر اُس سے انصاف کرنے اور اُس کے جائز حقوق کی ادائی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اللہ اللہ! دُنیا کا کونسا قانون ایسا ملے گا جس نے اپنے باغیوں تک کے حقوق کی یہ رعایت روا رکھی ہو!

(۲) وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ (التوبۃ:۶)

"اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اُسے پناہ دیجئے تا کہ وہ کلامِ الٰہی سن سکے پھر اُسے اُس کی امن کی جگہ پہنچا دیجئے۔" (۶ : ۹)

اسلام کی وسعتِ ظرف اور اعلٰی اخلاقی قدروں کو دیکھتے جایئے اور سر دُھنتے جایئے کہ ایک حربی امن گزین کو اسلام نے چھیڑنا اور ستانا نہ صرف پسند نہیں کیا بلکہ اُس کی حفاظت کو اپنے ذمّہ لینا کیا ہے!

(۳) فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝ (اَلتّوبۃ: ۷)

"سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھے رہیں تم بھی اُن سے سیدھے رہو۔ بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔" (۷ : ۹)

(۴) وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ ۝ (اَلتّوبۃ: ۱۲)

"اور اگر یہ لوگ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو تم اِن قائدینِ کفر سے جنگ کرو (اس صورت میں) اُن کی قسمیں باقی نہیں رہیں تا کہ یہ باز آ جائیں۔" (۹:۱۲)

"ذمّی جب دینِ اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے تو وہ معاہدہِ امن سے نکل جاتا ہے اور اُس کا قتل جائز ہو جاتا ہے۔ آیت میں سرداروں کے قتل کے حکم میں عوام کے قتل کی نفی نہیں ہے۔ سرداروں کی تصریح اہتمام و خصوصیت اور تاکید کے لئے ہے۔ اُن کے قتل سے عوام خود بخود منتشر یا مطیع ہونے لگیں گے۔" (ماجدی اردو، ص ۳۹۶)

(ص) **جنگی اخلاقیات**: جنگ ایک ہیجانی کیفیت کا نام ہے جس میں متحارب گروہوں کے جذبات قدرتی طور پر آپے میں نہیں رہتے۔ لیکن اسلام نے یہاں بھی اپنے ماننے والوں کو ضبطِ نفس اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے امین ہونے کا سبق دیا تاکہ دنیا کے معلم ہونے کا مقصدِ اصلی حاصل ہو جائے۔ فرمایا گیا:

(۱) وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○ (البقرة)

''اور اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، اور حدود سے آگے مت بڑھو، بے شک اللہ کو حدود سے آگے بڑھنے والے پسند نہیں ہیں۔'' (۲ : ۱۹۰)

''اللہ کی راہ میں لڑو'' اُن لوگوں کے لئے فکر انگیز جملہ ہے جو اسلام پر جنگی قائد اور خونخوار مذہب ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ معاملے کو واضح کرنے کے لئے بریگیڈیئر ایس۔ کے ملک اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اسلام میں جنگ تو نامِ خدا پر کی جاتی ہے۔ مسلمان کا جنگ کے لئے ہتھیار اٹھانا عین منصفانہ، شریفانہ، نیک اور خیرِ خلق کا عمل ہے۔ اسلام کی فتح اسلام کی ترویج و ترقی کا نام ہے۔ ایسے شریفانہ اور انسانیت نواز عمل کی اجازت غیر انسانی اور اوچھے طریقوں سے نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح انسانیت نوازی اسلام کے تعارف کردہ طریقۂ جنگ ہی میں مضمر ہے۔'' ("The Qur'anic Concept of War" ... Brigadier S. K. Malik, p. 50)

"حدود سے آگے مت بڑھو" ایک جامع حکم ہے جس کی بابت ریمنڈ لی رانج اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''محمد ﷺ نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ دھوکہ اور فریب دہی مت کرو، بچوں کو قتل مت کرو۔ جب تم دشمن سے اُس کے علاقے میں لڑو تو وہاں کے پُرامن شہریوں پر ہاتھ مت اٹھاؤ۔ کمزور عورتوں کو چھوڑ دو، دودھ پیتے بچوں اور بیماروں پر ترس کھاؤ۔ گھروں اور کھیتوں کو تباہ مت کرو، باثمر باغوں کو ویران نہ کرو اور کھجور کے درختوں کو مت کاٹو۔ پیغمبر علیہ السلام کے ان الفاظ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے آپ کے خلیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعد میں اُمرائے لشکر کی راہ نمائی کے لئے ان الفاظ کا اضافہ کیا: نیک اور انصاف پسند بنو، فتح تمہارے قدموں میں ہوگی۔ جب دشمن سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو انتہائی بے جگری سے اُس پر حملہ کرو۔ اگر تم میدانِ جنگ میں فتحیاب رہے تو عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا اور گھروں اور کھیتوں کی تباہی سے بچنا۔ اگر دشمن سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کی شِقوں کی پابندی کرنا۔ عیسائی ممالک میں تمہارا سامنا اُن مقدس لوگوں سے ہوگا جو گرجا گھروں اور عبادت گاہوں میں اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں، اُنہیں تنگ نہ کرنا اور اُن کے گرجاؤں اور عبادت گاہوں کو تباہ مت کرنا۔''

''یہ وہ الفاظ تھے جو پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے۔۔۔ وہ الفاظ جو ساتویں صدی عیسوی میں مدینہ کی مسجد کے صحن میں گونجے۔ مجاہدین کے ذہنوں سے اِن الفاظ کا تاثر کبھی زائل نہیں ہوا۔ جب کبھی پیغمبر کی روحِ صالح اُن کی آتشِ شوق میں نئی زندگی ڈالے گی تو یوں معلوم ہوگا کہ اُس انسانیت نواز جنگجو کی ماضی بعید میں کہی ہوئی آواز اُن سے گویا ابھی مخاطب ہو رہی ہے۔'' ("Viede Muhamet" .... Raymond Leronge, pp. 164, 165)

(۲) فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَااعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَo (البقرۃ : ۱۹۴)

''تو جوکوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اُس پر اُتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُس نے تم پر زیادتی کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔'' (۱۹۴ : ۲)

یہاں مِثْل سے مراد برابری ہے نہ کہ مشابہت ۔کیونکہ بعض جرموں کی سزا اُس کی مثل دی جاتی ہے۔ چپت کا جواب چپت اور جوتے کا جواب جوتا۔ جبکہ بعض جرائم کی سزا اور طریقہ سے دی جاتی ہے جیسے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا اور زنا کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا۔ غرض یہ ہے کہ نہ تو تم جنگ کی ابتدا کرو اور نہ زیادتی کی سزا حد سے زیادہ دو۔ بدلہ لیتے وقت اللہ سے ڈرتے رہو کہ نہ تو جرم سے زائد بدلہ لو اور نہ ناجائز کام کرو لہٰذا ایک تھپڑ کا بدلہ دو سے نہ لو اور زنا کے بدلے زنا نہ کرو اور یہ یاد رکھو کہ پرہیزگاروں کے ساتھ رب ہے کہ اُن کی ہمیشہ مدد کرتا ہے اور اُنہیں غلبہ اور شوکت دیتا ہے۔

(۳) اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَایَتَّقُوْنَo فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْبِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَo وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَo (الانفال : ۵۶ تا ۵۸)

''اُن سے آپ بار بار عہد لے چکے ہیں پھر بھی وہ اپنا عہد ہر بار توڑ ڈالتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ سو اگر آپ اُنہیں جنگ میں پا جائیں تو اُن کے ذریعہ سے اُن لوگوں کو منتشر کر دیں جو اُن کے علاوہ ہیں تاکہ وہ لوگ سمجھ جائیں۔ اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ (وہ عہد) اُن کی طرف اسی طرح واپس کر دیں' بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔'' (۵۶تا۵۸ : ۸)

آیات میں اشارہِ خاص بنی قُریظہ اور بنی نضیر کے یہودی قبائل کی جانب ہے جن سے رسول اللہ ﷺ نے پہلے صلح کا معاہدہ فرمایا تو اُنہوں نے کفار کو اسلحہ مہیا کر کے عہد شکنی کی' پھر تائب ہوئے اور دوبارہ معاہدہ کیا لیکن جب غزوہ خندق میں سارا عرب مدینہ پر حملہ آور ہوا تھا تو کفار کا پلہ بھاری دیکھ کر پھر یہ یہودی اُن کی طرف جھک گئے اور عین حالتِ جنگ میں مسلمانوں سے دغا کی۔ یہاں سَوَآء کا معنی ہے کہ اگر تمہارا کسی قوم سے معاہدہ ہو اور تمہیں ایسے آثار دکھائی دینے لگیں جن سے یہ اندیشہ ہو کہ وہ عہد شکنی پر آمادہ ہیں اور دشمن سے ساز باز کر رہے ہیں تو اُن پر اچانک حملہ نہ کرو بلکہ پہلے اُنہیں اطلاع دو کہ تمہاری شرارتوں اور تمہارے مشکوک رویّہ کے پیشِ نظر ہم اس معاہدہ سے دستبردار ہیں تاکہ معاہدہ کے کالعدم ہونے کا تمہیں اور اُنہیں مساوی طور پر علم ہو۔ علامہ قرطبی نے وضاحت کی ہے کہ جب معاہد قوم سے ایسے آثار نمایاں ہوں جن سے اُن کی غدّاری اور خیانت کا پتہ چلتا ہو تو پہلے اُن کا معاہدہ اُن کے منہ پر دے مارو تب اُن کے خلاف کوئی کارروائی کرو لیکن اگر اُنہوں نے کھلم کھلا عہد شکنی کی تو پھر کسی تکلف کی ضرورت نہیں' تم مناسب قدم اُٹھا سکتے ہو۔

(۴) وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ اِنَّه' هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○ (الانفال: ۶۱)
''اور اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اُس کی طرف مائل ہو جایئے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے' بے شک وہی سب کچھ سننے والا' جاننے والا ہے۔'' (۶۱ : ۸)

(۵) وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَىْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ'' (الانفال:۷۲
''جو لوگ ایمان تو لائے لیکن ہجرت نہیں کی تو اُن کی وراثت سے تمہارے لئے کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اگر وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد طلب کریں تو تم پر اُن کی امداد فرض ہے مگر اُس قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور اُن کے درمیان (صلح کا) معاہدہ ہو چکا ہے۔''

(۶) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُوْلُه' وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ○ (اَلتوبة : ۲۹)
''اُن لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور اُسے حرام نہیں سمجھتے جسے اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں اُن لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے' یہاں تک کہ وہ رعیّت ہو کر اور اپنی پستی کا احساس کر کے جزیہ دیں۔'' (۹:۲۹)

جزیہ وہ رقم ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا (ذمّیوں) سے اُن کے جان و مال کی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کرتی ہے۔ اسلامی حکومت میں ہر مسلمان مرد پر فوجی خدمت لازم ہے اور بوقتِ ضرورت ساری مسلم رعایا سپاہ بن سکتی ہے۔ غیر مسلموں کے لئے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ فوجی خدمت سے استثناء ایک قلیل رقم کے معاوضہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ جزیہ معاوضہِ کفر یا کسی اعتقادی گمراہی کا نہیں بلکہ فوجی خدمات کا معاوضہ ہے۔ چونکہ ذمّی چونکہ اس خدمت سے معاف ہیں اس لئے اس کا قائم مقام یہ محصول ہے۔ عورتوں' بچوں' بوڑھوں' اپاہج اور تارکانِ دُنیا پر جزیہ نہیں اور اگر بوجہ قرار علی الکفر کے ہوتا تو اُن پر بھی جزیہ لازم ہوتا۔

''جزیہ'' کے متعلق ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''یہ ٹیکس صرف صحتمند مردوں سے لیا جاتا تھا' عورتوں اور بچوں سے نہیں۔ وہ غرباء جن کی گزر بسر صدقات و خیرات پر تھی اور وہ بوڑھے جو کام کرنے سے معذور تھے' اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح نابینا' لنگڑے' لاعلاج اور فاتر العقل (دیوانے) بھی اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے تا آنکہ وہ صاحبِ ثروت ہو جائیں۔ یہی شرط پادریوں اور راہبوں کے لئے تھی جن کی گزر بسر اگر اُمراء کی خیرات پر ہوتی تو وہ جزیہ سے مستثنیٰ تھے لیکن اگر وہ خوشحال ہوتے اور

آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہوتے تو اُنہیں جزیہ دینا پڑتا تھا۔ جزیہ کے اکٹھا کرنے والوں کو یہ خاص ہدایت تھی کہ وہ نرمی برتیں اور عدمِ ادائی کی صورت میں سخت و تندرویہ اور جسمانی سزا دینے سے گریز کریں۔''

''جیسا کہ ہم میں سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جزیہ عیسائیوں پر اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے بطور جرمانہ عائد تھا۔ نہیں بلکہ عیسائی بھی دوسرے ذمّیوں اور غیر مسلم رعایا کی طرح جزیہ ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے جن کا مذہب اُنہیں فوجی خدمت کرنے سے روکتا تھا اور یہ ٹیکس اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا جاتا تھا۔ جب حیرہ کے لوگوں نے طے شدہ رقم ادا کر دی تو اُنہوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ ہم نے یہ رقم اس شرط پر دی ہے کہ مسلمان اور اُن کے قائدین جابر و ظالموں سے ہماری حفاظت کریں گے خواہ وہ جابر و ظالم مسلمان ہوں یا کوئی اور۔ اسی طرح حیرہ کے مضافات میں واقع کچھ شہریوں سے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو معاہدہ کیا اُس میں لکھا: ''اگر تو ہم تمہاری حفاظت کر سکیں تو تم پر ہمیں جزیہ دینا فرض ہوگا اور اگر ہم تمہاری حفاظت نہ کر سکے تو اُس کا دینا فرض نہیں ہوگا۔'' کس وضاحت کے ساتھ اس شرط کو مسلمانوں نے عملی جامہ پہنایا' اس کا اندازہ عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت میں اِس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے:۔

''شہنشاہ ہرقل نے مسلمانوں کی اُن حملہ آور فوجوں کو پیچھے دھکیلنے کے لئے کثیر التعداد فوج تیار کی جنہوں نے اپنی تمام توانائیوں کو دشمن کے متوقع خطرہ سے نمٹنے کے لئے لگا دیا تھا۔ عرب جرنیل ابو عُبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) نے ملکِ شام کے مفتوحہ علاقوں کے گورنروں کو یہ حکم نامہ بھیجا کہ شہریوں سے اکٹھا کیا ہوا جزیہ اُنہیں واپس کر دیا جائے اور لوگوں کے نام یہ مکتوب لکھ بھیجا: ''جو رقم ہم نے تم سے لی تھی' وہ ہم تمہیں واپس کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ایک طاقتور فوج ہمارے خلاف پیشقدمی کر رہی ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان معاہدہ یہ تھا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور اب چونکہ یہ بات ہمارے بس میں نہیں رہی' اس لئے ہم تمہیں وہ تمام رقم واپس کرتے ہیں جو ہم نے تم سے وصول کی تھی۔ اگر ہم فتحیاب ہوئے تو ہم اپنے پرانے معاہدے کی رُو سے تمہاری حفاظت کرنے کے پابند ہوں گے۔'' اس حکم نامہ کی تعمیل میں بیت المال سے ایک خطیر رقم واپس کی گئی اور عیسائیوں نے مسلمان قائدین کو یہ دعائیں دیں کہ اللہ تمہیں ہم پر پھر حاکم بنائے اور تمہیں رومیوں پر فتح عطا فرمائے! اگر تمہاری جگہ رومی ہم پر حاکم ہوتے تو وہ ہمیں کچھ بھی واپس نہ کرتے بلکہ جو کچھ بھی ہمارے پاس تھا' اُس پر بھی قابض ہو جاتے۔'' ("The Preaching of Islam" ---- T.W. Arnold, pp. 61, 62)

''مسلمانوں پر ظلم کا الزام لگائے جانے کا جواب آسان ہے: محمد (ﷺ) نے جو سربراہِ ریاست بھی تھے اور اپنے لوگوں کی زندگی اور آزادی کے محافظ بھی' انصاف کے تقاضوں کی تعمیل میں مجرموں کو اُن کے جرموں کی پاداش میں سخت سزائیں دیں اور آپ کے اس طرزِ عمل کو آپ کے زمانہ کے وحشی اور درندہ صفت معاشرہ کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ الٰہی مذہب کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے محمد (ﷺ) اپنے ذاتی دشمنوں تک کے لئے مشفق و مہربان تھے۔ انصاف اور رحم دلی کی دونوں صفات جن کا ایک فانی انسان تصوّر کر سکتا ہے'

آپ کی نہاد میں رکھ دی گئی تھیں ۔ کئی اُن مثالوں سے اس حقیقت کی تائید کرنا کوئی مشکل بات نہیں جو آپ کی سوانح میں ملتی ہیں ۔ آپ کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے:

''حیاتِ انسانی کی ہیبت ناک ضرورت یعنی جنگ سے محمد (ﷺ) نے عملی طور پر ظلم کے عنصر کو کم کر دیا تھا ۔ ایک اور اطلاع کے مطابق آپ اکثر اپنے فوجیوں کو یہ حکم دیتے رہتے تھے کہ بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دو' اُن لوگوں کے مکانوں کو گرانے سے گریز کرو جو تمہاری راہ میں مزاحم نہیں ہوتے' اُن کے وسائلِ رزق کو تباہ و برباد مت کرو ۔ باثمر درختوں اور کھجور کے درختوں کو نقصان نہ پہنچاؤ ۔'' ("An Interpretation of Islam" ---- Prof. Laura Vaglieri, p. 28)

(ض) دربارِ نبوی کے آداب اور ضابطہ اخلاق: جب خالقِ کون و مکاں نے ہر شعبہ حیات سے متعلق ضابطہ حیات و اخلاق عطا فرمادیا تو وجہِ ظہورِ بزمِ امکاں ﷺ کی ذاتِ اقدس سے متعلق آداب و اخلاق کے عطا کرنے میں وہ کیسے خاموش رہ سکتا تھا! فرشِ خاکی پر لگے ہوئے دربار کے آداب وضوابط کو عرش کے مکین نے بھیج کر انہیں حدیث کا حصّہ بنانا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ قرآن کا حصّہ بنا دیا تاکہ کسی کج رَو اور سر پھرے کو انکار کی جرأت ہی نہ رہے ۔ چنانچہ فرمایا :

(ا) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥
''مومنو! رَاعِنَا مت کہا کرو اور اُنظُرنَا کہا کرو اور (رسول کی باتوں کو) خوب غور سے سنا کرو اور کافروں کے لئے عذابِ دردناک ہے ۔'' (۲ : ۱۰۴)

''رَاعِنَا ذو معنی لفظ ہے جس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ہماری رعایت فرمایئے اور صحابہ کرام بارگاہِ رسالت میں جب حاضر ہوتے اور حضور کریم ﷺ کے کسی ارشادِ گرامی کو اچھی طرح سمجھ نہ سکتے تو عرض کرتے رَاعِنَا اے حبیبِ الٰہ! ہم پوری طرح سمجھ نہیں سکے' ہماری رعایت فرماتے ہوئے دوبارہ سمجھا دیجئے لیکن یہود کی عبرانی زبان میں یہی لفظ ایسے معنی میں مستعمل ہوتا جس میں گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے محبوب علیہ السلام کی عزت و تعظیم کا یہاں تک پاس ہے کہ ایسے لفظ کا استعمال بھی ممنوع فرمادیا جس میں گستاخی کا شائبہ تک بھی ہو ۔ چنانچہ فرمایا کہ رَاعِنَا کی جگہ اُنظُرنَا کہا کرو (یعنی ہماری طرف نگاہِ لطف فرمایئے) کیونکہ یہ لفظ ہر طرح کے احتمالاتِ فاسدہ سے پاک ہے ۔ وَاسْمَعُوْا کا حکم دے کر یہ تنبیہ فرمادی کہ جب میرا رسول تمہیں کچھ سنا رہا ہو تو ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو تاکہ اُنظُرنَا کہنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ یہ بھی تو شانِ نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو ۔''

علامہ شوکانی ''فتح القدیر'' کی جلد اوّل (ص ۱۲۴) میں رَاعِنَا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

''رَاعِنَا اور ایسے تمام الفاظ جن سے توہینِ رسالت کا احتمال ہو' اُن کا استعمال قطعی طور پر ممنوع قرار دیا

گیا۔'' اس لئے اہلِ ایمان کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایسے ذو معنی الفاظ سے قطعاً احتراز کریں تاکہ شانِ رسالت مآب ﷺ میں کسی قسم کی پنہاں اور پوشیدہ گستاخی کا احتمال بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

آیت کے آخری حصہ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں ادنیٰ سی گستاخی بھی کفر ہے اور کفر کا سقدر دردناک عذاب ہے۔ بعض صاحبانِ نظر نے اِس آیت کے اسلوبِ بیان سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کو یہودیوں کے اس فتنہ پرور گروہ کا یہ گستاخانہ اندازِ تخاطب اتنا ناگوار گزرا کہ اُس نے ایسے بدطینت یہودیوں سے خطاب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا حالانکہ قرآنِ حکیم میں یہود و نصاریٰ سے جابجا براہِ راست خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) سورۃ النساء کی آیت ۶۵ میں ایمان اور کفر کا فرق واضح کرتے ہوئے بتلایا کہ پیغمبرِ برحق کی ہر بات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی عین ایمان ہے اور اس کے خلاف اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس کرنا صریحاً کفر ہے۔ ارشاد ہوا:

فَلَاوَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًاo (أَلنِّساء : ۶۵)

'' (اے پیغمبر!) آپ کے رب کی قسم! یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو اپنا فیصل نہ بنالیں، پھر آپ جو بھی فیصلہ کریں اُس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں (بلکہ اُسے بسرو چشم تسلیم کرلیں)''۔ (۴: ۶۵)

نوٹ : اس مبارک موضوع کی تفصیل کے لئے رجوع کیجئے صفحات ۵۹۰ تا ۵۹۸ (جلد دوم)

<u>دنیا کی بے چینی اور قرآن مجید</u> : ''نئی روشنی'' کا نہیں بلکہ ''ظلمتِ جدیدہ'' کا یہ دَورِ شورش، افراتفری، بے چینی و اضطراب اور بدامنی کا دَور ہے۔ انفرادی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ''اطمینانِ قلبی'' اور ''امن وشانتی'' کے الفاظ صرف ڈکشنریوں ہی میں ملتے ہیں۔ طاقت و منصب' نام ونمود اور شہرت' شراب اور جنسیات نسلِ انسانی کو وہ سکون اور اطمینانِ قلبی دینے سے بالکل قاصر رہے ہیں جس کی وہ ہر زمانہ میں آرزومند رہی ہے۔ صورتِ حال کی اِس اُداس کن تصویر کے پسِ پردہ اسباب پر کیا فانی انسان نے کبھی غور کیا ہے؟ کیا میں نے کبھی یہ سوچا کہ میرا گلا دبانے کے لئے میرے بھائی کا ہاتھ میری گردن تک کیوں اور کب پہنچ سکتا ہے؟ اگر وہ ہاتھ میرے گلے تک پہنچ سکتا ہے تو قصور یقیناً میرا ہے اور میں نے ضرور اس کے حقوق کو کسی نہ کسی طرح غصب کیا ہے۔ کیا صنعت کاروں' مالکانِ کارخانہ اور آجروں نے کبھی اُن آئے دن کی ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کے پسِ پردہ اسباب و وجوہ کے متعلق سوچا جو کساد بازاری (Slump) اور اُن کے کاروبار کے تعطّل کا باعث بنتی ہیں؟ یقیناً اُن کی طرف سے کوئی خلا ضرور ہے جسے پُر کرنے کے لئے مزدور اور اجیر اپنے قانونی اور قدرتی حقوق کو بزورِ بازو حاصل کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں جنہیں آجر اُنہیں خوشدلی اور رضامندی سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہی صورتِ حال بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی

افراتفری اور بے چینی کی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فانی انسان کے اطوار کے گھٹیا پن اور اُس کی بداخلاقی کا ردِّعمل یقیناً اُس کی جسمانی فلاح و بہبود اور مادّی خوشحالی پر پڑتا ہے۔ قرآن مجید نے صدیوں پہلے ایسی بیماریوں کی نہ صرف تشخیص کر دی تھی بلکہ اُس کا علاج بھی تجویز کر دیا تھا۔ چنانچہ سورۂ الرّوم میں فرمایا گیا :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (ألرُّوم : ۴۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے بلائیں پھوٹ پڑی ہیں اس غرض سے کہ اللہ اُنہیں اُن کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے تاکہ وہ لوگ باز آ جائیں۔'' (۴۱ : ۳۰)

آیتِ بالا کے ترجمہ کا خط کشیدہ حصّہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے کہ حضرتِ انسان کو اُن خاردار جھاڑیوں کی چبھن کو محسوس کرنا چاہئے جن سے اُس نے اپنی بہ لحاظِ دیگر ہموار زندگی کو پُر کر لیا ہے اور یہ کہ اُسے اپنے ابنائے جنس اور خالقِ حقیقی کے خلاف کی گئی زیادتیوں اور گناہوں کے مہیب نتائج کا مزہ چکھنا چاہئے تاکہ وہ اصلاحِ احوال کر لے اور بازارِ حیات کے بند ہونے کی آخری گھنٹی بجنے سے پہلے اُن گناہوں سے تائب ہو جائے۔

قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دستِ تخلیق نے انسان کو معصوم اور بے خطا بنایا ہے جو فطری طور پر نیکی اور اچھائی کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ سورۂ الرّوم میں فرمایا گیا :

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (ألرُّوم : ۳۰)

''دینِ (حق) کی طرف اپنا رُخ رکھو' اللہ کی اُس فطرت کا اتباع کرو جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے' اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے' سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (۳۰:۳۰)

فطرت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص میں اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سُن کر سمجھنا چاہے تو وہ سمجھ میں آ جاتا ہے اور اُس کے اِتّباع کا مطلب یہ ہے کہ اُس استعداد اور قابلیت سے وہ صحیح کام لے۔ اِس میں یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ دینِ اسلام تو عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور فطرتِ بشری میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں' اس لئے اس دین میں بھی کسی قسم کی ترمیم کی خواہش کرنا سرتا سر بے عقلی اور نادانی ہے۔

چونکہ یہ دین عقلِ سلیم سے کلیۃً ہم آہنگ اور فہمِ صحیح کے عین مطابق ہے اسی لئے فطری طور پر انسان نہ اس سے منہ موڑ سکتا ہے اور نہ اس کا انکار کر سکتا ہے۔ نیز انسانی فطرت کے جتنے تقاضے ہیں خواہ وہ جنسی ہوں' معاشی ہوں' اخلاقی ہوں' عقلی ہوں یا رُوحانی۔ یہ دین ہر قسم کے تقاضوں کو صحت مندانہ انداز میں پورا کرتا ہے جس کے باعث زندگی کا دامن سچی مسرتوں کے پھولوں سے بھر جاتا ہے اور ابدی سعادت کا تاج اُس کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے۔ نیز

اللہ تعالیٰ کی زمین پر اُس کی خلافت کے منصبِ جلیلہ کی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو صلاحیتیں اور استعدادیں اُسے ودیعت کی گئی ہیں' اُن کی صحیح نشو ونما کا اہتمام صرف یہی دین کرتا ہے۔امام بخاری اور امام مسلم نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے اس مفہوم کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ أَوْيُنَصِّرَانِهٖ أَوْيُمَجِّسَانِهٖ كَمَثَلِ الْبَهِيْمَةِ تُنْتِجُ الْبَهِيْمَةَ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟ (صحیح بخاری' جلد ا' ص ۱۸۵)

''ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے' تو اُس کے والدین اُسے یا تو یہودی بنا دیتے ہیں' یا عیسائی یا مجوسی (آتش پرست) بنا دیتے ہیں جس طرح جانور کا بچہ صحیح الاعضاء پیدا ہوتا ہے۔بعد میں اُس کے کان وغیرہ کاٹے جاتے ہیں۔''

اِسی قسم کی روایت جناب جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (مسند امام احمد) ''ہر پیدا ہونے والا بچہ صراطِ مستقیم (فطرت) پر پیدا ہوتا ہے۔''

''اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اُس نے اپنا بندہ بنا کر پیدا فرمایا ہے۔تم لاکھ چاہو کہ اُس کی بندگی سے نکل جاؤ' ناممکن ہے۔تم لاکھ چاہو کہ اُس کے علاوہ کسی اور کو اپنا خدا اور کارساز بنالو' قطعاً محال ہے۔آیت کا یہ مفہوم بھی بتایا گیا ہے کہ دینِ اسلام نے ہمیں جو نظامِ حیات دیا ہے' وہ ہماری فطرت کے عین مطابق ہے۔اگر کوئی چاہے کہ اِس نظامِ فطرت کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظامِ حیات تجویز کرلو جو اسلام کی طرح تمہاری فطرت کے عین مطابق ہو تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

انسان کی صحیح فطرت غلط ماحول' نامناسب طرزِ تعلیم' خودغرض مقاصد' سماجی رسوم ورواج اور توہمات کی وجہ سے گہنا جاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے اعلیٰ مقام کو بھول جاتا ہے' اُس غلط اور باطل چیز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتا ہے جس سے اُس کے خالق نے اُسے روکا ہے اور ایسے طریقوں اور ذرائع کو اپناتا ہے جو اُسے انسانیت سے درندگی کی طرف لے جاتے ہیں اور اپنے اَبنائے جنس کے حقوق کو غصب کرنا سکھاتے ہیں۔غرضیکہ صحیح رویّہ ہر انسانی فطرت کا غالب عنصر ہوتا ہے اور اسی کو قرآن مجید نے سورۃ الروم کی آیت ۳۰ میں اَلدِّیْنُ الْقَیِّمُ کہا ہے۔ اَلْقَیِّم مبالغہ کا صیغہ ہے بمعنیٰ ایسا سیدھا راستہ جس میں ذرا کجی نہیں اور ایسا صحیح جس میں غلطی کا ادنیٰ احتمال تک نہیں۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ امنِ عالم کی ضمانت تبھی دی جاسکتی ہے جب ہر فرد' ہر قوم اور ہر حکومت کو اپنی فطرتِ سلیمہ کا پاس رہے اور وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر دونوں طرح دوسروں کے حقوق کی پاسداری کریں کیونکہ ''حقوق کا حصول فرائض کی بجا آوری کے بعد ہی شروع ہوتا ہے''۔

خدا شاہد کہ ہم سے گردشِ دوراں بھی گھبرائی
عمل جب تک کیا ہم نے محمد کی شریعت پر

(۴۱) اسلام کا قانونِ شہادت (Evidence Law in Islam)

صحیح فیصلے پر پہنچنے کے لئے اسلام نے ہمیں واضح اور صاف ستھرا قانونِ شہادت عطا کیا ہے۔ اس قانون کا بڑا مقصد معاشرہ میں عدل و انصاف کا قائم کرنا ہے کہ مجرم کو اپنے کئے کی سزا ضرور مل جائے اور ایک بے گناہ شخص مستوجبِ سزا نہ ہو۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے فرمان کے بموجب کہ ہر شخص پیدائشی طور پر معصوم پیدا ہوا ہے (جس کا ذکر گزشتہ صفحہ ۱۲۷۶ پر ہو چکا ہے) صرف نتیجہ خیز، حتمی اور قابلِ قبول شہادت ہی صحیح فیصلہ تک رہنمائی کر سکتی ہے۔

__گواہی کی تعریف__: گواہی کے لئے عربی لفظ شَھادۃ ہے جس کا لغوی معنی حاضر ہونا اور موجود ہونا ہے۔ اور اس لحاظ سے گواہی کا معنیٰ ہوگا ایسی چیز جسے آنکھوں نے جیتے جاگتے دیکھا ہو جو کسی چیز پر یقین کرنے اور اُسے ثابت کرنے کے لئے ٹھوس اور مضبوط وجہ مہیا کرتی ہو۔

قانون کی اصطلاح میں شَھادۃ کا معنیٰ عدالت کے سامنے اُس چیز کی صحیح معلومات دینا ہے جو کچھ دیکھا یا معلوم کیا گیا ہے جس کا مقصد کسی حق یا جرم کو ثابت کرنا یا رَدّ کرنا ہو۔ .... "Islamic Law of Evidence")
Dr. Anwarullah, p. 4)

__اسلام میں عدل و انصاف کی اہمیت__: عدل و انصاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت ہے اور انصاف کی خاطر جسے رہنا اللہ کے آگے گواہ ہونا ہے اگرچہ وہ ہمارے یا ہمارے اعزّہ و اقرباء کے مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام کا عدل و انصاف رومن لا یا کسی اور انسانی قانون کے رسمی عدل و انصاف سے بالاتر ہے۔ اِس قانون کے تحت ہمیں اس طرح کام کرنا ہے گویا ہم اللہ کے حضور حاضر ہیں جسے تمام چیزوں، ہمارے اعمال و اَغراض کا بخوبی علم ہے۔

__اسلام میں شہادت کی اہمیت__: دُنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو اور کوئی حاکم عادل سے عادل سہی، بہر حال دُنیاوی فیصلے علمِ غیب کی بنا پر نہیں، روئدادِ مقدمہ ہی کی بنا پر صادر ہوتے ہیں۔ مجسٹریٹ، جج یا قاضی کتنا ہی ایماندار اور نیک نیت کیوں نہ ہو، انصاف پر مبنی صحیح فیصلہ تبھی صادر کر سکتا ہے اگر اُس کے سامنے دی گئی شہادت دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ ہو اور کسی مخصوص مفاد پر مبنی نہ ہو۔ وہ سچی اور حقیقت پر مبنی شہادت کے ذریعے ہی بے خطا نتیجے پر پہنچ کر منصفانہ فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔ اِسی لئے اسلام نے گواہی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۷۲ بتاتی ہے کہ اللہ کے نیک اور وفادار بندوں کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ دھوکہ دہی یا جھوٹ کے معاملہ میں مددگار نہیں ہوتے۔ سورۃ النّساء اور سورۃ المائدۃ میں مؤمنین کو علی الترتیب یہ حکم دیا گیا ہے:

(۱) يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗا اَوْتُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا o (اَلنِّساء : ۱۳۵)

''مؤمنو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بن جاؤ' چاہے وہ تمہاری اپنی ذات یا والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی ہو۔ (فریقِ معاملہ) اگر امیر ہو یا مفلس اللہ (بہر حال) دونوں سے زیادہ حق دار ہے' تو خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کجی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔'' (۴:۱۳۵)

(۲) يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَاَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اَلمائدة : ۸)

''مؤمنو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ گواہی دینے والے بنو اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اُس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۸ : ۵)

جو لوگ اپنی چرب زبانی' سخن سازی' اپنے ''اثر'' و ''پیروی'' سے جھوٹے مقدمے جیت جائیں' اُنہیں اور زیادہ ڈرنا چاہئے کہ اُن پر دوسرے جرائم کے علاوہ فریقِ ثانی کی حق تلفی کے ایک مزید جرم یعنی حاکمِ عدالت کو فریب میں مبتلا کرنے کا بھی عائد ہوگا۔ لہٰذا ادائے شہادت میں قرآن اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ شہادت واقعہ کے بالکل مطابق ہو اور شاہد (گواہی دینے والے) کے ذاتی رُجحانات کا اُس میں دخل نہ آنے پائے۔ ذاتی رُجحانات کو دخل دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدم راہِ حق سے بھٹک جاتا ہے (بحوالہ سورۃ النساء' آیت ۱۳۵)۔ ادائے شہادت کو بھی ہر بدعنوانی سے روکنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ اللہ تعالیٰ کی ہمہ بینی اور ہمہ دانی (Omnipresence, Omniscience) پر کامل ایمان کا ہونا ہے۔ جتنا یہ عقیدہ قوی' زندہ اور تازہ ہوگا' اُسی قدر نفسِ انسانی پر سخت پہرہ قائم رہے گا۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۸ میں حکم ہوا کہ اپنی دولت کو حکام تک پہنچنے کا' اپنی رسائی اور رسوخ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ اور رشوت اور مالی تحفہ وتحائف سے حکام پر اثر نہ ڈالو:۔

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o (البقرة : ۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اُڑاؤ اور نہ اُسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصّہ تم گناہ سے کھا جاؤ درآنحالیکہ تم جان رہے ہو۔'' (۱۸۸ : ۲)

اسلامی حکومت قائم ہونا اور اسلام کے سارے قانونِ دیوانی اور فوجداری کا نافذ ہونا تو خیر بڑی چیز ہے' قرآن مجید کی اسی ایک آیت پر اگر آج عملدرآمد ہو جائے تو جھوٹے دعوں' جعلی کاغذات' جھوٹی گواہیوں' جھوٹے حلف ناموں' اہلکاروں اور عہدہ داروں کی رشوتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام کی خدمت میں نذر' نذرانوں' قیمتی ڈالیوں اور

شاندار و پُر تکلف دعوتوں کا وجود کہاں باقی رہے گا؟ بالْاِثم گناہ کا لفظ عام ہے۔ ہر قسم کی معصیتیں جو عدالتی کارروائیوں اور انتظامی معاملات کے سلسلہ میں کام میں لائی جاتی ہیں، اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔

مقدمہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں: دعویٰ، جوابِ دعویٰ، گواہی اور حاکم کا فیصلہ۔ ان سب میں گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اسی پر دعویٰ کی پختگی ہوتی ہے، اُسی پر حاکم کا فیصلہ موقوف ہوتا ہے اور فریقین کی جرح گواہوں پر ہی ہوتی ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۶ میں دعویٰ یا جوابِ دعویٰ یا فیصلے کے لئے کوئی پابندی نہیں لگائی گئی، لیکن گواہوں پر پابندیاں لگائی گئیں کہ اُنہیں کھڑا کرو اور نماز (عصر) کے بعد گواہی لو۔

شہادت (گواہی) کا چھپانا بڑے گناہ کا موجب ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اس کی ممانعت کی گئی ہے :۔

(۱) وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا (ألبقرة : ۲۸۲)

''اور گواہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں۔'' (۲۸۲ : ۲)

(۲) وَلَاتَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗٓ آثِمٌ ''قَلْبُهٗ' (ألبقرة : ۲۸۳)

''اور گواہی کو مت چھپایا کرو اور جو کوئی اُسے چھپائے گا، اُس کا دل گنہگار ہوگا۔'' (۲۸۳ : ۲)

''شہادت چھپانے کی ساری صورتیں اس ممانعت کے اندر آجاتی ہیں مثلاً گواہی دینے سے گریز کرنا یا گواہی میں واقعات صحیح بیان نہ کرنا یا فریقِ معاملہ سے مالی مفاد کا مطالبہ کرنا وغیرہ۔ ادائے شہادت چونکہ واجب ہے اس لئے فقہاء نے اس پر اجرت لینا ناجائز قرار دیا ہے البتہ آمد و رفت اور خوراک پر جو کچھ خرچ ہو، اُس کا بہ قدرِ واقعی وصول کرنا بالکل جائز ہے۔'' (ماجدی اردو، صفحہ ۱۲۰، نوٹ: ۱۱۰۸)

نبی اکرم ﷺ نے مدعی کے لئے لازم قرار دیا کہ وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں ثبوت پیش کرے اور فرمایا:

أَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَا أَنْكَرَ (اربعین نووی)

''ثبوت مہیا کرنا مدعی کا کام ہے اور قسم اٹھانا اُس شخص کے ذمہ ہے جو انکاری ہو۔''

شہادت اُن واقعات کے حوالہ سے بالکل واضح اور غیر مبہم ہو جن کی گواہی دی جا رہی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم سورج کے ظاہر ہونے کی طرح کسی چیز کو دیکھو تو اُس کی گواہی دو، ورنہ نہیں۔'' (السنن الکبریٰ للبیھقی، ج ۷، ص ۱۳۲ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ)

<u>حدّ، تعزیر اور قصاص</u>: ''حدّ'' کسی جرم کی وہ سزا ہے جسے قرآن مجید یا سنتِ نبوی نے متعین کر دیا ہو جیسے چوری، قتلِ ناحق، ڈاکہ اور زنا وغیرہ۔ ''تعزیر'' میں اُن جرائم کی سزائیں شامل ہیں جو ''حدّ'' کی مد میں نہیں آتیں اور قرآن یا حدیث نے اُنہیں متعین نہیں کیا بلکہ اُنہیں قاضی اور عدالت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ ''قِصاص'' کا مطلب مجرم کو وہی برابر کی سزا دینا ہے جو اُس نے مقتول کو پہنچائی ہے (یعنی جان کے بدلے میں جان) اس کا تعلق قتل کرنے اور زخمی کرنے سے ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق جرم یا حق مندرجہ ذیل ذرائع سے ثابت کیا جاتا ہے :
(۱) شہادت
(۲) فوجداری مقدمات میں اعتراف(Confession)اور دیوانی کے مقدمات میں اقرار (Admission)
(۳) واقعاتی شہادت (Circumstantial Evidence)
(۴) کسی ماہر کی شہادت
(۵) قسم اور
(۶) قاضی رجج رمجسٹریٹ کا علم وغیرہ (بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۳)

(الف) گواہ کی شرائط

(۱) **گواہ بالغ و عاقل ہو** : اس نکتے پر تمام مکاتبِ فقہ متفق ہیں اور اس کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا:
''تین قسم کے لوگ ہر قسم کی ذمہ داری کے بارے مستثنیٰ ہیں :(i) نابالغ جب تک وہ بالغ نہیں ہو جاتا۔ (ii) مجنون اور دیوانہ جب تک وہ صحتمند نہیں ہو جاتا۔ (iii) سویا ہوا شخص جب تک وہ جاگ نہیں پڑتا۔(المغنی لابن قدامہ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ صفحہ ۶)

(۲) **گواہ کو عادل ہونا چاہئے** : ''عادل'' سے مراد وہ شخص ہے جسے معاشرہ میں با اعتماد مقام حاصل ہو اور وہ بدنام نہ ہو۔

(۳) **گواہ مسلمان ہونا چاہئے** : امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غیر مسلم کی گواہی مسلمان کے حق میں اور اُس کے خلاف اور اسی طرح غیر مسلم کی گواہی غیر مسلم کے حق میں اور اس کے خلاف دی جاسکتی ہے۔اُن کی اس رائے کی بنیاد اس استدلال پر ہے کہ اگر چہ غیر مسلم مسلمانوں کے لئے عادل نہیں ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے لئے قابلِ اعتماد تو ہیں۔علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ نے عیسائیوں کی گواہیوں کو اُن کے باہمی معاملات میں قبول فرمایا۔(''منہاج الطالبین ''لامام النووی' ص ۱۴۱)

''غیر مسلم کی گواہی مسلمان کے حق میں اور اس کے خلاف 'حدود' کے علاوہ کے مقدمات میں قبول کی جاسکتی ہے کیونکہ قرآن مجید کی کوئی واضح آیت یا نبی علیہ السلام کی ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں غیر مسلم کی شہادت کے قبول کرنے سے روکا گیا ہو۔اس کے برعکس سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۶ کے مطابق سفر کے دوران مرنے والے مسلمان کے حق میں دو غیر مسلموں کی شہادت اُس کی وصیت کے معاملہ میں قابلِ قبول ہے' اگر مسلمان گواہ میسر نہ آسکیں۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ صفحات ۶' ۷)

(۴) حدود اور قصاص میں گواہ میں دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدود اور قصاص میں نابینا اور گونگے' بہرے کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۵) ''عداوت اور دشمنی : جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ گواہ اور فریقِ ثانی کے مابین دنیاوی معاملات میں دشمنی گواہی کو بے وقعت کر دیتی ہے۔ اگر گواہ عادل ہے تو حقوق اللہ کے معاملے میں یہ دشمنی گواہی کو بے وقعت نہیں بناتی اور اسی وجہ سے ایک مسلمان کی گواہی غیر مسلم کے حق میں یا اُس کے خلاف قابلِ قبول ہے۔''
(''التشریع الجنائع الاسلامی'' لعبدالقادر عودہ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۱۵)

اِس نظریہ کی بنیاد وہ حدیثِ مبارکہ ہے جسے عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور دادا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
''ایک فریب کار مرد یا عورت کی گواہی جائز نہیں ہے' اور نہ ہی اُس شخص کی گواہی جس کی اپنے بھائی سے دشمنی ہے۔''

نبی علیہ السلام نے ایک خاندان کے ملازم یا خادم کی اُن کے حق میں گواہی کو مسترد کر دیا۔ مجلّہ میں ہے:
''یہ شرط ہے کہ گواہ اور اُس شخص کے درمیان جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے' دنیوی معاملات میں دشمنی نہ ہو۔ دنیاوی قسم کی دشمنی کو رسم و رواج کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔'' (مجلّة الاحکام العدلیة' حصہ ۱۷۰۲ صفحات ۳۸' ۱۱۲' ۱۲۳ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ)

(۶) خونی رشتے : کچھ شافعی فقہاء کو چھوڑ کر فقہاء کی اکثریت اس نظریہ کی قائل ہے کہ خاندان کی چھوٹی بڑی شاخوں کے افراد کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی قابلِ قبول نہیں ہے اور اس کا ثبوت وہ حدیثِ مبارکہ ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا:
''فریب کار مرد اور فریب کار عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے' نہ ہی اُس کی گواہی جس پر حدِّ قذف لگائی جا چکی ہے اور نہ ہی اُس کی گواہی جس کی اپنے بھائی سے دشمنی ہے' نہ ہی اُس غلام کی جو اپنی آزادی کو کسی اور کی طرف منسوب کرتا ہے اور نہ کسی خاندان کے ملازم کی گواہی اُن کے حق میں قابلِ قبول ہے۔'' (مشکوۃ المصابیح لولی الدین العمری بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' ص ۱۳)

امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد کے قول کے مطابق میاں بیوی کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں یا ایک دوسرے کے خلاف قابلِ قبول نہیں ہے لیکن امام شافعی کے نزدیک وہ قابلِ قبول ہے۔ (المُغنی لابن قُدامہ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۱۵)

اسی طرح اُس شخص کی گواہی اُس شخص کے حق میں جس کے ٹکڑوں پر وہ پل رہا ہے' اور ملازم کی گواہی

اجیر کے حق میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اسی طرح کاروبار اور جائداد میں شراکتی حصّہ داروں کی گواہی بھی ایک دوسرے کے حق میں قابلِ قبول نہیں اور نہ ہی اُس ضامن کی گواہی جس نے کسی چیز کی ضمانت دے رکھی ہو' اصولی طور پر قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔ ہاں دوسرے معاملات میں اُن کی ایک دوسرے کی جانب سے گواہی قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔ آقا کی غلام کے حق میں یا اُس کے خلاف اور اسی طرح غلام کی گواہی آقا کے حق میں اور اُس کے خلاف' ایک ایجنٹ کی گواہی اُس کے مؤکل کے حق میں اور دوست کی گواہی دوست کے حق میں وغیرہ وغیرہ سب کے سب نا قابلِ قبول ہیں۔ (مجلّة الاحکام العدلية' حصّہ ۱۷۰۰ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۱۷)

''عورت کی گواہی: جمہور فقہاء بشمول امام مالک' امام ابوحنیفہ' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک حدود اور قصاص میں گواہ مرد ہونا چاہئے یعنی حدود اور قصاص میں عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ حدود اور قصاص کے علاوہ دو عورتوں + ایک مرد کی گواہی قابلِ قبول ہے۔ صرف اُن معاملات میں جن کا علم بالعموم عورتوں کو ہوتا ہے جیسے بکارت اور دوشیزگی' حیض اور رضاعت وغیرہ' صرف عورتوں کی گواہی قابلِ قبول ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اِن معاملات میں صرف ایک عورت کی گواہی کافی ہوتی ہے اور امام شافعی کے نزدیک اِن معاملات میں چار عورتوں کی گواہی ضروری ہوتی ہے۔'' (اَلطُّرُقُ الحُکمیّة لابن القیّم ص ص ۱۵۵'۱۵۴)

''یہاں اِس بات کا ذکر کرنا اہم ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ نبوی میں ایسا کوئی واضح یا بالواسطہ متن نہیں ہے جو عورت کی گواہی کے قابلِ قبول ہونے سے روکتا ہو۔ کچھ مالی لین دین کی دستاویز کے علاوہ مرد اور عورت کی گواہی میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ اس طرح عورت کی گواہی تمام معاملات میں بنیادی طور پر قابلِ قبول ہے' اگر اُس کی گواہی بدونِ صورت مرد کی گواہی کی طرح قابلِ اعتبار ہو۔ جہاں تک کچھ مالی معاملات کی تحریر کے معاملے میں دو عورتوں کی گواہی کا ایک مرد کے مساوی ہونے کا تعلق ہے جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں ہوا' تو یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس صورت میں بھی گواہ صرف ایک ہی عورت ہے جبکہ دوسری عورت نے اُسے یاد دلانا ہے اگر پہلی عورت کوئی غلطی کرتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عورتوں کے ایک وفد سے فرمایا تھا کہ کیا ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کی گواہی کے برابر نہیں ہے؟ تو اُن عورتوں نے ہاں میں جواب دیا تھا۔''

''اس طرح عورتوں کی گواہی کا قابلِ قبول نہ ہونا زیادہ سے زیادہ ''حدود'' کے جرائم تک محدود ہے لیکن تعزیرات اور دوسرے معاملات میں عورتوں کی گواہی قابلِ قبول ہے اور عدالت کو یہ اختیار ہے کہ اگر قاضی اور جج مطمئن ہو جاتا ہے تو وہ ایک ہی عورت کی گواہی پر سزا دے سکتا ہے بشرطیکہ اُس گواہی کی توثیق ہو جائے۔ عدالت کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر دیوانی' مالی اور ذاتی معاملات میں شہادت کی متعین مقدار مہیا نہیں ہوسکی تو وہ کسی بھی معلوم شدہ شہادت کی بنیاد پر فیصلہ صادر کرسکتی ہے جو اُس کی رائے میں دعویٰ کے ثبوت کے لئے قابلِ اعتبار اور کافی ہو۔''

لِعان کے معاملات میں سورۃ النور میں مرد کی گواہی کو عورت کی گواہی کے مساوی قرار دیا گیا ہے' فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ٥ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ٥ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ٥ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ٥ (اَلنُّور : ۶ تا ۹)

''اور جو لوگ اپنی بیویوں کو تہمت لگائیں اور اُن کے پاس سوائے اپنے (اور) کوئی گواہ نہ ہو تو اُن کی گواہی یہ ہے کہ وہ (مرد) چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ میں سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں۔ اور عورت سے سزا اِس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم چار بار کھا کر کہے کہ بے شک مرد جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر مرد سچا ہے۔'' (۶۔۹:۲۴)

''اِس بیانِ حلفی کا نام اصطلاحِ شریعت میں ''لِعان'' ہے اور اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ بدکاری کے ثبوت کا تو قاعدہ وہی چار گواہوں کی چشم دید شہادت کا ہے لیکن جب شوہر بیوی کے متعلق یہ دعویٰ کرے اور چار چشم دید گواہ پیش نہ کر سکے تو خود اُس کی یہ پانچ بار کی حلفی شہادت چار گواہوں کے قائم مقام ہوگی' اور بیوی پر حدِّ زنا جاری کر دی جائے گی۔ اسی طرح اگر عورت بھی پانچ بار حلفی شہادت مرد کے جھوٹا ہونے کے بارے میں دے تو حدِّ زنا سے تو بچ جائے گی البتہ اُس مرد پر حرام ہو جائے گی۔ قاضی اُن دونوں کے درمیان تفریق کرا دے گا اور پھر تجدید نکاح بھی نہ ہو سکے گی جب تک دونوں میں سے ایک اپنی خطا کا قائل اور دوسرے کو سچا ماننے والا نہ ہو جائے۔ (ماجدی اردو' ص ۷۱۲)

<u>زنا بالجبر کا ثبوت</u>: کچھ فقہاء کے نزدیک اگر عورت سے زنا بالجبر اُسے اغوا کر کے یا کسی اور طریقے سے کیا گیا تو مجرم کے خلاف صرف عورت کی گواہی ثبوتِ جرم کے لئے کافی ہوگی اور مرد کو حدِّ زنا کی سزا یا کوئی اور سخت سزا دی جائے گی لیکن عورت کو سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اِس سلسلہ میں حدیث کے الفاظ لَيْسَ عَلَى الْمُسْتَكْرَهِ حَدّ'' (مجبور پر کوئی حد نہیں ہے) بالکل واضح ہیں۔ (جامع ترمذی' ج ۱' ص ۱۷۵؛ مؤطا امام مالک ج ۳' ص ۱۴۴) تاہم عورت کی اس شہادت کی توثیق دوسرے قرائن سے بھی ہوگی ورنہ ملزم کو 'حد' کی سزا نہیں دی جائے گی۔

<u>زنا کا غلط الزام</u>: تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اُس شخص کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص پر زنا کا الزام لگائے اور اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کرے جس کی وجہ سے اُسے حدِّ قذف کی سزا دی جا چکی ہو۔ اس قانون کی بنیاد سورۃ النُّور کی یہ آیات ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ٥ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ أَصْلَحُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ٥ (اَلنُّور : ۴' ۵)

''جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ نہ لا سکیں تو اُنہیں اَسّی دِرّے لگاؤ اور کبھی اُن کی

گواہی قبول نہ کرو' یہی لوگ تو فاسق ہیں۔ہاں البتہ جولوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اوراپنی اصلاح کرلیں تو اللہ بڑا ہی مغفرت کرنے والا' بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔''

''اللہ اللہ اللہ! اللہ تعالیٰ کومسلمان مرد اور مسلمان عورت کی عزت کے تحفظ کا کس درجہ اہتمام ہے! گواہ ایک نہیں' دو بھی نہیں' اکٹھے چار چار گواہ اور وہ بھی چشم دید ہونے چاہئیں۔اگر اِس تعداد میں ایک کی بھی کمی رہ جائے تو حد جاری نہ ہو سکے گی اور جب چار چشم دید گواہ موجود نہیں تو بھی حد جاری نہ ہو سکے گی۔ یہ چاروں گواہ مرد ہونے چاہئیں۔ اس حد کو اصطلاح میں ''قذف'' کہتے ہیں اور اس کا اجراء مقذوف کے مطالبہ پر ہی ہو سکے گا۔ اگر مقذوف معاف کردے تو یہ ساقط بھی ہوسکتی ہے۔تَابُوْا بمعنی اللہ کے حضور میں توبہ کرلیں۔ أَصْلَحُوْا یعنی جس پر تہمت لگائی گئی تھی' اُس سے اپنا قصور معاف کرالیں۔فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرائے حدّ قذف توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔''

''فقہاء میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ توبہ کرنے کے بعد آیا اُس شخص کی شہادت قابلِ قبول ہوگی یا نہیں۔ایک فریق کا کہنا ہے کہ اگر وہ شخص توبہ کرنے کے بعد اصلاحِ احوال کرلے تو وہ اللہ کے نزدیک گنہ گار نہیں رہے گا لیکن اوّل الذکر دو حکم قائم رہیں گے یعنی حد تو اُس پر جاری ہوگی اور مستقبل میں اُس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔''

''دوسرے فریق کا یہ کہنا ہے کہ ارشادِ ربانی اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا (سوائے اُن کے جنہوں نے توبہ کی) کا تعلق اوّل الذکر حکم سے نہیں ہے بلکہ مؤخر الذکر دو سے ہے یعنی توبہ کرنے کے بعد اُس مجرم کی گواہی نہ صرف قبول کی جائے گی بلکہ وہ گنہگار بھی شمار نہ ہوگا۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ' ص ص ۱۹' ۲۰)

''اس معاملہ میں دراصل پہلا فریق اپنے موقف میں زیادہ مضبوط ہے کہ اس استثناء کا تعلق کوڑے مارنے کی سزا سے نہیں ہے یعنی اگر کسی شخص نے تہمت لگانے کے بعد اُس تہمت سے رجوع کر کے توبہ کرلی اور یہ کہا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا تو پھر بھی اُسے اَسّی (۸۰) کوڑے مارے جائیں گے۔ کیونکہ توبہ نام ہے قلبی شرمندگی و عقلی احساسِ غلطی کا اور آئندہ کے لئے ارادۂ اصلاح کرنے کا لیکن یہ چیز مخفی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ آیا اُس شخص نے خلوصِ دل کے ساتھ سچی توبہ کی ہے یا نہیں۔حکومت' عدالت وعوام کو اُس کا نہ کوئی علم ہے اور نہ یقین۔ جبکہ گواہی کا تعلق عدالت وعوام سے ہے اور شریعتِ ظاہری علم وثبوت پر جاری ہوتی ہے' اسی لئے سچی توبہ سے صرف اُخروی سزائیں معاف ہوتی ہیں نہ کہ دنیاوی شرعی۔

دوسری وجہ یہ بھی کہ جھوٹا صرف وہی نہیں جو بلا کچھ دیکھے بناوٹی تہمت لگادے بلکہ وہ بھی جھوٹا ہے جو عدالت میں اپنی تہمت کو ثابت نہ کر سکے اگرچہ تہمت میں فی الواقع سچا ہو۔ کیونکہ تہمت لگانا مثلِ گندگی ہے' اُسے دُور کرنا ہی بہتر ہے نہ کہ پھیلانا اور جو شخص تہمت کو ثابت نہ کر سکے مگر بیان کرتا پھرے تو وہ گندگی پھیلانے' اُچھالنے کا مجرم ہے

اس لئے ایسے مجرم کی گواہی آئندہ کے لئے ہر مقدمے میں تاعمر بند کر دی گئی تاکہ تشہیری فتنے کا دروازہ بند ہو۔ نیز کوئی مدعی علیہ یا مقذوف علیہ کبھی بھی پسند نہیں کرتا کہ اُس کے خلاف ایسے جھوٹے کی گواہی سنی جائے جو پہلے جھوٹ کا سزا یافتہ ہو۔''

''تیسری وجہ یہ کہ فقہ کا کلی قانون ہے کہ جب چند معطوف جملوں کے بعد اِلَّا سے استثنا کیا جائے تو استثنا کا تعلق صرف اُس آخری جملے سے ہوگا جو اِلَّا سے متصل ہو یا پھر کوئی قرینہ یا وجہ ہو جو استثنا کو سابقہ تمام معطوفی جملوں سے جوڑ دے۔ یہاں آیت ۴ میں تین معطوفی جملے ہیں (اَسّی کوڑے لگانا' شہادت کی عدمِ قبولیت اور ایسے مجرم کا فاسق ہونا) اور اگلی آیت ۵ میں اِلَّا الَّذِیْنَ سے استثنا کیا گیا تو چونکہ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے جو تینوں کو یا دو کو اِلَّا سے جوڑ دے اس لئے آخری جملہ ہی مستثنیٰ ہوگا یعنی توبہ سے جھوٹے قاذف کی صرف فاسقیت ختم ہوگی۔''

''چوتھی وجہ یہ کہ پہلے دو جملے قانونِ شرعی اور اسلامی حکم ہیں۔ پہلا فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً اَمر اور دوسرا وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا نہی ہے۔ مگر تیسرا جملہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ قانون نہیں بلکہ خبر (Predicate) ہے' اس لئے یہ تیسرا جملہ پہلے دو سے حکماً مختلف اور جدا ہو گیا۔ اِلَّا کا تقاضا ہے کہ ماقبل سے مل کر پورا ہو اور یہ تقاضا تیسرے جملے کے ملنے سے پورا ہو گیا۔'' (تفسیر نعیمی' ج ۱۸' ص ۴۶۷)

''اگر ایک غیر مسلم جو بحالتِ کفر حدِّ قذف کی سزا پا چکا ہے' بعد میں مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ مقبول الشہادۃ ہوگا اگرچہ مذکورہ سزا پانے کی وجہ سے وہ اپنے ہم مذہبوں کے حق میں گواہی دینے کے مقام کو کھو چکا تھا لیکن اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اُسے مسلمانوں کے حق میں گواہی دینے کی اہلیتِ تازہ حاصل ہوگئی۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ' ص ۲۱)

نصابِ شہادت : قرآن مجید نے کچھ مالی معاملات' زنا' وصیت اور طلاق کے ثبوت کے لئے گواہوں کی تعداد مقرر کی ہے جن کی متعلقہ آیات حسب ذیل ہیں :

(i) **روزمرّہ کے مالی معاملات**: کے بارے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں حکم ہوا کہ جب کسی مدتِ معینہ تک اُدھار کا معاملہ کرنے لگو تو اُسے لکھ لیا کرو۔۔۔ اور اپنے مَردوں میں سے دو کو گواہ کر لیا کرو' اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں اُن گواہوں میں سے ہوں جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ اگر اُن میں سے ایک بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے۔

(ii) **زنا کے بارے میں نصابِ شہادت** :

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآءِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (النساء : ۱۵)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کی مرتکب ہوں تو اُن پر اپنوں میں سے چار (آدمی) گواہ کر لو۔''
(۴ : ۱۵)

(iii) وصیّت : يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَوٰةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللّٰهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ۝ (اَلْمَائِدَة : ۱۰۶)

''مؤمنو! جب تم میں سے کسی کو وصیّت کرتے وقت موت آ جائے تو تمہاری آپس میں گواہی یہ ہے کہ تم میں سے دو معتبر شخص ہوں یا غیروں میں سے دو ہوں اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو اور تم پر موت کا واقعہ آ پہنچے تو اگر تمہیں شبہ ہو جائے تو دونوں (گواہوں) کو بعد نماز روک رکھو اور وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس کے عوض کوئی نفع نہیں لینا چاہتے خواہ کسی قرابتدار ہی کے لئے ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی چھپائیں گے ورنہ بے شک ہم گنہگار رہوں گے۔'' (۱۰۶ : ۵)

موت کی مصیبت آنے سے مراد ہے' علاماتِ موت کا ظاہر ہونا یعنی اگر تم سفر میں ہو اور وہاں تمہیں موت آنے لگے اور تم وصیت کرنا چاہو اور وہاں تمہارے عزیز و اقرباء موجود نہ ہوں تو وہ اجنبی لوگ جو وہاں میسر ہوں' اُنہیں گواہ بنا لو۔ یعنی اگر حالتِ سفر وغیرہ میں مسلمان اور عادل اوصیاء نہ مل سکیں تو غیر مسلم گواہ بھی جائز ہیں۔ تَحْبِسُوْنَ کے لفظ میں چند نکات بتا دئے کہ (۱) حکام گواہوں کے گھر نہ جائیں بلکہ گواہ حاکم کے پاس آئیں۔ (۲) گواہ حاکم کے پابند ہیں' حاکم گواہ کا پابند نہیں۔ (۳) گواہ حاکم کے سامنے کھڑا ہو' نہ کہ حاکم گواہ کے آگے۔

عدالتی معاملات میں گواہی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ مقدمہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں: دعویٰ' جوابِ دعویٰ' گواہی اور حاکم کا فیصلہ۔ ان سب میں گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اسی پر دعویٰ کی پختگی ہوتی ہے' اُسی پر حاکم کا فیصلہ موقوف ہوتا ہے اور فریقین کی جرح گواہوں پر ہی ہوتی ہے۔ سورۃ المائدۃ درج بالا آیت میں دعویٰ یا جوابِ دعویٰ یا فیصلے کے لئے کوئی پابندی نہیں لگائی گئی' لیکن گواہوں پر پابندیاں لگائی گئیں کہ اُنہیں کھڑا کرو اور نماز کے بعد گواہی لو۔ نماز سے مراد نمازِ عصر ہے کہ اُس وقت لوگوں کا اجتماع زیادہ ہوتا ہے' نیز اُس وقت دن اور رات کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ اللہ کے مقبول بندوں کی موجودگی وقت اور جگہ کو مقبول بنا دیتی ہے۔ مسلمان خصوصاً اہلِ عرب اِس وقت کا بہت احترام کرتے ہیں اور اِس وقت جھوٹی قسموں سے بہت ڈرتے ہیں' اس لئے یہ وقت گواہی لینے کے لئے مقرر کیا گیا۔ مگر یہ قسم اُس وقت ہے جب تمہیں شک ہو کہ یہ گواہ جھوٹ بول رہے ہیں یا انہوں نے میّت کا کچھ مال خورد برد کر دیا ہے۔ گواہ مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر سب کے سامنے گواہی دینے سے پہلے اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم سچی گواہی دیں گے۔ اگر ہم روپیہ پیسہ کے لالچ میں یا کسی عزیز کی قرابتداری کی رعایت کی وجہ سے قسم یا گواہی میں جھوٹ بولیں تو ہم سخت مجرم اور حق العباد مارنے والے ہو کر اپنے پر سخت ظلم کریں گے اور مجرموں کے زمرہ میں سے ہوں گے۔ (تفسیر نعیمی' جلد ہفتم' ص ۱۲۳)

(iv) قذف (تہمت لگانے کا) نصابِ شہادت:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً (اَلنُّور: ۴)

''جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو اُنہیں اَسّی دِرّے لگاؤ۔'' (۲۴:۴)

(v) طلاق کا نصابِ شہادت:

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ أَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّأَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَأَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (اَلطَّلَاق: ۵)

''پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو اُنہیں (یا تو) قاعدہ کے مطابق (نکاح میں) رہنے دو یا اُنہیں قاعدہ کے مطابق رہائی دے دو اور اپنے میں سے دو عادل (معتبر) شخصوں کو گواہ بنالو اور گواہی اللہ کے واسطے ٹھیک ٹھیک دو۔'' (۶۵ : ۵)

''دو عادل گواہوں کا یہ حکم استحبابی کیفیت کا ہے اور رجوع وجدائی دونوں صورتوں کے لئے ہے۔ اگر کسی نے گواہوں کے بغیر طلاق دے دی یا اُس نے گواہوں کے بغیر رجوع کرلیا تو وہ طلاق اور رجوع دونوں شرعاً معتبر ہوں گے البتہ گواہ بنانا افضل ہے اور جھگڑوں کے سدّ باب کے لئے مفید ہے۔ یہاں گواہ بنانے کا مقصد ویسا ہی ہے جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں وَأَشْهِدُوْا إِذَا تَبَايَعْتُمْ (جب تم خرید وفروخت کرو تو گواہ بنالیا کرو)۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر تم نے گواہوں کی عدم موجودگی میں خرید وفروخت کی تو وہ جائز نہ ہوگی بلکہ مقصد یہ ہے کہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم خرید وفروخت کے وقت گواہ بنالیا کرو تا کہ اگر کبھی کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔'' (ضیاء القرآن، جلد پنجم، صفحہ ۲۷۷)۔ شہادت بالکل سچی محض حق تعالیٰ کی رضامندی کے لئے ہو۔ کسی کی رُورعایت، کسی کی دوستی، دشمنی کو اس میں بالکل دخل نہ ہو۔ (ماجدی)

مندرجہ بالا معاملات کے علاوہ کسی اور معاملہ میں نصابِ شہادت مقرر نہیں کیا گیا۔ روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ ایک گواہ کی گواہی پر فیصلہ صادر فرمایا تھا اور اس میں مدعی سے قسم بھی لی گئی تھی۔ (صحیح مسلم بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ)

یہ بھی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک گھوڑا ایک بدّو سے خرید کیا۔ بعد میں بدّو فروخت سے مکر گیا اور نبی علیہ السلام سے گواہ پیش کرنے کو کہا۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے تم سے گھوڑا خریدا ہے لیکن میری گواہی دو آدمیوں کی گواہی کے برابر ہے۔''

اِس حدیث کی توضیح میں امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ اگر قاضی کو گواہ کی صداقت وعدالت کا علم ہے تو وہ صرف اُسی ایک آدمی کی گواہی پر فیصلہ صادر کرسکتا ہے۔ (سنن ابوداؤد بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ صفحات ۲۲، ۲۳)

یہ بھی روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رضاعت اور بچے کی پیدائش کے معاملہ میں صرف ایک عورت کی گواہی کو قبول فرمایا۔ (اَلطُّرُقُ الْحُکْمِیۃ لابن قیّم صفحہ ۸۷ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ)

شرائطِ شہادت

(۱) شہادت دعویٰ رشکایت کے موافق ہو : گواہی اور دعویٰ رشکایت جو قابلِ مفاہمت و مصالحت ہو' کے مابین کوئی بھی نقطہِ اختلاف گواہی کو نا قابلِ قبول نہیں بنا دیتا۔ اُس حقیقت کے خلاف گواہی جو قابلِ مشاہدہ ہو یا جسے بالعموم تسلیم کیا جاتا ہو' قابلِ قبول نہیں ہوتی۔

(۲) شہادت معاملے سے متعلق اور مربوط ہو : غیر متعلق اور غیر مربوط شہادت جس کا مقدمہ سے کوئی تعلق نہ ہو' غیر مقبول ہے۔

(۳) جلسہ گاہ (کچہری Forum) : امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک زِنا کے گواہوں کو گواہی کے لئے اُسی عدالتی اجلاس میں پیش ہونا چاہئے جس میں کچہری لگائی گئی ہے۔ جمہور فقہاء کے نظریہ کے مطابق ساعتِ مقدمہ شروع ہونے کے بعد غیر حاضر گواہ کو گواہی دینے کی اجازت نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کا کہنا ہے کہ گواہوں کی گواہی شروع ہونے کے وقت تمام کے تمام گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ وہ تہمت لگانے والا جو زِنا کے دعویٰ کے ثبوت میں چار گواہ مہیا نہیں کر سکا' قاذف سمجھا جائے ہ۔
(عبدالقادر عودہ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۲۷' ۲۸)

(۴) متقدم دعویٰ (Prior Claim) : اُن جرائم میں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسے قِصاص' دیت' حدّ قذف' حدّ سرقہ (چوری) اور شہری حقوق وغیرہ' جرم کے شکار (مظلوم) یا اُس کے وارثوں یا اُس کے سرپرستوں کی طرف سے عدالت میں دعویٰ کا دائر کیا جانا ضروری ہے جیسا کہ مجلّہ کے سیکشن ۱۶۹۶ کی عبارت سے ظاہر ہے۔ اگر ایسے جرائم اور حقوق میں کوئی متقدم دعویٰ نہیں ہے تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ مظلوم یا اُس کے وارثوں نے مجرم کو معاف کر دیا ہے اور اب گواہی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

(۵) شہادت عدالت میں قاضی کے سامنے ہونی چاہئے : عدالت سے باہر یا قاضی کے علاوہ کسی اور کے آگے دی ہوئی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی۔

(۶) شہادت نتیجہ خیز اور حتمی ہونی چاہئے : عدالت کے فیصلہ کی بنیاد بننے کے لئے پہلی شرط جو قاضی کو

مطمئن کردے' وہ شہادت کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہادت واضح اور صاف طور پر جرمی عمل کو یا حقوق کی پامالی کے واقع ہونے کو بغیر کسی وضاحت اور تاویل کے ثابت کردے۔''

''شہادت کی نتیجہ خیزی کے حصول کے لئے جرم یا متنازعہ حق کے واقع ہونے کے وقت اور مقام کی تخصیص ہونی چاہئے اور جرم یا متنازعہ حق سے متعلق قاضی نے جو گواہیاں اکٹھی کی ہیں' شہادت کو اُن کے موافق و مطابق ہونا چاہئے۔ اقبالِ جرم کے ذریعے لی گئی شہادت بھی درست ہے۔ اس شرط کے نتیجہ کے طور پر شریعتِ اسلامی میں قاضی رجج کو شہادت کے پرکھنے کا اختیار حاصل ہے۔ بارِ ثبوت اس حدیثِ نبوی کے موافق ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا: اِدْرَؤُ الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ (جامع ترمذی) یعنی شک کی صورت میں حد کی سزا کا اجراء نہیں ہوگا اور متضاد گواہی حد کی سزا کو روک دیتی ہے۔ مثلاً دوشیزگی اور کنوارے پن کا ثبوت اُس وقت بھی نتیجہ خیز شہادت ہے جب گواہ زنا کے کئے جانے پر مصر ہوں یا اگر ملزم اقبالِ جرم کر لیتا ہے۔ لہٰذا قاضی رجج کے لئے شہادت کو بڑی سختی اور ایمانداری کے ساتھ پرکھنا ضروری ہے۔'' (روضۃ الطالبین لامام النووی بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ ص ۳۰'۳۱)

''علاوہ ازیں فوجداری مقدمات میں سزا کے نفاذ کے وقت تک شہادت کو نتیجہ خیز رہنا چاہئے۔ اگر سزا کے نفاذ سے پہلے کسی بھی سٹیج پر شہادت میں نتیجہ خیزی نہیں رہتی' مثلاً گواہ اپنی گواہی کو بدل دیتا ہے اور اس میں صاف اور مدلل ہونے کی خوبی نہیں رہتی' تو اس صورت میں نہ ہی شہادت اور نہ ہی اُس پر عدالت کا کیا گیا فیصلہ قانوناً درست ہیں۔ یہی چیز اُس وقت بھی صادق آتی ہے جب عدالت کا حکم سزا سنانے کے بعد اور سزا کے عملدرآمد سے پہلے شہادت اپنی نتیجہ خیزی کی صفت کھو بیٹھے۔ اگر گواہ اپنی گواہی کو بدل دیتا ہے یا حکمِ سزا سنانے کے دوران نئے حقائق جو قاضی کے علم میں نہیں تھے' سامنے آئیں جو گواہوں کی گواہی کو شک میں ڈال دیں تو شہادت میں وثوق و اعتبار کی کمی آجاتی ہے اور ایسی صورت میں فیصلہ کو پلٹ دینا چاہئے۔ اگر سزا عائد کر دی گئی ہے تو اسے روک دینا چاہئے۔''

(۷) <u>شہادت میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے</u> : عدل وانصاف کا یہ تقاضہ ہے کہ شہادت کے پیش کرنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ کچھ فقہاء نے شہادت میں تاخیر کو مشکوک شہادت کے مساوی قرار دیا ہے اور یہی شک حدود کے جرائم میں سزا کو روک دینے کے لئے کافی ہے۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ صفحہ ۳۱)

''امام ابوحنیفہ کے نزدیک کسی معقول عذر کے بغیر شہادت میں تاخیر اسے مشکوک بنا دیتی ہے اور مجرم کی سزائے حد کو روک دیتی ہے۔ البتہ حدِّ قذف میں شہادت میں تاخیر غیر مؤثر ہے۔ تاہم امام موصوف کے نزدیک اگر شہادت کسی معقول عذر کی بناء پر ہے جیسے عدالت سے طویل مسافت کا ہونا یا کوئی سنجیدہ بیماری' تو شہادت میں تاخیر مؤثر نہیں رہے گی۔'' (ایضاً' ص ۳۵)

<u>تَزکِیۃُ الشُّہود</u> : اس کا مطلب ہے عدالت کی طرف سے تحقیق اور یہ اطمینان کر لینا کہ آیا گواہ یا

گواہان عادل ہیں یا نہیں ۔امام ابوحنیفہ کے نزدیک ''حدود'' اور ''قِصاص'' کے علاوہ دوسرے مقدمات میں تزکیۃ النفوس کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن امام شافعی کے نزدیک ہر مقدمہ میں تزکیۃ النفوس کی ضرورت ہوتی ہے۔تاہم امام شافعی کے نزدیک اگر عدالت کسی اور طریق سے گواہ رگواہان کے عادل ہونے پر مطمئن ہوجائے تو تزکیۃ النفوس کی ضرورت نہیں ہوتی ۔''

''تزکیۃ النُّفوس کا طریقِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اگر عدالت گواہ رگواہان کے عادل ہونے سے مطمئن نہیں ہے تو وہ دو ''مزکّیوں'' کے نام بہ صیغہِ راز خط کے ذریعے اُن کی رائے معلوم کرے گی کہ آیا گواہ رگواہان عادل ہیں یا نہیں ۔اُس خط میں فریق ہائے مقدمہ کے نام' گواہان کے نام اور دوسرے متعلقہ کوائف درج ہوں گے ۔ یہ خط عدالت کے نمائندہ کے ذریعے سر بہ مُہر لفافے میں ''مُزکیوں'' کو پہنچایا جائے گا جو خط کے جواب میں گواہ رگواہان سے متعلق تحریری طور پر اپنی رائے کا اظہار کریں گے کہ آیا وہ عادل ہیں یا نہیں ۔اگر ایک ''مزکّی'' گواہ کو عادل اور دوسرا اُسے غیر عادل قرار دیتا ہے تو یہ عدالت کی صوابدید پر ہے کہ وہ اُس مزکّی کی رائے پر اپنا فیصلہ صادر کرے جس نے گواہ کے عادل ہونے پر اعتراض کیا ہے ۔''

''مزکّی کا عادل' عاقل اور مسلمان ہونا ضروری ہے اور اُسے اُن گواہ رگواہان کے پسِ منظر کا بھی مکمل علم ہونا چاہیے جن کے عادل ہونے یا نہ ہونے کا عدالت نے اُس سے استفسار کیا ہے ۔تاہم اگر گواہ اور ''مزکّی'' غیر مسلم ہیں تو گواہ کے عادل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اُن کے مذہب کے قائم کردہ معیار کے مطابق ہوگا ۔'' (ایضاً ص ص ۳۶' ۳۷)

''<u>شہادۃ علی الشَّہادۃ</u> : اگر کسی مقدمہ میں اصلی گواہ کسی خطرناک بیماری یا عدالت سے خاصی دُوری یا کسی اور معقول مجبوری کی وجہ سے عدالت میں حاضر نہیں ہوسکتا تو وہ کسی دوسرے آدمی کو عدالت میں گواہی دینے کے لئے بھیج سکتا ہے ۔لیکن اصلی گواہ اِس دوسرے بھیجے جانے والے گواہ کو بتائے گا کہ اُس (اصلی گواہ) نے بہ چشم خود حقیقتِ واقعہ کو دیکھا ہے اور گواہِ ثانی کو عدالت کے رُوبرو گواہی دینے کا اختیار دیا ہے ۔ یہ دوسرا گواہ عدالت کو اصلی گواہ کا نام اور دوسرے کوائف بیان کرکے اُس کی شناخت کرائے گا ۔امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک حدود اور قِصاص کے سوا ہر مقدمہ میں شہادۃ علی الشَّہادۃ ہوسکتی ہے ۔'' (ایضاً ص ص ۳۶' ۳۷)

''<u>گواہی سے منحرف ہوجانا</u> : حقوق العباد سے متعلق گواہی سے انحراف کی اجازت نہیں ہے البتہ حدود کے مقدمہ میں کسی بھی سٹیج پر یہاں تک کہ سزا پر عملدرآمد کے دوران بھی گواہی سے انحراف ہوسکتا ہے اور اُس انحراف کے بعد سزائے حد کالعدم ہوجائے گی ۔اگر کسی دیوانی مقدمہ میں فیصلہ کے اعلان سے پہلے گواہ اپنی گواہی سے پھر جائے تو گواہی منسوخ ہوجائے گی اور عدالت اُس گواہی کو اپنے فیصلہ کی بنیاد نہیں بنائے گی' تاہم گواہ کو تعزیری سزا دی جائے گی اور اگر وہ فیصلہ کے اعلان کے بعد اپنی گواہی سے پھر جائے تو وہ جرمانے کی ادائی کا قانونی طور پر پابند ہوگا ۔اگر زنا کے مقدمہ میں فیصلہ کے اعلان سے قبل یا سزا کے عملدرآمد سے قبل گواہ اپنی گواہی سے پھر جائے تو اُسے حدِّ قذف کی سزا دی جائے گی ۔اگر قِصاص' زنا' ارتداد اور چوری کے مقدمات میں سزا کے عملدرآمد ہونے کے بعد گواہ اپنی گواہی سے پھر

جائیں اور کہیں کہ انہوں نے ارادتاً جھوٹی گواہی دی تھی تو اُنہیں بھی وہی سزا دی جائے گی جو اصل مجرم کو دی گئی اور اگر وہ کہیں کہ اُن سے گواہی دینے میں غلطی ہوئی ہے تو اُنہیں بطور تلافی دیت دینا ہوگی یا کوئی تعزیری سزا بھگتنا ہوگی'' (امام نووی بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۳۷)

''سیّدنا علی کرّم اللہ وجھہ' کے رُوبرو دو آدمیوں نے بیان دیا کہ فلاں نام کے ایک آدمی نے چوری کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ نے معاملہ کی تحقیق وتدقیق کے بعد چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم صادر فرمایا اور اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ بعد میں گواہ اپنی گواہی سے پھر گئے اور یہ بیان دیا کہ چوری کسی اور نے کی تھی اور یہ کہ وہ پہلے آدمی کو مجرم ٹھہرانے میں غلطی پر تھے۔ جنابِ علی نے اُن سے فرمایا کہ'' میں تمہاری اس گواہی کو قبول نہیں کرتا اور سزا یافتہ ملزم کی دیت تم پر عائد کرتا ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم نے ارادۃً پہلے آدمی کو موردِ جرم ٹھہرایا ہے تو میں تمہارے ہاتھ کٹوا دیتا۔'' سیّدنا علی کرّم اللہ وجھہ' کے اس فیصلے کی بنیاد پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریہ ہے کہ اگر گواہ گواہی سے منحرف ہو جائیں اور تسلیم کریں کہ انہوں نے گواہی دینے میں غلطی کی ہے تو وہ بطور تلافی مافات' دیت ادا کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر وہ یہ کہیں کہ اُنہوں نے ارادۃً اُس آدمی کو موردِ جرم ٹھہرانے میں غلطی کی ہے تو اُنہیں ''حد'' کی سزا دی جائے گی۔''

(''نظرية الاثبات'' لاحمد فتحی بہناسی بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۳۹' ۴۰)

'' چار گواہوں نے ایک آدمی کے جرمِ زِنا کی تصدیق کر دی جس کے بعد مجرم کو سنگسار کر دیا گیا۔ پھر اُن گواہوں میں سے ایک گواہ اپنی گواہی سے منحرف ہو جائے تو اُس منحرف ہونے والے گواہ کو حدِّ قذف کی سزا دی جائے گی اور وہ چوتھائی دیت ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ اور اگر چاروں گواہ اپنی گواہی سے منحرف ہو جائیں تو چاروں کو حدِّ قذف کی سزا دی جائے گی اور اُنہیں دیت بھی ادا کرنا ہوگی۔'' (ایضاً)

''اگر کسی آدمی کے زنا کے ارتکاب پر پانچ گواہ اُس کے جرم کی تصدیق کر دیں اور وہ غیر شادی شدہ ہے تو اُسے سو (۱۰۰) دِرّوں کی سزا دی جائے گی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن پانچوں میں سے ایک گواہ پہلے ہی حدِّ قذف کی سزا بھگت چکا ہے اور دوسرے چاروں اپنی گواہی سے پھر گئے ہیں تو اُن چاروں کو حدِّ قذف کی سزا دی جائے گی لیکن پانچویں کو نہیں (کہ وہ پہلے ہی یہ سزا پا چکا ہے)۔'' (فتاویٰ عالمگیری' جلد سوئم' صفحہ ۴۷۴' بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۴۰)

''امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر چار مرد اور چار عورتیں کسی آدمی کے زنا کرنے کی تصدیق کر دیں اور اُن کی شہادت کی بنیاد پر مجرم کو سزائے ''حد'' دے دی جائے اور پھر اس کے بعد تمام گواہ اپنی گواہی سے منحرف ہو جائیں تو مرد گواہوں کو حدِّ قذف کی سزا دی جائے گی اور اگر سزا کے عملدرآمد ہونے سے پہلے وہ تمام گواہ اپنی گواہی سے پھر جائیں تو اُن سب کو حدِّ قذف کی سزا دی جائے گی۔'' (فتاویٰ عالمگیری' جلد سوئم' ص ۴۷۶)

''اگر پانچ گواہ کسی آدمی کے زِنا کرنے کی تصدیق کر دیں اور اُس کے بعد اُن میں سے ایک گواہ اپنی گواہی سے پھر جائے تو اُسے حد کی سزا دی جائے گی۔'' (ایضاً)

اگر گواہی سے منحرف ہو جانے کے دوران گواہ کے اپنے اعتراف یا کسی اور ذریعہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ گواہ نے جھوٹی گواہی دی تھی تو اُسے جھوٹی گواہی دینے کی سزا دی جائے گی۔ اگرچہ جھوٹی گواہی کو قرآن وحدیثِ نبوی نے قابلِ سزا گناہ کہا ہے لیکن اس کی سزا متعیّن نہیں کی۔ سورۃ الحجّ کی آیت ۳۰ میں فرمایا: وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ یعنی جھوٹی بات سے بچتے رہو۔

جھوٹی گواہی دینا: یہ بھی مندرجہ بالا حکم کے تحت آتی ہے۔ ایک حدیثِ نبوی ہے کہ جھوٹی گواہی دینا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے مساوی ہے۔ (سنن البیہقی، ج ۷، ص ۱۳۹ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ ص ۴۱)

''اسی لئے قانونِ اسلامی کی رُو سے جھوٹے گواہ کو سزا دی جائے اور اُس کی تذلیل کی جائے۔ صاحبین (یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں) کا یہ نظریہ ہے کہ عدالت میں جھوٹی گواہی کے مرتکب شخص کو عوام میں مشتہر کیا جائے اور اُسے قید کی سزا دی جائے۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں عملاً ایسا ہوتا رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے گواہ کو تعزیری سزا دی جائے گی۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ صفحہ ۴۱)

(ب) اعتراف واقرار (Confession/Admission)

''اسلامی قانون کی رُو سے فوجداری مقدمہ میں جرم کے ثبوت کا ایک اور ذریعہ اعتراف واقبالِ جرم ہے اور دیوانی مقدمات میں ''اقرار'' ہے۔ ''اقبال واعتراف'' کا مطلب مجرم کا اپنے خلاف گواہی دینا ہے۔ اس طرح مجرم کا اپنے خلاف بیان دینا اس بات کا مظہر ہے کہ اُس نے اقبالِ جرم کر کے اپنے جرم وگناہ کو فی الواقع پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔'' (تفسیر ''فتح القدیر'' ۔۔۔ محمد بن علی الشوکانی، جلد ششم، صفحہ ۲۶۱، بحوالہ ڈاکٹر فتح اللہ صفحہ ۴۳)

''اقرار'' کا مطلب ایسا بیان ہے جس میں ایک آدمی دوسرے آدمی کے حق کو اپنے اوپر عائد کرنے کو تسلیم کرتا ہے۔'' (ردّ المحتار، لابن عابدین، جلد چہارم، صفحہ ۴۹۸)

''اقبالِ جرم اور اقرار کو قرآن مجید اور حدیثِ نبوی نے جرم اور حق کے ثبوت کے ذریعہ کے طور پر مانا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ (اَلنِّسَاء: ۱۳۵)

''مومنو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بن جاؤ، چاہے وہ تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی ہو۔ (۴ : ۱۳۵)

نبی اکرم ﷺ نے اعترافِ جرم اور اقرار کو بہت سے مقدمات میں حتمی ثبوت کے طور پر مانا ہے اور آپ نے مجرم کی طرف سے صرف اقبالِ جرم کی بناء پر اُس پر سزائے حد جاری کی۔'' (المغنی لابن قدامہ، ج ۸، ص ۱۹۶)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو اسلم کا ایک آدمی دربارِ نبوی میں حاضر ہوا اور زِنا کے ارتکاب کا معترف ہوا اور اپنے خلاف چار مرتبہ گواہی دی۔ اِس پر نبی اکرم ﷺ نے اُسے سنگسار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ (صحیح البخاری' جلد دوم' صفحہ ۱۷۶)

اقبالِ جرم/اقرار کی شرائط : فوجداری مقدمات میں اقبالِ جرم اور دیوانی مقدمات میں اقرار کی درجِ ذیل شرائط ہیں:۔

''(۱) فوجداری مقدمہ میں اعترافِ جرم کرنے والا اور دیوانی مقدمہ میں اقرار کرنے والا بالغ و عاقل ہو۔ اس طرح نابالغ' فاترالعقل' سوئے ہوئے اور شراب میں مخمور شخص کی طرف سے اعتراف و اقرار قابلِ قبول نہیں ہیں۔ اس اصول کی بنیاد نبی علیہ السلام کی یہ حدیثِ مبارکہ ہے :

''تین قسم کے آدمی مستثنیٰ ہیں :(۱) نابالغ جب تک کہ وہ بالغ نہیں ہوجاتا۔ (۲) مجنون اور دیوانہ جب تک کہ وہ تندرست نہیں ہوجاتا اور (۳) سویا ہوا شخص جب تک کہ وہ جاگ نہیں پڑتا۔ (اَلْمُغنی لابن قُدامہ' ج ۹' ص ۶۵ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ ص ۴۴)

''(۲) اعترافِ جرم/اقرار اور حق کی پامالی کے معاملہ میں بالکل واضح ہو اور اُس اعتراف و اقرار میں کسی قسم کا اِبہام اُسے ناقابلِ قبول بنادے گا۔ یہ اصول نبی علیہ السلام کی اُس حدیث پر مبنی ہے جس میں آپ نے حضرت ماعز بن مالک اسلمی سے کئی بار زنا کے ارتکاب کی بابت پوچھا تھا جس کے ارتکاب کا اعتراف اُنہوں نے کر بھی لیا تھا اور جب ماعز رضی اللہ عنہ تمام سوالوں کے جواب دے چکے تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کے سنگسار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ زنا کے مقدمہ میں جو سزائے حد کا موجب بنادے' اقبالِ جرم کرنے والے کو عملِ دخول کا اعتراف کرنا چاہیے۔

''(۳) اعتراف/اقرار کرنے والے کو اظہار مافی الضمیر کے قابل ہونا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بہرے اور گونگے کا ''حدود'' میں اعتراف قابلِ قبول نہیں ہے۔ تحریری اقرار' دستخط یا مُہر کا ثبت ہونا تحریر کنندہ یا دستاویز کے کارپرداز کا اقرار سمجھا جائے گا۔ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ تمام معاملات میں نابینے کا اعتراف/اقرار قابلِ قبول ہے۔'' (سُبُل السَّلام: شرح ''بلوغ المرام'' للصنعانی' جلد چہارم' صفحہ ۸)

''(۴) اعتراف/اقرار کسی دباؤ اور جبر کے بغیر آزادانہ رضامندی سے ہو۔ اِس اصول کی بناء یہ حدیث ہے:

''سہو و خطا' نسیان کے تحت اور جبراً کرائے گئے کاموں کے بوجھ سے میری امت کو مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔'' ('' جامع الاصول' لابن اثیر' ج ۴' ص ۱۳۶)

''پھر اسی طرح دھمکی' ترغیب وتشویق یا کسی وعدہ کے تحت کیا گیا اعتراف/اقرار بھی قابلِ قبول نہ ہوگا۔'' (''اسلامک لا آف ایوی ڈینس'' ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۴۴'۴۵)

''غیر عدالتی اقبالِ جرم (Extra Judicial Confession): اقبالِ جرم اور اقرار عدالت کے رُو برو ہونا چاہئے۔ اگر اقبالِ جرم یا اقرار عدالت سے باہر کئے جائیں تو ان کے قانوناً درست ہونے کے بارے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ قانوناً درست نہیں ہوگا اور اس بناء پر کوئی بھی گواہی قابلِ قبول نہیں ہوگی کیونکہ اگر اعتراف یا اقرار کرنے والے نے عدالت کے روبرو اعتراف کرلیا تو اُس کے اعتراف کی وجہ ہی سے جرم ثابت ہوگا نہ کہ گواہوں کی گواہی سے۔ اور اگر اُس نے عدالت کے روبرو اعتراف سے انکار کردیا تو اُس کا یہ انکار اعتراف سے انحراف سمجھا جائے گا جو حدود کے مقدمات میں قابلِ قبول ہے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے جیسے زِنا۔

اقبالِ جرم کا نصاب: امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک زِنا کے مقدمہ میں چار جدا جدا اعترافات ہونے ضروری ہیں کیونکہ ایسے مقدمہ میں نصابِ شہادت بھی تو چار گواہوں کا ہے۔ وہ اس اصول کی بناء اُس حدیثِ مبارکہ پر رکھتے ہیں جس کے راوی جنابِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جب ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر چار مرتبہ اپنے گناہِ زِنا کا اعتراف کیا تو نبی اکرم ﷺ نے اُنہیں سنگسار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس کی تائید میں وہ حدیث بھی ہے جس کے راوی حضرت بُریدہ الاسلمی ہیں جن کا کہنا ہے کہ قبیلہ بنو غامد کی ایک عورت بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئی اور چار مرتبہ اپنے گناہِ زنا کا اعتراف کیا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا کہ چونکہ عورت حاملہ ہے' اس لئے وضعِ حمل کے بعد اُسے (زِنا کی) سزا دی جائے گی۔'' (مسند امام احمد بحوالہ انوار اللہ' ص ۴۹)

''امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اقبالِ جرم کا تکرار چار مختلف مواقع پر ہو اگرچہ نشست ایک ہی ہو۔ اس کی بناء جنابِ ماعز اسلمی کے مقدمہ میں سنت نبوی پر ہے جنہوں نے اپنے قصور کا اعتراف چار مختلف مواقع پر کیا تھا۔''

''علاوہ ازیں اقبالِ جرم سے جرم اُس وقت ثابت ہوگا اور مجرم مستوجب سزا تب ہوگا جب عدالت اس کی قائل ہو جائے۔ لہٰذا قاضی/جج کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ملزم کے اقبالِ جرم پر ہی سراسر انحصار نہ کرے بلکہ دوسرے حالات میں بھی اقبالِ گناہ کے شواہد معلوم کرے۔ فقہاء کا کہنا ہے کہ جج/قاضی ملزم کو اعترافِ جرم سے انحراف کی امکانی صورت بتا سکتا ہے۔ جنابِ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ سے متعلق حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ عامر کہلانی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ملزم کو وہ راہ ضرور بتانی چاہئے جس سے اُس کی سزائے حد ٹل جائے (صنعانی' جلد چہارم صفحہ ۸)۔ ایک اور حنفی فقیہ علی المرغینانی لکھتے ہیں کہ قاضی یا امام کے لئے یہ چیز قابلِ تحسین ہے جس کے روبرو بدچلنی کا اعتراف کیا گیا ہو کہ وہ ملزم کو یہ الفاظ بتاتے ہوئے ''شاید تم نے صرف بوس وکنار کیا ہو یا اس سے معانقہ کیا ہو'' جرم کے اعتراف سے انکار کرنے کی ترغیب دے کیونکہ پیغمبر علیہ السلام نے جنابِ ماعز سے ایسے ہی فرمایا تھا۔'' (ایضاً ص ۵۲)

''اقبالِ جرم میں تاخیر : فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ شہادت کے برعکس اقبالِ جرم میں تاخیر اعترافِ جرم پر اثر انداز نہیں ہوتی اور دیوانی مقدمات میں اقرار کی طرح اقبالِ جرم میں بھی تاخیر قابلِ قبول ہوتی ہے۔اس کی بناء اِس استدلال پر ہے کہ شہادت میں تاخیر کینہ' بغض وعناد اور شک وشبہ کی بناء پر ہوسکتی ہے جبکہ اقبالِ جرم میں ایسا کوئی امکان نہیں ہوتا کیونکہ کوئی بھی معقول انسان اپنے خلاف ضرر رساں چیز کا اعتراف نہیں کرتا۔امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہا کے نزدیک شراب نوشی کے اعتراف میں تاخیر کرنا سزا کو کالعدم کر دیتی ہے اور یہ تاخیر مجرم کے منہ سے شراب کی بو کو زائل کر دیتی ہے۔اس لئے اگر ایک آدمی نے شراب کی بو زائل ہونے کے بعد مے نوشی کا اعتراف کیا تو اُس کا اعتراف قانونا درست نہیں ہوگا۔'' (ایضاً صفحات ۵۲' ۵۳)

''ایسے شخص کا اعتراف جو جرم میں شریک ہی نہیں (Confession of a Co-accused): اسلامی قانون میں اعترافِ جرم صرف جرم کا اعتراف کرنے والے کے خلاف حتمی ثبوت ہوتا ہے نہ کہ اُس کے خلاف جو اُس جرم میں شریک ہی نہیں ہے۔اس کی بناء درجِ ذیل حدیثِ نبوی ہے:

''سعد بن ساعد رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور اعتراف کیا کہ اُس نے فلاں عورت کے ساتھ زِنا کیا ہے۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس عورت کو بلا بھیجا اور اس سے معاملہ کے متعلق استفسار کیا تو اُس نے اُس الزام کی تردید کی۔آپ نے اُس شخص کو سزا دی اور عورت کو آزاد کر دیا۔''

''اگر کسی آدمی نے کسی غیر حاضر عورت سے زِنا کرنے کا اعتراف کیا تو اُس مرد پر سزائے حد جاری ہوگی۔اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا کرنے کا اعتراف کیا جسے وہ جانتا ہی نہیں تو وہ بھی مستوجب سزائے حد ہوگا۔'' (عبدالقادر عودہ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۵۴' ۵۵)

''یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اگر کسی مرد اور عورت پر زِنا کا الزام لگایا جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہونے کا بیان دیں تو اُن کا بیان اُن کے نکاح کا کافی ثبوت ہوگا اور اُنہیں سزا نہیں دی جائے گی بشرطیکہ اُن کے خلاف زِنا کا ثبوت نہ ملے۔لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اُنہیں اپنی شادی کا ثبوت مہیا کرنا ہوگا ورنہ وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۵۵' ۵۶)

''اقبالِ جرم/اقرار سے انحراف : حدود کے مقدمات میں فیصلہ کے اعلان سے پہلے یا بعد میں یا سزا پر عملدرآمد کے دوران اقبالِ جرم سے انحراف قابلِ قبول ہے اور یہ انحراف سزائے حد کو کالعدم کر دیتا ہے۔لیکن قِصاص اور دیت وغیرہ کے مقدمات میں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے' اقبالِ جرم سے انحراف کی اجازت نہیں ہے۔تمام معاملات میں اقبالِ جرم سے انحراف کی اجازت نہیں ہوا کرتی اور اگر ایک مرتبہ کسی نے اعتراف کر لیا تو وہ قانونی طور پر اُس حق کو ادا کرنے کا پابند ہوگا اگرچہ وہ بعد میں اُس سے انحراف کر جائے۔''

مے نوشی کی سزائے حد کو زیرِ بحث لاتے ہوئے علی المرغینانی لکھتے ہیں:

''اگر کسی شخص نے مے نوشی یا کسی اور نشہ آور چیز کا اقبالِ جرم کیا اور بعد میں اُس اعتراف سے منحرف ہو گیا تو اُسے سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ مے نوشی کی سزا کا تعلق خالصتاً حقوق اللہ سے ہے۔''

''اگر کسی شخص نے چوری کا اقبالِ جرم کر لیا جس کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں سے ہے اور بعد میں اُس اعتراف سے پھر گیا تو اُسے سزائے حد نہیں دی جائے گی اور وہ مسروقہ جائداد کی واپسی یا اُس کی تلافی کر دینے کا ذمہ دار ہو گا۔''

''اگر کسی آدمی نے اعترافِ زِنا کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ وہ شادی شدہ ہے لیکن بعد میں وہ اپنے شادی شدہ ہونے سے منحرف ہو گیا تو اُسے سنگسار نہیں کیا جائے گا بلکہ اُسے ایک سو (١٠٠) دِرّے لگائے جائیں گے۔''

''اقبالِ جرم میں تضاد بیانی اور کذب بیانی بھی اُس اعتراف کو کالعدم کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اُس نے فلاں شخص کی چوری کی ہے لیکن بعد میں کہا کہ نہیں میں نے تو کسی اور کی چوری کی ہے تو اُس کا یہ بیان شک پیدا کرتا ہے جو اقبالِ جرم کو کالعدم کر دیتا ہے۔'' (احمد فتحی بہناسی بحوالہ انوار اللہ)

''اگر کوئی جرم گواہی اور اقبالِ جرم دونوں ذرائع سے پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اور اُس کے بعد ملزم فیصلہ کے اعلان سے پہلے اعتراف سے منحرف ہو جائے تو ایسے معاملہ میں حنفی فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس موقع پر اعتراف سے پہلو تہی ملزم کو سزائے حد سے بچا لیتی ہے۔ لیکن اگر وہ فیصلہ کے اعلان کے بعد جس کا انحصار شہادت پر تھا' اقبالِ جرم سے انحراف کرتا ہے تو امام ابو یوسف کے نزدیک اُسے سزائے حد نہیں دی جائے گی کیونکہ شہادت اُس وقت مؤثر ہوتی ہے جب کسی بھی مقام پر اقبالِ جرم نہ ہو۔ لیکن امام محمد کے نزدیک اُسے اس مقدمہ میں سزائے حد دی جائے گی کیونکہ شہادت کی رُو سے جرم ثابت ہو چکا ہے۔'' (''بدائع الصنائع'' للکاسانی' جلد ۵۲' بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۵۸' ۵۹)

''اگر یہ بات وسیع تر قومی مفاد میں ہو تو حکومتِ وقت تعزیری جرم میں شریک مجرم کو معاف کر سکتی ہے۔ لیکن حدود کی سزا میں نہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ ابنِ عابدین لکھتے ہیں:

''حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ تعزیر کے برعکس حد میں نہ تو کسی سفارش سے معافی مل سکتی ہے اور نہ ہی حکومتِ وقت اسے معاف کر سکتی ہے۔'' (ردّ المحتار' ج ۳' ص ١٩٤ بحوالہ انوار اللہ)

(ج) واقعاتی شہادت (القرینہ) (Circumstantial Evidence..: جرم یا حق کو ثابت

کرنے کا یہ ایک اور ذریعہ ہے۔ قرینہ کا لفظی معنی تعلق' جوڑ' رشتہ' اتحاد' الحاق' تنظیم' نشان اور رابطہ کا ہے۔ اصطلاح میں اس کا معنیٰ وہ منطقی نتیجہ ہے جو کسی کی گئی چیز یا اُن حالات سے حاصل کیا جائے جن کی رُو سے معاملہ فیصلہ کن اور حتمی ہو جاتا ہے۔ جب قیاس مضبوط ہو تو اسے متعلقہ حقیقت کے لئے بطور شہادت بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔ (Dictionary of Modern Written Arabic ... J. Miltan Coron, p. 760)

شریعتِ اسلامی قرینہ یعنی واقعاتی شہادت کو مختلف حالات میں بطور گواہ کے تسلیم کرتی ہے۔ جس کی مثال سورہ یوسف کی یہ آیات ہیں:۔

وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَقَدَّتۡ قَمِيۡصَه' مِنۡ دُبُرٍ وَّاَلۡفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الۡبَابِ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ يُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ" اَلِيۡمٌ "٥قَالَ هِىَ رَاوَدَتۡنِىۡ عَنۡ نَّفۡسِىۡ وَشَهِدَ شَاهِدٌ" مِّنۡ اَهۡلِهَا اِنۡ كَانَ قَمِيۡصُه' قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَهُوَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ٥ وَاِنۡ كَانَ قَمِيۡصُه' قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَكَذَبَتۡ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ٥ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَه' قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّه' مِنۡ كَيۡدِكُنَّ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ "٥ (یوسف : ۲۵ تا ۲۸)

"اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور اُس (عورت) نے اُن کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے اُس کے آقا (یعنی شوہر) کو دروازہ کے پاس (کھڑا ہوا) پایا۔ وہ بول اٹھی: اُس کی کیا سزا ہے جو تیری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے سوائے اس کے کہ قید میں ڈالا جائے یا (اور کوئی) دردناک سزا (اُسے ملے)۔ یوسف بولے: یہی (خود) تو مجھے اپنا مطلب نکالنے کے لئے پھسلا رہی تھی اور اُس عورت کے خاندان کے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اُن کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو تو وہ سچی ہے اور یہ جھوٹے اور اگر اُن کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو وہ جھوٹی اور یہ سچے۔ سو جب عزیز نے اُن کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو بول اٹھا: بے شک یہ (سب) تم عورتوں کا مکر و فریب ہے' بے شک تم عورتوں کا مکر و فریب غضب کا ہوتا ہے۔" (۲۵ تا ۲۸ : ۱۲)

صوفیاء عارفین نے کہا ہے کہ کشاد قفل میں اشارہ اسی طرف ہے کہ جو دنیائے حرام سے بھاگنے کی ہمت کرتا ہے' اُس کے لئے نجات کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ علماء نے یہاں ایک سوال یہ پیش کیا ہے کہ قرآن ہی نے شیطان کے مکر و فریب کو ضعیف بتایا ہے (سورۃ النساء: ۷۶) اور یہاں عورتوں کے مکر و فریب کو عظیم ٹھہرایا ہے تو کیا عورتوں کا مکر و فریب شیطان سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اس کا جواب اُنہوں نے یہ دیا ہے کہ شیطان کا کید (مکر و فریب) جو یہاں ضعیف قرار دیا ہے وہ اللہ کی تدبیر کے مقابلہ میں ہے اور نسوانی کید جو عظیم بتایا گیا ہے وہ بمقابلہ مَردوں کے ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت سے معاملات میں قرینہ کو بطور ذریعہ ثبوت کے تسلیم کیا ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو:
"جنگِ بدر میں عفراء کے دو بیٹوں نے دعویٰ کیا کہ اُنہوں نے ابوجہل کو قتل کیا ہے۔ نبی علیہ السلام نے اُن سے فرمایا: کیا تم نے اپنی تلواریں صاف کر لی ہیں؟" اُنہوں نے کہا: "نہیں"۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ذرا مجھے اپنی

تلواریں دکھاؤ۔ جب حضور علیہ السلام نے تلواروں کو خون آلود دیکھا تو فرمایا: واقعی تم ہی نے اُسے قتل کیا ہے۔'' (مسند احمد بن حنبل' جلد سوئم' آیت ۲۱۲] بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ)

نعمان بن اَلجار یہ روایت کرتے ہیں اور اُنہوں نے اپنے والد سے سنا کہ کچھ لوگ ایک جھونپڑی کا تنازعہ بارگاہِ نبوی میں لائے۔ آپ نے حضرت حذیفہ کو اُن کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے بھیجا۔ حضرت حذیفہ نے اُن لوگوں کے حق میں فیصلہ دیا جن کے گھر کی طرف جھونپڑی کے بانس باہر نکلے ہوئے تھے۔ واپسی میں حضرت حذیفہ نے نبی ﷺ کو یہ واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا: تمہارا فیصلہ درست ہے۔ (سنن ابن ماجہ' ج ۲' ص ۱۷۱ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ ص ۶۴)

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ شک وشبہ سزائے حدود کو کالعدم کردیتا ہے۔ چونکہ گمان وقیاس ہمیشہ ہی مشکوک اور غیر یقینی ہوتا ہے' اس لئے حدود کے معاملات میں اسے فیصلہ کی بنیاد نہیں بنایا سکتا۔''

''دستاویزی ثبوت : واقعاتی شہادت میں شامل ایک دستاویزی ثبوت بھی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق یہ کسی بھی تحریر شدہ' طباعت شدہ یا نقش شدہ مواد کو شامل ہے جو معلومات فراہم کرے۔'' (اَلطُّرُقُ الْحُکْمِیَّة لابن القیم بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۶۶)

''لاش کا پوسٹ مارٹم معائنہ' مرنے والے آدمی کا بیان' خون آلود کپڑوں' تلوار' بندوق' نیزہ یا کسی دوسرے ہتھیار کی بازیابی' قتل کے مقدمہ میں ملزم یا مشتبہ شخص کے جسم پر زخم یا دستاویزی ثبوت کو واقعاتی شہادت میں شمار کیا جاتا ہے جسے دوسرے واقعات کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ زِنا کے مقدمہ میں ملزم عورت کا حمل' ملزم مرد/عورت کے جسم یا لباس پر مادہ منویہ کا وجود وغیرہ اور شراب نوشی کی صورت میں ملزم کے منہ میں شراب کی بُو' یا اُس کا قے کرنا جس سے شراب نوشی کا شبہ ہوتا ہو' یہ سب واقعاتی شہادت کے زمرے میں آتے ہیں اور اسلامی قانون میں بطور شہادت کے قابلِ قبول ہیں۔''

''(د) ایک آزمودہ کار کی شہادت: ایسا گواہ جو مہارت' علم و ہنر' تربیت' تجربہ یا تعلیم کے بل بوتے پر آزمودہ کار ہے' وہ اپنی رائے کے اظہار کے ذریعے یا کسی اور طریق سے گواہی دے سکتا ہے۔'' (Black Law Dictionary, p. 519, quoted by Dr. Anwarullah, p. 70)

اسلام ایک آزمودہ کار کی رائے کو تسلیم کرتا ہے اور اُسے کما حقہٗ اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ o (اَلنَّحل : ۴۳)

''اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ لیا کرو۔'' (۱۶ : ۴۳)

نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جانشین خلفائے راشدین نے بھی آزمودہ کار کی رائے کو بطور گواہی کے تسلیم کیا۔ مثلاً:

(۱) سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ایک دن نبی ﷺ اُن کے پاس تشریف لائے اور خوشی خوشی فرمایا: اے عائشہ! کیا تم دیکھتی نہیں ہو کہ مجدّ ذ المدلجی آئے اور اُسامہ اور زید کو ایک چادر میں لپٹے ہوئے اس حال میں دیکھا کہ اُن کے سر ڈھانپے ہوئے تھے لیکن اُن کی ٹانگیں ڈھانپی ہوئی نہیں تھیں۔ اس پر مدلجی نے کہا کہ اُن کی ٹانگیں ایک دوسرے کا حصّہ ہیں۔ مجدّ ذ المدلجی علم الانساب میں ماہر تھے۔'' (صحیح بخاری بحوالہ انوار اللہ ص ۰ ۷)

(۲) جعفر بن محمد بیان کرتے ہیں کہ انصار قبیلہ کا ایک مرد اور ایک عورت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حضور پیش کیے گئے۔ دراصل وہ عورت اُس نوجوان سے محبت کرتی تھی لیکن وہ اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا اُس عورت نے حکمتِ عملی لڑائی کہ ایک انڈہ لیا اور اُسے اپنے کپڑوں اور رانوں پر توڑ دیا۔ اس کے بعد وہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہا کہ اس شخص نے میرے ساتھ جنسی عمل کرنے کی کوشش کی اور یہ اُس کے جرم کا ثبوت ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ عورتوں سے پوچھا تو اُنہوں نے کہا کہ اُس عورت کے کپڑوں اور رانوں پر مادہ منویہ ہے۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے اُس مرد کو سزا دینا چاہی جس پر وہ شخص بول اُٹھا: اے امیر المؤمنین! جلدی نہ کیجئے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اس عورت نے میرے خلاف منصوبہ بنایا ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جنابِ علی کرّم اللہ وجہہ' سے اس کی بابت پوچھا: حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' نے اُس عورت کے کپڑوں اور جسم کو دیکھا اور گرم پانی لانے کو کہا۔ آپ نے وہ پانی اُس عورت کے کپڑوں اور رانوں پر اُنڈیلا' کپڑوں کو اکٹھا کیا اور اُنہیں پرکھا۔ پرکھنے سے آپ کو معلوم ہوا کہ وہ مادہ منویہ نہیں بلکہ ایک انڈا تھا۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' نے اُس عورت کو ڈرایا دھمکایا اور اُس عورت نے اقبالِ جرم کرلیا۔'' (اَلــطُّـرُقُ الْحُکْمِیَۃ لابن القیّم بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحہ ۹۸)

(۳) ''ایک سیاہ فام آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ میں اور میری بیوی دونوں سیاہ فام ہیں لیکن میری بیوی نے سرخ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے۔ اُس کی بیوی نے حضرت عمر سے کہا: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے کسی سے ناجائز جنسی تعلق نہیں رکھا اور فی الحقیقت یہ بچہ اسی میرے خاوند کا ہے۔ حضرت عمر نے جنابِ علی کرّم اللہ وجہہ' سے اس کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے اُس کے خاوند سے کہا: اگر میں تم سے کچھ پوچھوں تو کیا تم مجھے صحیح معلومات دو گے؟ اُس نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔ حضرت علی نے اُس سے کہا: کیا تم نے اپنی بیوی سے اُس وقت مجامعت کی تھی جب وہ حالتِ حیض میں تھی؟ اُس نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔ اس پر حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' خوشی سے جھوم اٹھے اور فرمایا: جب مرد کا مادہ منویہ (عورت کے) خون سے ملتا ہے تو اس سے سرخ رنگ کا بچہ پیدا ہوتا ہے' اس لئے اپنے بچے کے حسب ونسب کا انکار نہ کرو۔ تم نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے۔'' (ایضاً ص ۷۲)

''امام سرخسی بیان کرتے ہیں کہ جب قاضی کو مسروقہ جائداد کی قیمت متعیّن کرنے میں دشواری ہو اور ماہرین اس کی قیمت لگانے میں مختلف الرائے ہوں کہ کچھ تو اُس کی قیمت دس درہم اور کچھ اس سے کم لگاتے ہوں' تو اس صورت میں ملزم پر حد جاری نہیں ہوگی کیونکہ حد کا نفاذ تو اُس وقت ہوتا ہے جب مسروقہ جائداد کا ''نصاب'' (یعنی مقررہ حد) مکمل ہو جائے اور اس کی قیمت متعیّن کرنے میں جب ہرین میں اختلافِ رائے ہو تو نصاب مکمل نہیں ہوتا۔ (المبسوط)

''علامہ ابن القیّم لکھتے ہیں کہ شدید زخموں کی صورت میں اگر دو ڈاکٹر (معالج) نہ مل سکیں تو ایک ہی ڈاکٹر کی رائے کافی ہوگی۔ اس طرح ڈاکٹر کی رپورٹ' قدموں کے نشانات' بازوؤں' حسب ونسب کے ماہر کی رائے یا خون کا رصد گاہی ٹیسٹ' مادہ منویہ کا ٹیسٹ یہ سب متازعہ معاملہ کو حل کرنے کے لئے بطور شہادت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم ایسی گواہی پر سزائے حد جاری نہیں ہوگی بلکہ ملزم کو تعزیری سزا دی جائے گی۔'' (انوار اللہ ص ۲۷۴)

(ذ) قَسم : اسلامی قانون میں کسی جرم یا حق کو ثابت کرنے کا ایک ذریعہ قاضی یا مجاز شخص کے سامنے قسم اٹھانا یا اُس کا انکار کرنا ہے۔ قسم کے لئے ''قسم' یمین'' اور ''حلف'' کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یمین اُس قوی عقد کو کہتے ہیں جس کے ساتھ قسم کھانے والا اللہ کے نام اور اُس کے اسمائے حُسنٰی کے ساتھ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا باضابطہ اعلان کرتا ہے۔ (Encyclopedia of Islam ... E. Van Donzel, Vol. 1, p. 687)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَا أَنْكَرَ (اربعین نووی)

''ثبوت مہیا کرنا مدّعی کا کام ہے اور قسم اٹھانا اُس شخص کے ذمّہ ہے جو انکاری ہو۔''

''اس طرح اگر مدّعی کوئی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے تو مدّعا علیہ سے قسم اٹھوائی جائے گی۔ اگر وہ قسم اٹھالے تو فیصلہ اُس کے حق میں ہوگا اور اگر وہ قسم اُٹھانے سے انکار کرے تو امام شافعی کے نزدیک مدّعی کو قسم اُٹھانے کو کہا جائے گا۔ اگر وہ قسم اٹھالے تو حدود اور قصاص کے مقدمات کے علاوہ مدعا علیہ کے خلاف دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔'' (امام اَلنووی بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ)

کچھ فقہاء کے نزدیک قَسم مندرجہ ذیل لوگ اٹھائیں گے:

(۱) شکایت کنندہ یعنی مدّعی :

(۲) ملزم یا مدّعا علیہ ؛

(۳) گواہ۔

مدّعی سے قسم مندرجہ ذیل صورتوں میں اُٹھوائی جائے گی :

''(۱) جب ایک شخص نے دوسرے شخص پر اپنی جائداد کے چُرانے کا الزام لگایا اور ملزم نے الزام کا انکار کیا اور قسم اٹھائی کہ اُس نے چوری نہیں کی لیکن بعدازاں مالِ مسروقہ ملزم کے ہاں سے نکل آیا تو مدّعی کو قسم اٹھانے کا کہا جائے گا اور اگر وہ قسم اٹھالے تو مالِ مسروقہ اُسے بحال کر دیا جائے گا۔''

’’(۲) اگر ملزم قسم اٹھانے سے انکار کرے اور معاملہ چوری اور قذف (بہتان) وغیرہ کی طرح حقوق العباد سے متعلق ہو تو مدّعی کو اپنا حق وصول کرنے کے لئے قسم اُٹھانے کا کہا جائے گا۔‘‘

’’(۳) حدود اور قِصاص کے علاوہ جب مدّعی کے دعویٰ کی تائید میں صرف ایک گواہ ہو تو اُسے قسم اُٹھانے کو کہا جائے گا اور اس کی بناء وہ حدیثِ نبوی ہے جس میں آنجناب ﷺ نے ایک گواہ اور مدّعی کی قسم کی بنیاد پر فیصلہ صادر فرمایا تھا۔‘‘

’’(۴) اگر خاوند بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے تو میاں بیوی دونوں چار مرتبہ قسم اٹھائیں گے۔‘‘

’’(۵) حدود کے مقدمہ میں قسم اٹھانے کو نہیں کہا جائے گا سوائے چوری کے مقدمہ کے جس میں اگر ملزم قسم اٹھانے سے انکاری ہو تو اُس انکار کی بنیاد پر مالِ مسروقہ کی بابت فیصلہ کیا جائے گا۔‘‘ (احمد فتحی بہناسی بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ‘ صفحات ۷۴‘۷۵)

’’جہاں تک ملزم یا مدّعا علیہ سے قسم لینے کا تعلق ہے تو اُس کی بناء آنجناب ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

أَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلَى مَا أَنْكَرَ (اربعین نووی)

’’ثبوت مہیا کرنا مدّعی کا کام ہے اور قسم اٹھانا اُس شخص کے ذمہ ہے جو انکاری ہو۔‘‘

’’فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر ملزم حدود کے مقدمہ میں قسم اٹھانے سے انکاری ہو تو اس کے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جائے گا سوائے چوری کے مقدمہ کے جس میں اگر ملزم قسم اٹھانے سے انکاری ہو اور کوئی گواہی بھی میسر نہ ہو تو اُسے مالِ مسروقہ کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا لیکن اُس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ تاہم فقہاء قِصاص‘ دیت اور تعزیر کے معاملہ میں مختلف الرائے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ملزم زخم کے مقدمہ میں قسم اٹھانے سے انکار کرے تو اُسے قِصاص یا تعزیر کی سزا دی جائے گی۔‘‘ (ابنِ قُدامہ بحوالہ انوار اللہ ص ۷۵‘۷۶)

’’امام ابو حنیفہ کے نزدیک حدود اور قِصاص کے علاوہ کے مقدمات میں فیصلہ ملزم یا مدّعا علیہ کے قسم سے انکاری ہونے کی بناء پر کیا جائے گا اور مدّعی کے انکاری ہونے کی بناء پر نہیں کیا جائے گا۔ مدّعی یا شکایت کنندہ کسی بھی صورت میں قسم اُٹھانے کے پابند نہیں ہوں گے۔‘‘

’’اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم گواہوں سے بھی گواہی لینے کو کہا ہے جب وہ سفر کے دوران ایک مسلمان کی وصیّت کی

توثیق کریں۔اس لحاظ سے مسلمان کسی دیوانی یا فوجداری مقدمہ میں قسم اٹھانے کے قانونی طور پر زیادہ پابند ہیں۔"

"غیر مسلم کو اپنے مذہب کے مطابق قسم اٹھانے کی اجازت ہے۔" (ڈاکٹر انوار اللہ صفحات ۷۶، ۷۷)

"(ر) قاضی یا جج کا ذاتی علم: شریعتِ اسلامی میں کسی جرم یا حق کے ثابت کرنے کا ایک ذریعہ اُس مقدمہ سے متعلق جج کا ذاتی علم بھی ہے جو اُس کی عدالت میں دائر کیا گیا ہے۔فقہاء اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ آیا قاضی رجج اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر کسی مقدمہ کا فیصلہ دے سکتا ہے یا نہیں۔

چونکہ ذاتی علم کی بناء پر کیا گیا فیصلہ جج رقاضی گواہی کے بغیر صادر کرتا ہے جس سے شکوک پیدا ہوتے ہیں اور عوام کا جج میں اعتماد نہیں رہتا اس لئے بالخصوص فوجداری مقدمہ میں قاضی رجج کو اپنے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ دینے سے روکا گیا ہے۔یہی رائے حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، علی، عبدالرحمن بن عوف اور معاویہ رضی اللہ عنہم کی ہے جس کی تائید میں مندرجہ ذیل حوالہ جات قارئین کی نذر ہیں:

آنجناب ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: "اگر میں نے گواہی کے بغیر سنگسار کرنا ہوتا، تو میں ضرور اس عورت کو سنگسار کروا دیتا۔"

"اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ جج کو زِنا کے مقدمہ میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ صادر کرنے سے روکا گیا ہے۔اس اصول کا اطلاق تمام سزائے حدود پر ہوتا ہے اور یہ اصول معافی کے متعلقہ ضابطے کا بھی عکاس ہے۔معافی کے اس نظریہ کی مندرجہ ذیل احادیث سے تائید ہوتی ہے جن میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(ا) (ا) اِدرَؤُ الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ (جامع ترمذی)
"شکوک وشبہات کی صورت میں سزائے حدود دینے سے گریز کرو۔"

(۲) اِدْفَعُوا الْحُدُوْدَ مَاوَجَدْتُّمْ لَهَا مَدْفَعًا (بلوغ المرام لحافظ ابن حجر عسقلانی، ص ۱۵۶)
"جہاں تک ہو سکے سزائے حدود کو دُور رکھو۔"

(۳) اِدرَؤُ الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَااسْتَطَعْتُمْ (ایضًا)
"(شکوک وشبہات کی بناء پر) مسلمانوں کو حتی الوسع سزائے حدود دینے سے اجتناب کرو۔"

(اا) ایک مرتبہ سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر میں کسی آدمی کو عورت سے زِنا کرتا ہوا

خود دیکھ لوں' تو میں گواہوں سے گواہی لئے بغیر اُس پر سزائے حد جاری نہیں کروں گا۔''

(III) ابن جُریج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھ بھیجا کہ قاضی کو نہ تو اپنے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ دینا چاہئے اور نہ ہی کسی کمزور گواہی یا گمان کی بناء پر۔''

(IV) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک فریق نے قاضی شُرَیح سے کہا کہ آپ ہماری طرف سے گواہی دے دیجئے کیونکہ آپ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ قاضی موصوف نے اُن کی اس فرمائش کی تردید کرتے ہوئے کہا: ''امیر المؤمنین سے جا کر کہئے کہ وہ میری جگہ کسی اور کو قاضی مقرر کر دیں' تب میں تمہارے حق میں گواہی دوں گا۔'' (فتح الباری لحافظ ابن حجر عسقلانی' ج ۹' ص ۲۱۲)

معلوم ہوا کہ قاضی کا ذاتی علم عوام میں اُس کا اعتماد پیدا کرنے کی بجائے شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے۔ حاکم رقاضی کی طرف سے سزائے حدود کا اجراء خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے ہوتا ہے جس میں کسی شخصِ غیر یعنی مدّعی کی رُو رعایت کو دخیل نہیں ہونا چاہئے اور اسی طرح قاضی کے ذاتی علم کو بھی فیصلہ میں دخیل نہیں ہونا چاہئے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر سزائے حد میں ملزم اپنے اعترافِ جرم سے مکر جاتا ہے تو سزائے حد کالعدم ہو جاتی ہے اور اس صورت میں جج مجرم پر متعیّن سزا نافذ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مجرم اعترافِ جرم نہیں کرتا تو سزائے حد قاضی کے ذاتی علم کی بنیاد پر نہیں دی جا سکتی۔''

''شوافع' امام ابوحنیفہ' صاحبین (یعنی امام ابویوسف اور امام محمد) کے پیروکار اِسی نظریہ کے حامی اور قائل ہیں۔ تاہم اگرچہ قاضی رجج حدود اور قِصاص کے مقدمات میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ صادر نہیں کر سکتا' وہ تعزیر اور حقوق کے مقدمات میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔''

''امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حدود کے مقدمہ میں قاضی رجج کے اُس فیصلہ کے حق میں نہیں ہیں جو اُس نے اپنے ذاتی علم کی بناء پر کیا ہو کیونکہ سزائے حدود' شکوک وشبہات کی صورت میں ساقط ہو جاتی ہیں۔ اگر قاضی نے اپنی آنکھوں سے زِنا ہوتے ہوئے دیکھا اور اُس جرم پر تین اور بھی عینی شاہد موجود ہیں (اور چوتھا گواہ میسر نہیں ہے) تو قاضی رجج کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی گواہی کو شامل کر کے چار کا نصاب پورا کر لے۔ بلکہ اُسے ایسے مقدمہ میں جج بننے سے انکار کر دینا چاہئے اور بطور گواہ کے عدالت میں پیش ہونا چاہئے' اس طرح دوسرا کوئی قاضی رجج ان چاروں گواہوں کی شہادت کو قبول کرے اور مجرم پر سزائے حد کو نافذ کرے۔'' ... ("Islamic Law of Evidence"
Dr. Anwarullah, pp. 78, 81, 82)

(۴۲) نظریہ ارتقاء بمقابلہ نظریہ تخلیق (Evolution Vs. Creationism)

''ڈارونزم نظریہ کی رُو سے وہ انواع' بقا اور افزائش پاتی ہیں جو ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔'' (Oxford English Urdu Dictionary ... Shanul Haq Haqqi)

''ڈارونزم (نظریہ ارتقاء): 1859ء میں چارلس رابرٹ ڈارون نامی ایک پادری نے جو کیمبرج یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا لیکن اُسے طب' حیاتیات کا کوئی علم نہ تھا' "The Origin of Species by Means of Natural Selection" (''جانداروں کا نقطہ آغاز بذریعہ فطری انتخاب'') کے نام سے اپنی ایک کتاب شائع کی جس میں اُس نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ انسان ایک جانور ہے جس نے یک خلوی نامیوں (unicellular organisms) سے تدریجاً (رفتہ رفتہ) ترقی کی ہے اور انتخابِ طبعی (اصلح للبقاء Survival of the Fittest) کے ذریعے وہ بندروں کی نسل سے انسان ہونے تک پہنچا ہے۔ نظریہ ارتقاء اور اس سے ملتے جلتے نظریات کے علمبرداروں نے انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کائنات ازلی وابدی ہے اور اس میں پائے جانے والے تمام جاندار ازخود بے جان مادّے سے پیدا ہوئے۔ پہلے ایک خلیہ (CELL) پیدا ہوا جو تقسیم در تقسیم کے ایک لامتناہی عمل کے ذریعے مختلف جانوروں کی شکلیں اختیار کرتا چلا گیا۔ اس طرح زندگی کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامہِ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی مقصد اور مصلحت نہیں۔ یہ یونہی بن گیا ہے' یوں ہی چل رہا ہے اور یوں ہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا لہٰذا یا تو وہ ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شاید یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اُسے کس نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہر حال ہمیں اتنا سمجھنا چاہئے کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے' کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور دیتی ہے۔ وہ کچھ قویٰ اور آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لہٰذا اُس کی قوّتوں کا اس کے سوا کوئی مصرَف نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہشات وضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے اور دنیا کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لئے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ اوپر کوئی صاحبِ امر نہیں جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہٰذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اپنے لئے قانون وضابطہ بنانا اور اپنی قوّتوں کا مصرف تجویز کرنا اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعین کرنا اُس کا اپنا کام ہے۔ وہ اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو اپنے آپ کے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے ہے جو انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مسلط ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیاوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اِسی زندگی کی حد تک ہیں۔ لہٰذا صحیح اور غلط' مفید اور مضر' قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔''

''ان فلسفیانہ نظریات نے دہریت اور لادینی کے قدیم فلسفوں کو بڑی تقویت پہنچائی اور اُنہیں الٰہیات

اور اس سے متعلق دیگر نظریات کا مذاق اڑانے کا خوب موقع ملا۔ مگر اُن کی یہ خوش فہمی زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکی' کیونکہ اس نام نہاد سائنسی کمک کے غبارے سے سائنس ہی نے جلد ہوا خارج کر دی۔''

''جنییات (Genetics)' خورد حیات (وائرس اور پھپھوندی وغیرہ کا مطالعہ Microbiology) اور حیاتیاتی کیمیا (Biochemistry) کی سائنسز نے جو ڈارون کے عہد تک وجود میں نہیں آئی تھیں نظریہ ارتقاء کے تمام مزعومات کو غلط قرار دے دیا۔''

''کائنات کے ازلی وابدی ہونے کا عقیدہ مادّے کے لافانی (Indestructable) ہونے کے تصوّر پر استوار تھا مگر ایٹمی توانائی کے دریافت ہو جانے کے بعد اِس تخیّل کی بساط بھی الٹ گئی اور خود سائنس نے ثابت کر دکھایا کہ قوّت مادّے میں تبدیل ہو جاتی ہے ($E=mc^2$) اور مادّہ پھر قوّت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حرکیات کے دوسرے قانون (Second Law of Thermodynamics) نے بھی واضح کر دیا کہ جس طرح اس کائنات کا ایک نقطہ آغاز مسلّمہ ہے' اسی طرح اس کا ایک روز خاتمہ بھی یقینی ہے۔ اگر ڈارون کی طرف سے یہ نظریہ پیش کرنے سے پہلے یہ شعبے دریافت ہو چکے ہوتے تو ڈارون نے اس حقیقت کو بہ آسانی تسلیم کر لیا ہوتا کہ اُس کا نظریہ مکمل طور پر غیر سائنسی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اُس نے اس قسم کے بے معنی دعوے پیش کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ وہ معلومات جو جانداروں کا تعیّن کرتی ہیں' جین میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہیں اور انتخابِ طبعی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ جین میں تبدیلیوں کے ذریعے نئے جاندار وجود میں لائے جائیں۔''

غرضیکہ نظریہ ارتقاء کے علمبرداروں نے انسانوں کو اُن کے خالق کے وجود سے بے خبر اور لاتعلق رکھنے کا جرم ہی نہیں کیا بلکہ خود سائنس کو بھی بے سمت کر کے بے شمار قیمتی انسانی وسائل کو ضائع کر دیا ہے۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس'' اردو ترجمہ --- ہارون یحییٰ صفحات ۹'۸)

''ڈارون کے غیر حقیقی اور خیالی نظریات کچھ فکریاتی اور سیاسی حلقوں میں یہاں تک ہر دلعزیز ہوئے کہ وہ ملک کے تمام مادر ہائے علمی میں برسوں تک پڑھائے جاتے رہے اور یوں لگتا تھا کہ وہ اُن کے نزدیک ناقابلِ تردید سائنسی حقائق ہیں جس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ اُن دنوں علم کی سطح ایسی گہری نہیں تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ ڈارون کے تصوّراتی مفروضات پوچ اور لغو ہیں۔

''اسی طرح اُن دنوں دنیائے سائنس بھی ایک خلیے کی ساخت اور کام کے بارے میں بہت محدود اور ناتمام علم رکھتی تھی۔ اگر ڈارون کو برقیہ خورد بین کی مدد سے خلیے کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا ہوتا تو وہ اپنی نظروں سے خلیے کی پیچیدگی اور اُس کی غیر معمولی ساخت کو دیکھ لیتا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا کہ اِس قدر نازک اور پیچیدہ نظام کا معمولی سے معمولی تغیرات کے ذریعے ظہور پذیر ہونا ممکن نہ تھا۔ اگر وہ حیاتیاتی ریاضی کے بارے میں علم رکھتا تو اُسے احساس ہوتا کہ ایک واحد لحمیاتی سالمہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل خلیہ بھی اتفاقاً وجود میں نہیں آ سکتا۔ خلیے کا مکمل

مطالعہ برقیہ خوردبین کی ایجاد کے بعد ہی ممکن تھا۔ ڈارون کے زمانہ میں قدیم خوردبین ہی موجود تھی جس کی مدد سے خلیے کا صرف باہر والا حصّہ دیکھا جا سکتا تھا۔'' (''نظریہ ارتقاء۔ایک فریب'' (اردو) ہارون یحییٰ' ص ۲۸)

''جس دوران ڈارون کی کتاب مقبولِ عام ہو رہی تھی' گریگل مینڈل (Gregor Mendel) نامی ایک آسٹریلوی ماہر حیاتیات نے 1865ء میں اوصاف اور خصلتوں کی نسلاً بعد نسلاً منتقلی کے قوانین دریافت کئے۔ اُس صدی کے اختتام تک اس بارے میں کچھ زیادہ نہ سنا گیا تھا مگر 1900ء کے اوائل میں جینیات کے علم کی تخلیق کے ساتھ مینڈل کی دریافت نے بہت اہمیت حاصل کر لی۔ یہ جینیات کی سائنس کا آغاز تھا۔ کچھ عرصہ بعد جین اور لونیے (کروموسومز) کی ساخت دریافت کر لی گئی تھی۔ 1950ء کی دہائی میں ڈی این اے سالمے (DNA Molecule) کی دریافت نے جو جینی معلومات فراہم کرتا ہے' نظریہ ارتقاء کو بہت بڑے بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کا سبب ڈارون کی تجویز کردہ زندگی کی ناقابلِ یقین پیچیدگی اور ارتقائی میکانکی عمل کی باطل دلیل تھی۔ اس طرح کے انکشافات کا منطقی نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء منسوخ ہو کر تاریخ کے اوراق میں وقت کی گرد کی تہہ میں ہمیشہ کے لئے دب گیا ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا جس کا سبب یہ تھا کہ بہت سے حلقے اسے دہرانے' اس کی تجدید کرنے اور اس نظریئے کو بلند اٹھا کر سائنسی پلیٹ فارم پر رکھ دینے پر مصر تھے۔ ان کوششوں کا بامعنی مقصد صرف اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب ہمیں یہ احساس ہو کہ نظریہ کے پیچھے نظریاتی مقاصد ہیں نہ کہ سائنسی دلچسپیاں۔'' (ایضاً ص ۲۴'۲۵)

''ڈاروِنزم جو اس بات کا قائل ہے کہ زندگی غیر جاندار مادّے سے وجود میں آئی' دراصل اس حقیقت کے مقابل ناکام ہو گیا کہ کائنات کی تخلیق اللہ نے کی ہے۔ اس حقیقت کو ایک امریکی ماہرِ فلکیات یوں واضح کرتا ہے:

> ''اِلحاد (Atheism)' ڈاروِنزم اور فی الواقع تمام ''اِزم'' جو اٹھارویں صدی سے بیسویں صدی کے فلسفوں سے معرضِ وجود میں آئے' اس غلط مفروضے پر قائم ہیں کہ کائنات لامحدود ہے۔ بگ بینگ نظریہ # کے انوکھے پن نے ہمیں کائنات اور مافیہا بشمول زندگی کی علّت (Cause) کے رُوبرو لا کھڑا کیا ہے۔''
> ("The Fingerprint of God" ... Hugh Ross, p. 50)

ڈاروِنزم کا تمام تر زور وجودِ باری تعالیٰ کی نفی اور ارتقاء کے اصرار پر ہے جس کا طریق عمل پہلے ہی سے طے شدہ منصوبے کے تحت نہیں بلکہ ایک حادثاتی تغیر کی حیثیت سے جاری رہا۔ اس نظریہ کے مخالفین اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ تغیر (تبدیلی) ایک تعمیراتی طریقِ عمل نہیں بلکہ بہر حال یہ تخریبی عمل ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ جب حضرتِ انسان کو جانوروں کے ساتھ برابری کی حد تک پستی میں گرا دیا جائے تو اُس سے انسانیت کے شایانِ شان کسی بھی باوقار فعل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ بندروں جیسے کام کرے گا' اُس کا رویّہ بھی بندروں جیسا ہو گا اور بندروں اور درندوں کی طرح وہ جفتی کرے گا' جس میں جیون ساتھی' بیٹی اور بہن کے مابین کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لہٰذا بے حیائی' بداَخلاقی' اَخلاقی بے راہروی' بغاوت اور بدکاری نظریہ ارتقاء کے نمایاں خصائص ہیں۔ اس نظریہ کے حامیوں نے

یہ نظریہ کہ کائنات ایک زبردست مادّی دھماکے سے وجود میں آئی' Big Bang (انفجارِ عظیم) کہلاتا ہے جس کا ذکر سورۃ الانبیاء: ۳۰ میں ہوا۔

نے ابتدا ہی سے ہمیشہ اس نظریہ کے حق میں مضبوط بنیادیں اور برمحل 'مُسکت استدلال مہیا کرنے میں سرتوڑ کوشش کی ہے لیکن اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اس نظریہ کی تردید میں مختلف عیسائی سائنسدانوں نے کتابوں کی کتابیں لکھ ڈالیں اور ثابت کیا کہ یہ نظریہ معقولیت یا سائنس کے معیار پر کسی بھی طرح پورا نہیں اُترتا۔

فطری انتخاب کیا ہے؟ فطرت کا ایک عمل یعنی قدرتی انتخاب ڈارون سے پہلے ماہرینِ حیاتیات کے علم میں تھا۔ اُنہوں نے اسے ''ایک ایسا میکانکی عمل بتایا جو جانداروں کو کسی بگاڑ اور خرابی سے گزرے بغیر غیر متبدل رکھتا ہے۔'' ڈارون وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اِس عمل میں ارتقائی قوت موجود ہے اور پھر اُس نے اپنے مکمل نظریے کی بنیاد اِسی دعویٰ پر اٹھائی۔ اُس نے جو نام اپنی کتاب کو دیا' اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطری انتخاب ڈارون کے نظریے کی بنیاد تھا۔ تاہم ڈارون کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایک بھی ثبوت ایسا نہیں مل سکا جس نے سامنے آکر یہ ظاہر کیا ہو کہ فطری انتخاب جاندار چیزوں کو ارتقائی عمل سے گزارتا ہے۔ کولن پیٹرسن جو انگلستان کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں ایک سینئر ماہرِ قدیم حیاتیات ہے اور جو اس کے ساتھ ساتھ ایک نامور ارتقاء پسند بھی ہے' اس بات پر زور دیتا ہے کہ فطری انتخاب کو کبھی بھی اس طرح تصور نہیں کیا گیا کہ یہ کوئی ایسی قوت رکھتا ہے جس سے چیزیں ارتقائی عمل سے گزرنے لگتی ہوں۔ وہ لکھتا ہے :

> ''آج تک کوئی بھی فطری انتخاب کے میکانکی عملوں کے ذریعے جاندار پیدا نہیں کر سکا' نہ کوئی اس کے قریب تک بھی آیا ہے اور نوڈارونیت میں جو دلائل ملتے ہیں' اُن کا تعلق اسی سوال سے ہے۔''
>
> ("Cladistics".. Colin Patterson)

''فطری انتخاب کا موقف یہ ہے کہ وہ جاندار چیزیں جو اپنی جائے پیدائش کے قدرتی مزاج سے زیادہ موافقت رکھتی ہوں وہ اولاد کے ذریعے زندہ رہ جائیں گی جبکہ وہ جو ناموافق ہوں گی' مٹ جائیں گی۔ مثال کے طور پر ہرنوں کے ایک ریوڑ میں سے جو جنگلی جانوروں کے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں' قدرتی طور پر وہی بچ جائیں گے جو تیز دوڑ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن قطع نظر اس بات کے کہ یہ عمل کب تک جاری رہتا ہے' یہ ان ہرنوں کو دوسرے جانداروں میں تبدیل نہیں کر دے گا اور ایسی ماہیت قلبی ممکن نہیں ہوگی۔ ہرن ہمیشہ ہرن ہی رہیں گے۔'' (''نظریہ ارتقاء ۔۔ ایک فریب'' ہارون یحییٰ صفحات ۳۱' ۳۲)

''کائنات میں منصوبہ بندی سے انکار کے باعث سائنس کو پہنچنے والے نقصانات : مادّہ پرستوں نے نہ صرف یہ دعویٰ کیا کہ کائنات ازل سے موجود ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی داغ دیا کہ کائنات میں کوئی منصوبہ بندی (ڈیزائن) نہیں اور اس کے پیچھے کوئی مقصد بھی کارفرما نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کائنات میں جو توازن و توافق اور جو نظم پایا جاتا ہے' یہ بھی ایک مظہرِ اتفاقات ہے۔ اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف حصّہ کے آغاز سے دنیائے سائنس پر یہی دعویٰ مسلط رہا اور اسی نے سائنسی تحقیق کے باقیماندہ سفر کا رخ متعین کر دیا۔''

''مثال کے طور پر بعض سائنسدانوں نے ایک مفروضہ پیش کیا جسے ''نظریہ انتشار'' (Chaos Theory) کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات کے اندر نظم و ترتیب کے فقدان کا دعویٰ ہے۔ اس نظریہ کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ ''انتشار سے خود بخود ہی ظہورِ نظم و ترتیب ہو جائے گا۔'' چنانچہ اس دعویٰ کی تائید میں کئی مطالعات ہوئے۔ ریاضیاتی اعداد و شمار، نظریاتی طبعیات اور کیمیائی تجربات کی مدد سے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش ہوتی رہی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ کائنات کا وجودِ ماحاصل انتشار و بے ترتیبی ہے۔''

''تاہم ہر نئی دریافت ''بے ترتیبی'' اور ''اتفاقات'' کے نظریوں کی مزید تردید کرتی رہی اور ثابت کرتی رہی کہ کائنات میں زبردست ترتیب و منصوبہ بندی کارفرما ہے اور کائنات میں کمال درجے کا مادّی توازن پایا جاتا ہے۔ اُس کے جزئیات اس باریک بینی سے ایک دوسرے سے پیوست ہیں کہ اُنہوں نے زندگی کے وجود کو ممکن بنا دیا ہے۔ یہ بدنظمی نہیں بلکہ کامل ترین نظم کا ظہور ہے۔ جوں جوں تحقیق کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا، یہ حقیقت تابناک تر ہو کر سامنے آتی رہی کہ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی اور بنیادی قوّتوں (مثلاً تجاذب اور الیکٹرومیگنیٹزم، ایٹموں اور عناصرِ کائنات) کے تمام کے تمام قوانین کو اس طرح آپس میں منظّم و مرتّب کیا گیا ہے کہ بنی نوعِ انسان کی زندگی برقرار رہ سکے۔ سائنسدان اِس غیر معمولی منصوبہ بندی کو ''اُصولِ بشری'' (Anthropic Principle) کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہ اُصول ہے جس سے کائنات کے تمام جُزئیات انسانی زندگی کو ممکن بنانے کے لئے بڑی حکمت و احتیاط کے ساتھ مرتّب کئے گئے ہیں۔''

''اِن دریافتوں نے سائنسدان برادری پر مادّہ پرستانہ فلسفوں کے مسلّط کردہ اِس مقولے کو رد کر کے اس کا غیر سائنسی مغالطہ ثابت کر دیا۔ ممتاز مالیکیولر بیالوجسٹ مائیکل ڈینٹن نے اپنی کتاب ''مقدرِ فطرت: قوانینِ حیات مقصدِ کائنات کا کیسے اثبات کرتے ہیں'' میں لکھا ہے) بحوالہ ''قرآن رہنمائے سائنس''۔ ہارون یحییٰ ص ص ۳۳۔:

''20 ویں صدی کے علمِ فلکیات سے جس نئی تصویر کا ظہور ہوا ہے، وہ پچھلے چار سو سال کے بیشتر حصّے میں سائنسدان حلقوں میں مروّج اِس مفروضے کے لئے ایک ڈرامائی چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے کہ زندگی اس نقشۂ کائنات میں محض اتفاقاً ظہور پذیر ہوئی ہے۔۔۔۔ جدید علمِ تکوینیات اور علمِ طبعیات نے بعینہٖ اسی قسم کے شواہد مہیا کر دیئے ہیں جن کی ماہرینِ مذہبِ فطرت کو سترہویں صدی میں تلاش رہی ہے مگر اس زمانے کی سائنس اُنہیں وہ شواہد فراہم نہیں کر سکتی تھی۔'' ("Nature's Destiny : How the Laws of Biology Reveal Purpose in the Universe", p.1415, N.Y. 1998)

نظریہ اِرتقاء کے ردّ میں قرآنی، سائنسی و عقلی دلائل

(1) ''حیات از غیر حیات (Abiogenesis) اور حیات از حیات (Biogenesis) کے نظریات: اوّل الذکر نظریئے کا تعلق مادہ پرستانہ فلسفہ سے ہے جبکہ مؤخر الذکر نظریئے کا منبع مذہبی تعلیمات ہیں۔ مادّہ پرست فلسفیوں کی طرف سے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ غیر جاندار اشیاء میں سے زندہ مادّوں کا جنم لے سکنا ممکن ہے۔''

''اس کے برعکس الٰہیاتی تعلیمات کا اِصرار ہے کہ غیر جانبدار مادّوں کو زندگی عطا کرنے والی واحد ہستی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے جو خالقِ حقیقی ہے۔ ذیل کی دو آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہوں :۔

(۱) اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ٥ (الانعام : ۹۵)

''دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے' پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟''(۶:۹۵)

(۲) لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ''٥(اَلحدید: ۲)

''زمین اور آسمانوں کی سلطنت اُسی کی ہے' زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔''

(2) کائنات میں پھیلی ہوئی انواع قسم کی مخلوقات اپنے خالقِ واحد کا پتہ دیتی ہیں : اس خاکدانِ گیتی پر لاکھوں زندہ اجسام موجود ہیں جن کی انواع و اَقسام ایک دوسرے سے متعدد پہلوؤں سے مختلف ہیں۔ مثلاً گھوڑوں' پرندوں' سانپوں' تتلیوں' مچھلیوں' بلیوں' چمگادڑوں' کیڑوں مکوڑوں' چیونٹیوں' ہاتھیوں' مچھروں' شہد کی مکھیوں' ڈولفنز' شارفش اور اونٹوں پر غور کیجئے۔ یہ جاندار ایک دوسرے سے جسمانی خصوصیات' عادات' شکار کے طریقوں' اپنے دفاعی حربوں' غذائی عادتوں اور بقائے نسل کے طریقوں کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر یہ کیسے وجود میں آئے؟

اِس سوال پر غور کرنے سے معمولی عقل والا انسان بھی سمجھ جاتا ہے کہ اُنہیں باقاعدہ ''ڈیزائن'' کیا گیا ہے یعنی ایک منصوبے کے تحت پیدا کیا گیا ہے اور ہر ڈیزائن ایک ذہین ڈیزائنر کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے جس نے اُنہیں پیدا کیا۔ فطرت میں پائی جانے والی دیگر مثالوں کی طرح زندہ اجسام بھی اللہ کے وجود کی گواہی دیتے ہیں۔ اس سچائی سے مذہب نے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ زندہ اجسام کس طرح وجود میں آئے۔ تمام زندہ اجسام کو رب تعالیٰ نے الگ الگ وجود عطا کئے۔ اُس نے اپنی بے مثال قدرتِ تخلیق اور زبردست علم وحکمت سے ان سب مخلوقات کو قسما قسم کی شکلیں اور خصوصیات عطا فرمائیں۔ اس طرح بنی نوعِ انسان کو اپنی زبردست طاقت اور علم وبصیرت سے مطلع کیا۔ بعض آیاتِ قرآنی میں زندہ چیزوں کا ذکر یوں آتا ہے :

(۱) وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ٥ ھٰذَا خَلْقُ اللّٰہِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ٥(لقمٰن:۱۰'۱۱)

''اُس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دئے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق' اب ذرا مجھے دِکھا دو' اُن دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔'' (۱۰' ۱۱ : ۳۱)

(۲) وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْھِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَھُوَ عَلٰی جَمْعِھِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ''٥ (اَلشّورٰی : ۲۹)

''اُس کی نشانیوں میں سے زمین وآسمان کی پیدائش ہے اور یہ جاندار مخلوقات جو اُس نے دونوں جگہ (آسمان وزمین میں) پھیلا رکھی ہیں' وہ جب چاہے اُنہیں اکٹھا کر سکتا ہے۔'' (۲۹ : ۴۲)

(۳) وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ آيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (اَلْجَاثِيَة : ۴)
''اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور اُن حیوانات میں جنہیں اللہ (زمین و آسمان میں) پھیلا رہا ہے' یقین رکھنے والوں کے لئے (بڑی) نشانیاں ہیں۔'' (۴۵ : ۴)

(3) ماں کا دودھ : ''ماں کا دودھ بچے کی غذائی ضرورتوں کے عین مطابق بنتا ہے اور اُس کی مرحلہ وار ضرورتوں کے مطابق اُس میں ردّوبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جس روز بچے کا جسم پوٹاشیم مانگتا ہے' اُس دن ماں کے دودھ میں پوٹاشیم کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح دیگر اجزاء کی طلب کا جواب بھی ماں کے دودھ کے ذریعے ملتا رہتا ہے۔ اسی طرح بچے کی پیدائش کے ابتدائی دنوں میں ماں کا دودھ پتلا ہوتا ہے کیونکہ اُن دنوں بچے کا معدہ گاڑھا دودھ ہضم نہیں کرسکتا۔ بچے کا نظام ہضم مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دودھ بھی گاڑھا ہوتا جاتا ہے۔ یہ انتظام ایک خاص حکمت اور منصوبے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اندھے بہرے اتفاقات سے بننے والی چیزوں میں ایسے اہتمام کا موجود ہونا ممکن نہیں ہوتا۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس''۔ ہارون یحییٰ ص ص ۵۶' ۵۷)

''اللہ تعالیٰ نے ماں کے دودھ کو نوزائیدہ بچوں کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور تحفہ بے نظیر بنایا ہے جو بچوں کے لئے بہترین غذا ہے' اُن کی بڑھوتری کا سامان بھی ہے اور بیماریوں کے خلاف مؤثر دفاع بھی ہے۔ دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس فیکٹریاں جتنا بھی عمدہ کوالٹی کا دودھ تیار کریں' وہ ماں کے قدرتی دودھ کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ آج آئے دن ماں کے دودھ کے نئے نئے فوائد دریافت ہو رہے ہیں۔ ان نئے حقائق میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ نومولود کو دو سال تک دودھ پلاتے رہنا بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔'' (ایضاً ص ص ۱۴۳' ۱۴۴)

نوٹ: (۱) ماں کے دودھ کی اہمیت' اُس کی افادیت اور (۲) دو سال تک بچے کو دودھ پلانے کی حکمت کو انشاء اللہ ''رضاعت'' کے عنوان کے تحت اگلی کسی جلد میں بیان کیا جائے گا۔ سرِ دست انہیں اِسی انسائیکلوپیڈیا کے حصہ انگریزی کی جلد سوم کے صفحات 54-2152 پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(4) ماں کے دودھ اور جانوروں کے دودھ وغیرہ میں الٰہی کرشمہ سازیاں : دیکھئے صفحات ۳۲۳ تا ۳۳۸ (جلد اوّل)۔

(5) حرحرکیات (Thermodynamics) کا دوسرا قانون نظریہ ارتقاء کا ردّ کرتا ہے: رجوع کیجئے جلد اوّل کے صفحات ۲۳۸' ۲۳۹۔

(6) تبدیلی توارث کا چیستاں (Mutation Impasse) : نظریہ ارتقاء کا ایک دعویٰ ''مفید تبدیلی توارث'' تھا۔ اس سے مراد وہ تبدیلیاں ہیں جو کسی وجود کے خلقی یا تولیدی ضابطے (Genetic Code) میں

تابکاری یا کیمیائی مادّے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظریئے کے علمبرداروں کا دعویٰ ہے کہ جانداروں نے ''عملِ تبدیلیِ توارث'' کی وجہ سے ارتقاء پایا لیکن حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ یہ عمل تو ہمیشہ ضرر رساں ہوتا ہے۔ یہ جانداروں میں بدنظمی و بداطواری کے سوا کچھ بھی پیدا نہیں کرتا۔ سانحہ چرنوبل اس کی جدید ترین مثال ہے۔ اس روسی ری ایکٹر میں تابکاری پھوٹ نکلنے کا نتیجہ شدید تباہی کی صورت میں نکلا تھا۔ یہ تبدیلیِ توارث ہی تھی۔ اس کے بعد کے اثرات اس صورت میں برآمد ہوئے کہ ہزاروں لوگ لیوکیمیا (خون میں سفید ذرّات کی بہتات) اور بلڈ کینسر میں مبتلا ہو گئے اور ہزاروں بچے معذور پیدا ہوئے۔''

''تبدیلیِ توارث کے منفی اثرات کے باوجود ڈارونیتِ نَو کے علمبرداروں نے ایک اور پینترا بدلا۔ اُنہوں نے ''ارتقائی میکنزم'' کے دو تصوّرات پیش کر دیئے جن میں سے ایک کو ''مضر تبدیلیِ توارث'' کا نام دیا جو نقصان دہ ہے اور دوسرے تصوّر کو ''مفید تبدیلیِ توارث'' کا نام دیا جس کے ذریعے جاندار 'بقول اُن کے' ترقی کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حقیقت یہی ہے کہ تبدیلیِ توارث ہمیشہ اور ہر صورت میں ضرر رساں ہوتی ہے اور ارتقاء کا ذریعہ ہرگز نہیں بنتی۔''

''اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے ارتقاء کے علمبرداروں نے مصنوعی تبدیلیِ توارث کے ماڈل تیار کئے اور اُن سے حسبِ خواہش نتائج حاصل کرنے کے لئے بیسیوں برس محنت کر کے اُن کا بار بار مشاہدہ کرتے رہے۔ اُنہوں نے فروٹ کی مکھیوں کو تبدیلیِ توارث کے عمل سے سالہا سال گزارا تا کہ اُن کے تولیدی ضابطے میں کوئی ترقی دیکھ سکیں لیکن ان میں بری طرح ناکامی ہوئی۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس''۔ ہارون یحییٰ ص ص ۶۰، ۶۱)

سورۃ الاحزاب اور سورۃ المجادلۃ کی مندرجہ ذیل دونوں آیات اگرچہ ظہار (زمانہ جاہلیت کی طلاق) کی حرمت سے متعلق ہیں لیکن اگر اُنہیں بالواسطہ طور پر زیرِ نظر ''تبدیلیِ توارث'' کے منفی اثرات پر منطبق کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)۔

(۱) وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَآءَكُمْ أَبْنَآءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ ---- اُدْعُوهُمْ لِآبَآئِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللّٰهِ (الاحزاب: ۴، ۵)

''اُس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنا دیا' یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے۔ ۔۔ اُنہیں اُن کے باپوں کی طرف منسوب کرو کہ یہی اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے۔'' (۴، ۵ : ۳۳)

(۲) اِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا الّٰئِي وَلَدْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا (المجادلۃ : ۲)

''اُن کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے اُن کو جنا ہے اور یہ لوگ یقیناً ایک نامعقول بات اور جھوٹ کہہ رہے ہیں۔'' (۲ : ۵۸)

(7) رِحمِ مادر میں بچے کے تین مراحل : قرآن مجید بچے کے رحمِ مادر میں نشوونما پانے کے تین مراحل یوں بیان کرتا ہے :

يَخۡلُقُكُمۡ فِىۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ خَلۡقٍ فِىۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ‌ؕ ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَهُ الۡمُلۡكُ‌ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ۚ فَاَنّٰى تُصۡرَفُوۡنَ ○ (اَلزُّمَر : ۶)

''وہ تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا پالنہار ہے' بادشاہی اُسی کی ہے' اُس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟'' (۶ : ۳۹)

''جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ انسان کو رحمِ مادر میں تین مرحلوں میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ جدید علم الحیات نے بھی رحم میں جنین کے تین واضح حصّوں میں نشو ونما پاتے ہوئے دریافت کیا ہے۔ آج ایمبریالوجی کی تمام نصابی کتابوں میں جو میڈیکل کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں' اس موضوع کا بنیادی معلومات کے طور پر مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس شعبے میں بنیادی حوالے کی ایک کتاب (Basic Human Embryology) میں لکھا ہے:

''بچہ دانی میں زندگی کے تین مراحل ہوتے ہیں: قبل از جنین' ابتدائی ڈھائی ہفتے تشکیلِ جنین' آٹھویں ہفتے کے اختتام تک اور آٹھویں ہفتے کے بعد جنین کی نشو ونما تا وضعِ حمل۔'' (Basic Human Embryology... Williams, 3rd Edition, 1984, p. 64)

''قبل از جنین مرحلہ: رحمِ مادر میں اوّلیں مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ بارآور شدہ خلیہ (Zygote) تقسیم در تقسیم کے عمل کے ذریعے خلیوں کا ایک گچھا بن جانے کے بعد خود کو رحم کی دیوار کے اندر دفن کر لیتا ہے اور وہاں پہنچ کر اپنی بڑھوتری کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور بالآخر یہ خلیے خود کو تین تہوں میں منظم کر لیتے ہیں۔''

''مرحلہ جنین: جنین کا یہ دوسرا مرحلہ ساڑھے پانچ ہفتے پر محیط ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں بچے کے بنیادی اعضاء اور جسم کے مختلف نظام اپنی ابتدائی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ خلیوں کی تہوں کی صورت میں طے ہوتا ہے۔''

''حتمی نشو ونما کا مرحلہ : یہ مرحلہ قرارِ حمل کے آٹھویں ہفتے سے لے کر وضعِ حمل تک ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ خلیوں کا یہ مجموعہ تقریباً تقریباً انسانی روپ دھار لیتا ہے جس میں چہرہ اور ہاتھ پاؤں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کی لمبائی اگرچہ ابتدا میں تین سنٹی میٹر ہوتی ہے لیکن اس میں بڑی حد تک انسانی شکل و شباہت ابھر آتی ہے۔ یہ مرحلہ تقریباً تیس ہفتوں تک رہتا ہے جس میں جنین کی جسامت مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ جنین کی نشو ونما کا مشاہدہ صرف جدید آلات کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ تاہم دیگر بہت سی معلومات کی طرح ان معجزاتی واقعات کا بھی قرآن میں ذکر موجود ہے۔ ان صحیح ترین اور تفصیلی حقائق کا ایسے زمانہ میں انکشاف کرنا جبکہ عام لوگوں کے پاس ان سے متعلق علم بہت کم تھا' قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی مزید ایک شہادت ہے اور یہ بھی کہ اندھے بہرے اتفاقات سے بننے والی چیزوں میں ایسے اہتمام کا موجود ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ (''قرآن رہنمائے سائنس'' (اردو ترجمہ)--- ہارون یحییٰ ص ص ۱۴۲' ۱۴۳)

(8) کائنات ایک ''نقطہ بھر مادے'' میں دھماکے سے معرضِ وجود میں آئی جس کا حجم صفر تھا۔ اس دھماکے کو ''انفجار عظیم'' یا Big Bang کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کی نا قابلِ تردید شہادت ہے جس سے مادّہ پرستوں کے اس دعویٰ کے غبارے سے ہوا نکل گئی کہ کائنات ازلی اور ابدی ہے۔ حقیقتِ ازلی سے انکار کرنے والوں کی طرف قرآن مجید نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے!

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء : ۳۰)

''کیا کافروں کو علم نہیں کہ آسمان اور زمین آپس میں جڑے ہوئے تھے' پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا۔'' (۳۰: ۲۱)

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں جلد دوم کے صفحات ۸۵۸' ۸۵۹۔

انفجارِ عظیم (Big Bang) کے حوالے سے کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کی شہادت کی توثیق ہو جانے سے مادہ پرست سائنسدان لڑکھڑا گئے۔ اپنی وسیع پیمانے پر کی گئی تحقیق' اپنے مفروضوں اور تصدیق طلب نظریوں کے یکے بعد دیگرے پول کھل جانے سے اُن پر شدید سراسیمگی طاری ہو گئی۔ اس کے برعکس بہت سے سائنسدان جنہوں نے وجودِ خداوندی سے غیر مشروط انکار نہیں کیا تھا' آج تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق وہی قادرِ مطلق ہے۔ ایک ایسی مثال امریکی سائنسدان ولیم لین کریگ (William Lane Craig) ہے جسے بگ بینگ (انفجارِ عظیم) پر اپنی ریسرچ کی وجہ سے شہرت ملی۔ چنانچہ کریگ لکھتا ہے:

''اس مقولے کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے کہ ''جس کا اپنا وجود نہ ہو' وہ کسی کو وجود نہیں دے سکتا'' بگ بینگ (انفجارِ عظیم) کے لئے ایک مافوق الفطرت سبب درکار تھا۔ چونکہ ابتدائی کونیاتی انفرادیت (Cosmological Singularity) ہر قسم کے زمان و مکان کے خط متدیر (Trajectories) کی نفی کرتی ہے اس لئے بگ بینگ کے لئے کوئی مادّی (فزیکل) سبب نہیں ہو سکتا۔ اسے لازماً کائنات سے ماورائی اور نا قابلِ تصور طاقت کا مالک ہونا چاہئے۔ علاوہ ازیں اسے منفرد ہستی اور شخصیت کا مالک بھی ہونا چاہئے جو اپنی خود مختارانہ مرضی و ارادہ رکھتا ہو۔ لہٰذا آفرینشِ کائنات کا سبب ایک شخصی خالق ہی ہو سکتا ہے جس نے کسی زمانہ مدید میں اس کو اپنی آزاد مرضی سے وجود عطا کیا۔'' (''کائنات اور اُس کا تخلیق کار --- ابتدا اور اُس کی صورت گری'' --- ولیم لین کریگ' ج ۱۷' ص ۱۸)

''نظریہ انفجار عظیم سے ایک اور نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کائنات کے رازوں کو بے نقاب کرنے کے لئے وہی سائنسی اپروچ کامیاب ہو سکتی ہے جو الٰہیاتی علم و عرفان پر مبنی ہو۔ جن سائنسدانوں نے مادّہ پرستانہ فلسفے سے اپنی تحقیق کا آغاز کرتے ہوئے لامحدود کائنات (Infinite Universe) کا تصوّر پیش کیا وہ اپنی بہترین مساعی بروئے کار لانے کے باوجود اس کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں لا سکے۔ تاہم نظریہ انفجار عظیم جس کی آبیاری میں جارج لیمیٹر نے اپنا کردار ادا کیا اور جو الٰہیاتی حوالوں پر مبنی تھا ایک مثبت سائنسی پیشرفت تھی جس سے آفرینشِ کائنات کے حقیقی سبب (خالقِ حقیقی) کی نشاندہی ہو گئی۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس'' -- ہارون یحییٰ' ص ص ۳۰۔۳۲)

(9) ایک امریکی ماہرِ فلکیات ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے اپنی پہلی دیو قامت دُوربین سے یہ مشاہدہ کیا کہ ستارے ہم سے دُور دُور جا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے بھی مسلسل دُور ہو رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات مزید وسعت اختیار کر رہی ہے۔ اس طرح وہ جامد (Static) نہیں جیسا کہ مادّہ پرستوں نے عرصہ دراز سے یہ مفروضہ قائم کر رکھا تھا۔ کائنات کے قرآنی نظریہ ''وسعت پذیری'' کو بالآخر آج کی سائنس نے تسلیم کر ہی لیا اور اس طرح قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کا اعتراف کر لیا۔ قرآن مجید میں کائنات کی وسعت پذیری کا ذکر یوں ہوا : وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِأَيْدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ o (اَلذّٰرِيٰت : ۴۷) ''اور ہم نے آسمان کو دستِ قدرت سے بنایا اور ہم یقیناً (اُسے) پھیلا رہے ہیں۔'' (۴۷ : ۵۱)

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں جلد دوم کے صفحات ۸۵۴' ۸۵۵)

(10) کائنات کا سُکڑاؤ (Big Crunch): دیکھئے صفحات ۸۵۷' ۸۵۸ (جلد دوم)۔

(11) ڈارونزم کے برعکس قرآن مجید انسان کو باوقار مقام عطا کرتا ہے : دیکھئے صفحات ۲۴۱ تا ۲۶۴ (ج ا)

(12) انسانی تخلیق کے کیمیائی اور حیاتیاتی دونوں طریق ہائے عمل خدائی حکمت و دانش کی بلندترین چوٹی ہیں: ملاحظہ ہوں جلد اوّل کے صفحات ۲۴۶ تا ۲۵۲۔

(13) نظریہ ارتقاء کے حامیوں کے مفروضہ ''حادثاتی کائنات'' کا ردّ ہارون یحیٰی نے بڑی کامیابی اور مہارت سے اپنی کتاب میں کیا ہے جو بڑا ہی روح پرور ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات ہدیہ قارئین ہیں:

''(الف) ہمارے جسموں میں خون کا بڑا کام خوراک کی منتقلی ہے۔ وہ تمام مادّے جن کی ہمارے جسموں کو ضرورت ہوتی ہے' متعلقہ اعضاء کو خون کے ذریعے پہنچائے جاتے ہیں۔ اس دوران خون کے خلیے کاربن ڈائی آکسائڈ کی طرح کے ناکارہ مواد کو جمع کر کے یقینی طور پر اُن کا جسم سے اِخراج کر دیتے ہیں۔ گویا کہ خون کوڑا کرکٹ کو پیسنے کی چکی کے طور پر کام کرتا ہے۔ ایک سو کھرب خلیوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ غیر ضروری مواد کو اکٹھا کر کے اُس کا جسم سے اخراج کرنا خون کا دن بھر کا کام ہوتا ہے۔''

''خون کو قدرت کی طرف سے یہ سمجھا دیا گیا ہوتا ہے کہ جو مواد وہ لے کر چلتا ہے' اُسے کہاں پہنچانا ہے اور اسے کیسے استعمال میں لانا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ایک خلیے کو غلطی سے وہ کاربن ڈائی آکسائڈ نہیں پہنچاتا جسے اُس نے کسی اور خلیہ سے ناکارہ مواد کے طور پر لیا ہے۔ خون خلیوں کو ہمیشہ آکسیجن مہیا کرتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو خارج کرتا ہے۔ خون یہ کام غلطی اور اُکتاہٹ و تھکاوٹ کے بغیر انجام دیتا ہے کیونکہ یہ اُس کامل منصوبہ بندی کا ایک جزو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں پیدا کر دیا ہے۔''

(ب) خونِ میں کارپردازانِ عمل (Soldiers in the Blood): ہمارے جسم روزانہ کئی بیکٹیریا' وائرس اور زندگوں (خرد حیویہ Microbes) کے خلاف جنگ لڑتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ کو جسم میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے اور کچھ داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُن سے برسرِ پیکار ہونے کے لئے ہمارے جسموں میں Immune Cells (مامونی خلیے) نام کے خاص قسم کے حفاظتی خلیے ہیں جو ایسے ہی ہیں جیسے فوجی دشمن کے خلاف لڑتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمارے جسموں کی خطرات سے حفاظت کرتے ہیں اور دورانِ خون میں رواں دواں رہتے ہیں۔ جب کبھی دشمن حملہ آور ہوتا ہے تو یہ خلیے خون کی نالیوں کے ذریعے جسم کے متعلقہ حصّہ میں پہنچ کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِن خلیوں کو جو بہ ظاہر نظر نہیں آتے' یہ منصوبہ بندی سکھائی ہے اور اُنہیں ہماری خدمت پر لگا دیا ہے۔'' ("Miracles in Our Bodies" ... Harun Yahya, pp. 52-55)

(ج) ''خونِ بطور ذریعہ اِبلاغ: جسم میں خون بطور اِبلاغ کے بھی خدمت انجام دیتا ہے۔ جسم کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ تک پیغام پہنچانے کے لئے پیغام رساں ہیں۔ ہارمونز (Hormones) نامی یہ پیغام رساں ڈاک تقسیم کرنے والے ڈاکیے کی طرح متعلقہ اعضاء کو پیغام پہنچاتے ہیں۔ جسم کی بڑھوتری' پیاس' پسینہ اور بلڈ شوگر کی سطح جیسے اہم طریق ہائے عمل ایسے ہی پیغام رساؤں کے رہینِ منّت ہیں۔'' (ایضاً ص ۵۶)

نوٹ: انسانی دانتوں' نظامِ ہضم' دل اور دماغ میں الٰہی کرشمہ سازیوں کے لئے دیکھئے جلد اوّل کے صفحات ۳۴۲ تا ۳۴۸)

خلاصہِ کلام: یہ ہوا کہ کُل جسمِ انسانی کا ہر ہر جزو ہماری روزمرّہ زندگی میں اپنا بلا توقف (نان سٹاپ) کام باقاعدگی سے انجام دئے جا رہا ہے۔ اُس اِتمام و تکمیل کا یقیناً کوئی سبب (Cause) ہے جو ہمیں زندگی کے ہر لمحے حاصل ہے۔ ایسا بے خطا اور ہر طرح مکمل نظام خود بخود وجود میں نہیں آ گیا اور نہ ہی یہ اندھی کاریگری کا نتیجہ ہے کہ اس تمام عمدہ اور بہترین نظام کو اتفاقی یا حادثاتی کہا جا سکے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ ایسی ذات کا پیدا کردہ ہے جو عقلِ کُل اور اعلیٰ ترین ذہانت کا منبع ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۲ میں اللہ تعالیٰ ہمیں مخاطب ہوتے ہوئے فرماتا ہے کہ اُس کے سوا رشتۂ عبودیت کسی سے بھی جوڑنا درست نہیں ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ''o

''یہ ہے تمہارا پالنہار' اُس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں' ہر شے کا پیدا فرمانے والا ہے' پس اُسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے۔'' (۱۰۲ : ۶)

(14) بارش کا تناسب: قرآن مجید میں بارش کے بارے میں ایک اور حقیقت یہ بتائی گئی ہے کہ ایک خاص مقدار میں برسائی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الزُّخرُف کی آیت ۱۱ میں بیان ہوا:

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ o (الزُّخرُف: ۱۱)

''وہی تو ہے جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا ہے اور اُس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جلا اُٹھاتا ہے۔ ایک دن تم بھی اِسی طرح زمین سے برآمد کئے جاؤ گے۔'' (۱۱ : ۴۳)

''ناپی ہوئی مقدار میں بارش برسنا جدید تحقیق سے بھی دریافت کرلیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ زمین سے ایک سیکنڈ میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ٹن پانی بخارات بن کر اوپر چلا جاتا ہے۔ اس سے ایک سال میں دنیا بھر سے 513 ٹریلین ٹن پانی بخارات بن کر اُڑتا ہے (ٹریلین دس کھرب کے برابر ہوتا ہے) اور یہی مقدار بصورتِ بارش سال میں زمین پر واپس آجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پانی ایک خاص مقدار میں متواتر گردش کرتا رہتا ہے۔ زمین پر زندگی کا انحصار پانی کی اسی گردش پر ہوتا ہے۔ اگر اہلِ دُنیا اپنی تمام دستیاب ٹیکنالوجی استعمال کرلیں تب بھی وہ مصنوعی طور پر اِس گردش کو رُوبہ عمل نہیں لاسکیں گے۔ اگر اس توازن میں معمولی سا انحراف بھی آجائے تو اس سے ماحول میں شدید بگاڑ پیدا ہوجائے گا جو روئے زمین پر زندگی کے خاتمے پر منتج ہوگا۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ بارشیں ہر سال ایک ہی تناسب سے ہوتی ہیں۔'' [''قرآن رہنمائے سائنس'' (اردو ترجمہ) ہارون یحییٰ ص ۱۴۳]

(15) ''<u>سمندروں کا آپس میں خلط ملط نہ ہونا</u>: حالیہ تحقیق کے نتیجہ میں سمندروں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت سامنے آئی ہے جس کا قرآن مجید صدیوں پہلے ذکر کرچکا ہے۔ سورۃ الفرقان اور سورۃ الرَّحمٰن میں فرمایا:

(i) وَهُوَالَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ ''فُرَاتٌ'' وَّ هٰذَا مِلْحٌ ''اُجَاجٌ'' وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًاo (اَلْفُرقان : ۵۳)

''وہ وہی اللہ ہے جس نے دو دَریاؤں کو ملایا' ایک شیریں تسکین بخش ہے اور ایک کھاری' تلخ ہے اور دونوں کے درمیان ایک حجاب اور ایک مانع قوی رکھ دیا۔'' (۵۳ : ۲۵)

(ii) مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِo بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ '' لَّا یَبْغِیٰنِo (الرَّحمٰن : ۱۹' ۲۰)

''اُسی نے دو دریاؤں کو ملادیا کہ باہم ملے ہوئے بھی ہیں اور دونوں کے درمیان ایک حجاب بھی حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔'' (۵۵ : ۲۰'۱۹)

''سمندروں کی اِس خصوصیت کو کہ وہ ایک دوسرے سے آملنے کے باوجود آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے' ماہرینِ بحری جغرافیہ (Oceanographers) نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ یہ ایک طبعی قوّت ''سطحی تناؤ'' (Surface Tension) کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ سمندروں کے پانی آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ اِن پانیوں کی کثافتوں (Density) کے مختلف ہونے کی بناء پر سطحی تناؤ انہیں آپس میں خلط ملط ہونے سے باز رکھتا ہے جیسے اُن کے مابین ایک پتلی دیوار حائل ہوگئی ہو۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب اہلِ دُنیا علم طبیعیات (فزکس) ''سطحی تناؤ'' یا ''علمِ بحری جغرافیہ'' سے نابلد تھے' اُنہیں اس حقیقت سے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کے ذریعے باخبر کردیا۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس'' ص ۱۴۴)

''ماہرینِ فن کا بیان ہے کہ سطحِ زمین کے نیچے پانی کے دو مستقل نظام جاری ہیں۔ ایک سلسلہ آبِ شور کا ہے جو سمندروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا سلسلہ آبِ شیریں کا ہے جو عموماً کنوؤں' دریاؤں اور جھیلوں سے نکلتا رہتا ہے۔ کائناتِ انسانی کے لئے دونوں اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری ہیں۔ ہندوستان میں دو دَریاؤں کے درمیان جدائی کا مشاہدہ کئی مقامات پر ہوسکتا ہے مثلاً اراکان (علاقہ برما) اور چاٹگام کے درمیان اور ضلع باریسال'' (ماجدی)۔ اسی

[illegible]

(16) بچے کی جنس (بیٹا یا بیٹی): ماضی میں یہ سمجھا جاتا رہا کہ بچے کی جنس کا تعین ماں کے خلیوں (Cells) سے ہوتا ہے یا بعد میں یہ سمجھا جاتا رہا کہ جنس کے تعین میں مرد اور عورت دونوں کے خلیوں کا دخل ہوتا ہے مگر قرآن مجید میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ جنس کا تعین مرد کے نطفے سے ہوتا ہے جیسے بیان کیا جاتا ہے:

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ○ مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ○ (النجم: ۵۳: ۴۵-۴۶)

"اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا ایک بوند سے پیدا کیا جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔" (النجم ۵۳: ۴۵-۴۶)

"سالماتی حیاتیات (Molecular Biology) اور جینیات (Genetics) کے ترقی یافتہ ہونے کے بعد قرآن مجید کی بتائی ہوئی حقیقت کی سائنسی طور پر تصدیق ہو چکی ہے اور یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ بچے کی جنس کا تعین مرد کے نطفے کے خلیوں کی بناء پر ہوتا ہے اور اس عمل میں عورت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جنس کے تعین میں اہم کردار لونیے (کروموسومز) ادا کرتے ہیں۔ 46 لونیوں (کروموسومز) میں سے 2 لونیے جنسی لونیے ہوتے ہیں۔ باقی آٹوسوم (Autosome) یعنی غیر جنسی ہوتے ہیں۔ مرد کے دو جنسی لونیوں کو XY اور عورت کے جنسی لونیوں کو XX کہا جاتا ہے۔ انہیں X یا Y اُن کی شکلوں کے ان حروف سے مشابہ ہونے کی بناء پر کہتے ہیں۔ وائی (Y) لونیوں میں مذکر جینز اور ایکس (X) لونیوں میں مؤنث جینز ہوتے ہیں۔"

"انسانی بچے کی تخلیق کا آغاز ان لونیوں کے مذکر و مؤنث جینز کے انضمام (Cross Combination) سے ہوتا ہے جو مرد اور عورت میں جوڑا جوڑا موجود ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت کی طرف یوں بیان ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ (اَلدَّھر: ۲)

"بے شک ہم نے ہی انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا۔" (۷۶ : ۲)

"عورت کے جنسی خلیہ کے دونوں اجزاء جو بیضہ ریزی (Ovulation) کے دوران دو حصوں میں منقسم ہو جاتے ہیں، X لونیے ہوتے ہیں۔ دوسری جانب مرد کا جنسی خلیہ دو مختلف اقسام کے تخموں (Sperms) کو پیدا کرتا ہے۔ اُن میں سے ایک کے اندر X لونیے اور دوسرے کے اندر Y لونیے ہوتے ہیں۔ اگر عورت کا X لونیہ اُس تخم سے جا ملے جس کے اندر X لونیہ ہی موجود ہو تو اُس کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ لڑکی ہوتی ہے اور اگر یہ اُس تخم سے مل جائے جس میں Y لونیہ ہو تو پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر بچے کی جنس کا تعین اِس امر سے ہوتا ہے کہ مرد کا کونسا لونیہ عورت کے تخم سے جا ملتا ہے۔" ["قرآن رہنمائے سائنس" (اردو) ہارون یحییٰ ص ص ۱۳۷، ۱۳۸]

''بیسویں صدی کے علمِ تکوینیات (Genetics) کی اس دریافت سے پہلے کسی کو اِن حقائق سے آگاہی حاصل نہ تھی۔ کئی معاشروں اور تہذیبوں میں یہی عقیدہ پایا جاتا تھا کہ بچے کے نر یا مادہ پیدا ہونے کا انحصار عورت کی جسمانی اہلیت پر ہوتا ہے۔ جب اُس کے ہاں بچیاں ہی بچیاں پیدا ہوتیں تو اُسے بیٹا پیدا نہ کرسکنے پر طعنہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ شوہر' مرد وارث کی تلاش میں یا تو بیوی پر سوکن لاتے یا اُسے طلاق دے دیتے تھے۔ سُبحان اللہ! قرآنِ پاک نے انسانی جینز کی دریافت سے چودہ سو سال پہلے ہی اصل حقیقت کا انکشاف کردیا جس سے اُن توہّمات کا خاتمہ ہوگیا اور تعلیم یافتہ لوگوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ بچے کے نر اور مادہ کا سرچشمہ عورت کے اندر نہیں بلکہ مرد کے نطفے کے اندر پایا جاتا ہے۔'' [''قرآن رہنمائے سائنس'' (اردو) ہارون یحییٰ ص ۱۳۸]

(17) ''رحم پر گٹھلی جم جانا: اگر تخلیقِ انسان کے حقائق کے بارے میں قرآن مجید کے ارشادات پر غور کریں تو ہمیں مزید سائنسی معجزات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جب مرد کا مادہ منویہ عورت کے بیضے سے ملاپ کرتا ہے تو آئندہ تشکیل پانے والے بچے کا جوہر (ایسنس) وجود میں آجاتا ہے یعنی دونوں کے ملنے سے جو خلیہ بنتا ہے' اُسے علم الحیات کی اصطلاح میں زائیگوٹ (Zygote) کہا جاتا ہے۔ پھر زائیگوٹ فوراً تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرنے لگتا ہے جو بالآخر ''گوشت کا ایک ٹکڑا'' بن جاتا ہے جسے مُضغة یا ''کچا بچہ'' (Embryo) کہا جاتا ہے۔''

''گوشت کا یہ ٹکڑا یا کچا بچہ اپنے نشوونما کا زمانہ کسی خلا میں نہیں گزارتا بلکہ رِحم کے ساتھ اُسی طرح چمٹ جاتا ہے جیسے کسی بیل کی جڑیں زمین میں دھنس جاتی ہیں۔ اس طرح یہ مُضغة یا کچا بچہ اسی بندھن کے ذریعے ماں کے جسم سے اپنی نشوونما کے لئے ضروری مادّے حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں اِس نکتے سے قرآن کا ایک بہت اہم معجزہ سامنے آتا ہے۔ ''کچے بچے'' کے رِحمِ مادر سے نشوونما پانے کا حوالہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کے لئے ''عَلَق'' کا لفظ استعمال کیا ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o (اَلْعَلَق: ۱ ' ۲)
''پڑھئے (اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ اُس نے انسان کو خون کے جمے ہوئے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔'' (۱ ' ۲ : ۹۶)

''عربی میں عَلَق کے معنیٰ ایسی چیز کے ہیں جو کسی جگہ پر چمٹ جائے۔ لغوی طور پر یہ لفظ جونک کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کسی کے جسم کے ساتھ چمٹ کر اُس کا خون چوس چوس کر موٹی ہوتی رہتی ہے۔ ماں کے رِحم کے اندر نشوونما پانے کے لئے ایسے موزوں لفظ کا انتخاب ایک بار پھر اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ یہ اُسی کا کلام ہے جو سارے جہان کا خالق و مالک ہے۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس''۔۔۔ ہارون یحییٰ ص ص ۱۳۹' ۱۴۹)

(18) ہڈیوں پر عضلات کو لپیٹنا: قرآن نے رِحمِ مادر میں انسانی بچے کی نشوونما کے مراحل کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ بتائی ہے کہ پہلے بچے کی ہڈیاں بنتی ہیں' بعد میں اُن پر عضلات چڑھائے جاتے ہیں:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ o (أَلْمُؤمنون : ۱۴)

''پھر ہم نے اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا' پھر اُسے دوسری مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس اللہ بڑا ہی بابرکت ہے' سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔'' (۲۳ : ۱۴)

''علم الجنین علم کی وہ شاخ ہے جس میں رحمِ مادر کے اندر جنین کے نشو ونما پانے کی منزلوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس علم کے ماہرین دَورِ حاضر تک یہ سمجھتے رہے کہ ''کچے بچے'' کی ہڈیاں اور عضلات ایک ہی ساتھ نشو ونما پاتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگ طویل عرصے سے یہ دعوٰی کرتے رہے کہ یہ آیاتِ قرآنی' سائنس کے ساتھ متصادم ہیں۔ تاہم تکنیکی علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب انسان نے خوردبین بھی بنالی اور اُس کے ذریعے مشاہدات کا سلسلہ شروع کیا تو اُس پر کئی راز کھلے۔ اعلیٰ درجے کی خوردبین سے رحمِ مادر کا مشاہدہ کرنے سے سائنسدانوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اس معاملے میں قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ یعنی پہلے جنین کی کری ہڈی (Cartilage Tissue) ہڈی کی شکل اختیار کرتی ہے' پھر ہڈیوں پر چڑھانے کے لئے ان میں سے عضلاتی خلیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہڈیوں پر عضلات کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس مرحلے کے بارے میں ایک سائنٹیفک پبلی کیشن میں بعنوان ''ارتقائے انسان'' لکھا گیا ہے کہ:

''ساتویں ہفتے کے دوران ڈھانچہ سارے جسم کے اندر پھیل جاتا ہے اور ہڈیاں اپنی معروف ہیئت اختیار کر لیتی ہیں۔ ساتویں ہفتے کے اختتام اور آٹھویں ہفتے کے دوران عضلات ہڈیوں کے گرد اپنی پوزیشن لے لیتے ہیں۔''

''مختصر یہ کہ انسانی بدن کے نشو ونما پانے کے مراحل جس ترتیب سے قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں' جدید علم الجنین کی دریافتوں کے عین مطابق ہیں۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس'' ۔۔ ہارون یحییٰ ص ص ۱۴۰' ۱۴۱)

<u>(19) ''فنگر پرنٹ ۔۔ شناخت کا یقینی ذریعہ</u> : قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے لئے انسان کو موت کے بعد زندہ کرنا بہت آسان ہے۔ اس آیت میں انسانوں کی انگلیوں کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهُ o بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰى أَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ o (أَلْقِيامة :۳'۴)

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اُس کی انگلیوں کے پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔''

''یہاں انگلیوں کے پور پور کا ذکر خصوصی معنیٰ رکھتا ہے کیونکہ ہر شخص کی انگلیوں کے نشانات خود اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر شخص جو زندہ ہے یا کبھی اس دنیا میں زندہ رہا ہے' اُس کی انگلیوں کے پرنٹ منفرد خصوصیت

رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فنگر پرنٹس کو کسی شخص کی شناخت کا اہم ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے دنیا بھر میں انہیں قبولیتِ عامّہ حاصل ہے۔''

''فنگر پرنٹس کی اِس خصوصیت کا انکشاف اُنیسویں صدی کے اواخر میں ہو۔ اس سے پہلے لوگ اُنہیں محض اُبھار یا خمیدگیاں سمجھتے رہے جن کے اندر کوئی معنویت یا خصوصیت دکھائی نہ دے سکی تھی۔ تاہم جب قرآن نے انگلیوں کے پوروں کی طرف توجہ دلائی تو اُس دَور میں کوئی شخص اُن کی اہمیت کو واضح طور پر نہ سمجھ سکا لیکن جب انسانی عقل و شعور نے ایک مناسب حد تک ترقی حاصل کر لی تو اسے فرد کی شناخت کا اہم ذریعہ مان لیا گیا۔'' (ایضاً ص ۱۲۵، ۱۲۶)

(20) ''پہاڑوں کی کارکردگی : قرآنِ حکیم ہمیں پہاڑوں کی بے حد اہم ارضیاتی کارکردگی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً فرمایا :

(۱) وجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (الانبیاء : ۳۱)

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جمادئے تاکہ وہ اُنہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔'' (۳۱ : ۲۱)

(۲) وَأَلْقٰى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (لقمٰن : ۱۰)

''اور اُس نے زمین میں پہاڑ جمادئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔'' (۱۰ : ۳۱)

یہ آیات بتاتی ہیں کہ پہاڑ اس لئے نصب کئے گئے ہیں کہ زمین جھٹکے لگنے سے محفوظ رہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے یہ حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی۔ یہ جدید علم طبقات الارض کے انکشافات میں سے ہے جس کے مطابق پہاڑ قشرِ زمین (Earth's Crust) بنانے والی عظیم پلیٹوں کی حرکت اور ان کی ایک دوسرے سے رگڑ اور مسلسل ٹکراؤ کے نتیجے میں تشکیل پاتے ہیں۔ جب دو پلیٹیں آپس میں متصادم ہوتی ہیں تو اُن میں جو مضبوط تر ہوتی ہے وہ دوسری کے نیچے گھس جاتی ہے اور اوپر والی خم کھا کر بلندی اختیار کر لیتی ہے' اس طرح پہاڑ وجود میں آجاتا ہے جبکہ نیچے والی تہہ زمین کے نشیب میں نچلی جانب بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح ایک گہرائی عمل میں آنے لگتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑوں کا ایک حصّہ نیچے کی جانب بھی ہوتا ہے جو سطحِ زمین سے نظر آنے والے حصّے کے تقریباً مساوی ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر پہاڑ سطحِ زمین کے نیچے اور اوپر سے آگے کی طرف بڑھتے ہوئے قشرِ ارض کی پلیٹوں کو آپس میں بھینچتی ہیں جس سے زمین کی مضبوطی بڑھتی ہے۔ مختصر طور پر ہم پہاڑوں کو میخوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو زمین کے مختلف حصّوں کو اسی طرح جوڑتے ہیں جیسے میخیں لکڑی کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑتی ہیں۔ ذیل کی آیتِ قرآنی میں بھی پہاڑوں کو میخوں کے مماثل قرار دیا گیا ہے :

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًاo وَالْجِبَالَ أَوْتَادًاo (اَلنَّبا : ۶، ۷)

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنا دیا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا؟'' (۶، ۷ : ۷۸)

''سائنسی لٹریچر میں پہاڑوں کے ''کارِ پیوستگی'' کو ''ہم توازنیت'' (Isostasy) کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے :

''قشرِ ارض میں ایسا عام توازن جو سطحِ زمین کے نیچے چٹانی مادوں کے بہاؤ کو یکساں بنا کر قائم کیا جائے ۔''

''پہاڑوں کے اس اہم کردار کا پتہ ماڈرن جیالوجی اینڈ سسمک ریسرچ کے ذریعے لگایا گیا ہے جسے قرآن مجید نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتِ تخلیق کے طور پر صدیوں پہلے بے نقاب کر دیا تھا۔'' ("The Qur'an Leads the Way to Science" ... Harun Yahya (Urdu translation), pp. 122, 123)

(21) آسمان ایک محفوظ چھت: قرآن ہماری توجہ آسمان کی ایک دلچسپ خصوصیت کی طرف مبذول کراتے ہوئے فرماتا ہے :

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ٥ (الانبیاء : ۳۲)

''اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا مگر یہ لوگ کائنات کی نشانیوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔'' (۲۱:۳۲)

''آسمان کی اس خصوصیت کا ثبوت بیسویں صدی کی سائنسی تحقیق سے ملا ہے۔ زمین کے گرد و پیش کی فضا زندگی کے تسلسل میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ چھوٹے بڑے بہت سے شہابیئے (Meteors) جب زمین کے قریب آتے ہیں تو فضا انہیں تباہ کر کے زمین پر گرنے سے روک دیتی ہے اور اس طرح زندہ اجسام اُن کی زد میں آنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمینی فضا خلا سے آنے والی روشنی کی اُن شعاعوں کو مقطر (فلٹر) کر دیتی ہے جو زندہ اجسام کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں اور صرف غیر مضر اور مفید شعاعوں یعنی ''مرئی روشنی''، ''نزبنفشی'' (Near-Ultra Voilet) اور ریڈیائی لہروں کو گزرنے دیتی ہے۔ پودوں کی ضیائی تالیف (Photosynthesis) جانداروں کی زندگی کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ سورج سے نکلنے والی ''شدید بالا بنفشی'' (Intense Ultra Violet) شعاعوں میں سے بیشتر کو اوزون کی تہہ فلٹر کر دیتی ہے اور صرف اُس تھوڑی سی تعداد کو زمین تک آنے دیتی ہے جو بقائے زندگی کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔''

''زمینی فضا کا یہ حفاظتی کردار یہیں تک محدود نہیں۔ یہ زمین کو یخ سردی سے ٹھٹھر کر مردہ ہو جانے سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ خلا کی یہ سردی منفی 270 درجہ سنٹی گریڈ تک ہوتی ہے۔ زمین کو نقصان دہ اثرات سے صرف فضا ہی نہیں بچاتی ' اس کے علاوہ ایک اور تہہ بھی حفاظتی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ''وان الن بیلٹ'' (Van Allen Belt) # ہے جو زمین کے مقناطیسی میدان کی وجہ سے بنتی ہے (یہ اشعاعی پٹی بیسویں صدی کے وسط میں ایک امریکی ماہرِ طبیعیات نے دریافت کی تھی' اس کا نام اُسی کے نام پر رکھ دیا گیا ہے)۔ سورج اور دیگر ستاروں سے مسلسل نکلنے والی مضر تابکاری کو روکنے میں وان الن بیلٹ بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ تابکاری زندہ اجسام کے لئے شدید طور پر اثرات رکھتی ہے۔ اگر یہ پٹی نہ ہوتی تو سورج سے نکلنے والی انرجی' جو بکثرت خارج ہوتی رہتی ہے' روئے زمین پر زندگی کا بالکل خاتمہ کر دیتی۔ چونکہ یہ زبردست ہیجان کے ساتھ لپکتی ہے اس لئے اُسے ''سورج کے شعلے'' (Solar Flares) کہا جاتا ہے۔''

#وان الن بیلٹ وہ شدید اشعاع زدہ منطقہ رخطہ ہے جو کئی ہزار کلومیٹر کی بلندی پر زمین کو جزوی طور پر گھیرے ہوئے ہے۔

''حالیہ برسوں کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ صرف ایک شعلے سے نکلنے والی انرجی (ہیروشیما پر گرائے گئے بموں کے حوالے سے) ایک سو ارب ایٹم بموں کی تباہ کاری کے مساوی ہوتی ہے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے کے ۵۸ گھنٹے بعد یہ انکشاف ہوا تھا کہ قطب نما (کمپاس) کی مقناطیسی سوئیوں میں غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوا ہے اور سطح زمین سے ۲۵۰ کلومیٹر کی بلندی پر فضا کا درجہ حرارت اچانک ۲۵۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ تک جا پہنچا ہے۔'' ("The Qur'an Leads the Way to Science" ... Harun Yahya (Urdu translation), pp. 115, 116)

''مختصر یہ کہ زمین کے اوپر زبردست حفاظتی نظام قائم ہے۔ یہ کرہ ارض کو بیرونی خطرات سے بچا رہا ہے۔ سائنس دانوں کو اس حفاظتی نظام کے بارے میں اب معلوم ہوا ہے جسے قرآنِ پاک نے صدیوں پہلے بتا دیا تھا۔''

(22) واپس بھیجنے والا آسمان : سورۃ الطّارق میں آسمان کے ''واپس بھیجنے'' کی کارکردگی کا حوالہ دیا گیا ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ o (اَلطَّارق : ۱۱)

''قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔'' (۸۶ : ۱۱)

''بارش برسنا' چونکہ آبی بخارات کے پانی بن کر زمین پر واپس آنے کے عمل کا نام ہے' اس لئے اسے ''دائروی'' یا ''دوری'' (Cyclic) عمل بھی کہا جا سکتا ہے۔''

''جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ زمین کے گرداگرد کی فضا کئی تہوں (Layers) پر مشتمل ہے۔ اِن میں سے ہر تہہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کسی نہ کسی اہم فرض کو پورا کر رہی ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ تہیں بعض مادّوں یا شعاعوں کو زمین پر واپس بھیج دیتی ہیں یا فضا میں اُچھال دیتی ہیں۔ آیئے ہم زمین کو اپنے احاطے میں رکھنے والی اِن تہوں کی دائروی (Recycling) کارکردگی کا جائزہ لیں۔''

''☆ زمین پر پہلی تہہ یعنی کرہ اوّل (Troposphere) 13 سے 15 کلومیٹر تک ہوتا ہے۔ زمین سے اٹھنے والے آبی بخارات جب اِس تہہ تک پہنچتے ہیں تو یہ تہہ اُنہیں گاڑھا کر کے پانی کی شکل دے دیتی ہے اور وہ بارش کی شکل میں زمین پر واپس آ جاتے ہیں۔''

''☆ اوزون کی تہہ (Ozonosphere) 25 کلومیٹر تک بلند ہوتی ہے۔ یہ فضا سے آنے والی بالائے بنفشی روشنی کو واپس منعکس کر دیتی ہے۔ یہ سخت نقصان دہ ہوتی ہے۔ اوزون کی تہہ اگر اُسے واپس خلا میں نہ پھینک دے تو زندہ اَجسام کو بہت نقصان پہنچے۔''

''☆ اس سے اوپر کرّہ روانیہ (Ionosphere) ہے جو زمین سے چلنے والی ریڈیائی لہروں کو زمین پر واپس منعکس کر دیتا ہے۔ یہ ایک قسم کے منفعل مواصلاتی سیارے کی طرح کام کرتا ہے اور دُور دُور کے وائرلیس

پیغامات' ریڈیو اور ٹیلیویژن کی نشریات سننا ہمارے لئے ممکن بنا دیتا ہے۔''

''☆ کرہ مقناطیسیت وہ تہہ ہے جو سورج اور دوسرے ستاروں سے نکل کر آنے والے ریڈیائی ذرّات کو زمین پر پہنچنے سے روکتی ہے یعنی یہ اُنہیں دوبارہ فضا میں پھینک دیتی ہے۔''

''سائنسدانوں نے فضائی تہوں کی اِن خصوصیات کا ماضی قریب میں پتہ چلایا جن کا قرآن مجید نے صدیوں پہلے حوالہ دے دیا تھا۔ اس طرح یہ حقیقت بھی قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔'' (ایضاً ص ۱۷)

(23) ''فضائی تہوں کی مزید تفصیل: مختلف آیاتِ قرآنی میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ آسمان سات تہوں پر مشتمل ہے: (۱) هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (البقرۃ: ۲۹)

''وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں' پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان اُستوار کئے۔'' (۲۹ : ۲)

(۲) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حٰمٓ السجدۃ: ۱۲)

''پھر اُس نے دو مرحلوں میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔''

لفظ ''سَمآء'' (آسمان) قرآن کی بہت سی آیات میں زمین سے قریب والے آسمان کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور پوری کائنات کے لئے بھی۔ پہلے معنوں میں یہ آسمانِ زمین کے لئے اور دوسرے معنوں میں اس کا مطلب ''فضا کی سات تہیں'' (Layers) ہے۔ آج کا ہر فرد و بشر اِس امر سے آگاہ ہے کہ فضائے دنیا سات مختلف تہوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسری کے اوپر بڑی مہارت اور نفاست کے ساتھ اُستوار کی گئی ہیں۔ سائنسی زبان میں اس کی تفصیل یوں ہے:

''یہ تہیں ایک دوسرے سے ''دباؤ'' (پریشر) اور ''گیسوں کی اقسام'' جیسی طبعی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف وجود رکھتی ہیں۔ زمین سے قریب تر تہہ کو کرّہ اوّل یا (Troposphere) کا نام دیا گیا ہے۔ کل فضائی مادّے کا 90% حصہ اِسی کرّے میں شامل ہے۔ اس کے اوپر کی تہہ کو کرّہ قائمہ یا (Stratosphere) کہتے ہیں۔ اوزونی تہہ (Ozone Layer) سٹریٹوسفیئر (Stratosphere) کا حصہ ہے جہاں بالائے بنفشی شعاعوں کا انجذاب عمل میں آتا ہے۔ کرّہ قائمہ کے اوپر والی تہہ کو (Mesosphere) کہتے ہیں۔ اس کے اوپر ''حر کرّہ'' (Thermosphere) واقع ہے۔ اِس تہہ کے اندر موجود روانیت یافتہ (Ionized) گیسوں کو کرہ روانیہ (Ionosphere) کہا جاتا ہے۔ زمینی فضا کا کل بیرونی حصہ 480 کلومیٹر سے لے کر 960 کلومیٹر تک ہوتا ہے۔ اس حصے کو ''فضائے بالا'' یا (Exosphere) کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سات تہیں بنتی ہیں۔ یعنی:

1.Troposphere; 2. Stratosphere ; 3. Ozonosphere ; 4. Mesosphere ;
5. Thermosphere ; 6. Ionosphere ; 7. Exosphere.

حٰمٓ السجدۃ کی محولہ بالا آیت وَأَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا ("اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا'') میں ایک اہم حقیقت کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بیان فرما رہا ہے کہ اُس نے ہر آسمان (تہہ) کو ایک ڈیوٹی سونپ رکھی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحہ میں بیان ہوا کہ ان میں سے ہر تہہ کو انسان اور اس زمین پر پائے جانے والے جانداروں کے مفادات کے لئے اہم فرائض کی ادائیگی کا حکم دے دیا گیا ہے۔ ہر تہہ ایک خاص کام انجام دے رہی ہے جو بارش برسانے سے لے کر نقصان دِہ شعاعوں کو زمین پر آنے سے روکنے' ریڈیائی لہروں کو منعکس کرنے اور شہابیوں کے مضر اثرات کو زائل کرنے کے کاموں تک تفویض کردہ فرائض میں منہمک ہے۔''

''یہ عظیم معجزہ ہے کہ یہ حقائق بیسویں صدی کی ٹیکنالوجی کے وجود میں آئے بغیر انسان کے علم میں کبھی نہ آ سکتے تھے جو قرآن نے چودہ سو سال پہلے منکشف فرما دیئے تھے۔'' (ایضاً ص ۱۱۹' ۱۲۰)

(24) مدار: سورج اور چاند کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ پاک نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مقررہ مدار میں حرکت کر رہا ہے:

(۱) وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۳۳)

''وہی اللہ ہی تو ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا' سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔'' (۲۱ : ۳۳)

(۲) وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ (یٰسٓ: ۳۸)

''اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے' یہ ایک زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔''

''قرآن کے بیان کردہ یہ حقائق جدید دَور کے فلکیاتی مشاہدوں میں اب آئے ہیں۔ ماہرینِ علمِ فلکیات کے جمع کردہ اَعداد و شمار کے مطابق سورج 720,000 کلومیٹر کی بے حد تیز رفتاری سے ایک انتہائی روشن ستارے ''ویگا'' (VEGA) کی سمت رواں دواں ہے اور اُس کی یہ گردش اُس کے مخصوص مدار میں ہے جسے ماہرین نے ''سولر اپیکس'' (Solar Apex) کا نام دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج دن میں اندازاً 17,280,000 کلومیٹر سفر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام سیارے (Planets) اور طفیلی سیارچے (Satellites) بھی شمسی نظامِ تجاذب کے تحت اِتنا ہی فاصلہ طے کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں تمام ستارے (Stars) بھی اسی طرح ایک طے شدہ نظام کے مطابق محوِ گردش ہیں۔ چنانچہ پورا دائرہ کائنات راستوں اور مداروں سے بھرا ہوا ہے جس کا قرآن مجید کی سورۃ الذّاریٰت کی آیت ۷ میں یوں ذکر آیا ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (الذّاریٰت: ۷)

''قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی'' (۵۱ : ۷)

اِن راستوں کا ذکر سورۃ الْمُلْك کی آیت ۱۵ میں بھی ''مَنَاکِب'' کے لفظ سے کیا گیا ہے۔

''کائنات میں کم از کم 200 اَرب کہکشائیں ہیں جن میں سے ہر ایک میں 200 اَرب ستارے ہیں۔ اِن میں سے بیشتر ستاروں کے اپنے سیارے ہیں اور بہت سے سیّاروں کے طفیلی سیارچے ہیں۔ یہ سب اجرامِ فلکی اپنے اپنے مقررہ مداروں میں گھومتے ہیں اور لاکھوں سال سے انتہائی نظم وضبط کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گردش کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے دُمدار ستارے (Comets) بھی اپنے مقررہ مداروں میں گھوم رہے ہیں۔ کائنات میں یہ مدار صرف انہی اجرامِ فلکی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ کہکشاں بھی نہایت تیز رفتاری سے مقررہ مداروں میں متحرک رہتی ہیں۔ اِس نقل وحرکت کے دوران مختلف اجرامِ فلکی ایک دوسرے کا راستہ نہیں کاٹتے اور نہ ہی اُن کے درمیان کوئی تصادم ہوتا ہے۔ ایک عظیم ''کمپیوٹر'' انتہائی صحت اور زبردست احتیاط کے ساتھ ان کے راستوں اور رفتاروں کو کنٹرول کر رہا ہے۔''

''یہ یقینی امر ہے کہ جس زمانے میں قرآن مجید نے یہ انکشاف کئے' بنی نوعِ انسان کے پاس آج کی دُوربینیں یا ترقی یافتہ مشاہداتی ٹیکنالوجی نہیں تھی جس سے لاکھوں کلومیٹر دُور محوِ گردش اَجرام کا مشاہدہ کیا جا سکتا اور نہ ہی علمِ طبیعیات اور علمِ فلکیات اس درجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ انسان کی رہنمائی کر سکتے لٰہذا اُس وقت اس امر کا سائنسی طور پر تعیّن کرنا ممکن نہیں تھا کہ خلاء راستوں اور مداروں سے پُر ہے جیسا کہ آیت مذکورہ میں بیان ہوا ہے تاہم قرآن نے ہمیں اُسی وقت واضح طور پر مطلع کر دیا کیونکہ یہ اَحْکَمُ الْحَاکِمِین کا کلام ہے۔'' (ہارون یحیٰی ص ۱۱۴)

(25) ''فوسل ریکارڈ نظریہ ارتقاء کو مسترد کرتا ہے: وضاحت جلد اوّل کے صفحات ۲۳۷' ۲۳۸ پر موجود ہے۔

''بندر سے ارتقائے انسانی -- ایک مکروہ نظریہ'': تفصیل دیکھئے صفحات ۲۳۱ تا ۲۳۶ (جلد اوّل) پر۔

باری تعالیٰ کے وجود پر غیر مسلم مفکرین کے اعترافات

مادّہ پرست اور ملحدین خواہ کتنی ہی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیں' اِس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ زندگی کی جتنی بھی اقسام اور نظام موجود ہیں' سب کے سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے یہ یقینی امر ہے کہ سائنس اور مذہب کے درمیان ہم آہنگی اور تطبیق کی راہ نکل سکتی ہے بشرطیکہ اُن کے بارے میں دیانتداری اور صحیح سوچ کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اُن کے مابین ہم آہنگی کا اِمکان ماضی اور حال کے اُن مذہبی سائنسدانوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جنہوں نے انسانیت کی بھلائی کے لئے کئی اہم کارنامے انجام دئے ہیں۔ ایک سائنسدان جو اپنی تحقیق کے ذریعے کائنات کے مخفی رازوں سے پردہ ہٹاتا ہے' وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صنّاعی کی گہرائی میں جا کر جائزہ لیتا ہے اور اُس کی تفصیلات معلوم کرتا ہے۔ وہ اللہ پاک کی بے پناہ قوّت' اُس کی زبردست صنّاعی اور اُس کی بے نظیر قدرتِ تخلیق کا مشاہدہ کرتا ہے' اس لئے عام تصوّر کے برعکس وہ جب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ موجودات کے مطالعے و مشاہدے میں محو ہوتا ہے' تو اُسے ذاتِ کبریاء کے وجود اور اُس کی توحید کا فوراً ادراک حاصل ہو جاتا ہے۔ بنا بریں

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ بے شمار سائنسدان جنہوں نے بڑے بڑے سائنسی کمالات کا مظاہرہ کیا' وہ لوگ تھے جنہیں قلب ونظر کی وسعت' مذہب کے مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ مزید برآں سائنس کی ترقی کے لئے بنیادیں فراہم کرنے والے بھی یہی دیانتدار سائنسدان تھے۔ لہٰذا یہ دعویٰ کرنا بالکل بجا ہے کہ مذہب نے سائنس کو ترقی دینے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ اب باری تعالیٰ کی ہستی اور اس کے ناقابلِ انکار وجود کے بارے میں ان مفکرین کی آراء ملاحظہ ہوں:

(۱) Isaac Newton (1642-1727) نے کہا: ''سورج' ستاروں اور دُمدار تاروں کا حسین ترین نظام ایک ذہین ترین اور انتہائی طاقتور ہستی کی منصوبہ بندی اور غلبے کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ وہی ہستی تمام موجودات پر حکمرانی کر رہی ہے اور جس کی عملداری اور اقتدار میں سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُسے خدائے عظیم و برتر اور ہمہ گیر حکمران تسلیم کیا جائے۔'' ("Principia"NEWTON, p. 15،(1958 Edition)

(۲) ''چونکہ بنی ہوئی ہر چیز کسی بنانے والے کی قوّتِ بازو اور اُس کی ہنرمندی پر دلالت کرتی ہے۔۔۔ اسی طرح خدا کی صناعی دکھائی دے رہی ہے جو اپنے صانع کی قدرتِ کاملہ اور اُس کی حکمت و دانائی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔'' (فرانسس بیکن ۱۵۶۱ـ۱۶۲۶)

(۳) جانز کیپلر نے کہا: ''ہم ماہرینِ علمِ فلکیات چونکہ بہ لحاظِ کتابِ فطرت خدائے بزرگ و برتر کے مبلّغین ہیں اس لئے ہمیں یہی بات زیب دیتی ہے کہ ہم غور و فکر کی عادت اختیار کریں۔ ہمیں اپنی سوچوں کی عظمت کے نہیں' بلکہ خدا کی عظمت کے مبلّغ بننا چاہئے۔'' ("Men of Science -- Men of God".. Henry M. Morris, p. 13)

(۴) William Palley (1743-1805) نے کہا: ''اگر تمام جانداروں کو اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے درکار ہتھیاروں سے لیس کیا گیا ہے تو یہ ایک واضح منصوبہ بندی کا ثبوت ہے اور ایسے منصوبے اُن کا خالق ہی بنا سکتا ہے۔'' ("Natural Theology"........ William Palley, Chapter 5, Section 5, p. 61 Edinburgh, 1861 Edition)

(۵) Samuel Morse (1791-1872) نے کہا: ''میں جوں جوں اپنے سفرِ دُنیا کے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہوں' خدا کی عظمت اور اس کے جلال و جمال' اور ایک گرے ہوئے آدمی کے لئے اُس کی رحمتوں کو بہتر طور پر محسوس کر رہا ہوں۔ اُس نے ہم جیسوں کے مستقبل کو امیدوں اور خوشیوں سے مزیّن کر دیا ہے۔'' ("Men of Science -- Men of God".. Henry M. Morris, p. 47, 1992 Edition)

(۶) James Prescott Joule (1818-1889) نے کہا: ''خدا کے بارے میں علم حاصل کرنے' اُس کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے اور اُس کی منشا کو سمجھنے کے بعد اُس کی صفاتِ صنّاعی میں سے اُس کی صفتِ دانائی

حکمت' اُس کی قوّتِ دسترس اور اُس کے لطف و کرم کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ یہ بالکل واضح امر ہے کہ قوانینِ فطرت سے آگاہی پالینا' معرفتِ الٰہی حاصل ہونے سے ہرگز کم نہیں ہے۔'' ("Scientists of Faith" ... Dan Graves, p. 133, 1996 Edition)

(۷) George Gabriel Stokes (1819-1903) نے اپنی کتاب میں لکھا: ''قوانینِ فطرت اُس کی منشا و مرضی کے مطابق اپنا کام کر رہے ہیں۔ جس نے اُنہیں وضع کیا' وہ اُنہیں معطّل کر دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔'' (www.leaderu.com/offices/schaefex/scientists html)

(۸) Gregory Mendel (1822-1884) نے ارتقاء کے دعویداروں پر واضح کر دیا کہ اتنی کامل دنیا کا ظہور اندھے بہرے اتفاق کا نتیجہ ہونا' ناممکنات میں سے ہے۔ ("Scientists of Faith" ... Dan Graves, p. 143, 1996 Edition)

(۹) Louis Pasteur (1822-1895) کے الفاظ ہیں: ''میرا علم جتنا بڑھتا جاتا ہے' میرا ایمان اُتنا ہی پختہ ہوتا جاتا ہے۔ سائنس کی تعلیم کی کمی انسان کو خدا سے دُور لے جاتی ہے اور اس میں وسعت اور گہرائی اُس کے قریب پہنچا دیتی ہے۔'' ("Dieu et la science"... Jean Guitton, p. 5, 1991 Edition)

(۱۰) William Thompson (Lord Kelvin 1824-1907) نے کہا: ''آزاد سوچوں سے خوفزدہ مت ہو' اگر تمہاری سوچ میں قوت ہے تو سائنس تمہیں خدا پر ایمان لانے پر مجبور کر دے گی۔ جہاں تک آغازِ آفرینش کا تعلق ہے سائنس نہایت مثبت انداز میں تخلیقی قوّت کی تصدیق کرتی ہے۔''
(WWW.leadru.com/offices/schawfer/docs/scientists.html)

(۱۱) J.J. Thomson (1856-1940) نے کہا: ''دُور کے اونچے بُرجوں سے بھی زیادہ بلند'' سائنس کی چوٹیاں ہیں۔ جو لوگ وہاں تک چڑھیں گے' وہ اُن سے دب جائیں گی۔ پھر اُن پر مزید وسعتوں کے در کھل جائیں گے اور احساسات میں مزید گہرائی پیدا ہو جائے گی۔ سائنس کی ہر پیش رفت اسی طرح سچائی کی عظمتوں کو واضح تر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ سب اُسی خدائے عظیم و برتر کے کام ہیں۔''

(۱۲) Sir James Jeans (1877-1946) نے لکھا: ''کائنات کے سائنسی مطالعے کا نتیجہ مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا ڈیزائن کسی خالص ریاضی دان نے تیار کیا تھا۔'' ("The Mysterious Universe" ... Sir James Jeans, New York, 1932 Edition)

(۱۳) Albert Einstein (1879-1955) کے الفاظ ہیں جو اُس نے 1941ء میں ایک کانفرنس میں کہے تھے: ''میں ایسے سائنسدان کا تصور ہی نہیں کر سکتا جو گہرے مذہبی جذبات نہ رکھتا ہو۔ شاید میری بات اس تمثیل سے واضح ہو جائے کہ مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے۔''

(۱۴) Wernher Von Braun (1912-1977) نے ''فطرت کی تخلیق و منصوبہ بندی'' کے موضوع پر چھپنے والے ایک مجلّے کا پیش لفظ لکھا جس میں اُس نے کہا: ''انسان بردار خلائی پرواز ایک حیرت انگیز تجربہ ہے لیکن اس سے یہاں تک پہنچنے والے انسان کے خلا کی پُر جلال وسعتوں میں جھانکنے کے لئے ایک چھوٹا سا در کھلا ہے جو کائنات کے بیکراں اَسرار میں جھانکنے کے لئے محض ایک سوراخ ہے۔ اس سے ہمارے اس عقیدے کو تقویت پہنچنی چاہئے کہ کائنات کا واقعی ایک خالق موجود ہے۔ میرے لئے اُس سائنسدان کو سمجھنا بہت مشکل بات ہے جو اِس کائنات کے وجود کے پیچھے کارفرما اعلیٰ ترین حکمت و دانش کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو' اسی طرح اس مذہبی شخصیت کو بھی سمجھنا بہت مشکل امر ہے جو سائنس کی پیش رفت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔''

ورنہر وان بران نے مئی 1947ء میں اپنے ایک شائع شدہ مقالے میں لکھا: ''کوئی بھی شخص کائنات کے نظم وضبط کو اُس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اِس کارخانہِ قدرت کے پیچھے کارفرما واضح منصوبہ بندی اور مقصد کو تسلیم نہ کرتا ہو۔۔۔ ہم نے کائنات کے رازوں کو جتنا بہتر سمجھنے کی کوشش کی ہے' اُس کے منصوبے پر ہماری حیرت اُتنی ہی بڑھی ہے۔۔۔ کسی کا خود کو صرف اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور پانا کہ یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو گیا ہے' خود سائنس کی معروضیت کے منافی ہے۔۔۔ وہ کونسا اتفاقی امر ہے جو انسانی دماغ یا اُس کی آنکھ کے نظام کو جنم دے سکتا ہے؟''

("Unlocking the Mysteries of Creation" ... Dennis R. Petersen, p. 63, 1990 Edn.)

(۱۵) ''ہر قسم کی سنجیدہ سائنسی تحقیق کرنے والا شخص سائنسی معبد میں داخل ہوتے وقت بڑے دروازے پر یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتا ہے: 'تمہیں لازماً صاحبِ ایمان ہونا چاہئے۔' یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے سائنس دان صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔'' ["Where is Science Going?" .. Max Planck (1858-1947), p. 24, 1933 Edition]

(۱۶) Charles Coulson (1910-1974) اس عقیدے کا اظہار کیا کرتا تھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کا قرب ہونا چاہئے۔ ("Science & Christian Belief" ... Charles Coulson, p. 72)

(۱۷) Prof. Dale Swartzendruber کا کہنا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ ہر طرف ایک مقصدیت اور ایک منصوبہ بندی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ آپ اوپر آسمان کی طرف دیکھیں یا نیچے زمین کی طرف' وہ ضرور آپ کی نظر سے گزرے گی۔ اِس عظیم منصوبہ ساز کی موجودگی سے انکار اُتنی ہی غیر منطقی بات ہے جتنی کہ گندم کی لہلہاتی زرد زرد فصلوں کی تعریف بھی آپ کریں اور ساتھ ہی برلبِ سڑک فارم ہاؤس میں کسان کی موجودگی کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کریں۔'' ("The Evidence of God in an Expanding Universe" ... John Clover Monsma, p. 191)

(۱۸) Prof. Karl Fliermans نے استنبول میں ''انہدام نظریہ ارتقاء و اثباتِ حقیقتِ تخلیق'' کے موضوع

پر منعقدہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا : ''جدید علم حیات نے ثابت کر دکھایا ہے کہ زندگی کسی اتفاق کے تحت وجود میں نہیں آئی جو اس امر کی گواہی ہے کہ دنیا میں ہر چیز ایک بلند و برتر ہستی نے پیدا کی ہے۔''

(۱۹) پروفیسر ڈیوڈ منٹن نے کہا: ''میں تیس سال سے زندہ اجسام کی تشریح و مطالعہ کے لئے اُن کی چیر پھاڑ کر رہا ہوں۔ میں نے ہر دفعہ تخلیقِ خداوندی کی کاملیت کے نئے نئے مظاہر دیکھے ہیں۔''

(۲۰) ''ڈاکٹر Allan Sandage موجودہ دَور کے عظیم ماہرینِ فلکیات میں سے ہیں۔ اُنہیں پچاس سال کی عمر میں خدا پر ایمان لانے کی توفیق ہوئی۔ اُنہوں نے امریکی جریدہ ''نیوز ویک'' کو ایک انٹرویو دیا جو کَور سٹوری کے طور پر اس سرخی کے ساتھ شائع ہوا "Science Finds God" (سائنس نے خدا تلاش کر لیا)۔ سانڈیج نے اپنے قبول کردہ مذہب کے بارے میں کہا: ''یہ میری سائنس ہی تھی جس نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ کائنات اتنی زیادہ پیچیدہ ہے کہ سائنس کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں موجودات کے معمّے کو مافوق الفطرت حوالوں سے ہی سمجھ سکا ہوں۔'' (Newsweek, July 27, 1998, p. 46)

(۲۱) ''مائیکل جیرارڈ نے ۵ جولائی ۱۹۹۸ء کو استنبول میں سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جس کا موضوع ''انہدام نظریہ ارتقاء و اثباتِ نظریہ تخلیق'' تھا' اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا: ''جاندار اشیاء کی جسمانی ساخت' لیبارٹری میں حاصل کردہ نتائج کی بہ نسبت کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ جب ہم کسی وضاحت کے لئے فزکس اور کیمسٹری کے قوانین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو جو کچھ ہم سیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک اعلیٰ پائے کی ''ذہانت اور ایک خالق کا وجود ہونا'' ناگزیر ہے جس نے یہ قوانین بنائے ہیں۔ یہی اس کی انتہائی سائنسی توجیہ ہے۔ فزکس اور کیمسٹری کے قوانین پورے تیقّن کے ساتھ ہم پر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ بے جان مادّے میں سے جاندار اشیاء کا وجود میں آنا یا تشکیل پانا' ناممکن ہے۔ ان سائنسی حقائق کو بیان کرنے کے بعد میری یہ تقریر اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے بلکہ نظریہ ارتقاء کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے۔''

(۲۲) ''نظریہ ارتقاء ایک مایوس کن بحران کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس نظریہ تخلیق کی مضبوط شہادتوں سے تصدیق ہو چکی ہے۔ آج ہزاروں سائنسدان اس نظریئے کو قابلِ قبول پا رہے ہیں اور اُن کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر ڈوائن کش)

(۲۳) ''میں نظریہ ارتقاء کا مخالف ہوں اور خدا کی موجودگی کا قائل ہوں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ نظریہ ارتقاء فرسودہ اور از کار رفتہ ہو چکا ہے۔ اسے چیلنج کیا جانا چاہئے اور اس کے ذہنی افلاس کو بے نقاب کر دینا چاہئے کیونکہ ہم جدھر بھی دیکھتے ہیں اپنے چاروں طرف اُس دانا اور زبردست حکیم کی پیدا کردہ اشیاء اور مظاہر کو پاتے ہیں۔ ہم اپنے موقف کی حمایت میں ان اشیاء کو بطورِ ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔'' (Kenneth Cumming: Taken from his Speech in the First International Conference-- April 4, 1997 in Istanbul).

[بحوالہ ''قرآن رہنمائے سائنس'' (اردو ترجمہ) ہارون یحییٰ' صفحات ۱۵۰ تا ۲۰۸]

(۴۳) اِخراجِ بول و براز (EXCRETION)

بول و براز (ٹٹی' پیشاب) کے اخراج سے متعلق کیا اَخلاق و آداب ہونے چاہئیں' قرآن مجید نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ البتہ وہ بول و براز کا ذکر اس طرح کرتا ہے :۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى أَوْعَلٰى سَفَرٍ أَوْجَآءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ أَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَأَيْدِيْكُمْ (اَلنِّساء : ۴۳ ؛ المائدة : ۶)

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے اپنی بیویوں سے قربت کی ہو' پھر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو اور اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر ہاتھ پھیر لیا کرو۔''

یعنی ایسی مٹی جو غیر طاہر یا گندی نہ ہو' دو دو بار ہاتھ مار کر پہلی بار پورے چہرہ اور دوسری بار ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیر لیا کرو۔ پانی کی معدومیت (نہ ہونا) ایک تو حقیقی ہے یعنی پانی کا موجود نہ ہونا اور دوسری حکمی ہے یعنی موجود تو ہو لیکن اُس کا استعمال مرض پیدا کر دے یا مرض کو بڑھا دے یا کسی اور وجہ سے اُس کے استعمال سے معذوری ہو۔

تیمّم کے مسائل : (۱) تیمم کے تین فرائض ہیں' نیتِ تیمم کرنا پہلا فرض ہے جبکہ وضو کے چار فرائض ہیں اور اِس میں نیتِ وضو کا ہونا فرائض میں سے نہیں۔ (۲) اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ حدثِ اصغر (ضرورتِ وضو) ہو یا حدثِ اکبر (ضرورتِ غسل)' تیمم صرف چہرے اور ہاتھوں پر کیا جاتا ہے اور اس کے لئے دو ضربیں (دو بار مٹی پر ہاتھ مارنا) ضروری ہیں۔ ایک ضرب سے چہرے پر مسح کیا جائے اور ایک ضرب سے کہنیوں سمیت ہاتھوں پر مسح کیا جائے۔ (۳) پانی جب موجود ہو اور اُس کے استعمال پر قدرت بھی ہو تو تیمم جائز نہیں ہے۔ (۴) عید نماز اور نمازِ جنازہ کے فوت ہونے کے خوف ہونے کی وجہ سے تیمم جائز ہے کیونکہ اُن کی قضا نہیں ہے۔ (۵) مٹی کی جنس سے تیمم کرنا ضروری ہے اور اُس پر غبار ہونا ضروری نہیں کیونکہ عام طور پر دیوار پر غبار نہیں ہوتا۔ اگر اس پر اعتراض ہو کہ دیوار کے مالک کی اجازت کے بغیر آپ نے کیسے تیمم کر لیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دیوار مباح تھی یا کسی ایسے شخص کی دیوار تھی جسے آپ جانتے تھے اور آپ کو علم تھا کہ آپ کے تصرّف سے اُسے اعتراض نہیں ہوگا۔ (۶) جس شخص نے کسی زخم یا بیماری کی وجہ سے تیمم کیا تو نماز کا اعادہ نہیں ہوگا۔ جس نے پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کیا تو اگر وہ ایسی جگہ ہے جہاں اکثر پانی نہیں ہوتا تو اُس پر اعادہ واجب نہیں ہے اور اگر ایسی جگہ ہے جہاں پر کبھی کبھی پانی نہیں ہوتا اور اکثر ہوتا ہے تو اُس پر نماز کا اعادہ ہے۔'' (''تبیان القرآن'' جلد دوم' صفحات ۶۸۴' ۶۸۵)

سنتِ نبوی نے ہمیں بول و براز کے آداب و اخلاق کی تعلیم دی ہے جو درج ذیل ہیں :

(الف) عملِ اخراج شروع ہونے سے قبل کے آداب : (۱) اگر کھلا اور وسیع میدان ہو تو قضائے حاجت کے

لئے جتنا دُور جانا ممکن ہو' جایا جائے۔ یہ اس لئے کہ لوگوں کی اُس پر نگاہ نہ پڑے۔ رسول اللہ ﷺ کی یہی سنتِ مبارکہ رہی ہے۔

(۲) قضائے حاجت کے لئے جانے کی صورت میں اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہونی چاہئے جس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام ہو یا اُن سے متعلق لکھا' یا چھپا ہوا کچھ ہو' یا اسی طرح کی کوئی اور مقدس چیز جس سے اُس کا تقدس مجروح ہوتا ہو۔ روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللہ کے الفاظ کندہ تھے۔ جب بھی آپ قضائے حاجت کے لئے جاتے تو آپ اُس انگوٹھی کو اتار دیتے (ترمذی)۔

(۳) قضائے حاجت کی جگہ پر پہنچنے پر اپنا بایاں پاؤں بیت الخلاء (ٹائلیٹ) میں رکھیں اور اُس کے بعد اور برہنہ ہونے سے پہلے مندرجہ ذیل کلمات پڑھ لینے چاہئیں جو صحیح بخاری میں منقول ہیں:

بِسْمِ اللهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

''اللہ پاک کے نام سے۔ اے اللہ! میں تمام قسم کی گندگیوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔''

(۴) زمین کے قریب ہونے سے پہلے برہنہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی کپڑا اوپر اٹھانے میں جلدی کرنی چاہئے کیونکہ سترِ عَورۃ بہرحال واجب اور لازمی ہے۔ (اصطلاح میں ''عَورۃ'' سے مراد جسم کا وہ حصہ ہے جس کا چھپانا بہر حال فرض ہے خواہ وہ مرد کا ہو یا خاتون کا یعنی ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ مرد کے لئے اور عورت کے لئے تمام جسم)۔

(۵) ٹٹی پیشاب کرتے ہوئے نہ ہی رُخ اور نہ ہی پشت قبلہ کی طرف ہونے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں حدیثِ نبوی ملاحظہ ہو جس میں آپ نے فرمایا:

لَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا بِغَائِطٍ اَوْبَوْلٍ (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''ٹٹی پیشاب کرتے ہوئے قبلہ کی طرف نہ ہی رخ کرو اور نہ ہی پشت۔''

(۶) عام گزرگاہوں' سایہ دار جگہوں' آبی چشموں اور باثمر درختوں کے نیچے بھی بول و براز سے گریز کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں نبی علیہ السلام کی ہدایت واضح ہے جس میں آپ نے فرمایا:

اِتَّقُوا الْمَلَاعِنَ الثَّلَاثَةَ: اَلْبَرَازَ فِی الْمَوَارِدِ وَقَارِعَةَ الطَّرِیْقِ وَالظِّلِّ (مستدرک حاکم)

''تین عام استعمال کی جگہوں پر ٹٹی پیشاب کرنے سے بچو: آبی چشموں کے قریب' عام گزرگاہوں اور باثمر درختوں کے نیچے۔''

(۷) جب دو آدمی ٹٹی پیشاب کے لئے جائیں تو اُنہیں ایک دوسرے سے چھپ کر بیٹھنا چاہئے' آپس میں

گفتگو بھی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلَانِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهٖ وَلَا يَتَحَدَّثَا فَإِنَّ اللّٰهَ يَمْقُتُ عَلٰى ذٰلِكَ (مُسند احمد)

''جب دو آدمی قضائے حاجت کے لئے جائیں تو اُنہیں ایک دوسرے سے چھپ کر بیٹھنا چاہئے' ایک دوسرے سے باتیں نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔''

نوٹ : اس حال میں مطلقاً کلام کرنا مکروہِ تنزیہی ہے لیکن ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں مثلاً اس حال میں کسی نابینا کو کنویں کی طرف بڑھتا دیکھ کر اُسے صحیح راستہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔
(''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدی' جلد دوم' صفحہ ۶۸۵)

(ب) <u>قضائے حاجت کے دوران کے آداب</u> : (۱) ہڈی یا گوبر سے نجاست کو دُور نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نبی ﷺ نے ایسا کرنے سے اِن الفاظ میں منع فرمایا ہے:۔

لَا تَسْتَخْمِرُوْا بِالرَّوْثِ وَلَا بِالْعِظَامِ فَإِنَّهٗ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''جائے نجاست کو نہ تو گوبر اور نہ ہی ہڈیوں کے ذریعے صاف کرو کیونکہ وہ تمہارے بھائیوں یعنی جنّات کی خوراک ہیں۔''

اس لحاظ سے انسانی استعمال کی دیگر چیزوں کو بھی ایسے کام میں لانا منع ہے جیسے روئی اور کپاس یا باسی سوکھی روٹی کے ٹکڑے وغیرہ۔

(۲) قضائے حاجت کے وقت کسی کو سلام کرنا یا اُس کا جواب دینا مکروہ ہے۔ اسی طرح اس حالت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ذکر کرنے یا قرآن پاک کے پڑھنے کی بھی ممانعت ہے۔

(۳) استنجا کرنے میں دائیں ہاتھ کا استعمال کرنا بھی منع اور بالکل حرام ہے۔ اسی طرح آلہِ تناسل اور مقعد کو بھی اِس دوران دائیں ہاتھ سے چھونا حرام ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے :

لَا يَمَسَّنَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ وَهُوَ يَبُوْلُ وَلَا يَتَمَسَّحْ مِنَ الْخَلَاءِ بِيَمِيْنِهٖ (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''تم میں سے کوئی قضائے حاجت میں اپنے آلہِ تناسل کو نہ چھوئے (یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے) اور نہ ہی نجاست کو اپنے دائیں ہاتھ سے دُور کرے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(۴) نجاست صاف کرنے کے لئے سنگ ریزے / خشک مٹی کے ڈھیلے طاق عدد میں استعمال کئے جائیں۔

اگر تین نا کافی ہوں تو پانچ استعمال کئے جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ خود طاق (یعنی ایک) ہے اور وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔ سیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

نَهَانَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْبَوْلٍ أَوْ أَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ أَوْ أَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ أَوْعَظْمٍ (صحیح مسلم)

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قضائے حاجت کے دوران قبلہ کی طرف رخ کرنے' دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے' تین سے کم ڈھیلوں اور گوبر اور ہڈی سے نجاست کو صاف کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

(۵) استنجا کرنے اور نجاست صاف کرنے کے لئے پانی کے استعمال سے پہلے سنگریزوں یا مٹی کے خشک ڈھیلوں کا استعمال کر لینا چاہئے اور پھر اس کے بعد پانی استعمال ہونا چاہئے۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کچھ صحابیات کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

مُرْنَ أَزْوَاجَكُنَّ أَنْ يَّسْتَطِيْبُوْا بِالْمَاءِ فَإِنِّيْ أَسْتَحْيِيْهِمْ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يَفْعَلُه' (ترمذی)

''اپنے شوہروں سے کہو کہ وہ (قضائے حاجت کے بعد) پانی کے ذریعے جائے نجاست کو دھو لیا کریں کیونکہ یہ بات مجھے خود اُن سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے مسلسل طریقے میں رہا ہے۔''

(ج) قضائے حاجت سے فراغت کے بعد کے آداب : (۱) قضائے حاجت سے فراغت کے بعد بیت الخلاء یا ٹائیلٹ سے نکلتے وقت سنتِ نبوی کے مطابق دایاں پاؤں پہلے باہر رکھنا چاہئے (جبکہ اندر داخل ہوتے وقت سنتِ نبوی کے مطابق بایاں پاؤں پہلے اندر رکھا گیا تھا)۔

(۲) پھر رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مبارکہ کے مطابق بیت الخلاء سے باہر آ کر یہ دعا پڑھ لینی چاہئے اور بعدہ' ہاتھ پاک کر لینے چاہئیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى وَعَافَانِيْ (سنن ابنِ ماجہ)

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دِہ چیز کو دُور کیا اور مجھے عافیت بخشی۔''

نوٹ : قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں لفظ غائط آیا ہے جو غوط سے ہے بمعنی زمین کھودنا اور ہر پست زمین کو غائط کہتے ہیں۔ جہاں بیٹھنے سے انسان لوگوں کی نگاہ سے چُھپ جاتا ہے۔ چونکہ اہلِ عرب عموماً قضائے حاجت کے لئے پست جگہ میں بیٹھتے تھے تاکہ لوگوں سے پردہ رہے اس لئے پیشاب خانہ کو غائط بولتے تھے' جیسے ہندوستان میں دیہاتی لوگ جنگل پھرنا اور پنجاب میں باہر جانا کہتے ہیں۔

(۴۴) خاندانی منصوبہ بندی/تحدیدِ نسل (Family Planning)

''ارادی طور پر جنسی فعل کا ترک کرنا، مانعِ حمل ادویات کا استعمال، عملِ جراحی کے ذریعے تعقیم (نسل کشی کے ناقابل بنانا)، اِسقاطِ حمل یا ماں کا اپنے بچے کو طویل وقت تک دودھ پلانا، یہ سب امور خاندانی منصوبہ بندی یا تحدیدِ نسل کے ذیل میں آتے ہیں۔ ''مانع افزائشِ نسل'' (Fertility Control) کی وسیع اصطلاح، افزائشِ نسل یا اُس کی حد بندی کو محیط ہے۔ اگرچہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' یا ''سوچی سمجھی ولدیت'' کی اصطلاحات بعض اوقات تحدیدِ نسل کے ہم معنیٰ استعمال ہوتی ہیں لیکن وسیع معنیٰ میں اُن کا اطلاق بالعموم پالیسیوں، پروگراموں اور اُن خدمات پر ہوتا ہے جو لوگوں کو تحدیدِ نسل میں مدد دینے میں کی جاتی ہیں۔'' (The Encyclopedia Americana, Vol 4, p. 4)

''تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) کی اصطلاح 15-1914 میں امریکہ کی حقوقِ نسواں کی حامی مارگریٹ سانگر نامی عورت نے وضع کی۔۔ طبی لحاظ سے برتھ کنٹرول کا مشورہ اکثر اُن حالات میں دیا جاتا ہے جب بچے کی پیدائش مستقبل میں ہونے والی ماں کی جسمانی یا ذہنی صحت کے لئے خطرے کا موجب ہو یا اپاہج بچے کو جننے میں فی الواقع خطرہ ہو۔ معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے تحدیدِ نسل کا محرّک خاندان میں معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے یا اُسے بہتر بنانے کی خواہش ہوتی ہے۔'' (The New Encyclopaedia Britannica, Vol. 2, p. 236... Chicago, 15th Edition)

خاندانی منصوبہ بندی ایک متنازعہ مسئلہ ہے اور اس پر دو مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں: ایک نقطۂ نظر اُس کی حمایت میں ہے جبکہ دوسرا اُس کی مخالفت کرتا ہے۔ تاہم اِن دونوں نظریات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

''**خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں اور مخالفت میں دلائل**: تحدیدِ نسل کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کی بنیاد دراصل مالتھس کے اس نظریہ پر ہے کہ آبادی کو وسائلِ پیداوار سے بڑھنا نہیں چاہئے۔ اس نظریہ کے حامیوں کے نزدیک اگر آبادی کو مصنوعی ذرائع سے نہ روکا جائے تو یہ بالیقین وسائلِ پیدائش سے باہر نکل جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ معیار سے گری ہوئی زندگی کے باعث مختلف بیماریوں اور فاقہ کشی کا بہ آسانی شکار ہو جائیں گے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ آبادی کی افزائش اُقلیدسی طریق سے (By Geometric Progression) اور پیداواری افزائش توالی ہندسی سے (By Arithmetic Progression) ہونا# تنگ و افلاس جیسے خطرہ کو دعوت دینا ہے۔ لہٰذا اُن کے نزدیک اس خطرے کا علاج مصنوعی ذرائع کو

#اُقلیدسی افزائش (Geometric Progression) بڑھتے ہوئے اعداد کا ایسا سلسلہ ہے جس میں ہر اگلا عدد اُسی نسبت سے بڑھے جس نسبت سے پچھلا عدد بڑھا تھا جیسے ۱، ۳، ۹، ۲۷، ۸۱، ۲۴۳ وغیرہ۔

''توالی ہندسی سے افزائش'' (Arithmetic Progression) ایک ہی مقدار سے بڑھتی یا گھٹتی ہے جیسے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ وغیرہ۔ (آکسفورڈ اردو انگریزی ڈکشنری از شان الحق حقی، صفحات ۶۵۷، ۶۳)

اختیار کرنے میں ہے۔

اقتصادی وجوہ کے باعث تحدیدِ نسل کے ذرائع اختیار کرنے پر تنقید یہ کی جاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اُس وعدے پر عدمِ ایمان ہے جس میں اُس نے اپنی ہر مخلوق کو رزق پہنچانے اور انسان کے اُس پر بھروسہ کرنے کا کہا ہے۔ آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہوں:۔

(۱) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ٥ (هُود : ٦)

''اور زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اُس کا رزق نہ ہو اور وہ ہر ایک کے کم رہنے کی جگہ اور زیادہ رہنے کی جگہ کو جانتا ہے' ہر چیز کتاب میں درج ہے۔'' (۶ : ۱۱)

(۲) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرَازِقِينَ ٥ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ٥ (اَلْحِجْر : ۲۰' ۲۱)

''اور ہم نے اُس (زمین) میں تمہارے لئے بھی معاش کے ذرائع بنائے اور اُن کے لئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔ اور جو چیز بھی ہمارے پاس ہے' اُس کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم اُسے ایک مقدارِ معین ہی سے اتارتے رہتے ہیں۔'' (۲۰' ۲۱ : ۱۵)

(۳) وَكَأَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ٥ (اَلْعنكبوت)

''اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی غذا اُٹھا کر نہیں رکھتے' اللہ ہی اُنہیں روزی پہنچاتا ہے اور تمہیں بھی اور وہی خوب سننے والا' خوب جاننے والا ہے۔'' (۶۰ : ۲۹)

(۴) لَهٗ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (اَلشُّورٰى : ۱۲)

''آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اُسی کے اختیار میں ہیں' وہ جسے چاہے' زیادہ روزی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' کم دیتا ہے۔'' (۱۲ : ۴۲)

فاقہ کشی کے خوف سے آبادی کی افزائش کو روک دینے کی مندرجہ ذیل آیات میں سختی سے ممانعت ہوئی ہے:

(۱) قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوٓا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ٥ (الانعام : ۱۴۰)

''وہ لوگ بڑے ہی گھاٹے میں رہے جنہوں نے اپنی اولاد کو ازراہِ حماقت کسی بنیاد کے بغیر قتل کر دیا اور جو کچھ اللہ نے اُنہیں دے رکھا تھا' اُسے اللہ پر افتراء کرتے ہوئے اپنے اوپر حرام کر لیا' یہ لوگ خوب ہی بھٹکے اور کسی طرح راہ یاب نہ ہوئے۔'' (۱۴۰ : ۶)

(۲) وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام : ۱۵۱)

''اور اپنی اولاد کو ناداری (کے خیال) سے قتل مت کر دیا کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور اُنہیں بھی' اور بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ۔'' (۱۵۱ : ۶)

(۳) وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًاo وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًاo (بنی اسرائیل : ۳۱، ۳۲)

''اوراپنی اولادکوناداری کےاندیشہ سےقتل مت کیا کرو، ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی، بےشک اُن کاقتل کرنا بہت بڑاجرم ہے۔اور زِنا کےقریب تک نہ جاؤکہ وہ بڑی بےحیائی کا کام ہےاوربُری راہ ہے۔'' (۳۱، ۳۲ : ۱۷)

جاہلی عربوں پر ایک جدید مستند شخصیت یوں رقم طراز ہے:۔

''طفل کُشی کا بڑا محرک خوراک کی نایابی تھا جسے اُس صحرائی ماحول میں ہمیشہ محسوس کیا جاتا رہا۔''
("Kinship and Marriage in Early Arabia" ... Robertson Smith, p. 155)

اِسی قسم کا نظریہ Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics میں ملتا ہے :

''اِس عملِ (طفل کُشی) میں اصلی محرک بلاشک وشبہ وہی ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے یعنی غربت و افلاس۔ یہ بات خوب جانی پہچانی ہے کہ دوسرے ممالک میں بھی طفل کُشی کی وجہ یہی غربت وافلاس ہی تھی۔'' (جلد اوّل، صفحہ ۶۶۹)

مندرجہ بالا ہردوآیات (یعنی سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۱ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۳۱، ۳۲) میں طفل کُشی (یعنی برتھ کنٹرول) کی ممانعت کے فوراً بعد فواحش اور زِنا کے قریب جانے کی ممانعت ہوئی ہے جس میں ان دونوں (یعنی برتھ کنٹرول اور زِنا) کے باہمی تعلق کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اوّل الذکر یعنی برتھ کنٹرول لازمی طور پر بےحیائی اور زِنا کا دروازہ کھولتا ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ شرک کے بعد طفل کُشی کبیرہ گناہ ہے کہ تم اپنے بچے کو اس خدشہ کے مارے قتل کردو کہ وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر تمہارے کھانے میں شریک ہوگا۔

اِن حوالہ جات کی بناء پر برتھ کنٹرول کے مخالفین کا یہ موقف ہے کہ چونکہ رازقِ حقیقی اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو اُن کی ضروریات کے مطابق رزق بہم پہنچانے کا ذمہ لے رکھا ہے، اس لئے شرحِ پیدائش کو کنٹرول کرنے کی کوئی بھی کوشش اُس پر عدمِ ایمان کے برابر ہے۔ اُن کا یہ بھی استدلال ہے کہ ''جبکہ آبادی میں ہر اضافے کا مطلب ایک اور منہ میں خوراک ڈالنا ہے تو اس کا بالواسطہ یہ مطلب بھی تو نکلتا ہے کہ کمانے کے دومزید ہاتھ آگئے ہیں۔'' بہ الفاظِ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں آنے والا کوئی بھی شخص بھوکے پیٹ کے ساتھ نہیں آتا بلکہ (کمانے والے) اپنے

دونوں ہاتھوں کے ساتھ آتا ہے۔ خوراک کی کمی یا نایابی جو کہ انسان کے اپنے تساہل اور غفلت کا نتیجہ ہوتی ہے' عارضی کیفیت ہے اور جسے سنبھالا جا سکتا ہے اگر اس میں پُر خلوص اور اَن تھک محنت لگا دی جائے کیونکہ قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (اَلرَّعْد : ۱۱)

''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی نہیں کر لیتے۔'' (۱۱ : ۱۳)

برتھ کنٹرول کے مخالفین اُس مشہور و معروف حدیث کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس کے راوی حضرت جابر بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں اور جس میں نبی ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو اِن الفاظ میں نصیحت فرمائی:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُ بِالْبَاءِ وَ يَنْهٰى عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْيًا شَدِيْدًا وَيَقُوْلُ: تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ" بِكُمُ الْأَنْبِيَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (مُسنَد امام احمد و صَحّحه' ابنُ حبّان)

''رسول اللہ ﷺ شادی کرنے کا حکم فرماتے تھے اور بیویوں سے دُور رہنے کی سختی سے ممانعت فرماتے تھے اور کہتے تھے: ایسی عورتوں سے شادی کرو جو بہت زیادہ محبت کرنے والی اور فراوانی سے اولاد پیدا کرنے والی ہوں' کیونکہ میں قیامت کے دن تمہاری کثرتِ تعداد میں دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فخر کروں گا۔''

حدیثِ مذکورہ میں اَلْوَدُوْدَ اور اَلْوَلُوْدَ دونوں لفظ انتہائی مبالغہ کے ہیں جن کے معنیٰ بالترتیب ''بہت زیادہ محبت کرنے والی'' اور ''بہت زیادہ بچے جننے والی'' کے ہیں' نہ کہ ''محض محبت کرنے والی'' اور نہ ہی ''صرف بار آور'' ہو (کہ دو یا تین بچوں کو جنم دے) جیسا کہ برتھ کنٹرول کے حامی اس کا یہ مطلب لیتے ہیں۔ حدیثِ مبارکہ کا لفظ مُكَاثِرٌ" بھی پیغمبر علیہ السلام کی اپنی اُمّت کی کثرت کی آرزو کا مظہر ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے حامی اپنے موقف کی تائید میں کہتے ہیں کہ اگر لفظ اَلْوَلُوْد کو بطور مبالغہ لیا جائے بمعنیٰ کہ اُن عورتوں سے شادی کرو جو موروثی طور پر زیادہ سے زیادہ بچوں کو جنم دینے والی ہوں' تو یہ لفظ عورتوں کی کمی کے خطرے کا موجب ہوگا جس کے نتیجہ میں مَردوں کی تعداد عورتوں سے بڑھ جائے گی۔ لہٰذا بقول اُن کے لفظ اَلْوَلُوْد کا معنیٰ محض ''بار آور'' کا ہے نہ کہ ''بہت زیادہ بچوں کو جنم دینے والی''۔ برتھ کنٹرول کے مخالفین اس کے ردّ میں کہتے ہیں کہ یہ بات اُن کی عربی زبان کی صَرف ونحو (گرامر) سے ناواقفیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی مندرجہ ذیل حدیثِ نبوی کو پیش کرتے ہیں جو عورتوں کی کمی کے اندیشہ کو دُور کرتی ہے:

مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا وَتَكْثُرَ النِّسَاءُ وَ يَقِلَّ الرِّجَالُ حَتّٰى يَكُوْنَ لِخَمْسِيْنَ اِمْرَءَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ (صحیح بخاری: باب رفع العلم وظهور الجهل)

''علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ علم ختم ہو جائے گا' جہالت نمودار ہوگی' بدکاری بڑھ جائے گی' عورتوں کی تعداد مَردوں سے بڑھ جائے گی یہاں تک کہ ایک مرد پچاس عورتوں کا قیم ہوگا۔''

۱۳۳۸ (خاندانی منصوبہ بندی/تحدیدِ نسل Family Planning)

کیا موجودہ صورتِ حال پیغمبر علیہ السلام کی پیشگوئی کی صداقت کا واضح ثبوت نہیں ہے؟ اور وہ وقت دُور نہیں جب مرد ضرور تا تعدّدِ ازواج کی زندگی (Polygamous Life) اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے اور عورتوں کو اپنی سوکنوں کے وجود سے موافقت کرتے ہوئے اُنہیں برداشت کرنا ہوگا۔

برتھ کنٹرول کے حامی یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ آدمی کو بھاری کنبے کے بوجھ سے بچانے کے لئے قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں کچھ ایسے نکات ملتے ہیں جو مرد کو صرف ایک شادی پر اکتفا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مثلاً سورۃُ النِّساء کی یہ آیت :

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُوْلُوْا ○ (النساء : ۳)

”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو، یا جو کنیز تمہاری مِلک میں ہو، اِس بات میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔“ (۳ : ۴)

ظاہر ہے کہ بے انصافی اور عدمِ مساوات سے بچنے کے لئے (خواہ وہ بیویوں کے درمیان ہو یا بچوں کے درمیان ہو یا دونوں کے درمیان ہو) صرف ایک بیوی پر قناعت کرنا عقل و دانش اور نیکی کی بات ہے کیونکہ اس صورت میں ظلم اور زیادتی کے امکانات بھی بہت کم رہ جائیں گے۔ عَول کے معنی ایک طرف جھک جانے اور زیادتی کرنے کے ہیں۔ لَا تَعُوْلُوْا کے معنیٰ ہوں گے کہ ظلم وزیادتی نہ کرو۔

علاّمہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لَا تَعُوْلُوْا کی توضیح میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بیان کرتے ہیں ”تاکہ تمہیں اِتنے سارے بچوں کی کفالت نہ کرنی پڑے“ (عَالَ يَعُوْلُ سے بمعنی عیالداری) [بحوالہ ”ضیاء القرآن“ از کرم شاہ، جلد اوّل، صفحہ ۳۱۸]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالی اور دیگر مشکلات سے بچنے کے لئے یک زوجیت بہتر ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے حامی ابوبکر الجصاص کی تفسیر ”احکام القرآن“ کا حوالہ دیتے ہیں جنہوں نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۳ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ

”تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں، سو تم اپنے کھیت میں جس طرح چاہو، آؤ۔ اور اپنے حق میں آئندہ کے لئے کچھ کرتے رہو۔“ (۲۲۳ : ۲)

کی تفسیر میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ”تمہیں عزل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔“ ابوبکر الجصاص مزید کہتے ہیں کہ عزل کا یہ عمل بیوی کی رضامندی ہی سے ہوگا۔ ... ("Islam & Current Issues" Rashid Ahmad Jullundhri, p. 130)

برتھ کنٹرول کے مخالفین آیتِ بالا ۲۲۳ سے یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ لفظ حرث کی تکرار میں اِس حقیقت پر

زور دینا ہے کہ ازدواجی تعلقات میں اصل مقصد جنسی لذت اندوزی کی بجائے طلب اولاد ہونا چاہئے۔ قَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ عین لذّت کے وقت بھی اپنی عبدیت اور اپنی ذمہ داری کو بھول نہ جاؤ اور لذت پرستی ہی میں غرق نہ ہو جاؤ بلکہ ہو سکے تو اپنی لذتوں کو بھی عین طاعت وعبادت بنا لو۔

أَنّٰى بمعنیٰ كَيْفَ ہے یعنی مقاربت کی کوئی ایک ہیئت مقرر نہیں بلکہ جیسے تمہیں پسند ہو۔ صرف ایک شرط ملحوظ رہے کہ تخم ریزی کی جگہ وہ ہو جو اس کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ أَنّٰى کے دوسرے معنیٰ یعنی أَيْنَ (جدھر کے، جس رخ کے) کو لے کر بعض گندی فطرت کے لوگوں نے اس کی تشریح میں اپنی گندی سیرت کے عجیب عجیب مظاہرے کئے ہیں اور عورت کی دُبر میں جنسی لذت کے حصول کی غیر فطری بات تلاش کی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ موضع ومقام میں کسی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ برتھ کنٹرول اسلام کے نظامِ ازدواج کے بالکل خلاف ہے اور اس کی اس نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کو اس وجہ سے بھی چیلنج کیا گیا ہے کہ منع حمل کے لئے طریقہِ عزل کو اختیار کرنا غیر اسلامی فعل ہے اور اس موقف کی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

(۱) إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ قَدَّرَ مَا هُوَ خَالِقٌ" إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (صحیح بخاری ۶۷:۹۷)
"اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے پیدا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، وہ قیامت کے دن تک بھی پیدا ہو کر رہے گی۔"

(۲) ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْعَزْلُ فَقَالَ: ذٰلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ (طحاوی: کتاب النکاح)
"نبی علیہ السلام کے پاس عزل کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بچوں کا خفیہ طور پر دفن کرنا ہے۔"

(۳) جَاءَ رَجُلٌ" إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ عَزَلْتُ جَارِيَتِيْ فَحَمَلَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا قَدَّرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِنَفْسٍ أَنْ يَّخْلُقَهَا إِلَّا وَهِيَ كَائِنَةٌ" (ایضًا ص ۲۳)
"ایک شخص نبی علیہ السلام کے پاس آ کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں نے اپنی لونڈی سے عزل کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ حاملہ ہوگئی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جس چیز کے اللہ نے پیدا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، وہ پیدا ہو کر رہے گی۔"

(۴) إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ إِذَا أَرَادَ أَنْ يُّخْلُقَ شَيْئًا لَمْ يَمْنَعْهُ شَيْءٌ" (ایضًا ص ۲۱)
"جب اللہ بزرگ و برتر کسی چیز کے پیدا فرمانے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو کوئی بھی چیز اُسے اس سے روک نہیں سکتی۔"

برتھ کنٹرول کے حامی "عزل" کی حمایت میں مندرجہ ذیل احادیث کا حوالہ دیتے ہیں:

(۱) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: ذُكِرَ الْعَزْلُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: وَلِمَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ أَحَدُكُمْ وَلَمْ يَقُلْ فَلَا يَفْعَلْ ذٰلِكَ أَحَدُكُمْ فَإِنَّهُ لَيْسَتْ نَفْسٌ "مَّخْلُوْقَةٌ" إِلَّا اللّٰهُ خَالِقُهَا (صحیح مسلم: کتاب النکاح)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے عزل کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی اسے کیوں کرتا ہے؟ اور آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم میں سے کسی کو عزل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ جو بھی ذی روح چیز پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ پیدا ہو کر ہی رہتی ہے۔''

(۲) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَعْزِلُ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ قَالَ سُفْيَانُ: لَوْ كَانَ شَيْئًا يُنْهٰى عَنْهُ نَهَانَا عَنْهُ الْقُرْآنُ (ایضا حدیث: ۳۴۵۵)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کے نزول کے زمانہ میں ہم عزل کیا کرتے تھے اور حضرت سفیان کا بیان ہے کہ اگر عزل برا فعل ہوتا تو قرآن مجید ہمیں یقیناً اس سے روک دیتا۔''

(۳) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَعْزِلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَبَلَغَ ذٰلِكَ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ يَنْهَانَا عَنْهُ (ایضا حدیث: ۳۴۵۷)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم زمانہ رسالت میں عزل کیا کرتے تھے۔ اس بات کا علم نبی اکرم ﷺ کو ہوا تو آپ نے ہمیں اس سے نہیں روکا۔''

صحیح مسلم میں ایک باب ''فی جوازِ الغِيْلة وهِيَ وَطْئُ الْمَرْضِ وَكَرَاهَةُ الْعَزْل'' کے نام سے موجود ہے۔

برتھ کنٹرول کے مخالفین ''عزل'' کو مکروہ ہونے کے باوجود مجبوری اور ضرورت کے تحت جائز قرار دیتے ہیں۔ ''اضطرار'' یعنی مجبوری اور ضرورت مستثنیات ہوتی ہیں لہٰذا انہیں کسی بھی صورت میں قانون کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ استثنائی صورتوں میں ''عزل'' فعلِ مکروہ نہیں ہوگا۔ مثلاً جب حمل عورت یا بچے کی زندگی یا صحت کے لئے خطرہ ہو اور جب بچے کی پیدائش کو طبی وجوہ کی بناء پر خطرناک سمجھا جاتا ہو تو اس کی پیدائش اور حمل کو مانع حمل کے مصنوعی طریقوں کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ''عزل'' صحیح اور درست عمل ہوتا ہے اور جب اس کی حقیقی اور فوری ضرورت ہو تو اسے ضرور اختیار کرنا چاہئے۔ اور جونہی ضرورت یا عذر جاتا رہے تو ''عزل'' پھر اُسی طرح فعلِ مکروہ ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صحابہ رسول ''عزل'' بطورِ افراد اختیار کرتے تھے کہ اوّل تو یہ حکومتی حکمتِ عملی (سٹیٹ پالیسی) کا نتیجہ نہیں تھی اور دوم یہ کہ وہ اسے بھوک یا غربت کے خوف سے نہیں (جیسا کہ اقوامِ متحدہ کے ماہرینِ اقتصادیات نے کہا) بلکہ طبی وجوہ کی بناء پر اختیار کرتے تھے۔ (Encyclopaedia of Seerah, Vol. 2, p. 515)

تاہم اگر ''عملِ عزل'' کو سماجی تحریک کے طور پر چلایا جائے تو عمرانی نقطہ نگاہ سے یہ فعلِ مکروہ ہوگا۔ فقہاء نے ''عزل'' کو میاں بیوی دونوں کی رضامندی کی شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے اور اُن دونوں میں سے کوئی ایک

بھی دوسرے کی رضامندی کے بغیر ''عزل'' نہیں کرسکتا۔ اور جو چیز ایک فریق کی رضامندی پر منحصر ہو' اُسے قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن مجید ایسی صورتوں میں کوئی خاص شِق فراہم نہیں کرتا لیکن اس کی کچھ آیات ایسی ہیں جن کی روشنی میں ایسی صورتِ حال سے نمٹا جاسکتا ہے۔ مثلاً ذیل کی آیاتِ مبارکہ:

(۱) يُرِيْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة: ۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔'' (۲:۱۸۵)

(۲) مَا يُرِيْدُاللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (اَلْمائدة: ۶)

''اللہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ تو (یہ) چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک وصاف رکھے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے تاکہ تم شکر گزاری کرو۔'' (۶ : ۵)

(۳) وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اَلْحج: ۷۸)

''اور اُس نے دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔'' (۷۸ : ۲۲)

برتھ کنٹرول کے مخالفین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی کو ہردلعزیز بنانے میں لاکھوں ڈالرخرچ کرنا وسائل اور توانائی کا ضیاع ہے۔ اگر اِن وسائل اور اَفرادی قوّت کو محروم القسمت اور نادار لوگوں کے اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لئے کام میں لایا جائے تو یہ زیادہ بہتر اور باثمر ہوگا۔ برتھ کنٹرول کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ''خاندانی منصوبہ بندی کا مقصد آبادی کی مسلسل بڑھوتری کو روکنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد محنت کشوں کی قوّت میں صفاتی اور اَقدار پر مبنی بہتری لانا اور آبادی کی بڑھوتری اور اقتصادی بڑھوتری کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔'' اُنہیں یہ بھی خدشہ ہے کہ نئے آنے والے بچوں کو اگر مناسب تعلیم وتربیت نہ دی گئی جو آج کے دَور میں مہنگا معاملہ ہے' تو وہ معاشی طور پر طفیلی (مفت خورے) بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔

برتھ کنٹرول کے مخالفین کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اُمّتِ مسلمہ میں فحاشی' بے حیائی' غیر اِزدواجی تعلقات' زِنا اور بدکاری کو پھیلانے میں مصنوعی تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) اسلام دشمن دھڑے کی اختراع ہے تاکہ اُمّت کے اخلاق بگڑیں اور اُن کی توانائیاں کم ہوں کہ وہ دشمن کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ لہٰذا اسلام کی نظریاتی ضابطہ اَخلاق کی سرحدوں پر حملہ کے لئے خاندانی منصوبہ بندی اُن کا کامیاب ہتھیار ہے۔ اس کے جواب میں برتھ کنٹرول کے حامی کہتے ہیں کہ معاشرہ میں زِنا اور غیر اِزدواجی تعلقات محض تحدیدِ نسل کے طریقوں سے متعارف کرانے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ فلسفہِ حیات کے رویّہ میں تبدیلی اور اخلاقی اور روحانی اَقدار میں زوال پذیری بھی اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

برتھ کنٹرول کے حامیوں کے نزدیک شیر خوار بچے مانعِ حمل کا ایک ذریعہ ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کچھ فقہاء کے نزدیک بچے کو دوسال تک دودھ پلانے کی قرآنی تجویز (بحوالہ سورۂ البقرۃ :۲۳۳؛ سورہ لُقمان:۱۴؛ سورۂ الاَحقاف :۱۵) مانعِ حمل کی بالواسطہ مددگار ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ایک دلیل یہ بھی ہے کہ معاشرہ کے غریب و نادار اور ناخواندہ طبقے کی بجائے معاشرے کے امیر اور تعلیم یافتہ طبقوں کو برتھ کنٹرول میں دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ معاشرہ میں اُنہیں اپنے معیارِ زندگی کے قائم رکھنے کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ جونہی آسائشات کا معیار بڑھتا ہے' لوگ عمر کے تاخیری حصے تک آرام و آسائش کی زندگی کا حصول مشکل سمجھتے ہیں' لہٰذا وہ دیر سے شادی کرنے میں مجبور ہوتے ہیں۔ وہ کثیر العیال بھی ہونا نہیں چاہتے کیونکہ یہ چیز اُن کے معیارِ زندگی میں گراوٹ کا باعث ہوگی۔ ''بچہ یا کار'' ہی نوجوان جوڑے کے لئے مسئلہ بن جاتا ہے اور اکثر کار ہی کو ترجیح ملتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ امیر اور تعلیم یافتہ لوگ بچے کم پیدا کریں گے جس کی وجہ سے سماجی ترقی کی رفتار کم پڑ جائے گی۔ دراصل یہ خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ایک سنجیدہ اعتراض ہے اگرچہ اس کے حامیان کا یہ نظریہ ہے کہ اگر خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو صحیح طور پر نافذ کیا جائے تو وہ آبادی کی موجودہ ترقی کی پریشان کن (خوفناک) شرح کو روک دیں گے اور اسے اقتصادی ترقی کے دوش بدوش چلانے میں ممد ثابت ہوں گے جس کا دوسرے لفظوں میں مطلب فلاح و بہبودِ عامہ ہوگا۔'' ("Islamic Economics --- Theory and Practice" ... M.A. Mannan, p. 120)

اِسقاطِ حمل (Abortion): اسلام جہاں ٹھوس وجوہ کی بناء پر منعِ حمل کی اجازت دیتا ہے' وہاں وہ حمل کو اُس کے قرار پا جانے کے بعد نقصان پہنچانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

''مسلم فقہائے کرام اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ جنین (کچا بچہ Foetus) کی حمل میں مکمل تشکیل اور اُس میں روح پڑ جانے کے بعد اُس کا اِسقاط (گرانا) حرام ہے۔ یہ ایک جرم بھی ہے جس کے ارتکاب کی مسلمانوں کو ممانعت ہے کیونکہ اس میں ایک مکمل انسانی جان لینے کا گناہ ہے۔ تاہم اسقاطِ حمل کی ایک استثنائی صورت ہے۔ فقہاء کہتے ہیں کہ بچے کی مکمل تشکیل کے بعد اگر یہ بات باعتماد طور پر یقینی ہو جائے کہ حمل کو باقی رکھنا لازماً ماں کی موت کا سبب بنے گا' تو شریعت کے عام اصول کے مطابق دو بُرائیوں میں سے کم تر بُرائی کا اِختیار کرنا ہوگا یعنی اِسقاطِ حمل کرا دینا چاہیئے۔

''کیونکہ ماں جنین (کچے بچے) کا مبدا ہے' مزید یہ کہ وہ کچھ فرائض اور ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ زندگی میں مستحکم بھی ہو چکی ہوتی ہے اور وہ خاندان کا مانند ستون کے سہارا بھی ہوتی ہے' تو اُس کا اپنی زندگی کو اُس جنین کے عوض قربان کرنا ممکن نہیں جس نے ابھی شخصیت بھی حاصل نہیں کی' اور جس پر ابھی تک کسی بھی ذمہ داری یا فرائض کا بوجھ نہیں پڑا۔'' (الفتاویٰ از شیخ شلتوت' صفحہ ۱۶۴)

''استقرارِ حمل سے ۱۲۰ دن تک حمل کا اِسقاط درست ہے۔ تاہم اس عرصہ کے بعد بھی اسقاطِ حمل میں کوئی اعتراض کی بات نہیں اگر مقصد ماں کی زندگی کا بچانا اور اُس کا تحفظ ہو۔'' ("The Concise Encyclopaedia of Islam, p. 17 --- London, 1989).

''مانعِ حمل ادویات (Contraceptions): بلا شک وشبہ نوعِ انسانی کا تحفظ' شادی کا اہم مقصد

ہے اورنسلِ انسانی کا یہ تحفظ تولید کے تسلسل کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اسلام کثیرالعیال ہونے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اُس نے مذکر و مؤنث اولاد میں برکت رکھی ہے۔ تاہم اسلام آدمی کو ٹھوس وجوہ اور مسلّمہ ضروریات کی بنیاد پر اپنے خاندان کی منصوبہ بندی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ بابرکت میں منعِ حمل کا عام طریقہ ''عزل'' تھا یعنی آلہِ تناسل کو اِنزال سے پہلے اندام نہانی سے باہر نکال لینا تاکہ مادہ منویہ اندر داخل نہ ہو۔ جیسا کہ بیان ہوا صحابہ کرام قرآن کے نزول کے عرصہ میں بھی عزل کیا کرتے تھے اور ''عزل'' کے جائز ہونے میں کچھ احادیث کا حوالہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔[''الحلال والحرام'' لقرضاوی (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۱۹۸]

''ایک ایسے اجتماع میں جس میں عمر رضی اللہ عنہ موجود تھے' کسی شخص نے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عزل بچے کو زندہ درگور کرنے کی ادنیٰ اور غیر اہم شکل ہے۔ اس پر جنابِ علی کرّم اللہ وجھہ' نے فرمایا کہ سات منازل کی تکمیل سے پہلے ایسی کوئی بات نہیں ہے: مٹی سے پیدا ہونا' پھر قطرۂ منی (نُطفه) پھر عَـلَقه' پھر مُضغَة کا بننا' پھر ہڈیاں اور اُن ہڈیوں پر گوشت کا چڑھایا جانا' اِن چھ مراحل کے بعد ساتویں مرحلہ میں تخلیقِ انسانی مکمل ہوتی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''علی! تم نے سچ کہا' اللہ تمہیں درازیٔ عمر عطا کرے!''

<u>اِسقاطِ حمل بمقابل مانعِ حمل ادویات</u> : منعِ حمل اور اِسقاطِ حمل دونوں ایک دوسرے سے مختلف چیزیں ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے مابین حدّ فاصل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مانعِ حمل اسقاطِ حمل کی طرح نہیں ہے۔ اسقاطِ حمل ایک جان لینے کے جرم کا نام ہے۔ اب وجود کی کئی منازل ہیں: وجود کی پہلی منزل رحم میں نطفے کا قرار پکڑنا اور اُس کا عورت کے بیضہ سے ملاپ کرنا ہے۔ یہ روح کو قبول کرنے اور زندگی پانے پر تیار رہتا ہے۔ اس میں مزاحم ہونا یا کسی قسم کا خلل ڈالنا جرم ہے۔ جب یہ عَلَقه بن جاتا ہے تو اس کا اسقاط بڑا جرم ہے۔ جب اس میں روح پڑ جاتی ہے اور اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو اسقاط کا جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے اور یہ جرم اپنی انتہا کو اُس وقت پہنچتا ہے جب جنین کو ماں سے جدا کر دیا جائے۔'' (احیاء علوم الدین: کتاب النکاح' صفحہ ۴۷)

<u>اسقاطِ حمل کے جائز ہونے کی تحقیق</u> : استقرارِ حمل سے چار ماہ بعد رحمِ مادر میں واقع بچے میں روح پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا اُس وقت سے وہ روح پڑا ہوا بچہ ایک زندہ' جاندار وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس وقت کا اسقاطِ حمل ایک زندہ جان کو قتل کرنا ہے اور اس لئے یہ سنگین جرم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ استقرارِ حمل سے چار ماہ بعد بچے میں روح کا پڑنا درجِ ذیل حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے:

قَالَ عَبْدُاللهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَهُوَالصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ قَالَ: اِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُه، فِیْ بَطْنِ أُمِّهٖ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ مَلَكًا وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ وَيُقَالُ لَه: أُكْتُبْ عَمَلَه، وَرِزْقَه، وَأَجَلَه، وَشَقِیٌّ" أَوْسَعِيْدٌ" ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۵۶)

''حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا اور آپ سچے اور سچ سے تائید کئے گئے ہیں' آپ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی تخلیق اُس کے رِحمِ مادر میں کی جاتی ہے اور وہ وہاں قطفہ کی شکل میں چالیس دن تک رہتا ہے۔ پھر یہ خونِ بستہ کی ایک پھٹکی (علقة) بن جاتا ہے اور وہاں اُسی عرصہ (یعنی چالیس دن) تک رہتا ہے پھر یہی پھٹکی چالیس دنوں تک کے لئے گوشت کا ٹکڑا (مُضغة) بنی رہتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو یہ حکم دیتے ہوئے بھیجتا ہے کہ وہ چار باتیں لکھے: اُس کے اعمال (اچھے یا برے ہوں گے)' اُس کا رزق' اُس کی عمر اور آیا وہ بد بخت ہوگا یا نیک بخت۔ پھر اُس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔''

یہ حدیثِ مبارکہ صاف طور پر بتاتی ہے کہ استقرارِ حمل سے چار ماہ بعد اِسقاطِ حمل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔

مانعِ حمل ادویات کے استعمال میں مضر اثرات کے حوالہ جات

(۱) ''ہر نقطہ نگاہ سے یہ بات مفادِ عامّہ میں ہے کہ مانعِ حمل طریقوں کے استعمال سے رک جانا چاہئے کیونکہ اُن کا استعمال غیر قدرتی اور ضرر رساں ہے اور شادی شدہ جوڑے کی حقیقی ازدواجی مسرت کے لئے تباہ کن ہے۔ اُن کے استعمال میں صحت اور ازدواجی مسرت کو عظیم خطرات درپیش ہوتے ہیں۔'' ("Straight Talks to Women" --- Lady Doctor Mary Scharlieb, pp. 167-168)

(۲) ''کچھ مانعِ حمل طریقوں کا استعمال جسمانی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ ایک بدبودار انجذاب کی ایسی مقدار کو پیدا کرتے ہیں جو موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔'' (ایضاً ص ۱۴۰)

(۳) ''مانعِ حمل طریقے کلی طور پر غیر معتبر اور عام طور پر مضر بھی ہوتے ہیں۔'' ("Biological Tragedy of Women" ... Nemilov, p. 193)

(۴) ''مکمل طور پر کامیاب' بے ضرر اور سادہ مانعِ حمل' جس پر مکمل اعتماد کیا جاسکے' تاحال دریافت نہیں کیا جاسکا۔'' (انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا' جلد سوم' صفحہ ۶۵۰)

(۵) ''کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی صحت' ازدواجی مسرّت اور حُسنِ کارکردگی کی اہلیت متواتر واقع ہونے والے حمل کی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں لیکن مانعِ حمل کے اِن مصنوعی طریقوں جن کا استعمال عام ہے' کی تخریب کاری کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔'' [ایک جدید ماہرِ طب بحوالہ تفسیر ماجدی (انگریزی) صفحہ ۲۹سی' نوٹ: ۲۴۲]

منعِ حمل کی معقول وجوہ: (۱) منعِ حمل کے طریقے استعمال کرنے کی پہلی معقول وجہ یہ ڈر ہے کہ حمل یا بچے کی پیدائش سے ماں کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں منعِ حمل کے طریقے استعمال کرنا جائز ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو زندگی کو اُس کے اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ قرآن مجید میں ہے:

(i) وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرة: ۱۹۵)

''اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالا کرو۔'' (۱۹۵ : ۲)

(ii) وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ (النساء: ۲۹)

''اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو' بے شک اللہ تمہارے حق میں بڑا مہربان ہے۔'' (۲۹ : ۴)

(۲) دوسری وجہ یہ خوف ہے کہ بچوں کا بوجھ خاندان کے حالات کو تنگ نہ کر دے جس سے آدمی اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے حرام ذرائع کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اسلام تکالیف کا مذہب نہیں۔ وہ اپنے ماننے والوں کے لئے ممکنہ حد تک آرام و آسائش مہیا کرتا ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۱۸۵؛ سورۃ المائدۃ: ۶؛ سورۃ الحج: ۷۸ بر صفحہ ۱۳۴۱)۔

(۳) یہ ڈر کہ کہیں بچوں کی صحت یا اُن کی نشو و نما کو نقصان نہ پہنچے' منعِ حمل کے لئے معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور کہا: میں اپنی بیوی سے ''عزل'' کرتا ہوں۔ آپ نے اُس سے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو اُس نے جواب دیا کہ مجھے اُس کے بچوں کی صحت کے بارے میں خوف ہے۔

(۴) منعِ حمل کی ایک اور معقول وجہ یہ خوف ہے کہ نیا حمل یا نیا بچہ پہلے دودھ پیتے بچے کو نقصان نہ دے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دودھ پلاتی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرنے اور اس کے نتیجے میں اُس کے حاملہ ہونے کو ''غِیلَہ'' کا نام دیا' اس خیال سے کہ حمل کہیں دودھ کو ختم نہ کر دے اور اس طرح شیر خوار بچے کو کمزور نہ کر دے۔ چونکہ آپ کو اپنی اُمت کی بہتری کا خیال ہر وقت دامنگیر رہتا تھا' اس لئے آپ نے اُنہیں ہر ضرر رساں چیز سے منع فرمایا۔ آپ کا ارشاد ہے:

''اپنے بچوں کو خفیہ طور پر قتل نہ کرو کیونکہ غِیلہ سوار سے آگے نکل جاتا ہے اور اُسے گھوڑے سے نیچے پھینک دیتا ہے۔'' (صحیح مسلم)

تاہم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اِس حد تک آگے نہیں گئے کہ آپ نے دودھ پلانے والی بیوی کے ساتھ مجامعت کرنے سے روک دیا ہو کیونکہ آپ کو معلوم ہوا تھا کہ اُس زمانے کی دو طاقتور قومیں یعنی ایرانی اور یونانی غِیلہ پر کاربند ہونے کے باوجود یہ چیز اُن کے بچوں کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔ مزید برآں اس ڈر سے کہ مدتِ رضاعت کے دوران جس کا عرصہ دو سال بھی ہوسکتا ہے' خاوندوں کا اپنی بیویوں سے دُور رہنا اُن کی مشکلات کا باعث ہوگا' آپ نے فرمایا:

''میں نے غِیلہ سے روکنا چاہا لیکن میں نے دیکھا کہ ایرانی اور یونانی عورتیں اپنے بچوں کو حمل کے دوران اپنا دودھ پلاتی ہیں اور اس سے اُن کے بچوں کو نقصان نہیں پہنچتا۔'' (ابوداؤد)

اس حدیث کا گزشتہ بیان کردہ حدیث کہ ''اپنے بچوں کو خفیہ طور پر قتل نہ کرو'' کے ساتھ تعلق پر بحث کرتے ہوئے ابن القیم لکھتے ہیں :

''نبی علیہ السلام نے دیکھا کہ حمل شیر خوار بچے کو اسی طرح نقصان دیتا ہے جس طرح کہ سوار کو گھوڑے سے گر کر ہوتا ہے۔ یہ نقصان دہ ضرور ہے لیکن بچے کے مارنے کی حد تک نہیں۔ آپ نے خاوندوں کو نصیحت کی کہ وہ دودھ پلاتی بیوی کے ساتھ اس طرح ہم بستری نہ کریں جس سے وہ حاملہ ہو جائیں لیکن آپ نے ہم بستری سے منع نہیں فرمایا۔ پھر آپ نے دودھ پیتے بچے کے حفظانِ صحت کے لئے اس سے روکنا چاہا لیکن اس کے نتیجہ میں خاوندوں اور بالخصوص نوجوان خاوندوں کو پہنچنے والی مشکل کو بھی سمجھا جو معاشرتی اخلاق کے لئے اور بھی نقصان دہ بات تھی۔ لہٰذا اِن معاملات میں توازن رکھنے کے لئے آپ نے اس سے نہ روکنے کو ترجیح دی۔ مزید برآں آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اُس زمانے کی دو طاقتور اور گنجان آباد قوموں کی عورتیں اپنے بچوں کو حمل کے دوران بھی دودھ پلاتی ہیں اور اس سے اُن کی طاقت اور تعداد پر کوئی اثر نہیں پڑتا' اس وجہ سے بھی آپ نے اس سے نہیں روکا۔'' (''مِفتاح دارالسعادۃ'' لابن القیم' صفحہ ۶۲۰ : ''زادالمعاد'' لابن القیم' ج ۴' ص ۲۶ بحوالہ القرضاوی)

''ہمارے اِس زمانے میں منع حمل کے نئے نئے طریقے آگئے ہیں جو نبی ﷺ کی آرزو اور مقصد کو پورا کرتے ہیں یعنی شیر خوار بچے کو کسی ایسے ممکن نقصان سے بچانا جو اُس کی ماں کے حمل کے باعث واقع ہو' جبکہ اس کے پہلو بہ پہلو خاوند کو اپنی دودھ پلاتی بیوی سے دُور رہنے کی تکلیف کو بھی ہٹانا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے دو بچوں کی پیدائش کا درمیانی فاصلہ تیس ماہ ہے یا اگر کوئی بچے کو پورے دو سال تک دودھ پلانا چاہے تو یہ عرصہ تینتیس (۳۳) ماہ کا ہے۔''

''امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ منع حمل کے طریقے اختیار کرنے میں بیوی کی رضامندی ضروری ہے کیونکہ جنسی لذت حاصل کرنے اور یہ فیصلہ کرنے پر اُس کا حق ہے کہ آیا وہ بچہ چاہتی ہے یا نہیں۔ روایت ہے کہ خلیفہ ثانی سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے بیوی کی رضامندی کے بغیر ''عزل'' سے روک دیا تھا۔ اور اسلام کی طرف سے

اُس زمانے میں حقوقِ نسواں کو قائم کرنے میں یہ ایک قابلِ ذکر اِقدام تھا جب عورت کو کوئی حق حاصل نہیں تھا۔''
[''الحلال والحرام'' لقرضاوی (ترجمہ انگریزی)' صفحہ ۲۰۱]

تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) پر مختلف علمائے دین کے فتاویٰ

سوال : ایک شادی شدہ آدمی کا ایک بچہ ہے۔ اُسے ڈر ہے کہ اگر وہ کثیر العیال ہو جائے تو وہ اُن بچوں کی نشو ونما اور نگہداشت صحیح طور پر نہ کر سکے گا یا یہ کہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری نہ کر سکنے کے باعث تفکرات اور بیماریوں یا اُن کے باعث اعصابی خلل (Nervous Breakdown) کا شکار ہو جائے یا یہ کہ بار بار کے حمل اور وضعِ حمل کے باعث اُس کی بیوی کی صحت خراب رہتی ہو اور اُسے آرام کرنے اور حمل کے دوران کھوئی ہوئی طاقت بحال کرنے کا وقفہ نہ ملتا ہو۔

تو کیا اُسے اور اُس کی بیوی کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ایسے طبی طریقے اختیار کرنے کی اجازت ہے جس سے حمل کا وقفہ بڑھ جائے تا کہ بیوی کو آرام اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کرنے کا وقت مل جائے؟

جواب فتویٰ از (۱) شیخ عبدالماجد سلیم ۔۔ مفتیِ مصر
(۲) محمد عبدالفتاح العنانی' چیئر مین فتویٰ کمیٹی' الازہر یونیورسٹی (مصر)

''صورتِ مسئولہ میں منعِ حمل کے طریقے اختیار کرنے کی اجازت ہے خواہ وہ ''عزل'' کے ذریعے ہوں یا عورت کا اندامِ نہانی کے منہ کو بند کرنے کے ذریعے تا کہ مادہ منویہ اُس میں داخل نہ ہو۔ اصول یہ ہے کہ خاوند کو اپنی بیوی کی رضا مندی کے بغیر جائے مخصوصہ سے باہر انزال کا حق حاصل نہیں اور نہ ہی عورت کو خاوند کی رضا مندی کے بغیر جائے مخصوصہ کا منہ بند کر دینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر خاوند کو غلط ماحول کی وجہ سے غیر طبعی (Abnormal) بچے کی پیدائش کا خوف دامنگیر ہو تو بیوی کی اجازت کے بغیر بھی وہ جائے مخصوصہ سے باہر اِنزال کر سکتا ہے۔''

''اگر ماں کی صحت کو خطرہ لاحق ہو تو مستند علمائے اسلام کے فتاویٰ کی رُو سے وہ اپنے حمل کا ابتدائی چار ماہ کے دوران جبکہ بچے میں ابھی روح نہیں پڑتی' اِسقاط کرا سکتی ہے۔'' (''اسلامک اکنامکس'' ص ص ۱۳۸'۱۳۹)

''عارضی طور پر منعِ حمل کے لئے دوا کے استعمال کی مذہب میں ممانعت نہیں ہے بالخصوص جبکہ عورت کو آرام اور طاقت بحال کرنے کے مناسب مواقع نہ ملیں اور بغیر توقف (اور بار بار کے) حمل اُسے کمزور و ناتواں کر دیں کیونکہ اسلام سہولت کا مذہب ہے نہ کہ مشکلات اور دشواریاں پیدا کرنے کا۔ لیکن مستقل اور حتمی طور پر منعِ حمل کے لئے ادویات کے استعمال کی مذہب میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔''

''برتھ کنٹرول پر ٹرکی کی مذہبی امورِ مشاورت کی کمیٹی کا فتویٰ: نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ بابرکت میں اگرچہ ''عزل'' کو برتھ کنٹرول کا ایک طریقہ سمجھا جاتا تھا لیکن بعض صحابہ کرام کے نزدیک یہ طریقہ مذموم تھا۔ حضرات علیؓ سعد بن ابی وقاصؓ زید بن ثابتؓ ابنِ عباسؓ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے کچھ فقہاء نے اسے جائز کہا ہے اور اِنہی حضرات کی پیروی میں بعد میں آنے والے تمام علماء نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔''

''ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اِس میں بیوی کی رضامندی بالعموم ایک لازمی شرط ہے' اور وقت کے حالات کے تحت بچوں کی پیدائش کو ناممکن بنا دیا گیا ہو جیسے ملک' دشمن سے برسرِ پیکار ہو' یا ملک افراتفری اور بدنظمی کا شکار ہو یا اسی قسم کے دیگر حالات سے گھرا ہوا ہو' تو اُس صورت میں اس شرط کا اطلاق نہ ہوگا۔'' (اسلامک اکنامکس'' صفحات ۱۴۰' ۱۴۱)

''خاندانی منصوبہ بندی'' پر اُردن کے مفتیِ اعظم شیخ عبداللہ القلقیلی کا فتویٰ: بسمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کثرتِ آبادی کے خوف نے ہر جگہ بے تحاشا مبالغائی رنگ کا روپ دھار لیا ہے اور ماہرینِ آبادی نے اسے آفت' تباہ کاری اور خوفناک نتائج کی بدشگونی سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اُن کی سوچ کے مطابق دنیا کو اس بڑھتی ہوئی قباحت اور سنگین بلائے جان سے محفوظ رکھنے کا عظیم طریقہ ''پیدائش کی حد بندی'' ہے۔ تاہم اُنہیں یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اِس طریقے کو اُس وقت تک نہیں اپناتے جب تک اس بارے میں مذہب کا کوئی واضح نقطۂ نظر اُن کے سامنے نہیں آ جاتا۔ اس لئے مسلمان اس مسئلہ پر با اعتمادِ الٰہی حکم کو تلاش کرتے ہیں۔''

''یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اسلام کا بے تعصب اور کشادہ دل قانون' فطرت اور انسانی حالات سے موافقت کر لیتا ہے اور اللہ فرماتا ہے: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ (سورۃ الروم: ۳۰) (یکسو ہو کر دینِ (حق) کی طرف اپنا رخ رکھو' اللہ کی بنائی ہوئی اُس فطرت کی پیروی کرو جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے' اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں)۔''

''نکاح اور شادی انسان کی موروثی اور فطری ضرورت ہے لیکن نوعِ انسانی کے تسلسل کے لئے شادی کا مقصد افزائشِ نسل ہے۔ قرآنی آیات میں اس کا حوالہ موجود ہے اور قرآن حکیم نے نکاح اور اِزدواج کو اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر نعمت و احسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (سورۃُ النَّحل: ۷۲) یعنی ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تمہیں نفیس چیزیں عطا کیں۔'' (۷۲ : ۱۶)۔ لہٰذا شادی ایک اسلامی مذہبی طریقہ ہے اور تولید اس کا مسرور کن' خوش کن اور مرغوب و مطلوب مقصد ہے۔ اسی وجہ سے ایک حدیثِ مبارکہ میں محبت کرنے والی' کثیر اولاد پیدا کرنے والی عورت سے شادی کرنے کو پسند کیا گیا ہے (حدیث کا حوالہ صفحہ ۱۳۳۷ پر موجود ہے)۔

''تاہم قانون ساز نے کثیرالاولاد پیدا کرنے والی عورت سے شادی کرنے کی ترغیب دی اور شادی کو تولید کا مقصدِ اوّلیں قرار دیا بشرطیکہ شادی کے اخراجات کے متحمل ہونے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے وسائل موجود ہوں تاکہ بچے خراب نہ ہو جائیں اور غیر معاشرتی طریقوں کی بھینٹ نہ چڑھ جائیں۔ مذہب اسلام کے اصول کے مطابق اگر ہونے والا خاوند ازدواجی زندگی کے اخراجات کا بار اٹھانے کا اہل نہیں تو اس سے شادی نہیں کرنی چاہئے۔اس بات کا حوالہ قرآن اور احادیثِ نبوی میں موجود ہے۔قرآن فرماتا ہے: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (سورۃ النُّور: ۳۳) (اور جن لوگوں کو نکاح کا مقدور نہیں' اُنہیں چاہئے کہ ضبط سے کام لیں یہاں تک کہ اللہ اُنہیں اپنے فضل سے غنی کر دے) (۲۴ : ۳۳)۔اور حدیثِ نبوی میں آیا کہ آپ نے فرمایا: ''نوجوانو! تم میں سے جو کوئی مالی استطاعت رکھتا ہے' اُسے شادی کر لینی چاہئے اور جس میں استطاعت نہیں تو اُسے روزے رکھنے چاہئیں کیونکہ روزہ شہوت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔''اس قرآنی آیت اور حدیثِ نبوی سے جو یقینی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ''تحدیدِ نسل'' قانونی حصار ہے کیونکہ افزائش کو بالکل روک دینا اُس کی حد بندی کی نسبت زیادہ خطرناک ہے۔

نوٹ: یہ اجازت ہرگز نہیں کہ وسائل کے نہ ہونے کی صورت میں وہ کسی ناجائز طریقہ پر شہوت رانی کرنے لگے جیسا کہ شدید بھوک کے موقع پر (بقدرِ ضرورت) حرام کھا لینے کی اجازت ہے۔شہوتِ جنسی کا ضبط بھوک پیاس کی طرح چنداں دشوار نہیں بلکہ نسبتاً بہت آسان ہے۔

''علاوہ ازیں 'عزل' کی طرح کچھ ایسی صحیح احادیث بھی ہیں جن میں تحدیدِ نسل کی اجازت ملتی ہے۔ایک آدمی نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا: ''میری ایک نوجوان بیوی ہے۔میں اُس کے حاملہ ہونے کو پسند نہیں کرتا' میں وہ چاہتا ہوں جو مرد چاہتے ہیں لیکن یہودی کہتے ہیں کہ عزل معمولی قسم کی طفل کُشی ہے۔''اس پر پیغمبر ﷺ نے فرمایا: ''یہودی جھوٹ بولتے ہیں' اگر اللہ تعالیٰ بچے کو پیدا کرنا چاہے تو تم اُسے اُس کے ارادے سے روک نہیں سکتے۔''

''مخولہ بالا صحیح احادیثِ نبوی میں ''عزل'' کی یقینی اجازت موجود ہے جو منعِ حمل کا یا کسی عذر کے بغیر بھی تحدیدِ نسل کا ایک طریقہ ہے۔جنین میں روح ڈالے جانے سے پہلے منعِ حمل یا اسقاطِ حمل کی ادویات کا استعمال اسی ذیل میں آتا ہے۔احناف کسی جائز عذر کے تحت عزل کی اجازت دیتے ہیں۔''

''فقہائے کرام یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک جنین (کچا بچہ) انسانی شکل اختیار نہیں کر لیتا تو اسقاطِ حمل کی دوا لینے کی اجازت ہے۔یہ غیر تشکیلی عرصہ 120 دن کا ہوتا ہے۔فقہاء کا خیال ہے کہ اس عرصہ کے دوران جنین یعنی کچا بچہ ابھی تک انسانی شکل میں نہیں آیا ہوتا۔ایک روایت کے مطابق سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اِسقاطِ حمل کو طفل کُشی نہیں سمجھتے تھے جب تک کہ جنین اپنے مقررہ وقت کی حد کو عبور نہ کر چکا ہو (یعنی وہ عَلَقَه نہ بن چکا ہو)۔

''امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خاوند کو بیوی کی رضامندی کے بغیر ''عزل'' نہیں کرنا چاہئے۔علاّمہ

زرقانی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ جنین میں روح پڑنے سے پہلے عزل کی اجازت یا ممانعت اِسقاطِ حمل کے مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے راہ نمائی کا کام دے سکتی ہے۔''

''اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ فقہ کے چاروں مکاتبِ فکر کے نزدیک ''عزل'' کی بطور مانعِ حمل کے اجازت ہے۔ علمائے دین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اِسقاطِ حمل کے لئے منعِ حمل کے طریقے اور ادویات استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ہم پُر اعتماد طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔'' ("Islamic Economics --- Theory and Practice" .... M. A. Mannan, pp. 141-144)

''برتھ کنٹرول پر ملیشیا کے مفتی السید یوسف بن علی الزّ واوی کا فتویٰ: بسم اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَبِہٖ نَسْتَعِیْنُ خاندانی منصوبہ بندی کی خاطر جمعیتوں اور تنظیموں کی تشکیل کاری کا مطالبہ مسلمان اسلامی قانون کے تحت کرتے ہیں۔ زمانہ حال اور ماضی کے مسلمانوں نے اس مسئلہ پر بڑی گہری غور وخوض کی ہے اور کسی یقینی نتیجہ پر پہنچے بغیر تمام مکاتبِ فکر نے حدیث اور فقہ کی شروح میں اس پر خاصا تبصرہ کیا ہے۔ صحابہ کرام کے عہدِ مبارک میں منعِ حمل کے طریقہ کو ''عزل'' کہا جاتا تھا (یعنی مرد کے مادہ منویہ کا عورت کے رِحم میں داخل نہ ہونا)۔ پیغمبر ﷺ سے اس عمل کے بارے میں اُن کی رائے معلوم کی گئی تو آپ نے یہ جواب دیا کہ ''بہتر ہے کہ تم ایسے کام نہ کرو۔ ہر وہ روح جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے' تا قیامت پیدا ہوکر رہے گی۔'' اس حدیث سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ پیغمبر علیہ السلام نے تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) سے روکا تو نہیں' تاہم آپ نے صحابہ کو اس بات کی نصیحت کی کہ وہ اُسے اپنی عادت نہ بنائیں۔''

''حفظانِ صحت کے اصولوں میں اسلامی تعلیمات میڈیکل سائنس کے ذرّہ بھر مخالف نہیں ہیں اور اس معاملہ میں تمام علمائے کرام متفق الرائے ہیں۔ خود قرآن مجید نے اکثر صحت اور جسمانی فلاح و بہبود سے متعلق حقائق کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ البَقَرة کی آیت ۲۳۳ سے معلوم ہوا کہ وہ مائیں جو اپنے بچوں کو دودھ پلانا چاہیں تو وہ دو سال تک اُنہیں دودھ پلائیں (اور میڈیکل سائنس سے ثابت ہے کہ ماں کے دودھ میں بچے کی ضرورت کی تمام غذائی قوّت موجود ہوتی ہے)۔ والد کے ذمّہ اپنے اہلِ خانہ کو بہتر اور موزوں طریقہ سے لباس وخوراک مہیا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے بلکہ ہر شخص کو اُس کی اہلیت کے مطابق ذمّہ دار بنایا گیا ہے۔ لہٰذا والدہ کو اپنے بچے کو نقصان نہیں پہنچانا چاہئے اور نہ ہی والد کو (اس بیان کا یہ مطلب ہے کہ اپنے بچے کو دودھ پلانے والی ماں اتنی جلد حاملہ نہ ہونے کا خیال رکھے کہ جس سے اُس کے شیر خوار بچے کو کسی قسم کا جسمانی نقصان پہنچے۔ اس بیان میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے خاندانی منصوبہ بندی کی یقیناً حوصلہ افزائی کی ہے)۔''

اَسماءبنتِ یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ اُنہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

لَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَکُمْ سِرًّا فَاِنَّ الْغِیْلَةَ یُدْرِکُ الْفَارِسَ فَیَعْوُدُ سِرُّہٗ مِنْ فَرَسِہٖ

''اپنے بچوں کو خفیہ طور پر قتل مت کرو کیونکہ غِیْلَة (اُس عورت سے ہم بستری کرنا جس کا بچہ ابھی اُس کا دودھ پی رہا ہو) جنگ میں ایک ایسے گھوڑ سوار کی طرح ہے جو گھوڑے سے گر کر کچلا جائے۔''

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جو ماں ایک بچے کو دودھ پلا رہی ہے' اُس دوران ماں کا حاملہ ہو جانا آنے والے بچے کی جسمانی کمزوری کا سبب بنے گا۔

''فقہائے اسلام نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) مکروہ فعل ہے کیونکہ اُن کے نزدیک بچے بہ حیثیتِ مجموعی سماج کا مشترک اثاثہ ہیں اور اُنہوں نے یہ نتیجہ حضرات ابوبکر' عمر فاروق اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے اقوال سے اخذ کیا ہے۔ تحدیدِ نسل کا نتیجہ اولاد کی کمی کی صورت میں نکلے گا۔''

''مختصر یہ کہ میرے نزدیک اس مسئلہ کے تین پہلو ہیں: (۱) اگر منعِ حمل صحت کی رُو سے ضروری ہے خواہ خاوند کی صحت سے متعلق ہو یا بیوی سے یا آنے والے بچے سے' تو اس کی مخالفت میں قطعاً کوئی مذہبی قوانین نہیں ہیں جیسا کہ اس قرآنی آیت میں بیان ہے:۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (البقرة: ۲۳۳)

''نہ کسی ماں کو اُس کے بچے کے باعث تکلیف پہنچائی جائے اور نہ کسی والد کو اُس کے بچہ کے باعث تکلیف پہنچائی جائے۔'' (۲۳۳ : ۲)

(۲) فقہائے کرام اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ جنین میں روح پڑنے سے پہلے (جس کی مدت چار ماہ ہے) آیا اسقاطِ حمل جائز ہے یا نہیں۔ لیکن وہ اس بارے میں باہم متفق الرائے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے بعد اِسقاط حرام اور ممنوع ہے۔ (۳) اُن وجوہ کے بغیر جنہیں اسلام تسلیم کرتا ہے' حمل کی مکمل بندش یا تعقیم (یعنی نسل کشی کے ناقابل بنانا Sterilization) کی بالکل ممانعت ہے اگرچہ اُس میں اپنی مرضی شامل ہو۔''

''ایسی تحدیدِ نسل (برتھ کنٹرول) جس میں حفظانِ صحت کی کوئی وجہ نہ ہو یا اُس کا مقصد عورت کے حسن و جمال اور جاذبیت و کشش کو باقی رکھنا ہو یا اُس کا مقصد عائلی ذمہ داریوں سے فرار ہو تو یہ متفقہ طور پر حرام اور ممنوع ہے اور مسلمان کو ایسے عمل سے گریز کرنا چاہئے۔ عائلی زندگی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی نعمتوں کا اظہار یوں کیا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ۝ (النحل: ۷۲)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تمہیں نفیس چیزیں عطا کیں' تو کیا پھر بھی یہ لوگ باطل پر ایمان رکھیں گے اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے رہیں گے!'' ☆ (۷۲ : ۱۶) [تشریح اگلے صفحہ کے زیریں حاشیہ پر ہے۔]

''مختصر یہ کہ اس مسئلہ میں مذہبی قوانین کا اطلاق میاں بیوی دونوں کی حیثیت پر منحصر ہے۔لہٰذا میری یہ پُرزور تجویز ہے کہ حکومتِ وقت ایسے افراد کی تنظیم کو منتخب کرے جو فی الواقع ذمہ دار ہوں' باضمیر ہوں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور اپنی جوابدہی کا خیال رکھتے ہوں اور یہ احساس بھی رکھتے ہوں کہ ایسی تنظیموں کا مقصد قوم کی فلاح و بہبود ہوتا ہے جسے ایسے سپوتوں کی سخت ضرورت ہے جو مستقبل کی (نازک) ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں۔ایماندار اور باکردار مَردوں اور عورتوں پر مشتمل ایسی تنظیم یقیناً داخلی نظم وضبط اور اسلام کے مقرر کردہ قوانین کے عین مطابق کام کرے گی۔'' (''اسلامک اکنامکس۔تھیوری اینڈ پریکٹس' از ایم اے منّان' صفحات ۱۴۴ تا ۱۴۷)

تحدیدِنسل (برتھ کنٹرول) کے ذرائع کا مطلوبہ نتائج دینا یقینی نہیں ہوتا: یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ بعض دفعہ طبّی گولیوں' انجیکشن' کیمیائی طریقوں' ربڑ کے جھلّی نما غلاف(Condom)' چھلّے(Loop) وغیرہ کا استعمال بھی تحدیدِنسل کا خاطر خواہ نتیجہ دینے میں ناکام رہ جاتا ہے۔مجامعت کے دوران بعض اوقات کنڈم پھٹ جاتا ہے۔چھلّے اور فمِ رِحم پر چڑھانے کی مانعِ حمل ٹوپی یا خول(Diaphragm) کا استعمال بھی بعض اوقات ناکام ہوجاتا ہے جس کے نتیجہ میں مادہ منویہ رِحم میں داخل ہوکر استقرارِحمل کا سبب بن جاتا ہے۔اللہ کے سچے رسول ﷺ نے بجا طور پر فرمادیا تھا:

لَوْ أَنَّ الْمَاءَ الَّذِیْ یَتَکَوَّنُ مِنْهُ الْوَلَدُ صُبَّ عَلٰی صَخْرَةٍ لَا َخْرَجَ اللّٰہُ مِنْهَا وَلَدًا وَّلَیَخْلُقَنَّ اللّٰہُ تَعَالٰی نَفْسًا هُوَ خَالِقُنَا (مسند احمد' مسند بزار' صحیح ابن خزیمہ' کشف الغمّہ ج ۲' ص ۷۸)

''اگر اُس قطرۂ آب کو جس سے بچہ کی تشکیل ہوتی ہے' ایک چٹان پر ڈالا جائے (تو اللہ تعالیٰ اگر چاہے) تو اُس چٹان سے بھی اُسی طرح بچہ پیدا فرمادے گا جس طرح اُس نے ہماری تخلیق کی۔''

سورہ ھُود کی آیت ۶ کے حوالہ کی رُو سے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو رزق پہنچانے کا ذمہ اپنے اوپر لے لیا ہے' اس لئے برتھ کنٹرول کا عمل اُس پر عدم ایمان کے مساوی ہے۔اب اس پر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ پھر وہ ملازمتوں اور تجارتوں کا سہارا کیوں لیتے ہیں اور وہ مستقبل کے لئے اپنی کمائی جوڑ جوڑ کر کیوں رکھتے ہیں؟ پس جب رزق کے وسائل واسباب کو اختیار کرنا رب تعالیٰ کی رزّاقیت پر عدم اعتماد نہیں ہے' اُسی طرح برتھ کنٹرول کے طریقوں کو اختیار کرنا بھی اُس پر عدم اعتماد وایمان نہیں ہے۔کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ برتھ کنٹرول قضا وقدر پر ایمان کے منافی ہے۔اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان مصیبت اور تکلیف میں اللہ سے دعائیں کیوں کرتا ہے جبکہ تقدیر ناگزیر اور ناقابلِ تبدیلی ہے؟ لہٰذا جو کچھ بھی مشیّتِ الٰہی میں ہونا ہے' ہوکر رہے گا خواہ ہم دعا کریں یا نہ کریں۔اسی طرح اگر کوئی بیمار لاعلاج ہے اور مسلسل بیمار رہنا ہی اُس کی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے تو کوئی بھی معالجاتی تدبیر (Therapeutic Device) اُس کے لئے کارگر اور مفید نہیں ہوگی۔ تو وہ پھر کیوں

☆ (گزشتہ صفحہ کا ذیلی نوٹ) گزشتہ صفحہ کی خط کشیدہ عبارت کا مطلب مؤلف کے نزدیک یہی ہوسکتا ہے کہ رب تعالیٰ بیویوں' بیٹوں اور پوتوں وغیرہ کا بطور نعمتِ الٰہی ذکر کرنے کے بعد تحدیدِنسل (برتھ کنٹرول) کے خلاف اپنی ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کررہے ہیں کہ وہ کیسے لوگ ہیں جو اِن نعمتوں کے پانے کے باوجود بھی تحدیدِنسل (برتھ کنٹرول) جیسی باطل چیز کو اپنا کر اسلام کے پکے دشمنوں کی اندھادُھند تقلید کرتے ہیں اور اس طرح اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی بے قدری کرتے ہیں۔

علاج معالجہ اور طبی مشورے کا سہارا لیتا ہے؟ ایسے موقعوں پر تو ایک ضدّی اور ہٹ دھرم شخص کو بھی یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اسباب کا اختیار کرنا بھی تو ''تقدیر'' ہی ہے۔ اسباب کو اگر یہ سمجھ کر اختیار کیا جائے کہ وہ مشیّتِ الٰہی یا تقدیرِ مبرَم (نہ ٹلنے والی تقدیر) کو بدل دیں گے تو یہ صریحًا کفر ہے اور اس لئے حرام ہے۔ اس کے برعکس اگر اسباب کو اس عقیدہ کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تخلیق اُن سے نتائج کے حصول کی خاطر کی ہے اور اسباب کے اختیار کرنے کے بعد کے حاصل کردہ نتیجے کا نام ''تقدیر'' ہے تو یہ عین ایمان ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کائناتی قوانین میں مداخلت کے لئے دعا نہیں کرتا بلکہ وہ تو دُعا یا اپنی بیماری کا علاج اس لئے کرتا ہے کہ اُسے وہ آرام وسکون اور صحت مل جائے جسے اللہ تعالیٰ نے اُس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ یہی صورت برتھ کنٹرول کی ہے جو الٰہی قوانین میں مداخلت نہیں بلکہ اُس راحت و آرام کا لانا ہے جو دو (۲) پیدائشوں کے درمیانی خلا کا نتیجہ ہوتی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدّر کر دیا ہے۔'' (شرح صحیح مسلم از علامہ غلام رسول سعیدی' جلد سوم' صفحات ۸۸۷تا۸۹۱)

خاندانی منصوبہ بندی کا جدید مادیّت پر مبنی نظریہ مشہور ومعروف ماہرِ اقتصادیات مالتھس (Malthus) کا اختراع کردہ ہے جو فی الحقیقت ملحدانہ رُجحانات پر مبنی ہے اور اس لئے اُس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا مرکزی نقطہ انسانی آبادی کی غیر معمولی افزائش کو ایک اچھی منصوبہ بندی کے تحت محدود کر دینا ہے تاکہ اقتصادی وسائل کی کمیابی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خود غرضانہ مقاصد پر مبنی اِس نظریہ کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنے آرام و آسائش کی قیمت پر دوسروں کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جبکہ انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آبادی کے ہوش رُبا اضافہ کے باوجود انسان نے ہر نئے دَور میں اپنی سابقہ نسل کی نسبت زیادہ آرام و آسائش اور خوشحالی کی زندگی گزاری ہے۔ مزید برآں یہودیوں اور عیسائیوں کو ہمیشہ اُمّتِ مسلمہ کے کثیر التعداد ہونے کا خوف رہا ہے اور اس ہمیشہ کے لٹکتے ہوئے خوف سے بچنے کے لئے اُنہوں نے مسلمانوں کے ''خیر خواہ'' ہونے کے بھیس میں اس نظریے کو گھڑ نکالا ہے۔ اگر مسلمان اُن کی پُرکشش چالوں سے مرعوب ہوتے ہوئے برتھ کنٹرول پر عامل ہوتا ہے' تو وہ بڑا گنہگار ہے۔ مندرجہ ذیل حوالہ جات اُن کی مسلمانوں کے خلاف شیطانی سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہیں :۔

(۱) ''اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی 1984 کی رپورٹ (بر صفحہ 61) میں مارشل لا حکومت سے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی کے دفاتر بند کر دے کیونکہ خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک مغربی طاقتوں کی عالم اسلام کے خلاف سازش ہے۔'' ("Islam and Current Issues" ... Rashid Ahmad Jullundhri, p. 133 footnote)

(۲) غیر مسلم ریاستیں اپنی آبادی میں اضافہ کے لئے ناجائز بچوں کی پیدائش تک کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں جبکہ مسلم ریاستیں جائز بچوں کی تعداد پر پابندی عائد کر دیتی ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو (۲) ہوں۔ درج ذیل معلومات اِس حقیقت کی حتمی گواہ ہیں :

(i) ''منیلا 19 فروری 1981 : کرسچین کیتھولک فرقہ کے لیڈر نے آج وسط فلپائن کے ایک شہر میں لاکھوں لوگوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چرچ عائلی اور شادی کے قانون میں تبدیلی نہیں کرے گا اور وہ تحدیدنسل (برتھ کنٹرول) اور اسقاطِ حمل کی مخالفت جاری رکھے گا۔'' (روزنامہ نوائے وقت لاہور مؤرخہ 20 فروری 1981)

(ii) ''اسرائیلی وزیرِ اعظم نے یہودی جوڑوں کو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی ہدایت کی ہے کیونکہ یہودی آبادی مسلسل کم ہو رہی ہے۔ اگر اسرائیلی ممالک کی شرح پیدائش اسی تناسب سے گھٹتی رہی تو ہمیں ایک بہت بڑے قومی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔'' (روزنامہ جنگ لاہور مورخہ 25 مئی 1986)

(iii) ''آبادی میں اضافہ کے لئے حکومتِ رومانیہ نے ایک فرمان جاری کیا ہے کہ 45 سال سے کم عمر کی ماؤں کو جن کے پانچ سے کم بچے ہیں' اسقاطِ حمل کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بے اولاد جوڑوں پر ٹیکس بڑھا دیا جائے گا اور زیادہ بچے پیدا کرنے والے گھرانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات فراہم کی جائیں گی۔'' (روزنامہ جنگ لاہور مؤرخہ 25 جون 1986)

(۳) اقوامِ مغرب لوگوں کو برتھ کنٹرول کے قائل کرنے کی سرتوڑ کوشش میں ہیں جبکہ آپ لوگ اُن قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ کی تشریحات و تاویلات میں پوری کوشش کر رہے ہیں جو مغربی نظریہ کے خلاف ہیں۔ لیکن آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ مُلکِ چین سات سوملین کی آبادی کے باوجود زندہ و توانا ہے اور اُس نے بہت مختصر سے عرصہ میں معاشی راقتصادی میدان میں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ وزیرِ اعظم چواین لائی ہی نے تو کہا تھا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنے ساتھ خوش آئندگی کا پیغام لاتا ہے۔ مغرب کے شوروغوغا میں آپ نے شیرخوار کا ایک منہ دیکھا اور پریشانی اور اضطراب میں یہ نہ جانتے ہوئے جھک گئے کہ اس کی خوراک کہاں سے آئے گی لیکن آپ نے اُس کے اُن دو ہاتھوں کی طرف دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے اسرائیل اپنی آبادی میں اضافہ کر رہا ہے۔ مغرب نے آپ کو بتایا کہ کثرتِ آبادی ترقی پذیر ملکوں کے لئے بری بات ہے اور اس وجہ سے آپ نے برتھ کنٹرول کا سہارا لے لیا۔ لیکن آپ نے یہ خیال نہیں کیا کہ ویتنام نے امریکہ جیسی سپر پاور کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں اور چین امریکہ کو ڈراؤنے خواب دکھا رہا ہے۔ امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ صرف برتھ کنٹرول کے حامی ملکوں کو امداد دے گا اور آپ نے یہ سمجھا کہ وہ آپ کا ہمدرد ہے اور اس بات کی تحقیق نہ کی کہ اسرائیل کی طرف سے برتھ کنٹرول کو مسترد کرنے کے باوجود امریکہ نے اس کی امداد جاری رکھی ہوئی ہے۔'' ("Islam and Modernism" ... Justice Mufti Muhammad Taqi Usmani, pp. 47, 48) Lahore 2001.

(۴) برطانیہ کی ماہرِ عمرانیات خاتون الزبتھ لیاگن نے برتھ کنٹرول سکیم کے پسِ پردہ مغرب کے بدعزائم کو اپنی کتاب بہ عنوان Family Planning میں بڑی وضاحت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے جس کا اردو ترجمہ حال ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد (پاکستان) نے شائع کیا ہے۔

(۵) ڈاکٹر رخسانہ جبین نے بھی بڑے افسوس کے ساتھ اپنی کتاب بہ عنوان Family Planning میں اِنہی جذبات کا اظہار کیا ہے جس کا حوالہ پروفیسر ریاض الرحمٰن قریشی نے اپنے مضمون میں دیا ہے۔

حرفِ آخر : خاندانی منصوبہ بندی کو مسلمانوں پر بطورِ قانون جبراً عائد کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس کے قانونی جواز پر تمام مکاتبِ فقہ متفق الرائے نہیں ہیں۔ شیخ ابنِ حزم اور دوسرے علماء ''عزل'' کو حرام سمجھتے ہیں جبکہ بعض فقہاء اس کی کراہت کے ساتھ اجازت دیتے ہیں۔ عزل کی بلا کراہت اجازت دینے والے فقہاء اس کی اجازت بیوی کی رضامندی کی شرط کے ساتھ دیتے ہیں۔ لہٰذا شریعت کی نگاہ میں ہر شخص پر قانوناً برتھ کنٹرول کا عائد کرنا درست نہیں۔ انفرادی طور پر بھی برتھ کنٹرول کو اختیار کرنا درج ذیل دو شرائط کے تحت درست نہیں ہے:

(۱) بھوک کے خوف سے یا رزق کی تنگی کے اندیشہ سے ؛

(۲) لڑکیوں کی پیدائش کے ڈر سے کیونکہ اُن کی شادی کے معاملہ میں والدین کو قسما قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ رُجحان زمانہ جاہلیت کے مشرکین کے مشابہ ہے اور اسلام نے اس کی زبردست مذمّت کی ہے۔

تاہم برتھ کنٹرول کی اجازت تو ہے لیکن وہ بھی انفرادی طور پر مندرجہ ذیل خاص حالات میں ہے:۔

(i) لونڈیوں کے ساتھ برتھ کنٹرول کرنا تاکہ آنے والی نسل غلامی کی لعنت سے محفوظ رہے۔ اگرچہ اُب اسلام میں غلامی کی بندش ہے لیکن چونکہ شریعتِ اسلامی ہمہ گیر اور آفاقی' جامع اور دائمی ہے اس لئے اگر غلامی کسی زمانے میں بھی رائج الوقت ہو جائے تو لونڈیوں سے برتھ کنٹرول کرنا درست ہوگا۔''

(ii) اگر لگاتار بچے جننے کے تسلسل میں عورت کی شدید بیماری کا اندیشہ ہو تو خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا درست اور قرینِ دانش ہے۔

(iii) اگر مسلسل بچے پیدا کرنا بچوں کی نگہداشت اور نشوونما میں رکاوٹ ہو تو گاہے گاہے برتھ کنٹرول کا سہارا لینا درست اور قرینِ عقل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے بہ یک وقت دو بچوں کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے بالخصوص جبکہ اگلی پیدائش نو یا دس ماہ بعد واقع ہونے والی ہو۔

(iv) حمل اور وضعِ حمل کے درمیانی عرصے میں بعض اوقات شوہر کی جنسی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں شوہر کے لئے بیوی سے لمبے عرصے تک دُور رہنے کے ذریعے برتھ کنٹرول پر عمل پیرائی بالکل درست بات ہوگی۔

(v) اگر شوہر اپنی بیوی کو از راہِ فرطِ محبت زمانہِ حمل کے بوجھ اور وضعِ حمل کی تکالیف سے بچانا چاہے تو برتھ کنٹرول پر عمل بالکل درست اور جائز ہوگا۔

(vi) بیوی کے حُسن و جمال اور نفاست و لطافت کو قائم رکھنے کے لئے خاوند کے لئے برتھ کنٹرول پر عمل کرنا درست ہے جیسا کہ امام غزالی (م ۵۰۵ ھ) نے ''احیاء علوم الدین'' کی جلد دوم صفحہ ۵۲ پر کہا ہے۔

(vii) اگر یہ اندیشہ ہو کہ بچوں کے اضافہ سے اقتصادی وسائل ایسے تنگ اور نا قابلِ برداشت ہو جائیں گے کہ عائلی زندگی پارہ پارہ ہو کے رہ جائے گی اور روٹی کمانے والا حرام ذرائع کی طرف مائل ہوگا تو برتھ کنٹرول پر عمل پیرائی کے ذریعے ایسے حالات سے بچنا قرینِ مصلحت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے آسانی چاہتا ہے' تنگی نہیں جیسا کہ سورۂ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ اور سورۂ المائدۃ کی آیت ۶ میں بیان ہوا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے قرینِ دانش سمجھتے ہوئے اس وجہ کو اختیار کیا ہے۔

(viii) کچھ مائیں عملِ جراحی کے ذریعے بچہ جنتی ہیں۔ وضعِ حمل کی تکالیف اور بعدہ' زندگی کے خطرہ سے بچانے کے لئے برتھ کنٹرول پر عملدرآمد صحیح اور جائز ہے۔

(ix) اوپر (viii) میں بیان کی گئی صورت میں جب رحم مزید عملِ جراحی کے قابل نہ رہے تو منعِ حمل کے ذرائع اختیار کرنا ضروری ہو جاتے ہیں تاکہ مزید افزائش کی کلی طور پر بندش ہو جائے۔

(x) اگر وضعِ حمل کی کوئی ماہر (Gynaecologist) پہلے ہی سے خبردار کرتی ہے کہ اگر عورت دوبارہ حاملہ ہوئی تو اُس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے تو اس صورت میں برتھ کنٹرول پر عمل کرنا لازمی ہوگا۔

عزل کے علاوہ برتھ کنٹرول کے مندرجہ ذیل طریقے بھی شریعتِ اسلامی میں جائز ہیں بشرطیکہ کوئی معقول اور جائز وجہ ہو :

طبی گولیاں' کیپسول' انجیکشن' کیمیائی طریقے مثلاً فوم جیلی اور کریم کا بیرونی استعمال' کنڈم' لوپ اور پردۂ شکم (Diaphragm) کا استعمال' انبوبی ٹانکا (Tubal Ligation) جس کا مطلب رِحم کی دونوں نالیوں کو آپس میں جوڑ دینا ہے جس کے بعد عورت مکمل طور پر بانجھ (Nulliparous) ہو جاتی ہے۔ یہ نہ صرف قانوناً جائز ہے بلکہ اوپر (viii) اور (ix) کے تحت بیان شدہ صورتوں میں اُن کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔

اسلام میں نس بندی (Vasectomy) یعنی مرد کو غیر بارآور کرنے کا عمل) بالکل حرام ہے جس کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیث ہماری راہ نما ہے:

أَرَادَ عُثْمَانُ بْنُ مَظْعُوْنَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنْ يَّتَبَتَّلَ فَنَهَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْجَازَلَه' ذٰلِكَ لَاخْتَصَيْنَا (صحیح مسلم : کتاب النکاح' باب : استحباب النکاح' ج ۲)

''عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے خصی ہونے کا ارادہ کیا تو نبی علیہ السلام نے اُنہیں اس سے روک دیا۔ (صحابہ کہتے ہیں کہ) اگر یہ اُن کے لئے جائز ہوتا تو ہم اپنے آپ کو ضرور خصی کرالیتے۔'' (صحیح مسلم)

(۴۵) تحریک آزادیِ نسواں (FEMINISM)

(یہ نظریہ کہ مرد اور عورت کی برابری کی بنیاد پر عورتوں کے حقوق مردوں کے حقوق کے برابر ہوں)

طلوعِ اسلام کے وقت تمام عالم میں عورت غلامی اور ذلّت کی زندگی بسر کر رہی تھی اور اُس سے ایسا سلوک کیا جاتا تھا جیسے وہ بے جان ہو۔ اُسے بہت ہی کم حقوق حاصل تھے اور وہ بھی مَردوں کے رحم و کرم پر۔ قرآن مجید عورت کو ماں، رفیقہِ حیات، بیٹی اور ہمشیرہ کی حیثیت سے اعلیٰ و ارفع مقام عطا کرتا ہے اور اِن تمام حالتوں میں اُسے مرد کی طرح تمام معاشرتی، قانونی، اقتصادی اور مذہبی حقوق حاصل ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کے منصبی کام میں مشابہت اور یگانگت ہے۔ مرد اور عورت دونوں بلا شک وشبہ بطورِ انسان کے اور بطورِ ایک دوسرے کے جیون ساتھی کے مساوی حیثیت اور مساوی حقوق کے حامل ہیں لیکن اپنے کارِ منصب میں اُن کا دائرہِ عمل مختلف نوعیت کا ہے جس کا تعیّن اُن کے فطرتی، جسمانی، نفسیاتی اور جذباتی مزاج کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک انتہائی اہم نکتہ یہ ہے کہ منصبی کام میں اُن کی عدمِ مشابہت اور عدمِ یگانگت کسی بھی طرح اُن میں سے کسی ایک کی کمتری یا برتری کی مظہر نہیں ہے۔ اُن کی فطری قابلیتوں و استعداد، اہلیت اور الٰہی عطیہ کے مطابق اُن میں تقسیم کار ہوئی ہے اور ہر ایک کا اپنا اپنا میدانِ عمل ہے جو الٰہی حکمت و دانش سے پُر ہے۔ مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے میدانِ عمل میں مختلف طریقوں سے سماج کی خدمت کرتے ہیں اور مادّی اور روحانی دونوں لحاظ سے معاشرہ کی کل دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ مرد اور عورت دونوں میں سے ہر ایک کے کام میں عدمِ مشابہت اور عدمِ مماثلت کو کسی بھی طرح اُن کے مقام کی عدمِ مساوات پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔''

''مغرب زدہ ذہن کے لوگ مہر، طلاق، کفالت اور تعدّدِ اَزواج سے متعلق اور اسی قسم کے دیگر اسلامی قوانین کو عورت کے لئے توہین اور ذلت آمیز سمجھتے ہیں۔ ایسی تنقید سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صرف مرد کی طرفداری اور حمایت کی گئی ہے اور یہ کہ عورت کو تو مرد کے فائدے اور استعمال کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ عورت کو مکمل انسان ہی نہیں سمجھتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر اسلام نے عورت کو مکمل انسانی ہستی تسلیم کیا ہوتا تو:

(الف) وہ تعدّدِ اَزواج (Polygamy) کو جائز نہ بناتا۔

(ب) اُس نے طلاق کا حق مرد کو نہ سونپا ہوتا۔

(ج) اُس نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر نہ کیا ہوتا۔

(د) اُس نے خاندان کی قیادت مرد کے سپرد نہ کی ہوتی۔

(ر) اُس نے عورت کو چند شوہری ہونے (Polyandry) کے حق سے محروم نہ کیا ہوتا۔

(ز) اُس نے عورت کے حقِ وراثت کو مرد کے حصّہ وراثت سے نصف نہ کیا ہوتا۔

(س) اُس نے مہر کے نام سے عورت کی قیمت نہ لگائی ہوتی۔

(ش) اُس نے اُسے مرد کی وظیفہ خوار نہ بنایا ہوتا جو اُسے اپنے پاس رکھنے پر مجبور ہے۔

''وہ کہتے ہیں کہ ان وجوہات کی بناء پر اسلام نے عورت کی تذلیل کی ہے اور اُسے زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسلام واقعی مساوات کا مذہب ہے لیکن اُس نے مرد اور عورت کے معاملہ میں مساوات کو ملحوظ نہیں رکھا۔''

اسلام کے خلاف کثیر الجہتی الزامات کا تجزیہ اور اُن کے جوابات

(الف) تعدّدِ ازواج (Polygamy): اسلام پر ایسے غیر معقول الزامات لگانے میں یہ کوتاہ نظر نقاد اس بات پر نظر کرنا کیوں بھول جاتے ہیں کہ اُن ممالک کے لوگ جہاں تعدّدِ ازواج کے قانون کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا، جنسی لحاظ سے ایک بیوی پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ وہ عارضی طور پر یا مستقل طور پر ناجائز' خارج از ازدواج' آزادانہ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ جرمنی کے گرجا گھروں کے اراکین کے ایک اجتماع میں تقریر کے دوران آئزک ٹیلر (Isaac Teeler) نے اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''یہ سچ ہے کہ بہ ظاہر عیسائی لوگ ایک سے زیادہ شادی نہیں کرتے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیسے مخفی طور پر ناجائز اور خارج از ازدواج تعلّقات جیسے گھناؤنے جرم میں ملوّث ہیں۔'' (Encyclopaedia of Seerah, Vol. V, p. 157)

علاوہ ازیں انگلستان جیسے عیسائی معاشروں میں ہم جنسیت (Homosexuality) جیسا شرمناک فعل عام ہے اگرچہ انگلستان میں دوسرے مغربی ممالک کی نسبت اس فعل کو زیادہ شرمناک سمجھا جاتا ہے۔ اس گھناؤنے گناہ کا نتیجہ اکثر خودکشی اور قتل میں نکلتا ہے۔ یہ بات فی الحقیقت بڑی ہی تعجب خیز ہے کہ اُن ممالک میں جہاں داشتہ رکھنے (Concubinage) کی قانوناً ممانعت نہیں ہے' غیر فطری جنسی عمل کی حکمرانی ہے۔ پھر اس سے زیادہ وحشت خیز یہ حقیقت ہے کہ اِن ممالک میں ایسے روز افزوں اَخلاقی بگاڑ (Corruption) اور جنسی بے راہروی کے باوجود وہ ابھی تک تعدّدِ ازواج سے متعلق قنوطیت کا شکار ہیں۔ یہ تعدّدِ ازواج ہی تو ہے جس سے اَخلاقی بگاڑ اور بدکاری کا دروازہ بند ہوتا ہے۔'' ("Status of Women in Islam" published by the Islamic Propagation Organization, Tehran, 1984.1405, pp. 7-10)

تعدّدِ ازواج مسلم معاشرہ کے عائلی نظام کے کواڑ کا ایک حفاظتی پَٹ ہے۔۔ وہ بے لگام سندِ اجراء (لائسنس) نہیں بلکہ اِتلاف سے تحفظ کی جھاڑ بندی (حفاظت)' حالات پر مبنی مشروط اجازت نامہ اور معاشرتی برائیوں کے خلاف تحفظ کا پروانہ ہے: تعدّدِ ازواج مسلم معاشرے کا جزوِ لازم نہیں ہے لیکن تعدّدِ ازواج کی اجازت دینے پر مغرب نے اسلام کو شدید اور غیر منصفانہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ اسلام کو حساسیت اور جنسیت زدہ مذہب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسلام کے سادہ' حقیقت پسند اور

۱۳۵۹ (تحریکِ آزادیٔ نسواں ـ ـ ـFeminism)

آسودہ ذرائع کی مذمّت کرنے میں یہ حملہ آور اس بات کو سمجھنا کیوں بھول جاتے ہیں کہ اسلام ہی تو وہ واحد مذہب ہے جس نے تعدّدِ ازدواج پر پابندی لگائی ہے اور اس کے چاروں طرف ایسی شرائط کی باڑ لگا دی ہے جن کا پورا کرنا ہر اُس شخص کے لئے مشکل ہے جو خانگی ذمہ داری کا بوجھ غیر سنجیدگی سے اٹھاتا ہے۔ قرآن مجید اس کی اجازت صرف اُس وقت دیتا ہے جب آدمی ایک سے زیادہ بیویوں کو مساویانہ انصاف دے اور اس کے پہلو بہ پہلو وہ یہ بھی تنبیہ کرتا ہے کہ آدمی کے لئے ہر لحاظ سے ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ فرمایا :

(۱) فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً (اَلنِّساء : ۳)

''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔'' (۳ : ۴)

(۲) وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡحَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ (اَلنِّساء : ۱۲۹)

''اور تم سے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم بیویوں کے درمیان (پورا پورا) عدل کرو خواہ تم اس کی (کیسی ہی) خواہش رکھو، تو تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھلک جاؤ کہ اُسے لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔''

آیاتِ بالا میں پنہاں مقصد اپنی فطرت میں نہ صرف اَخلاقی اقدار پر مبنی ہے بلکہ دراصل وہ اجازتی شِق (Permissive Clause) کو منسوخ یا مسترد کرنے کا کام دے رہا ہے۔ مزید وضاحت کے ساتھ اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص تمام بیویوں سے انصاف اور مساوی سلوک نہیں کر سکتا تو وہ ایک سے زیادہ بیوی نہیں رکھ سکتا۔ شرطیہ شِق کا اجازتی شِق کے ساتھ اضافہ ہونے سے الٰہی حکم کی تعمیل فی الواقع واجب ہو جاتی ہے اور اس کے تقاضوں کی عدمِ تعمیل میں آدمی اسلامی قانون سے انحراف کا موردِ الزام ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا قانون کو بذاتِ خود ہر لحاظ سے کثیر التعداد بیویوں کا مانع سمجھنا چاہئے۔

بدقسمتی سے شرطیہ حصّے کو نظر انداز کر دینے سے اُس کی اجازتی شِق کو ہر زمانے میں مسلم طبقۂ رؤساء نے اکثر غلط طور پر استعمال کیا ہے اور اس کا استحصال کیا ہے اور اس استحصالی عمل نے مغربی مبلّغین کی جانب سے اسلام کے خلاف نہ رُکنے والی دل خراش تنقید کی یلغار کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ لہٰذا ایسے مسلمانوں کی کوتاہیوں کو مذہب اسلام کی طرف منسوب کرنا ایسے ہی نامناسب اور ناروا ہے جیسے مغرب میں عام پھیلے ہوئے اخلاقی بگاڑ کو عیسائیت کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ اگر قانون شکنی میں قانون کے ڈھیلے پن اور نرمی سے چشم پوشی کی جاتی ہے تو قانون کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔

یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ تعدّدِ ازدواج کے وجود کا انحصار معاشرہ کے حالات پر ہے جو اس پر عملدرآمد کو لازم بنا دیتے ہیں تاکہ عورت غربت اور فاقہ کشی سے محفوظ رہے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور کوئی بھی شخص اس سے آنکھیں بند کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مغرب کے تہذیبی مراکز میں جس خوفناک بداَخلاقی کا راج ہے، وہ غربت اور فاقہ کشی کا نتیجہ ہے۔

۱۳۶۰ (تحریکِ آزادیِ نسواں ---Feminism)

نکاح اور شادی محض رومانوی محبت کا معاملہ ہی نہیں' یہ بنیادی طور پر حیاتیاتی ہے جو اقتصادی پہلو کو بھی ناگزیر طور پر شامل ہے۔ ایسے معاشرہ میں جو مسلسل جنگوں کی وجہ سے افرادی قوت سے عاری ہو چکا ہو' عورتوں کی اضافی کثرتِ تعداد ہو گی جن کی حفاظت اور امداد بہر صورت لازمی ہو گی۔

مغرب کے سماج نے تعدّد ازدواج سے کنارہ کشی کرتے ہوئے صنفِ نازک کو مساوات اور انصاف دینے کا ذریعہ بنانے کے لئے یک زوجیت (Monogamy) کو اپنایا ہے لیکن وہ ناجائز بچوں اور کنواری ماؤں کی شکل میں اس کے منطقی انجام کو روکنے میں ناکام رہا ہے۔ اہلِ مغرب میں آئے دن کے واقع ہونے والے معاشرتی اور اخلاقی بے راہروی کے واقعات اُن کی خود وضعی یک زوجیت کے نظریے کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ درحقیقت یک زوجیت کے نظریے نے اُنہیں ان قباحتوں کی طرف دھکیل دیا ہے: (۱) اخلاقی دیوالیہ پن اور معاشرتی زوال پذیری۔ (۲) غیر مطلقہ شکستہ خاندان اور (۳) کنواری ماؤں کی ہمیشہ بڑھتی ہوئی تعداد۔

اس کے برعکس تعدّدِ ازدواج (1) اُن بچوں اور عورتوں کو توجہ اور پناہ مہیا کرتا ہے جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ (2) یہ مطلقہ عورتوں اور بیواؤں کی معاشرتی نوآبادکاری کی عملداری مہیا کرتا ہے۔ (3) یہ عورتوں کو طلاق حاصل کرنے یعنی خلع کا حق عطا کرتا ہے۔ (4) یہ عمل کی آزادی (صوابدید) ہے نہ کہ فریضہ کیونکہ نکاح سے پہلے عورت سے اُس کی رضامندی بہرحال معلوم کی جاتی ہے۔

یہ بات واقعی افسوس ناک ہے کہ عیسائی مصنّفین اسلام کو حبّا سیت اور جنس زدہ ہونے کا مذہب ہونے کا اس وجہ سے الزام دیتے ہیں کہ اس نے تعدّدِ ازدواج کی اجازت دی ہے۔ وہ اس حقیقت سے کیوں منہ پھیر لیتے ہیں کہ اُن کے اپنے مذہب نے تعدّدِ ازدواج پر کھلے طور سے کبھی پابندی نہیں لگائی۔ اگرچہ عہد نامہ جدید (انجیل) یک زوجیت کا حامی ہے لیکن اُس نے اُسقف (پادری ربشپ) یا شمّاس (ڈیکن) کے علاوہ تعدّدِ ازدواج کی پابندی ہرگز نہیں لگائی۔ ابتدائی صدیوں میں چرچ کی کسی مجلس نے تعدّدِ ازدواج کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی اُن ممالک میں جہاں تعدّدِ ازدواج کا رواج تھا' بادشاہوں نے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ علاوہ ازیں عہد نامہ عتیق (تورات) کے تمام پیغمبروں نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ تعدّدِ ازواج روحانیت کے اعلیٰ معیار تک پہنچنے کے خلاف نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِن معاملات پر مغرب کی سوچ آج انتہائی طور پر بگڑ گئی ہے' یہاں تک کہ مغرب میں تمام اقدار جنس کے گرد گھومتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ تمام شعبہ ہائے حیات میں مَردوں اور عورتوں کی گہری مشغولیت بس جنس ہی میں رہ گئی ہے۔ اس ضمن میں اگر اسلام اور مغرب کے اَخلاقی معیاروں کا باہم موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پاکیزگی کردار پر زور دیتا ہے اور اَخلاقی اور روحانی اقدار کی پشت پناہی کرتا ہے جبکہ مغرب برائے نام یک زوجیت کو اور بے لگام ہرجائی پن کو ترجیح دیتا ہے۔

مسلم معاشرہ کے عائلی نظام میں تعدّدِ ازدواج کے جواز اور اس کی اشد ضرورت پر عمومی استدلال کے بعد

۱۳۶۱ (تحریکِ آزادیِ نسواں ۔۔۔Feminism)

ہم یہاں چند مشہور اُن مصنفین کا حوالہ دیتے ہیں جنہوں نے تمام صورتِ حال کا مطالعہ کرنے کے بعد مسلم معاشرہ کو پاکیزہ، خالص اور بے آمیزش خطوط پر چلانے کے لئے تعددِ ازواج کی حمایت اور توثیق کی ہے:۔

(۱) ''اسلام نے قانونِ ازدواج میں دُوررس اصلاحات کیں۔ جاہلی عربوں میں شادی کی مختلف مروّج شکلوں میں سے اسلام نے اُن سب شکلوں پر بندش لگادی جو اَخلاقی لحاظ سے قابلِ اعتراض تھیں اور بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کردیا۔ قرآن مجید کو اخلاقی توضیحات کے ساتھ یہ بتانا تھا کہ اگر آدمی بیویوں کے درمیان عدل قائم نہیں کر سکتا تو اُسے صرف ایک ہی شادی کرنی چاہئے۔ قرآن مجید حقوقِ نسواں سے متعلق خصوصی قانون سازی کے ذریعے عورتوں کی حالت کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک عمومی اصول دیا ہے کہ مَردوں اور عورتوں کے حقوق کو باہم متوافق اور ہم مقدار ہونا چاہئے ہاں البتہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ'' (اور مَردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے) کہہ کر وہ جاہلیت کے اِس مفروضہ کی تردید کر رہا ہے کہ عورت بے حقّی ہے، وہ بھی مَردوں کی طرح اپنے حقوق رکھتی ہے لیکن دونوں جنسوں میں مساواتِ مطلق و مساواتِ کامل نہیں بلکہ مرد کو عورت پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔''
(انسائیکلو پیڈیا بریٹیریکا، جلد۱۲، صفحہ ۶۶۹)

(۲) ''اپنی اُمّت کے لئے بطور قانون ساز اور بطور محسنِ انسانیت بالعموم، محمد ﷺ کا منصبی کام (مشن) اُن تمام جمع شدہ برائیوں کا بااثر علاج کرنا تھا۔ ہم زمانی شادیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی حد بندی کرنے، بیویوں کو اُن کے شوہروں کے مقابل حقوق و مراعات دینے، تمام بیویوں کو مساوی درجہ دینے اور اُنہیں سماج کے عیاش افراد کی دیدہ و دانستہ من موجی کے رحم و کرم پر بے یار و مددگار چھوڑ دینے کے خلاف تحفظ دینے کے ذریعے محمد ﷺ نے برائی کی جڑ پر ضربِ کاری لگائی۔'' ("Islamic Laws" p. 225)

(۳) ''یہ حقیقت ذہن نشین ہونی چاہئے کہ تعددِ ازواج کا وجود حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ معاشرہ کے کچھ اوقات اور کچھ حالات عورتوں کو فاقہ کشی اور مکمل بے چارگی اور غربت سے بچانے کے لئے اس کی عملداری کو لازم کر دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے ہم اپنی آنکھیں بند کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' (ایضاً ص ۲۲۶)

(۴) ''جب ہم ہزاروں آفت کی ماری عورتوں کو رات کے اوقات میں مغربی شہروں کی گلیوں میں اکٹھا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں، تو ہمیں یہ یقیناً احساس ہونا چاہئے کہ مغرب کو اسلام پر تعددِ ازواج کا الزام دینا مناسب نہیں۔ عورت کے لئے محمد ﷺ کے نظریہ تعددِ ازواج کے تحت زندگی گزارنا اور صرف ایک مرد سے منسلک رہنا زیادہ بہتر اور عزت کی بات ہے کہ اس کے ہاتھوں میں ایک جائز طریق کا بچہ ہو اور معاشرہ میں اسے عزت کا مقام حاصل ہو، بہ نسبت اس کے کہ فریب کاری سے اُس سے جنسی لذت حاصل کی جائے، اُسے سماج کی گلیوں میں بے یار و مددگار پھینک دیا جائے، اس وجہ سے کہ اُس نے قانون کی حد سے باہر ایک ناجائز بچے کو جنم دیا ہے، جس کی کوئی پناہ گاہ نہیں اور جس کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ ہر رات کسی بھی راہ گزر کے ہتھے چڑھ جانے والی، ماں بننے کی صلاحیت سے محروم اور سب کی نظروں میں قابلِ نفرت ہستی ہے۔'' (مسز اینی بسانت کی تقریر سے ایک اقتباس)

(۵) ''مغرب کے سماجی مفکرین نے عورتوں کو مساوات اور انصاف فراہم کرنے لئے یک زوجیت کو اُس مقصد کے حصول کے لئے اپنایا ہے۔لیکن یہ نظریہ معاشرے کو اخلاقی زوال، مطلقہ شکستہ خاندانوں اور کنواری ماؤں کی ہمیشہ ترقی پذیر لاتعداد کثرت کی طرف لے گیا ہے۔اس کے برعکس تعدّدِ ازواج بے یارومددگار عورتوں اور بچوں کو پناہ اور نگہداشت مہیا کرتی ہے۔اسلامی معاشرے میں تعدّدِ ازواج اِکراہ و جبر سے خالی ایک صوابدیدی اختیار ہے۔لہٰذا اس نظریہ نے بیواؤں اور طلاقنوں کو معاشرتی نو آبادکاری مہیا کی ہے۔مغرب کا معاشرہ تعدّدِ ازواج سے گریز کرتا ہے لیکن وہ کنواری ماؤں اور ناجائز بچوں کی شکل میں اس کے منطقی نتائج پر بند باندھنے کی کوئی تجویز پیش نہیں کرتا۔'' (ایضاً)

(۶) ''اس بات کا مشاہدہ کرنا بھی دلچسپ ہے کہ اسلام نے دوسرے نظریات کے برعکس تعدّدِ ازواج کی منسوخی کی راہ کھولی ہے جس پر مشرق میں قدیم زمانے سے بغیر کسی روک ٹوک کے عمل ہوتا آیا ہے اور اس حقیقت کے ثبوت میں خود بائبل میں بکثرت شواہد موجود ہیں۔قرآن نے بیویوں کی تعداد کو کم کر کے اُسے چار تک محدود کر دیا جبکہ وہ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک سے زیادہ شادی نہ کرنے کی تاکیدی نصیحت کرتا ہے۔عورتوں کو اُن کے خاوندوں کے آمرانہ رویّہ سے محفوظ رکھنے کے لئے قرآن مجید میں کئی قوانین وضوابط موجود ہیں۔اور وہ ضوابط بھی موجود ہیں جو شوہر کے اُن نام نہاد ''وسیع'' اختیارات کی حدبندی کرتے ہیں جن کے غلط استعمال سے وہ عورت کے حقوق پامال کرتا رہا۔''

("Wisdom of the Qur'an" ... Mahmud Muhtar Katircioglu pp. xx, xxi)

(۷) ''جنسِ عورت کے لئے محمد ﷺ کے نظام نے یقیناً بہت کچھ اثر پذیری کی اور اس مقام پر جذبات کی آواز کو خاموش کرا دینا اور آپ کے قوانین وضوابط کو اس طور لینا بہتر ہے کہ وہ ایک خالی از امید مسئلہ سے نمٹنے کی کوشش ہے۔۔۔تعدّدِ ازواج بذاتِ خود ایک مسئلے کو حل کرنے کی کوشش ہے جس کے حل کے لئے ہندو جرمن اقوام نے عصمت فروشی تجویز کی۔مؤخر الذکر نظام (یعنی عصمت فروشی) میں نسوانی آبادی کے ایک حصّہ کی کلی طور پر تذلیل ہوتی ہے جبکہ اول الذکر نظام (یعنی تعدّدِ ازواج) میں تمام کی تمام نسوانی آبادی کے عزت واحترام میں جزوی طور پر فرق آتا ہے۔اگر محمد ﷺ نے پردہ اور حجاب کو رائج کر کے آزادیِ نسواں کو محدود کر دیا تو آپ نے بلاشک وشبہ عورت کو قانونی طور پر حقوقِ وراثت اور حقوقِ ملکیت بھی تو دلوائے جن کا حصول قدیم نظام میں غیر یقینی تھا۔''

("Muhammad and the Rise of Islam"... D. S. Margoliouth, p. 460)

(۸) ''انسان بنیادی طور پر کثیر الازواج رُجحان کا مالک ہے اور تہذیب کی ترقی اس اندرونی رجحان کو مزید پروان چڑھاتی ہے۔'' ("History of Prostitution" ... G.R.Scott, p. 21)

(۹) ''مل جل کر اجتماع اور معاشرہ میں رہنے کی زندگی تعدّدِ ازواج کی طرفداری میں ہے۔۔۔۔انتہائی تہذیب یافتہ قوموں کی ابتدا تعدّدِ ازواج سے ہوئی ہوگی اور فی الحقیقت ہر جگہ پر اور ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے۔مختلف تہذیب یافتہ معاشروں میں خواہ وہ اب موجود ہیں یا نہیں، شادی کا آغاز تعدّدِ ازواج سے ہوا ہے۔اس قانون میں چند ایک مستثنیات ہیں۔'' ("Evolution of Marriage"... M. Letourneau, pp. 122, 134)

(۱۰) ''عورت فطری طور پر یک زوجیتی ہے جبکہ مرد میں تعدّدِ زوجیت کے عناصر ہیں۔'' ("Conduct and Its Disorders Biologically Considered" ... Dr. Mercier, pp. 292, 293)

(۱۱) ''تعدّدِ ازواج مستحکم بنیادوں پر قائم ایک ادارہ معلوم ہوتا ہے اور اس کی تاریخ زمانہ قدیم سے لے کر آج کے جدید دَور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس نظریہ نے واقعی قانونِ نکاح میں نظم و ضبط پیدا کیا ہے اور اُس کے استعمال پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔'' (Jewish Encyclopedia, Vol. X, p. 120)

(۱۲) ''بائبل اور تالمودی زمانہ میں تعدّدِ ازواج ایک تسلیم شدہ ادارہ تھا۔'' (ایضاً جلد ۳، ص ۲۱۰)

(۱۳) ''بائبل کے زمانہ میں قدیم یہودیوں میں تعدّدِ ازواج عام تھا۔ موسوی قانون میں اس کی اجازت تھی اور کچھ حالات میں اس پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ عہد نامہ جدید (انجیل) میں سوائے پادریوں (بشپ) کے اس کی کہیں بھی ممانعت نہیں ہے۔'' (Encyclopaedia Britannica, Vol. XXII, p. 24)

(۱۴) ''جب پہلی بیوی بے اولاد ثابت ہوتی تو کم از کم تعدّدِ ازواج کو ایک ضرورت سمجھا جاتا تھا۔'' (Cheyne and Black's Encyclopaedia Biblica --- London)

(۱۵) ''ویدی ہندوؤں میں تعدّدِ ازواج پر عملداری کے کافی ثبوت ہیں اور رگ وید اور دوسرے متنوں میں اس کے براہِ راست حوالہ جات موجود ہیں اگر چہ یک زوجیت کو بھی حسبِ معمول تسلیم کیا گیا ہے۔ رزمیہ دَور کے برہمنوں اور ہیروز کو اکثر کئی بیویاں کئے ہوئے دکھایا گیا ہے۔'' (Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. 8, p. 452)

(۱۶) ''کثیر الازدواج ہونا جنسی مسئلہ کی بجائے اکثر عزت و وقار یا اقتصادیات کا مسئلہ ہوتا ہے اور جبکہ مرد اور عورت کے میدانِ عمل میں فرق ہے تاہم اکثر اوقات عورت خود اپنے خاوند کو دوسری شادی کرنے کی ترغیب دیتی ہے تاکہ اس سے خاندان کی عزت بڑھے اور شوہر کو کھانا دینے کی زحمت سے اُسے آرام ملے۔'' (Hammerton's Encyclopedia of Modern Knowledge, Vol. 5, p. 2340)

(۱۷) ''یہ حقیقت کہ تعدّدِ ازواج پر عمل ہوتا رہا ہے' بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ مرد اور عورت کی دونوں جنسیں یکساں تناسب کے ساتھ موجود نہیں۔ اگر دنیا میں مردوں اور عورتوں کی تعداد باہم برابر بھی ہو تو یک زوجیت کی شادی کا نفاذ منطقی شق کے طور پر ہر فرد کو مزید شادی کرنے پر مجبور کر دے گا۔ صرف اسی نقطے پر بغیر کسی اور دلیل کی مدد کے' یک زوجیت بطور عالمی نظام کے قابلِ مذمّت ہے۔'' ("The Case for Polygamy" ... Macfarlane, p. 79)

(۱۸) ’’تا حیات یک زوجیت کج روی ہے اور ہماری نسل کے لئے یہ مضر ثابت ہوگی۔ اگر اس نظریہ کو کبھی فی الواقع رائج کر دیا جائے۔۔۔ اور خوش قسمتی سے ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔ تو نسل زوال پذیر ہو جائے گی۔ یک زوجیت کا نظریہ تمام فطری حقائق سے متصادم ہے۔‘‘
(An Extract from the Essay "Knowledge and the Spirit of Motherhood" by Earnest Bergman --- a German Professor of Leipzig and quoted in the "Hindu", Madras of 5th November, 1939)

(۱۹) ’’تعدّدِ ازواج کی وجہ سے مسلمان ممالک عادی آورگی سے بچے ہوئے ہیں جو عیسائی دنیا کے لئے اس سے زیادہ قابلِ مذمّت ہے جتنی تعدّدِ ازواج اسلام کے لئے قابلِ مذمت سمجھ لی گئی ہے۔ مسلم دنیا کے شدید قسم کے باضابطہ تعدّدِ ازواج کا نظام ہرجائی چند شوہری کی نسبت جو عیسائی آبادی کے لئے لعنت ہے اور جس سے اسلام قطعاً واقف نہیں ہے، عورتوں کے لئے کم ذلت کا باعث اور مردوں کے لئے کم ضرر کا باعث ہے۔ چند شوہری والے انگریز کو تعدّدِ ازواج کے مسلمان پر پتھر پھینکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اسلام نے دنیا کو عیسائیت کی نسبت زیادہ تہذیب سکھائی ہے۔‘‘ (مسیحی کلیسا کے عبادت گزار عملے کے فرد یعنی کلرجی مین Rev. Canon Isaac Taylor کی تقریر سے اقتباس جو اُنہوں نے انگلستان میں منعقدہ چرچ کانگریس میں کی: بحوالہ تفسیر ماجدی (انگریزی) صفحہ 42-A نوٹ:274)

(۲۰) ’’عیسائی دنیا کو بلندیٔ اخلاق دینے کے لئے اسلامی ضابطۂ اخلاق کا متعارف کرانا ضروری ہے جو لوگوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی ترقی کی طرف برابر کی توجہ دیتا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ عیسائی یورپ اخلاقی ضابطے کی قیمت پر ذہنی پہلو کی اصلاح کرتا ہے۔ تعدّدِ ازواج کو اسلام میں لازمی چیز سمجھنا ایک ناقابلِ معافی غلطی ہے۔ جیسا کہ بھوپال (انڈیا) کی حکمران نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ تعدّدِ ازواج کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو یہ (بہت سی برائیوں کا) علاج ہے۔ اس کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی ہیں۔ اسلام نقصانات کے خلاف تحفظ دیتا ہے اور فوائد پر کچھ سخت گیرانہ حدود و قیود عائد کرتا ہے۔ انسانی ضروریات اور ہنگامی صورتِ حال کا علم دنیا کو روشن خیالی دے گا اور اُسے تعدّدِ ازواج جیسی ضرورت کو محسوس کرنے کے قابل بنائے گا جس کی اسلام نے حدود و قیود کے ساتھ اس کے شاذ و نادر استعمال کی اجازت دی ہے۔‘‘ ("Review of Religions" ... Qazi Abdul Haque)

(۲۱) ’’بہت سے پڑھے لکھے لوگ اس ناشائستہ اور گھٹیا غلطی کا شکار ہو گئے ہیں کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو لامحدود کثیر الازواج کی اجازت دے رکھی ہے۔‘‘ ("The Koran" ... George Sale, p. 103)

(۲۲) ’’تعدّد ازواج نے فرد کے عمل کی آزادی کے نظریہ (Individualism) کی ترقی کی وجہ سے کچھ برائیوں کا علاج کیا، اضافی عورتوں کی باوقار شادی کا اہتمام کیا، عورت پر اُن کے سرپرستوں کی جانب سے ظلم و تشدد کو روکا اور شادی سے باہر کے ناجائز تعلقات کی اکساہٹ (ترغیب) کو کم کیا جو عرب کی نسوانی معاشرے میں عام تھی۔ اب تک کی گئی کچھ عملداریوں کے مدِّ نظر اس اصلاح کو سماجی تنظیم میں ایک اہم پیش رفت سمجھنا چاہئے۔‘‘ ("Muhammad at Madina" ... Montgomery Watt, p. 277)

مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوا کہ اسلام نے تعدّدِ ازواج کو بالکل منسوخ نہیں کیا بلکہ اسلام نے اس پر کچھ حدود و قیود عائد کیں اور تمام بیویوں کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ سلوک کرنے کی تاکید کی۔ اگر آدمی کو اس بات کا خوف ہے کہ وہ وسائلِ خوراک بہم پہنچانے اور رویّہ میں انصاف نہ کر سکے گا تو اُسے ایک زوجیت پر قناعت کرنی چاہیئے جیسا کہ سورۂ النِّساء کی آیت ۳ اور ۱۲۹ میں بیان ہوا اور جن کا حوالہ صفحہ ۱۳۵۹ پر دیا جا چکا ہے۔

(ب) <u>حقِ طلاق مرد کو کیوں سونپا گیا؟</u> خاندان کی تنظیم کا تحفظ بالخصوص اسلام میں انتہائی اہم ہے۔ عورت قدرتی طور پر زیادہ جذباتی ہے اور جلد مغلوب الغضب ہو جاتی ہے اس لئے اگر حقِ طلاق اُسے تفویض کیا جاتا تو وہ اس کا غلط استعمال کرتی۔ معمولی سبب سے زخم خوردہ ہونے کے باعث جذباتیت کے ہاتھوں وہ اس اختیار کے غلط استعمال سے خانگی تباہی کا موجب بن سکتی ہے' اس لئے حقِ طلاق اُسے نہیں سونپا گیا۔

''یورپ اور امریکہ کے معاشروں میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح اس حقیقت سے آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ شماریات کی رُو سے امریکہ میں پانچ میں سے ایک شادی طلاق پر منتج ہوتی ہے اور طلاق کی اَسّی فیصد اپیلیں عورت کی جانب سے ہوتی ہیں اور معمولی عذر کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اس لئے مرد کو جو زیادہ معقول اور کم جذباتی ہے' حقِ طلاق تفویض کیا گیا۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ' ج ۵' ص ۱۵۵)

(ج) <u>دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں؟</u> دشمنانِ اسلام کے نزدیک قرآنی آیت:

فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰهُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰهُمَا الۡاُخۡرٰی (البقرۃ: ۲۸۲)

''اگر دونوں مرد نہ ہوں تو اُن گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو' ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ اگر اُن میں سے ایک بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے۔'' (۲ : ۲۸۲)

بے جا بے انصافی ہے اور جنسِ ناتواں کے حقوق کا استحصال ہے۔ لیکن اگر جانبداری اور ہٹ دھرمی کی عینک سے نہ دیکھا جائے تو یہ سیدھی سادی اور غیر متنازعہ حقیقت کی غلط تاویل ہے۔ آیت مذکورہ (۲۸۲) کا سیاق و سباق تجارتی معاملات سے متعلق ہے۔ کاروباری معاملات اور بالخصوص مستقبل کے معاہدوں میں عام طور پر عورتیں ملوث نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں عورتوں کا بڑا میدانِ عمل اُن کا گھر ہے جہاں وہ اپنے بچوں کی نگہداشت اور دوسری خانگی ذمہ داریوں میں مصروف ہوتی ہیں۔ اِسی وجہ سے ایک عورت کا کاروباری شرائط کو یاد نہ رکھ سکنے کا بہت حد تک امکان ہے تو ایک عورت کی گواہی صحیح فیصلہ کے مقصد کے لئے کافی نہ ہو۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ قانونی عدالتوں کی فضا بے ملاحظہ اور پُر جلال ہوتی ہے اور اِن معاملات میں ماہرینِ مالیات تک کو وکلاء اکثر اوقات پریشان اور بدحواس کر دیتے ہیں۔ ان معاملات میں ایک سیدھی سادہ گواہ عورت پر عدالتی اثر حاوی اور غالب ہو سکتا ہے۔ اس لئے عورت گواہ کی ضرر پذیر کیفیت کے پیشِ نظر قانون ساز نے اُس کے ساتھ ہونے کی ایک معاون کا اہتمام کیا جو اُس کی حوصلہ افزائی کرے' اُس کی خود اعتمادی کو بڑھائے اور عدالت میں اُسے غیر ضروری گھبراہٹ سے بچائے۔ عورت کی

معاون کی موجودگی اُسے بطور گواہ پیش ہونے کا اور پریشان نہ ہونے کا حوصلہ دے گی اور اسی وجہ سے قرآن نے یہ اہتمام کیا۔عورت مرد کی نسبت زیادہ غلطی کرنے اور بھول جانے کی عادی ہوتی ہے۔ کچھ غیر مسلم مفکرین اور ماہرین نفسیات نے مختلف اوقات میں اس حقیقت کی تائید کی ہے اور یہاں ہم عورت کی شہادت کی حیثیت جدید سائنس کی تحقیقات کی روشنی میں کرتے ہیں:

(۱) ''بعض ممالک میں عورت کی عدالتی شہادت کو مرد کی شہادت کی نسبت کم تر درجہ دیا گیا ہے۔''
("Man and Woman" ... Havelock Ellis, p. 196)

(۲) ''یہ حقیقت کہ جرح میں عورتوں سے نمٹنا مشکل کام ہے' وکلاء میں مشہور و معروف بات ہے اور جب اُنہیں کوئی چیز چھپانی ہو تو اُن کے خلاف استفسار کی راہ میں اُن کے بہکاوے اور بھٹکانے کے طریقے اُنہیں ہٹ دھرم اور گواہی سے گریز کرنے والی بنا دیتے ہیں۔''("Woman" ... Ludovici, p. 320)

(۳) اپنی کتاب بہ عنوان "Psychology of Suggestion" کے صفحات ۳۶۲' ۳۶۳' ۳۶۴ پر Sidis نے لکھا کہ وہ عورتوں کی گواہی کے حق میں نہیں ہے کچھ تو نفسیاتی اور کچھ عضویاتی (Pysiological) وجوہ کی وجہ سے۔

(۴) ''ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عورت اپنی جذباتیت سے متاثر ہوئے بغیر کسی چیز کا معروضی طور پر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتی۔''(Bauer)

(۵) ''قانونی عدالت میں مردوں کی نسبت عورتیں اکثر جھوٹی گواہی دینے کی مرتکب پائی گئی ہیں۔ یہ سوال بالعموم کیا جاتا ہے کہ آیا اُنہیں قسم اٹھانے کی اجازت دی جانی چاہئے یا نہیں۔''(Schopenhauer)

یہ وہ مقام ہے جو عیسائیت نے اُسے عطا کیا ہے۔ یہودی ضابطہ میں عورت کی گواہی نا قابلِ قبول ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''گواہ مرد ہونے چاہئیں' عورتیں اور نابالغ نہیں۔'' (Cohen's Everyman's Talmud, p. 326) London.

''گواہ مرد ہونا چاہئے' عورت نہیں۔'' (Jewish Encyclopaedia, Vol. 5, p. 177)

''عورتوں کے اوچھے پن (متانت کی کمی) اور اُن کی بے دھڑک جنس کی وجہ سے عورت کی گواہی قبول نہ کی جائے۔'' ("Ant", IV.8 : 15)

<u>عورتیں بطور گواہان</u>: قرآن مجید آٹھ مقامات پر گواہی دینے سے متعلق ہدایات دیتا ہے جن میں سے دو کا انحصار صرف قسم لینے پر ہے' گواہی پر نہیں جبکہ باقی چھ میں گواہی اور شہادت کا حوالہ ہے' قسم لینے کا نہیں۔

(1) صرف عورتوں کی گواہی : ''تقریباً تمام مسلم فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ عورتوں کے رازہائے سربستہ کے معاملات میں جن کا علم مَردوں کو نہیں ہوتا (مثلاً عورت کی دوشیزگی اور کنوارا پن' حیض' رضاعت وغیرہ) عورتوں کی گواہی کافی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا آدمی اس نظریہ کی مخالفت میں نہیں ملا کہ پیدائش اور عورت کے مخفی مسائل میں مرد کی گواہی کے بغیر عورت کی گواہی قانوناً قابلِ قبول ہے۔ (کتاب الأم' ج ۷' ص ۹۷ بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ' ج ۸' ص ۷۰۴) امام زُہری بھی اسی نظریہ کے قائل ہیں۔

(2) قصاص میں عورت کی گواہی : تاریخ کی یہ مسلمہ اور مشہور و معروف حقیقت ہے کہ تمام صحابہ کرام نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کو قبول کرتے ہوئے قاتلینِ عثمان سے قِصاص لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ (انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ' جلد ہشتم) باقی تفصیل صفحہ ۱۲۸۲ (جلد ہٰذا) پر موجود ہے۔

(3) لعان میں عورت کی گواہی : تفصیل ملاحظہ ہو جلد ہٰذا کے صفحہ ۱۲۸۳ پر۔

(4) قذف (تہمت) میں عورت کی گواہی : سورۃ النُّور کی آیت ۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً

''جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو اُنہیں اَسّی دِرّے لگاؤ۔'' (۲۴:۴)

یہ چار گواہ عورتیں بھی ہوسکتی ہیں اور مرد بھی۔ اَلَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اگرچہ مذکر کے صیغے ہیں لیکن تہمت لگانے والی عورتیں بھی ہوسکتی ہیں جنہیں جرم کی توثیق ہونے پر قذف (تہمت) کی سزا دی جائے گی۔ (سیرۃ انسائیکلوپیڈیا)

(5) یتیم کا مال اُس کے حوالے کردینے پر گواہان : قرآن مجید کی مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ یتیم کو اُس کا مال واثاثہ وغیرہ حوالے کرتے وقت معاملے کو قانونی بنانے اور آئندہ کی مقدمہ بازی سے بچنے کے لئے گواہ کرلیا کریں :

فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ (ألنِّساء : ٦)

''جب تم اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو اُن پر گواہ بھی کرلیا کرو۔'' (۶ : ۴)

اِس آیت میں بھی کوئی تخصیص نہیں کہ گواہ لازمی طور پر مرد ہی ہونے چاہئیں۔ فَأَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ (اُن پر گواہ کرلیا کرو) کے الفاظ عموم پر ہیں اور اُن میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ عورتیں اور مرد بطورِ گواہ لئے جاسکتے ہیں۔

(6) زِنا کے ارتکاب پر عورتوں کے خلاف چار گواہ : سورۃ النِّساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَالّٰتِيْ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآءِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (النِّساء : ۱۵)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو زِنا کی مرتکب ہوں' اُن پر اپنے میں سے چار گواہ کرلو۔'' (۱۵ : ۴)

(7) **عدّت کے اختتام پر میاں بیوی میں جدائی کے وقت دو گواہ**: سورۃ الطلاق میں ارشاد ہوا:

فَإِذَا بَلَغۡنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمۡسِكُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ فَارِقُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ وَّأَشۡهِدُوا ذَوَيۡ عَدۡلٍ مِّنكُمۡ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ (الطلاق : ۲)

''پھر جب وہ (عورتیں) اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو اُنہیں (یا تو) بھلے طریق سے (نکاح میں) رہنے دو یا اُنہیں بھلے طریق سے رہائی دے دو اور اپنے میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ ٹھہرالو اور گواہی اللہ کے واسطے ٹھیک ٹھیک دو۔'' (۶۵ : ۲)

سورۃ النِّساء اور سورۃ الطلاق کی محوّلہ بالا دونوں آیتوں میں گواہوں کے مرد ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر یہ خیال ہو کہ لفظ مِنکُمۡ میں کُمۡ مذکر کا صیغہ ہے اور اس وجہ سے گواہ بھی مذکر یعنی مرد ہونے چاہئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید مذکر کا صیغہ بالعموم مرد و عورت دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے' ورنہ عورتیں احکاماتِ الٰہی کی پابندی سے مستثنیٰ ہو جائیں گی۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ کے احکام میں اَلَّـذِیۡنَ مذکر کا صیغہ استعمال ہوا جس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ حالات کے مطابق گواہ مرد یا عورتوں یا دونوں جنسوں سے ہو سکتے ہیں۔

(8) **وصیت پر گواہ**: سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۶ جو وصیت سے متعلق ہے اور جس کا حوالہ جلد ہٰذا کے صفحہ ۱۲۸۶ پر دیا جا چکا ہے' بھی مرد یا عورت کی بطور گواہ تخصیص نہیں کرتی بلکہ عمومی طور پر کہتی ہے کہ مرد یا عورت یا دونوں بطور گواہ کے لے لئے جائیں۔ ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت دورانِ سفر غیر مسلم کو بھی أَوۡ آخَرَانِ مِنۡ غَيۡرِكُـمۡ کے الفاظ میں گواہ بنانے کی اجازت دے رہی ہے تو پھر عام حالات میں مسلمان عورتوں کو بطور گواہ کیوں نہ لیا جائے؟ قرآنی لفظ مِنكُمۡ میں مذکر و مؤنث یعنی مرد و عورت کی دونوں جنسیں شامل ہیں۔

(9) **وصیت کے گواہوں پر شک کی صورت**: اگر وارثوں کو وصیت کے گواہوں کی ایمانداری پر شک و شبہ ہو تو اُنہیں گواہ پیش کرنے کی اجازت ہے جو قسم کھانے کے ذریعے بے ضابطگی کے مرتکب شخص کی بد نیتی کی تصدیق کریں گے۔ اُسی سورۃ المائدۃ کی اگلی آیت ۱۰۷ میں حکم مذکور کے یہ الفاظ ہیں:

فَإِنۡ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسۡتَحَقَّا إِثۡمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مِنَ الَّذِينَ اسۡتَحَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡأَوۡلَيَانِ فَيُقۡسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِن شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعۡتَدَيۡنَا إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (المائدۃ : ۱۰۷)

''پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں (وصی) حق بات دبا گئے تو اُن کی جگہ اُن لوگوں میں سے جن کا حق دبا ہے' دو گواہ اور مقرر ہوں (میّت کے) قریب تر لوگوں میں سے اور یہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی اُن دونوں کی گواہی سے زیادہ درست ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی ہے ورنہ بے شک ہم ہی ظالم ٹھہریں گے۔'' (۵ : ۱۰۷)

یہاں اِس آیت میں بھی مرد گواہ اور عورت گواہ میں فرق نہیں رکھا گیا۔ اگر کسی کے وارث اُس کی بیوی اور

بیٹی ہیں تو کیا اُنہیں بطور گواہ پیش ہونے سے روک دیا جائے گا اور دوسرے گواہوں کے معتبر ہونے اور اُن کی دیانتداری کے متعلق معلوم کرنے کے حق سے اُنہیں محروم کر دیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی صورت کے واقع ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اُن دو وارث عورتوں کو بطور گواہ پیش ہونے اور مالِ وراثت میں اپنے حق کے تحفظ کے لئے قسم اٹھانے کی اجازت دی جائے گی۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ' جلد ہشتم' صفحہ ۴۶۸)

(10) حدود اللہ میں عورتوں کی گواہی : کچھ لوگ مندرجہ ذیل آیت کی بنیاد پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ حدود مقدمات میں عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

وَالّٰتِیْ یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآءِ کُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْکُمْ (النِّساء : ۱۵)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو زِنا کی مرتکب ہوں' اُن پر اپنے میں سے چار گواہ کرلو۔'' (۱۵ : ۴)

اُن کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں لفظ مِنْکُمْ میں کُمْ مذکر کا صیغہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ گواہ بھی مذکر یعنی مرد ہونے چاہئیں۔ اُن کی دوسری دلیل یہ ہے کہ گواہوں کی تعداد چار ہے اور اگر عورتوں کی گواہی قابلِ قبول ہے تو اس سے تعداد بڑھ جائے گی کیونکہ ایک مرد گواہ کی جگہ دو گواہ عورتیں لینا ہوں گی۔ اس طرح یہ یا تو تین مرد اور دو عورتیں ہوں گی یا دو مرد اور چار عورتیں ہوں گی۔ دونوں صورتوں میں قرآن میں بیان شدہ چار کی تعداد کی پابندی نہیں ہوگی اور اس لئے یہ حکمِ قرآن کی خلاف ورزی ہوگی۔''

''جہاں تک اُن کی دلیل کے پہلے حصّہ یعنی مذکر کے صیغے کا تعلق ہے تو اس کا جواب سابقہ صفحے پر دیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید میں مذکر صیغے کا استعمال بہت عام ہے اور ضروری نہیں کہ اس سے مراد صرف مرد ہی ہوں بلکہ یہ عمومی ہونے کے باعث مرد اور عورتوں دونوں کو شامل ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کے الفاظ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (سورۃ البقرۃ : ۲ ؛ سورہ آلِ عمران : ۱۵ اور سورۃ النساء : ۵۷) ہی کو لیجئے۔ جس میں لفظ أَزْوَاج کا معنیٰ جوڑے کا ہے جس میں بیویاں اور شوہر دونوں شامل ہیں۔ اس لئے أَزْوَاج مُّطَهَّرَة کا مطلب صرف یہی نہیں کہ مَردوں کو پاکدامن بیویاں ملیں گی بلکہ بیویوں کو بھی پاکباز مرد ملیں گے۔''

''گواہوں کی تعداد کے بارے میں اُن کی دوسری دلیل بڑی پریشان کن اور مغالطہ آمیز ہے۔ اُن کے ذہنوں میں یہ اُلجھن اور انتشار اُن کی اپنی بدحواسی اور اُلجھی ہوئی سوچ کی پیداوار ہے کہ تمام قسم کی گواہیوں میں ایک مرد اور دو عورت گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ قرآن مجید میں اِس شرط کا ذکر اُدھار کے لین دین میں ہوا ہے لیکن اُنہوں نے اسے عموم میں لیتے ہوئے اسے ہر قسم کی گواہی پر چسپاں کر دیا ہے۔ اگر اس محدود حکم کو اپنی جگہ پر رہنے دیا جاتا اور اس کے الفاظ کو قرآن کے دوسرے عمومی احکام پر چسپاں نہ کیا جاتا تو حکم کی خلاف ورزی کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ قانون چار گواہ چاہتا ہے خواہ وہ دو مرد اور دو عورتیں ہوں' یا ایک مرد اور تین عورتیں ہوں یا تین مرد اور ایک

عورت، لیکن اِن تمام صورتوں میں تعداد بہرحال چار ہی رہے گی۔

پھر سورۃ الطلاق کی مندرجہ ذیل آیت دوئم کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے جو طلاق کے وقوع کے بعد عدت سے متعلق ہے اور جس میں میاں بیوی کی باہم جدائی یا صلح صفائی کا ذکر ہے:

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْفَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَّأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ

''پھر جب وہ (عورتیں) اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو اُنہیں (یا تو) بھلے طریق سے (نکاح میں) رہنے دو یا اُنہیں شریفانہ طریق سے رہائی دے دو اور اپنے میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ ٹھہرالو۔ (۲ : ٦۵)

یہاں تو وہ دو مَردوں یا پھر صرف ایک عورت کی گواہی کو کافی سمجھتے ہیں اگرچہ یہ کھلم کھلا طور پر تعداد کی شرط کے خلاف ہے۔ یہاں بھی ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ کا لفظ کُمْ مذکر کا صیغہ ہے لیکن یہ لوگ یہاں کوئی اعتراض نہیں کرتے۔

''اگر بہت سے معاملات میں عورت کی گواہی محض اس وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے کہ اکثر اوقات اُس کا گھر سے باہر نکلنا نہیں ہوتا اور وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی ہے تو ایسا قانون مَردوں اور عورتوں سب کے ساتھ منصف ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ یہ لوگ اُدھار کے معاملات میں ایک آدمی اور دو عورتوں کی گواہی کو تو قبول کر لیتے ہیں لیکن قتل، چوری، زنا اور بدکاری اور قذف وغیرہ جیسے معاملات میں وہ صرف عورتوں کی گواہی کو قبول کرنے کو تیار نہیں اگرچہ وہ کتنی ہی نیک، پارسا اور ایماندار کیوں نہ ہوں!''

''عورت کے بھول جانے، بے توجہی اور عدمِ التفات (سہو و نسیان) کے متعلق اُن کے دلائل اس لئے اطمینان بخش نہیں ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے رضاعت کے ایک مقدمہ میں صرف ایک عورت کی گواہی کو قبول فرمایا تھا۔''

''روایت حدیث میں عورتوں کی گواہی: اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ اُمّتِ مسلمہ نے ہر شعبہ حیات میں عورتوں سے روایت کردہ احادیث کو قبول کیا ہے۔ اگر عورت کا حافظہ، یادداشت، فہم اور سوچ اتنی ہی ناقص اور ادھوری ہے تو ہمارے علماء اُن کی روایتِ حدیث پر اعتماد نہ کرتے۔ یہ حقیقت کہ اُنہوں نے نہ صرف اُن پر اعتماد کرتے ہوئے اُن کی روایت کو قبول کیا بلکہ اُنہوں نے مَردوں اور عورتوں کی روایت کے درمیان فرق بھی روا نہیں رکھا۔ اس طرح اگر دینی معاملات میں عورت کی روایتِ بیان مَردوں کی روایتِ بیان کی طرح قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسہ ہے تو دُنیاوی معاملات میں بھی اُصولی طور پر وہ قابلِ اعتنا اور باوزن ہونی چاہئیں۔''

''فقہ کا ایک معتد بہ حصّہ عورتوں کی روایتِ بیان پر مبنی ہے۔ سیدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بہت سی ایسی حدیثیں مروی ہیں جن میں کوئی دوسرا راوی نہیں ہے لیکن کوئی بھی اُن کی صداقت کا منکر نہیں۔ نبی ﷺ کی ایک معروف حدیث یہ ہے کہ دین کا آدھا حصّہ عائشہ صدّیقہ سے سیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح دین کے معاملات

میں ہمیں مکمل طور پر عورت پر اعتماد ہے تو پھر ہم دنیاوی معاملات میں اُس پر اعتماد کیوں نہیں کرتے اگرچہ دینی معاملات کو دنیاوی معاملات پر اوّلیت (فوقیت) حاصل ہے؟''

''اس تمام بحث سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ عورت کی گواہی کو بالعموم مرد کی گواہی جیسی اہمیت دی جانی چاہئے لیکن چونکہ اُدھار کے معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں اور عورتیں بالعموم اُن میں ملوّث نہ ہونے کے باعث اُن میں دلچسپی نہیں رکھتیں اور جن پر قرآن مجید نے واضح ہدایات دی ہیں' تو اُن کی گواہی کو مشروط طور پر قبول کیا جائے گا جہاں ایک اضافی عورت اصل گواہ کی مدد کے لئے ہوگی۔ لیکن اُن تمام معاملات میں جن کا ذکر قرآن مجید نے کیا' عورتوں کی گواہی مَردوں کی گواہی کے برابر سمجھی جائے گی۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ' جلد ۸' صفحات ۱۷۱ تا ۳ ۴۷ ۴) ۱۹۸۶ء ایڈیشن۔

''(د) خانگی قیادت مرد کے سپرد کیوں؟' سورۃ 'النِّسَاء کی آیت ۳۴ میں قرآن مجید نے مرد کو دو وجوہ سے خانگی قیادت سونپی ہے: اُن میں سے ایک الٰہی عطیہ ہے جسے آئندہ صفحات میں ''عورت کی قدرتی جسمانی کیفیت'' کے تحت زیرِ بحث لایا جائے گا جبکہ دوسری وجہ مرد کا اپنے گھر کی خوراک اور ضروریات کی کفالت پر خرچ کرنا ہے۔ روزی کی تلاش اور جدّ وجُہد برائے حیات فی الواقع ایک دقّت طلب اور ٹیڑھا راستہ ہے جس کے لئے ایسی قوّت وطاقت کی ضرورت ہوتی ہے جس میں نفیس ولطیف جذبات کے باوجود ناقابلِ تسخیر گرمجوش استقامت شامل ہو اور ایسا تحمّل' بُردباری اور ٹھنڈا مزاج ہو جو جذباتیت اور حساسیت پر غالب ہو۔ ارادے کی پختگی کی بدولت آدمی خوشحالی اور اپنے مقاصد کے حصول کی دَوڑ دوڑتا ہے۔

زندگی کے ہنگامہ میں عضویاتی اور نفسیاتی طور پر کنبے کی خوراک کی فراہمی اور تحفظ کے لئے ہر شعبہ حیات میں خواہ وہ معماراتی مہارت کے ذریعے ہو' یا جنگل سے لکڑیاں کاٹنے' یا بھاری بھرکم صنعتی مشینیں چلانے' یا ملک کو دشمن سے بچانے' یا ملک اور معاشرے کے معاملات کو نمٹانے کے ذریعے ہو' اِن تمام چیزوں میں تندرست' توانا اور چاق وچوبند جسم کی ضرورت ہوتی ہے جو جذباتِ لطیف اور نرم دلی کے ذریعے قابلِ حصول نہیں ہیں۔

''اگرچہ قانون کی نظر میں مرد اور عورت دونوں کو برابر کے حقوق اور مقام حاصل ہیں (بحوالہ سورۃ البَقَرۃ: آیت ۲۲۸) لیکن گھر کے عام معاملات اور اُن کے انتظام میں مرد بطورِ سردار اور سرپرست' ذمّہ داری کے مقام کا حامل ہے جبکہ عورت امورِ خانہ داری کی نگران ہے۔ اس تقسیم کار میں اُن میں سے ہر ایک کو اُس کی اہلیت ومہارت' فطری خصوصیات اور استعداد کے مطابق کوئی نہ کوئی کام سپرد کیا گیا ہے جس سے تمام افرادِ خانہ کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لئے خاندان کی جملہ حُسنِ کارکردگی اور استعدادِ کار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذمّہ داریوں کو نبھانے کی اِس تقسیمِ کار میں کسی طرح بھی ایک پر دوسرے کی فوقیت کا ثبوت نہیں ہے۔ اگر مرد خاندان کی سرپرستی اور قیادت کا کام عورت کی نسبت زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے تو اسی طرح عورت بھی بچوں کی نگہداشت اور تربیت کا کام مرد کی نسبت زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔ لہٰذا ہر ایک اپنے اپنے مخصوص میدانِ کار میں کام کرنے کی بدولت دوسرے سے فائق ہے اور اس طرح وہ دوسرے پر فائق ہے۔ اس کے علاوہ ایک کی دوسرے پر فوقیت کا کوئی اور جواز نہیں ہے۔''

''علاوہ ازیں خاندان کی یہ قیادت آمرانہ یا مطلق العنانیت کی نہیں ہے' جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ شرعی قانون اور باہمی مشاورت کے عمل کے ذریعے اُس پر کچھ پابندیاں ہیں۔اس کا انحصار مرد کی خواہشات' ترنگ اور ذوق ورُجحان پر نہیں ہے۔قرآن کا مطالبہ: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی بودوباش رکھو) فطری اور قرینِ عقل ودانش ہے جس کی بنیاد رحم دلی' فراخ دلی' انصاف اور مساواتِ حقوق ہے۔''

''قرآن مجید ہر اُس ترنگ کو دُور کرتا ہے جو ذمہ داریوں کی اس تقسیم کے ذریعے پیدا ہوسکتی ہیں اور اِن الفاظ میں اس میں پنہاں حکمت ودانش کی توضیح ان الفاظ میں کرتا ہے:

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (اَلنِّساء : ۳۴)

''اس وجہ سے کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دُوسرے پر فضیلت بخشی ہے۔''

''اس فضیلت کی بناء الٰہی حکمت ودانش ہے اور اس میں کسی بھی ایک فریق کی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سادہ الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ فضیلت کسبی نہیں ہے بلکہ نوعِ انسان کی فلاح وبہبود کے لئے الٰہی حکمت پر مبنی ہے۔''

''اس سرداری کی دوسری وجہ یہ بیان ہوئی کہ مرد اپنی دولت عورت پر خرچ کرتے ہیں' اُنہیں مہر ادا کرتے ہیں اور اُن پر اپنی فضیلت جتلائے بغیر اُن کی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں۔فَضَّل کا لفظ الٰہی حکمت کی انتہا کا مظہر ہے۔ اگر مَردوں کو عورتوں پر ایک چیز میں فوقیت حاصل ہے تو عورتوں کو مَردوں پر دوسری چیز میں فوقیت حاصل ہے۔اور یہ ایک کی برتری دوسرے پر برتری نہیں۔ یہ بات اسی طرح ہے جیسے ہم کہیں کہ سر ہاتھ پر فوقیت رکھتا ہے یا دل کو معدہ پر فوقیت حاصل ہے۔جس طرح سر کی برتری کسی بھی طرح ہاتھوں کی اہمیت اور مقام کو نہیں گھٹاتی' اسی طرح مرد کی قیادت عورت کے مقام کو کم نہیں کرتی کیونکہ وہ ایک دوسرے کا جزوِ لاینفک ہیں اور اُس حیثیت میں وہ دونوں اپنے دائرۂ عمل اور ذمہ داریوں کو اپنی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے مطابق انجام دے رہے ہیں بغیر اس سوال کے کہ ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں پر برتری یا کم تری حاصل ہے۔'' (ایضاً' جلد پنجم' صفحات ۳۸۱'۳۸۲)

معلوم ہوا کہ اپنی فطری اور کسبی برتری کے باعث مرد ہی اس امر کا مستحق ہے کہ وہ گھر کی ریاست کا امیر ہو۔ کوئی کج فہم یہ نہ سمجھے کہ عورت کے گلے میں مرد کی غلامی کا طوق ڈال دیا گیا ہے۔نہیں' اِن انتظامی امور کے علاوہ عورت کے اپنے حقوق ہیں جو مرد پر ایسے ہی واجب ہیں جیسے مرد کے حقوق عورت کے ذمہ واجب ہیں (سورۃ البقرۃ: ۲۲۸)۔قربِ الٰہی کے دروازے دونوں صنفوں کے برابر کشادہ ہیں۔اس لئے یہاں عورت کی غلامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔حقیقت یہ ہے کہ عورت کو جو مقام اسلام نے معاشرہ میں بخشا ہے' اُس کی نظیر نہیں۔ ویسے کوئی آنکھیں بند رکھنے پر ہی اُدھار کھائے بیٹھا ہو تو چشمۂ آفتاب راچہ گناہ۔

''جب ہم امورِ خانہ داری میں عورت کے فرائض کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی بہت

بہت زیادہ زیرِ بار ہے۔ خانہ داری کے منتظم اور کنٹرولر کی حیثیت سے وہ گھر کے بجٹ اور تمام متعلقہ امور کی ذمہ دار ہوتی ہے مثلاً باورچی خانہ، بچوں کے لباس اور تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا۔ پھر اگر اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو اُن کی دیکھ بھال اُس کا خاصا وقت اور قوت لے جاتی ہے۔ اِن تمام امور میں جسمانی، دماغی اور جسمانی دباؤ ہوتا ہے اور اس دباؤ کی موجودگی میں اُس کے کندھوں پر خاندان کی قیادت کا مزید بوجھ ڈالنا بے انصافی ہوگی اور تکلیف کا موجب ہوگا اور خاندانی وحدت کو صحیح خطوط پر چلنے میں دھچکا لگے گا۔''

''پھر یہ بھی ایک سائنسی حقیقت ہے کہ عورت جذباتی، نرم احساسات کی حامل اور جلد ہی بیرونی اثرات کو قبول کرنے والی ہوتی ہے اور یہ خصوصیات قیادت کے لئے مناسب نہیں ہوتیں۔ قیادت تو فیصلہ کرنے میں جذباتی اثرات کو روکنے میں استقلال اور قوت چاہتی ہے۔ اس کے برعکس مرد کو فطرتاً ہوشمندانہ اور عقلی خصوصیات سے نوازا گیا ہے۔ جسمانی طور پر وہ اپنے افعال میں زیادہ مضبوط اور پختہ ہوتا ہے اور اُسے اپنے آپ پر قابو پانے کا ملکہ زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے خاندان کی قیادت کا بوجھ اٹھانے کا وہ زیادہ اہل ہے۔''

''مغربی سماج کو جو نظریہ ارتقاء اور انسان کا آغاز بندروں سے ہونے کا قائل ہے، مرد کی قیادت اور اُس کی بالادستی پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ بندروں کی نسل میں انسان نمایاں ہستی ہے اور انسان چونکہ بندر کی اولاد ہے، اس لئے فوقیت اور برتری کا وہی رجحان مردوں کو ورثے میں ملا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۷۲)

ملکہ سبا (بلقیس) کی حکومت سے عورت کی قیادت کا جواب: سورۃ النمل میں ملکہ بلقیس کے واقعے کا جس قدر ذکر ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد پھر اُس کی حکومت کے تسلسل کا ذکر نہیں ہے لہٰذا اس واقعہ میں عورت کی سربراہی کا ادنیٰ سا جواز بھی موجود نہیں ہے اور اگر بالفرض بلقیس کے اسلام لانے کے بعد اُس کی حکومت کا ثبوت ہو بھی، تو وہ شریعت سابقہ ہے اور ہم پر حجت نہیں ہے۔

جنگِ جمل کے واقعہ سے عورت کی سربراہی پر استدلال کا جواب: بعض متجددعلماء جنگِ جمل میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شرکت سے عورت کی سربراہی کے جواز کی دلیل دیتے ہیں لیکن یہ دلیل قطعاً باطل ہے۔ اول تو سیدہ عائشہ اُمارت اور خلافت کی مدعیہ نہیں تھیں بلکہ وہ امت میں اصلاح کے ارادہ سے اپنے گھر سے نکلی تھیں اور یہ اُن کی اجتہادی غلطی تھی جس پر وہ تا حیات نادم رہیں۔ امام محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ) نے روایت کیا کہ سیدہ عائشہ جب بھی سورۃُ الاحزاب کی آیت ۳۳ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) کی تلاوت کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آپ کا دوپٹہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔'' (الطبقات الکبریٰ، ج ۸، ص ۸۱ مطبوعہ دار صادر، بیروت)

''قیادت کا اشتراک: نوعِ انسانی کی تمام تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کسی بھی انسانی مہم میں مشترک کنٹرول کامیاب نہیں ہوا۔ مشترک ذمہ داری کا مطلب عدمِ ذمہ داری ہے۔ جب کوئی ایک قوت اور واحد شخص کسی

بنیادی ذمّہ داری کا بار اٹھانے کو نہ ہو تو وہ ٹوٹ کے بکھر جائے گی۔ بدانتظامی یا عدمِ انتظام خاندان کے امن وسکون اور اتحاد کو برباد کر کے رکھ دے گا۔ یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کسی نظام کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اسے مشترک کنٹرول کے حوالے کر دیجئے۔ لہٰذا مسئلے کا یہ کوئی حل نہیں ہے۔''

''مستثنیات : ہاں البتہ کچھ مستثنیات ہوسکتی ہیں بالخصوص جبکہ عورت کے بچے نہ ہوں یا وہ ذہنی' دماغی اور تعلیمی لحاظ سے اپنے خاوند سے بالا ہو تو وہ اپنے خاوند کی نسبت زیادہ بہتر قیادت کی اہل ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں زوجین کا رشتہ باہمی تعاون اور محبت وشفقت چاہتا ہے۔ اُن کی باہمی مفاہمت اور یک جہتی خاندانی معاملات میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ آمرانہ رویّہ نہ تو اچھے' صحتمند اور خوش کن خاندانی رشتے کے لئے مرغوب و پسندیدہ ہوتا ہے' نہ ہی قابلِ عمل اور نہ ہی موزوں ہوتا ہے۔ افرادِ خانہ کے مابین یہ نہ صرف محبت وشفقت کے رشتوں کی نفی کرتا ہے بلکہ حقیقی امن وسکون' شادمانی ومسرت اور خاندان کی وحدت کی بنیاد کو بھی غارت کر کے رکھ دیتا ہے۔''

''عورت عائلی زندگی میں قیادت تب سنبھال سکتی ہے جب بچوں والی نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی تعلیم وتربیت کے بارے میں اُسے کوئی فکر نہ ہو۔ بچے ہو جانے کے بعد وہ اضافی ذمّہ داریاں اٹھانے کے قابل نہیں ہوتی کیونکہ بہ حیثیت والدہ کے وہ اپنے دائرہ کار میں پہلے ہی کافی زیرِ بار ہوچکی ہوتی ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد اپنے گھر یا بیوی پر آمر بن کر رہے۔''

(ر) عورت بہ یک وقت دو خاوندوں سے محروم کیوں؟ دشمنانِ اسلام اپنی دیوانگی کے شدید دورہ میں کہتے ہیں کہ مرد کو جب ایک بیوی سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہے تو عورت کو بہ یک دو شوہروں سے محروم کیوں کیا گیا؟

کیا مرد وزن کی مساوات کے حامیوں کی یہ دلیل درست ہے کہ مرد کو بھی اُنہی مراحل سے گزرنا چاہئے جن مراحل سے اُس کی بیوی گزرتی ہے تاکہ دونوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کا مقصد حاصل ہو جائے؟

مرد کو تعدّدِ ازواج کی اجازت دینا کئی معماتی مسائل کا حل ہے۔ اگر یہ اجازت عورت کو دی جائے تو اس سے کئی لاینحل مسائل کے دروازے کھل جائیں گے۔ حسب ونسب کے تحفظ کو بھی جو اسلام کے نزدیک بہت محبوب ہے' دھچکا لگے گا۔ مزید برآں یہ اجازت ''جنگل کے قانون'' کے شدید نتائج کو شامل ہوگا' ایسا جنگل جہاں ہر طاقتور درندے کو مادہ پر قبضہ کرنے کا خصوصی اختیار حاصل ہوتا ہے اور کمزور درندے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں یہ بات ناقابلِ برداشت ہے جس کی بنیاد خالصتاً پارسائی' شرم وحیا اور تقویٰ (خداخوفی) جیسے جذبات ہے۔

(ز) عورت کا میراث میں حصّہ مرد کے حصّہ میراث سے نصف کیوں؟ اس سلسلہ میں عورت بہ ظاہر مالی لحاظ سے نقصان میں ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے انصاف نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر اسلام کے تمام عائلی نظام کو مدِّ نظر رکھا

جائے تو بہ ظاہر اصل صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت کا میراث میں نصف حصہ مقرر کرنے سے اسلام نے اس کی تلافی تین طرح کر دی ہے:

(۱) اُسے اپنے خاوند کی جانب سے مہر ملتا ہے جس کی وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہوتی ہے۔

(۲) شادی میں حاصل شدہ تمام تحفوں، نقدی اور زیورات و جواہرات کی وہ خود مالکہ ہوتی ہے۔

(۳) شادی سے پہلے لڑکی کے والدین اُس کی تمام ضروریات کے کفیل ہوتے ہیں اور شادی کے بعد اُس کی رہائش، لباس، خوراک کی تمام تر ذمہ داری خاوند پر ہوتی ہے۔ اُس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے جملہ مصارف بھی اُس کے خاوند کے ذمہ ہیں۔ مزید برآں عملی زندگی کی سرگرمیاں جس سرمایہ کی محتاج ہیں، اُس کا مہیا کرنا بھی خاوند کی ذمہ داری ہے۔ یہ حقائق ہیں جن کے پیشِ نظر اسلام نے عورت اور مرد کے حصّوں میں فرق رکھا اور یہ فرق ہی عین عدل ہے۔ ان امتیازات کی موجودگی میں اُن کے حصّوں کو مساوی رکھنا مساوات تو ہو گی لیکن کھلی اور ظالمانہ اور اسلام صرف اُس مساوات کا علمبردار ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔

اگر عورت کمانے والی ہو تو بھی تمام تر بوجھ یا اس کا معتد بہ حصّے کا بوجھ یا اس کا جزوی بوجھ خاوند کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ مالی ذمہ داریاں بالعموم خاوند پوری کرتا ہے اور طلاق کی صورت میں خاوند کو اپنی (مطلقہ) بیوی اور بچوں کے نان و نفقہ کا بوجھ برداشت کرنا ہوتا ہے اور بیوی اس بوجھ کو نہیں اٹھاتی۔

اس طرح یہ اور اس قسم کی سورۃُ النّساء کی دیگر آیات کی رُو سے جن میں اُسے وراثت کے حصّے کا حقدار بنایا گیا ہے، تاریخِ عالم میں پہلی بار عورت کو خود مختار زندگی گزارنے کا موقع دیا گیا۔ نزولِ قرآن کے ابتدائی زمانہ میں اس بات سے لوگ بڑے حیران ہوئے کہ عورتوں کو میراث میں سے اپنا حصّہ لینے کا حق دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس طریق سے ظالموں کے اُن جابر ہاتھوں کو جن کے نزدیک ''عورت کا میراث میں حصّہ'' ایک ناقابلِ تصوّر بات تھی، پہلے دلائل کے ذریعہ اور پھر اُن کی اثر پذیری کے نہ ہونے کے بعد بزورِ بازو کاٹ دیا گیا۔

(س) یہ نظریہ کہ مہر کے نام پر بیوی کی قیمت لگائی جاتی ہے، ایک اور غلط تاویل ہے:

''قانون کی طرف سے مہر کی ادائی صرف عورت کی تعظیم و تکریم کی خاطر کی جاتی ہے اور اس کا ذکر نہ کرنا شادی کی توثیق اور جائز کے لئے ضروری نہیں ہے (ہدایہ)۔ پس اس کا قبل از اسلام عرب کی ''قیمتِ خرید'' سے کوئی تعلق نہیں جو شادی شدہ لڑکی کے سپرد نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُس کے والد یا بھائی یا اُس رشتہ دار کو دی جاتی تھی جس کی سرپرستی میں وہ ہوتی تھی۔'' (تفسیر ماجدی حصّہ انگریزی، صفحہ ۷۴۔ بی)

مساوات یا مماثلت: اس مفروضہ میں وہ بنیادی نقطہ جس پر زور دیا جاتا ہے یہ ہے کہ مرد و زن دونوں کے حقوق ایک جیسے یعنی مماثل ہونے چاہئیں تاکہ وہ انسانی عزت و وقار میں برابر کے شریک ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ

مردوزن کا انسانی شرف ووقار اور حقوق میں مساوات کا اشتراک حقوق میں بھی برابری چاہتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حقوق میں مماثلت کیسے ہو؟

ضد، تعصّب اور مغربی نظریہ کی اندھا دھند تقلید سے ہٹ کر ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ آیا حقوق کی مساوات کے لئے حقوق کا ایک جیسا ہونا (مماثلت) ضروری ہے کہ نہیں۔ مساوات کا مطلب ایک دوسرے کے ہمقدر رہنا اور برابر ہونا ہے جبکہ مماثلت کا مطلب بالکل ایک جیسا ہونا ہے۔ والد کے لئے اپنی دولت کو اپنے بیٹوں میں مماثلت کے بغیر برابر برابر تقسیم کرنا ممکن ہے۔ مثلاً والد کے پاس مختلف قسم کی دولت ہے: اُس کی ایک تجارتی فرم ہے، کچھ زرعی زمین ہے اور کچھ اور قسم کی جائداد ہے۔ اُس کے بیٹے مختلف اہلیتوں اور صلاحیتوں کے ہیں۔ اُن میں سے ایک بیٹا کاروباری معاملات میں، دوسرا بیٹا زراعت میں اور تیسرا بیٹا اراضی کی خرید وفروخت میں ماہر ہے۔ والد بیٹوں میں برابر برابر تقسیم کرنے کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے کہ کوئی ترجیحی یا فرق کا سلوک نہ ہونے پائے، جائداد کو بیٹوں کی صلاحیتوں کے مطابق دیے جانے کی وصیت کرتا ہے تو یہ بالکل درست ہے۔

کسی چیز کی مقدار (Quantity) اُس کی خوبی (Quality) سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ مساوات مماثلت (ایک جیسا ہونے) سے مختلف ہوتی ہے۔ اسلام نے مردوزن میں مساوات کے اصول کو تو ہمیشہ قائم رکھا ہے لیکن وہ اُن کے حقوق میں مماثلت سے متفق نہیں ہے۔ اسلام نے ہر چیز میں مَردوں اور عورتوں کو مماثل (ایک جیسے) حقوق نہیں دیے اور اسی طرح اُس نے تمام مواقع میں اُن دونوں کے فرائض بھی اُن پر ایک جیسے نہیں عائد کئے۔

عورت کی بابت غیر اسلامی نظریات: (۱) عورت سے متعلق جو ذلت آمیز رویہ ماضی میں رہا ہے اور جس نے عالمی ادب پر ناپسندیدہ اثرات چھوڑے ہیں، وہ یہ ہے کہ عورت بدی اور برائی کا منبع ہے اور یہ کہ اُس کا وجود گناہ اور جاذبیت کا سرچشمہ ہے۔

''چرچ کے پادری اور مبلّغین عورت کے خلاف اپنی گھن گرج، اُس کی تذلیل وتحقیر کرنے اور اُسے برا بھلا کہنے سے باز نہیں آئے، اور یہ کہ وہ ناپاک وجود ہے اور شیطانیت اُس کی صفت ہے۔'' ("Evolution of Marriage" ... Letourneau, p. 205)

''عیسائیت کی ابتدائی چند صدیوں میں مغربی دنیا پر عورت کی بابت کچھ غیر معمولی خیالات کی یلغار ہوئی جو اُنہیں تبت کی پہاڑیوں سے پہنچے۔۔۔۔ تقدس رکھنے والی شخصیات کے حوالہ سے عورتوں کو یہ بتایا گیا کہ اُنہیں محض اس خیال سے ہی شرم آنی چاہئے کہ وہ عورتیں ہیں اور اُن نحوستوں کی بدولت جو اُن کی جنس دنیا میں لائی ہے، اُنہیں مسلسل نادم رہنا چاہئے۔ عورتوں کے خلاف مانو کا بیان یہ تھا کہ عورت جہنم کا دروازہ اور گناہ کی تجسیم ہے۔ اور کچھ تو یہاں تک کہہ گئے کہ عورتوں کا جسم ابلیسی نقطۂ آغاز ہے لیکن مسلمہ بات یہ ہے کہ یہ تمام بیانات بدعقیدگی پر مبنی ہیں۔'' ("Universal History of the World".... Hammertson, Vol. 1, p. 379)

اُن کا کہنا ہے کہ انسان بذاتِ خود ہر گناہ سے معصوم ہے اور شیطان اُس تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتا۔ یہ عورت ہی ہے جس کے ذریعے وہ مرد کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ شیطان عورت کو اور عورت مرد کو ورغلاتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ پہلا انسان (حضرت) آدم جسے شیطان نے ورغلایا اور اُسے جنت سے نکال دیا گیا' عورت کے ذریعے دھوکا کھا گیا۔ شیطان نے حوّا اور حوّا نے آدم کو ورغلایا۔

عورت کی بابت اسلام کا نظریہ: قرآن حکیم نے جنتِ آدم کی کہانی کے بیان میں کہیں یہ نہیں کہا کہ شیطان یا کسی سانپ نے حضرت حوّا کو ورغلایا اور حوّا نے آدم کو ورغلایا اور نہ ہی قرآن نے حضرت حوّا کو ذمّہ دار ٹھہرایا۔ سورۃ الاعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَيَآدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا (الاعراف: ۱۹)

''اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جس جگہ سے چاہو' کھاؤ پیو۔'' (۷ : ۱۹)

قرآن مجید اُس غلط فہمی کو پُر زور طور پر ردّ کرتا ہے جو اَب تک دنیا کے کچھ حصّوں میں موجود ہے اور اس طرح عورت کو اِس الزام سے بری الذمہ قرار دیتا ہے کہ وہ جاذبیت اور گناہ کا سرچشمہ ہے اور آدھی شیطان ہے۔

(۲) عورت کے بارے میں ایک اور توہین آمیز نظریہ اُس کی روحانی اہلیت کے میدان میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت جنت میں نہیں جا سکتی اور وہ اللہ کا اتنا قرب حاصل نہیں کر سکتی جتنا مرد کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن مجید اکثر جگہوں پر اور غیر مبہم الفاظ میں بتاتا ہے کہ آخرت میں ثواب اور قربِ الٰہی جنس پر منحصر نہیں بلکہ مرد ہو یا عورت' ایمان اور اعمالِ صالحہ پر منحصر ہے (سورۃ النّحل: ۹۷)۔ آدم اور ابراہیم علیہما السلام کی بیویوں اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی والداؤں کا قرآنی ذکر بڑے عزت و احترام سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ قرآنِ حکیم نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کو اُن کے خاوندوں کے لئے نااہل بتاتا ہے لیکن وہ فرعون کی بیوی کو بطور ایک امتیازی عورت کے (سورۃ التحریم: ۱۱) نظر انداز نہیں کرتا جو ایک قابلِ نفرت انسان (فرعون) کے قبضہ میں تھی۔

(۳) عورت کے بارے میں ایک اور ذلت آمیز رویّہ جنسی اجتناب اور کنوارا رہنے کے سلسلہ میں ہے۔ اس نظریہ کے مطابق صرف کنوارا آدمی ہی روحانی مقام حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا کے ایک مشہور و معروف مذہبی قائد نے کہا تھا: ''شادی کے درخت کی جڑ کو کنوارے پن کے تیشے سے کاٹ دو۔'' ایسے لوگ عورتوں کی محبت کو عظیم اخلاقی بے راہروی سمجھتے ہیں۔ درحقیقت جنسی اجتناب اور تجرد (کنوارا پن) کی بنیادی وجہ جنسِ عورت سے نفرت کا احساس ہے۔

اسلام نے اس توہم کا بھرپور مقابلہ کیا ہے۔ وہ شادی کو مقدس اور تجرد کو ناپاک چیز سمجھتا ہے۔ وہ عورت کی محبت کو نبوی اخلاق کا جزو سمجھتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ ''تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے محبوب بنا دی گئی ہیں: خوشبو' عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

برٹرینڈ رسل نے کہا تھا:

''اسلام کے سوا تمام اخلاقی رویوں کے ضابطوں میں جنسی تعلق سے ایک قسم کی نفرت ہے۔ اسلام نے جنسیات کے کچھ اصول وضوابط اور اُس پر پابندیاں عائد کی ہیں لیکن اس نے کبھی بھی جنس کو قابلِ نفرت اور غیر پاکیزہ معاملہ نہیں سمجھا۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ' جلد پنجم' صفحہ ۱۳۹) لندن

زمین و آسمان' اجرامِ فلکی' پودوں اور جانوروں وغیرہ کے ذکر میں قرآن مجید بڑے واضح طور پر بتاتا ہے کہ یہ سب چیزیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں لیکن یہ کہیں نہیں کہتا کہ عورت انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ عورت کی حیثیت کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا:

هُنَّ لِبَاس '' لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاس '' لَّهُنَّ (البقرة : ۱۸۷)

''وہ عورتیں تمہارے لئے اور تم اُن کے لئے لباس ہو۔'' (۱۸۷ : ۲)

اس قرآنی بیان کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے مستقل اور ناقابلِ جدا ساتھی کے طور پر کام آتے ہیں۔ قرآن زندگی میں اُن کی باہمی وابستگی کی حقیقت پر زور دیتا ہے اور یہ کہ ایک دوسرے کے بغیر نا تمام اور ادھورا ہے کیونکہ اسلام اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ جنسی جبلّت ایک انتہائی عضویاتی ضرورت ہے۔ اس طرح قرآن مجید میاں بیوی کے باہمی تعلق کی فطرت اور دائرۂ عمل کا خلاصہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مرد کی زندگی میں کئی خوابیدہ پہلو ہیں جنہیں عورت کے ذریعے ہی فعّال اور روشن کیا جاسکتا ہے اور عورت کی زندگی کے کئی پہلو مرد کے بغیر ادھورے ہیں۔ اکملیت اور اِتمام نفرت' غصّہ یا ٹانگ کھینچنے کے ذریعے نہیں بلکہ باہمی محبت وشفقت اور باہمی تعاون کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ سورۃُ الرّوم کی آیت ۲۱ اِزدواجی تعلقات کے مقصدِ اصلی کی پوری طرح وضاحت کرتی ہے جس کا حوالہ نیچے دیا جارہا ہے۔

(۴) زمانۂ ماضی میں عورت کے متعلق ایک اور توہین آمیز خیال یہ تھا کہ اُسے ناگزیر اور ضروری بدی سمجھا جاتا تھا۔ باوجودیکہ لوگوں نے عورت سے بہت مفاد اور فائدے حاصل کئے لیکن بہت سے لوگ عورت کو مصیبت اور بدقسمتی کا نشان سمجھتے ہوئے اُس سے نفرت انگیز طریق سے پیش آتے تھے۔ اس نظریہ کا رد کرتے ہوئے قرآن مجید سورۃ الرّوم کی مندرجہ ذیل آیت ۲۱ میں یہ مژدہ جانفزا سناتا ہے کہ عورت تو مرد کے آرام و آسائش کا ایک ذریعہ ہے:

وَمِنْ آيٰتِهٖ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کردی۔'' (۲۱:۳۰)

''یہ آیت بنیاد ہے جس پر اسلامی معاشرہ میں عورت کے مقام کو جانچا جاسکتا ہے اور جس کے بغیر کسی سماج کو اسلامی سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔'' ("Islam -- the Misunderstood Religion"..Muhammad Qutub, p.90)

''زندگی کی دوڑ دھوپ میں آدمی کی اَن تھک اور مسلسل کوششوں کا نظارہ' پسینے میں شرابور اُس کی پیشانی' اُس کا تھکا ماندہ چہرہ اور پژمردہ اعصاب بیوی میں پیار و محبت کے جذبات کو جگاتے ہیں۔ یہ اِنہی جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے جن کے تحت وہ اپنے گھر کو خوشیوں سے پُر ایک منظم پناہ گاہ بنانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ گھر کی گرم جوش اور پیار و محبت کی فضا میں اُس کے خاوند کی تھکن کی تلافی ہو جائے۔ اسی پیار و محبت کے سائے اور اسی جذبہ محبت کی تازگی میں آدمی اپنی تمام تھکن کو بھول جاتا ہے۔ بیوی کی یہ جمالیاتی حِس اور اُس کے طبعی ذوق کی شائستگی ہی تو ہے جو اُس کے خاوند اور بچوں کے لباس و اَطوار پر اثر انداز ہوتی ہے' گھر کو جاذبیت اور خوش باشی (مرفہ الحالی) کی نظر عطا کرتی ہے اور اُسے زندگی سے بھرپور اور زندہ رہنے کی پُرتپش تمتماہٹ سے سرفراز کرتی ہے۔''

(۵) عورت کے بارے میں ایک اور قابلِ نفرت نظریہ یہ تھا کہ اُسے مرد کے نطفے کا مال خانہ سمجھا جاتا تھا اور یہ کہ عورت کا کام اُس بیج (نطفے) کی حفاظت اور اُس کی نشو و نما ہے۔ بہت سی جگہوں پر قرآن مجید فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کے صنفِ نازک (عورت) کے بارے میں کسی قسم کے توہین آمیز اور قابلِ نفرت خیالات نہیں ہیں بلکہ وہ تو بڑے شدّ و مد کے ساتھ ایسے خیالات کی تردید کرتا ہے۔ اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ عورتوں اور مَردوں کے حقوق میں مماثلت کا فقدان کیوں ہے۔

<u>مساوات' نہ کہ یکسانیت</u> :عورت اور مرد کے ساتھ اسلام مساویانہ بنیاد پر سلوک کرتا ہے اور دونوں کو مساویانہ حقوق عطا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود دونوں جنسیں کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مماثل نہیں ہیں۔ قدرت نے چاہا ہی نہیں کہ اُن کی فطرت اور مزاج میں یکسانیت ہو۔ نتیجتاً یہ چیز اس بات کی متقاضی ہوئی کہ بہت سے حقوق و فرائض اور سزاؤں میں اُن میں مماثلت نہ ہو۔ اسلامی حقوق کے حامیوں اور مغربی نظام کے حامیوں کے درمیان جھگڑا مرد و زن کے حقوق کی مشابہت اور مماثلت کا ہے نہ کہ اُنْ کے مساویانہ حقوق کا۔

انسان کے حقوق و فرائض کے تعین کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کی قدرتی اور فطرتی اہلیت اور خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے۔

<u>عورت کی قدرتی جسمانی کیفیت</u> : یہ حقائق کہ مرد اور عورت دونوں انسان ہی ہیں اور اُن میں انسانی خصائص اور اقدار کا اشتراک ہے' غیر متنازعہ ہیں۔ لیکن اِنہیں اُن تفاوتوں کو جانچنے کی کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا جو اُن کے حقوق و فرائض کے درمیان ہیں۔ آغازِ کار میں ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ نظریہ ''نسوانیت'' کا مطلب کیا ہے اور اس کی بنیاد کیا ہے۔ اُن کے درمیان انتہائی اہم فرق اُن کی جنس کا ہے۔ وہ اپنے اعصابی اور دیگر نظاموں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

’’کچھ گہرے قابلِ مشاہدہ فرق ایسے ہیں جو مرد و زَن کی دونوں جنسوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کو کچھ مخصوص قسم کے فرائض اور مقام تفویض کرتے ہیں۔ عضویاتی لحاظ سے مرد کی جسمانی ساخت زیادہ وزن، قد و قامت اور ذہنی صلاحیت کی حامل ہے اور یہ حقیقت بذاتِ خود اس بات کی مظہر ہے کہ مرد کو سخت مشقت والے کاموں کے لئے بنایا گیا ہے۔‘‘

’’ذہن کا وہ حصہ جو جذبات سے متعلق ہے، عورت میں زیادہ ہے جبکہ ذہن کے جس حصے کا تعلق فکر و تدبر سے ہے، وہ مرد میں زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کے جسم میں اُن اعضاء کو رکھ دیا گیا ہے جو بچے کو اٹھانے اور اُسے اپنا دودھ پلانے کے لئے ہیں۔ یہ ایک خاص وصف ہے جس سے وہ نوازی گئی ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بچے کو دودھ پلانا اور اُس کی نشو و نما اُن کا فریضہ ہے۔ بچے کی تربیت کرنے میں قوت اور احساسات میں فراوانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بچے کی افزائش اور ہر لحہ تغیر پذیر رُجحانات کی تکمیل ہوتی رہے۔ کوئی شک نہیں کہ عورت کا کام اپنی مخصوص جسمانی خصوصیات کے حوالہ سے بچوں کی نشو و نما ہے لیکن قدرتی طور پر اُس میں بچے کے لئے شدید جذباتِ محبت و شفقت بھی ہیں۔ یہ چیز انسانی زندگی میں ہم آہنگی کے نظام کو قائم رکھتی ہے۔ یہ حقیقت کہ اُس میں محبت و شفقت کے لطیف جذبات مرد کی نسبت زیادہ شدید ہوتے ہیں، انسانی سماج کے لئے اُس کی مخصوص ذمہ داریوں کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں اور اس سلسلہ میں کسی تفصیلی دلیل دینے کی ضرورت نہیں۔‘‘

نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی مرد بہت حد تک عورت سے مختلف ہے۔ عورتیں عام طور پر زیادہ جذباتی ہوتی ہیں جبکہ مرد کی عقل و دانش اُس کے جذبات پر غالب ہوتے ہیں۔ اس تفاوت کا براہِ راست تعلق اُن کے اعصابی نظام سے ہے اور یہاں ناقدانہ عضویاتی اور نفسیاتی تجزیہ باثمر ثابت ہوسکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ مرد کا تولیدی کردار فوری ہوتا ہے جبکہ عورت کو حمل کا بار کئی ماہ تک اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر بچے کو جننے، اُس کی رضاعت اور نشو و نما کے وقت کو اس میں شامل کیا جائے تو عورت کا کردار مرد کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ حاملہ عورت کو علالتِ طبع اور آرام کی شدید خواہش کو برداشت کرنا پڑتا ہے جس میں اُسے اکثر علاج معالجے کی بھی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ڈاکٹروں کے کہنے کی رُو سے حمل کا دورانیہ بھی بیماری کی طرح ہوتا ہے۔ حمل کے تمام عرصہ کے دوران عورت کو جسمانی اور ذہنی طور پر تندرست و توانا ہونے کے ساتھ ساتھ اعصابی دباؤ اور ذہنی تناؤ، جذباتیت اور تکان و تھکن سے بھی دُور ہونا چاہئے۔ اِن تحفظات سے غفلت ماں اور بچے دونوں کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ بات بھی مشہور و معروف ہے کہ وضعِ حمل کے بعد کے چند ہفتوں تک عورت کو حسبِ معمول طبیعت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

معاشرتی معاملات میں عورت کے کردار پر قرآنی پابندی اُس کے تولیدی کردار کی وجہ سے ہے۔ خالق و قادرِ مطلق نے اُسے اس اہم فطرتی کام کو انجام دینے کی قوت سے نوازا ہے جس کے ساتھ ساتھ اس کام سے حظ اندوزی

اور لطف اٹھانا بھی اُسے عطا ہوا ہے۔ یقینی بات ہے کہ مرد کے لئے مادرانہ بوجھ کو اٹھانا نا قابلِ برداشت ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کا ہونا مرد کے لئے خوش کن ہے لیکن کیا وہ اُن صعوبتوں اور تکلیفوں کو اٹھانے کے لئے تیار ہے جو عورت اپنے بچے کے لئے اٹھاتی ہے؟ کیا وہ ماں کی طرح اپنے بچے کو پاک وصاف رکھ سکتا ہے؟ کیا وہ بچے کی خاطر اپنے آرام وسکون اور فارغ وقت کو قربان کر سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر اہم بات یہ کہ کیا وہ اِن تھکا دینے والے پُر صعوبت کاموں کی انجام دہی سے تسکین حاصل کر سکتا ہے؟

مرد عام طور پر زیادتی کرنے والا اور جھگڑالو واقع ہوا ہے جبکہ عورت اپنے احساسات اور بالخصوص اپنی ممتا میں پُر امن واقع ہوئی ہے اور یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ مادرانہ ذمہ داریاں بھی اٹھانی چاہئیں۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ بیوی کو اُن کاموں میں شریک ہونا چاہئے اور شوہر کے شانہ بہ شانہ اُن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا چاہئے جو دانائے کل ہستی نے بالخصوص مرد کو تفویض کئے ہیں۔ یہ حقیقت مرد کی تشریح الاعضاء (Anatomy) کے مطالعہ کے بعد اور بھی اہم ہو جاتی ہے اور وہ مطالعہ مرد کی جسمانی ساخت کے متعلق بتاتا ہے جن کی صلاحیت اور اہلیت کے مطابق کام اُسے تفویض کئے گئے ہیں۔

ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ تشریح الابدان دونوں جنسوں کے تشریح الابدانی اعصابی نظاموں کے مابین واقع فرق کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً تشریح الابدانی لحاظ سے مرد کا دماغ عورت کے دماغ سے زیادہ بڑا ہے۔ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے اوسطاً ایک سو گرام کم وزن کا ہے۔ اسی طرح عورت کے دماغ کا سامنے کا آدھا حصّہ مرد کے دماغ سے پچاس مکعب ملی میٹر چھوٹا ہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک دونوں جنسوں کے دماغوں کی ساخت کے اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے' ماہرینِ عضویات نے ثابت کیا ہے کہ تشریح الابدانی لحاظ سے مرد کا دماغ عورت کے دماغ سے نمایاں ہے اور اس میں اعلیٰ ذہانت اور دماغی افزائش کی علامات موجود ہیں۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حکیم مطلق خالق نے مرد وزَن کی ہر دو جنسوں کے میدانِ عمل کو مخصوص کر دیا ہے اور اُن میں سے کسی ایک کا دوسرے کے میدان میں داخل ہونا مکمل ناکامی کا موجب ہوگا۔ مثلاً مرد اپنے بچے کی نشوونما اور دودھ پلانے کا کام خود نہیں کر سکتا اور اسی طرح عورت اپنے ملک وقوم کے دفاع کی خاطر دشمن سے لڑنے کے لئے میدانِ کارزار میں نہیں جا سکتی کہ یہ فطرت کے خلاف بغاوت ہوگی۔ مرد پیدائشی لحاظ سے زیادہ توانا اور مضبوط جسم والا ہے اور اس لئے قدرتی طور پر وہی دشمن سے برسرِ پیکار ہو سکتا ہے۔ تاہم کچھ مستثنیات ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ کچھ عورتوں کا دماغ مردوں کی نسبت بڑا ہو سکتا ہے لیکن ان مستثنیات کو قانون واصول کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

کچھ مخصوص مقامات واوقات میں کچھ مسلمانوں کے اعمال وافعال سے اسلام کے ضوابط وقواعد اخذ نہیں کرنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر اگر کچھ مسلمان عورت کے حقوق کی پامالی کرتے ہیں تو اُن کی اس بے انصافی کو اسلام کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ جب مغربی تہذیب وثقافت کی پیروی میں کچھ اسلامی ممالک میں احکاماتِ

اسلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ وہاں کے قوانین اسلامی قوانین سے متفق ہیں اگر چہ لاکھوں مسلمان اُن مغربی طریقوں کے پیرو کار ہوں۔

مبالغاتی حد تک حقائق کو مسخ کرنے اور اہلِ مغرب کے غلط نظریات کو عیسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ مذہب کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ کچھ عیسائی فرقوں کے نزدیک عورت انسان ہی نہیں ہے اور یہ کہ وہ حیوانات اور نوعِ انسانی کے مابین ایک واسطہ ہے اور یا یہ کہ (مریم علیہا السلام کے علاوہ) عورت کی روح دائمی نجات کی مستحق نہیں ہے بلکہ دائمی نجات کا حق صرف مرد کو حاصل ہے لیکن اِن دُور از کار مفروضات کو عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اُس اَخلاقی بگاڑ اور عصمت فروشی کو جس کا آج دنیائے مغرب پر راج ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے تعارف کردہ مذہب عیسائیت کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہوگا۔

نوعِ انسان کی مساوات : قرآن مجید ایک سماجی انصاف کے ضابطے کے اندر تمام نوعِ انسان کی مساوات کو واضح کرتا ہے جو عورتوں اور مَردوں کو ایک جیسے بنیادی حقوق عطا کرتا ہے۔ سورۃ الحُجُرات کی آیت ۱۳ کا خطاب تمام نوعِ انسان سے ہے اور وہ دو نکات سے نوعِ انسان کی وحدت پر زور دیتا ہے: اوّل تو یہ کہ تمام بندگانِ خدا پیدائش، مقام، قومیت اور جنس سے قطع نظر ایک ہی سطح پر ہیں۔ دوم یہ کہ تمام انسان ایک ہی جدِّ اعلیٰ سے ہونے کے ناطے سے اللہ کی نظروں میں برابر ہیں اور یہ کہ اللہ کی نظروں میں سب سے زیادہ متقی اور خدا خوفی رکھنے والا روالی زیادہ معزز و مکرّم ہے۔

جنس سے قطع نظر مساواتِ انسانی پر زور دیتے ہوئے اللہ اپنے بندوں کو یوں یقین دہانی کراتا ہے :

(۱) لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (آلِ عمران : ۱۹۵)
''میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں ہونے دیتا، تم آپس میں ایک دوسرے کے جز ہو۔'' (۱۹۵ : ۳)

یعنی چونکہ انسانیت دونوں میں مشترک ہے اس لئے دونوں کا حکم بھی مشترک رہے گا اور جنسِ مذکر و مؤنث سے عمل و اجرِ عمل پر مطلق اثر نہیں پڑے گا۔ عملِ عامل کے لحاظ سے ہر عامل یکساں ہے۔

(۲) وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ○ (اَلنِّساء : ۱۲۴)
''اور جو کوئی نیک عمل کرے (خواہ) وہ مرد ہو یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان ہو تو ایسے (سب) لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن پر ذرّہ بھر ظلم نہیں ہوگا۔'' (۱۲۴ : ۴)

(۳) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النّحل : ۹۷)
''جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہو تو ہم اُسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔'' (۹۷ : ۱۶)

محولہ بالا آیات میں بیان کردہ اصول کی بنیاد پر قرآن دونوں جنسوں کو قانونًا برابر کے حقوق عطا کرتا ہے اور اس لحاظ سے وہ صنفِ نازک کو بھی وہی مساویانہ حقوق دیتا ہے جو وہ مَردوں کو دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا :
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ : ۲۲۸)
''اور عورتوں کا بھی دستورِ شرعی کے موافق حق ہے جیسا کہ عورتوں پر فرض ہے۔'' (۲۲۸ : ۲)

اسی طرح قرآن مجید میں عورتوں اور مَردوں دونوں کو جگہ جگہ خبردار کیا گیا ہے کہ احکامات وفرامینِ الٰہی کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں اُنہیں قیامت کے دن بُرے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا (سورۃ الاحزاب: ۳۶)۔

''یہ اور اس قسم کی دیگر قرآنی آیات اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں کہ تمام معاملات میں عورت کے ساتھ بھی اُسی سطح کا رویّہ ہے جو مَردوں کے ساتھ ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو بھی وہی معاشرتی، قانونی اور اقتصادی حقوق حاصل ہیں جو مَردوں کو حاصل ہیں۔ حقوقِ نسواں سے متعلق صدیوں پہلے اِس صاف طور پر واضح اور بیباکانہ اعلان کی نظیر دوسرے کسی الٰہی دین کے صفحات میں نہیں ملتی۔ اس کا موازنہ بائبل سے کیجئے جو حضرتِ حوّا (سلام اللہ علیہا) کی غلطی کی سزا کے طور پر عورت کو اس کے شوہر کا غلام بنا دیتی ہے جسے اُس پر حکومت کرنی ہے۔''

''عہد نامہ عتیق (تورات) کی رُو سے مرد کی تنزلی کا سبب عورت ہے اور یہ عقیدہ عیسائیت کی تعلیم کا سنگِ بنیاد بن گیا۔۔۔ یہ حقیقت قابلِ ذکر ہے کہ انجیل میں طلاق کی ممانعت کے ضمن میں ایک لفظ بھی عورت کی طرف داری میں نہیں ہے۔ سینٹ پال کے مکتوبات یقینی طور پر اس بات پر مُصر ہیں کہ عورت کے مقام میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں ہے۔ سینٹ جروم کا کہنا ہے کہ ''عورت شیطانیت کا دروازہ'' اُس کی شاہراہ اور بچھو کا ڈنگ ہے۔'' کلیسائی قانون کا اعلان ہے: ''صرف مرد کو الٰہی شکل پر پیدا کیا گیا ہے' عورت کو نہیں۔ لہٰذا عورت کو مرد کی خدمت کرنا ہوگی اور اُس کی ماما اور پیش دست عورت (Handmaid) بنا ہوگا۔'' چھٹی صدی عیسوی میں میکان کی صوبائی مجلس اس سوال کو بڑے ہی سنجیدہ طور پر زیرِ بحث لائی کہ آیا عورت میں روح ہے بھی کہ نہیں۔'' ("Psychopathia Sexualis" ... Krafft Ebing, p. 2 : 12th Edition, quoted in Majidi, p. 36-B, N.513)

اُن لوگوں کی تعلیمات کو سامنے لائیں جو عورت کے حقوق کو استحصال کرنے کا الزام قرآن پر دھرتے اور اسے بدنام کرتے ہیں اور پھر اس قرآنی اعلان کو بھی پڑھیں: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ: ۲۲۸) یعنی ''عورتوں کا بھی دستورِ شرعی کے موافق حق ہے جیسا کہ عورتوں پر فرض ہے۔'' اور پھر خود ہی فیصلہ کریں کہ وہ اپنے موقف میں کس حد تک درست ہیں۔

۱۳۸۴ (تحریک آزادیِ نسواں---FEMINISM)

تاریخ کے دھارے میں یہودیت کے مذہبی پیشواؤں اور عیسائی باباؤں کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ :

''عورت کو بدی کے دروازے اور تمام انسانی بیماریوں کی جڑ کے طور پر پیش کیا گیا۔ اُسے اس خیال سے ہی شرم آنی چاہئے کہ وہ عورت ہے۔'' ("History of European Morals"... Lecky, Vol. II, p. 142)

<u>یہ بات واقعی بڑی حیران کن ہے کہ عورت عیسیٰ علیہ السلام جیسی برگزیدہ ہستی کو جنم دینے کے باوجود شیطان کے داخلے کی راہ اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کی نظروں میں ایک ناگزیر بدی بن گئی !!</u>

ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عورت کے متعلق اِن سب خانہ ساز اور دُور از کار نظریات کی دھجیاں بکھیر دیں اور یہ زور دیتے ہوئے اُسے معاشرے میں نمایاں طور پر باوقار اور باعزت مقام عطا کیا کہ :

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ بِأَهْلِيْ (ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہے اور میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ تم سب سے اچھا ہوں۔''

گھر ایک چھوٹی سی ریاست کی مانند ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی ریاست کو خوش آئند اور خوشگوار طور پر چلانے کے لئے شوہر (مہربان) حکمران ہے' اُس کی رفیقۂ حیات اُس کی وزیر کے طور پر کام کرتی ہے اور اُن کے بچے اُس چھوٹی سی ریاست میں باشندوں کی مانند ہیں۔ چونکہ اس چھوٹی سی ریاست (گھر) کا انتظام صرف گھر کے حاکم (شوہر) کے کندھوں پر ہے اور وہ ہی اپنی رعایا کی خوراک بہم پہنچانے اور روٹی کمانے کا ذمہ دار ہے اور بعض حالات میں صنفِ نازک (بیوی) کے تحفظ کی ذمہ داری بھی اُسی کے کندھوں پر ہے' لہٰذا عقل و دانش کا تقاضا تھا کہ اُسے اُن پر یک گونہ درجہ حاصل ہونا چاہئے اور اُسے اس درجہ اور مقام کا عطا کیا جانا حکیم و دانائے کل اللہ کی جانب سے ہے جیسا کہ اُس نے فرمایا:

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥ (البقرۃ : ۲۲۸)

''اور مردوں کو اُن پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے اور اللہ بڑا ہی زبردست' بڑی حکمت والا ہے۔''

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ کی آخری کتاب (قرآنِ حکیم) عورتوں کے حقوق کی نہ صرف طرفداری کرتی ہے بلکہ مکمل طور پر اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی جنس کے موافق مرد کے شانہ بہ شانہ برابر کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے لیکن اس سے دونوں جنسوں کی قطعی مساوات کی جدید خام خیالی کو تقویت نہیں ملتی کیونکہ حقوق اور مواقع کی مساوات اور چیز ہے اور یکسانیت یا مماثلت اور چیز ہے۔

۱۳۸۵ (تحریک آزادیٔ نسواں ـ ـ ـ FEMINISM)

یورپ کے دو مشہور و معروف ماہرینِ حیاتیات کی یہ رائے ہے کہ:

''یہ بات بالعموم درست ہے کہ مرد زیادہ چاق و چوبند' مستعد' سرگرم' پُرولولہ اور تغیر پذیر ہوتا ہے جبکہ عورت زیادہ بے عمل' جامد' روایت پسند' سست اور اپنی دُھن کی پکی ہوتی ہے۔'' ("Evolution of Sex" ... Thompson and Geddes, p. 289)

''طاقت اور علم کا ذوق و شوق' فنی تکمیل کی جستجو بالعموم مردانہ خصوصیات ہیں۔'' ("Man and Woman" ...Havelock Ellis, p. 454)

Cheyne and Black's Encyclopaedia Biblica کے الفاظ میں یقیناً یہ قرآن مجید نہیں بلکہ بائبل ہے جو مرد کو عورت کا مالک اور عورت کو اُس کا اثاثہ اور مملوک بناتی ہے۔

مرد اور عورت بنیادی طور پر ایک جیسے ہیں' تاہم نوعِ انسانی کو قائم رکھنے اور اُس کے تسلسل کے لئے انسان حیاتیاتی طور پر مختلف طور پر پیدا کئے گئے ہیں۔ صرف عورتیں ہی بچوں کو جنم دینے (تولیدی) کا کام اور اُن کی پرورش کر سکتی ہیں اور اس طرح قرآن مجید میں شوہر کو اپنی بیوی کو مادّی امداد مہیا کرنے کا حکم ہوا۔ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں فرمایا گیا:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ

''مرد عورتوں کے سردھرے ہیں اس لئے کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس لئے بھی کہ مَردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔'' (۴ : ۳۴)

انسانیت کے بالعموم اور صنفِ نازک (عورت) کے بالخصوص محسن' قرآن مجید اور پیغمبر ﷺ کی شکل میں منظرِ عام پر اُس وقت آئے جب تمام عالم میں عورت ظلم و جبر' تشدّد اور استبداد کی چکی میں بری طرح پس رہی تھی' معاملاتِ حیات بلکہ اپنی ذات کے بارے میں اُس کی کوئی آواز نہ تھی۔ اُس کی حیثیت فروخت ہونے والی شے سے زیادہ نہ تھی جسے اُس کا مالک جب بھی چاہے' فروخت کر دے۔

کارزارِ حیات میں برابر کے شریک : معاشرے اور اس کی تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں عورت اور مرد دونوں برابر کے حصّہ دار ہیں۔ انسانی تہذیب کے تمام مرحلوں میں شر اور بدی کی قوّتوں کے خلاف وہ دونوں مل کر نبرد آزما ہوتے ہیں اور صداقت کی کامیابی و کامرانی کے لئے وہ مشترکہ طور پر کوشاں ہوتے ہیں۔ قرآن مجید مؤمن مَردوں' عورتوں اور غیر مؤمن مَردوں' عورتوں کے درمیان اس جدّ وجُہد کو یوں بیان کرتا ہے:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ ـ ـ

۱۳۸۶ (تحریک آزادیِ نسواں---FEMINISM)

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
(التّوبة : ۶۷، ۷۱)

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی طرح کے ہیں، بُری بات کا حکم دیتے رہتے ہیں اور اچھی بات سے روکتے ہیں ---اور ایمان والے اور ایمان والیاں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں، نیک باتوں کا حکم دیتے رہتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے رہتے ہیں۔'' (۹:۷۱،۶۷)

آیت ۷۱ میں واضح طور پر مضبوط بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر میں مرد و زَن کی مساوی کوششوں کا بیان ہے۔ انسانی ثقافت و تہذیب کے ارتقاء کے تمام مراحل مرد و زَن کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ انسانی سماج اور اس کی ثقافت کی تعمیر میں اکٹھے مل کر کام کرتے ہیں، اکٹھے حصّہ دار بنتے ہیں اور مساوی طور پر اُس کے مدد و معاون بنتے ہیں۔ لہٰذا اُن میں سے کوئی بھی دوسرے سے کسی بھی طرح فائق یا کمتر نہیں ہے۔'' ("Woman in the Islamic Society"... Sayyed Jalalud Din Ansar Umari)

اسلامی معاشرے میں مرد و زَن کے حقوق و فرائض کے مابین ایسا خوش آئند توازن ہے کہ نہ تو عورت کو اپنی کمزوری کی کسی موقع پر شکایت ہوتی ہے اور نہ ہی مرد عورت پر اپنی فوقیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ عورت کے حقوق غصب ہونے کی صورت میں اسلام اُسے اُس کے حقوق دلانے میں گرم جوشی کے ساتھ اُسی طرح مستعد رہتا ہے جس طرح وہ دوسروں پر زیادتی اور تشدّد کی صورت میں اُن کی مدد کرتا ہے۔ اگر کوئی کسی عورت کو قتل کرتا ہے تو وہ سزا سے بچ نہیں سکے گا اور اُسے مہیب نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اہلِ یمن کو ضابطۂ قانون بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ ''عورت کے قاتل کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔'' (السنن الکبریٰ للبیہقی، ج ۸، ص ۲۰۸)

مستند فقہائے اسلام اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ قصاص میں مرد و زَن میں کوئی فرق نہیں (ایضاً ص ۸) پیغمبر علیہ السلام کے دَورِ مبارک میں ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر کچل کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تو نبی اکرم ﷺ نے اُس سے اُسی طرح کا قصاص لینے کا حکم صادر فرمایا۔ (نَیلُ الاوطار، ج ۷، ص ۱۶۰)

اسلام اس بات کو بخوبی سمجھتا ہے کہ ازدواجی زندگی کی خوشی اور مسرّت کا راز معمولی معمولی باتوں پر تنقید کرنے یا تنگ نظری میں نہیں ہے بلکہ اپنے رفیقِ حیات/رفیقۂ حیات کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو فیاضانہ طور نظر انداز کرنے اور معاف کر دینے میں ہے۔ شوہروں کو اپنی بیویوں سے مہربان اور خوش اخلاق رہنے کا حکم دیتے ہوئے قرآن نے فرمایا: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النّساء : ۱۹) (بیویوں کے ساتھ عمدہ بود و باش رکھو)۔

مَردوں کا اپنی بیویوں کے ساتھ تعلق میں اسلام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اُن کی کوتاہیاں اور فروگزاشت برداشت اور نظر انداز کی جائیں اور اُن کے ساتھ رواداری کا رویہ قائم کیا جائے۔ اس حقیقت کو حیاتیاتی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو ذیل کا حوالہ دیکھ لیجیے :

''عورتیں کبھی بھی اِن مجبوریوں پر قابو نہ پا سکیں گی جو اُن کی جسمانی فطرت میں بہت گہری حد تک گڑی ہوئی ہیں۔۔۔ جو کوئی بھی عورت کی نفسیات اور حیاتیات سے واقف ہے' وہ اُس کی کیفیتِ مزاج میں اچانک تبدیلی' مزاج کے غیر معقول اشتعال اور اُس کے بلا مقصد افعال سے ناراض نہیں ہوگا اور غصہ نہیں کرے گا اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے مرد' عورت کے اُن تولیدی خلیوں کے حاملین سے گہری ہمدردی کرے گا جن میں زندگی کی امنگ اور تڑپ ہے اور جنہیں کافی مشکل حیاتیاتی امور سے زیر بار کیا جاتا ہے۔'' ("Biological Tragedy of Women" ... Nemilov, pp. 187, 188)

اسلام میں اِزدواجی بندھن کا نمایاں اور اہم مقصد میاں بیوی میں خوشی اور شادمانی کا لانا اور پیار و محبت' دوستانہ ربط' ذمہ دارانہ رفاقت اور زوجین میں عمدہ ہمراہی پیدا کرنا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بار بار کی کوششیں اور حسنِ نیت زوجین کے اکٹھا رہنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں تو ایسے موقع پر نکاح کے بندھن کو کھول دینا ہی اس کا واحد علاج ہے۔ میاں بیوی کی باہمی جدائی کے اس موقع پر بھی جب انسانی جذبات عروج پر ہوتے ہیں' خاوند کو قرآن نے حکم دیا کہ وہ جذباتیت کے اشتعال سے مغلوب ہوتے ہوئے بیوی کو اپنی زندگی سے بے عزتی سے یا اُسے ذلیل کرتے ہوئے نہ نکالے بلکہ وہ اپنے فراخدلانہ حوصلہ اور بیوی کی لطافت و نفاست کے پیشِ نظر اور اس بات کو ثابت کرتے ہوئے کہ وہ رحمۃ للعالمین ﷺ کا اُمتی اور تمام اُمتوں میں سب سے بہتر اُمت (خیر الامم) کا فرد ہے' اپنی مطلقہ سے مہربانی اور حسنِ اخلاق سے پیش آئے (بحوالہ آیات ۲۲۹' ۲۳۱ سورۃ البقرۃ)

شادی ہونے پر عورت اپنی انفرادیت کو کھو نہیں بیٹھتی۔ وہ اپنی ذات اور اپنی جائداد سے متعلق تمام معاملات میں اپنے خاوند یا والد کی مداخلت کے بغیر اپنا حق استعمال کر سکتی ہے۔ طلاق کی صورت میں خاوند کو کسی بھی صورت میں اُس سے مہر کو واپس لینے کی اجازت نہیں ہے جو اُس نے اُس کی عزت و تکریم کی خاطر اُسے دیا تھا (بحوالہ سورۃ النّساء : آیت ۲۰)۔ نکاح کے بندھن کو قائم رکھنے کی صورت میں بھی خاوند کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اشارتاً بھی بیوی سے کل مہر یا جزوِ مہر واپس لینے کو کہے۔ بلکہ اُسے شادی کے موقع پر مہر کو خوش دلی اور آزادانہ رضامندی سے ادا کرنے کو کہا گیا ہے (بحوالہ سورۃ النّساء : آیت ۴)۔

عورت کو مرد کے برابر تسلیم کیا جانا ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔ دولت کمانے کا حق جس طرح مرد کو حاصل ہے' اُسی طرح عورت کو بھی ہے۔ مرد بھی اپنی کمائی ہوئی دولت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اُس میں اپنی مرضی سے تصرّف کر سکتا ہے اور اُس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اس طرح عورت کو بھی یہ حقوق حاصل ہیں۔ وراثت میں مرد کی طرح اُس کا بھی حصّہ ہے۔ اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو قرآنی اجازت کے اندر رہتے ہوئے وہ کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتی ہے۔ قرآنِ حکیم کے مندرجہ ذیل اعلان سے مرد و زَن میں جو بے جا تفریق صدیوں سے قائم تھی' اُس کا قلع قمع ہو گیا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ "مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ" مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النّساء : ۳۲)

''مردوں کے لئے اُس سے حصّہ ہے جو اُنہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے اُس سے حصّہ ہے جو اُنہوں نے کمایا۔'' (۴ : ۳۲)

۱۳۸۸ (تحریک آزادیِ نسواں ۔۔۔FEMINISM)

ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے آزادیِ نسواں کی عالمی تحریک کو تاریخ کی ایک نئی لہر کا رُخ ملا۔ آپ ﷺ بطور ایک نجات دہندہ کے اور آزادیِ نسواں کی پُر زور حمایت کرنے والے کے طور پر نمودار ہوئے جب آپ نے یہ فرمایا: اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ (جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے)۔

حجۃ الوداع کے اپنے مشہور خطبہ میں آپ نے بیویوں کے ساتھ حسنِ اخلاق اور عمدہ رویہ سے پیش آنے پر خاصا زور دیتے ہوئے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوْهُنَّ بِأَمَانَةِ اللهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَاتِ اللهِ. أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَاءِ كُمْ حَقًّا وَ لَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا وَ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُوْنَهٗ وَ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فَإِنْ فَعَلْنَ فَإِنَّ اللهَ قَدْ أَذِنَ لَكُمْ أَنْ تَهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ تَضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَ لَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (السيرة النبوية لابن هشام، ج ۴، ص ۲۵۱؛ مظاہر حق (شرح مشکوٰۃ المصابیح اردو) از قطب الدین، ج ۲، ص ۳۵۰)

''لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ کا خوف رکھو۔ تم نے اُنہیں نکاح میں اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اُن کے جسموں کو اللہ کے نام سے حلال کیا ہے۔ لوگو! تمہارا اپنی بیویوں پر حق ہے اور اُن کا تم پر حق ہے۔ تمہارا اُن پر حق یہ ہے کہ وہ کسی ایسے کو تمہارے بستر پر نہ آنے دیں جنہیں تم پسند نہیں کرتے۔ اُن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کوئی بے حیائی کا کام نہ کریں۔ اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو اللہ نے تمہیں اُن کے بستروں سے علیحدہ ہونے کی اجازت دی ہے۔ تم اُنہیں ہلکی مار بھی مار سکتے ہو جس کا نشان اُن کے جسموں پر نہ پڑے۔ اُن کا تم پر یہ بھی حق ہے کہ اُنہیں بھلے طریق سے لباس پہناؤ اور خوراک مہیا کرو۔''

ایک حدیثِ مبارکہ میں عورت کو مرد کا جزو کہا گیا ہے کہ اُن میں سے کوئی تو ماں اور کوئی بیٹی یا بہن ہے اور کوئی شخص اپنے جسم کے کسی حصے کو بے آرامی نہیں دینا چاہتا۔ اُن کی عزت و تکریم اور اُن سے مہربانی اور حسنِ اخلاق سے پیش آنا مرد کا اوّلیں فرض ہے۔ معاشرہ صرف اُسی صورت میں امن و سکون اور خوشی و مسرت کی زندگی گزار سکتا ہے جب اہلِ خانہ اور بالخصوص زوجین میں پیار و محبت اور ایثار و قربانی کی فضا قائم ہو۔

<u>لفظ ''عَورَة'' کا مفہوم</u>: عربی زبان میں خاتون کے لئے ''عَورَة'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب جسم کا وہ حصہ ہے جس کا غیر محرم کو دکھانے کی شدید ممانعت ہے۔ اس سے مراد جسم کا وہ حصہ بھی ہے جو از راہِ شرم و حیا دوسروں سے چھپایا جاتا ہے (بحوالہ سورۃ النور: آیات ۳۱، ۵۸)۔ عربی زبان میں لفظِ ''عَورَة'' کا ایک مطلب وہ چیز بھی ہے جو آنکھ میں دُکھن پیدا کرے۔ (''لسان العرب'' لابن منظور الافریقی؛ ''تاج العروس من جواهر القاموس'' للزبیدی؛ ''مفردات القرآن'' لامام راغب اصفہانی)

سورۃ النور کی آیات ۳۱، ۵۸ اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۳ اس بات کی پُر زور تائید کرتی ہیں کہ

''عَورَة'' کے لفظ کو عزت وتکریم اور حفاظتی چیز کے طور پر لیا گیا ہے۔اور یہ بات اس حقیقت کو بالکل شفاف اور عیاں کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اِس نفیس ولطیف مخلوق کی بہر صورت حفاظت ہونی چاہئے جب بھی کوئی غیر مجاز آنکھ عورت کے کسی حصے پر نگاہ ڈالے کیونکہ اس کا نتیجہ آنکھ کے اُس زخم کی طرح پریشان کن ہلکوروں کی صورت میں نکلتا ہے جس سے کوئی چیز ٹکراتی ہے۔لہٰذا کسی نوجوان لڑکی یا عورت کے مخفی حصّوں کو کسی بالغ مرد کا دیکھنا شہوانی جذبات کو ابھارنے کا سبب بنتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر معاشرتی اور اخلاقی بے راہروی کی صورت میں نکلتا ہے۔اگر ان بدافعال کی شروع ہی سے بندش کر دی جائے تو اسلامی معاشرہ غیر شریفانہ نتائج سے محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ آگ بھڑکا کر اُسے بجھانے کی ناکام کوشش سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ آگ لگانے کی حماقت کی ہی نہ جائے۔یہی وہ دانشمندانہ مصلحت ہے جس کی رُو سے قرآن مجید مسلمان مَردوں اور عورتوں کو سورۃ النور کی آیات ۳۰'۳۱ میں اپنی نگاہیں جھکائے رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

حجاب (پردہ): سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں مسلم خواتین کو اپنی گردنیں' کان اور چھاتیوں کے چھپانے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔اس الٰہی حکم کے نازل ہونے پر مسلم معاشرہ نے فوراً اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے تابع کر دیا۔اس دوران ایک مرتبہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حفصہ بنت عبدالرحمن بن ابی بکر نامی بھتیجی سر کو ایک باریک رومال سے ڈھانپے آپ سے ملنے آئیں۔سیدہ عائشہ نے اُن سے ناراض ہوتے ہوئے ایسا موٹا پردہ پوش (Cover) پہننے کو کہا جو حجاب کے اصل مقصد کو پورا کر سکے۔

جدید دخترانِ اسلام کو سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کس حد تک اسلام کے وقار اور نام کی سربلندی میں کوشاں ہیں اور یہ کہ وہ پردہ اور حجاب کے بارے میں اسلام کے سخت قوانین کی کس حد تک پابند ہیں۔

عورت کا اصلی میدانِ عمل: مندرجہ بالا توضیحات سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ مسلمان خاتون کا اصلی میدانِ عمل کیا ہے۔قرآن مجید عورت کے میدانِ عمل کا وضاحت کے ساتھ ان الفاظ میں تعین کرتا ہے:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (الاحزاب : ۳۳)

''اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور جاہلیتِ قدیم کی طرح اپنے آپ کو دکھاتی مت پھرو۔'' (۳۳ : ۳۳)

اس حکم سے مقصود عفت و پاکدامنی ہے اور اگر کوئی فاحشہ عورت باوجود اپنی فحش کاری کے پردہ کرتی ہے تو وہ اس حکم کی نافرمان ہی کہی جائے گی (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۸۴۷' نوٹ:۶۲)

اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ بات زیادہ اہم ہے کہ عورت اجتماعی نمازوں اور دیگر بیرونِ خانہ سرگرمیوں میں جانے کی بجائے اپنے گھر ہی میں رہے۔سماجی پروگراموں سے اُس کا دُور رہنا معاشرے کے لئے اتنا نقصان دِہ نہیں جتنا اُس کا اپنے مرکز (یعنی گھر) کو چھوڑ دینا مضر ہے۔اجتماعی نمازوں میں اس کے حاضر نہ ہونے کے فائدے کے ضیاع کی تلافی اور بھی کئی طریقوں سے ہو سکتی ہے لیکن اُس خلا کو کسی اور طرح پُر نہیں کیا جا سکتا جو اُس کے اپنے مرکز

(گھر) کو چھوڑ دینے میں پیدا ہوتا ہے۔اسی لئے عورت پر عبادات اور زندگی کے دوسرے فرائض اجتماعی شکل میں عائد نہیں کئے گئے۔ مثلاً عبادت کی انتہائی اہم شکل نماز ہی کو لیجئے۔مرد کے لئے اس کی ادائیگی اجتماعی شکل میں لازم ہے لیکن عورت کے لئے فرض ہونے کے باوجود اجتماعی نماز فرض نہیں ہے۔اگر مرد بغیر کسی معقول وجہ کے اجتماعی نماز ادا نہیں کرتا تو وہ شریعت کی نگاہ میں قابلِ ملامت اور قابلِ سرزنش ہے۔اس کے برعکس عورت کو اپنے گھر کے کسی کونے میں نماز ادا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکا کرو لیکن اُن کے گھر اُن کے لئے بہتر ہیں۔''(ابوداؤد)

آپ نے یہ بھی فرمایا:

''عورتوں کے لئے عبادت کی بہتر جگہیں اُن کے گھروں کے اندرونی حصّے ہیں۔''(مُسند احمد' ج ٦)

ابوحمید ساعدی کی بیوی بارگاہِ نبوی میں آئیں اور عرض کیا:

''یارسول اللہ! میں آپ کے ساتھ نماز ادا کرنا چاہتی ہوں' آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے جواب دیا: مجھے یقین ہے کہ یہ تمہاری آرزو ہے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا گھر کے کسی تنگ کونے میں نماز ادا کرنا کسی وسیع وفراخ کمرے میں ادا کرنے سے بہتر ہے' تمہارا کسی کمرے میں نماز ادا کرنا گھر کے وسط میں ادا کرنے سے بہتر ہے' تمہارا گھر میں نماز ادا کرنا کسی قریبی مسجد میں ادا کرنے سے بہتر ہے اور تمہارا کسی قریبی مسجد میں نماز ادا کرنا میری اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔''(مسند احمد)

راوی بیان کرتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی نصیحت کا ابوحمید ساعدی کی بیوی پر اس قدر اثر ہوا کہ اُنہوں نے اپنے گھر میں نماز کے لئے ایک تنگ کونہ بنالیا تھا جہاں وہ باقی تمام عمر نماز ادا کرتی رہیں۔(ایضاً)

''پیغمبر ﷺ کی عورت کو مسجد کی بجائے گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید معاشرے میں عورت کے اسلامی کردار کو ظاہر کرتی ہے کہ اُسے ہمیشہ اپنے مرکز میں اپنے آپ کو پابند رکھنا چاہئے بالخصوص جبکہ اس کے بچے بھی ہوں اور جہاں تک ہوسکے بغیر کسی جائز اور ہنگامی ضرورت کے اُسے بیرونِ خانہ نہیں جانا چاہئے۔درحقیقت امورِ خانہ داری بذاتِ خود اُس کی آزمائش کا میدان ہیں اور اپنے خاوند' بچوں اور رشتہ داروں کے لئے ہمدردی' شفقت و الفت اور امداد اُس کے ایمان ویقین کا ثبوت ہیں۔''

''یہ اِقدام بھی سماج کو گندے خیالات اور فحش واقعات سے بچانے اور صاف ستھرا رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور اُسی کے ساتھ ساتھ دونوں شرکائے حیات کے درمیان اُن کی فطری صلاحیتوں اور اہلیتوں کی بنیاد پر تقسیمِ کار کے ذریعے معاشرے میں حُسنِ کارکردگی (Efficiency) کو بھی قائم رکھنا ہے۔''

''نمازِ جمعہ نہ صرف سماجی جذبے کی آئینہ دار ہے بلکہ افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور اُنہیں اسلامی تعلیمات و احکامات سے متعارف کرانے کا بھی ایک ذریعہ ہے لیکن عورت کو اس اہم اجتماعی شکل سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''سوائے غلاموں' عورتوں' چھوٹے بچوں اور بیمار لوگوں کے نمازِ جمعہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' (ابوداؤد)

عورت اپنے گھر کی نگران (Custodian) ہے: زمانہ قبل از اسلام میں عورت کو کوئی سماجی مقام حاصل نہ تھا اور وہ مرد کے رحم و کرم پر تھی۔ اُنہیں داشتہ بنا کر بے رحمی سے قید میں رکھا جاتا تھا اور کسی بھی وقت بغیر کسی حقیقی وجہ کے گھر سے نکال باہر کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے اُنہیں کئی حقوق عطا کئے اور اُن کا سماجی مقام بلند کیا۔ اِس ضمن میں ایک حدیثِ نبوی یوں ہے:
''اپنے خاوند کے گھر میں بیوی خاوند کے بچوں پر حکمران کی طرح ہے۔'' (صحیح بخاری' جلد اوّل؛ فتح الباری لحافظ ابن حجر عسقلانی' جلد ۱۳؛ سنن الکبریٰ للنسائی' جلد پنجم)

مندرجہ ذیل حدیث خاوند کے گھر میں اُس کے مقام کو واضح کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
''بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو وہ تمہیں خوش کرے' جب تم اُسے حکم دو تو تمہاری اطاعت کرے اور تمہاری عدم موجودگی میں اپنی عزت اور تمہارے مال کی حفاظت کرے۔'' (''جامع البیان'' للطبری' جلد چہارم' صفحہ ۹۹)

حقوقِ نسواں کی حفاظت: اسلام نے معاشرے میں عورت کو اُس کے جائز حقوق دے کر اُنہیں ہر قسم کے غاصبانہ اِقدام سے محفوظ کر دیا ہے۔ مثلاً خوراک میں اُن کا حق ہے جس کا فراہم کرنا تمام تر خاوند کی ذمہ داری ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۲۲۸؛ سورۃ النساء: ۳۴)۔

لفظ ''قوّام'' کی وضاحت: سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں لفظ ''قوّام'' کا ترجمہ ''محافظ'' اور ''دیکھ بھال کرنے اور سہارا دینے والا'' کے کئے گئے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس قرآنی لفظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اس کا مطلب ایسا شخص ہے جو کسی چیز یا شخص کی ضروریات کو پورا کرے' اُس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو اور اُس کی اصلاح اور صحیح مقام کو عمل میں لائے۔ جس طرح فوج کا ایک کمانڈر اور ریاست کا ایک حکمران ہوتا ہے جو ایک خاص نظام کو تعمیل کے لئے قائم رکھتا ہے' اسی طرح گھر بھی ایک (چھوٹی سی) ریاست کی مانند ہے جس کا اُصولی طور پر ایک سربراہ ہونا چاہئے جو اراکینِ خانہ کی ضروریات کی تسکین کا ذمہ دار ہو اور وہ دیکھے کہ کنبہ ایک پُرمسرت زندگی گزار رہا ہے۔ اگر خاندان کا سربراہ مناسب کنٹرول اور نگرانی نہیں کر سکتا تو تمام عائلی زندگی پارہ پارہ ہو کے رہ جائے گی جس سے ناگفتہ بہ مصائب اور حادثات کی راہ کھل جائے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِن فرائض کا ذمہ دار کون ہو؟ اس کے لئے ماں اور باپ دو اُمیدوار ہیں۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ باپ میں اس فرض کو نباہنے کی

دو وجوہ کے باعث اہلیت و استعداد زیادہ ہے: ایک وجہ الٰہی عطیہ ہے اور دوسری کسبی ہے۔ الٰہی عطیہ کی رُو سے مرد مسلّمہ طور پر جسمانی قد و قامت، توانائی، ذہنی فوقیت، دانشمندی اور دُور بینی میں عورت کی نسبت بہتر ہوتا ہے۔ دوسری نمایاں خصوصیت جو اُسے خاندان کا سربراہ بناتی ہے، یہ ہے کہ اُسے خاندان کی جملہ ضروریات کی تکمیل کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ عورت کی نسبت مرد ان تقاضوں کو پورا کرنے کا زیادہ اہل ہے۔

علامہ واعظ کشفی سورۃ النساء کی آیت ۳۴ کی تشریح میں لکھتے ہیں: (متنِ آیت کا حوالہ بر صفحہ ۱۳۸۵)

''مردوں کو عورتوں پر غلبہ حاصل ہے کیونکہ وہ عورتوں کو سماجی برتاؤ اور طرزِ عمل سکھاتے ہیں۔ مَردوں کو عورتوں پر علم، تحمّل و بُردباری، فہم و فطانت، جہاد میں شرکت کے فرض، نمازِ جمعہ کے اجتماع میں شرکت اور لوگوں کو نماز کی طرف بلانے میں فضیلت حاصل ہے۔ جمعہ کا خطبہ مرد ہی دیتے ہیں، کفن دفن کی رسوم وہی ادا کرتے ہیں اور اسلامی قوانینِ تعزیرات کے نفاذ کی ضرورت میں گواہ مرد ہی بنتے ہیں۔ وراثت میں مرد کا حصّہ عورت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اور اُسے قسما قسم کے فرائض تفویض کئے گئے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام طبقۂ مردان سے تعلق رکھتے تھے (بحوالہ سورۃ النّحل: ۴۳؛ سورۃ الانبیاء: ۷)۔ عورتوں پر مَردوں کا غالب غلبہ اس اصولی حقیقت کے باعث بھی ہے کہ مرد اپنی کمائی عورت کے تغذیہ (کھلانا پلانا)، لباس اور پناہ گاہ (گھر) کی فراہمی کرتے ہیں اور شادی کے اخراجات اور مہر کی ادائی کو برداشت کرتے ہیں۔'' (تفسیر حسینی از علامہ حسین واعظ کشفی، ج ۱، ص ۱۱۳)

علامہ کشفی نے تفسیر بالا کے ضمن میں مندرجہ ذیل واقعہ کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں سورۃ النساء کی آیتِ مذکورہ ۳۴ کے شانِ نزول کو بیان کیا گیا ہے:۔

''سعید بن ربیع کی زوجہ حضرت حبیبہ یا حضرت ثابت بن قیس کی زوجہ حضرت جمیلہ نے اپنے خاوند کے ساتھ رشتۂ ازدواج کو قائم رکھنے سے انکار کر دیا اور اُن سے بے اعتنائی برتی۔ خاوند ناراض ہو گیا اور جمیلہ کے منہ پر تھپّڑ دے مارا۔ بیوی جمیلہ اپنے والد کے پاس گئی اور اپنے خاوند کے رویّہ کے خلاف اُن سے شکایت کی۔ والد اُنہیں پیغمبر علیہ السلام کے پاس لے گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا۔ پیغمبر علیہ السلام نے خاوند سے بدلہ لینے کا حکم صادر فرمایا۔ جونہی والد اور اُن کی بیٹی جمیلہ خاوند سے بدلہ لینے کے لئے نبی علیہ السلام سے جدا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے مَردوں کی عورتوں پر فضیلت کی آیت نازل فرما دی۔'' (سنن الکبریٰ للنسائی، جلد سوم؛ سنن الکبریٰ للبیہقی جلد ہفتم؛ سنن ابن ماجہ، ج ۱)

قرآنی لفظِ بالا ''قوّام'' کی تشریح میں مولانا ابوالحسنات قادری لکھتے ہیں:

''مرد کو عورت پر بااختیار افسرِ مجاز مقرر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت عطا کی ہے کیونکہ مرد اپنی آمدنی عورت پر خرچ کرتا ہے۔ چونکہ مَردوں کو عورتوں پر قیادت کا کردار تفویض کیا گیا ہے تو یہ بات قدرتی ہے کہ وہ عورتوں کی اصلاح کے بھی ذمّہ دار ہیں۔ اس طرح خاوند کو بیوی پر حکم چلانے کا اسی طرح اختیار حاصل ہے

جس طرح حاکم کو اپنی رعایا پر حکم چلانے کا اختیار ہوتا ہے اور اُن کی اصلاح و تکمیل کی بھی کوشش کرتا ہے۔ مَردوں کی عورتوں پر فوقیت کی دوسری وجہ عقل و دانش' جہاد' رسالت و نبوت' خلافت' امامتِ نماز' اذان برائے نماز' خطبہ جمعہ اور حدود اور قِصاص کے مقدمات میں بطور گواہ پیش ہونا ہے۔ وراثت میں مرد کو عورت سے دُگنا حصّہ ملتا ہے۔ شادی اور طلاق کے معاملہ میں بھی وہ مختارِ کل ہے۔ نسلِ انسانی کی افزائش بھی باپ کی طرف سے ہوتی ہے۔ عورت کی نسبت مرد نمازوں اور روزوں کے مکمل ضابطے کو قائم رکھنے کا زیادہ ذمہ دار ہے کیونکہ ایامِ حیض میں عورت اِن ذمہ داریوں کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ مَرد کو داڑھی رکھنے اور پگڑی پہننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کھلے طور پر مرد کو عورتوں کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے کا حکم دیا ہے۔'' (تفسیر الحسنات' جلد اوّل' صفحات ۱۷' ۱۸) ۱۹۹۰ ایڈیشن

(ب) مہر طلب کرنا عورتوں کا حق ہے: اور اُنہیں یہ حق قرآن نے دیا ہے کہ فرمایا:

(۱) وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النِّساء: ۴)

''اور بیویوں کو اُن کے مَہر خوش دلی سے ادا کر دیا کرو۔'' (۴ : ۴)

(۲) وَ اِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّآتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَاراً فَلاَ تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُوْنَه' بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًاo (النِّساء: ۲۰)

''اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اُس بیوی کو ڈھیروں کے ڈھیر مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو' کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اُسے واپس لو گے؟'' (۲۰ : ۴)

(۳) فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النِّساء: ۲۵)

''اُن سے اُن کے سر پرستوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور اُنہیں اُن کے مہر دستور کے موافق دے دیا کرو۔'' (۲۵ : ۴)

(ج) عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ مرد کو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دینے میں عورت کے حقوق کا تحفظ کر دیا گیا ہے۔ اگر مرد اپنی کئی بیویوں کے درمیان عدل کرنے کے قابل نہیں جیسا کہ قرآن نے تقاضا کیا ہے' تو اُسے ایک سے زیادہ شادی کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ (بحوالہ سورۃ النساء: ۳' ۱۲۹)

(د) مرد کو اپنی بیوی کے شادی شدہ ہونے کے باوجود اُسے درمیان میں لٹکتا ہوا چھوڑنے سے روکا گیا ہے اور اگر وہ اُسے طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے تو بیوی کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر اُسے معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹانا چاہئے اور اس سلسلہ میں قرآن کا فرمان بالکل واضح ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۲۲۹' ۲۳۱)

(ذ) خلع یعنی بیوی کو خاوند سے طلاق لینے کا حق (جلد دوم کے صفحات ۹۳۴' ۹۳۵ پر دیا جا چکا ہے)

(ر) حلالہ: جلد دوم کے صفحہ ۹۳۶ پر دیا جا چکا ہے۔

(ز) ظِہار: جلد دوم کے صفحات ۹۳۸‘۹۳۹ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(س) ایلاء: جلد دوم کے صفحہ ۹۳۷ پر دیا جا چکا ہے۔

(ش) عدّت کے بعد بیوہ کو دوسری شادی کرنے کا حق: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۴ میں حکم ہوا کہ متوفّی کی بیوہ اگر حاملہ نہ ہو تو وہ چار ماہ دس دن تک عدت کا زمانہ گزارے گی۔ بیوہ کے حاملہ ہونے کی صورت میں اُس کی عدت کا زمانہ وضعِ حمل تک ہوگا اور وضعِ حمل ہونے یعنی بچہ جننے کے بعد زمانۂ عدت ختم ہو جائے گا جیسا کہ سورۃ الطّلاق میں ارشاد ہوا: (اگرچہ وضعِ حمل اپنی طبعی مدّت پوری ہونے سے پہلے ہو جائے)۔

وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق : ۴)

''اور حمل والیوں کی میعاد اُن کے حمل کا پیدا ہو جانا ہے۔'' (۶۵ : ۴)

کچھ احادیثِ نبویہ عدّت گزار بیوہ پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہیں مثلاً (۱) وہ اس دوران دوسری شادی نہ کرے۔ (۲) وہ اپنی زیب و زینت سے دُور رہے مثلاً ریشمی‘ پُرکشش اور بھڑکیلا لباس پہننا‘ عطریات‘ خوشبو‘ مہندی اور اسی قسم کی زیب و زینت والی چیزوں کا استعمال اور بالوں کو تیل لگانا وغیرہ۔ (۳) عدت کے دوران اُسے اپنے متوفّی خاوند کے گھر کو چھوڑنے سے روکا گیا ہے۔ تاہم کسی ناگزیر کام کے لئے اُسے بیرونِ خانہ جانے کی اجازت ہے لیکن رات وہ باہر نہیں گزار سکتی۔

(ص) حیض والی عورت سے جماع کرنے کی ممانعت: یہودیوں کا حیض والی عورتوں سے رویّہ غیر معقول تھا۔ وہ ایسی عورت کے ساتھ بیٹھنے اور کھانے پینے تک کے تعلق کو ختم کر دیتے تھے۔ حیض کے دوران اُس کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا پلید اور گندا سمجھا جاتا تھا۔ اُن کے نزدیک عورت اُن دنوں میں پلیدی کا مجسمہ ہوتی ہے۔ ملحدین (اللہ کی ہستی کے منکرین) کا بھی اِن باتوں میں یہودیوں کا سا رویّہ تھا۔ زمانۂ حیض کے دوران عیسائی‘ عورت کے ساتھ جماع کرنے سے نہیں رکتے تھے۔ اس طرح عورت اِن تینوں طبقات کے ہاتھوں مصیبت کا شکار تھی۔

معتدل مذہب ہونے کے لحاظ سے اسلام نے اِن انتہا پسند عادات کا خاتمہ کر دیا۔ اسلام نے حیض کے زمانہ میں اُس سے جماع کرنے کی ممانعت اس معقول وجہ سے کر دی کہ وہ اُن دنوں کمزور ہوتی ہے‘ چڑچڑی ہو جاتی ہے اور اُسے اُن دنوں کوئی جنسی خواہش نہیں ہوتی۔ تاہم خاوند کو اُن دنوں بیوی کی مرضی کے مطابق اُس کے ساتھ بیٹھنے‘ ہمکلام ہونے اور ایک ساتھ ہو کر کھانے پینے کی اجازت ہے۔ قرآن نے فرمایا:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (البقرۃ : ۲۲۲)

''(اے نبی!) لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجئے کہ وہ ایک (طرح کی) گندگی ہے پس تم حیض کے دوران عورتوں کو چھوڑے رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے قربت نہ کرو۔''

<u>ایامِ حیض میں جماع سے ممانعت کی بابت چند ماہرین کی آراء</u> : موسوی قانون میں حیض کے دنوں میں عورت سے جماع کرنے والے مرد اور اُس عورت کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔

(۱) دراصل حفظانِ صحت کے صفائی ستھرائی کے اصولوں کے لحاظ سے اُن دنوں عورت سے جماع کرنے کی ممانعت ہے۔شدید قسم کا استحاضہ (اِخراجِ خون کی کثرت Menorrhagia)' رِحم کے اندر کی سوزش' رِحم کے اندر کی سوجن کی شکایات ایسے غیر محتاط اور ناسمجھی کے رویّہ سے پیدا ہوتی ہیں۔-- حیض کے دوران تحمّل سے عاری نفس پروری سنجیدہ قسم کی گشتی خلل اندازیوں کو جنم دیتی ہے ("Sexual Life of Women" ... Kisch, pp. 173, 185)

(۲) ''حیض کے دنوں میں عورت غیر معمولی طور پر حساس اور چڑ چڑی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ معمولی سی باتوں پر وہ بہت زیادہ مشتعل ہو جاتی ہے۔---عورتوں میں جرائم کی شماریات بتاتی ہیں کہ عورتوں کی جانب سے کئے گئے اکثر و بیشتر جرائم حیض کے زمانہ میں ہوتے ہیں۔'' ("Women and Love" ... Bauer, p. 283)

(۳) ''یہ کہ طاقتور ترین' صحتمند ترین اور انتہائی پُر عزم عورتوں میں بھی حیض کے ایام میں ذہنی توانائی' اَعصابی قوّت اور جسمانی پھرتی کسی حد تک بگاڑ اور کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں' بذاتِ خود اکثر عورتوں کے نزدیک ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔'' ("Man and Woman" ... Havelock Ellis, p. 228)

(۴) '' مکمل طور پر صحتمند عورتوں کے جملہ نامی وجود (Organism) پر بھی دورانِ حیض' جماع کم و بیش حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔نظامِ اعصاب میں تناؤ اور عضلاتی اشتعال پذیری بڑھ جاتے ہیں۔غیر اختیاری اور اضطراری فعل زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے اور ٹانگوں کا معمولی طور پر پھڑکنا' جمائیوں اور نیند کا بہ کثرت آنا' گردن کا بے لچک ہونا عام علامات ہیں۔بھوک ختم ہو جاتی ہے اور کسی حد تک ہاضمے اور آنتوں کی خلل اندازی کے ساتھ ساتھ نفخِ ریح (تبخیر کی بیماری) بھی ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً صفحات ۲۸۹' ۲۹۰)

(۵) ''حیض کے ایام میں عورت میں جلد اثر قبول کرنے' بات ماننے پر آمادگی اور کم و بیش ضبطِ نفس کی کمی ہوتی ہے۔اُن دنوں عورتیں سحر زدگی (Mesmerism) کے زیرِ اثر زیادہ ہوتی ہیں۔انہی دنوں میں عورت میں اچانک تلوّن مزاجی' بدمزاجی کے دَورے' انتہائی افسردگی (ڈیپریشن) کی بے لطفی' حسد کی اُکساہٹ' شدید خود اقراری کا واقع ہونا دیکھا گیا ہے۔'' (ایضاً ص ۲۹۱)

(ض) <u>خاوند کے فیصلے بیوی پر ٹھونسے نہیں جا سکتے</u> : ایک حدیثِ نبوی کی رُو سے عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے' اس لحاظ سے جبلّاتی طور پر وہ کج (ٹیڑھی) ہے۔لہٰذا خاوند کے لئے اپنے فیصلوں کو اُس پر زبردستی ٹھونسنا اچھی بات نہیں کیونکہ اُس کا ضدی اور خود پسندی کا رویّہ ازدواجی رشتے کو قائم رکھنے میں بہتر نتائج کا موجب نہیں ہوگا۔عورت کی فطرت سے متعلق نبی علیہ السلام نے فرمایا :

اِنَّ الْمَرْءَ ةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ لَنْ تَسْتَقِيْمَ لَكَ عَلٰى طَرِيْقَةٍ فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَفِيْهَا عِوَجٌ" وَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَ كَسْرُهَا طَلَاقُهَا (صحیح مسلم: کتاب الرضاع)
''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ یہ کسی طریقے سے بھی تیرے لئے سیدھی نہیں ہو گی۔ پس اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو اِسی کجی کی حالت میں فائدہ اٹھا۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے تو اسے توڑ ڈالے گا اور اُس کا توڑ دینا اُسے طلاق دینا ہے۔'' (صحیح مسلم: کتاب الرضاع' باب الوصیۃ بالنساء' ح ۱۴۶۸)

(ط) اسلام نے عورت کو اپنے خاوند کے انتخاب میں مکمل آزادی عطا کی ہے۔ اُسے اپنی پسند کے خلاف شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے:
وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرة: ۲۳۲)
''جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور پھر وہ اپنی عدّت پوری کر چکیں تو اُنہیں اپنے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ آپس میں شریفانہ طریقے سے رضامند ہو جائیں۔'' (۲: ۲۳۲)

درج ذیل احادیثِ مبارکہ زیرِ نظر موضوع کو مزید تقویت دیتی ہیں جن میں پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:
(۱) ''لڑکی کو اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اپنے سرپرست کی نسبت زیادہ ہے۔''
(۲) ''کنواری لڑکی کو اُس کے مرضی کے بغیر نکاح میں نہ دو۔''
(۳) ''کسی بیوہ کا نکاح اُس کے مشورہ کے بغیر نہ کرو اور کسی کنواری لڑکی کی شادی اُس کی مرضی کے بغیر نہ کرو اور اُس کی رضامندی اُس کی خاموشی ہے۔''

شادی ہو جانے کے بعد بھی اگر لڑکی اعلان کرے کہ وہ اس شادی پر راضی نہیں تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

(۴) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں ایک شخص نے اپنی لڑکی کی شادی ایک امیر آدمی سے کر دی لیکن لڑکی اُس مرد کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ نبی علیہ السلام کی بارگاہ میں آئی اور کہا کہ میرے والد نے میری شادی اپنے ایک امیر بھتیجے سے کر دی ہے تاکہ وہ اس سے مالی منفعت حاصل کر کے اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنا لے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اُسے پسند نہیں کرتیں تو تم آزاد ہو۔ لڑکی نے جواب دیا کہ میں اپنے والد کے فیصلے کو برقرار رکھتی ہوں لیکن میں یہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ آیا والد کو اپنی بیٹیوں کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف کرنے کا حق حاصل ہے؟'' (مسند امام احمد' ابن ماجہ)

(۵) اسی طرح بریرہ نامی ایک لونڈی ایک غلام سے بیاہ دی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد بریرہ کو آزادی مل گئی اور اُس نے اُس غلام خاوند کی بیوی رہنے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ اُس کے پیچھے شدید

طور پر روتا ہوا گیا۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ نے بریرہ سے فرمایا: ''بریرہ! اللہ کا خوف کرو اور تمہارے لئے اُس کی محبت اور تمہاری طرف سے مایوس کن صورتِ حال کا کچھ تو خیال کرو! وہ تمہارا خاوند رہا ہے اور اُس سے تمہارے بچے بھی ہیں۔'' بریرہ نے جواب دیا: ''کیا آپ مجھے اُس کی زوجیت میں رہنے کا حکم فرما رہے ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں، میں اس کا حکم کیسے دے سکتا ہوں؟ میں تو تم سے سفارش کر رہا ہوں۔'' اس پر بریرہ نے کہا کہ مجھے اُس کی ضرورت نہیں۔'' (صحیح بخاری)

یہ اور اس قسم کے دوسرے واقعات اس بات کا مظہر ہیں کہ اسلامی معاشرے میں حقوقِ نسواں کو بڑا احترام اور قانونی تحفظ حاصل ہے۔

عورت کے معاشرتی حقوق: مرد باپ اور روزی کمانے والا ہے جبکہ عورت ماں اور امورِ خانہ داری کی منتظمہ ہے۔ عائلی زندگی کو جو انسانی تہذیب کی اہم اور بنیادی جڑ ہے، کامیابی سے چلانے کے لئے دونوں کا کردار مساوی طور پر اہم ہے۔ قرآن مجید اِس رشتے کا حوالہ سورۃ النّحل کی آیت ۷۲ میں یوں دیتا ہے:

وَاللهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً

''اللہ تعالٰی نے تمہارے لئے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔''

اِس آیت میں جنسی حیات کا راز پنہاں ہے اور اس میں میاں بیوی کے درمیان مساوات اور پیار و الفت کی بنیاد پر عائلی زندگی کی تعمیر کی ضرورت پر اشارہ ہے۔ زوجین کے لئے یہ آیت اس بات کی یاد دہانی بھی ہے کہ اُن کا ازدواجی رشتہ عطیہ الٰہی ہے جس کے لئے اُنہیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اور اُس کی شکر گزاری کا ایک طریقہ یہ ہے کہ عقدِ نکاح کو کامیاب بنانے کے لئے اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے بھلے طریق اور شائستگی سے پیش آئے۔

عطیہ الٰہی کی ایک اور علامت نفسیاتی اور جذباتی عامل پر مبنی ہے جس کا بیان سورۃ الرُّوم کی اس آیت میں ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر دی۔'' (۳۰:۲۱)

یہ آیت ایک بار پھر میاں بیوی کے باہمی بندھن کی مضبوطی اور موافقت کا ثبوت ہے۔ اُن دونوں کے درمیان ایسی حیران کن ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے کہ ہر ایک دوسرے کا مکمل طور پر جزوِ لازم ہے۔ ایک کی جسمانی اور نفسیاتی ضروریات دوسرے کی جسمانی اور نفسیاتی ضروریات کے مثل اور موافق ہیں۔

وہ بنیادی عامل جس نے تہذیبِ انسانی کی پیدائش میں مدد دی ہے، یہ ہے کہ خالق نے اپنی عقل و دانش سے

دونوں جنسوں میں ایک دوسرے کے لئے اُمنگ، تشنگی اور چاہت رکھ دی ہے جو اُس وقت تک غیر مطمئن رہتی ہے جب تک دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر منسلک نہیں ہو جاتے۔ امن وآشتی اور تسکین کی یہی امنگ اُنہیں باہم مل کر ایک اچھا گھر بنانے پر راغب کرتی ہے۔

تہذیب انسانی کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کے سیاق میں آیت مذکورہ میں لفظ مَوَدَّة کا مطلب جنسی محبت ہے جو زوجین کے درمیان باہمی کشش اور جاذبیت کے مقصد کی طرف پہلا قدم ہے اور جو اُنہیں ایک دوسرے سے وابستہ رکھتی ہے۔ لفظ رَحْـمَة سے بالواسطہ مراد روحانی تعلق ہے جو ازدواجی زندگی میں بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے جس کی بدولت وہ ایک دوسرے سے شفقت ومحبت اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ بڑھاپے میں جنسی محبت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور دونوں رفقائے حیات جوانی کے زمانہ سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے پر مہربان اور الفت کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں جذبات (مہربانی اور الفت) مثبت قوّتیں ہیں جنہیں خالقِ حقیقی نے انسان میں اُس کی فطرتی امنگ کو سہارنے کے لئے پیدا کر دی ہیں۔ وہ چاہت اور بے قراری محض آرام وسکون اور اطمینان کی متلاشی رہتی ہے اور مرد وزن کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتی ہے۔ یہ دونوں قوّتیں دو اَن جانی شخصیتوں کو جنہوں نے مختلف ماحولوں میں پرورش پائی ہے، اس طرح ربط ویگانگت کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں کہ دونوں تمام مشکلات میں ایک دوسرے سے وابستہ رہتے ہیں۔

سورۃ الـرّوم کی مذکورہ آیت ۲۱ اِس عمرانی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ خوش آئند ازدواجی رشتے کی بنیاد دونوں صنفوں میں مساوی طور پر ہے جس کے بغیر یہ اتحاد اور جوڑ فی الحقیقت پھل پھول نہیں سکتا اور تہذیب انسانی کو مضبوط بنیاد پر تعمیر کرنے میں صحتمند، خوشگوار نتائج نہیں دے سکتا۔

ایسی پیار واُلفت بھری کنبے کی تعمیر کی مدد میں شوہر کا منصبی کام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُسے اپنی بیوی سے پیار ومحبت، صبر وتحمل اور عزت ووقار سے پیش آنے میں اللہ کے حضور اپنی جوابدہی اور اُس کے عائد کردہ فرض کا احساس رہے۔ خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ یہ فیّاضانہ اور اُلفت بھرا رویّہ بیوی کا دل جیت لے گا اور اُن دونوں کے درمیان احسن اور صحتمند رشتے کی ترقی کا موجب بنے گا۔ قرآن مجید بیویوں کے ساتھ تند وتیز رویّے کی پُرزور مذمت کرتا ہے اور اُن سے مہربانی سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ سورۃ الـنِّساء کی آیت ۱۹ میں آیا اور جس کا حوالہ صفحہ ۱۳۸۶ کی آخری سطور میں دیا جا چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر افرادِ معاشرہ کو صرف اپنے قانونی حقوق کی فکر دامن گیر ہو اور فرائض کی ادائی کا خیال تک نہ ہو تو معاشرتی زندگی پُرمسرت اور خوشگوار ہو ہی نہیں سکتی۔

اپنے خاوند کے انتخاب میں عورت کی مکمل آزادی ایک نمایاں معاشرتی حق ہے جو اسلام نے عورت کو عطا کیا ہے اور جس کی مثال مذاہبِ عالم کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ اس کی تفصیل گزشتہ صفحہ ۱۳۹۶، ۱۳۹۷ پر شق (ط) کے تحت دی جا چکی ہے۔

اسی طرح اگر ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو اُسے خُلع کا حق دیا گیا ہے۔ بیوگان اور مطلقوں اور اُن دوسری تمام عورتوں کو جن کا نکاح قانونی طور پر فسخ ہو چکا ہے' دوبارہ شادی کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حقیقت مغرب کے نقادوں کے اس دعویٰ کو جھوٹا ثابت کرتی ہے کہ عورت کو اسلام میں کوئی حقوق یا سماج میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان خواتین کو نکاح و طلاق کے معاملے میں جن حقوق سے نوازا گیا ہے وہ مغرب اور دوسرے مشرقی معاشروں میں عورت کو ابھی تک نہیں دیے گئے۔

عورت کے اقتصادی حقوق : اسلام عورت کے مالی حقوق کو تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد پر اُسے وراثت میں اور مال و جائداد رکھنے میں حقدار بنایا گیا ہے خواہ وہ کنواری یا شادی شدہ۔ وہ اپنے والدین' خاوند' بچوں اور قریبی رشتہ داروں کی جانب سے اُن کی جائداد' زمین اور دیگر کسی بھی اثاثہ میں وراثت کا حق رکھتی ہے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ اُسے یہ حقِ وراثت سورۃ النساء کی اس آیت میں دیا گیا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ (النسآء : ۷)

''مردوں کے لئے اُس ترکہ میں سے حصّہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ گئے اور عورتوں کے لئے اُس ترکہ میں سے حصّہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ گئے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔'' (۷ : ۴)

اُسی سورۃ النساء کی مندرجہ ذیل آیت ۲۴ میں بیان کردہ حکم بھی عورت کے مالی حقوق کے حق میں ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ (النساء : ۲۴)

''پس جو تم نے اُن سے لطف اٹھایا ہے تو اُنہیں اُن کے مقرر شدہ مہر دے دو اور جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔'' (۲۴ : ۴)

عورت اپنی جائداد اور اثاثے کی جیسے بھی چاہے' سرمایہ کاری کر سکتی ہے۔ اس معاملے میں وہ بالکل خودمختار اور اپنی انفرادیت کے قیام میں منفرد ہے۔

اسلام عورت کو جائز شرعی حدود کے اندر رکھتے ہوئے روزی کمانے کا حق بھی عطا کرتا ہے مثلاً تعلیمِ نسواں' دایہ گری' عورتوں کا طبی علاج وغیرہ کے پیشے۔ ایسی اجازت اُسے اُسی سورۃ النساء میں اِن الفاظ میں دی گئی ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النِّساء : ۳۲)

''مردوں کے لئے اُس میں سے حصّہ ہے جو اُنہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے اُس میں سے حصّہ ہے جو اُنہوں نے کمایا۔'' (۳۲ : ۴)

اس طرح اسلام میں عورت کی اقتصادی حالت ایسی محفوظ کر دی گئی ہے کہ بعض حالات میں وہ اقتصادی لحاظ سے اپنے خاوند سے بہتر ہوتی ہے۔

<u>عورت کے تعلیمی حقوق</u> : تعلیم و تعلّم کے حصول میں عورتوں کے وہی حقوق ہیں جو مَردوں کے ہیں۔ یہ اسلام ہی ہے جو تعلیم کی ضرورت کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور جس نے:

''اُس وقت جب تمام دنیا جہالت اور تاریکی کے گھپ اندھیروں میں گم تھی' مرد و زن ہر فرد کے لئے تعلیم کو ضروری اور ناگزیر قرار دیا اور تعلیم پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ بات بھی اسلام کے اعزاز میں جاتی ہے کہ وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورت کے جداگانہ اور خود مختار مقام کو تسلیم کرتے ہوئے اُس پر زور دیا کہ وہ تعلیم کے بغیر انسانِ کامل نہیں بن سکتی۔ عورت کے لئے تعلیم کا حصول ایسا ہی عظیم فرض ہے جیسا وہ مرد کے لئے ہے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ عورت اپنی جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ذہنی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھائے اور اس طرح وہ روحانی بلندیوں تک پہنچ جائے جبکہ اس کے برعکس یورپ نے آج تک عورت کے حقوق کو تسلیم تک نہیں کیا اور بالآخر یہ حقوق اُس نے اُسے اقتصادی حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر دئے۔'' ("Islam --- the Misunderstood Religion" ... Muhammad Qutub, pp. 90, 91,quoted in the Encyclopaedia of Seerah, Vol.2, p.27)

''حدیثِ نبوی طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ'' عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (حصولِ علم ہر مسلمان مرد و زن پر فرض ہے) سے ظاہر ہے کہ اسلام مرد و زن میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ تاہم وہ مرد و زن کے لئے تعلیم کی قسم کے فرق کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے عورت کے لئے صحیح قسم کی تعلیم وہ ہے جو اُسے اچھی بیوی' اچھی ماں اور گھر کی اچھی مالکہ بننے کے لئے تیار کرے۔ اُس کا شعبہ عمل صرف گھر ہے۔ اس لئے اُسے بنیادی طور پر علم کی اُن شاخوں میں تربیت دی جائے جو اُسے اس شعبہ میں مفید بنا سکتی ہیں۔'' ("Purdah and the Status of Woman in Islam" ... Sayyid Maudoodi) 1976 Edition.

''اس طرح پیشہ ورانہ اور تکنیکی مضامین کے عملی انتخاب میں عورت مرد استادوں سے اُن مختلف مضامین کی تعلیم حاصل کر سکتی ہے جو اُس کی حیاتیاتی' عضویاتی اور عملی ضروریات اور منصبی کام کے لئے موزوں ہوں۔ یہ بات اُن کے منصبی کاموں کے تفاوت کی وجہ سے معقول ہے۔''

''علاوہ ازیں اُسے اُن علوم میں بھی تعلیم کی ضرورت ہے جو اُسے اخلاقی اور ثقافتی لحاظ سے ایک اچھا انسان بنانے میں مدد و معاون ہوں اور جو اُس کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کریں۔ اس طرح علم اور ثقافتی تربیت حاصل کرنا ہر مسلمان عورت کا فرض ہے۔ تاہم اگر ایک عورت غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہے اور وہ علم کے دوسرے شعبوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہشمند ہے تو اسلام اُس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا بشرطیکہ وہ عورت سے متعلق اسلامی قانون کی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔'' (ایضاً)

نبی اکرم ﷺ نے علم کے حصول میں عورتوں کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ آپ کی ازواجِ مطہرات بالخصوص

اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا نے بہت سے ممتاز صحابہ کرام کو قرآن‘ حدیث اور اسلامی فقہ کی تعلیم دی۔

والدین اور خاوندوں کے لئے ہدایات :عورت کی تعلیم و تربیت کی بہترین جگہ اُس کا گھر ہے۔اس لئے شریعتِ اسلامی نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ عورت کے والدین اور شوہر اُسے حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا اور اُسے غلط طریقوں سے بچنا سکھائیں۔سورۃ التَّحریم میں قرآن مجید مسلمانوں کو یوں حکم کرتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِیۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ عَلَیۡهَا مَلٰٓئِكَةٌ" غِلَاظٌ" شِدَادٌ" لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ o (اَلتَّحریم : ۶)

''مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں‘ اُس پر تندخو‘ بڑے مضبوط فرشتے مقرر ہیں‘ وہ کسی بات میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ اُنہیں حکم دیتا ہے اور جو کچھ (اُنہیں) حکم دیا جاتا ہے‘ اُسے فوراً بجالاتے ہیں۔'' (۶ : ۶۶)

مالک بن حُویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ جوان لوگ نبی اکرم ﷺ کے ہاں مذہب اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بیس دن ٹھہرے۔جب نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتے ہیں تو آپ نے اُنہیں فرمایا:

''اپنے اہل و عیال کے پاس جاؤ‘ اُن کے ہاں ٹھہرو اور اُنہیں دین کی باتیں سکھاؤ اور اُنہیں حکم دو کہ وہ اُن باتوں پر عمل کریں۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذہنی اور عملی کاموں میں مختلف طریقوں سے عورتوں کی حوصلہ افزائی کی اور اُنہیں لامحدود ثواب کی خوشخبری سنائی۔ایک دفعہ فرمایا:

''جو شخص اپنی تین بیٹیوں کی پرورش کرتا ہے اور اُنہیں ثقافت اور آدابِ (اسلامی) سکھاتا ہے‘ پھر اُن کی شادی کر دیتا ہے اور اُن سے حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے‘ وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' (ابوداؤد)

بحوالہ صحیح بخاری خاوندوں کے بارے میں آپ نے فرمایا:

''تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں دگنا ثواب ملے گا: اُن میں سے ایک وہ ہے جس کی ایک لونڈی ہے‘ وہ اُسے عمدہ ثقافت کی تعلیم دیتا ہے‘ اچھی تعلیم دیتا ہے‘ پھر وہ اُسے آزاد کر کے اُس سے شادی کر لیتا ہے۔''

ایک مرتبہ حضور ختمی مرتبت ﷺ نے ایک عورت کا نکاح ایک ایسے غریب آدمی سے کر دیا جس کی تمام تر پونجی یہ تھی کہ وہ قرآن مجید کی کچھ سورتیں جانتا تھا۔اُسے کہا گیا کہ وہ اپنی دلہن کو اُس کے مہر کے طور پر ان سورتوں کی تعلیم دے دے (صحیح بخاری‘ صحیح مسلم)۔بہ الفاظِ دیگر نبی اکرم ﷺ نے عورت کو قرآن کا علم بطور مہر حاصل کرنے کا حق عطا فرمایا۔

۱۴۰۲ (تحریک آزادیِ نسواں---FEMINISM)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بعض اوقات اپنے صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کو قرآن مجید کی مخصوص سورتوں کی تعلیم دیں جیسے سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کی تعلیم جن میں ایمان اور دین کی بنیادی باتیں شامل ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا:

''بے شک اللہ ربّ العزت نے سورۃ البقرۃ کی ایسی دو آیات سے سورت کا اختتام کیا جو مجھے اپنے عرش کے نیچے کے خزانے سے عطا کی گئیں۔ لہٰذا اُنہیں خود بھی یاد کرو اور اپنی بیویوں کو بھی اُن کی تعلیم دیا کرو۔'' (دارمی)

اسلام کے خلیفہ ثانی سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کو لکھ بھیجا کہ وہ اپنی عورتوں کو سورۃُ النُّور کی تعلیم دیا کریں (تفسیر قرطبی، جلد ۱۲، صفحہ ۱۵۸)

<u>عورت کی ذہنی تعلیم</u>: شریعتِ اسلامی نے عورت کے ذہنی معیار کو بلند کرنے میں نہ صرف ہر قسم کی سہولت مہیا کی ہے بلکہ اُس کی فہم و فراست کی ترقی کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے تاکہ وہ غور و فکر اور مشاہدے کی اُن مخفی قوتوں سے فائدہ اٹھانا سیکھے جو قدرت نے اُس میں ودیعت کی ہیں۔ نبی علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات کو کچھ سماجی ہدایات دینے کے بعد قرآن مجید اُنہیں سورۃُ الاحزاب میں یوں خطاب کرتا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (الاحزاب: ۳۴)

''اور تم اللہ کی اُن آیات اور حکمت کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھ کر سنائے جاتے رہتے ہیں۔''

یہ آیت ازواجِ مطہرات کی توجہ بالخصوص اور دیگر مسلمانوں کی توجہ بالعموم اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے اور یہ دیکھنے کی طرف مبذول کرتی ہے کہ یہ نشانیاں اور اللہ کی عقل و دانش ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ایمان باللہ اور یومِ آخر میں اپنی جوابدہی پر ایمان ہم سے کس قسم کی زندگی گزارنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

<u>تعلیمِ نسواں کی قانونی حیثیت</u>: تعلیم سے متعلق یہ ہدایات محض ترغیبی اور اخلاقی نوعیت کی نہیں بلکہ اُن کے پیچھے قانون اور تعزیراتی سزاؤں کی قوّت کارفرما ہے۔ فقہِ مالکی کے مشہور و معروف عالم علامہ ابن الحاج لکھتے ہیں:

''اگر عورت خاوند سے علمِ دین سے متعلق اپنے حقوق کا مطالبہ کرے اور معاملہ قانون کے دروازے تک لے جا کر مذہبی تعلیم کے دیئے جانے پر اصرار کرے کیونکہ یہ اس کا حق ہے کہ یا تو خاوند اُسے خود دین کی تعلیم دے یا اُسے بیرونِ خانہ تحصیلِ علم کی اجازت دے۔ حاکمِ وقت پر یہ لازم ہے کہ وہ اُس کے خاوند کو اپنی بیوی کا یہ حق پورا کرنے کے لئے مجبور کرے جیسا کہ وہ دنیاوی حقوق پورے کرتا ہے۔ کیونکہ دینی فرائض دنیاوی فرائض سے زیادہ اہم ہیں۔ (''المَدخل''ج ۲، ص ۲۷۷)

امام فخر الدین حسن بن منصور حنفی (م ۲۹۵ھ) اپنے فتاویٰ میں بالتفصیل لکھتے ہیں کہ عورت پر علمِ دین کا سیکھنا

کب فرض ہوتا ہے اور یہ کب تک سنت کے درجے میں رہتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کب تک اپنے خاوند کے حکم کی پابند رہتی ہے اور اُسے کہاں اپنے خاوند سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے؟ وہ لکھتے ہیں :

''اگر عورت خاوند کی اجازت کے بغیر کسی علمی مرکز میں جانا چاہتی ہے تو اُسے اس کا کوئی حق حاصل نہیں اور اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو اُسے اس کے متعلق اپنے خاوند سے معلوم کرنا چاہیے۔ اگر اُس کا خاوند عالمِ دین ہے تو وہ خود اُس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے ورنہ وہ دوسروں سے معلوم کر کے بیوی کو بتا سکتا ہے۔ بیوی کو خاوند کی اجازت کے بغیر بیرونِ خانہ نہیں جانا چاہیے۔ اگر خاوند اپنے استفسارات کے ذریعے بیوی کو کوئی جواب نہیں دیتا تو بیوی کو خاوند کی اجازت کے بغیر اپنے مسئلہ کی معلومات لینے کے لئے کسی علمی مرکز کی طرف جانے کا حق حاصل ہے کیونکہ علم کا حاصل کرنا مسلمان مرد و عورت دونوں پر فرض ہے۔ اس طرح اس صورت میں حصولِ علم کے حق کو خاوند کے حق پر اوّلیت حاصل ہوگی۔ تاہم اگر عورت کو کوئی خاص مسئلہ درپیش نہیں ہے اور وہ کسی مذہبی مرکز میں نماز' روزہ اور وضو وغیرہ کی تفصیلات حاصل کرنے جاتی ہے اور اُس کا خاوند بھی اُسے تعلیم دیتا ہے تو اُسے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ لیکن اگر خاوند کو اُن کی تفصیلات کا علم نہیں تو بہتر ہے کہ وہ اُسے کسی مذہبی مرکز سے اُن معلومات لینے کی اجازت دے دے بشرطیکہ کوئی مصلحت آڑے نہ آئے۔ اگر کوئی مصلحت درپیش ہے تو خاوند بیوی کو اجازت نہ دینے پر قابلِ الزام و ملامت نہیں ہے۔'' (فتاویٰ قاضی خاں' ج ۱' ص ۴۴۳' المطبوعۃ علیٰ فتاویٰ عالمگیری)

نبی اکرم ﷺ کے حصولِ علم پر تاکیدی زور نے عورتوں میں ایسی زبردست خواہش پیدا کر دی تھی کہ وہ دن رات اسلام کی باتوں کو زیادہ سے زیادہ معلوم کرنے میں بے قرار رہتی تھیں۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انصار کی عورتیں دین کو سمجھنے میں ایسی سرگرم تھیں کہ شرم و جھجک اُن کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھیں (صحیح مسلم)۔ یہ گرم جوشی اور اُمنگ جس کے ذریعے ان مقدس ہستیوں نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں' سیّدہ عائشہ کے اس بیان سے ظاہر ہے:

''جب بھی کوئی آیت نبی علیہ السلام پر نازل ہوتی تو ہم حلال و حرام اور معروف و منکر کے متعلق احکام کو یاد کر لیتیں اگر چہ ہم آیت کے تمام الفاظ کو یاد نہ رکھ سکتیں۔'' (اَلعِقدُ الفرید لابن عبدربہ' ج ۱' ص ۲۷۶)

مخلوط تعلیم : اسلامی معاشرے میں مرد و زَن کا آزادانہ اختلاط بالکل حرام ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے اس مسئلہ کا استنباط کیا جا سکتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْم" مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآء" مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ (اَلحُجرات : ۱۱)

''اے ایمان والو! مَردوں کو مَردوں پر نہیں ہنسنا چاہیے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔'' (۴۹ : ۱۱)

مفسّرینِ قرآن فرماتے ہیں کہ چونکہ آیتِ مذکورہ (۱۱) میں مرد وزَن دونوں صنفوں کو علیحدہ علیحدہ حکم دیا گیا ہے تو اس الٰہی تدبیر کار (سکیم) میں بالواسطہ مطلب یہی ہے کہ اُن کا باہم ملنا جلنا بالکل غیر قانونی ہے۔ اس بالواسطہ مطلب کی رُو سے مخلوط تعلیم جس میں نوجوان لڑکے' لڑکیاں اکٹھی تعلیم حاصل کرتے ہیں مسلمہ طور پر حرام ہے۔

مخلوط تعلیم اس نظریہ کے جدید رُجحان کا فرعیہ (Corollary) ہے کہ مرد وزَن کے مابین ہر طرح اور ہر چیز میں مساوات ہے۔ مساوات کے لئے اُن کی گرمجوشی میں عورتیں اب مساوات کے اِس انتہائی نقطہ نظر تک پہنچ گئی ہیں کہ مرد وزَن کے مابین قطعاً کوئی فرق نہیں اور یہ کہ دونوں صنفیں ہر چیز میں اور ہر طرح نہ صرف برابر ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مشابہ اور ایک ہی چیز ہیں۔ لہٰذا تعلیم' کام اور روزگار میں اُن کے مابین کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہئے۔ جو کام مرد کر سکتا ہے' عورت بھی کر سکتی ہے اور تعلیم میں جس چیز کی مرد کو ضرورت ہوتی ہے' عورت کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح مخلوط تعلیم کے حامی دونوں جنسوں کے درمیان کسی بھی میدان میں کسی قسم کے فرق کو نہیں مانتے۔ اِس منفی رُجحان کے ہیبت ناک اَخلاقی نتائج کا معاشرے کو جس قدر سامنا ہے وہ کسی درد بھرے دل سے مخفی نہیں ہے۔

اسلام ازدواجی زندگی کو معاشرے میں بہت ہی اہم چیز سمجھتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ عورت کے لئے گھر اور خاندان ہی قدرتی اور اہم شعبہ کار ہے۔ اسی وجہ سے اُسے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو اُسے اُس کے قدرتی کارِ منصب کی خوش اسلوبی سے انجام دہی کے لئے تربیت دے اور تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ اُس کے تعلیمی نصاب کا تمام رنگ مَردوں کے نصاب کے رنگ سے بالکل مختلف ہوگا اور اسی لئے تمام سطحوں پر عورت کے لئے علیحدہ ادارے ہونے چاہئیں۔

اس کے علاوہ مخلوط تعلیم اسلام کے بنیادی نظریہ کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیتی ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ مرد وزَن کو کسی بھی میدانِ عمل میں اور کبھی بھی باہم میل جول نہیں رکھنا چاہئے۔ مسلمان معاشرے میں نیکی' اچھائی اور شرم وحیا کے مطلوبہ معیار کو قائم رکھنے اور پروان چڑھانے میں یہ ممانعت بہت ہی اہم اور ضروری ہے۔

<u>عورت کے حقوق بہ حیثیت بیوی</u>: بہ حیثیت بیوی' عورت اپنے گھر کی مالکہ اور ملکہ ہوتی ہے اور خاوند کا مقام اُس کے اپنی بیوی کے ساتھ رویّہ سے متعین ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند احادیثِ مبارکہ ذیل میں دی جارہی ہیں جن میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

(۱) ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا ہے۔۔۔۔۔۔۔'' (مشکوٰۃ)

(۲) ''مؤمنوں میں ایمانِ کامل والے وہ ہیں جو خوش اخلاق ہیں اور اپنے اہل وعیال پر مہربان ہیں۔''

اس ضمن میں آپ کے خطبہ حجۃ الوداع کا حوالہ جس میں آپ نے بیوی کے حقوق کے بارے میں تاکیدی نصیحت فرمائی' صفحہ ۱۳۸۸ پر دیا جاچکا ہے۔ دیگر تفصیلات بھی گزشتہ صفحات میں دی جاچکی ہیں۔

عورت کے حقوق بہ حیثیت والدہ: اسلامی معاشرے میں بہ حیثیت والدہ عورت کا مقام نمایاں ہے۔تمام افرادِ خانہ کے لئے وہ مرکزی نقطہ ہے۔ ہر فردِ خانہ اُس کی عزت وتکریم کرتا ہے۔اہم موقعوں پر تمام افرادِ خانہ اُس کی تعظیم کو آتے ہیں اور تمام عائلی معاملات میں اُس کی رائے اور تجاویز بڑا وزن رکھتی ہیں۔قرآن مجید کے نزدیک اللہ کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور مہربانی و شفقت کا درجہ ہے (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: ۲۳)۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ مجید نے جہاں کہیں بھی عبادتِ الٰہی کی ترغیب دی ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے روکا ہے' اُس کے معاً بعد اُس نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید ہے جس کی مثالیں قرآن مجید میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔

دو احادیثِ نبوی کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے جو والدہ کے ناقابلِ تصور اعلیٰ مقام اور عزت پر روشنی ڈالتی ہیں:

(۱) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے حسنِ سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔اُس نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔اُس نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔اُس نے پوچھا: اس کے بعد کون زیادہ مستحق ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ۔(مشکوٰۃ)

(۲) ''ماں کے چہرہ کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا ایک سوحج مبرور کے ثواب کے برابر ہے۔اس پر ایک صحابی نے آپ سے پوچھا: اگرچہ میں اُسے محبت بھری نگاہ سے دن میں سو بار دیکھوں تو بھی مجھے اُسی نسبت سے ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں! اللہ بہت عظیم ہے اور اُس کے خزانے ہر وقت پُر رہتے ہیں جن میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔''

جو فیاضانہ حقوق عورت کو اسلام نے عطا کئے ہیں' ناقدین اور دشمنانِ اسلام اُن سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہیں؟ ایک باغیرت اور باحیا مذہب ہونے کے ناطے سے اسلام نے عورت کو شمع محفل بننے کی اجازت دینے کی بجائے اُسے شمع خانہ بنایا ہے جس کی بہتری کے لئے اُسے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔دراصل یہ ناقدین اور حقوقِ نسواں کے حامیان جنسی بے راہروی کا شکار ہیں جو اپنی جنسی کج روی کی تسکین کی ناکام کوشش میں آزادیٔ نسواں کی خاطر لڑتے ہیں۔عورتوں کے ننگے جسموں اور نقش ونگار کئے ہوئے چہروں کو دیکھنے میں اُن کا مقصدِ وحید اپنی جنسی خواہش کی تسکین اور اُن کے ساتھ ناجائز' غیر انسانی اور غیر اخلاقی جنسی تعلقات قائم کرنا ہوتا ہے۔

بیوی کی سرتابی (نشوز) کی صورت میں اُسے زدوکوب کرنے کی قرآنی اجازت: بیوی کی جانب سے خاوند کی نافرمانی' ناشائستہ رویہ اور سرتابی کی صورت میں قرآن مجید نے خاوند کو بطور حتمی ہتھیار کے ہلکی سزا دینے کی اجازت دی ہے۔چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا٥ (اَلنساء: ۳۴)

''جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو اُنہیں نصیحت کرو اور اُنہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور اُنہیں مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو اُن پر (ظلم کرنے کی راہ) نہ تلاش کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ (عظمت و کبریائی میں) سب سے بالا' سب سے بڑا ہے۔'' (۴: ۳۴)

دشمنانِ اسلام نے خاوند کے اس قرآنی اختیار پر بھی بڑا ہنگامہ کھڑا کیا ہے اور کہا ہے کہ صنفِ ناتواں پر یہ ظلم اور غیر انسانی فعل ہے۔ لیکن اُن کی یہ تنقید اُن کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اسلامی کنبے کی صحیح فطرت کیا ہے جس پر تمام عمرانیاتی نظام کا انحصار ہے۔ خاوند کا یہ اقدام بشرطِ ضرورت حتمی اور آخری تدبیر ہے تاکہ خاندان کا امن و سکون اور اتحاد و یک جہتی قائم رہے۔ یہ بات بہ شمول بیوی کے تمام اہلِ خانہ کے مفاد میں جاتی ہے کہ وہ سب بغیر کسی رڈوکد کے امن سے رہیں۔ اس سزا کا حکم صرف اُس صورت میں ہے جب تمام مصالحاتی طریقے ناکام ہو جائیں اور بیوی گھر میں صرف اپنے بچوں کی خاطر رہنا چاہے' خاوند سے وفادار رہنے سے انکار کر دے اور اپنی سرکشی کے رویّہ کو برقرار رکھے۔ اِن حالات میں ایسے غیر مہذبانہ رویّہ کو سیدھا کرنے کا سوائے ہلکی مار کے اور کوئی متبادل راہ نہیں ہے۔ مخالفینِ اسلام کو اُس تدریجی عمل کو بھی دیکھنا چاہئے جو قرآن نے بیوی کی اصلاح کے لئے تجویز کیا ہے اور جس کی آخری اور حتمی سزا ہلکی مار ہے۔

نکاح اور شادی ایک ایسی تنظیم ہے جس کا مقصد شادی شدہ جوڑے کی مشترک فلاح و بہبود ہے۔ اُس مشترک فلاح و بہبود کی بنیاد باہمی الفت و محبت اور ہم آہنگی ہے جو ہر قیمت پر گھر میں ہونی چاہئے۔ لیکن زوجین کی باہمی کشیدگی اور عدمِ اتحاد کے نتیجہ میں بُرے اثرات صرف میاں بیوی تک ہی محدود نہیں رہ سکتے بلکہ بچوں اور آنے والی نسلوں کو بھی بری طرح متاثر کر سکتے ہیں۔ اگر اس مصیبت کا سبب بیوی ہے تو اُس کی اصلاح کی توقع کس سے کی جانی چاہئے؟ اگر معاملہ عدالت تک جا پہنچتا ہے تو یہ بات زوجین کے درمیان حائل خلیج کو اور زیادہ چوڑا کرے گی کہ اُن کے نجی معاملات میں مداخلت کی گئی ہے۔ اُن کے باہمی اختلافات معمولی اور عارضی ہو سکتے ہیں لیکن عدالت کی مداخلت معاملے کو اور ہوا دے گی اور صورتِ حال کو سنگین بنا دے گی۔ کوئی بھی ذی ہوش انسان اپنے روزمرّہ کے معمولی مسائل کو عدالت تک لے جانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسے معاملات سے نمٹنے کے لئے کسی ایسی بااختیار ہستی کی ضرورت ہے جو بوقتِ ضرورت اس کی اصلاح اور سرزنش کر سکے اور وہ ہستی خاوند کی ہے جو خاندان کا حقیقی اور حتمی سربراہ ہے۔

''عورت کی اصلاح کے لئے تدریجی اور مرحلہ وار ذرائع (وعظ و نصیحت' خواب گاہ سے علیحدگی اور ہلکی مار) کی تجویز واضح طور پر اس بات کی مظہر ہے کہ عورت کی نفسیات پر اسلام کی نظر کیسی تیز اور بلیغ ہے۔'' --("Islam the Misunderstood Religion"... Muhammad Qutub, pp. 112, 113)

محمد قطب نے بڑی ذہانت سے قرآن کے اِس اقدام کا دفاع کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ سزا کسی بھی طرح عورت کے لئے ذلت آمیز یا اُس کی خودداری کو نقصان پہنچانے والی نہیں ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ)

اسلام میں عورت کے مقام کی بابت مسلم اور غیر مسلم شخصیات کی تشخیص

(1) ''عورت کے مقام کی بابت بالعموم اور شادی شدہ عورت کی بابت بالخصوص بلاخوف تردید یہ کہا جاتا ہے کہ قرآنی قوانین میں اُسے مقام فخر حاصل ہے۔ نکاح و طلاق کے قوانین متعدد اور مختلف الانواع ہیں اور عورت کے مقام کی اصلاح کے عمومی مقصد کے تحت قرآن نے عربوں کے روایتی قانون میں دُوررس اصلاحات کیں اور یہ اصلاحات بیوی کے مقام کو رُوبہ اصلاح کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوئیں۔'' ("A History of Islamic Law"... Noel J. Coulson, pp. 14, 15)

(2) ''زمانہ جاہلیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے' عیسائیت اور ہندومت بھی اس بات کا کبھی تصوّر تک نہ کرسکتے تھے کہ عورت کو ایسا مقام حاصل ہوسکتا ہے یا اُسے بھی جائداد کی ملکیت کا حق مل سکتا ہے۔ اِن مذاہب نے عورت کو اپنے خاوند کے مقابلے میں اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اِن مذاہب' معاشروں اور رواجوں میں عورت کی حیثیت لونڈی کی سی تھی اور وہ مرد کے رحم و کرم پر تھی۔ محمد (ﷺ) نے عورت کو آزادی' خود مختاری' خود اعتمادی اور زندہ رہنے کا حق عطا کیا۔'' ("Islam & Christianity" ... Margoliouth, pp. 28, 29)

(3) ''یہ بات ذہن نشین رہے کہ عورتوں سے متعلق اسلام کا قانون پورے عالم کے قوانین سے بڑھ کر عدل و انصاف پر مبنی ہے جس کی جزوی طور پر انگلستان میں پیروی کی گئی ہے۔ جائداد و ملکیت' حقوقِ وراثت اور طلاق کے معاملات میں عدل و انصاف اور عورت کے حقوق کی پاسداری کے حوالے سے مغرب کا قانون اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جب لوگ یک زوجیت (Monogamy) اور کثیر زوجیت (Polygamy) کے الفاظ سے خواب آوری (Hypnotisation) کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ مغرب میں اس کے پسِ پردہ عورت کی خوفناک تذلیل کے سوا کچھ نہیں جنہیں گلیوں میں پھینک دیا جاتا ہے جب اُن کے پہلے محافظ اُن سے تنگ آتے ہوئے اُنہیں کسی قسم کی امداد بہم نہیں پہنچاتے۔۔۔۔ مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اسلام میں عورت عیسائیت کی نسبت زیادہ آزاد ہے۔ اسلام میں عورت کو اُس مذہب کی نسبت زیادہ تحفظ حاصل ہے جو یک زوجیت (Monogamy) کا پرچارک ہے۔ قرآن میں عورت سے متعلق قانون زیادہ منصفانہ اور کشادہ دل ہے۔ گزشتہ صرف بیس سالوں سے عیسائی انگلستان نے عورت کے جائداد میں حقِ ملکیت کو تسلیم کیا ہے جبکہ اسلام اس حق کو ہر زمانے میں عورت کو دیتا آیا ہے۔ یہ کہنا محض بہتان اور الزام تراشی ہے کہ اسلام اس بات کا مبلّغ ہے کہ عورت میں روح ہے ہی نہیں۔'' ("The Life and Teachings of Muhammad" ... Annie Besant, pp. 3, 25, 26) Madras 1932 Edition.

(4) ''اسلام نے عورت کو مقام ارفع عطا کیا' اُس بے شرم شہوت پرستی کو فرو کیا جو زمانہ جاہلیت میں رائج العام تھی' طلاق کے منصفانہ قانون کی تشکیل کی' جہاں قبل ازیں زوجین میں جدائی بے ربط تبدیلی کا معاملہ تھا اور

خاوند کے ظلم وتشدد‘ ہوا وہوس اور بے انصافی کے خلاف بیوی کی حفاظت کی۔ اسلام نے فی الفور اور ہمیشہ کے لئے طفل کشی کو نابود کر دیا۔‘‘ ("History of the Moorish Empire in Europe" ... S.P. Scott, p. 60)

(5) ’’آپ (ﷺ) ہی قانون کے عطا کرنے والے اور اس بات کے دعویدار ہیں کہ وحیِ الٰہی آپ کے پاس آتی ہے۔ آپ نے تعددِ ازواج (Polygamy) پر کچھ پابندیاں لگانے اور کچھ قوانین وضوابط عائد کرنے کے ذریعے جن سے حقوق کے چھن جانے کے بغیر فرار ممکن نہیں‘ عورتوں کی حالت کی اصلاح کی۔ طلاق پر کچھ پابندیاں عائد کرنے‘ بیوگان کو غربت وعُسرت سے مامون ومحفوظ کرنے اور دُختر کشی کو روکنے کے ذریعے اِن فرامین کے فائدہ مند اثرات آپ کے نام کی عزت وتوقیر میں قابلِ لحاظ اور وقیع اضافہ کرتے ہیں۔‘‘ (ایضاً صفحہ ۱۰۳)

(6) ’’محمد (ﷺ) پورے عالم میں اِس حیثیت سے منفرد ہیں کہ آپ نے حقوقِ نسواں سے دنیا کو متعارف کرایا اور اُن حقوق کو تحفظ فراہم کیا۔ آپ کی آمد سے پہلے عورتیں مَردوں کے شادنیت زدہ سماج # میں بے یارومددگار ہو کے رہ گئی تھیں۔ اقتصادی لحاظ سے اُسے معاشرہ میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ محمد (ﷺ) نے ایسے قوانین سے معاشرے کو متعارف کرایا اور اُن کا نفاذ کیا جن سے بیویوں کی تعداد کی حد بندی ہوگئی۔ پیغمبرِ اسلام نے عورتوں کے مقام کو بدل دیا۔ وہ ذات جسے بذاتِ خود ایک جائداد واثاثہ سمجھا جاتا تھا‘ اب ملکیت کا حق رکھنے لگی۔ عورتوں کے لئے حقِ وراثت کے قانون کی تشکیل پورے عالم میں پہلی‘ انوکھی اور نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔‘‘

(اُردو ڈائجسٹ‘ مئی ۱۹۸۹ء رحمۃ للعالمین نمبر‘ جلد دوم‘ صفحہ ۳۴۰)

(7) ’’جب مغربی دنیا میں عورتوں کو منقولہ اثاثہ سمجھا جاتا تھا اور اس بات میں بڑی سنجیدگی سے شک کیا جاتا تھا کہ آیا اُس میں روح ہے بھی کہ نہیں‘ اسلامی قانون نے اس سے پہلے عورت کو جائداد کا حقِ ملکیت عطا کر دیا تھا۔ بیوگان اپنے خاوندوں کے ترکہ میں حصّہ دار ہوگئیں اور لڑکیاں لڑکوں کے حصّوں سے نصف پر قانع ہوگئیں۔ جدید طریقے کی روشنی میں بہ ظاہر ایسے وراثتی قوانین غیر منصفانہ لگتے ہیں لیکن اس کا کیا کیجئے کہ مغرب میں اب تک صرف لڑکوں کو وراثت میں حصّہ دیا جاتا ہے۔‘‘ ("Islam and the Arabs"... A. Landau, p.138)

(8) ’’آزادیٔ نسواں کے لئے مغرب کے حامی لوگوں کو جو اسلام کی اُس کی زن بیزاری (Misogyny) کی وجہ سے علی الاعلان مذمت کرتے ہیں‘ اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ عورتوں کے لئے عیسائی روایت بھی انتہائی منفی رہی ہے۔ محمد (ﷺ) اور اسلام کو اُن کی زن بیزاری کا الزام دینا درست نہیں ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ اپنی بیویوں سے باعزت رویّہ اختیار کریں۔ مغرب میں لوگوں کے خیال کے برعکس اسلام نے حقوقِ نسواں کو پامال نہیں کیا اور کچھ کا خیال ہے کہ اسلام نے عورت کو وہ حقوق عطا کئے جن کا تصوّر تک زمانہ جاہلیت میں نہیں کیا جاتا تھا۔‘‘ ("Muhammad---A Biography of the Prophet"..Karen Armstrong, p. 240)

#انگریزی میں اس کے لئے Male Chauvinist Society کے الفاظ ہیں جن کا مطلب مَردوں کے حق میں مبالغہ آمیز خیالات اور عورتوں سے تعصب رکھنے والے معاشرہ کے ہیں۔ اُردو میں اس کا ترجمہ ’’مردانہ شادنیت‘‘ کا کیا گیا ہے۔

(9) ''عورتوں کے مخصوص حقوق کی قانون سازی کے ذریعے قرآن نے عورتوں کی حالت کی اصلاح کی ۔ قرآن کے عام اصول کی رُو سے عورتوں کے حقوق مَردوں کے حقوق کے ہم مقدار ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''مَردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے'' (سورۃ البقرۃ: ۲۲۸) ۔ اِن الفاظ کی تاویل عملی سماجی حالت کی روشنی میں کی جائے جس میں مرد نہ صرف روٹی کمانے والا ہے بلکہ ایک لازمی اور ناگزیر فعّال عامل بھی ہے ۔'' (انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا' جلد ۱۲' صفحہ ۲۶۹) ۱۹۶۸ ایڈیشن ۔

(10) ''محمد (ﷺ) نے عورت کو پراپرٹی کی حیثیت سے اُٹھا کر پروپرائٹر کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا ۔ آپ نے اُسے (ہر شعبۂ حیات میں) اوّلیں حصّہ دار بنا دیا اور اُس کے مفادات کا تحفظ محمدی قانون میں کر دیا گیا ۔'' ("Muhamadanism in Religious Systems of the World" -- A Collection of Addresses by Swan Sonnenschein & Co., p. 298)

(11) ''صنفِ نازک کے متعلق یہ نظریہ کہ وہ ایک بے جان ہستی ہے اگرچہ ضرر رساں نہ سہی لیکن مخالف دنیائے عیسائیت کی جانب سے مسلم دنیا پر ٹھونس دیا گیا ۔ میں Buron کی بات سے بالکل متفق ہوں کہ مسلمان اس انتہائی حد تک نہیں جاسکتے ۔'' ("Islam"... A. G. Leonard, p. 79) 1909 Edition.

(12) ''مرد کی دُنیا اور عورت کی دُنیا کے مابین' بہ حیثیتِ مجموعی سماج اور خاندان کے مابین جو سماج کا مرکزی حصّہ ہے' عام گزرگاہ اور گھر کے درمیان اسلام نمایاں فرق رکھتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ معاشرہ اور فرد یا ظاہریت (Exotericism) اور باطنیت (Esotericism) کے مابین فرق روا رکھتا ہے ۔ گھر اور عورت جو گھر کی تجسیم (Incarnation) یعنی انسانی شکل میں بذاتِ خود گھر ہے' دونوں قابلِ احترام ہیں اور تقدّس کے حامل ہیں ۔'' ("Understanding Islam" ... F. Schuon : translated into English by D. M. Matheson, p. 37, 1965 Edition)

(13) ''محمد (ﷺ) نے عورت کے مقام کو بہتر بنایا ۔ آپ نے عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دی لیکن اُس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اُن کے گھر اُن کے لئے بہتر ہیں ۔ جب عورتیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آپ اُن سے مہربانی سے پیش آتے اگرچہ اُن کی گودوں میں دودھ پیتے بچے ہوتے ۔ ایک خوش کن حدیث کی رُو سے آپ جب کسی عورت کی گود کے بچے کے رونے کی آواز کو سنتے تو اپنے خطبے کو مختصر کر دیتے تاکہ بچے کی ماں کو بے آرامی نہ ہو ۔ آپ نے عربوں کی (دیرینہ) دختر کشی کا خاتمہ کر دیا (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: ۳۱) ۔ آپ نے قانونی طریقِ عمل اور خود مختاری میں عورتوں کو مرد کے شانہ بہ شانہ کر دیا ۔ وہ کوئی بھی جائز اور شرعی پیشہ اختیار کر سکتی ہے' اپنی کمائی اپنے پاس رکھ سکتی ہے' ورثے میں حق دار ہے اور اپنے اثاثے کا اپنی مرضی سے تصرف کر سکتی ہے (بحوالہ سورۃ النساء: آیات ۴' ۳۲) ۔ آپ نے عربوں کے عام رواج یعنی باپ سے لڑکے کی طرف عورت کی بطور جائداد منتقلی کو منسوخ کر دیا ۔ وراثت میں عورت کو مرد سے نصف دے کر اُسے مطمئن کر دیا ۔ عورت کی رضامندی کے بغیر کسی سے اُس کا نکاح نہیں کیا جاسکتا ۔'' ("The Age of Faith"... Will Durant, pp. 181, 182)

(14) ''حقِ مہر اور بھلے طریق سے خوراک کی بہم رسانی کے حوالے سے عورت کا اپنے خاوند کی جائداد پر حق ہے بالکل اسی طرح جیسے اچھی رفاقت (ہمراہی) اور لطف اندوزی کے حوالے سے اُس کا حق اُس کے جسم پر ہے۔'' ("Ibn-e-Taymiyya on Public and Private Law in Islam" ... Dr. Qamar A. Farrukh, p. 177)

(15) ''والد کے گھر سے اپنے خاوند کے گھر کو منتقلی تک کے تمام عرصے میں عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مرد کو قانوناً حاصل ہیں۔ اُن تمام مراعات کا اُس کے حق میں تحفظ کر دیا گیا ہے جو بطور عورت اور بطور بیوی کے اُسے حاصل ہیں' اُن رعایتوں کی رُو سے نہیں جن کی ''آمد و شد'' رہتی ہے بلکہ اُس استحقاق کی بدولت جو قانوناً اُسے حاصل ہے۔'' ("The Spirit of Islam" ... Amir Ali, pp. 256, 257) Karachi, 1976

<u>عورت اور جہاد</u> : عورت پر جہاد فرض نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جہاد میں عورت کی شرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کی سوائے اُن چند مواقع کے جن میں آپ نے چند عورتوں کا انتخاب کیا۔ جب کچھ صحابیات نے آپ سے جہاد میں شرکت کی درخواست کی تو آپ نے اُنہیں بتایا کہ اُن کا جہاد ''حج'' کرنے میں ہے جس کا مطلب یہی تھا کہ اُنہیں حج کرنے میں وہی ثواب ملے گا جو مَردوں کو اللہ کے دشمنوں سے لڑنے میں ملتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا' نبیِ مکرّم ﷺ نے چند عورتوں کو ابتدائی طبّی امداد (فرسٹ ایڈ) اور دیگر ذیلی خدمات بجالانے کے لئے جہاد میں اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دی۔ چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

(۱) اُمِّ عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ سات مہمات میں گئی اور سامان کی حفاظت' مجاہدین کے لئے کھانا تیار کرنے' زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنے میں پیچھے رہی (صحیح مسلم)۔

(۲) اُمِّ سُلَیط رضی اللہ عنہا نے بھی مجاہدین کو پانی پلانے میں اُن کی خدمت کی (صحیح بخاری)۔

(۳) رُبَیِّع بنت مُعَوِّذ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کی ہمراہی میں زخمیوں کو پانی پلانے' اُن کا علاج کرنے اور شہداء کو میدانِ جہاد سے مدینہ منورہ لانے پر مامور تھیں۔

(۴) سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جہاد کو جانے سے پہلے ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ہمارے درمیان قرعہ اندازی کی اور قرعہ میرے نام نکلا۔ تو میں آپ کے ساتھ گئی اور یہ واقعہ آیتِ حجاب کے نزول سے پہلے کا ہے (صحیح بخاری)۔

اِن احادیث میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ عورتیں نبی علیہ السلام کی اجازت کے ساتھ مختلف غزواتی مہمات میں شریک ہوتی رہی ہیں اور اِن واقعات کا مطالعہ اس بات کا مظہر ہے کہ عورتیں میدانِ جہاد میں مجاہدین کے لئے بڑی مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ اس چیز کی ضرورت اور ناگزیریت اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب اَفرادی قوت (Manpower) کم ہوجائے اور جنگ کے محاذ پر ہر نوجوان کی ضرورت پڑ جائے۔ تاہم اِن نازک اور ہنگامی حالات میں بھی عورت کی جہاد میں شرکت مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مشروط ہے:۔

''(۱) یہ کہ اُن کی خدمات کی فی الواقع ضرورت ہو اور وہ مجاہدین کی ہمراہی مغرب کی Women's Army Corps (WACS) کی شکل میں اُن کے جنسی دباؤ کو کم کرنے کے لئے نہ کریں۔
(۲) یہ کہ صرف اُنہی عورتوں کا انتخاب کیا جائے جو مجاہدین کی خدمت کرنے کی اہل ہوں بغیر اس کے کہ وہ کسی بدطینت سپاہی کی توجہ اور جاذبیت کا مرکز بنیں۔ بہ الفاظِ دیگر اگر پختہ عمر خواتین کو نوخیز اور نوجوان لڑکیوں پر ترجیح دی جائے تو ایسے نازک جنگی لمحات میں اسلامی اقدار کی پاسداری میں یہ بات سب کے مفاد میں ہوگی۔
(۳) اس خدمت کے لئے صرف تربیت یافتہ اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی حامل خواتین کا انتخاب کیا جائے۔
(۴) یہ منتخب شدہ خواتین اپنے تفویض شدہ کام کو انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ اس طرح انجام دیں کہ مَردوں سے اُن کا کم سے کم ملنا جُلنا ہو اور وہ قرآن کے مقرر کردہ معیارِ ''حجاب'' کی مکمل طور پر پابندی کریں اور کسی بھی حالت میں مَردوں کے آگے اپنی زیب و زینت کو ظاہر نہ کریں۔''

''اگر خواتین اِن شرائط کی پابندی کریں تو جنگی زمانے میں قومی مفاد کی خاطر اُن کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اہم نقطہ اسلامی سرحدوں کو غیر ملکی جارحیت سے بچانے کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی پاکیزگی اور شرم و حیا کا تحفظ ہے۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ' جلد پنجم' صفحات ۳۲۷'۳۲۸)

''<u>حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' کے خلاف سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جدّ وجُہد</u>: مغربی طرز کی آزادیٔ نسواں کی بنیاد پر جو ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہے' لوگوں نے غلط طور پر آزادیٔ نسواں کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' کے خلاف اِقدام کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سیاسی' معاشرتی اور ثقافتی آزادی کی فطرت جس کا مغرب کو عورت کے لئے دعویٰ ہے' اُس آزادی سے بالکل مختلف ہے جو اسلام نے عورت کو عطا کی ہے۔ اسلام جس سمت عورت کو لے جانا چاہتا ہے' وہ اُس سمت سے قطعاً مختلف ہے جس کی طرف مغربی فکر اپنی عورتوں کو لے جا رہی ہے۔ اسلام گھر کو عورت کی سرگرمیوں کا مرکز سمجھتا ہے جبکہ مغرب عورت کو اس کے خلاف بغاوت کرنا سکھاتا ہے۔ اس طرح عورت کے معاشرتی مقام کے اسلامی نظریہ اور مغربی فلسفہ کہ عورت ہر قسم کی خانگی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر آزاد ہے' کے درمیان کھلا تضاد ہے۔ اِن دو نظریوں کے مابین کھلے تضاد کی موجودگی میں کچھ لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اِقدام کا سہارا لیتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آپ کا یہ اِقدام غیر معمولی حالات کا نتیجہ تھا جس میں آپ اُن حدود سے تجاوز کر گئیں جو قرآن مجید نے نبی علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات کے لئے مقرر کی ہیں۔ اِسی اِقدام کی بناء پر وہ عورت کے لئے اسلامی معاشرے میں مغربی طرز کی آزادی کا پرچار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صرف اسی ایک واقعہ کی بنیاد پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سیاسی جدّ وجُہد میں عورت کو بھی اُسی طرح کا حق حاصل ہے جس طرح مرد کو حاصل ہے اور اس لئے اسلامی نقطہ نگاہ سے اُس کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگانا صحیح نہیں ہے۔ اُن کا یہ رویّہ دونوں صنفوں کے درمیان اُس قدرتی فرق کی نفی کرتا ہے جس سے کارزارِ حیات میں اُن کے میدانِ عمل کا تعیّن ہوتا ہے۔

''نبی علیہ السلام اور آپ کے خلفائے راشدین کے زمانوں میں اُمّت کو کئی معاشرتی اور سیاسی مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن اُن کے حل کے لئے اُنہوں نے نہ تو کبھی کسی عورت سے مشورہ کیا اور نہ ہی کسی عورت کے مشورے پر انحصار کیا۔ اِن زمانوں میں بہت سی جنگیں بھی لڑی گئیں لیکن کسی مہم میں عورت نے کمان نہیں سنبھالی' بہت سے گورنروں کی تعیناتی ہوئی لیکن کسی عورت کو اس منصب پر فائز نہیں کیا گیا۔ مالیات اور قضا کے محکمے قائم ہوئے لیکن یہ ذمہ داریاں کسی عورت کو تفویض نہیں ہوئیں۔ پیغمبر علیہ السلام کی وفات کے بعد اُمّت مسئلہِ خلافت کو ہمیشہ خود حل کرتی رہی لیکن عورت کو اپنا خلیفہ بنانے کا سوال کبھی کھڑا نہیں ہوا۔ انتہائی ہنگامی حالات میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اِس تنہا اِقدام کو شریعتِ اسلامی کے اصول کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی کے انفرادی عمل سے معاشرتی رویّے ثابت کئے جا سکتے ہیں۔''

''اس سے قطع نظر اگر سیّدہ کے اس تنہا اِقدام کو پیروی کے لئے قانونی نظیر بنا ہوتا تو دوسری اُمہات المؤمنین اور سربرآوردہ صحابہ کرام کے رویّے کا کیا کیجئے گا۔ اگر سیّدہ کی حضرت علی کے خلاف جنگ کو اپنے لئے قانونی نظیر اور سند کے طور پر دیکھنا ہے تو اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمّ سلمٰی رضی اللہ عنہا کے رویّے کا کیا کیجئے گا؟ جب حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' حضرات طلحہ' زبیر اور سیدہ عائشہ سے لڑنے بصرہ کو جا رہے تھے تو اُمّ سلمٰی رضی اللہ عنہا نے جنابِ علی سے فرمایا تھا: ''اے امیر المؤمنین! اس مہم میں میرا آپ کے ساتھ جانا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سمجھا جائے گا اور آپ خود بھی میرے اس عمل کو قبول نہیں کریں گے۔ اگر ان دو چیزوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور آپ کے ساتھ چلتی۔ میرے اس چچیرے بھائی کو اپنے ساتھ لیجئے۔ بخدا! وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ جائے گا اور جنگ میں آپ کے ساتھ شریک ہوگا۔'' (تاریخ طبری)

''اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمّ سلمٰی نے حضرت عائشہ صدّیقہ کو لکھ بھیجا: ''رسول اللہ ﷺ اور اُمّت کے درمیان آپ کی حیثیت ایک دروازے کی سی ہے اور آپ کا حجاب (پردہ) اُس کی حُرمت پر ایک اوٹ ہے۔ لیکن آپ نے حُرمت کے اس پردے کو چاک کر دیا ہے۔ یاد رکھئے کہ قرآن مجید نے آپ کی چادر کی وسعت کو محدود کر دیا ہے' خدارا اسے وسعت مت دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گھر میں رہنے کا حکم فرمایا ہے لہٰذا اُسے چھوڑ کر جنگ کو مت جائیے۔ اللہ تعالیٰ اس اُمّت کی حفاظت کر رہا ہے۔ آپ بخوبی جانتی ہیں کہ نبی ﷺ کو آپ سے کتنی محبت تھی۔ اگر آپ ﷺ کو اُمّت کی ذمہ داری آپ کے سپرد کرنا ہوتی تو آپ ایسا کر سکتے تھے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر دین کا ستون گرنے کو ہو گیا تو عورتیں اُسے سیدھا نہیں کر سکتیں اور اگر اُس میں شگاف پڑ گئے تو عورتیں اُنہیں پُر نہیں کر سکتیں۔ اگر دین کی خاطر عورتوں میں جہاد کرنے کی اہلیت ہوتی تو پیغمبر علیہ السلام یقیناً آپ کو اس ذمہ داری کے سنبھالنے کی وصیت فرما جاتے۔ عورتوں کے لئے انتہائی پسندیدہ چیز یہ ہے کہ وہ اپنی نظروں کو جھکائے رکھیں اور اپنی حدود کے اندر رہیں۔''

''ذرا اُس لمحے کا تصوّر تو کیجئے اگر آپ کا سامنا نبی علیہ السلام سے اس حال میں ہو کہ آپ اونٹ پر بیٹھی

اونٹ کو ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف بھگا رہی ہوں تو آپ اُنہیں کیا جواب دیں گی؟ کل آپ کا سامنا نبی علیہ السلام سے ہونا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ پردے (حجاب) کو تار تار کر دیا ہے اور اللہ سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑ دیا ہے۔ جو قدم آپ نے اُٹھایا ہے اگر میں اٹھاتی تو بخدا! میں جنت میں جانے تک سے شرما جاتی۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ نبی علیہ السلام کے قائم کردہ پردے کو اپنا ''ستر'' (حجاب) اور اپنے گھر کی چاردیواری کو اپنا قلعہ بنا لیجئے۔ اگر آپ اپنے گھر میں رہیں اور میدانِ کارزار کو نہ جائیں تو آپ صحیح معنوں میں اُمّت کی محسنہ ہوں گی۔ اگر میں نے اُس حدیث کو بیان کر دیا جو میں نے نبی علیہ السلام سے سنی تھی تو یقین کیجئے کہ آپ سانپ کی طرح مجھے ڈسنے کے لئے چلی آئیں گی۔'' (اَلعقد الفرید لابن عبدربہٖ' ج ۳' ص ص ۹۶' ۹۷)

''سیّدہ عائشہ کے اس اِقدام پر تنقید کرنے میں سیّدہ اُمِّ سلمٰی تنہا نہیں تھیں۔ بہت سے سربرآوردہ صحابہ کرام نے سیّدہ کے اِس اِقدام کو غلط اور شرعی حدود کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز قرار دیا جس کی مثالیں طبری کی ''تاریخ الرُّسل والملوک'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

''پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس اُمّتِ مسلمہ کو اپنے ابتدائی سالوں میں کئی سیاسی اور ثقافتی واقعات کا سامنا کرنا پڑا اور اربابِ عقل و دانش نے اِن واقعات کو صحیح جہت پر لے جانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی خاتون کبھی اُن کے خلاف کھڑی نہیں ہوئی۔ نبی علیہ السلام کے بعد سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تقریباً پچاس برس بقیدِ حیات رہیں اور اس دوران اُمّت پر کئی نشیب و فراز آئے لیکن سیّدہ نے ہمیشہ اُن سے گریز کیا اور حالات کو رُوبہ اصلاح کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ آپ گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز سمجھتی تھیں؟ آپ کی فکر اور رویّے کے انداز جس کی تصدیق و تائید آپ کی تمام زندگی سے ثابت ہے' کا انکار آپ کے اِس تنہا اقدام کی وجہ سے نہیں کیا جا سکتا۔''

''معاملے کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے شہادتِ عثمان سے پہلے اور بعد کے واقعات کے پیچھے کارفرما فلسفے میں گہری تفتیش اور تنقیدی نظر کی ضرورت ہے۔ ان تمام واقعات نے امتِ مسلمہ کی بنیادوں کو اور تمام مخلص مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ایک ''فتنہ'' ہے اور فتنہ کے اِن حالات کو معمول پر لانے کے لئے شہادتِ عثمان کا قِصاص لینا ضروری ہے ورنہ صورتِ حال کے بگڑنے سے اُمّت کی اجتماعی قوّت اور ساکھ کو نقصان پہنچے گا اور کنٹرول بدلوگوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ اِس مکتبِ فکر کے قائدین حضرات طلحہ اور زبیر تھے۔ جب مالک بن عوف السّلمی نے جناب زبیر سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا: ''ہم لوگوں کو قصاصِ عثمان پر اُبھار رہے ہیں تاکہ خون رائیگاں نہ جائے کیونکہ اس کا رائیگاں جانا سلطنتِ اسلامیہ کو ہمیشہ کے لئے کمزور کر دے گا۔ اگر مجرموں کے اس جرم کی بندش نہ کی گئی تو بعد میں آنے والے ہر خلیفہ اور امام کو تلوار کی ایک ضرب سے زندگی کے خاتمے کا خطرہ مول لینا ہوگا۔ بخدا! قِصاص کا نہ لینا ایک دشواری کی بات ضرور ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس کے کتنے دُوررس نتائج ہوں گے۔'' (''تاریخ الرُّسل و المُلوک'' للطبری' جلد پنجم' صفحہ ۱۷۳)

''لوگوں کا ایک اور طبقہ وہ تھا جو اِن حالات میں اُمّت کی وحدت اور یک جہتی کو اوّلیت دے رہا تھا۔ اُنہوں

نے دیکھا کہ اُمّت کی وحدت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور وہ تار تار ہو کے رہ گئی ہے اور یہ کہ اُمت کے ایک طبقے نے ایک خود مختار اور خود سر فوج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اِن حالات میں قِصاصِ عثمان کی بات کرنا اُمّت کے مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور ابتری کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے سب سے پہلے اُمّت کی توانائیوں کو ایک جگہ پر اکٹھا ہونا ضروری سمجھا اور اس مقصد کے لئے اُنہوں نے حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' کو اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ اہالیانِ مدینہ کی اکثریت نے اس طبقہ کی حمایت کی۔''

''اِن واقعات کے وقوع سے پہلے ہی سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حج کے ارادے سے مدینہ منورہ سے جا چکی تھیں اور اُنہیں صحیح صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ مدینہ سے آنے والے لوگوں نے حضرت علی کے بطور خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کی صورتِ حال کی صحیح تصویر آپ کے سامنے نہیں رکھی۔ آپ کو یہی تاثر دیا گیا کہ غنڈوں' بدمعاشوں اور بدفطرت لوگوں نے مدینہ پر قبضہ کر لیا ہے اور یہ کہ حضرت علی اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور مکمل طور پر بے اختیار ہو کر رہ گئے ہیں۔ سیّدہ کو یہ بتایا گیا کہ ہم اقلیت میں ہیں اور اپنی جانوں کے خوف سے ہم مدینہ سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ ہم اپنے پیچھے ایک پریشان حال اور فکر مند قوم (یعنی اہالیانِ مدینہ) کو چھوڑ آئے ہیں جو نہ تو حق وصداقت کو پہچانتی ہے' نہ ہی باطل کی مخالفت کرتی ہے اور نہ ہی اُس میں اپنا دفاع کرنے کی سکت ہے۔'' (ایضاً' ج ۳' ص ۱۰۹)

''طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما جو حضرت علی کے حلیف بننے کے خلاف تھے' کی رائے یہ تھی کہ قِصاصِ عثمان اوّلیں ترجیح ہے۔ وہ دونوں مکہ مکرّمہ گئے اور اُمّہات المؤمنین سے بہ شمول سیّدہ عائشہ کے درخواست کی کہ وہ دین کے استحکام میں پہلے قِصاصِ عثمان لے کر اُن کی مدد کریں۔ لیکن حضرت عائشہ کے سوا سب نے اِس اقدام کو اپنی حدود سے باہر سمجھتے ہوئے اُن کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور مدینہ منورہ کو واپس چلی گئیں۔''

''سیّدہ عائشہ صدّیقہ کا حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' سے جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ وہ بدتر صورتِ حال کی اصلاح کے لئے اُمّت کو دعوت دینا چاہتی تھیں جیسا کہ بصرہ کے گورنر کے نام اُن کے اُس خط سے ظاہر ہے جسے ''الکامل'' لابن اثیر کی جلد سوم کے صفحہ ۸۹' اور تاریخ طبری کی جلد پنجم کے صفحہ ۴۷ پر دیکھا جا سکتا ہے۔''

''یہ توضیحات صاف طور پر اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ نہ تو آپ کو کسی منصب یا عہدے کے حصول کی خواہش تھی اور نہ ہی آپ نے حضرت علی کے خلاف جنگ کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا تھا بلکہ اپنے اثر و رسوخ کی بدولت امت کی توجہ اُس وقت کی صورتِ حال کی اصلاح کی طرف مبذول کرانا چاہتی تھیں۔ اسی مقصد کی خاطر وہ اپنے گھر سے نکلیں کیونکہ اُن کے خیال میں اُن کا گھر سے نکلنا امت کے لئے فائدہ مند ہوگا۔'' (''منہاج السنۃ'' ج ۲' ص ۱۸۵)

''اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعد میں آپ کو حضرت علی سے جنگ کرنا پڑی لیکن یہ اقدام آپ کے ارادے اور مرضی کا حصّہ نہیں تھا۔ واقعات کے تسلسل نے آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر چہ سیّدہ عائشہ اِس مکتبِ فکر کے قائد ہونے کی حیثیت میں تھیں اور تمام مسائل آپ ہی کے مشورے سے حل کئے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں کہ آپ نے مشیر اور خیر خواہ ہونے سے بڑھ کر یا مسلمانوں کی امامت کا کوئی دعویٰ کیا ہو۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو آپ کے ایک اشارے پر ہر چیز قربان کرنے کو تیار تھے' آپ کی خلافت اور امامت کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ نمازیں حضرات طلحہ یا زبیر رضی اللہ عنہما کی امامت میں ادا کی جاتی تھیں اگر چہ نماز کی امامت اُمّتِ مسلمہ کی قیادت کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ یہ سب باتیں اُن لوگوں میں موجود تھیں جو آپ کے مخالف نہیں بلکہ آپ کے زبردست حامی اور حمایتی تھے اور آپ کا فیصلہ اور آپ کا دینی مقام حضرات طلحہ' زبیر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے کہیں ارفع واعلیٰ تھا۔''

''اِن انتہائی نازک اور اُمّت کے تحفظ اور یک جہتی کے لئے پُر خطر حالات میں اگر چہ وہ عارضی تھے' سیّدہ عائشہ ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئیں جو وہ عام حالات میں نہ اُٹھاتیں۔ اس ایک' اکیلے اور استثنائی واقعہ کو مستقل سند اور قانونی نظیر کے طور پر سمجھنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی قریب المرگ پیاسے کو شراب پیتے ہوئے دیکھ کر شراب کے قانونًا جائز ہونے کا حکم نامہ جاری کر دیا جائے۔'' ("Aurat in Islamic Society" ... Sayyid Jalalud Din Ansari Umri, with reference to Encyclopaedia of Seerah.

:

<u>مغرب میں عورت کا مقام</u> : علی اصغر چشتی کے الفاظ میں :

''رضائے الٰہی کی کھلے بندوں مخالفت میں ہند کے مسلمانوں نے برطانویوں کو وہ اَلقاب اور تسلیم و نیاز کے وہ آداب دیئے جو روحِ اسلام کے لئے انتہائی ہتک آمیز تھے۔ ہند کے مسلمان نیم برہنہ برطانوی خواتین کو اُن اعزازی ناموں سے پکارتے تھے جو سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی ذی وقار و محترم عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔ برطانویوں کو تسلیم و نیاز کے اُن آداب کے ساتھ پکارا جاتا تھا جن کے مستحق حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' جیسے عظیم و شجاع اور متقی مسلم قائدین تھے۔ پستہ قد کے اِن غیر مسلم بونوں کے مقام کو مبالغاتی حد تک لے جانے کا رُجحان یہاں تک بڑھا کہ (معاذ اللہ) ہم نے برطانوی ''آقاؤں'' کو اللہ قادرِ مطلق کے برابر کر دیا۔ فرنگیوں کی پیروی میں ہمارے لوگوں نے اپنی داڑھیاں اور مونچھیں منڈوا دیں اور ہماری عورتوں نے اپنے بال کٹوا دیئے اور پردے کو اُدھر دے مارا جو اُن کی پاکدامنی کی ایک علامت تھا۔ ہماری عورتوں نے عام لباس کو ترک کر کے جیکٹ اور گھٹنے سے اوپر تک کے ستر پوش (Shorts) کو اختیار کر لیا تاکہ وہ نام نہاد خود ساختہ Madam نظر آئیں۔ ہم نے مغرب کی تمام بُری عادات کو اپنا لیا اور اپنے نبی ﷺ کے دکھائے ہوئے طرزِ زندگی کو ترک کر دیا۔ جب برطانویوں کو محسوس ہوا کہ اُنہوں نے ہندی مسلمانوں کی اسلامی ثقافت کو بگاڑ دیا ہے تو اُنہوں نے مقدس مسلم خواتین کو نرسیں بننے اور فلموں میں کام کرنے کا چکمہ دیا۔ ہر غیر شریفانہ کام عورت سے کرایا گیا جو ننگی تصویروں میں مظاہرے کے ذریعے ایک قابلِ خرید جنس بن کے رہ گئی۔ یہ رُجحان ابھی تک جاری ہے اور مستقبل میں اس ناگوار اور باعثِ کوفت عمل پر بندش لگنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' ("Islam and Women" ... pp. 61, 62)

اور یہودیت سے تائب ایک نومسلمہ مریم جمیلہ کے الفاظ میں :

''اگر ڈارون کے فلسفہ نے مغربی معاشروں میں اخلاقی نظریات کو مٹا دیا ہے تو فرائڈ کے نظریہ نے بھی اُن کے فن اور ادب (لٹریچر) کی اچھائی کو کم نقصان نہیں پہنچایا۔۔۔۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر صحتمند فسوں کاری اور اخلاقی بے راہروی کے ساتھ ساتھ ہرجائی پن اور آزادانہ جنسی میل جول کو اب نہ صرف برداشت کیا جا رہا ہے بلکہ سماجی رواج اور عوامی ذرائع ابلاغ (Mass Media) اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ چونکہ نسوانی جسم کا کاروباری استحصال ایک بڑی تجارت بن چکا ہے' اس لئے عوام الناس نسوانی لباس میں بے حیائی اور بے شرمی کے فیشنوں کو قبول کر رہے ہیں۔شرم و حیا' پاکبازی و پاکدامنی' باہمی وفاداری اور فرزندانہ سعادتمندی کو نیکی تک نہیں سمجھا رہا۔'' ("Western Civilization Condemned by Itself", Vol. 1)

''نام نہاد آزادیِ نسواں کا نعرہ عورت کا محض بے رحمانہ کاروباری استحصال ہے۔ ہر تنظیم اور ادارے نے خوبصورت نوخیز لڑکیوں کو فلمی صنعت تک پہنچا کر اُن کا استحصال کیا ہے۔مغربی معاشرہ اخلاقی بے راہروی کے اُس مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔انسانی سماج کی تاریخ میں اخلاقی تنزلی کا گراف کبھی بھی ایسی تیزی سے نہیں گرا جیسا کہ وہ بیسویں صدی کی مغربی دنیا میں گرا ہے۔مغرب میں عورت کی حیثیت المناک ہے۔اُس کی پاکدامنی اور شرم و حیا کے کھیت کو چڑیاں چگ گئی ہیں اور مرد کی بہیمانہ شہوت کی تسکین کے لئے اُس کے حسین و جمیل جسم کا کاروباری استحصال کیا جا رہا ہے۔اپنی پُرسکون عائلی زندگی کو وہ کھو چکی ہے' میاں بیوی اور بچے اور ماں کے مقدس رشتے میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اُسے اپنے آپ کو اور بچوں کو پالنے کے لئے سخت محنت و ریاضت کرنا پڑتی ہے۔مختصر یہ کہ وہ ہر چیز یہاں تک کہ وہ اپنی نسوانیت سے بھی آزاد ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود یہ اُسی کی ذات ہے جس نے بچوں کو بھی جنم دینا ہے اور روزی کمانے کی کلفت کو بھی برداشت کرنا ہے اور وہ بھی کسی آرام و سکون اور خوشی و مسرت کے بغیر!''

''موجودہ دَور کی مسلم خواتین کے لئے لمحہ فکریہ : اب یہ فیصلہ کرنا مسلم خاتون کا کام ہے کہ اپنے رفیقِ حیات اور بچوں کے ساتھ مساوی حقوق سے لطف اندوز ہونے کے لئے اُس کے لئے کون سی راہ بہتر ہے۔ آیا وہ عزت و وقار کی زندگی چاہتی ہے یا اپنی عزت' پاکدامنی' اپنے خاوند' اپنے بچوں' اپنے گھر اور عائلی زندگی تک کو کھو دینا چاہتی ہے۔لیکن اس کے بدلے میں اُسے ملے گا کیا؟ یہی ناں کہ عائلی زندگی میں الفت و محبت جیسی روح پرور اور پُر لطف نعمت سے محرومی کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش کا بوجھ اور ریٹائرمنٹ کی عمر تک روزی کمانے کی صعوبت و کلفت اٹھانے کا بوجھ اُس کا مقدّر بن کے رہ جائے گا! مغربی دنیا میں ''آزادیِ نسواں'' کی طرف سے دیا گیا یہی ورثہ ہے۔''

زمانۂ جدید کی مسلمان بنتِ حوا اپنی انفرادیت کھو چکی ہے اور مغربی طرزِ زندگی کے اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ وہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی احسان فراموش ہے جنہوں نے اُسے عظمت و رفعت کی اُن اعلیٰ بلندیوں تک پہنچا دیا جن کا کبھی تصوّر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا چاہتی ہے؟ کیا اُس کی اَنا اور خودی ''شمعِ محفل'' بننے میں تسکین چاہتی ہے کہ لاتعداد شہوت پرست' ہوا و ہوس کی لالچی آنکھیں اُس کا تعاقب کریں یا کہ وہ ''شمعِ خانہ'' بننا چاہتی ہے کہ گھر میں رہ کر وہ اُن فرائض کو بہ احسن طریق انجام دے جو اُس کے خالق و مالک نے اُس کے کندھوں پر ڈالے ہیں۔ کیا قابلِ خرید جنس بننا اُس کی شان کے لائق ہے کہ اُسے سائن بورڈوں' سبزیات کے تیل کے ڈبوں' ٹالکم پاؤڈر کی شیشیوں' صابن اور چائے کے اشتہاروں' بڑے بازوں کی دکانوں' سکول کالج کی کاپیوں' ریڈیو' ٹیلیویژن' ریلوے سٹیشنوں اور روزمرّہ ضروریات کی اشیاء وغیرہ پر نیم برہنہ پیش کیا جاتا ہے۔ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ عورت زاد اب تک یہ نہیں سمجھی کہ ریگِ رواں (سَراب) اور فریب خوردگی کے تعاقب میں اُسے کس گہری حد تک ذلیل و خوار کر دیا گیا ہے! اُن کی آخرت کی فلاح و بہبود کے نام پر اُن سے درخواست ہے کہ خدارا وہ سیّدہ ہاجرہ' سیّدہ سارہ' سیّدہ آسیہ' سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ' سیّدہ عائشہ صدیقہ' سیّدہ فاطمۃ الزہراء اور حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ عنہن وغیرہ جیسی مقدس ہستیوں کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی اُخروی تباہی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

''طریقِ کار اور حکمتِ عملی: اپنے قانونی حقوق کے لئے منظّم کارروائی کرتے ہوئے مسلم خاتون کو محتاط ہونا چاہئے کہ وہ اُن غلطیوں کا ارتکاب نہ کرے جو مغرب میں اُس کی ہمزاد عورت کر چکی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی طرف سے اُسے دئے گئے اُن حقوق کو جنہیں معاشرہ نے اُسے دینے سے انکار کر دیا' دوبارہ حاصل کرنے میں اُس کا مقصد درست اور شریفانہ ہے۔ لیکن اِس نیک مقصد کے حصول میں اُسے ایسے ذرائع اور طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو اُس کے شایانِ شان ہوں اور اُس کے مقصد کے لئے موزوں ہوں۔ اُسے نہ تو چالاک اور فریبی سیاستدانوں کے ہتھے چڑھنا چاہئے اور نہ ہی کاروباری ٹھگوں کی چالوں کا شکار ہونا چاہئے جو آزادیِ نسواں کے نام پر اپنی گھٹیا اغراض کی خاطر اُس کا استحصال کرتے ہیں۔ اُسے انتہا کے جدید' ممتاز طبقہ (Ultra-modern Elite) کی پیروی سے بھی بچنا چاہئے جن کا اسلامی اقدار اور اسلامی عمل میں مسلم خواتین کے ساتھ کوئی اشتراک نہیں بلکہ وہ تو عورت کو بدراہ کرنے کے لئے اپنی قیادت کو اُس پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان حکومت عورتوں کے قانونی حقوق سے متعلق قرآنی احکام کو نافذ کرنے سے گریزاں ہے تو عورتوں کو مغربی خواتین کے پُرتشدّد اور نازیبا طریقہ کے برعکس پُرامن اور موزوں طریقے سے اپنے احتجاج اور زور دینے کو جاری رکھنا چاہئے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ انشاء اللہ اپنے اُن قانونی حقوق کو حاصل کر لیں گی جو اسلام نے اُنہیں عطا کئے ہیں۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ)

(۴۶) اسلامی تہوار اور یادگاری دن (Festivals & Commemorative Days)

قرآن مجید نے ''تہوار'' کے لئے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۴ میں ''عِید'' کا لفظ استعمال کیا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اُن کی طرف آسمان سے مائدہ (دسترخوان) اتارنے کی درخواست کی تاکہ وہ اُن کے لئے اور اُن کی نسلوں کے لئے خوشی و مسرّت کا موقع اور اللہ کی طرف سے ایک علامت بن جائے۔ ''عِید'' کا لفظی معنیٰ (۱) کسی واقعہ کا وقفہ وقفہ سے بار بار لوٹ کر واقع ہونا (۲) خوشی اور غم کے دوبارہ آنے کا وقت اور (۳) وہ دن ہے جس میں لوگ کسی جگہ پر اکٹھے ہوں۔ (''القاموس المُحیط'' مجد الدین فیروز آبادی' ج ۱' ص ۳۱۹)

اسلامی تہواروں اور یادگاری دنوں میں سے چند ایک کو ذیل میں دیا جاتا ہے:

(۱) عید الفطر: اسے ماہ رمضان (روزوں کے مہینے) کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کے شکر کے اظہار میں منایا جاتا ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو پورا مہینہ روزہ رکھنے کی توفیق بخشی۔ محروم القسمت اور غربت کے ماروں کی اس دن رضائے الٰہی کی خاطر فیاضانہ امداد کی جاتی ہے۔ احادیثِ نبویہ کی رُو سے یہ دن روزہ داروں کے لئے لاتعداد الٰہی برکتوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرام نے جس طرح اس دن کو منایا' غیر اسلامی رسومات اور لغویات سے بچتے ہوئے اگر اُسی طرح اس دن کو منایا جائے تو اس منانے کا ضرور ثواب ملے گا۔

(۲) عید الاضحیٰ (قربانی کی عید۔ بڑی عید): جواں سال اسماعیل علیہ السلام کی اُن کے والدِ ماجد ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں قربانی کی یاد میں یہ عید اسلامی کیلنڈر کے آخری مہینے ذوالحجہ کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہے اگرچہ اسماعیل علیہ السلام کو رحمتِ الٰہی نے بچالیا۔ عید نماز کے بعد پوری مسلم دنیا میں اللہ کے نام پر مسلسل تین دن (دس ذی الحجہ سے بارہ ذی الحجہ کی عصر کے وقت) تک قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور ان ذبح شدہ جانوروں کا گوشت اپنے استعمال میں لایا جاتا ہے اور رشتہ داروں' ہمسایوں' غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ احادیثِ نبویہ کی رُو سے ذبح شدہ جانور کا خون اللہ تعالیٰ کو دنیا و مافیہا سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔

دونوں عیدوں کے یہ تہوار کے دن خوشی کے موقعے ہوتے ہیں اور اُن میں روزہ رکھنا منع ہے۔ ایک حدیث کی رُو سے سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی اور اُمُّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں داخل ہوئے تو آپ نے کچھ لڑکیوں کو گاتے ہوئے پایا۔ یہ دیکھ کر آپ کو صدمہ ہوا اور فرمایا: پیغمبر کے گھر میں اور اس تہواری موقع پر شیطانی گانے گائے جارہے ہیں؟ پیغمبر علیہ السلام نے جنابِ ابوبکر کو فرمایا کہ ''اُنہیں گانے دو کیونکہ ہر قوم کا کوئی نہ کوئی تہوار کا دن ہوتا ہے اور یہ ہمارا تہوار کا دن ہے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(۳) عید میلاد النبی ﷺ: اِس عید کو منانے کا موجودہ طریقہ نبی علیہ السلام اور آپ کے چاروں

خلفائے راشدین کے زمانہ میں نہیں تھا۔ کچھ روایات کی رُو سے صحابہ کرام اسے مندرجہ ذیل قرآنی حکم کی تعمیل میں انفرادی طور پر مناتے تھے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ○ (یونس: ۵۸،۵۷)

”لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے بالیقین نصیحت آ گئی ہے اور (اُن بیماریوں کے لئے) شفا بھی جو سینوں میں ہوتی ہیں اور ایمان والوں کے حق میں ہدایت اور رحمت۔ (اے نبی!) فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت سے، ہاں اس سے چاہئے کہ لوگ خوشیاں منائیں، وہ اُس ذخیرے سے جسے وہ جمع کر رہے ہیں، کہیں بہتر ہے۔“ (۵۷، ۵۸ : ۱۰)

اوپر کی آیت ۵۸ میں فَضْل اور رَحْمَة کے دو لفظ اکٹھے آئے ہیں۔ نحوی قاعدہ کی رُو سے ان دونوں لفظوں یعنی تثنیہ کے لئے ذٰلِکَ کی بجائے ذٰنِكَ آنا چاہئے تھا کیونکہ ذٰلِكَ تو واحد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ فَضْل اور رَحْمَة سے مراد ایک ہی ذات ہے اور وہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ لہٰذا لوگوں کو خوشی منانے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کو کہا گیا ہے کہ اُس نے اُنہیں اپنا محبوب رسول عطا کر دیا جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں بیان ہوا کہ اُس نے اپنے محبوب رسول کو بھیج کر یقیناً مؤمنین پر احسان کیا ہے۔

اس حقیقت کو ٹھوس اور مضبوط بنانے کے لئے کہ فَضْل اور رَحْمَة سے مراد محض نبی علیہ السلام ہی کی ذاتِ اقدس ہے، کچھ نامور اور مستند مفسرینِ کرام کا حوالہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فِی الْآیَةِ قَالَ: فَضْلُ اللّٰهِ الْعِلْمُ وَرَحْمَتُهٗ مُحَمَّدٌ ﷺ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ (الدُّرُّالمنثور فی التفسیر بالماثور لجلال الدین السیوطی ۴ : ۳۳۰)

”ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فضلُ اللہ سے مراد علم (قرآن) ہے جبکہ رحمت سے مراد نبی علیہ السلام ہیں کیونکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۷ کی رُو سے نبی علیہ السلام عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔“

(۲) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ الْفَضْلَ الْعِلْمُ وَالرَّحْمَةُ مُحَمَّدٌ ﷺ وَاَخْرَجَ ابْنُ عَسَاكِرَ وَالْخَطِیْبُ عَنْهُ تَفْسِیْرُ الْفَضْلِ بِالنَّبِیِّ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ (روح المعانی)

”ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فضلُ اللہ سے مراد علم (قرآن) ہے جبکہ رحمت سے مراد نبی علیہ السلام ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اسی روایت کا استخراج خطیب بغدادی اور ابن عساکر نے کیا ہے اور کہا ہے کہ فضل سے مراد نبی علیہ السلام ہیں۔“ (روح المعانی للعلامہ آلوسی البغدادی)

(۳) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِیْمَا رَوَی الضحاک عَنْهُ اَلْفَضْلُ الْعِلْمُ وَالرَّحْمَةُ مُحَمَّدٌ ﷺ (تفسیر ”بحر المُحیط“ لامام ابو حیان اندلسی ۵ : ۱۷۱)

(۴) اِنَّ فَضۡلَ اللّٰہِ اَلۡعِلۡمُ وَرَحۡمَتُہ' مُحَمَّدٌ" ﷺ رواہُ الضّحاک عنِ ابنِ عبّاس (زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی ۴ : ۴۰)

"فَضۡلُ اللّٰہِ سے مراد علم (قرآن مجید) اور رَحۡمَتُہ' سے مراد مُحَمَّد ﷺ ہیں۔ اسے ضحاک نے عبداللہ بن عباس سے روایت کیا۔"

(۵) وَ مَعۡنَی الۡاٰیَۃِ قُلۡ لِھٰؤُلَاءِ الۡفَرِحِیۡنَ بِالدُّنۡیَا اَلۡمُعۡتَدِیۡنَ بِھَا اَلۡجَامِعِیۡنَ لَھَا اِذَا فَرِحۡتُمۡ بِشَیۡءٍ فَافۡرَحُوۡا بِفَضۡلِ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتِہٖ لَکُمۡ بِاِنۡزَالِ ھٰذَا الۡقُرۡآنِ وَاِرۡسَالِ مُحَمَّدٍ اِلَیۡکُمۡ فَاِنَّکُمۡ تَحۡصِلُوۡنَ بِھِمَا نَعِیۡمًا دَائِمًا مُّقِیۡمًا ھُوَخَیۡرٌ" لَّکُمۡ مِّنۡ ھٰذِہِ الدُّنۡیَا الۡفَانِیَۃِ (مجمع البیان للطبری)

"آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیِ مکرّم! دنیا کی خوشیوں پر حد سے زیادہ رِیجھنے والوں اور (فانی زندگی کے لئے) جوڑ جوڑ کرر کھنے والوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں خوشی منانی ہی ہے تو تم اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کی رحمت پر خوشی مناو جو تمہیں قرآن مجید اور نبی علیہ السلام کی شکل میں عطا کی گئی ہیں۔ اس خوشی منانے کے انعام میں تمہیں (جنت کے) دائمی باغات عطا کئے جائیں گے جو اس فانی دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔"

علاّمہ آلوسی البغدادی (م ۱۲۷۰ھ) کی طرح جمہور مفسرینِ قرآن اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ "رحمت" نبی علیہ السلام کا لقب ہے۔ اس لئے اکثر مفسرین کے نزدیک اگر فَضۡل اور رَحۡمۃ قرآن میں ایک ساتھ آجائیں تو اس سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ہوتی ہے۔ اس کی قرآنی مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہ' لَکُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخَاسِرِیۡنَ○ (البقرۃ : ۶۴)

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتے تو تم یقیناً نقصان پانے والوں میں سے ہوتے۔"

(یعنی اگر یہ ہمارا نبی تشریف نہ لاتا تو تم یقیناً نقصان پانے والوں میں سے ہوتے۔)

(۲) وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہ' لَا تَّبَعۡتُمُ الشَّیۡطٰنَ اِلَّا قَلِیۡلًا○ (النساء : ۸۳)

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتے تو تم (سب) سوائے تھوڑے سے لوگوں کے شیطان کی پیروی کرنے لگ جاتے۔" (۴ : ۸۳)

(یعنی اگر یہ ہمارا نبی تشریف نہ لاتا تو تم۔۔۔۔۔۔۔)

مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی یہی خیال ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت اور اُس کی مکمل عنایت ہیں۔ لہٰذا سورہ یونس کی آیتِ مذکورہ (۵۸) میں فَضۡل اور رَحۡمۃ سے مراد نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہے جن کی ولادتِ پاک پر اُن کا خالق و مالک خوشیاں منانے کا حکم دے رہا ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانوی کے "میلادالنبی" پر خطبات سے اقتباس)۔

یہاں قرآنی لفظ فَلۡیَفۡرَحُوۡا قابلِ غور ہے۔ نوعِ انسانی پر اُس کے لاتعداد احسانات پر اُس نے کہیں بھی اس

انداز اور اہتمام سے شکر ادا کرنے کو نہیں کہا جیسے یہاں آیت ۵۸ میں کہا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو حکم فَلْيَفْرَحُوْا کی بجائے یوں بھی دے سکتا تھا فَلْيُنْفِقُوْا (چاہئے کہ خرچ کریں) فَلْيَسْجُدُوْا (چاہئے کہ سجدے کریں) فَلْيَعْبُدُوْا (چاہئے کہ عبادت کریں) وغیرہ۔ بلکہ اُس نے فَلْيَفْرَحُوْا کا حکم دے کر یہ جتلا دیا کہ میرے محبوبِ مکرّم ﷺ کی ولادتِ پاک پر خوشی منانا میرے حضور شکر ادا کرنے کا بہت ہی اعلیٰ وارفع طریقہ ہے۔

کچھ لوگوں کو یہ تنقید کرتے ہوئے بھی سنا گیا ہے کہ میلاد کے موقع پر بے تحاشا خرچ کرنا بے فائدہ ہے اور اگر اس رقم سے بیوگان، یتیموں اور غرباء و مساکین کی مدد کر دی جائے یا کوئی مسجد بنوا دی جائے یا کسی دینی مدرسے میں رقم دے دی جائے یا کسی محروم القسمت بچی کے ہاتھ پیلے کر دئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ لیکن ربِّ محمد ﷺ نے اس خیال کا بھی رد کر دیا ہے کہ اِن مواقع پر خرچ کرنا واقعی عظیم خدمتِ خلق اور بہت بڑے ثواب کا موجب ہے جو دیگر اوقات میں بھی کئے جا سکتے ہیں لیکن اس موقع پر اُمتِ مسلمہ کا اکٹھے مل کر میرے محبوب کے میلاد کی خوشی منانا میری نظروں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ میں کسی کو خیراتی اور فیاضی کاموں سے نہیں روکتا۔ ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق محروم القسمت لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بڑھ چڑھ کر کوشش کرنی چاہئے لیکن میلادِ مصطفےٰ کے موقع پر کسی کو اس عذر سے مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے کہ کسی دیگر فلاحی کام پر خرچ کر لیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور شکر بجالانے کی علامت کے طور پر میلادِ مصطفےٰ منانے کی ایک اور معقول وجہ یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس بلاقیل وقال عالمِ انسانیت کے لئے بالعموم اور مؤمنین کے لئے بالخصوص ایک عظیم نعمت ہے (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۱۶۴) اور ہر نعمت و احسان پر اُس کا شکر ادا کرنا منعَم علیہ پر فرض ہے۔ شکر کی ادائیگی رضائے الٰہی اور بندے کی نعمتوں میں مزید اضافے کا موجب بنتی ہے جیسا کہ سورہ ابراھیم میں وعدہ کیا گیا کہ:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ''o (ابراھیم: ۷)

''اگر تم نے (میری نعمتوں پر) شکر سے کام لیا تو میں ضرور بالضرور تمہیں مزید عطا کروں گا اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو یاد رکھو میری سزا بہت سخت ہے۔'' (۱۴ : ۷)

<u>هُوَ خَيْرٌ'' مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ</u>: اس عبارت کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات پر شکر بجالانا مال کا ذخیرہ کرنے سے بہتر ہے۔ مال کا ذخیرہ کرنا دو طرح سے ہو سکتا ہے: اوّل دنیاوی دھن دولت کا اکٹھا کرنا اور دوم نفل نمازوں، روزوں، حج اور زکوٰۃ و خیراتی کاموں وغیرہ کی شکل میں آخرت کا توشہ اکٹھا کرنا۔ قرآن مجید نے نہ تو دنیاوی دھن دولت کی تخصیص کی ہے اور نہ ہی اُس نے خیراتی یا فلاحی کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ لفظ (مِمَّا میں) مَا لا کر جو عموم پر دلالت کرتا ہے، دونوں دنیاؤں کے ذخیروں کو اس میں شامل کر لیا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کی توضیح یوں ہوگی:

لوگو! تم دنیاوی دھن دولت کا ذخیرہ کر کے اپنے اثاثوں اور جائداد کو بڑھاتے ہو، کارخانے اور مستری

خانے (ورکشاپ) قائم کرتے ہو اور سونے چاندی کے انبار لگا دیتے ہو۔ لیکن میرے محبوب نبی علیہ السلام کا میلاد منانا تمہاری دنیاوی خزانوں کو اکٹھا کرنے سے کہیں بہتر ہے۔

آخرت کے حوالے سے فرمایا کہ تم نیکی اور بھلائی کے کام کتنے ہی ذخیرہ کرلو' فرض اور نفل نمازوں کی کتنی ہی پابندی کرلو' میرے بندوں کی فلاح و بہبود کے لئے کتنا ہی خرچ کر ڈالو اور اپنی آخرت کی بہتری کے لئے جو چاہتے ہو کر گزرو لیکن میلادِ مصطفےٰ پر خوشی منانا اور اس باسعادت موقع پر اپنی دولت خرچ کرنا میرا شکر ادا کرنے کی بہترین صورت ہے اور مجھے تمہارے تمام دیگر نیکی کے کاموں سے زیادہ محبوب ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خودنمائی اور دکھاوے کی خوشی منانا اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناپسندیدہ ہے اور اس نے ہمیں منع فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ٥ (سورة القصص : ۷۶)

''بے شک اللہ تعالیٰ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۲۸ : ۷۶)

خوشی منانے اور تہوار منانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ سادگی اور عجز وانکسار کو پسند کرتا ہے۔ خوشی منانے میں کرّ وفر اور خودنمائی عجز وانکساری کے خلاف ہے اور اللہ کے مخلص بندے کی شان سے گری ہوئی چیز ہے۔ یہ تو عمومی حکمِ الٰہی تھا لیکن یہاں میلادِ مصطفیٰ کی صورت میں الٰہی حکم بدل دیا گیا کہ اس باسعادت موقع کو اس انداز اور ایسے طریق سے مناؤ کہ تمہارا اشمار فَرِحِین میں ہونے کے باوجود تم اُس کے پسندیدہ بندے بن جاؤ (سورہ یونس کی آیت ۵۸ میں لفظ ''فرح'' کا تقابل سورۂ القَصص کی آیت ۷۶ کے لفظ فَرِحِین سے کیجئے)۔

<u>نبی علیہ السلام کی ولادت پاک پر رب تعالیٰ کی جانب سے غیر معمولی خوشی منانے کا اہتمام:</u> نبی ﷺ کی سیرتِ پاک اور سوانح حیات پر لکھی گئی کتب آپ کی پیدائش کی تفصیلات سے پُر ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ خالقِ لم یزل نے کس گرمجوشی سے اپنے محبوب پیغمبر کی ولادت پر خوشی منائی۔ ایمان کی تازگی کے لئے اور یہ دکھانے کے لئے کہ پیغمبر علیہ السلام کو اپنے خالق کی نظروں میں کیسا اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے' چند حوالہ جات ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

(ا) کَانَتْ تِلْكَ السَّنَةُ الَّتِیْ حُمِلَ فِیْهَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ یُقَالُ لَهَا سَنَةُ الْفَتْحِ وَالْاِبْتِهَاجِ فَاِنَّ قُرَیْشًا كَانَتْ قَبْلَ ذٰلِكَ فِیْ جَدْبٍ وَّضِیْقٍ فَاخْضَرَّتِ الْاَرْضُ وَحَمَلَتِ الْاَشْجَارُ وَآتَاهُمُ الرَّغَدُ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ فِیْ تِلْكَ السَّنَةِ (السیرة الحلبیة لحلبی ۱:۷۸؛ المواهب اللّدنیة لقسطلانی ۱:۹۱؛ شرح علی المواهب اللّدنیة للزُّرقانی ۱:۱۹۷؛ السیرة النبویه لدحلان ۱:۴۵؛ الانوار المحمدیة للنبهانی بحوالہ: ''میلاد النبی ﷺ'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' ص ۳۵۱)

''وہ سال جس میں سیّدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نبی علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں ''مدد' تازگی اور فراوانی'' کا سال کہلاتا ہے۔ اُس سے پہلے قبیلہ قریش اقتصادی بدحالی' غربت وعُسرت اور شدید قحط سالی کا شکار تھے۔ نبی علیہ السلام کی ولادت کی برکت کی بدولت اللہ ربّ العزت نے گرم اور خشک' کرخت اور جھلسی ہوئی بے آب وگیاہ زمین کو برگ دار اور سبزہ زار زمین میں بدل دیا اور درختوں کی خشک ٹہنیاں پھلوں کی بہتات سے لدگئیں۔ اس طرح مجموعی خوشحالی اور اور افراطِ دولت سے اہلِ عرب آسودہ حال' خوش نصیب سماج کے ہوگئے۔'' (السیرۃ الحلبیہ لحلبی' المواھب اللدُنیہ لقسطلانی' شرح مواھب اللدُنیہ لزُرقانی وغیرہ)

(۲) عَنْ عَمْروبْنِ قُتَيْبَةَ قَالَ سَمِعْتُ أَبِىْ وَكَانَ مِنْ أَوْعِيَةِ الْعَلْمِ قَالَ: لَمَّا حَضَرتْ وِلَادَةُ آمِنَةَ قَالَ اللهُ لِلْمَلَائِكَةِ: اِفْتَحُوْا أَبْوَابَ السَّمَاءِ كُلِّهَا وَ أَبْوَابَ الْجِنَانِ وَ أُلْبِسَتِ الشَّمْسُ يَوْمَئِذٍ نُوْرًا عَظِيْمًا (السيرة الحلبية لحلبى ۱:۴۸؛ المَواهِب اللَّدُنية لقسطلانى ۱:۱۲۴؛ شرح على المواهب اللَّدُنية للزُّرقانى ۱:۲۰۸؛ السيرة النبويه لدحلان ۱:۴۵؛ الانوار المحمدية للنبهانى بحوالہ: ''میلادالنبی ﷺ'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری)
''عمرو بن قُتیبہ بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے والد سے سنا جو ایک ماہر عالمِ دین تھے کہ جب سیّدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کا وضعِ حمل کا وقت قریب ہوا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور جنت کے تمام دروازے کھول دو اور اُس دن آفتاب عظیم الشان روشنی سے نوازا گیا۔''

(۳) وَ أَذِنَ اللهُ تِلْكَ السَّنَةَ لِنِسَاءِ الدُّنْيَا أَنْ يَّحْمِلْنَ ذُكُورًا كَرَامَةً لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ (السيرة الحلبية لحلبى ۱:۷۸؛ المَواهِب اللَّدُنية لقسطلانى ۱:۱۲۴؛ شرح على المواهب اللَّدُنية للزُّرقانى ۱:۲۰۸؛ الخصائص الكبرىٰ لجلال الدين السيوطى ۱:۸۰؛ الانوار المحمدية للنبهانى بحوالہ: ''میلادالنبی ﷺ'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' ص ۳۵۱)
''اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس سال رسول اللہ ﷺ کی عزت وتکریم کی خاطر فیصلہ کیا کہ دنیا کی تمام مائیں لڑکے ہی جنیں گی۔'' (السیرۃ الحلبیہ لحلبی' المواھب اللدُنیہ لقسطلانی وغیرہ)

(۴) قَالَتْ آمِنَةُ بِنْتَ وَهْبٍ أُمُّ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ أَنَّهُ خَرَجَ مِنِّيْ نُوْر'' أَضَاءَ قُصُوْرُ بُصْرٰى مِنْ أَرْضِ الشَّامِ وَفِيْ رِوَايَةٍ أَضَاءَتْ لَهُ قُصُوْرُ الشَّامِ وَ أَسْوَاقُهَا حَتّٰى رَأَيْتُ أَعْنَاقَ الْإِبِلِ بِبُصْرٰى (تاريخ الامم والملوك للطبرى ۱:۴۵۵؛ المستدرك للحاكم ۲:۶۷۳؛ اَلْمُعجَم الكبيرلطبرانى ۲۴:۲۱۴؛ الآحاد والمثانى لشيبانى ۳:۵۶؛ السيرة لابن اسحاق ۱:۲۸ رقم: ۳۲؛ الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ۱:۱۰۲ بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری)
''رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنتِ وہب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (بوقتِ ولادت) میرے جسم سے ایسا نور نکلا جس نے ملکِ شام میں واقع بُصرٰی کے محلات کو جگمگا دیا۔ ایک اور روایت

کے مطابق نبی علیہ السلام کی تعظیم وتوقیر کی خاطر ملکِ شام کے محلات اور وہاں کے بازار جگمگا اُٹھے یہاں تک کہ میں نے اُن کی روشنی میں بصریٰ کے شہروں میں اونٹوں کی گردنوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔''

وَھٰذَا ظَاھِر'' فِیْ أَنَّھَا رَأَتْ ذٰلِكَ النُّوْرَ یَقْظَةً (السیرۃ الحلبیة لحلبی ۱ : ۵۶)
''اور یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت آمنہ نے وہ نور بحالتِ بیداری دیکھا۔''

رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ سیّدہ آمنہ رضی اللہ عنہا یہ بھی فرماتی ہیں:

(۱) فَكَشَفَ اللّٰہُ عَنْ بَصَرِیْ فَرَأَیْتُ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَ مَغَارِبَھَا وَ رَأَیْتُ ثَلَاثَةَ أَعْلَامٍ مَضْرُوبَاتٍ: عَلَمًا بِالْمَشْرِقِ وَ عَلَمًا بِالْمَغْرِبِ وَعَلَمًا بِظَھْرِ الْكَعْبَةِ (الخصائص الکبریٰ للسیوطی ۱ : ۸۱ـ۸۳؛ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ۲: ۲۹۸؛ السیرۃ الحلبیۃ لحلبی ۱۰۹؛ الانوار المحمدیۃ للنبہانی ۲۲ـ۲۴ بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' ص ۳۵۹)

''اللہ تعالیٰ نے میری آنکھوں سے حجابات اٹھادیئے تو مشرق ومغرب تک کی زمین میرے آگے ظاہر کردی گئی اور میں نے تین نصب شدہ جھنڈے دیکھے: ایک مشرق میں' ایک مغرب میں اور ایک جھنڈا کعبہ کی چھت پر لہراتا ہوا دیکھا۔''

(۲) ثُمَّ أَخَذَنِیْ مَا یَأْخُذُ النِّسَاءَ وَإِنِّیْ لَوَحِیْدَة'' فِی الْمَنْزِلِ وَعَبْدُالْمُطَّلِبِ فِیْ طَوَافِهٖ فَسَمِعْتُ وَجْبَةً عَظِیْمَةً وَ أَمْرًا عَظِیْمًا ھَالَنِیْ ثُمَّ رَأَیْتُ جَنَاحَ طَیْرٍ أَبْیَضَ قَدْ مَسَحَ عَلٰی فُؤَادِیْ فَذَھَبَ عَنِّی الرُّعْبُ وَكُلُّ وَجَعٍ أَجِدُہٗ' ثُمَّ الْتَفَتُّ فَإِذَا أَنَا بِشُرْبَةٍ بَیْضَاءَ فَتَنَاوَلْتُھَا فَإِذَاھِیَ أَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ فَأَصَابَنِیْ نُوْر'' ثُمَّ رَأَیْتُ نِسْوَةً كَالنَّخْلِ طِوَالًا كَأَنَّھُنَّ مِنْ عَبْدِ مُنَافٍ یَحْدِقْنَ بِیْ فَبَیْنَمَا أَتَعَجَّبُ وَ أَنَا أَقُوْلُ وَا غَوْثَاہُ مِنْ أَیْنَ عَلِمْنَ بِیْ فَقُلْنَ لِیْ: ''نَحْنُ آسِیَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَ مَرْیَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَ ھٰؤُلَاءِ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ (المواہب اللدنیہ للقسطلانی ۱ : ۱۲۴ـ۱۲۵ ؛ شرح علی المواہب اللدنیہ لزرقانی ۱: ۲۰۹ ؛ الانوار المحمدیۃ للنبہانی ۲۲' ۲۳ بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'' ص ۳۶۰)

''جب مجھے دوسری عورتوں کی طرح دردِزہ ہونا شروع ہوا اور (اُس وقت) میں گھر میں اکیلی تھی اور عبدالمطلب طوافِ کعبہ کو گئے ہوئے تھے تو میں نے ایک خوفناک آواز سنی جس نے مجھے ڈرا دیا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ ایک سفید پرندے کا پَر میرے دل کو چھو رہا ہے جس سے میرا تمام خوف اور دردِزہ جاتا رہا۔ پھر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے سامنے سفید رنگ کے مشروب کو دیکھا' میں نے اُسے پیا جو شہد سے بھی زیادہ میٹھا تھا۔ پھر مجھے روشنی کے ایک ہالے نے گھیر لیا تو میں نے کھجور کے درخت کی طرح لمبی کچھ عورتوں کو دیکھا جو قبیلہ عبد مناف کی عورتوں سے مشابہ تھیں۔ اُنہوں نے میرا گھیرا کرلیا۔ میں حیرت کے مارے دم بخود تھی اور نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں سے آئی ہیں اور اُنہیں اس پیدائش کا کیسے علم ہوا ہے۔ تب اُنہوں نے بتایا کہ وہ فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنتِ عمران ہیں اور اُن کے ساتھ حورانِ جنت ہیں۔''

(۳) فَبَيْنَمَا أَنَا كَذٰلِكَ إِذْ بِدِيْبَاجٍ أَبْيَضَ قَدْ مُدَّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَائِلٌ " يَقُوْلُ : خُذَاهُ عَنْ أَعْيُنِ النَّاسِ قَالَتْ وَرَأَيْتُ رِجَالاً قَدْ وَقَفُوْا فِي الْهَوَاءِ بِأَيْدِيْهِمْ أَبَارِيْقُ مِنْ فِضَّةٍ ثُمَّ نَظَرْتُ فَإِذَا أَنَا بِقِطْعَةٍ مِنَ الطَّيْرِ قَدْ أَقْبَلَتْ حَتّٰى غَطَّتْ حُجْرَتِيْ مَنَاقِيْرُهَا مِنَ الزُّمُرُّدِ وَ أَجْنِحَتُهَا مِنَ الْيَاقُوْتِ (المواهب اللدنیہ لقسطلانی ۱: ۱۲۵؛ شرح علی المواهب اللدنیہ لزرقانی ۱: ۲۱۰ ؛ الانوار المحمدیۃ للنبھانی ۱: ۲۳ بحوالہ ''میلادِ مصطفیٰ ﷺ'' ص ۳۶۱)

''اس اثناء میں میں نے سفید رنگ کے ریشم کا ایک ٹکڑا دیکھا جسے زمین و آسمان کے درمیان پھیلا دیا گیا تھا۔ میں نے سنا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا کہ اسے لوگوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے لے لو۔ سیّدہ آمنہ فرماتی ہیں کہ میں نے ہوا میں کچھ لوگوں کو تعظیماً کھڑے دیکھا' اُن کے ہاتھوں میں چاندی کے کھلے منہ والے جگ تھے۔ پھر میں نے پرندوں کے غول کو دیکھا جس نے میرے کمرے کو گھیر لیا تھا۔ اُن کی چونچیں زمرّد کی اور اُن کے پَر یاقوت کے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ نے خود اپنا میلاد مختلف طریقوں سے منایا: آپ اپنے صحابہ کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ میلاد منانے کے ذریعے اپنے خالق و مالک کا شکر بجالایا کریں۔ اس سلسلہ کی احادیث ملاحظہ ہوں :

(۱) عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ فَقَالَ: ذَاكَ يَوْمٌ " وُلِدْتُ فِيْهِ وَيَوْمٌ " بُعِثْتُ فِيْهِ أَوْأُنْزِلَ فِيْهِ (صحیح مسلم ۲: ۸۱۹ باب استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شهر رقم: ۱۱۶۲؛ السنن الکبری للبیہقی ۴: ۲۸۶ رقم: ۸۱۸۲: ۳۰۰؛ مسند احمد بن حنبل ۵: ۲۹۶ رقم ۲۲۵۹۰

''ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام سے اُن کے سوموار کو روزہ رکھنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں سوموار کو روزہ اس لئے رکھتا ہوں کہ اِسی دن میں پیدا ہوا' اِسی دن وحیِ الٰہی مجھ پر آنا شروع ہوئی اور مجھے رسول مبعوث کیا گیا۔''

(۲) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنْ نَّفْسِهٖ بَعْدَمَا بُعِثَ نَبِيًّا (الاحادیث المختارة للمقدسی ۵: ۲۰۵' رقم: ۱۸۳۲؛ المعجم الاوسط لطبرانی ۱: ۲۹۸' رقم: ۹۹۴؛ میزان الاعتدال فی نقد الرجال لذھبی ۴: ۱۹۳' رقم: ۴۵۹۶؛ المسند لرویانی ۲: ۳۸۶' رقم: ۱۳۷۱)

''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے منصبِ نبوّت پر فائز ہونے کے بعد اپنی طرف سے جانور ذبح کئے۔''

حدیثِ بالا پر تبصرہ کرتے ہوئے امام جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

إِنَّ جَدَّهٗ عَبْدَالْمُطَّلِبِ عَقَّ عَنْهُ فِيْ سَابِعِ وِلَادَتِهٖ وَالْعَقِيْقَةُ لَاتُعَادُ مَرَّةً ثَانِيَةً فَيُحْمَلُ ذٰلِكَ أَنَّ الَّذِيْ فَعَلَهٗ النَّبِيُّ ﷺ إِظْهَارًا لِلشُّكْرِ عَلٰى إِيْجَادِ اللهِ تَعَالٰى إِيَّاهُ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ وَ تَشْرِيْفًا

لِأُمَّتِهٖ كَمَا كَانَ يُصَلِّيْ عَلٰى نَفْسِهٖ لِذٰلِكَ فَيُسْتَحَبُّ لَنَا أَيْضًا اِظْهَارُ الشُّكْرِ بِمَوْلِدِهٖ بِاجْتِمَاعِ الْاِخْوَانِ وَاِطْعَامِ الطَّعَامِ وَنَحْوَ ذٰلِكَ مِنْ وُجُوْهِ الْقُرُبَاتِ وَاِظْهَارِ الْمَسَرَّاتِ (الحاوی للفتاوی للسیوطی ۱:۱۹۶؛ حسن المقصد فی عمل المولد لسیوطی:۶۵؛ حجۃ اللہ علی العالمین للنبھانی:۲۳۷ بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'' ص ۳۸۲)

''نبی اکرم ﷺ کے دادا جنابِ عبدالمطلب نے نومولود بچے کا عقیقہ اُن کی پیدائش کے ساتویں دن ہی کر دیا تھا اور عقیقہ بار بار نہیں کیا جاتا۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اپنے یومِ پیدائش کی خوشی میں جانور ذبح کئے تھے اور اس وجہ سے بھی کہ آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس وجہ سے آپ اپنی تمام امت سے افضل ہیں۔ اس لئے اپنے نبی کی پیدائش پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ایک مستحب (پسندیدہ) عمل ہے جس کی کچھ صورتیں نبی علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں غرباء و مساکین کو کھانا کھلانے اور دوسرے اضافی مناسک کو ادا کرنے میں اپنی خوشی کا اظہار ہے۔''

مندرجہ بالا حدیث کے ابتدائی لفظ عَــــقَّ سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ آقا علیہ السلام کا عقیقہ تھا حالانکہ یہ مغالطہ ہے اس لئے کہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ تمام کتبِ سیرت سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کی پیدائش سے ساتویں دن آپ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کا عقیقہ کر دیا تھا۔ اس پر یہ اعتراض ہوا کہ وہ دَورِ جاہلیت کا عمل تھا اور آقا علیہ السلام نے اُسے اعلانِ نبوّت کے بعد دوبارہ کیا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جناب عبدالمطلب پکے موحّد اور دینِ حنیف پر تھے اور آقا علیہ السلام کے تمام آباء واجداد شرک اور بت پرستی سے دُور رہے جس کا ثبوت سورۃ الشُّعَراء کی آیت ۲۱۹ میں یہ الفاظ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ میں موجود ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آقا علیہ السلام کا سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح بھی تو زمانہ جاہلیت میں ہوا تھا جس کا مہر جناب ابوطالب نے ادا کیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آقا علیہ السلام نے اعلانِ نبوّت کے بعد اس نکاح کی تجدید نہیں کی اور اسے نہیں لوٹایا۔ جب نکاح نہیں دہرایا تو عقیقہ کے دُہرانے کا کیا مطلب؟ امام جلال الدین السیوطی نے ''الخصائص الکبریٰ'' میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا بکرے ذبح کرنا اپنا میلاد منانا تھا تاکہ قیامت تک کے لئے یہ سنتِ مصطفیٰ ہو جائے۔

<u>اپنے بھتیجے محمد (ﷺ) کی پیدائش پر کافر ابولہب کے خوشی منانے پر اُس کے عذاب میں تخفیف</u>: صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ حضور ﷺ کی ولادتِ باسعادت کی خبر جب ابولہب کی لونڈی ثُوَیبہ نے اُسے دی تو اپنے بھتیجے کی ولادت کی (رسول کی ولادت کی نہیں) خوشخبری سن کر اُس نے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا۔ اگرچہ اُس کی موت کفر پر ہوئی اور اُس کی مذمّت میں پوری سورت لَہب نازل ہوئی لیکن آپ کی پیدائش پر اظہارِ مسرت کی وجہ سے ہر سوموار کو اُسے پانی کا گھونٹ پلایا جاتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

(۱) عَنْ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: لَمَّا مَاتَ أَبُوْلَهَبٍ رَأَيْتُهٗ فِيْ مَنَامِيْ فَقَالَ: مَا لَقِيْتُ بَعْدَ كُمْ رَاحَةً اِلَّا أَنَّ الْعَذَابَ يُخَفَّفُ عَنِّيْ كُلَّ يَوْمِ اثْنَيْنِ قَالَ: وَذٰلِكَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وُلِدَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَكَانَتْ ثُوَيْبَةُ بَشَّرَتْ أَبَا لَهَبٍ بِمَوْلِدِهٖ فَأَعْتَقَهَا (فتح الباری لحافظ ابن حجر عسقلانی ۹:۱۴۵؛

صحیح بخاری ۵:۱۶۵‘ کتاب النکاح‘ باب وَأُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِىٓ أَرْضَعْنَكُمْ)

اس حدیث پر بھی اعتراض ہوا اور کہا گیا کہ یہ ایک خواب تھا اور خواب کو بہ طورِ حجت آپ کے میلاد منانے کا جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ خواب کس کا تھا؟ اُس جلیل القدر ہستی کا یہ خواب تھا جسے زبانِ رسالت نے حِبرُالامّۃ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ پھر اگر یہ خواب حجت نہیں تھا تو امام بخاری اور امام مسلم جیسے نامور حضرات نے اپنی کتابوں میں اس کی تخریج کیوں کی؟ معلوم ہوا کہ یہ خواب برحق اور میلادِ مصطفےٰ منانے اور اُس پر اجر مرتب ہونے کا پکا ثبوت ہے۔ اس حدیث کو بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں‘ انور شاہ کشمیری نے فیض الباری میں‘ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور امام بغوی نے شرح السنۃ میں بیان کیا۔

حافظ الشام شمس الدین محمد بن ناصر نے کیا خوب کہا ہے:

إِذَا كَانَ هٰذَا "كَافِرٌ" جَاءَ ذَمُّه‘ وَتَبَّتْ يَدَاهُ فِي الْجَحِيمِ مُخَلَّدَا
أَتٰى أَنَّه‘ فِي يَوْمِ الْإِثْنَيْنِ دَائِمًا يُخَفَّفُ عَنْهُ لِلسُّرُورِ بِأَحْمَدَا
وَمَا الظَّنُّ بِالْعَبْدِ الَّذِي كَانَ عُمْرُه‘ بِأَحْمَدَ مَسْرُورًا وَ مَاتَ مُوَحِّدَا

”جب ایک کافر‘ جس کی مذمّت میں پوری سورت ”تَبَّتْ يَدَا“ نازل ہوئی اور جو تا ابد جہنم میں رہے گا‘ اُس کے بارے میں ہے کہ حضور علیہ السلام کی ولادت پر اظہارِ مسرّت کی برکت سے ہر سوموار کو اُس کے عذاب میں کمی کی جاتی ہے‘ تو تمہارا اُس بندے کے بارے میں کیا خیال ہے جو زندگی بھر احمدِ مجتبیٰ کی ولادتِ باسعادت پر خوشی مناتا رہا اور کلمہ توحید پڑھتے ہوئے اِس دنیا سے رخصت ہوا۔“

غلامانِ مصطفےٰ عَلَيْهِ أَجْمَلُ التَّحِيَّةِ وَأَطْيَبُ الثَّنَا ہر زمانہ اور ہر دَور میں اپنے ربِّ کریم کی اس نعمتِ کبریٰ کا شکرادا کرتے آئے ہیں۔ زمانے کے تقاضے کے اعتبار سے شکر کے انداز گو مختلف تھے لیکن جذبۂ تشکر ہر عمل کا روحِ رواں رہا۔ جو خوش بخت اس نعمت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں وہ تا ابد اپنی فہم اور بساط کے مطابق اپنے رحیم و کریم ربِّ ذوالجلال والاکرام کا شکرادا کرتے رہیں گے۔

میلادِ مصطفےٰ علماء کی نظر میں: (۱) علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزی جو ضعیف احادیث پر تنقید کرنے میں بے رحمی کی حد تک بے باک ہیں‘ اس سلسلہ میں اُن کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

مِنْ خَوَاصِهٖ أَنَّه‘ أَمَانٌ فِيْ ذٰلِكَ الْعَامِ وَبُشْرٰى عَاجِلَةٌ بِنَيْلِ الْبُغْيَةِ وَالْمَرَامِ

”محفلِ میلاد کی خصوصی برکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص اسے منعقد کرتا ہے‘ اس کی برکت سے سارا سال اللہ تعالیٰ کے حفظ و امان میں رہتا ہے اور اپنے مقصد اور مطلوب کے جلدی حصول کے لئے یہ ایک بشارت ہے۔“

(۲) غیر مقلدین کے پیشوا نواب صدیق حسن خان نے اپنی کتاب اَلشَّمَّامَةُ الْعَنْبَرِيَّة میں لکھا کہ جو شخص

امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت پر خوشی نہیں مناتا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔

(۳) إِنَّ عَمَلَ الْمَوْلِدَ حَدَثَ بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلَاثَةِ ثُمَّ لَازَالَ أَهْلُ الْإِسْلَامِ مِنْ سَائِرِ الْأَقْطَارِ وَالْمُدُنِ الْكِبَارِ يَعْمَلُوْنَ الْمَوْلِدَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ فِيْ لَيَالِيْهِ بِأَنْوَاعِ الصَّدَقَاتِ وَيَعْتَنُوْنَ بِقِرَاءَةِ مَوْلِدِهِ الْكَرِيْمِ وَيُظْهِرُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَرَكَاتِهِ كُلَّ فَضْلٍ عَمِيْمٍ (محدث امام سخاوی)

''موجودہ صورت میں محفلِ میلاد کا اِنعقاد قرونِ ثلاثہ کے بعد شروع ہوا۔ پھر اُس وقت سے تمام ملکوں اور تمام بڑے شہروں میں اہلِ اسلام میلاد شریف کی محفلوں کا انعقاد کرتے رہے ہیں' اُس کی راتوں میں صدقات و خیرات سے فقراء و مساکین کی دلداری کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی ولادتِ با سعادت کا واقعہ پڑھ کر حاضرین کو بڑے اہتمام سے سنایا جاتا ہے اور اس عمل کی برکتوں سے اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ عمیم کی اُن پر بارش کرتا ہے۔'' (امام سخاوی بحوالہ ضیاء النبی از کرم شاہ الازہری' ص ۴۸)

(۴) امام نووی شارح صحیح مسلم کے استاذ الحدیث امام ابو شامہ فرماتے ہیں:

وَمِنْ أَحْسَنِ مَا أُبْتَدِعَ فِيْ زَمَانِنَا مَا يُفْعَلُ كُلَّ عَامٍ فِي الْيَوْمِ الْمُوَافِقِ لِيَوْمِ مَوْلِدِهٖ ﷺ مِنَ الصَّدَقَاتِ وَ الْمَعْرُوْفِ وَ إِظْهَارِ الزِّيْنَةِ وَ السُّرُوْرِ فَإِنَّ ذٰلِكَ مَعَ مَا فِيْهِ مِنَ الْإِحْسَانِ لِلْفُقَرَاءِ مُشْعِرٌ" بِمَحَبَّةِ النَّبِيِّ ﷺ وَتَعْظِيْمِهٖ فِيْ قَلْبِ فَاعِلِ ذٰلِكَ وَشُكْرًا لِلّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى مَا مَنَّ بِهٖ مِنْ إِيْجَادِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الَّذِيْ أَرْسَلَهٗ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (ضیاء النبی' ص ۴۷)

''ہمارے زمانہ میں جو بہترین نیا کام کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ہر سال حضور ﷺ کے میلاد کے دن صدقات اور خیرات کرتے ہیں اور اظہارِ مسرّت کے لئے اپنے گھروں اور کوچوں کو سجاتے ہیں کیونکہ اس میں کئی فائدے ہیں۔ فقراء اور مساکین کے ساتھ احسان کا برتاؤ ہوتا ہے نیز جو شخص یہ کام کرتا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں محبوبِ الٰہی کی محبت و عظمت کا چراغ روشن ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ کو پیدا فرما کر اور اُنہیں رحمۃ للعالمینی کی خلعتِ فاخرہ پہنا کر مبعوث فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بہت بڑا احسان ہے جس کا شکر ادا کرنے کے لئے اس مسرّت و شادمانی کا اظہار کیا جاتا ہے۔'' (السیرۃ الحلبیہ' جلد اوّل' صفحہ ۸۰)

(۵) ''امام ابن جوزی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے اربل کے بادشاہ الملک المظفر ابو سعید نے اِس کا آغاز کیا اور اُس زمانہ کے نامور محدّث حافظ ابنِ دِحیہ نے اس مقصد کے لئے ایک کتاب اَلتَّنْوِيْرُ فِيْ مَوْلِدِ الْبَشِيْرِ النَّذِيْرِ کے عنوان سے تصنیف کی۔ جب یہ تصنیف ملک مظفر کے سامنے پیش کی گئی تو اُس نے ابنِ دِحیہ کو ایک ہزار اشرفی بطورِ انعام پیش کی۔ وہ ربیع الاوّل شریف میں ہر سال محفلِ میلاد کا انعقاد کیا کرتا تھا۔ ابنِ جوزی کے بیان کے مطابق وہ زیرک' دانا' بہادر' دانشور' عدل گستر اور مردِ میدان تھا۔ اُس کا عہدِ حکومت کافی طویل ہوا۔ اُس کا ظاہر و باطن بہت ہی پسندیدہ تھا۔ سبط ابن الجوزی اپنی تصنیف ''مِرْأَةُ الزَّمَان'' میں اُس ضیافت کا ذکر کرتے ہیں جو ملک

مظفر میلاد شریف کے موقع پر کیا کرتا تھا۔ اس ضیافت کا یہ حال اُس آدمی کی زبانی بیان کیا گیا ہے جو خود اس دعوت میں شریک تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے بھیڑ بکریوں کے پانچ ہزار سر، دس ہزار مرغیاں اور فیرنی کے ایک لاکھ سکورے اور حلوہ شریف کے تیس ہزار طشت خود دیکھے۔ جو علماء وصوفیاء اس ضیافت میں شرکت کرتے، ملک مظفر انہیں خلعتیں پہناتا اور میلاد شریف کی اس تقریب میں تین لاکھ دینار خرچ کرتا۔''

میلادِ مصطفٰے اور بدعت کا تصوّر: امام ابوزکریا محی الدین بن شرف النووی نے ''شرح مسلم'' اور ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں لفظ بدعت پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کے مطالعہ کے بعد اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور طرح طرح کے شبہات جو اذہان وقلوب کو پریشان کرتے ہیں خود بخود کافور ہو جاتے ہیں۔ ''تہذیب الاسماء واللغات'' کی چند سطور ہدیہ ناظرین ہیں:

اَلْبِدْعَةُ بِكَسْرِ الْبَاءِ فِي الشَّرْعِ هِيَ اِحْدَاثُ مَالَمْ يَكُنْ فِي عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَهِيَ مُنْقَسِمَةٌ'' اِلٰى حَسَنَةٍ وَقَبِيْحَةٍ

''شریعت میں بدعت اُسے کہتے ہیں کہ ایسی نئی چیز پیدا کرنا جو رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں نہیں تھی، اس کی دو قسمیں ہیں: بدعتِ حَسَنہ اور بدعتِ سَیِّئہ۔''

امام موصوف شرح صحیح مسلم میں حدیث کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هٰذَا عَامٌ'' مَخْصُوْصٌ ''وَالْمُرَادُ غَالِبُ الْبِدَعِ قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ هِيَ كُلُّ شَيْءٍ عَمِلَ عَلٰى غَيْرِ مِثَالٍ سَابِقٍ قَالَ الْعُلَمَاءُ : اَلْبِدْعَةُ عَلٰى خَمْسَةِ أَقْسَامٍ : وَاجِبَةٌ'' وَ مَنْدُوْبَةٌ'' وَ مُحَرَّمَةٌ'' وَ مَكْرُوْهَةٌ'' وَ مُبَاحَةٌ'' فَمِنَ الْوَاجِبَةِ نَظْمُ اَدِلَّةِ الْمُتَكَلِّمِيْنَ لِلرَّدِّ عَلَى الْمُلاَحِدَةِ وَالْمُبْتَدِعِيْنَ وَ شِبْهُ ذٰلِكَ وَ مِنَ الْمَنْدُوْبَةِ تَصْنِيْفُ كُتُبِ الْعِلْمِ وَ بِنَاءُ الْمَدَارِسِ وَ الرُّبُطِ وَ غَيْرُ ذٰلِكَ وَ مِنَ الْمُبَاحِ التَّبَسُّطُ فِي اَلْوَانِ الْأَطْعِمَةِ وَغَيْرُ ذٰلِكَ وَالْحَرَامُ وَالْمَكْرُوْهُ ظَاهِرَانِ

''کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ' اگرچہ عام ہے لیکن یہ مخصوص ہے یعنی ہر بدعت ضلالت نہیں بلکہ غالب بدعت ضلالت ہوتی ہے۔ لغت میں اُس چیز کو ضلالت کہتے ہیں جس کی مثال پہلے موجود نہ ہو اور علمائے کرام کہتے ہیں کہ بدعت کی پانچ قسمیں ہیں: واجب، مستحب، مباح، حرام، اور مکروہ۔ واجب کی مثال متکلمین کا ملحدوں اور اہلِ بدعت پر ردّ کرنے کے لئے اپنے دلائل کو منظم کرنا، مستحب کی مثال مختلف علوم وفنون پر کتب تصنیف کرنا، مدرسے تعمیر کرنا اور سرائیں وغیرہ بنوانا۔ مباح کی مثال طرح طرح کے لذیذ کھانے پکانا وغیرہ، حرام اور مکروہ ظاہر ہیں۔'' (شرح مسلم لامام النووی، صفحہ ۲۸۵)

''لیکن محفلِ میلاد کے انعقاد میں نہ کسی سنتِ ثابتہ کی خلاف ورزی ہے اور نہ کسی فعلِ حرام کا ارتکاب ہے بلکہ یہ نعمتِ خداوندی پر اُس کا شکر ہے اور شکر کا ادا کرنا کثیر آیات واحادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح آیت فَلْيَفْرَحُوْا سے اس فضل ونعمتِ خداوندی پر اظہارِ مسرت کرنا حکمِ الٰہی ہے۔'' (''ضیاء النبی'' جلد دوم، ص ۵۳)

مسلم علمائے فقہ بہ شمول مغلیہ دَور کے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے (جنہوں نے اپنے ''ملفوظات'' میں) بدعت کی مندرجہ ذیل دو قسمیں بیان کی ہیں :-

(۱) بدعتِ حسنہ : جو ایمان وایقان کی تازگی کا موجب ہو اور جس سے اللہ اور اُس کے رسول کا قرب ملے' وہ بدعتِ حَسنہ ہے جیسے قرآن مجید پر اِعراب' حرکات وسکنات اور شدّ ومدّ کا لگنا جو خلفائے راشدین کے زمانے سے بھی بعد میں اموری دَور میں حجاج بن یوسف نے عجمیوں کی سہولت کے لئے لگوائے' قرآن وحدیث کے سمجھنے کے لئے صرف ونحو کے قوانین واصول' اصولِ تفسیر' حدیث وفقہ اور دوسرے علوم کے اصول وضوابط' دینی مدارس کا قیام' درسِ نظامی کا نصاب' مسافروں کے لئے سراؤں کی تعمیر' رمضان المبارک میں نمازِ تراویح وغیرہ سب بدعتِ حسنہ کی مثالیں ہیں کیونکہ ان کا وجود اسلام کے ابتدائی ایام میں نہیں تھا۔

رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کو باقاعدہ شکل سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں دی گئی اور جنابِ عمر نے تراویح کے بارے میں فرمایا تھا : نِعْمَ بِدْعَةُ هٰذِهٖ (یہ کیسی عمدہ بدعت ہے!)۔ آپ کے اس فرمان سے ثابت ہے کہ ہر بدعت سَیّئہ نہیں ہوتی بلکہ کئی بدعتیں شریعت کے مزاج سے موافق اور ہم آہنگ ہیں۔ اگر ایسی بات ہو تو رمضان المبارک کی راتوں میں لوگوں کا مساجد میں اکٹھے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت سننا اور ذکر واذکار سب ناجائز اور (معاذ اللہ) حرام ہوتے بلکہ یہ بدعتِ حسنہ ہے اور ہر زمانے میں اس پر عمل ہوتا آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بدعتِ حسنہ کا تصوّر قیاسی نہیں بلکہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تعارف کردہ ہے۔

بدعتِ حسنہ کی ایک اور مثال نمازِ جمعہ کی دوسری اذان ہے جو خطبہ سے پہلے دی جاتی ہے۔ اس کا آغاز خلیفہِ ثالث سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے کیا جب مسجد میں آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔'' (صحیح بخاری: کتاب الجمعۃ' باب الجلوس علی المنبر ؛ نَیل الاوطار لشوکانی ۳: ۳۲۳ بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'' از پروفیسر طاہر القادری' ص ۷۲۶)

میلادِ مصطفےٰ ﷺ کی محافل کے تناظر میں دیکھئے تو اِن سے ایمان کو تازگی اور طراوت ملتی ہے اور آقا علیہ السلام کی ولادتِ پاک کے تذکروں میں کہیں درود وسلام کے گلہائے عقیدت نچھاور کئے جاتے ہیں' تو کہیں نظم ونثر کی شکل میں محبوبِ کبریاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضائل وشمیم کا تذکرۂ جمیل ہوتا ہے' کہیں آپ کے حُسنِ سیرت کی بات ہوتی ہے تو کہیں آپ کی حُسنِ صورت کے تذکروں سے ایمان کو گرمی ملتی ہے اور کہیں آپ کی شانِ دلربائی' بندہ نوازی' بندہ پروری اور شانِ بندگی کے بیانات سے حاضرِ مجلس اپنے دامن کو ایمان وایقان کی نئی تازگی سے بھر کر اٹھتا ہے۔

(۲) بدعتِ سَیّئہ : یہ وہ بدعت ہے جو دینِ اسلام میں ابتری' درہمی اور اختلاف وافتراق پیدا کرے اور اللہ اور اُس کے رسول سے دُور کر دے۔ جیسے میلاد جیسی مبارک اور باسعادت محفلوں میں غیر شرعی اعمال وافعال جن سے رکنا اور روکنا فرضِ عین ہے۔

مندرجہ ذیل حدیثِ مبارکہ جہاں ایک طرف بدعت کی تقسیم کی تائید کرتی ہے تو دوسری طرف اُس سے بدعتِ حَسَنہ اور بدعتِ سیئہ کا تصوّر بھی ملتا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا :

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَه' أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَه' مِنْ غَيْرِ أَنْ يُّنْقَصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُّنْقَصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ'' (صحیح بخاری: کتاب الزکوٰۃ؛ سنن نسائی: کتاب الزکوٰۃ؛ مسند احمد بن حنبل؛ صحیح ابن حبان؛ المصنف لابن ابی شیبۃ؛ السنن الکبریٰ للبیہقی بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'')

''جس کسی نے اسلام میں کسی اچھی اور نیک چیز کا آغاز کیا تو اُسے بھی اُس کا اجر ملے گا اور اُس کا بھی جس نے اس کے بعد اس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ اُن کے اجر میں سے کسی چیز کی کمی کی جائے۔ اور جس کسی نے دینِ اسلام میں کسی بُری چیز کا آغاز کیا تو اُس کا گناہ اُس پر بھی ہوگا اور اُس کا بھی جس نے اس کے بعد اُس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ اُن کے گناہوں کے بوجھ میں کسی قسم کی کمی کی جائے۔''

''کوئی شک نہیں کہ حدیثِ پاک میں بدعت سے اجتناب کرنے کا حکم ہے۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اگر بدعت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عمل جو عہدِ رسالت میں اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں نہ تھا اور اُس کے بعد ظہور پذیر ہوا' وہ بدعت ہے اور بدعتِ مذمومہ ہے اور اس پر عمل کرنے والا گمراہ اور جہنم کا ایندھن ہے تو پھر اس کی زد محفلِ میلاد پر ہی نہ پڑے گی بلکہ امت کا کوئی بھی فرد اُس کی زد سے بچ نہیں سکے گا۔ یہ علوم جن کی تدریس کے لئے بڑے بڑے مدارس اور جامعات اور یونیورسٹیاں زرِ کثیر سے قائم کی گئی ہیں' ان علوم میں سے بیشتر وہ علوم ہیں جن کا خیر القرون میں یا تو نام ونشان ہی نہ تھا اور اگر تھا تو اس کی موجودہ صورت کا کہیں وجود نہ تھا۔ صرف' نحو' معانی' بلاغت' اصول الفقہ' اصولِ حدیث' یہ تمام علوم بعد کی پیداوار ہیں۔ کیا جن علماء وفضلاء نے ان علوم کو مدوّن کیا اور اپنی گراں قدر زندگیاں' اپنی قیمتی صلاحیتیں اور اوقات ان کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لئے اور اُن کی نوک پلک سنوارنے کے لئے صَرف کیں کیا وہ سب بدعتی تھے اور اس بدعت کے ارتکاب کے باعث وہ سب ان حضرات کے فتویٰ کے مطابق جہنم کا ایندھن بنے؟ پھر گزشتہ چودہ صدیوں میں اسلام کے دامن میں کون ایسا رہ جاتا ہے جسے جنت کا مستحق قرار دیا جائے! پھر یہ علوم جن کا وجود ہی مجسم بدعت ہے' کی تدریس کے لئے جو جامعات اور یونیورسٹیاں آج تک تعمیر کی گئیں یا اب بھی تعمیر ہو رہی ہیں اور اُن پر کروڑہا روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے' کیا یہ سب تعلیماتِ دین کی خلاف ورزی ہے اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کا باعث ہے؟ یہ عظیم الشان مسجدیں اور اُن کے فلک بوس مینار اور اُن کے مزیّن محراب' عہدِ رسالت یا خلفائے راشدین کے اَدوار میں کہاں تھے؟ کیا ان سب کو آپ گرا دینے کا حکم دیں گے؟ کیا آپ ''بدعت کو جڑ سے اُکھیڑ دینے والے'' بننے کے جنون میں اپنی فوج سے توپیں' ٹینک' بمبار طیارے سب چھین لیں گے اور اُن کی بجائے تیر کمان دے کر میدانِ جنگ میں جھونک دیں گے؟ بدعت کی جو تعریف آپ نے کی ہے وہ تو ان تمام چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ کیا اسلام جو دینِ فطرت ہے' اُس کی ہمہ گیر تعلیمات اور اُس کی جہاں پرور رُوح کو آپ اپنے ذہن کے تنگ زنداں میں بند کرنے کی ناکام کوشش میں اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے؟''

<u>رضائے الٰہی کی خاطر کیا جانے والا عمل ہرگز حرام نہیں</u> : ضروری نہیں کہ ہر بدعت قرآن وسنت

کے خلاف ہو بلکہ وہ بدعتیں جو قرآن و سنت اور شریعتِ اسلامی کی روح کے مخالف نہیں، اُنہیں مباح بدعتیں کہا جاتا ہے۔ زیرِ نظر مسئلہ کو سمجھنے کے لئے سورۃُ الحدید کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کرنا ضروری ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ن ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَo (الحدید: ۲۷)

''اور ترکِ دنیا کو اُنہوں نے خود ایجاد کرلیا، ہم نے اُن پر واجب نہیں کیا تھا بلکہ اُنہوں نے اُسے اللہ کی رضا مندی کی خاطر اختیار کرلیا تھا، سو اُنہوں نے اُس کی پوری پوری رعایت نہ کی، تو اُن میں سے جو ایمان لائے، ہم نے اُن کا اجر اُنہیں دے دیا اور اُن میں سے زیادہ تو نافرمان ہی ہیں۔'' (۲۷: ۵۷)

آیتِ مذکورہ میں اِبْتَدَعُوْهَا کا لفظ بتا رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں ترکِ دنیا (رہبانیت) لازم نہیں تھی۔ بعد کے لوگوں نے اسے اپنے طور پر بہ طورِ بدعت گھڑ لیا تھا اور عبادات میں پوری طرح منہمک ہونے کے لئے اسے اپنے اوپر عائد کرلیا تھا۔ اس کے پسِ پردہ مقصد دنیا میں عام پھیلی ہوئی گندگیوں سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ بدعتِ حسنہ ہونے کے لحاظ سے چونکہ ترکِ دنیا کا یہ عمل حُسنِ نیت کے تحت کیا گیا تھا، اس لئے ربِ تعالیٰ نے اپنے اُن بندوں سے اسے قبول فرمالیا جنہوں نے اس کے تقاضوں کی پابندی کی اور اُنہیں اس کا پورا پورا اجر عطا فرمادیا۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر جو بھی عمل کیا جائے وہ حرام اور راندۂ درگاہ نہیں ہوا کرتا اگرچہ وہ خود عائد کردہ ہو۔

<u>کیا بارہ ربیع الاوّل واقعی نبی علیہ السلام کا یومِ وصال ہے؟</u> متفق علیہ روایت کی رُو سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے رفیقِ اعلیٰ سے بروز سوموار جا ملے اور شاعرِ دربارِ رسول جناب حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا یہ شعر بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے جس میں يَوْمِ الْاِثْنَيْن (سوموار) کو آپ کا یومِ وصال بتایا گیا ہے:

بِأَبِىْ وَأُمِّىْ مَنْ شَهِدتُ وَفَاتَه، فِىْ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ النَّبِىُّ الْمُهْتَدِىْ

اِن چار تاریخی حقیقتوں پر سب کا اتفاق ہے: (۱) آپ نے حجۃ الوداع ۹ ذی الحجۃ کو بروز جمعہ ادا فرمایا۔ (۲) آپ کا وصال حجۃ الوداع سے ٹھیک تین ماہ بعد ہوا۔ (۳) حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے محولہ بالا شعر کی رُو سے آپ کا یومِ وصال یقینی طور پر سوموار ہے۔ (۴) آپ کا وصال ماہِ ربیع الاوّل میں ہے۔

اِن چاروں تاریخی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کسی بھی طرح بارہ ربیع الاوّل کو سوموار کا دن نہیں پڑتا۔ چھ ممکنہ صورتوں کا حساب ذیل میں دیا جاتا ہے:

(۱) اگر ماہ ذی الحجۃ (ذ) ۲۹ دنوں کا، محرّم (م) ۲۹ دنوں کا اور صفر (ص) ۳۰ دنوں کا ہو تو سوموار ذی الحجۃ کی ۱۲، ۱۹ اور ۲۶ تواریخ کو، محرّم کی ۴، ۱۱، ۱۸، ۲۵ تواریخ کو، صفر کی ۳، ۱۰، ۱۷، ۲۴ تواریخ کو اور ربیع الاوّل کی یکم اور ۸ تاریخ میں آتا ہے۔

(۲) اگر ماہ ذی الحجہ کو ۲۹ دنوں کا، محرم کو ۳۰ دنوں کا اور صفر کو ۲۹ دنوں کا مانا جائے تو سوموار ذی الحجہ کی ۱۲، ۱۹، ۲۶ تواریخ کو، محرم کی ۴، ۱۱، ۱۸ اور ۲۵ تواریخ کو، صفر کی ۲، ۹، ۱۶، ۲۳ تواریخ کو اور ربیع الاوّل کی یکم اور ۸ تاریخ کو پڑتا ہے۔

(۳) اگر ماہ ذی الحجہ کو ۳۰ دنوں کا، محرم کو ۳۰ دنوں کا اور صفر کو ۲۹ دنوں کا مانا جائے تو سوموار ذی الحجہ کی ۱۲، ۱۹، ۲۶ تواریخ کو، محرم کی ۳، ۱۰، ۱۷، ۲۴ تواریخ کو، صفر کی یکم، ۸، ۱۵، ۲۲، ۲۹ تواریخ کو اور ربیع الاوّل کی ۷ اور ۱۴ تاریخ کو پڑتا ہے۔

(۴) اگر ماہ ذی الحجہ کو ۳۰ دنوں کا، محرم کو ۲۹ دنوں کا اور صفر کو ۲۹ دنوں کا مانا جائے تو سوموار ذی الحجہ کی ۱۲، ۱۹، ۲۶ تواریخ کو، محرم کی ۳، ۱۰، ۱۷، ۲۴ تواریخ کو، صفر کی ۲، ۹، ۱۶، ۲۳ تواریخ کو اور ربیع الاوّل کی یکم اور ۸ تاریخ کو پڑتا ہے۔

(۵) اگر ماہ ذی الحجہ کو ۳۰ دنوں کا، محرم کو ۲۹ دنوں کا اور صفر کو ۳۰ دنوں کا مانا جائے تو سوموار ذی الحجہ کی ۱۲، ۱۹، ۲۶ تواریخ کو، محرم کی ۳، ۱۰، ۱۷، ۲۴ تواریخ کو، صفر کی ۲، ۹، ۱۶، ۲۳، ۳۰ تواریخ کو اور ربیع الاوّل کی ۷ اور ۱۴ تاریخ کو پڑتا ہے۔

(۶) اگر ماہ ذی الحجہ کو ۲۹ دنوں کا، ماہِ محرم کو ۳۰ دنوں کا، صفر کو ۳۰ دنوں کا تسلیم کیا جائے تو سوموار ذی الحجہ کی ۱۲، ۱۹، ۲۶ تواریخ کو، محرم کی ۴، ۱۱، ۱۸، ۲۵ تواریخ کو، صفر کی ۲، ۹، ۱۶، ۲۳، ۳۰ تواریخ کو اور ربیع الاوّل کی ۷ اور ۱۴ کو پڑتا ہے۔

مؤلف کے خیال میں اس حساب کی کوئی اور (ساتویں یا آٹھویں) صورت نہیں بنتی کیونکہ ۲۹ یا ۳۰ تاریخوں کے تین مسلسل قمری مہینوں کا ہونا بعید از امکان ہے۔ اِن چھ حسابی صورتوں کے پیشِ نظر بارہ ربیع الاوّل کسی بھی صورت میں آپ کا یومِ وصال نہیں بنتا۔

میلاد النبی عید میلاد کیوں؟ یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ میلاد النبی کا منانا شرعی عید نہیں ہے کیونکہ شریعتِ اسلامی نے ہمیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ دو عیدیں عطا کی ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ کی رُو سے لوگ اپنی ہر مشترک خوشی اور مسرّت کے لئے ''عید'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں جیسے ہم اپنے کسی عزیز کی آمد پر کہتے ہیں کہ آپ کی آمد عید سے کم خوشی کی بات نہیں۔ یومِ میلاد اتنے ارفع و اعلیٰ مقام کا حامل ہے کہ دنیا کی تمام خوشیاں اور مسرّتیں مل کر بھی اس خوشی کے مقابل ہیچ اور کمتر ہیں کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس تمام انعاماتِ الٰہیہ سے بڑھ کر فائق اور افضل ہے (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۱۶۴)۔ میلاد پر تنقید کرنا غیر معقول بات ہے اور یہ کہنے کے مترادف ہے کہ تم پر اس خوشی اور مسرّت کا فیضان کیوں کیا گیا ہے؟ اس قسم کے تمام اعتراضات بے ادبی پر مبنی اور خود اختراعی ہیں اور نبی علیہ السلام کے امتی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

میلاد النبی کو ''عیدِ میلاد'' کہنے کی وجہ سیّدنا عمر فاروق کے اُس جواب سے بھی معلوم ہوتی ہے جو آپ نے ایک یہودی کو دیا تھا:

''ایک یہودی نے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق سے کہا: اے امیر المؤمنین! تم لوگ قرآن میں ایک آیت پڑھتے ہو اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اُس دن کو اپنی عید کا دن بنا دیتے۔ حضرت عمر نے پوچھا: تمہارا مطلب کس آیت سے ہے؟ اُس نے کہا: سورۃ المائدۃ کی یہ آیت ۳: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بہ طورِ دین پسند کر لیا'')۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہمیں وہ دن اور جگہ معلوم ہے جب اور جہاں اس آیت کا نزول ہمارے پیغمبر علیہ السلام پر ہوا۔ وہ دن جمعہ کا تھا اور مقام عرفات کا تھا۔ نَزَلَتْ فِیْ یَوْمِ الْعِیْدَیْن کہ یوم عرفہ کو یہ آیت نازل ہوئی۔ یومِ عرفہ بھی عید ہے اور یوم الجمعۃ بھی عید کا دن ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الایمان' باب: زیادۃ الایمان ونقصانہ؛ کتاب المغازی 'باب: حجۃ الوداع' کتاب تفسیر القرآن؛ صحیح مسلم: کتاب التفسیر؛ جامع ترمذی' کتاب تفسیر القرآن؛ سنن نسائی' کتاب الایمان: باب زیادۃ الایمان)

یہودی کے سوال اور عمر فاروق کے مابین بہ ظاہر کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن بغور دیکھا جائے تو تعلق بنتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''عرفہ'' اور ''جمعہ'' کہہ کر اشارتاً بتا دیا کہ یومِ عرفہ (یعنی حج کا دن) اور یومِ جمعہ دونوں ہمارے لئے عید ہیں: یوم الحج سالانہ عید اور یوم الجمعۃ ہفتہ وار عید۔ یہودی اس جواب سے مطمئن ہو گیا تھا اور مزید کچھ نہیں بولا۔

لوگ کہتے ہیں کہ دو عیدوں سے تو ہم متعارف تھے' یہ تیسری عید' عید میلاد النبی کیسے بن گئی؟ یہ تو بدعت ہے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ اِس تیسری عید سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تعارف کرایا۔ سال میں ۵۲ جمعے آتے ہیں۔ ہر جمعہ کو یومِ عید فرمایا گیا۔ جمعہ کو یومِ عید کہنے پر چیں بہ جبیں نہیں ہوتے۔ میلادِ مصطفیٰ کو عید کہنے پر جبینوں پر شکنیں آ جاتی ہیں!

<u>''لفظ ''میلاد'' کی اصل دین میں موجود ہے</u>: نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے نعت گوئی اور آپ کی تعریف میلادِ مصطفیٰ کا لازمی جزء ہے جس کے ذریعے مسلمان اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہے اور اس میں گرمجوشی لاتا ہے۔

عام لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ صرف حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ ہی آقا علیہ السلام کے نعت خواں تھے لیکن نہیں' حسان کے علاوہ تینتیس (۳۳) اجلّ صحابہ سے آپ کی نعت خوانی مروی ہے اور اُن میں سے ہر ایک کا کلام اُن کے دواوین میں محفوظ ہے جن میں (۱) حضرت حسّان (۲) حضرت عباس بن عبد المطلب (۳) حضرت حمزہ (۴) جنابِ ابو طالب (۵) حضرت ابو بکر صدّیق (۶) حضرت عمر فاروق (۷) حضرت عثمان ذو النورَین (۸) حضرت علی بن ابی طالب (۹) حضرت فاطمۃ الزہراء (۱۰) آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ (۱۱) حضرت خنساء (۱۲) حضرت کعب بن مالک (۱۳) حضرت کعب بن زُہیر (۱۴) حضرت بکر بن وائل (۱۵) حضرت مالک بن وائل (۱۶) حضرت عبد اللہ بن رواحہ (۱۷) حضرت ابو سفیان اور (۱۸) نابغہ جعدی سرِ فہرست ہیں تو اِن ۳۴ صحابہ کی جمعیت گویا ''نعت کونسل'' بن گئی۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر معترضین نعت گوئی کا انکار کیسے کر سکتے ہیں!! بخاری پڑھانے پر بخار کا نہ ہونا بھی تو انعامِ الٰہی ہے۔

سو جب یہ بات تحقیق سے پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نعت کا سننا بڑا پسندیدہ تھا اور یہ کہ نعت گوئی ''میلادِ مصطفےٰ'' کا جزوِ لاینفک ہے تو اس بات کے تسلیم کرنے سے کون سی چیز مانع ہے کہ نعتِ مصطفےٰ خود نبی علیہ السلام اور اُن کے خالق و مالک دونوں کو پسند ہے جس کی اپنے نبیِ مکرّم ﷺ کی شانِ اقدس میں تعریف وثنا کے مضامین قرآن مجید میں جابجا بکھرے پڑے ہیں مثلاً سورۃ البقرۃ:۱۰۴، ۱۱۹، ۱۴۴ ؛ آلِ عمران: ۳۱، ۱۵۹، ۱۶۴، ۱۷۹ ؛ النساء : ۵۹، ۶۴، ۶۵، ۸۰، ۱۱۳، ۱۷۴ ؛ المائدۃ : ۶۷ ؛ الانعام :۳۳، ۱۶۳ ؛ الانفال:۱۷ ؛ التوبۃ: ۱۲۸؛ بنی اسرائیل:۱، ۲۰، ۷۹، ۸۷ ؛ مریم: ۹۷ ؛ طٰہٰ:۲ ؛ الانبیاء : ۱۰۷ ؛ الحج : ۱۵ ؛ الاحزاب : ۴۰، ۴۵، ۴۶، ۵۳، ۵۶، ۵۷ ؛ یٰسٓ:۱ تا ۴ ؛ الزُّمر:۶۸ ؛ اَلدُّخان:۵۸ ؛ الفتح :۱، ۱۰، ۲۸، ۲۹ ؛ الحجرات:۱ تا ۵، ۷ ؛ الطّور:۲۹ ؛ اَلنجم : ۱ تا ۵، ۸ تا ۱۸ ؛ الحدید:۹ ؛ القلم : ۲، ۳، ۴ ؛ الجن : ۲۶، ۲۷ ؛ الضحٰے:۳ تا ۸ ؛ الانشراح:۱ تا ۴ ؛ الکوثر:۱، ۳ وغیرہ۔ چنانچہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مصطفےٰ علیہ السلام کی تعریف اصل میں اُن کے خالق و مالک کی حمد وثنا ہے کیونکہ عطا کرنے والا تو خود مالکِ ہر جہاں ہے اور تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے۔ اور کس قدر جامع اور پُرمغز الفاظ میں ربِّ محمد نے اپنے رسولِ مکرم کی تعریف فرمائی ہے :

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء : ۱۱۳)

(اے حبیب! اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا ہی فضل ہے۔)

کچھ لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ لفظ ''میلاد'' ایک نئی اختراع ہے جس کی بازگشت صرف برِّصغیر ہند و پاک ہی میں سنائی دیتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ عرب ممالک میں لفظ ''مولد'' عام استعمال میں آتا ہے۔ لیکن اُن کا یہ موقف درست نہیں اور اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ درجِ ذیل حوالہ جات اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ یہ کوئی نئی اختراع نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے اس لفظ کا استعمال ہوتا چلا آتا ہے:

(۱) مِيْلَادُ الرَّجُلِ : اِسْمُ الْوَقْتِ الَّذِيْ وُلِدَ فِيْهِ (لسان العرب لابن منظور الافریقی ۳: ۴۶۸)

'' آدمی کے میلاد سے مراد وہ وقت ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔''

(۲) سَأَلَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قُبَاثَ بْنَ أَشْيَمَ أَخَا بَنِيْ يَعْمُرَ بْنِ لَيْثٍ أَأَنْتَ أَكْبَرُ أَمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ؟ فَقَالَ : رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَكْبَرُ مِنِّيْ وَأَنَا أَقْدَمُ مِنْهُ فِي الْمِيْلَادِ (جامع ترمذی کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ باب : ما جاء فی میلاد النبی ﷺ ؛ تاریخ الامم والملوک لطبری ۱ : ۴۵۳ ؛ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ۲:۲۶۱ ؛ الآحاد والمثانی لشیبانی ۱:۴۰۷ ؛ تہذیب الکمال لمزی)

'' حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بنی یعمر بن لیث کے بھائی سے پوچھا: کیا تم بڑے ہو یا رسول ﷺ؟ تو اُنہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ مجھ سے بڑے ہیں، میں تو یونہی اُن سے پہلے پیدا ہو گیا تھا۔

(۳) طَلَبَ قُرَيْشٌ '' رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَشَدَّ الطَّلَبِ حَتّٰى انْتَهَوْا إِلٰى بَابِ الْغَارِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ : إِنَّ عَلَيْهِ الْعَنْكَبُوْتَ قَبْلَ مِيْلَادِ مُحَمَّدٍ ﷺ فَانْصَرَفُوْا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۱ : ۲۲۸ ؛ الخصائص الکبریٰ لجلال الدین السیوطی ۱ : ۳۰۵)

'' قریش نے رسول اللہ ﷺ کو ڈھونڈ نکالنے میں سخت کوشش کی یہاں تک کہ وہ غار (ثور) کے دہانے تک پہنچ

گئے تو اُن میں سے کسی نے کہا: اس پر تو محمد (ﷺ) کی پیدائش سے بھی پہلے مکڑی نے جالا بن رکھا ہے۔ تو وہ (مایوس ہو کر) چل دیے۔''

(۴) وَفِيْ رِوَايَةٍ لَمَّا انْتَهَوْا إِلَى فَمِ الْغَارِ قَالَ قَائِلٌ " مِّنْهُمْ أُدْخُلُوا الْغَارَ فَقَالَ أُمَيَّةُ بْنُ خَلَفٍ: وَمَا أَرْبُكُمْ أَيْ حَاجَتُكُمْ إِلَى الْغَارِ أَنَّ عَلَيْهِ لَعَنْكَبُوْتًا كَانَ قَبْلَ مِيْلَادِ مُحَمَّدٍ ﷺ (السیرة الحلبیة حلبی ۲:۲۰۹؛ الخصائص الکبریٰ لسیوطی ۱:۳۰۶)

(۵) عَنِ ابْنِ عَوْنٍ قَالَ: قُتِلَ عَمَّار" رَحِمَهُ اللّٰهُ وَهُوَ ابْنُ إِحْدٰى وَ تِسْعِيْنَ سَنَةً وَكَانَ أَقْدَمَ فِي الْمِيْلَادِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۳:۲۵۹؛ تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر ۴۳:۴۷۱)

(۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ بَيْنَ مُوْسٰى بْنِ عِمْرَانَ وَعِيْسٰى بْنِ مَرْيَمَ أَلْفُ وَتِسْعُ مِائَةِ سَنَةٍ وَلَمْ تَكُنْ بَيْنَهُمَا فَتْرَة" وَأَنَّه' أُرْسِلَ بَيْنَهُمَا أَلْفُ نَبِيٍّ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيْلَ سِوٰى مَنْ أُرْسِلَ مِنْ غَيْرِهِمْ وَكَانَ بَيْنَ مِيْلَادِ عِيْسٰى وَالنَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ وَتِسْعٌ" وَّسِتُّوْنَ سَنَةً (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۱:۵۳؛ تاریخ الامم والملوک لطبری ۱:۴۹۵؛ الجامع لاحکام القرآن لقرطبی ۶:۱۲۲)

مندرجہ بالا حوالہ جات میں خط کشیدہ لفظ ''میلاد'' اس بات کو ثابت کرنے میں ٹھوس ثبوت ہے کہ یہ لفظ جدید اختراع نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم سے عربی زبان میں اس کا استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ اردو کے الفاظ ''ولد' والد' والدہ' مولود' میلاد اور متولّد'' سب عربی مادّہ (مصدر) سے ہیں جس کا مصدر و۔ل۔د ہے لیکن اب وہ لفظ اردو محاورے کا جزوِ لاینفک بن چکے ہیں کیونکہ اُن کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے اردو زبان نے اُنہیں اپنے اندر سمو لیا ہے۔

لفظِ ''مِیــــلاد'' (جو صرف خالق کے حضور شکر بجالانے کا عمل ہے) کے جواز کا ثبوت طلب کرنے میں معترضین یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جب کافی عرصہ کے بعد اُن کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا ہے تو وہ دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں' مٹھائیاں بلا امتیاز تقسیم کرتے ہیں' روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں اور اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں اور کیا کچھ نہیں کرتے۔ اپنے بچوں کی پیدائش پر کے اخراجات ہزاروں تک پہنچتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں اخراجات کی صورتِ حال ناگفتہ بہ ہے۔ نام و نمود اور محض دکھاوا مقررہ وقتِ تقریب سے مہینوں پہلے شروع ہو جاتے ہیں۔ کیا وہ قرآن و سنت سے کوئی ایسا ثبوت دکھا سکتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام یا آپ کے صحابہ نے مٹھائیاں تقسیم کی ہوں' یا قیمتی اور لذیذ کھانوں کا اہتمام کیا ہو یا اُنہوں نے اپنے بچوں کا یومِ پیدائش منایا ہو؟ تو یہ کس قدر شرمناک مضحکہ خیز بات ہے کہ یومِ آزادی کے انعقاد یا دوسرے قومی دنوں کے انعقاد کے موقعوں پر یا کسی سفیر اور سربراہِ مملکت کو توپوں کی سلامی کے ساتھ خوش آمدید کہنے میں قرآن و حدیث سے کوئی ثبوت نہیں مانگا جاتا تو ایسے موقعوں پر نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہدفِ تنقید کیوں بنتی ہے اور سورہ یونس میں وارد اِس حکمِ الٰہی کو وہ کیوں بھول جاتے ہیں فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ" مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (چاہیے کہ خوشی منائیں' یہ خوشی منانا اُن کے ذخیرہ کرنے سے بہتر ہے۔)

ابتدائی دَور کے مسلمانوں نے جدید طریقوں سے میلاد کیوں نہیں منایا؟ نبی علیہ السلام کی بعثتِ

مبارکہ واقعی نوعِ انسانی پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور فضلِ عمیم ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا' سورہ یونس کی آیت ۵۸ کی رُو سے آپ کا میلاد منانا اُس کا حکم بھی ہے۔ کچھ لوگ اسے غیر شرعی کام بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ شرعی اور جائز ہوتا تو صحابہ کرام نے اسے ضرور منایا ہوتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ماہِ ربیع الاوّل نبی علیہ السلام کی پیدائش ہی کا نہیں' وفات کا بھی مہینہ ہے اور آپ کی وفات اور صحابہ کرام سے آپ کی جدائی صحابہ کے لئے ناقابلِ بیان صدمہ تھی۔ وہ لوگ جنہیں نبی علیہ السلام کی صحبت میں وجد آفریں اور رُوح پرور لمحات نصیب ہوئے تھے' وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو اپنی نظروں کے سامنے نازل ہوتے دیکھا تھا' وہ لوگ جنہوں نے ہر مشکل گھڑی میں اپنے پیغمبر کا ساتھ دیا تھا اور وہ لوگ جن کی خونخوار' وحشی اور غیر مہذب زندگیاں بے غرض' پسندیدہ انسانوں میں ڈھال دی گئی تھیں' ایسی ہستی کو کبھی نہیں بھول سکتی تھیں جس کا ہر کہ وہ مہ کے ساتھ انسانیت نواز رویہ اُن کی زندگیوں میں قابلِ رشک انقلاب لے آیا تھا۔ ہر سال ماہِ ربیع الاوّل کی آمد پر اُن کے غم والم کے جذبات پلٹ آتے اور اُن پر غالب آجاتے اور یوں محسوس ہوتا کہ اُن کا محبوب آقا ابھی اُن سے جدا ہوا ہے۔ غم واندوہ کی وجہ سے خوشی ومسرّت کا اظہار نہ کرنا انسانی فطرت ہے جس سے اُنہیں فرار نہیں تھا۔ نبی علیہ السلام سے جدائی کے صدمہ کی یہ کیفیت صحابہ کرام اور تابعین پر سالوں رہی۔ تبع تابعین کے بعد کا زمانہ وہ دَور تھا جس میں نہ تو کسی نے نبی علیہ السلام کی زیارت کی تھی' نہ ہی اُن کی صحبت سے لطف اٹھایا تھا اور نہ ہی آپ سے جدائی کے صدمہ سے وہ دوچار ہوئے تھے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خوشی ومسرّت کے مواقع کو دھوم دھام اور چمک دمک سے منانا صحابہ اور تابعین کی تہذیب وثقافت میں نہیں تھا۔ مثال کے طور پر مکہ مکرمہ سے مدینہ منوّرہ کو صحابہ کرام کی ہجرت تاریخِ اسلام کا ایک نمایاں اور امتیازی واقعہ ہے اور جو دراصل ایک خودمختار اسلامی حکومت کے قیام کی بنیاد ہے۔ اس واقعہ سے زیادہ خوش کن اور کوئی واقعہ نہیں ہوسکتا تھا لیکن انصارِ مدینہ نے نبی علیہ السلام کی اپنے ہاں آمد کو دھوم دھام سے نہیں منایا کیونکہ یہ اُن کی عادت وثقافت میں نہیں تھا۔ اسی طرح کی مثالیں میثاقِ مدینہ' جنگِ بدر کی فتح کا دن' فتحِ مکہ کا دن اور شبِ قدر جیسی وجد آفریں نعمت کے ملنے کے مواقع ہیں۔

آج کی ہماری اس جدید دُنیا کی ماحولیاتی اور ثقافتی کیفیت قدیم زمانے کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہم پاکستانی اپنا یومِ آزادی اور دوسرے قومی دن بڑے ہی طمطراق اور نمود ونمائش سے مناتے ہیں کیونکہ یہ ہماری ثقافت کا جزوِ لازم ہے۔ اسی طرح سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک اُن دنوں کو سرکاری طور پر مناتے ہیں جن میں اُن کے حکمران اور بادشاہ برسرِ اقتدار آئے۔ لہٰذا محبانِ مصطفےٰ ﷺ کا میلادِ نبی کے جوش وخروش کے ساتھ منانے کا یہی جواز ہے۔

<u>بعد کے زمانوں میں نبی علیہ السلام کے یومِ پیدائش کی خوشی آپ کی جدائی کے صدمے پر غالب آگئی:</u> تبع تابعین کے زمانے کے اختتام پر اُن لوگوں کا زمانہ شروع ہوا جنہوں نے نہ تو نبی علیہ السلام کی

پیدائش اور اس کی برکات کو دیکھا تھا اور نہ ہی وہ آپ کی جدائی کے صدمہ سے اس طرح دوچار ہوئے تھے جس طرح صحابہ دوچار ہوئے تھے۔ صدیاں گزرنے کے بعد خوشی اور شادمانی غالب آ گئے اور پیغمبر علیہ السلام کی جسمانی عدم موجودگی کے شدید تکلیف دہ جذبات دَب گئے۔ اِس طرح اُمّتِ مسلمہ پیغمبر علیہ السلام کی پیدائش کی خوشی کے مقابل صدمہ کو بھول گئی اور اُنہیں یقین ہو گیا کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی حیاتِ طیّبہ اور وفات دونوں ہی اُمّتِ مسلمہ کے لئے خیر و برکت کا موجب ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہے جس میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

حَيَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ وَمَمَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ تُحَدِّثُوْنَ وَتُحَدَّثُ لَكُمْ وَوَفَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ تُعْرَضُ عَلَيَّ أَعْمَالُكُمْ فَمَا رَأَيْتُ مِنْ خَيْرٍ حَمِدْتُ اللهَ وَمَا رَأَيْتُ مِنْ شَرٍّ اِسْتَغْفَرْتُ اللهَ لَكُمْ (الشفاء لقاضی عیاض ۱: ۱۹؛ المسند لبزار ۵: ۳۰۸، رقم: ۱۹۲۵؛ مجمع الزوائد لبیہقی ۹: ۲۴؛ البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۵: ۲۷۵)

''تمہارے لئے میری حیات خیر و برکت کا موجب ہے کہ شریعت کے فیصلے اور احکام تم پر واضح کئے جاتے ہیں۔ اور میری وفات بھی تمہارے خیر و برکت کا موجب ہے کیونکہ تمہارے اعمال میرے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ تمہاری طرف سے نیکی دیکھ کر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور تمہارے بداعمال کو دیکھ کر میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کا خواستگار ہوتا ہوں۔''

اِس اُمّتِ مسلمہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ روزِ حساب کو اعمال پیش کئے جانے سے پہلے ہی نبی علیہ السلام کو اُن کی مغفرت کے لئے سفارشی بنا دیا گیا ہے اور اِسی وجہ سے اُن کی حیات و وفات دونوں ہی اُمّت کے لئے خیر و برکت کا موجب ہیں۔ اس حقیقت کے ثابت ہو جانے پر دیکھنا یہ ہے کہ حیات و وفات میں سے کون سی چیز دوسری سے عظیم تر ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی پیدائش اور بعثت آپ کی وفات اور جدائی سے عظیم تر ہے کیونکہ آپ کی وفات آپ کی پیدائش ہی کا تو نتیجہ ہے۔

<u>صدمہ ہمیشہ کسی خوشی کے اختتام کا ذیلی وجود (شاخچہ) ہوتا ہے</u>: صدمہ، غم اور الم کسی عزیز چیز کے جانے اور اُس فائدہ کے ختم ہونے کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں جو جانے والی چیز سے ملتا تھا یہاں تک کہ اس کے اثرات بھی ایک وقت میں جا کر تھم جاتے ہیں۔ مثلاً بیٹے کی وفات پر آدمی کو قدرتی طور پر صدمہ اور دکھ ہوتا ہے لیکن یہ بات مسلمان کے شایانِ نہیں کہ وہ جائداد یا اولاد سے محرومی کی شکایت اللہ سے کرے کیونکہ آزمائشیں اور مصائب ہی اس عارضی زندگی کا دوسرا نام ہے۔

اسی طرح پیغمبر علیہ السلام سے جدائی پر غم زدہ ہونا یا پست حوصلہ ہونا مسلمان کے شایانِ شان نہیں کیونکہ محوّلہ بالا حدیث کی رُو سے نبی ﷺ کی وفات بھی اُمّت کے لئے ایسی ہی مستقل اور دائمی خیر و برکت کا موجب ہیں جیسے آپ کی حیاتِ دُنیوی خیر و برکت کا موجب تھیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہم میں موجود ہے (بحوالہ سورۃ الانفال: ۳۳)۔ غم واندوہ کا جواز تو جب ہوتا جب آپ کا امت میں ہونے کا یقین نہ ہو۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی دین سے آقا علیہ السلام کی رحمت اور شفقت تمام اُمّت کو گھیرے ہوئے ہے (الانبیاء: ۱۰۷) تو آپ کو اپنی تمام اُمّت کا بخوبی علم ہے تو پھر آپ کی جدائی پر غم واندوہ کا کیا مطلب؟ آپ کا اس دنیا سے پردہ فرما جانا

الٰہی فیصلہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے) کی تعمیل میں تھا۔ ورنہ اللہ کے ممتاز او نیک بندے آج بھی نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کی زیارت اِن کھلی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ امام جلال الدین السیوطی کی طرح اللہ کے کچھ صالح بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے نبی علیہ السلام کی زیارت بحالتِ بیداری زندگی میں پچھتر مرتبہ کی۔ (''میزان الکبریٰ'' ۱:۴۴ بحوالہ ''میلادِ مصطفےٰ ﷺ'' ص ص ۹۰۷، ۹۰۸)

تاج الدین لخمی (المعروف بہ فاکھانی) کو میلاد سے اختلاف ہے: مالکی مکتبِ فکر کے عالم تاج الدین عمر لخمی (۷۳۴-۶۵۴ھ) المعروف بہ ''فاکہانی'' کو میلادِ نبی سے اختلاف ہے۔ وہ اپنی کتاب بہ عنوان ''اَلْمَوْرِدُ فِی الْکَلَامِ عَلٰی عَمَلِ الْمَوْلِدِ'' میں لکھتے ہیں کہ میلاد کا منانا ایک مذموم بدعت ہے اور اس کا قرآن و سنت میں کہیں ثبوت نہیں ہے' نہ ہی اس عمل کو اُمّت کے اُن علماء و فضلاء نے کیا جو تقویٰ اور پارسائی میں نمونۂ کمال تھے اور مذہب پر پوری طرح کار بند تھے۔ بلکہ میلاد کی بدعت کو بیکار اور پیٹو لوگوں نے اپنے پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لئے اختراع کیا جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی اور جہاں تک میرا علم ہے وہ صحابہ کرام یا تابعین کے عمل سے بھی ثابت نہیں ہے۔

فاکھانی کے اعتراض کا جواب: فاکھانی کے اس اعتراض کے جواب میں کہ میلادِ نبی کے مستند ہونے کے بارے میں اُن کے پاس قرآن و سنت سے کوئی ثبوت نہیں پہنچا' اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کسی چیز کے علم نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اُس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ کیا جنابِ فاکھانی کو پختہ یقین ہے کہ قرآن و سنت کے تمام علوم کا اُنہوں نے احاطہ کر لیا ہے اور پھر سورہ یونس کی آیت ۵۸ میں مذکور الٰہی حکم (کہ میلادِ نبی پر خوشی مناؤ) کا اور اُن متعدد حوالوں کا کیا کیجئے گا جو گزشتہ صفحات میں بیان ہوئے!!

فاکھانی کا یہ کہنا کہ میلاد کا منانا پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لئے پیٹو لوگوں اور ہوا و ہوس کے لوگوں کی اختراع ہے' بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ ہمارے پاس اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ میلادِ نبی کو ایک منصف مزاج حاکم ملک مظفر نے قربِ الٰہی کے حصول کی خاطر شروع کیا جو بذاتِ خود عالمِ دین بھی تھا۔ اُس کے اکثر و بیشتر ساتھی علمائے دین اور متقی انسان تھے جن میں سے کسی نے بھی میلاد کے انعقاد کو برا نہیں سمجھا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا' اُس وقت کے نامور عالمِ دین ابنِ دِحیہ نے میلادِ نبی کو نہ صرف پسندیدہ عمل قرار دیا بلکہ سلطانِ وقت کے لئے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی۔ یہ تمام لوگ ابتدائی دَور کے فقہاء کی نسل اور اولاد تھے جن کے نزدیک میلادِ نبی ایک قابلِ تحسین عمل تھا اور وہ ہمیشہ میلاد کے حق میں رہے۔ یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نمازِ تراویح کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ کیا ہی عمدہ بدعت ہے! اس میں اُن کا مطلب یہی تھا کہ اگرچہ یہ بدعت اور نئی چیز ضرور ہے جس کا پہلے کوئی وجود نہیں ہے لیکن بدعت ہونے کے باوجود وہ شریعتِ اسلامی کے مبادیات اور اسلامی ضابطہ قانون کے منافی نہیں ہے۔ یہی بات میلادِ نبوی کی ہے۔ لہٰذا یہ تمام بحث فاکھانی کے اعتراض کو رد کرنے کے لئے کافی ہے۔'' (''میلاد النبی ﷺ'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحہ ۴۵۹)

میلادِ مصطفےٰ ﷺ پر لٹریچر: اس موضوع پر کیا گیا تحقیقی کام کثیر التعداد ہے جس میں کچھ منظوم اور کچھ نثر

میں ہے۔ان میں سے کچھ کتب کافی ضخیم ہیں اور کچھ عام حجم کی ہیں۔ ذیل میں مستند اور معروف علماء واُدباء کی جانب سے ''میلادِ نبی'' پر لکھی گئی چند کتب کا ذکر کیا جاتا ہے :

کتاب	مصنف
(۱) اَلْمَولِدُ العَروس	امام ابن جوزی (۵۹۷۔۵۱۰ھ)
(۲) اَلتَّنوِیر فی مولد السراج المنیر	ابن دِحیہ الکلبی (۶۳۳۔۵۴۴ھ)
(۳) عرف التعریف بالمولد الشریف	ابن عبداللہ الجزری (م۶۶۰ھ)
(۴) مَولِدُ النبی ﷺ	حافظ ابنِ کثیر (م۷۷۴ھ)
(۵) المورود الهنی فی المولد السنی (رساله)	حافظ عراقی (۸۰۸۔۷۲۵ھ)
(۶) جامع الآثار فی مولد النبی المختار (۳جلد)	حافظ ابن ناصر الدین (۸۴۲۔۷۷۷ھ)
(۷) اللفظ الرائق فی مولد خیر الخلائق	ایضاً
(۸) مَورد الصادی فی مولد الهادی	ایضاً
(۹) مَولِدُ النبی ﷺ	حافظ السخاوی (۹۰۲۔۸۳۱ھ)
(۱۰) حُسن المقصد فی عمل المولد (رساله)	جلال الدین السیوطی (۹۱۰۔۸۴۹ھ)
(۱۱) سُبُلُ الهُدٰی والرَّشاد	امام محمد بن یوسف الصالحی (م۹۴۲ھ)
(۱۲) مَولِدُ النبی ﷺ	الشیبانی (۹۴۴۔۸۶۶ھ)
(۱۳) تحریر الکلام فی القیام عند ذکر مولِد سیّد الانام ﷺ	امام ابن حجر مکّی (م۹۷۴ھ)
(۱۴) تحفة الاخیار فی مولِد المختار ﷺ	ایضاً
(۱۵) مَولِدُ النبی ﷺ (مختصر رساله)	ابن احمد الشربینی (م۹۷۷ھ)
(۱۶) اَلْمَورد الروی فی المولد النبوی ﷺ	مُلّا علی قاری (م۱۰۱۴ھ)
(۱۷) عقد الجوهر فی مولد النبی الازهر	عبدالکریم البرزنجی (م ۱۱۷۷ھ)
(۱۸) اَلقول المنجی علی مولد البرزنجی (منظوم)	شیخ ابوعبداللہ محمد المعروف بہ علیش (م۱۲۹۹ھ)
(۱۹) مَولِدُ النبی ﷺ (رساله)	ابن احمد العدوی (م۱۲۰۱ھ)
(۲۰) مَولِدُ النبی ﷺ (مختصر رساله)	عبدالهادی الابیاری (م۱۳۰۵ھ)
(۲۱) اَلیُمن والاسعاد بمولود خیر العباد (رساله)	محمد بن جعفر الکتانی (م۱۳۴۵ھ)
(۲۲) ذِکرُ المَولِد وخلاصةُ السیرةِ النبویة و حقیقةُ الدعوة الاسلامیة	شیخ سیّد محمد رشید رضا

(ماخوذ از ''میلادالنبی ﷺ'')

<u>پیغمبرانِ الٰہی کا میلاد منانا سنتِ کبریاء ہے</u> : ذیل میں دیے گئے قرآنی اقتباسات زیرِ نظر موقف کی تائید کے لئے کافی ہیں:-

(۱) میلادنامہ حضرت آدم علیہ السلام:سورۃ البقرۃ:۳۰ ؛ سورۃ الحجر:۲۹،۲۸ ؛ سورہ ص : ۷۱، ۷۲۔

(۲) میلادنامہ حضرت یحیٰ علیہ السلام :سورہ آلِ عمران:۳۸ تا ۴۱ ؛ سورہ مریم : ۷ تا ۱۵۔

(۳) میلادنامہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام :سورہ آلِ عمران : ۴۵ تا ۴۷ ؛ سورہ مریم : ۱۹ تا ۳۵۔

(۴) میلادنامہ حضرت موسیٰ علیہ السلام :سورۃ القصص : ۷ تا ۱۴۔

(۵) میلادنامہ حضرات اسحاق اور یعقوب علیہما السلام: سورہ ھُود : ۶۹، ۷۱۔

(۶) میلادنامہ حضرت مریم علیہا السلام : سورہ آلِ عمران : ۳۵ تا ۳۷، ۴۲ تا ۴۴۔

(۷) میلادنامہ امام الانبیاء ﷺ : سورۃ البقرۃ : ۱۲۹# ، ۱۵۱ ؛ سورہ آلِ عمران : ۸۱، ۸۲، ۱۶۴ ؛
سورۃ النساء : ۷۰، ۱۷۴ ؛ سورۃ المائدۃ : ۱۵، ۱۹ ؛ سورۃ التوبۃ : ۱۲۸ ؛سورۃ الانبیاء : ۱۰۷ ؛
سورۃ الاحزاب : ۴۵، ۴۶ ؛ سورۃ الجمعۃ : ۲ ۔

انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنا اور اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرنا بھی سنتِ الٰہیہ ہے: جیسا کہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے ثابت ہے : سورۃ البقرۃ : ۵۴، ۶۰، ۸۷، ۱۰۲، ۱۲۷، ۱۳۲ ؛ سورۃ الانعام :۸۳، ۸۴ تا ۸۷ ؛ سورہ ھُود:۷۵ ؛سورہ ابراہیم : ۳۹ ؛ سورۃ النحل : ۱۲۰، ۱۲۱ ؛ سورہ بنی اسرائیل : ۱، ۲ ؛ سورہ مریم : ۲، ۳، ۱۲ تا ۱۵، ۳۰ تا ۳۴، ۴۱، ۵۱ تا ۵۸ ؛ سورہ طٰہٰ : ۹ ؛ سورۃ الانبیاء : ۵۱، ۷۱ تا ۷۶، ۷۸ تا ۸۱، ۸۳ تا ۹۱، ۹۷ ؛ سورہ ص : ۱۷، ۳۰، ۴۱، ۴۵ تا ۴۸ ؛ سورۃ النجم : ۲، ۳، ۳۶، ۳۷ ؛ سورہ نوح : ۱، ۲۱ ؛ سورۃ النازعات : ۱۵، ۱۶ ۔

خلاصہ کلام یہ کہ جب انبیاء علیہم السلام پر انعامات الٰہیہ اور اُن کی پیدائش کی تفصیلات دینا سنتِ الٰہیہ ہے تو پھر

#یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اسلام کا اوّلیں مقصد نوعِ انسان کو پتھروں وغیرہ کی عبادت سے آزاد کرنا تھا۔لیکن یہ حیران کن بات ہے کہ حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے دو پتھروں میں سے ایک دیوارِ کعبہ میں اور دوسرا مطافِ کعبہ میں ہے۔مؤخرالذکر پتھر (یعنی مقامِ ابراہیم) کی جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدمین شریفین کے نشانات ثبت ہیں' اس قدر اہمیت ہے اور وہ رب تعالیٰ کو اس قدر محبوب ہے کہ زائرین کو طوافِ کعبہ کرنے کے بعد مقامِ ابراہیم کے قرب میں شکرانہ کے نوافل ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔مکہ کی اُس سنگلاخ زمین میں ابراہیم علیہ السلام اور بھی تو لاکھوں پتھروں پر چلے ہوں گے لیکن اُن میں سے کسی پر آپ کے قدموں کے نشان ثبت نہیں ہوئے۔''مقامِ ابراہیم'' کے پتھر پر آپ کے قدموں کے نشانات کی محض وجہ یہ ہے کہ اُس پر کھڑے ہو کر میلادِ مصطفےٰ ﷺ منایا گیا تھا اور بروئے آیت سورۃ البقرۃ: ۱۲۹ ابراہیم علیہ السلام نے نبی علیہ السلام کے مبعوث ہونے کی دعا مانگی تھی۔

''میلادِ مصطفیٰ'' کو سنتِ الٰہیہ کیوں نہ سمجھا جائے۔ وہ مصطفیٰ جو وجہِ ظہورِ بزمِ امکاں ہیں اور جن کی خاطر یہ ساری خاکدانِ گیتی اور بزمِ عالم سجائی گئی ہے۔

حرفِ آخر : اِس ضمن میں چند جیّد و مقتدر علماء و فضلائے کرام کے تاثرات ذیل میں دیے جاتے ہیں:

(۱) ''حجۃ المحدثین حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۵۲ھ) نے ناقدین و معترضین کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ محفلِ میلاد کا انعقاد بے اصل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے سنتِ نبوی میں اصل موجود ہے۔ اس ضمن میں اُنہوں نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بھی بیان فرمائی جو صحیحین (بخاری و مسلم) میں موجود ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو دیکھا کہ وہ یوم عاشوراء کو بطورِ عید مناتے ہیں اور اس میں روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اُن سے اس کی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے کہا کہ یہ وہ دن ہے جب اللہ پاک نے فرعون کو غرق کر کے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم بنی اسرائیل کو اُن کے ظلم سے نجات دلائی۔ ہم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے روزہ رکھتے ہیں۔ رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: تم سے زیادہ ہم اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی نجات پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔'' (''ضیاء النبی'' ج ۲' ص ۵۴)

مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے نجات پانے اور اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت سے سرفراز کئے جانے پر اُس کا شکر ادا کرنا واجب اور لازم ہے اور اُس کی ہر سال یاد منانا بھی جائز ہے۔

(۲) امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۲۳ھ) نے المواھب اللدنیہ میں فرمایا کہ تمام عالمِ اسلام میلادِ مصطفیٰ مناتا ہے۔

(۳) امام ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۷۴ھ) نے البدایۃ والنّھایۃ میں فرمایا کہ صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ عظیم الشان طریقے سے میلادِ نبی مناتا تھا اور اُن کا بہنوئی ابو سعید مظفر بڑے اہتمام سے میلاد مناتا تھا جس کا حوالہ اِسی جلد کے صفحات ۱۴۲۸' ۱۴۴۹ پر دیا گیا ہے۔

(۴) اسی طرح کی بات محدث ابن الجوزی (م ۵۷۹ھ)' امام شمس الدین الجزری (م ۶۶۰ھ)' امام صدرالدین الجزری (م ۶۶۵ھ)' امام ابوشامہ (م ۶۶۵ھ)' علامہ ذھبی (م ۷۴۸ھ)' امام شمس الدین دمشقی (م ۸۴۲ھ)' امام ابو زرعہ العراقی (م ۸۲۶ھ)' امام سخاوی (م ۹۰۲ھ)' ابن حجر مکی (م ۹۷۳ھ)' شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ)' شاہ عبدالرحیم دہلوی (م ۱۰۵۲ھ)' امام زُرقانی (م ۱۱۲۲ھ)' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۴ھ)' مولانا عبدالحی لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ)' حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) اور مفتی محمد مظہر اللہ دہلوی نے لکھی ہے۔

تمام مناسک اور رسوماتِ دین دراصل کسی نہ کسی واقعہ کی یادگار ہیں

(الف) تمام کی تمام پنجگانہ نمازیں انبیاء علیہم السلام کی یاد میں ہیں : تفصیل ملاحظہ ہو :۔

صلاۃُ الفجر: اِنَّ آدَمَ عَلَیْہِ السَّلاَمُ لَمَّا تِیْبَ عَلَیْہِ عِنْدَالْفَجْرِ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ فَصَارَتِ الصُّبْحُ

نمازِ فجر: ''حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ صبح صادق کے ابتدائی وقت میں قبول ہوئی تو آپ نے اس کے شکرانہ میں دو رکعت نماز ادا کی' تو اسے نمازِ فجر بنا دیا گیا۔''

صلاۃُ الظُّہر: وَفُدِیَ اِسْحٰق عِنْدَ الظُّہْرِ فَصَلّٰی اِبْرٰہِیْمُ اَرْبَعًا فَصَارَتِ الظُّہْرُ۔

نمازِ ظہر: سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو ظہر کے وقت اسحاق علیہ السلام بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی گئی تو آپ نے اس کے شکرانے میں چار رکعت نماز ادا کی تو اسے نمازِ ظہر بنا دیا گیا۔

صلاۃُ العَصر: وَبُعِثَ عُزَیْر'' فَقِیْلَ لَہٗ: کَمْ لَبِثْتَ؟ فَقَالَ: یَوْمًا اَوْبَعْضَ یَوْمٍ فَصَلّٰی اَرْبَعَ رَکْعَاتٍ فَصَارَ تِ الْعَصْرُ

نمازِ عصر: جب عُزیر علیہ السلام کو ایک صدی گزرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا تو آپ سے پوچھا گیا کہ آپ اس حال میں کتنا عرصہ رہے؟ تو آپ نے فرمایا: ایک دن یا اُس کا کچھ حصّہ۔ فرمایا گیا: نہیں تم اس حال میں ایک سو سال رہے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کے حضور بطورِ شکرانہ آپ نے چار رکعت نماز ادا کی' تو اسے نمازِ عصر بنا دیا گیا۔

صلاۃُ المَغْرِب: وَقَدْ قِیْلَ بَرِیَٔ اَیُّوْب عَلَیْہِ السَّلاَمُ عِنْدَالْمَغْرِب فَقَامَ فَصَلّٰی اَرْبَعَ رَکْعَاتٍ فَجَلَسَ فِیْ الثَّلاَثَۃِ فَصَارَتِ الْمَغْرِبُ ثَلاَثًا

نمازِ مغرب: روایت ہے کہ سیّدنا ایوب علیہ السلام مغرب کے وقت اپنی بیماری سے رُوبہ صحت ہوئے تو آپ نے (اس خوشی میں) چار رکعت نماز شروع کی لیکن تین رکعت ادا کرنے کے بعد آپ چوتھی رکعت کے لئے (بوجہ کمزوری ونقاہت) نہ اُٹھ سکے اور تیسری رکعت ہی میں بیٹھ گئے۔ اللہ ربّ العزت نے اُن تین رکعتوں ہی کو قبول فرماتے ہوئے اُنہیں (امتِ مسلمہ کے لئے) نمازِ مغرب بنا دیا۔

صلاۃُ العِشَاء: وَاَوَّلُ مَنْ صَلّٰی الْعِشَاءَ نَبِیُّنَا مُحَمَّد'' ﷺ (شرح معانی الآثار للطّحاوی' ۱:۷۵'کتاب الصلاۃ' رقم: ۱۰۱۴)

نمازِ عشاء: نمازِ عشاء سب سے پہلے ہمارے نبی ﷺ نے ادا فرمائی تو شریعتِ اسلامی میں اسے بطور فریضہ دائمی اور مستقل حیثیت دے دی گئی۔

علامہ ابن العابدین شامی نے ان پانچ نمازوں کے متعلق ''رِدُّالمُحتار علی الدُّرِّالمُختار'' کی کتاب الصلاۃ میں لکھا ہے:

''نمازِ فجر بطور عبادتِ الٰہی حضرت آدم علیہ السلام کی یاد میں ہے۔''

''نمازِ ظہر حضرت داؤد علیہ السلام کی یاد میں پڑھی جاتی ہے۔''

''نمازِ عصر حضرت سلیمان علیہ السلام کی یاد میں ادا کی جاتی ہے۔''

''نمازِ مغرب حضرت یعقوب علیہ السلام کی یاد میں ادا کی جاتی ہے۔'' اور

''نمازِ عشاء حضرت یونس علیہ السلام کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جب اُنہیں مچھلی کے پیٹ سے نجات ملی۔''

اور یہ پانچوں یادیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پانچ نمازوں میں اکٹھی کر دی گئیں۔

اِن حقائق کی رُو سے نتیجہ نکلا کہ خوشی اور غم کی حالتوں کو ذہن میں اس طرح لانا کہ وہ ذہن پر اَن مٹ اثرات چھوڑ جائیں' ایک جائز بات ہے جو نبی علیہ السلام کی سنتِ مبارکہ اور صحابہ کے عمل سے ثابت ہے۔ لہٰذا اُمّتِ مسلمہ کا اپنے پیغمبر علیہ السلام کا میلاد منانے کا عمل ایک روح پرور عمل ہے اور تجدیدِ ایمان اور گرمجوشیِ ایمان کا دوسرا نام ہے۔ علاوہ ازیں ایسے اجتماعات اور تقریبات نبی علیہ السلام سے انتہائی قرب پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں جن کی بنیاد آپ ﷺ سے پُر شوق محبت اور آپ سے سرگرم الحاق پر ہے۔

(ب) <u>اُمّتِ مسلمہ کے روزہ رکھنے کا عمل بھی انبیاء علیہم السلام کے عمل کی یاد میں ہے</u>: جناب آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر جنابِ عیسیٰ علیہ السلام کے وقت تک تمام پیغمبروں کی اُمتیں روزہ رکھنے کی مکلّف رہی ہیں (تفسیر کبیر لفخر الدین رازی؛ تفسیر احمدی لُملّا جیون بحوالہ تفسیر نعیمی' جلد دوم' صفحہ ۱۱۴)

آدم علیہ السلام کے لئے ہر قمری ماہ کی تیرہ' چودہ اور پندرہ تاریخ کو اور موسیٰ علیہ السلام کی اُمّت کے لئے دس محرّم (یومِ عاشورہ) کو روزہ رکھنا فرض تھا۔ کچھ روایات کی رُو سے حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے روزہ رکھا۔ (''دُرِّ منثور'' لجلال الدین السیوطی)۔ ماہِ رمضان میں روزہ رکھنا عیسائیوں کے لئے فرض تھا (تفسیر کبیر)

(ج) <u>تمام مناسکِ حج حضرت ابراہیم' اُن کے بیٹے اسماعیل علیہما السلام اور اُن کے اہلِ خانہ کی یادگار ہیں</u>: مناسکِ حج پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ۸ تاریخ سے ۱۳ ذی الحجہ تک ادا کئے گئے تمام کے تمام مناسکِ حج' شعائر اللہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اندر اللہ کے پیارے اور مقدس پیغمبروں کے لئے عزت و تکریم کا خراجِ تحسین لئے ہوئے ہیں۔ حج کے دوران ہونے والے اِن بہ ظاہر ''غیر معمولی'' اور ''مجنونانہ'' افعال کا جواب منطق اور عقلِ انسانی کے پاس کچھ بھی نہیں۔ صرف ''شرابِ طہور'' پلائی گئی والہانہ محبت و عشق ہی اس کا جواب ہو سکتی ہے۔ اِس مجنونانہ اور بے خود و بے اختیار شیفتگی اور والہانہ عشق کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(i) احرام : حاجی ہو یا عمرہ کرنے والا' اپنے علاقائی' قیمتی اور سلے ہوئے لباس کو چھوڑ کر دو سفید رنگ کی اَن سلی سادہ سی چادریں پہنے حضرت ابراہیم اور اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت اسماعیل علیہما السلام کی یاد میں حج اور عمرہ ادا کرتا ہے جو تعمیرِ کعبہ کے وقت یہی سفید اَن سلی چادروں میں تھے۔ یہ دو اَن سلی چادریں جن کا اصطلاحی نام ''اِحرام'' ہے' اُس کفن کی بھی یاد دلاتی ہیں جو ہر مسلمان کو وفات کے بعد پہننا ہے۔ حج کے ایام میں سر کے بالوں اور ناخنوں کا بڑھانا بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں ہے۔

(ii) حج' عمرہ کے دوران تلبیہ کہنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے دعوتِ حج کے جواب میں ہے: تلبیہ کے الفاظ لَبَّيك اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لاَ شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْك اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لاَ شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكُ دراصل جنابِ ابراہیم علیہ السلام کی اُس دعوت کے جواب میں ہیں جو آپ نے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آج سے چار ہزار سال قبل نوعِ انسان کو دی تھی کہ وہ دنیا کے دُور دراز مقامات سے آکر بیت اللہ کا حج کریں جیسا کہ سورۃ الحج کی آیت ۲۷ میں آیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

لَمَّا بَنٰى اِبْرٰهِيْمُ الْبَيْتَ أَوْحَى اللهُ اِلَيْهِ أَنْ أَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ قَالَ: فَقَالَ اِبْرٰهِيْمُ : أَلاَ اِنَّ رَبَّكُمْ قَدِ اتَّخَذَ بَيْتًا وَّأَمَرَكُمْ أَنْ تَحُجُّوْهُ فَاسْتَجَابَ لَهُ' مَا سَمِعَهُ' مِنْ حَجَرٍ وَّشَجَرٍ وَّأَكَمَةٍ أَوْتُرَابٍ : لَبَّيك اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ (المستدرک للحاکم ۲: ۶۰۱' رقم: ۴۰۲۶ ؛ السنن الکبریٰ للبیہقی ۵: ۱۷۶' رقم: ۹۶۱۳؛ شعب الایمان للبیہقی ۳: ۴۳۹' رقم: ۳۹۹۸؛ تاریخ الامم والملوک لطبری ۱: ۱۴۴ ؛ تفسیر مجاہد (من اجل التابعین) ۲: ۴۲۲ ؛ الدرُّ المنثور للسیوطی ۶: ۳۲؛ احکام القرآن للجصاص ۵: ۶۳ بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'')

''جب ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر کر چکے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حکم دیا کہ وہ لوگوں میں اِس گھر کے حج کرنے کا اعلان کر دیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ابراہیم نے اعلان کیا: ''خبردار! تمہارے رب نے اس گھر کے حج کرنے کا تمہیں حکم دیا ہے۔ تو آپ کے اس اعلان کو ہر پتھر' ہر درخت' ہر ٹیلے اور مٹی کے ہر ذرّے نے سن کر کہا: اے اللہ! میں حاضر ہوں' اے اللہ! میں حاضر ہوں۔''

(iii) حجرِ اَسود کو بوسہ دینا : اپنی افضلیت اور برکت میں حجرِ اسود دنیا کے تمام پتھروں سے فائق ہے کیونکہ مقدس پیغمبر ﷺ کے مقدّس ہونٹوں سے اسے چوما ہے اور آپ کی سنتِ مبارکہ کی پیروی میں زائرین اسے چومنے میں اپنی سعادت اور خوش بختی سمجھتے ہیں ورنہ اس کی حقیقت تو محض پتھر کی سی ہے جو نہ کسی کو فائدہ اور نہ ہی نقصان دے سکتا ہے۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُسے بوسہ دیتے ہوئے صحیح ہی تو فرمایا تھا :

''اے حجرِ اَسود! مجھے معلوم ہے کہ تمہاری حقیقت صرف ایک پتھر کی سی ہے جو نہ کسی کو فائدہ اور نہ نقصان دے سکتا ہے۔ میں تمہیں اس لئے بوسہ دے رہا ہوں کہ میں نے اپنے نبی ﷺ کو تمہیں بوسہ دیتے دیکھا ہے۔''

(iv) رَمل کرنے میں سنتِ رسول کی پیروی: طوافِ کعبہ سات چکروں کو شامل ہے۔ حاجیوں کو حکم ہے کہ وہ پہلے تین چکروں میں طواف اِتراتی چال سے اور اکڑ کر چلیں جس کا اصطلاحی نام ''رَمل'' ہے۔ بڑی ہی عجیب

بات ہے کہ عام حالات میں اکڑ کر اور اِترا کر چلنا تکبر اور سرکشی کی علامت ہے اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینا ہے۔لیکن حج میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔روایت ہے کہ جب مسلمان مکّہ مکرّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ پہنچے تو وہ مسلسل بے آرامی اور صعوبت کی وجہ سے جسمانی طور پر لاغر اور کمزور پڑ گئے تھے۔صلح حُدیبیہ کے بعد جب وہ مدینہ منوّرہ سے مکّہ مکرّمہ عمرہ کی غرض سے پہنچے تو اُن کی چال و انداز سے اُن کی کمزوری اور سُستی دکھائی دیتی تھی۔ ایسی سُستی سے مسلمانوں کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھ کر گویا کہ وہ کسی پرانی بیماری کا شکار ہیں' کفارِ مکّہ اُن پر یہ کہتے ہوئے طعن کرنے لگے کہ یہ مسلمان ہم میں (دورانِ مکّہ) قیام کے دوران خوشحال اور آسودہ حال تھے جبکہ مدینہ کو ہجرت کرنے کے بعد اُن کی حالت ایسی ابتر ہوگئی ہے کہ وہ چل بھی نہیں سکتے۔

کفار کی جانب سے ایسی الزام تراشی اور تمسخر کی بات سن کر نبی ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اللہ کے ان دشمنوں کی طنزیہ بات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے وہ کعبہ کا طواف اِترا کر اور اپنے کندھوں کو اُچکا کر (یعنی رَمل کے ساتھ) کریں۔اُس وقت سے رَمل' طواف کا جزء بن گیا (یاد رہے کہ رَمل کا حکم صرف مَردوں کے لئے ہے' عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں) اور پیغمبر علیہ السلام کا یہ حکم اُس وقت سے لے کر اب تک تسلسل کے ساتھ جاری ہے اگرچہ اب وہاں مسلمانوں پر طعن و طنز کرنے والے کفار موجود نہیں ہیں۔

(v) مقام ابراہیم کو جائے عبادت بنانے کا الٰہی حکم: اگرچہ حرم پاک کی تمام زمین مقدس اور قابلِ احترام ہے لیکن وہ خوش قسمت جگہ جسے تعمیر کعبہ کے وقت خلیل اللہ کے قدمین شریفین نے چھوا' اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک ایسی محبوب ہوگئی کہ وہ زائرین کی سجدہ گاہ بن گئی اور اُنہیں حکم ہوا کہ طواف کعبہ کے بعد حتی الوسع مقامِ ابراہیم سے قریب تر جگہ میں شکرانہ کے نوافل ادا کریں جس کے بغیر اُن کا طواف اور حج نامکمل رہے گا۔

(vi) صفا اور مروہ کے درمیان سعی سیّدہ ھاجرہ کی یاد کو باقی رکھنا ہے: مکّہ کی خشک اور بے آب وگیاہ زمین میں شیر خوار بچے جناب اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے پانی کی تلاش میں اُن کی والدہ ماجدہ سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا صفا اور مروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگانا کہ جس دوران کبھی وہ پہاڑیوں کے اوپر چڑھنے اور کبھی نیچے اترنے میں بھی نگاہیں اپنے بچے پر مرکوز رکھتیں' شیر خوار بچے کے لئے سیّدہ کی یہ پریشان کن حالت رب جلیل کو ایسی بھا گئی کہ اُس نے سعی بین الصفا والمروۃ کو حج اور عمرہ کا جزِو لازم بنا دیا۔سیّدہ ہاجرہ اور اُن کا شیر خوار بچہ اب وہاں نہیں ہیں لیکن زائرین کرام حکم ربانی کی تعمیل میں اور خلیل اللہ کی مقدس زوجہ اور ذبیح اللہ اسمٰعیل علیہما السلام کی والدہ ماجدہ سیّدہ ہاجرہ کے معصومانہ عمل کی یاد میں ان دو پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتے ہیں۔یہی کیفیت چاہِ زمزم کی ہے جو معصوم اسمٰعیل کے مقدس پاؤں کی رگڑ سے پھوٹ پڑا اور اب تک بلکہ ابدالآباد تک ہمیشہ جاری رہے گا۔

(vii) ظہرین اور مغربین کی نمازیں علی الترتیب عرفات اور مزدلفہ میں پڑھنا: میدانِ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو حاجی جو اپنے گھر میں بروئے حکم سورۃ النساء:۱۰۳ تمام نمازیں وقت پر ادا کرنے کا مکلّف تھا' اپنی ظہر اور عصر

کی دونوں نمازیں ظہر کے وقت میں ایک ساتھ پڑھنے کا مکلّف ہے۔اسی طرح وہ مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں مزدلفہ پہنچنے پر ایک ساتھ پڑھنے کا مکلّف ہے (نمازِ مغرب قضا نہیں بلکہ اَدا پڑھی جائے گی)۔اِن دو نمازوں کو اکٹھا کرنا (جمع بین الصلوٰتین) کیسا ہے جبکہ دوسرے اوقات میں اُن کا اکٹھا کرنا گناہ کی بات ہے! یہاں قانونِ شریعت کیوں بدل گیا؟ اپنی نماز کا وقت نکل جانے اور نماز کے فوت ہونے پر حاجی یہاں پریشان اور مضطرب کیوں نہیں ہوا اور وہ نماز کے تاخیر سے پڑھنے پر مطمئن کیوں ہے؟ کیونکہ یہ سب کچھ اُس ذاتِ مقدس کی سنتِ مبارکہ کی پیروی میں ہے جو بحوالہ سورۃ النّجم: ۳ ، ۴ اپنے خالق و مالک کی طرف سے بولنے والا نمائندہ (Mouthpiece) ہے اور جس نے خود عرفات کے مقام پر ظہر اور عصر کو ایک ساتھ اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا۔اگر کوئی حاجی اُس مقام اور اُس وقت اس کے خلاف کرتا ہے تو وہ نقصان میں رہے گا اور پکا گنہگار ہوگا۔

(viii) شیطانوں کو رمی جمار کرنا (کنکریاں مارنا) : شیطانوں کو کنکریاں مارنا (رمی جمار کرنا) واجباتِ حج میں سے ہے۔ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں حاجی صاحبان ۱۰ سے ۱۲ ذی الحجہ تک (اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۳ کی رُو سے ۱۳ ذی الحجہ تک مستحب ہے) تین شیطانوں کو کنکریاں مارتے ہیں۔حاجی صاحبان کا یہ عمل ابراہیم خلیل اللہ کے اُس فعل کی یادگار ہے جسے اُنہوں نے شیطان کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے کیا تھا جب وہ مردود اُنہیں اُن کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو راہِ خدا میں قربان کرنے سے رکاوٹ بنا تھا۔شیطان کو کنکریاں مارنے کے اس عمل میں شیطان کو تنبیہ کرنا مقصود تھا کہ اُس کی کوئی بھی فریب کاری اور ملمع سازی باپ بیٹے کے عزمِ صمیم (پختہ ارادہ) کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے گی۔ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا رمیِ جمار (کنکریاں مارنے) کا یہ بے مثال عمل رب تعالیٰ کو ایسا پسند آیا کہ اسے اُمتِ مسلمہ کے لئے تا قیامت حج کا جزوِ لا ینفک بنا دیا۔ جب تک اس سنتِ ابراہیمی کو ادا نہ کرلیا جائے تو حج جیسی عظیم عبادت نامکمل رہ جاتی ہے اور ربِّ جلیل کے ہاں قابلِ قبول ہی نہیں ہوتی۔

(ix) جانوروں کا ذبح کرنا : جانور تو اللہ کے نام پر تمام دنیا میں روزانہ بطور خیرات ذبح ہوتے ہیں لیکن منیٰ کے مقام پر ذبیح اللہ اسمٰعیل علیہ السلام کی یاد میں ذبح ہونے والے جانوروں کا معاملہ نمایاں طور پر کچھ اور ہی ہے اور اُسی وجہ سے اِن مخصوص جانوروں کو رب تعالیٰ نے قرآن مجید میں شَعَـائِرُ اللهِ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا :

> "وَالْبُدْنَ جَعَلْنَا هَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ" (سورۃ الحج : ۳۶)
> "اور قربانی کے جانوروں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ (کے دین) کی یادگاریں بنا دیا ہے تمہارے حق میں انہی کے اندر بھلائی رکھ دی گئی ہے۔"

اصل بھلائی تو یہی ہے کہ اُن کے ذریعہ سے حصولِ اجر ورضائے الٰہی کا موقع ملتا ہے اور ضمناً دنیاوی فوائد بھی ہیں مثلاً اُن کا گوشت کھانا کھلانا اور اُن کی کھالوں کو اپنے استعمال میں لانا وغیرہ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک اُس کے نام پر ذبح کئے جانے والے اِن جانوروں کے تقدس اور عظمت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ صفا اور مَروہ کی مقدس پہاڑیوں کو بھی بروئے آیت ۱۵۸ سورۃ البقرۃ' رب تعالیٰ نے شَعائِرُ اللہ کا نام دیا اور یہاں قربانی کے اِن جانوروں کو بھی شِعائرُ اللہ کہا جارہا ہے۔اور پھر اُسی سورۃ الحج کی آیت ۳۲ میں فرمادیا: وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (اور جو کوئی دینِ خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا تو یہ ادب والوں کی پرہیزگاری میں سے ہے)۔

''فقہاء نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا کہ غیر اللہ کی تعظیم مستقلاً ممنوع و ناجائز ہے لیکن ذاتِ الٰہی کی نسبت و تقرب میں غیر اللہ کی تعظیم ممنوع اور بُری نہیں' بلکہ اُن کی تعظیم وتکریم تو عین جزوِ دین ہے۔'' (ماجدی حصہ اُردو' ص ۶۸۳' نوٹ: ۴۹)

حاجی صاحبان کو اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ جواں سال بیٹے کو بوڑھے باپ کے ہاتھوں قربان کرنے کے اُس رقت آمیز منظر کو اپنی نظروں کے سامنے لائیں۔۔وہ بیٹا جو بڑھاپے کی راتوں میں گوشۂ تنہائی میں کی گئی اشکبار دعاؤں اور مناجات کا ثمر تھا۔۔اور اُس صورتِ حال کو اپنے آپ پر عائد کر کے سنتِ ابراہیمی کا اعادہ کریں۔صرف اسی طریقے سے حج کی صحیح روح تک پہنچا جا سکتا ہے۔

اس تمام بحث کا نتیجہ نکالنا کوئی مشکل امر نہیں کہ جب ہمارے دینِ اسلام کے تمام مناسکِ مختلفہ اور طرق ہائے عبادت کی بنیاد اللہ کے ممتاز بندوں یعنی پیغمبروں اور اولیاء اللہ کی یاد پر رکھی گئی ہے تو پھر میلادِ نبی منانے میں کون سا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بالخصوص آج کے لادینی اور مادیّت کے دَور میں میلادِ نبی کا منانا ایمان کے تحفظ اور تجدید کی بہترین راہ ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

> ''اپنے بچوں کو تین نہجوں پر تعلیم دو: اپنے نبی سے محبت' نبی کے اہلِ بیت سے محبت اور تلاوتِ قرآن سے محبت کرنا سکھاؤ'' (الجامع الصغیر للسیوطی ۱: ۲۵ رقم: ۳۱۱ ؛ کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۶۷؛ کنز العمال ۱۶: ۴۵۶ رقم: ۴۵۴۰۹ بحوالہ ''میلاد النبی ﷺ'' صفحہ ۹۳۴)

(۴) حج : حج بھی عباداتِ اسلامی میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔سال میں ایک مرتبہ حج کا مہینہ (ذوالحجہ) آتا ہے اور صاحبِ نصاب' عاقل و بالغ مسلمان پر زندگی میں حج ایک دفعہ فرض ہے۔حج کعبہ کے سات

گھڑی کی سوئی کے مخالفِ حرکت قوسی شکل میں (Anti-clockwise direction) سات چکروں' مقامِ ابراہیم پر نوافل ادا کرنے' اگر ممکن ہو تو حجرِ اسود کو چھونا یا بوسہ دینا (جس سے طواف کا آغاز ہوتا ہے)' صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات دفعہ سعی کرنا' دوپہر سے لے کر غروبِ آفتاب تک وقوفِ عرفات جہاں حاجی صاحبان مغفرت کے طلب گار ہوتے ہیں' اور جانوروں کا ذبح کرنا شامل ہیں۔ یہ تمام مناسک لباس' جسمانی زیب و زینت یا بالوں کو سنوارنے' جنسی عمل اور شکار کرنے کی ممانعت سے متعلق ہیں۔ حدیث اور فقہ کا لٹریچر حج کی ادائی کے طریقوں کی تفصیلات اور معلومات سے پُر ہے۔ سورۃ الحج میں مناسکِ حج اور قربانی کے جانوروں کی اہمیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلٰى مَارَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَام (الحج: ۳۴)

''اور ہم نے ہر اُمّت کیلئے قربانی رکھ دی تھی تا کہ وہ لوگ اللہ کا نام اُن چوپایوں پر لیں جو اُس نے اُنہیں عطا کر رکھے ہیں۔'' (۳۴ : ۲۲)

یعنی اصل مقصود تو بس اللہ کے نام کی تعظیم اور اللہ کے نام سے حصولِ تقربِ الٰہی ہے۔ مذبوح اور مذبح کی حیثیت صرف آلہ اور ظرف کی ہے۔ آج منکرین کا جو گروہ کہہ رہا ہے کہ قربانی کا حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں' کاش وہ سورۃ الحج کی آیت ۲۹ کے ساتھ ساتھ اس آیت پر بھی غور کر لیں۔

یومِ حج یعنی یومِ عرفہ ۹ ذی الحجہ کے تقدس کی بابت زبانِ رسالت نے فرمایا:

''یومِ عرفہ کی طرح کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ اس دن سے زیادہ بندوں کو عذابِ جہنم سے آزادی دیتا ہو' پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے حاجیوں کی تعریف کرتا ہے اور اُن سے پوچھتا ہے کہ میرے یہ بندے (مجھ سے) کیا چاہتے ہیں؟'' (صحیح مسلم)

(۵) <u>نبی علیہ السلام کے روضہ اقدس کی زیارت</u>: حج سے پہلے یا بعد میں نبی علیہ السلام کے روضہ اطہر کی زیارت کرنے کی پیغمبر علیہ السلام نے خود ہدایت فرمائی ہے (لیکن حج کے بعد کی زیارت زیادہ افضل ہے)۔ دوسری زمینوں پر سرزمینِ مدینہ کی فوقیت احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔

حج یا عمرہ کے مواقع پر روضہ اطہر کو نہ جانا یا اس سے گریز کرنا بڑے ہی گناہ کی بات اور نبی علیہ السلام کی ناراضی کا موجب ہے جیسا کہ آپ کی یہ حدیث اس بات پر شاہد ہے:

''جو کوئی حج یا عمرہ کے موقع پر میری زیارت کو نہ آئے (یعنی میرے روضہ پر نہ آئے) تو اس نے دراصل مجھ پر جفا کی۔''

مسجدِ نبوی کی فضیلت کے بارے میں فرمایا:

(i) صَلاَۃٌ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلاَۃٍ فِیْمَا سِوَاہُ إِلاَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ وَ صَلاَۃٌ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِائَۃِ أَلْفِ صَلاَۃٍ فِیْمَا سِوَاہُ (مسند احمد و صحیح ابن حبان)

''میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنا' مسجدِ حرام کے سوا کسی بھی مسجد میں ہزار نماز ادا کرنے سے افضل ہے اور مسجدِ حرام میں ایک نماز ادا کرنا کسی دوسری مسجد میں ایک لاکھ نماز ادا کرنے سے افضل ہے۔''

(ii) مَنْ صَلّٰی فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا أَرْبَعِیْنَ صَلاَۃً لاَ تَفُوْتُہٗ' صَلاَۃٌ کُتِبَ لَہٗ' بَرَاءَ ۃٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَ ۃٌ مِّنَ الْعَذَابِ وَبَرَاءَ ۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ (مسند احمد' ترمذی بلفظ آخر)

''جو شخص میری اس مسجد میں چالیس نمازیں پڑھ لے' اُس سے ایک نماز بھی فوت نہیں ہوتی تو اُس کے لئے جہنم' عذاب اور نفاق سے آزادی لکھ دی جاتی ہے۔''

(iii) رسول اللہ ﷺ نے اُسے ایک ایسی خصوصیت سے بھی نوازا ہے جو کسی اور مسجد کو حاصل نہیں یعنی مسجد کے ایک حصہ میں ریاض الجنۃ کا موجود ہونا جس کے بارے میں آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِّیَاضِ الْجَنَّۃِ (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان (کی جگہ) بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔''

(iv) اسی طرح آپ نے مسجدِ نبوی کو اُن تین مساجد میں سے دوسری گردانا ہے جن کی طرف تقرب کے ارادہ سے سفر کیا جاتا ہے۔ ارشادِ گرامی ہے:

لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلاَّ إِلٰی ثَلاَثَۃِ مَسَاجِدِ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِیْ ھٰذَا وَ الْمَسْجِدِ الاَقْصٰی

''تین مساجد کے علاوہ کسی اور کی طرف کجاوے نہ باندھے جائیں (وہ یہ ہیں): مسجدِ حرام' میری یہ مسجد اور مسجدِ اقصٰی''

(۶) **یوم شہادتِ حسین منانا**: تمام اسلامی تہواروں میں جو تہوار سب سے زیادہ یادگاری اہمیت کا حامل ہے' وہ دس محرم کو کربلا کے میدان میں نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن ہے۔ جناب حسین کی شہادت نہ صرف خانوادہِ رسول جیسے نیک افراد کا ظلم کی بھینٹ چڑھ جانے کا عظیم المیہ ہے بلکہ اُن کے دکھ درد میں غم گسار ہونا نجاتِ اخروی کا سامان ہے۔ ملکِ مصر میں جو خالصتاً ایک سُنّی ملک ہے' حضرتِ حسین کا یومِ شہادت منایا جاتا ہے اور اُن سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اپنے نانا جان کے دینِ متین کے تحفظ کی خاطر پورے خاندان کی جو عظیم قربانی حضرت حُسین نے اللہ کے حضور پیش کی' اس پر آپ کو منظوم اور نثری گل ہائے عقیدت پیش کئے جاتے ہیں۔

(۴۷) مالیات (FINANCE)

مال کی قدر و قیمت اور اس کے تصرف کے متعلق جس بنیادی نکتے کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہ سورۂ النِّساء کی یہ آیت ہے:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء : ۵)

''اور اپنے مال کم عقلوں کو نہ دے دیا کرو جسے اللہ نے تمہارے لئے مایہ زندگی بنایا ہے۔'' (۵ : ۴)

یعنی مال کو قرآن مجید نے مایہ زندگی اور زندگی کا سہارا مانا ہے جس پر انسان کی حیاتِ مادّی و معاشرتی کا دارومدار ہے۔ اس لحاظ سے مال بڑی قدر کی چیز اور اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور اسے غیر مصرف میں لگانے اور کم عقلوں کے ہاتھ میں دینے سے منع کیا گیا کہ وہ اس کی قدر و منزلت سے چونکہ واقف نہیں اس لئے وہ ناقدری سے اُسے اُڑا دیں گے۔ فقہاء نے اس آیت سے حفظِ مال اور مال کے ضائع نہ کرنے کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے۔ أَمْوَالَكُمْ (تمہارے مال) میں كُمْ کے لفظ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کے برعکس قرآن مجید انسان کے حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔

مال کے تصرّف کے بارے میں دوسرا بنیادی نکتہ یہ بیان ہوا کہ جو مال تمہارے قبضہ میں ہے' سب اللہ تعالیٰ کا ہے جو اُس نے تمہیں نفع اٹھانے کے لئے دیا ہے۔ تم حقیقۃً اُس کے مالک نہیں ہو بلکہ بمنزلہ نائب اور وکیل کے ہو۔ اُن سے حقوق اللہ بھی پورے کرو اور حقوق العباد بھی۔ اور جس طرح نائب اور وکیل کو مالک کے حکم سے خرچ کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تو تمہیں بھی کوئی تامل اور تردّد نہیں ہونا چاہئے۔ سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا:

وَ أَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (الحدید : ۷)

''اور اُن مالوں میں سے (اُس کی راہ میں خرچ کرو) جن میں اُس نے تمہیں نائب بنایا ہے۔'' (۵۷:۷)

یعنی ''کچھ عرصہ پہلے یہ مکان' یہ زمین' یہ زیورات کسی اور کے تصرّف میں تھے۔ وہ اُنہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ چیزیں تمہارے قبضہ اور تصرّف میں ہیں۔ تم نے بھی ایک روز یہاں سے رختِ سفر باندھنا ہے اور اُس وقت یہ چیزیں کسی اور کے تصرّف میں چلی جائیں گی۔ جتنے عرصہ کے لئے تمہیں اِن چیزوں کا مالک بنایا گیا ہے' اُس سے فائدہ اُٹھاؤ اور اُنہیں اس طرح خرچ کرو کہ تمہارا پروردگار تم سے راضی ہو جائے۔ جب یہ چیزیں تمہارے قبضہ سے نکل جائیں گی تو پھر کچھ نہ کر سکو گے۔''

''حضور سرورِ عالم ﷺ نے اپنے حکیمانہ انداز میں یہ سبق اپنے صحابہ کو خوب ذہن نشین کرا دیا تھا۔ مطرف اپنے باپ عبداللہ سے ذکر کرتے ہیں (رضی اللہ عنہما) اور فرماتے ہیں:

اِنْتَهَيْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ يَقُوْلُ: اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ مَالِيْ مَالِيْ وَ هَلْ لَكَ

مِنۡ مَّالِكَ اِلَّا مَا اَكَلۡتَ فَاَفۡنَيۡتَ اَوۡلَبِسۡتَ فَاَبۡلَيۡتَ اَوۡتَصَدَّقۡتَ فَاَمۡضَيۡتَ وَ مَا سِوٰى ذٰلِكَ فَذَاهِبٌ" وَتَارِكُه' لِلنَّاسِ (صحیح مسلم)

''عبداللہ کہتے ہیں کہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ تمہیں مال کی کثرت نے غافل کر دیا ہے۔ انسان کہتا ہے میرا مال' میرا مال۔ اے انسان! تیرے مال میں سے تیرا کچھ بھی حصہ نہیں سوائے اُس کے جو تو نے کھالیا اور ختم کر دیا یا پہن لیا اور اُسے پرانا کر لیا یا صدقہ کیا اور آخرت کے لئے بطورِ زادِ راہ بھیج دیا۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے' وہ جانے والا ہے اور تو اُسے لوگوں کے لئے چھوڑنے والا ہے۔''

مالیات کے سلسلہ میں قرآن کا تیسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اسلام کا تمام کا تمام مالیاتی نظام صاف ستھرا اور سودی لین دین سے بالکل مبرّا اور پاک ہے خواہ وہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی اور سماجی طور پر۔

مالیات کے بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی اپنی کتاب بہ عنوان "An Introduction to Islamic Finance" میں لکھتے ہیں :۔

''یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے مغربی ممالک کے اقتصادی اور سیاسی غلبے سے مسلمان بالخصوص سماجی اقتصادی میدانوں میں الٰہی راہ نمائی سے محروم ہو گئے ہیں۔ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد اقتصادی میدان میں مسلمانوں کے لئے یہ زبردست چیلنج تھا کہ وہ اپنے مالیاتی اداروں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق کریں۔ اُن حالات کے تحت جس میں تمام مالیاتی نظام سود پر مبنی ہو' وہاں مالیاتی اداروں کی تشکیل سود سے پاک نظام کی بنیاد پر کرنا واقعی جان جوکھوں کا کام ہے۔''

''کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مالیاتی اداروں اور بینکوں سے سود کو ختم کرنا قابلِ عمل نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ تجارتی ہونے کی بجائے خیراتی ادارے بن کے رہ جائیں گے۔ لیکن مالیات کے اسلامی اصولوں اور اس کے اقتصادی فلسفہ سے ناواقفیت کی وجہ سے اُن کا یہ خیال غلط ہے۔ درحقیقت اسلام میں قرض داری کا مقصد تجارتی سودے بازی کے لئے نہیں بلکہ امدادِ باہمی اور خیراتی سرگرمیوں کے لئے ہوتا ہے' ہاں اگر ہوتا بھی ہے تو محدود حد تک ہوتا ہے۔ جہاں تک تجارتی مالیات کا تعلق ہے' تو اُس مقصد کے لئے اسلام کا ایک مختلف نظام ہے۔ اصول یہ ہے کہ دوسرے کسی شخص کو رقم دینے والے کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا وہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اُس کی مدد کے لئے اُسے (قابلِ واپسی) قرض دے رہا ہے یا یہ کہ وہ اُس کے نفع میں شریک ہونے کی بناء پر اُسے رقم دے رہا ہے۔ اوّل الذکر صورت میں اُسے اُس سے کوئی اضافی رقم لینے کا اختیار نہیں اگرچہ اُس کا اصل زر محفوظ اور ضمانت شدہ ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں اُسے اُس کے اصل زر سے کمائے ہوئے نفع میں سے طے شدہ تناسب کے تحت جہاں حصہ لینے کا حق حاصل ہے' وہاں وہ اُس کے ممکنہ نقصان میں بھی برابر کا شریک ہوگا۔ اس طرح ''مشارکہ'' میں مالی امور سے متعلق شخص (Financier) کے حاصل شدہ منافع اُن حقیقی منافع پر منحصر ہوں گے جو اُس کاروبار میں کمائے گئے ہیں۔ کاروبار میں نفع جس قدر زیادہ ہوگا' اُسی قدر Financier کے نفع کی شرح زیادہ ہوگی۔''

''پس ظاہر ہے کہ مالیاتی سرگرمیوں سے سود کو ختم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ Financier نفع نہیں کما سکتا۔ اگر تو سرمایہ کاری کا مقصد تجارتی ہے تو اس کی بنیاد نفع و نقصان میں شراکت کے اصول پر ہوتی ہے جس کے لئے اسلام کے قانونِ تجارت کے آغاز ہی سے ''مشارکہ'' اور ''مضاربہ'' کے طریق کو وضع کر لیا گیا تھا۔''

''تاہم کچھ شعبے ایسے بھی ہیں جہاں بعض وجوہ کی بناء پر ''مشارکہ'' یا ''مضاربہ'' کی بنیاد پر سرمایہ کاری قابلِ عمل نہیں ہے۔ ایسے شعبوں کے لئے علماء نے ''مرابحہ'' یا ''اجارہ'' یا ''اِستصناع'' جیسے دیگر آلاتِ کار تجویز کئے ہیں جنہیں سرمایہ کاری کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

اسلام میں سرمایہ کاری کے حقیقی اور معیاری آلاتِ کار ''مشارکہ'' اور ''مضاربہ'' ہیں۔ جب ایک سرمایہ کار اِن دو آلاتِ کار کی بنیاد پر رقم مہیا کرتا ہے تو وہ رقم لازم افادیت کے حامل اثاثوں میں بدل جاتی ہے۔ منافع اِن حقیقی اثاثوں کی فروخت ہی سے کمائے جاتے ہیں۔''

''مالیاتی اجارہ اور ''مرابحہ'' بنیادی طور پر سرمایہ کاری کے معیاری طریقِ عمل نہیں ہیں۔ لیکن بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے اُن کی تشکیل اس انداز میں کی گئی ہے کہ چند شرائط کے تحت اُن کا اطلاق اُن شعبوں میں ہو سکتا ہے جہاں کچھ وجوہ کی بناء پر مشارکہ یا مضاربہ یا سَلَم یا استثناء قابلِ عمل نہیں ہیں۔ ''اجارہ'' اور ''مرابحہ'' دونوں پر بعض اوقات اس وجہ سے تنقید کی جاتی ہے کہ اکثر اوقات اُن کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو سُودی قرضداری کا ہوتا ہے۔ یہ تنقید کسی حد تک صحیح اور جائز ہے اور اسی وجہ سے علمائے شریعت اس نکتے پر باہم متفق ہیں کہ ''اجارہ'' اور ''مرابحہ'' دونوں سرمایہ کاری کے معیاری طریقِ عمل نہیں ہیں اور اُنہیں صرف ضرورت کے تحت شرعی حدود کی پابندی کا مکمل خیال رکھتے ہوئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔''

''مندرجہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام میں ہر قسم کی سرمایہ کاری حقیقی اثاثوں کو وجود میں لاتی ہے۔ یہ بات ''مرابحہ'' اور ''اجارہ'' پر بھی صادق آتی ہے اگرچہ اُنہیں سرمایہ کاری کا معیاری طریقِ عمل نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے برعکس سودی سرمایہ کاری' ضروری نہیں کہ حقیقی اثاثوں کو وجود میں لائے۔ اس لئے مالیاتی اداروں کی جانب سے قرضہ جات کی شکل میں سرمایہ کی فراہمی بالعموم اُن حقیقی اثاثوں اور خدمات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو اسلامی معاشرہ کو سود سے آزاد نظام میں حاصل ہیں۔ سرمایہ کی فراہمی اور حقیقی اثاثوں کی پیداوار کے مابین خلا افراطِ زر پیدا کرتا ہے اور اُسے ہوا دیتا ہے۔ اسلامی نظام مالیات میں سرمایہ کاری کو اثاثوں کا سہارا حاصل ہوتا ہے۔'' ("An Introduction to Islamic Finance"... Justice Muhammad Taqi Usmani, pp.19-22)

<u>اسلامی بینکوں کے ذرائع آمدنی</u>: اسلامی بینک جمع کرائی گئی رقوم پر سود نہیں دیتے۔ وہ جمع کرائی گئی

مختلف رقوم کو کن طریقوں سے زیرِ عمل لاتے ہیں، اس کا بیان درج ذیل ہے :

(۱) رواں کھاتہ یا رواں حساب (Current Accounts)
(۲) بچت کھاتہ (Savings Accounts)
(۳) مشترکہ یا عمومی سرمایہ کاری کا کھاتہ (Joint or General Investment Account)
(۴) محدود مدت کے لئے سرمایہ کاری کے کھاتہ جات (Limited-period Investment Deposits)
(۵) غیر محدود مدت کے لئے سرمایہ کاری کے حسابات (Unlimited-period Investment Deposits)
(۶) مخصوص سرمایہ کاری کے کھاتہ جات (Specified Investment Deposits)

"اسلامی بینکوں کا خزینوں (Funds) کا استعمال : چونکہ اسلامی بینک قرضہ سود پر نہیں دے سکتے، اس لئے وہ سرمایہ کاری کے اُن اختراعی طریقوں کو معلوم کرنے پر مجبور ہو گئے جو سودی لین دین سے بالکل پاک ہیں۔ اِن طریقوں میں فقہِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے معمولی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔" ("Elimination of Riba from the Economy" ... Edited by Khurshid Ahmad, p. 359)

اُس اُصولی طریقِ کار (تکنیک) کا خلاصہ جسے اسلامی بینک اپنے استعمال میں لاتے ہیں، درج ذیل ہے:

(1) مشارکت : یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنیٰ شراکت دار اور حصّہ داری کے ہیں۔ تجارتی اور کاروباری اصطلاح میں اس کا معنیٰ ایسی کاروباری مہم میں شریک (شامل) ہونا ہے جس کے نفع اور نقصان دونوں میں تمام حصّہ داران برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

مشارکت کی جامع تعریف ابن عابدین نے "ردّالمُختار علی دُرّ المختار" کے حاشیہ پر یوں دی ہے:

"مشارکت دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے درمیان اصل زر اور اس سے نفع حاصل کرنے کے معاہدے کا نام ہے۔"
(جلد سوم، صفحہ ۳۶۵، مطبوعہ کوئٹہ، ۱۳۹۹ھ)

اِسی جلد سوم کے صفحہ ۳۶۵ پر رَدّالمُختار علی دُرّ المختار کی عبارت یوں ملتی ہے :

مَشْرُوعِيَّتُهَا ثَابِتَة" بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَالْمَعْقُوْلِ

"شراکتی کاروبار کا جائز ہونا قرآن، حدیث اور عقل کی رُو سے ثابت ہے۔"

"مشارکت" کا کاروبار نبی علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے ملکِ عرب میں رائج الوقت تھا اور آپ نے خود

قبل از بعثت مشارکت کی ہے۔ لہٰذا آپ نے مشارکتی کاروبار کی منظوری دی ہے۔

''مشارکت'' کی قانونی حیثیت کا جواز قرآنِ مجید' سنت رسول اور مسلمان فقہاء کے اجماع سے ثابت ہے۔ داؤد علیہ السلام کے بیان میں قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیْلٌ" مَّا هُمْ (سورہ ص : ۲۴)

''اور اکثر شراکت دار (یونہی) ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل بھی کئے اور ایسے لوگ نہایت ہی کم ہیں۔'' (۲۴ : ۳۸)

شراکتی کاروبار کے جواز کا ثبوت احادیثِ مبارکہ سے بھی ثابت ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا:

(۱) ''اللہ تبارک وتعالیٰ دو حصہ داروں کی ہمراہی میں ہوتا ہے جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے دھوکہ دہی اور فریب کاری نہ کریں۔'' (''المغنی'' لابن قدامہ' جلد پنجم' صفحہ ۳) ریاض ۱۹۸۱ء ایڈیشن۔

(۲) ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں دو حصہ داروں میں تیسرا ہوتا ہوں جب تک وہ ایک دوسرے سے دھوکہ اور فریب نہ کریں اور جب اُن میں سے کوئی ایک دوسرے سے دھوکا کرتا ہے تو میں اُن سے علیحدہ ہو جاتا ہوں۔'' (سنن ابی داؤد: کتاب البیوع' باب الشرکۃ)

کتاب وسنت کی تائید کے ساتھ ''مشارکہ'' سودی مالیات کا ایک مثالی اور معیاری متبادل نظام ہے جس کے پیداوار اور اس کی تقسیم پر دُور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ موجودہ سرمایہ دارانہ اقتصادیات میں سود ایسا واحد آلہ کار ہے جسے ہر قسم کی سرمایہ کاری میں بلا امتیاز استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام سودی کاروبار سے روکتا ہے اس لئے کسی قسم کے فنڈ مہیا کرنے میں سود کی اسلامی نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ''مشارکہ'' اسلامی اُصولوں کی بنیاد پر اقتصادیات میں حیات آفریں کردار ادا کرسکتا ہے۔

''اُس قرض پر جو سرمایہ دار مقروض کو دیتا ہے' سودی شرح پہلے ہی سے مقرر کرلی جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ مقروض کو نفع ہوا ہے یا نقصان' جبکہ ''مشارکت'' میں شرحِ نفع کے تعیّن کی اجازت ہی نہیں ہے۔ بلکہ ''مشارکت'' میں نفع کا انحصار اُس حقیقی فائدہ پر ہوتا ہے جو اجتماعی کوشش سے کمایا جائے۔ سودی قرضہ میں سرمایہ کار نقصان کا متحمل نہیں ہوسکتا جبکہ ''مشارکت'' میں وہ نقصان اٹھا سکتا ہے اگر اجتماعی کوشش مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اسلام نے سود کو غیر منصفانہ سرمایہ کاری کے آلہ کا نام دیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ مقروض یا قرضخواہ کے ساتھ بے انصافی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر مقروض کو نقصان ہوتا ہے تو قرضخواہ کا اُس سے متعیّن شرح لینے کا مطالبہ کرنا بے اِنصافی کی بات ہوگی اور اگر مقروض کو بہت ہی اعلیٰ سطح پر منافع ہوتا ہے تو یہ قرضخواہ سے بے انصافی کی بات ہوگی کہ مقروض اُسے تھوڑا سا منافع دے کر باقی منافع اپنے پاس رکھ لے۔''

''مشارکت'' کے بنیادی اُصول : (۱) شراکتی حصّہ داروں میں سے ہر فریق معاہدہ میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔
(۲) کسی دھوکہ دہی، فریب کاری یا تلبیس (غلط بیانی Misrepresentation) کے بغیر معاہدہ ہر فریق کی آزادانہ رضامندی سے طے ہونا چاہئے۔

''مشارکت'' کے اصول وضوابط

(الف) منافع کی تقسیم : (۱) حصّہ داروں کے درمیان تقسیم ہونے والے منافع کے تناسب پر اتفاق معاہدہ ہونے کے وقت ہی ہو جانا چاہئے ورنہ شریعت کی نظر میں معاہدہ کالعدم اور بے اثر قرار پائے گا۔
(۲) ہر حصّہ دا کے منافع کی شرح کاروبار میں حاصل ہونے والے منافع کے تناسب سے ہونی چاہئے نہ کہ اُس سرمایہ کے تناسب سے جو اُس نے کاروبار میں لگایا ہے۔ کسی بھی حصّہ دار کے لئے اکٹھی فوری ادائیگی (Lump sum) مقرر کرنے یا اُس کی سرمایہ کاری کے پیشِ نظر منافع کی کوئی شرح مقرر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(ب) منافع کی شرح: (۳) مسلم فقہاء کے درمیان اس سوال پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر حصّہ دار کا شرحِ منافع اُس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے ہونا چاہئے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اِسی نظریہ کے قائل ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ہر فریق کی آزادانہ رضامندی سے طے ہو گیا ہے تو شرحِ منافع سرمایہ کاری کی شرح سے مختلف ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس بات کی اجازت ہے کہ کوئی حصّہ دار اپنی 40% سرمایہ کاری کے ساتھ 60 یا 70% منافع لے جائے جبکہ کسی دوسرے حصّہ دار کو اپنی 60% سرمایہ کاری کے ساتھ صرف 40 یا 30 فیصد منافع ملے۔ (''اَلمُغنی'' لابنِ قُدامہ، جلد پنجم، صفحہ ۱۴۰) بیروت ۱۹۷۲ء۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اِن دونوں کے بین بین ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ عام حالات میں شرحِ منافع سرمایہ کاری کی شرح سے مختلف ہو سکتی ہے۔ تاہم اگر ایک حصّہ دار نے معاہدہ میں کھلے طور پر یہ شرط رکھ دی ہے کہ وہ ''مشارکت'' کے لئے نہ تو کوئی کام کرے گا بلکہ ''مشارکت'' کی تمام مدت میں عملاً عدمِ شریک حصّہ دار (Sleeping Partner) رہے گا، تو اس صورت میں اُس کا شرحِ منافع اُس کی سرمایہ کاری کی شرح سے زیادہ نہیں ہوگا۔'' (''بَدائِعُ الصَّنائِع'' ـــ کاسانی، جلد ششم، صفحات ۱۶۲، ۱۶۳)

(ج) نقصان میں شراکت: نقصان کی صورت میں فقہاء کا اس نکتے پر مکمل اجماع ہے کہ ہر حصّہ دار

اپنی سرمایہ کاری کی شرح سے نقصان اٹھانے کا متحمل ہوگا۔اس لئے اگر کسی حصہ دار نے راس المال (Capital) کی 40% سرمایہ کاری کی ہے تو اُسے 40% نقصان بھی اٹھانا ہوگا اور اس اصول کے خلاف کوئی بھی شرط معاہدے کو کالعدم اور بے اثر کر دے گی۔'' (''اَلْمُغنی'' لابنِ قدامہ' جلد پنجم' صفحہ ۱۴۷)

اس اصول کو مندرجہ ذیل مشہور و معروف قولِ متعارف (Maxim) میں بیان کیا گیا ہے:۔

اَلرِّبْحُ عَلٰی مَا اصْطَلَحَا عَلَیْہِ وَالْوَضِیْعَۃُ عَلٰی قَدْرِ الْمَالُ

''منافع کا انحصار حصہ داروں کے اتفاقِ رائے پر ہوتا ہے لیکن نقصان بہر حال سرمایہ کاری کی شرح پر منحصر ہوتا ہے۔''

''مشارکت کا انتظام و انصرام : ''مشارکت'' کا عام اُصول یہی ہے کہ انتظامی امور میں حصہ لینے کا حق ہر شراکت دار کو حاصل ہوتا ہے۔تاہم حصہ داران اس بات پر متفق ہو سکتے ہیں کہ انتظامی امور کو اُن میں سے کوئی ایک حصہ دار چلائے گا اور کوئی دوسرا شراکت دار مشارکت کا کام نہیں کرے گا۔اس صورت میں (Sleeping Partner) کو صرف اپنی سرمایہ کاری کی وسعت تک منافع لینے کا حق حاصل ہوگا اور اُس کے منافع کی شرح اُس کی سرمایہ کاری کی شرح سے نہیں بڑھنی چاہئے۔

تاہم اگر تمام حصہ داران اجتماعی طور پر کام کرنے پر متفق ہو جائیں تو اُن میں سے ہر حصہ دار تمام کاروباری معاملات میں ایک دوسرے کا نمائندہ سمجھا جائے گا اور عام کاروباری حالات میں اُن میں سے کسی ایک حصہ دار کے کئے ہوئے کام کی توثیق سب شراکت داروں کی طرف سے ہوگی۔

''مشارکت'' کا اختتام : درجِ ذیل صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں مشارکت کا اختتام سمجھا جاتا ہے :

(۱) ہر حصہ دار کو اپنے شراکت داران کو اطلاع دینے کے ذریعے کسی بھی وقت ''مشارکت'' کے ختم کرنے حق حاصل ہوتا ہے اور ''مشارکت'' ختم ہو جاتی ہے۔اس صورت میں اگر ''مشارکت'' کے اثاثہ جات نقدی کی صورت میں ہیں تو وہ حصہ داران کے درمیان تناسب سے تقسیم کئے جاتے ہیں۔لیکن اگر اثاثہ جات نقدی کی شکل میں نہیں ہیں تو حصہ داران اُن کی تقسیم پر اُنہیں نقدی کی شکل میں لانے پر اتفاق کر سکتے ہیں۔اگر اثاثہ جات ایسے ہیں کہ اُن کا حصہ بخرہ نہیں ہو سکتا جیسے مشینری تو اُنہیں فروخت کرنے کے بعد حاصل شدہ رقم حصہ داروں میں تقسیم کی جاتی ہے۔(ایضاً ص ص ۱۴۳' ۱۴۴)

(۲) اگر مشارکت کے چالو ہونے کے دوران کوئی حصہ دار فوت ہو جاتا ہے تو اُس سے کیا ہوا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔اس صورت میں اُس کے وارثوں کو کاروبار سے متوفی کا حصہ لینے یا ''مشارکت'' کے معاہدے کو جاری رکھنے کا اختیار رہتا ہے۔ (ایضاً)

(۳) اگر کوئی حصّہ دار فاتر العقل (عقل سے محروم) ہو جاتا ہے یا کسی اور طرح تجارتی سرگرمیوں سے نااہل قرار پاتا ہے تو ''مشارکت'' ختم ہو جاتی ہے۔

(2) مضاربت: ''مضاربت'' عربی لفظ ہے اور ''ضَـرَبَ فِـی الارض'' سے نکلا ہے جس کا معنیٰ ''سفر کرنا'' ہے۔ کاروباری اصطلاح میں اُسے یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ آدمی کاروبار چلانے کی جدّ وجُہد کرتا ہے۔ سرمایہ کاری ایک شخص کی طرف سے ہوتی ہے جسے ''ربُّ المال'' کہا جاتا ہے جبکہ انتظام وانصرام کی ذمّہ داری دوسرے کی ہوتی ہے جو ''مُضارِب'' کہلاتا ہے۔ نفع ونقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

''مضاربہ'' کی تعریف یوں کی گئی ہے :

''مضاربہ کاروبار میں حاصل شدہ منافع میں حصّہ داری کا معاہدہ ہے جس میں ایک فریق سرمایہ کاری کرتا ہے جبکہ دوسرا فریق محنت کشی (لیبر) کرتا ہے۔'' (''الشرکۃ فی الفقہ الاسلامی'' ۔ علی الخفیف' ص ۶۵) قاہرہ ۱۹۴۱ء

''مضاربہ'' کی قانونی حیثیت اور جواز قرآن مجید' سنتِ رسول اور اجماعِ اُمّت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

وَآخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (اَلْمُزَّمِّل : ۲۰)
''اور بعض اللہ کی روزی کی تلاش میں ملک میں سفر کریں گے۔'' (۲۰ : ۷۳)

ابو بکر الجصّاص کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''وہ کاروبار اور تجارت کے ذریعے روزی کی تلاش کرتے ہیں۔ (''الاحکام القرآن'' ۔ ابو بکر الجصّاص' جلد سوم' صفحہ ۴۵)

نبی اکرم ﷺ نے خود سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ سے نکاح سے قبل اُن کے ''مضارب'' (نمائندہ/منتظم) کی حیثیت سے کام کیا۔

آپ ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی بھی ہے :
''تین چیزوں میں بڑی برکت ہے: آئندہ ادائیگی کے بھروسے پر فروخت (Credit Sale)' مضاربہ اور گھریلو استعمال کے لئے نہ کہ تجارتی مقصد کے لئے گندم اور جَو کو باہم ملانا۔'' ("Islamic Law of Contracts and Business Transactions" ... Muhammad Tahir Mansuri, p. 277) Lahore, 2001

یہ بھی روایت ہے کہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ یتیموں کے اثاثہ جات اور جائداد کی سرمایہ کاری مضاربہ کی بنیاد پر کرتے تھے (ایضاً صفحہ ۲۷۸)۔

کوفہ کے گورنر ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے عوامی رقم بیت المال کو ارسال کرنا چاہی۔ اُنہوں نے یہ رقم جنابِ عمر کے دو بیٹوں عبداللہ اور عبیداللہ کے سپرد کی جنہوں نے اس رقم سے تجارت کی۔ خلیفہ ثانی جنابِ عمر رضی اللہ عنہ کی مجلسِ مشاورت نے جو کئی صحابہ کرام پر مشتمل تھی' اسے گزشتہ مدّت سے نافذ العمل (Ex-post facto) مضاربہ کی حیثیت دیتے ہوئے عوامی رقم کے علاوہ اُن دو بھائیوں کے کمائے ہوئے منافع کا نصف حصّہ لے کر بیت المال میں جمع کرادیا۔' (''نَیلُ الاوطار''۔۔شوکانی' جلد پنجم' صفحہ ۲۳۶ ؛ ''بَدائعُ الصَّنائع''۔۔۔کاسانی' جلد ششم' صفحہ ۹۷' مؤطا امام مالک' جلد دوم' ص ۵۸۷)

''مشارکت'' اور ''مضاربت'' میں فرق: (۱) مشارکت میں سرمایہ کاری تمام شراکت داروں کی طرف سے ہوتی ہے جبکہ مضاربہ میں سرمایہ کاری کی تمام ذمّہ داری ربّ المال پر ہوتی ہے۔

(۲) مشارکت میں تمام شراکت داران کاروبار کے انتظامی امور میں حصّہ لے سکتے ہیں جبکہ مضاربہ میں ربّ المال کو انتظامی امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ان انتظامی امور کی ذمّہ داری مضارب پر ہوتی ہے۔

(۳) مشارکت میں تمام حصّہ داران اپنی سرمایہ کاری کی شرح کے تناسب سے نقصان میں شریک ہوتے ہیں جبکہ مضاربت میں ممکنہ نقصان صرف ربُّ المال اٹھاتا ہے کیونکہ مضارب تو سرمایہ کاری نہیں کرتا۔ مضارب کا نقصان اس حد تک محدود ہے کہ اُس کی محنت رائیگاں گئی اور اُس سے اُسے کسی قسم کا ثمر نہیں ملا۔ اگر مضارب کی غفلت یا بد دیانتی سے نقصان ہوا ہے تو مضارب کو نقصان کا ذمّہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

(۴) مشارکت میں حصّہ داران جونہی اپنا سرمایہ مشترکہ ساجھے میں شامل کرتے ہیں تو وہ مشارکت کے تمام اثاثے حصّہ داران کی سرمایہ کاری کے تناسب سے اُن تمام شراکت داروں کے مشترک اثاثے سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ہر حصّہ دار اثاثہ جات کی قدر و قیمت بڑھنے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اگرچہ فروخت کے ذریعے منافع نہ بھی ہوا ہو۔

مضاربہ کی صورت مختلف ہے۔ یہاں مضارب کی طرف سے خرید کئے گئے تمام اثاثہ جات صرف ربُّ المال کی ملکیت ہوتے ہیں اور مضارب کو منافع میں حصّہ اُس وقت ملتا ہے جب وہ سامان کو منافع پر بیچے۔ لہٰذا وہ اثاثہ جات میں اپنا حصّہ لینے کا مجاز نہیں اگرچہ اُن کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہو۔ ("An Introduction to Islamic Finance"... Justice Muhammad Taqi Usmani, pp.47-49)

ربُّ المال ایک سے زیادہ آدمیوں سے بھی مضاربہ کا معاہدہ کرسکتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنا سرمایہ الف اور ب دونوں کو پیش کرسکتا ہے تاکہ اُن میں سے ہر ایک اُس کی جانب سے مضارب کی حیثیت سے کام کرے۔ مضاربت کے سرمائے کو دونوں مضاربین مشترکہ طور پر استعمال میں لائیں گے اور مضارب کا حصّہ اُن دونوں کے درمیان طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔(''اَلمُغنی ''لابنِ قُدامہ' جِلد پنجم' صفحہ۱۴۵ بحوالہ ''اسلامک فنانس'')

اگر مضارب رمضاربین کوئی ایسا غیر معمولی کام انجام دینا چاہتے ہیں جو عام تجارتی نہج سے ہٹ کر ہے تو وہ اسے ربُّ المال کی واضح اور کھلی اجازت کے بغیر انجام نہیں دے سکتے۔

<u>منافع کی تقسیم</u>: شریعت کی جانب سے منافع کا کوئی خاص تناسب مقرر نہیں کیا گیا بلکہ اسے ربُّ المال اور مضارب کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔وہ منافع میں برابر کے تناسب سے بھی حصّہ دار ہوسکتے ہیں اور ربُّ المال اور مضارب کے لئے مختلف شرح بھی مختص کرسکتے ہیں۔

''مختلف صورتوں میں مختلف تناسبات پر اتفاق کرنے کی بھی اجازت ہے۔مثلاً ربُّ المال مضارب سے کہے کہ اگر تم گندم کا کاروبار کروتو تمہیں منافع کا 50% دوں گا اور اگر آٹے کا کاروبار کروتو تمہیں منافع کا 30% دوں گا۔ اسی طرح وہ اُسے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر تم اپنے علاقے میں کاروبار کروتو تمہیں منافع کا 30% دوں گا اور اگر کسی اور جگہ کروتو منافع کا 50% تمہارا ہوگا۔'' (''بَدائِعُ الصَّنائِع ''۔۔کاسانی' جِلد ششم' صفحہ۹۹)

مندرجہ بالا طریق سے طے شدہ منافع کے تناسب کے علاوہ مضارب' مضاربت میں کی گئی خدمات کے عوض کسی تنخواہ' فیس یا معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔(''المبسوط''۔۔علامہ سرخسی' جِلد ۲۲' صفحات ۱۴۹' ۱۵۰)

تمام فقہی مکاتبِ فکر اس نکتے پر متفق الرائے ہیں۔تاہم امام احمد بن حنبل نے مضارب کو مضاربت کے حساب میں سے کھانے کے یومیہ اخراجات لینے کی اجازت دی ہے۔'' (''اَلمُغنی ''لابنِ قُدامہ' جِلد پنجم' صفحہ۱۸۶)

فقہائے حنفی مضارب کے اس حق کو اُس صورت تک محدود رکھتے ہیں جب مضارب اپنے علاقے سے باہر کاروبار کرنے گیا ہوا ہو۔اس صورت میں اُسے اپنے ذاتی اخراجات' رہائش اور خوراک کے مطالبے کا حق حاصل ہے لیکن اگر وہ اپنے علاقے میں ہے تو وہ کسی قسم کے یومیہ وظیفہ (الاؤنس) لینے کا مجاز نہیں۔(''بَدائِعُ الصَّنائِع ''۔ کاسانی' جِلد ششم' صفحہ ۱۰۹)

<u>مضاربہ کا اختتام</u>: مضاربہ کا معاہدہ فریقین میں سے کسی ایک کی جانب سے کسی بھی وقت ختم ہوسکتا ہے۔ واحد شرط دوسرے فریق کو اطلاع دینے کی ہے۔ اگر مضاربہ کے اختتام کے وقت اُس کے تمام اثاثہ جات نقدی کی

شکل میں ہیں اور اصل زر پر کچھ منافع بھی کمایا جا چکا ہے تو یہ فریقین میں طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اگر مضاربت کے اثاثہ جات نقدی کی شکل میں نہیں، تو مضارب کو انہیں فروخت کرنے اور نقدی کی شکل میں لانے کا موقع دیا جائے گا تاکہ اصل منافع معلوم کیا جاسکے۔ (ایضاً)

مشارکت اور مضاربت کا باہم اجتماع : مضاربہ کے معاہدہ میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ مضارب نے مضاربت میں کوئی سرمایہ نہیں لگایا کیونکہ اُس کی ذمہ داری صرف انتظامی امور کو سنبھالنے کی ہوتی ہے جبکہ سرمایہ لگانا ربُّ المال کا کام ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ایسی صورتیں بھی ہوسکتی ہیں جہاں مضارب بھی مضاربت میں اپنی کچھ رقم لگانا چاہتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ''مشارکت'' اور ''مضاربت'' دونوں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً الف نے ب کو مضاربہ کے معاہدہ میں ایک لاکھ روپے دیئے۔ ب نے الف کی اجازت سے اپنے پاس سے پچاس ہزار روپے اُس میں شامل کر لئے۔ اس قسم کی حصہ داری کو مشارکت اور مضاربت کے اجتماع کے طور پر سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں اپنی رقم لگانے کی وجہ سے مضارب بطور حصہ دار منافع کا کچھ فیصد مخصوص کرسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مضارب کے طور پر کام کرنے اور انتظامی امور سنبھالنے کی وجہ سے کچھ اور فیصد بھی مخصوص کرسکتا ہے۔ اس مثال میں منافع کو مخصوص کرنے کی عام بنیاد یہ ہوگی کہ ب اپنی سرمایہ کاری کی وجہ سے اصل منافع کا تیسرا حصہ لے گا اور نفع کا بقایا ۲/۳ حصہ اُن دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا۔ فریقین کسی اور تناسب پر بھی متفق ہو سکتے ہیں۔ شرط صرف یہی ہے کہ Sleeping Partner اپنی سرمایہ کاری کے تناسب سے زیادہ فیصد نہ لے جائے۔ اس لئے اس مثال میں الف اپنے لئے کل منافع کے ۲/۳ حصہ سے زیادہ مخصوص نہیں کرسکتا کیونکہ اُس نے کل سرمائے کے ۲/۳ سے زیادہ کا سرمایہ نہیں لگایا۔ (''اَلْمُغنی'' لابنِ قُدامہ، جلد پنجم، صفحات ۱۳۶، ۱۳۷؛ ''بَدائِعُ الصَّنائِع'' ـــ کاسانی، جلد ششم)

(3) مُرابحہ (مارک اَپ) : یہ اشیائے صَرف کو اُس قیمت پر فروخت کرنا ہے جس میں قیمتِ خرید کے ساتھ ساتھ وہ منافع بھی شامل ہوتا ہے جس پر فریقین رضامند ہوں۔ عقدِ مرابحہ کو جب طریقۂ تمویل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اُدھار کی صورت میں ایک اضافی یا زائد قیمت عائد کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقدِ مرابحہ کی صورت میں کسی چیز کی قیمت نقد بازاری قیمت سے زائد ہوتی ہے۔ چونکہ قیمت اُس وقت کے عوض زیادہ کی گئی ہے جو وقت خریدار کو دیا گیا ہے، لہٰذا یہ سود پر مبنی عقدِ قرض کے مشابہ ہوگیا۔ [''سود پر تاریخی فیصلہ'' (اردو ترجمہ) ـــ مفتی محمد تقی عثمانی، ص ۱۶۷]

مُرابحہ دراصل امانت کی فروخت (بیعُ الامانہ) ہے جس میں خریدار فروخت کار کی دیانتداری اور اُس کی بتائی ہوئی قیمت پر اعتماد کرتا ہے۔ لہٰذا فروخت کار کا یہ قانونی اور اَخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ خریدار کو وہ قیمت بتانے میں ایمانداری سے کام لے جس میں اُس نے وہ شے خریدی ہے اور اگر اُسے کچھ رعایت (Rebate) ملی ہے تو اُس کا ذکر بھی بل میں ہونا چاہئے اور یہ چیز خریدار کے مفاد میں جاتی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ اشیاء کو ادھار پر زیادہ قیمت کے ساتھ فروخت کیا کرتے تھے۔اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب قیمت کسی تجارت کے ابتدائی مرحلے پر بڑھائی جاتی ہے تو اسے حرام قرار نہیں دیا جاتا لیکن جب خریدار وقتِ مقررہ پر قیمت ادا کرنے سے قاصر ہو جائے اور وہ کوئی اِضافی رقم اضافی مدّت کے عوض ادا کرے تو اُسے سود اور حرام قرار دیا جاتا ہے۔قرآن حکیم نے اس اعتراض کا یہ کہہ کر جواب دیا:

وَأَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو (البقرۃ : ۲۷۵)

''اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔'' (۲۷۵ : ۲)

مرابحہ کی بنیادی خصوصیات : (۱) ''مرابحہ'' سود پر دیا ہوا قرض نہیں ہے۔ یہ کسی جنس کی مؤخر ادائیگی پر فروخت کا نام ہے جس میں قیمتِ خرید پر وہ منافع بھی شامل ہوتا ہے جس پر فریقین رضامند ہوں۔

(۲) چونکہ مرابحہ قرض نہیں بلکہ فروخت ہے' اس لئے مرابحہ کو اُن تمام شرائط پر پورا اترنا چاہئے جو قانونی اور جائز فروخت میں ہونی چاہئیں۔

(۳) ''مرابحہ'' سرمایہ کاری کا طریق عمل نہیں ہے۔اس کا اطلاق ضرورتاً وہاں ہوگا جہاں خریدار کو کچھ اجناس کی خرید کے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی۔مثلاً اگر اُسے اپنی جننگ فیکٹری کے لئے بطور خام مال روئی خریدنے کے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہے' تو بینک اُسے مرابحہ کی بنیاد پر روئی فروخت کر سکتا ہے۔لیکن اگر رقم کی ضرورت کچھ دیگر مقاصد کے لئے پڑ گئی ہے جیسے اُن اجناس کے بلوں کی ادائیگی جو وہ پہلے ہی خرید کر چکا ہے' یا بجلی اور گیس کے بلوں کی ادائیگی' یا اپنے عملے کی تنخواہوں کی ادائیگی' تو اِن صورتوں میں مرابحہ کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ مرابحہ میں اجناس کی واقعی فروخت ہوتی ہے نہ کہ محض قرض دینا۔

(۴) مؤکل کو جنس فروخت کرنے سے پہلے سرمایہ کار کا اس جنس پر قبضہ ہونا ضروری ہے۔

(۵) شریعت کی نگاہ میں مرابحہ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ کار بذاتِ خود اُس جنس کو خرید کر اپنے قبضہ میں کرے یا اپنے کسی نمائندے کی وساطت سے اُسے خریدے۔تاہم استثنائی صورتوں میں اگر کچھ وجوہ کے باعث وہ براہِ راست نہیں خرید سکتا تو وہ اپنے مؤکل کو اپنی طرف سے خرید کرنے کا اختیار دے سکتا ہے۔(ایضاً)

مرابحہ کو اگر اپنی تمام ضروری شرائط کے ساتھ نافذ کیا جائے تو یہ شریعت میں ناجائز نہیں ہے۔

بیع مؤجّل : ایسی فروخت جس میں فریقین رقم کی مؤخر ادائیگی پر رضامند ہوں' بیع مؤجل کہلاتی ہے۔اگر رقم کی ادائیگی کی تاریخ واضح طور پر مقرر کر دی جائے تو بیع مؤجل قانونی طور پر جائز ہے۔

بیع مؤجل کے مشروع اور جائز ہونے میں فقہاء کا کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ تجارتی اُصول کی رُو سے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اور دوم یہ کہ بیع مؤجل سنتِ رسول سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے گندم کی کچھ مقدار مؤخر ادائیگی کی شرط پر خریدی اور اپنی زرہ بہ طورِ ضمانت اُس کے پاس گروی رکھی۔ لیکن اس بارے میں فقہاء کا اتفاق یا اِجماع نہیں ہے کہ مؤخر ادائیگی کی وجہ سے آیا فروخت کرنے والا جنس کی قیمت بڑھا سکتا ہے یا نہیں۔ مسلم فقہاء کا ایک فریق ایسے اضافہ کو جائز قرار دیتا ہے کیونکہ یہ اضافہ جنس کے مقابل ہے نہ کہ رقم کے مقابل۔ اس لئے وہ فروخت کار کو جنس کی دو قیمتیں متعیّن کرنے کی اجازت دیتے ہیں یعنی نقد اور فوری ادائیگی اور مؤخر (قرض پر) ادائیگی۔ وہ خریدار کو جنس کی خرید کی کوئی سی دو قیمتوں پر خرید کی اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح اُن کی نظر میں متوقع خریدار کو یہ کہنا جائز ہے کہ میں اس چیز کو تمہیں -/100 روپے نقد پر اور -/150 روپے ایک سال کے قرض پر فروخت کرتا ہوں۔ علمائے جدید کا ایک طبقہ ایسے لین دین کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ ایسی تجارت کو غیر شرعی ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل دلائل دیتے ہیں:۔

(۱) قرآن وسنت میں مؤخر ادائیگی پر رقم بڑھانے کی اجازت کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔

(۲) اگر رقم کی مؤخر ادائیگی پر رقم کے اضافہ کا شرعی جواز ہے بھی' تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ منڈی کی رائج الوقت قیمت سے بڑھ کر اتنی اونچی قیمت وصول کی جائے۔

(۳) بیع مؤجل میں فروخت کار کا مقصد اُس ٹائم سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے جو وہ خریدار کو دیتا ہے اور اس طرح اس میں اور سودی لین دین میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۴) خریدار کا منڈی کی رائج الوقت قیمت سے زیادہ ادائیگی پر راضی ہو جانا ایسے سودے کا جواز نہیں بن سکتا کیونکہ وہ نقد ادائیگی نہ کرسکنے کی وجہ سے مجبوراً اس پر راضی ہوا ہے۔ اس لئے ایسا معاہدہ خریدار کی حقیقی رضامندی کا آئینہ دار نہیں۔ علاوہ ازیں اس سودے میں خریدار کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔

(۵) وصول کیا گیا منافع اس قدر حد سے بڑھا ہوا نہیں ہونا چاہئے ورنہ وہ ''غبنِ فاحش'' کی زد میں آئے گا جو معاہدے کو غیر قانونی قرار دیتا ہے (''غبنِ فاحش'' کی وضاحت کے لئے جلد دوم کا صفحہ ۶۳۹ ملاحظہ ہو)۔

(۶) فروخت کار کی طرف سے مقرر کردہ نقد قیمت پہلے ہی منافع کی مقدار (Profit Margin) کو شامل ہوتی ہے۔ اب قیمت میں مؤخر ادائیگی کی وجہ سے مزید اضافہ صرف ٹائم کے مقابل ہے۔ مثلاً فروخت کار اگر خریدار سے یہ کہے کہ اشیاء کی نقد قیمت یکصد روپے اور کریڈٹ پرائس (ادھار پر) ڈیڑھ صد روپے ہے' تو ظاہر ہے کہ پچاس روپے کا یہ اضافہ وقت سے فائدہ اٹھانا ہی تو ہے۔

مؤخرادائی پراتنی اونچی قیمت وصول کرنا اگرچہ تکنیکی لحاظ سے سُودی عمل نہ ہولیکن نیت اورارادے کے مدِّنظر ایسا کاروبار بلا شک وشبہ سودی کاروبار ہی ہے۔ایسا عمل غاصبانہ ذہنیت کو پروان چڑھاتا ہے اور سود کے لئے پچھلی دروازہ کھولتا ہے۔شریعت میں بیع مؤجل دراصل اُس خریدار کوسہولت بہم پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے جسے فوری ادائی کے وسائل میسر نہیں۔بیع مؤجل کسی بھی طرح خریدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے اور اُس کا استحصال کرنے کے لئے نہیں۔بیع مؤجل سنتِ رسول سے ثابت ہے لیکن سنت سے کہیں یہ ثابت نہیں کہ مارکیٹ کی رائج الوقت قیمتوں سے زیادہ وصول کرنے کی شریعت نے کہیں اجازت دی ہو۔'' ("Islamic Law of Contracts and Business Transactions"... Dr. Muhammad Tahir Mansuri, pp. 224- 225).

<u>فریبی اور چالباز خریدار کا علاج</u> : اسی جلد سوم کے صفحہ ۱۰۶۱ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

(4) <u>اِجارہ (کرایہ داری)</u> <u>[LEASING]</u> : لفظ ''اِجارہ'' کا لفظی معنی کسی چیز کو کرائے پر دینا ہے۔حنفی فقہ میں اس کی تعریف یوں ہے:

''یہ ثمری تصرّف کا معاہدہ ہے جو کسی معلوم عمل کے لئے کیا جاتا ہے۔'' (''مُغنی المُحتاج''۔۔ شبرینی' جلد دوم' صفحہ ۳۳۲)

نوٹ : ثمری تصرّف (Usufruct) کسی دوسرے کی ملکیت سے فائدہ اٹھانا بشرطیکہ اُس جائداد کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔

اِجارہ کا جواز اور معتبر ہونا قرآنِ حکیم' احادیثِ نبویہ اور فقہائے اسلام کے اجماع سے ثابت ہے۔قرآنِ حکیم نے فرمایا:

(۱) قَالَتْ اِحْدٰهُمَا یٰٓاَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿اَلْقَصَص : ۲۶﴾
''اُن دو میں سے ایک بولی: اے ابّا! اُنہیں کرائے پر (نوکر) رکھ لیجئے کیونکہ اچھا نوکر وہی ہے جو قوّت دار' امانت والا ہو۔'' (۲۶ : ۲۸)

(۲) فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (الطَّلَاق : ۶)
''اگر وہ (مائیں) تمہارے لئے رضاعت کریں تو اُنہیں اُن کی اُجرت دو۔'' (۶ : ۶۵)

اس بارے میں کچھ احادیثِ نبویہ کا حوالہ ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

(۱) ''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی مکرّم ﷺ کے زمانہ مبارک میں زمین کے مالکان اپنی زمینوں کو کرائے پر دیا کرتے تھے۔'' (سنن نسائی' ج ۳' ص ۶۰)

(۲) ''نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مزدور کو اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اُس کی مزدوری ادا کر دیا کرو۔''
(۳) ''اگر کوئی شخص کسی سے مزدوری لیتا ہے تو مزدور کو بتا دینا چاہئے کہ وہ اُسے کتنی مزدوری دے گا۔''

نبی معظم ﷺ نے اجارہ کے عمل کی توثیق فرمائی (''المبسوط'' --سرخسی' جلد ۱۵' صفحہ ۷۴)۔

اجارہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) اجارۃ العین: چیزوں کو کرائے پر دینا جیسے مکان' دکان' زمین اور مویشی۔
(۲) اجارۃ الذمہ: کسی کی خدمات مزدوری پر لینا مثلاً پینٹر کا مکان کو پینٹ کرنا۔

کرایہ داری کے مفہوم میں ''اجارہ'' کے اصول' فروخت کے اصولوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں دوسرے آدمی کو کوئی نہ کوئی چیز کسی قابلِ قدر وقعت کی خاطر منتقل کی جاتی ہے۔ اجارہ اور فروخت میں فرق صرف اتنا ہے کہ فروخت میں اثاثہ فی نفسہٖ خریدار کو منتقل کیا جاتا ہے جبکہ اجارہ کی صورت میں اثاثہ فی نفسہٖ مالک کی ملکیت میں رہتا ہے لیکن اس کا ثمری تصرّف (Usufruct) یعنی اس کے استعمال کا حق کرایہ دار (Lessee) کو منتقل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات بہ آسانی معلوم کی جاسکتی ہے کہ اجارہ ابتداء سرمایہ کاری کا طریق عمل نہیں۔

<u>اجارہ کے بنیادی اصول</u> : (۱) اجارہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں کسی چیز کا مالک اس کے استعمال کا حق دوسرے آدمی کو ایک طے شدہ عرصہ کے لئے طے شدہ شرائط کے تحت دیتا ہے۔

(۲) اجارہ پر دی جانے والی چیز قابلِ استعمال قدر کی حامل ہو۔ لہٰذا ناقابلِ استعمال اور بے وقعت چیزیں اجارہ پر ہرگز نہیں دی جاسکتیں۔

(۳) اجارہ کے قانونی معاہدہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ کرایہ پر دی گئی جائداد فی نفسہٖ مالک کے قبضہ میں رہے اور صرف اس کے استعمال کا حق کرایہ دار کو منتقل ہو۔ اس طرح ایسی کوئی چیز جو تصرّف کے بغیر استعمال میں نہیں لائی جاسکتی' اجارہ میں نہیں دی جاسکتی۔ اسی لئے زر' ماکولات' ایندھن اور گولہ بارود وغیرہ کو اجارہ پر نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اُن کا استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُنہیں تصرّف میں نہ لایا جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی چیز اجارہ میں دی جائے تو اسے قرض سمجھا جائے گا اور اس پر قرضی لین دین کے اصولوں کا اطلاق ہوگا۔ اس غیر قانونی اجارہ کا کرایہ لینا قرض پر سود لینے کے برابر ہوگا۔

(۴) چونکہ اجارہ پر دی گئی جائداد فی نفسہٖ مالک کے قبضہ میں رہتی ہے اس لئے ملکیت سے پیدا ہونے والی

تمام ذمہ داریاں اور واجبات مالک کے ذمہ ہوتی ہیں لیکن وہ واجبات جو جائداد کے استعمال سے متعلق ہیں' کرایہ دار کے ذمہ ہوتی ہیں۔

مثال: الف نے ب کو اپنا مکان کرائے پر دیا۔ مکان سے متعلق ٹیکس الف ادا کرے گا جبکہ پانی' بجلی' گیس اور سیوریج کے بلوں کی ادائیگی ب کے ذمہ ہوگی یعنی مکان کے استعمال سے متعلق تمام اخراجات کا متحمل ب یعنی کرایہ دار ہوگا۔

(۵) مدتِ اجارہ کا تعین صاف اور واضح الفاظ میں ہو۔

(۶) کرایہ دار اجارہ پر دیئے گئے اثاثے کو اُس مقصد کے علاوہ جس کا ذکر اجارہ کے معاہدہ میں کیا گیا ہے کسی اور مقصد کے لئے استعمال میں لانے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی مقصد معاہدہ میں مخصوص نہیں کیا گیا تو کرایہ دار اسے صرف عمومی اور رائج الوقت استعمال میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ اسے کسی غیر طبعی (Abnormal) مقصد کے لئے استعمال میں لانا چاہتا ہے تو وہ اسے مالک کی کھلی اجازت کے بغیر استعمال میں نہیں لا سکتا۔

(۷) کرایہ دار مالک کو ہر اُس نقصان کی تلافی کر دینے کا مکلف ہے جو اُس نے اثاثے کو اپنی غفلت یا غلط استعمال کی وجہ سے پہنچایا۔

(۸) اُن نقصانات اور خطرات کی تلافی جن پر کرایہ دار کا بس نہیں چلتا' مالک کے ذمہ ہوگی۔ مثلاً زلزلہ' طوفان' سیلاب یا اسی قسم کی کوئی دوسری اَرضی یا سماوی آفت۔

(۹) وہ جائداد جس کے دو یا زیادہ مالک ہوں' اجارہ پر دی جا سکتی ہے اور اُن میں کرایہ کی تقسیم جائداد میں اُن کے متناسب حصہ کے لحاظ سے ہوگی۔

(۱۰) جائداد کا مشترک مالک اپنا متناسب حصہ اپنے کسی مشترک حصہ دار کو اجارہ پر دے سکتا ہے' کسی اور کو نہیں۔ (''ردّ المحتار'' ۔۔ ابن عابدین' جلد ششم' صفحات ۴۷' ۴۸ بحوالہ ''این انٹروڈکشن ٹو اسلامک فنانس' صفحہ ۱۶۱)۔

معاہدہ رہن (Pledge) : ''رہن وہ ضمانت ہے جسے قرض کے معاملے میں قرضخواہ کی تسلی کے لئے قانونی طور پر اُسے دی جاتی ہے۔'' (مجلّہ آرٹیکل ۷۰۱)

''رہن اُس حقیقی جائداد کا رائج الوقت قانون کے مطابق بطور ضمانت گروی رکھنا ہے جس کی کوئی مادّی قدر ہو اور یہ ضمانت قرض یا کسی مالی ذمہ داری کے بارے نمٹنے کے لئے دی جاتی ہے۔'' ("An Arabic English Lexicon"... Edward William Lane, part 3, p. 1172)

رہن کی قانونی حیثیت سورۃ البقرہ میں بہ ایں الفاظ بیان کی گئی ہے :
وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ" (اَلْبَقَرَة : ۲۸۳)
"اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ تو رہن رکھنے کی چیزیں با قبضہ دے دیا کرو۔"

قرآنی الفاظ صرف سفر کے دوران (نہ کہ حضر میں) رہن کا جواز ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال عموماً سفر کے دوران ہی پیش آتی ہے' اس لئے اسے سفر کے سیاق میں بیان کیا گیا ہے جس میں معاہدہ کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے کوئی کاتب نہ ملے۔ ورنہ رہن کی اجازت سفر وحضر دونوں صورتوں میں ہے۔ رہن کا اطلاق اُس صورت میں بھی ہوگا جہاں قرضخواہ مقروض پر اعتماد نہ کرے۔

احادیثِ نبویہ سے بھی رہن کے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً :
(۱) سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی یہودی سے کوئی چیز ایک مقررہ وقت تک کے لئے اُدھار پر خریدی جس کے لئے آپ نے اپنی زرہ اُس کے پاس رہن رکھی۔" (بخاری' ج ۳' ص ۵۴)
(۲) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زِرہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس گروی رکھی تھی۔" (ایضاً)

"مرہونہ اَثاثہ کی قانونی حیثیت : اُس شخص کے لئے جس کی تحویل میں اثاثہ بطور رہن رکھا گیا' رہن اعتماد اور تسلی کی ایک صورت ہوتا ہے۔ فقہائے احناف کا یہ نظریہ ہے کہ جس کے پاس اثاثہ بطورِ رہن رکھا گیا ہے' اُس اثاثے کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد اس کی حفاظت کا وہ ذمہ دار ہو جاتا ہے کہ کہیں اُس اثاثے کو نقصان نہ پہنچے۔ رہن رکھنے والے کی ذمہ داری کی وسعت قرض کی اُس رقم کی واپسی تک ہی ہے جو اُس نے مقروض کو دی ہے۔" (طاہر منصوری ص ۳۱۶)

جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے' اُس کا اثاثہ مرہونہ سے فائدہ اٹھانا : فقہائے احناف کے نزدیک مرہونہ اثاثہ سے فائدہ اٹھانا اُس چیز کے مالک کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے۔ فقہائے شوافع کے نزدیک مرہونہ اثاثہ سے فائدہ اٹھانا اِس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اثاثہ کی قدر و قیمت میں کمی نہ ہو۔ فقہائے مالکیہ کے نزدیک رہن رکھنے والے کو قطعاً اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں' چاہے اثاثے کا مالک اس کی اجازت کیوں نہ دے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ رہن کا بنیادی مقصد قرض کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس سے فائدہ اٹھانے یا اُسے کاروبار میں لگانے کا۔ اُس حدیث کی رُو سے مرہونہ اثاثہ سے ہر قابلِ نفع عمل کو اسلامی قانون میں سُود سمجھا جاتا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

"ہر وہ قرض جو کچھ نہ کچھ نفع لائے' سود کی ایک قسم ہے۔" ("سُبُل السلام" صنعانی' ج ۳' ص ۵۳)

جس حدیثِ مبارکہ میں جانور کا دودھ دوہنے یا اُس پر سوار ہونے کی اجازت دی گئی ہے' یہ اجازت اُس صورت

میں ہے جب جانور کا مالک اُس جانور کا چارہ اور خوراک مہیا کرنے سے انکار کردے :

''مرہون جانور پر اُس وقت تک سواری کی جاسکتی ہے جب تک اسے کھلایا پلایا جاتا ہے اور دودھیل جانور کا دودھ بھی اُس خرچ کے مطابق استعمال کیا جاسکتا ہے جو اُس پر ہوتا ہے۔ جو شخص جس جانور پر سوار ہوتا ہے یا اُس کا دودھ استعمال میں لاتا ہے' خرچ کرنا اُس کی ذمہ داری ہے۔'' (ملخّص: طاہر منصوری ص ۳۲۰)

(7) ''بیع سلم: یہ ایک قسم کا معاہدہ ہے جس کی رُو سے کسی چیز کی خرید پر فروخت کار کو پیشگی رقم ادا کی جاتی ہے اور اشیاء کی رسد مؤخر ہوتی ہے۔ اس قسم کی تجارت مختلف ناموں کے ساتھ قبل از اسلام عرب میں بھی رائج تھی۔ نبی اکرم ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے موقع پر کاروبار کی یہ صورت آپ سے رہنمائی کے حصول کے لئے آپ کے علم میں لائی گئی۔ آپ نے اسے ''سلم'' (بمعنی پیشگی) کا نام دیا اور کچھ شرائط کے تحت اس کی اجازت مرحمت فرمائی جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

بیع سلم کی شرائط: (۱) سلم کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ خریدار فروخت کار کو فروخت کے وقت پوری رقم ادا کرے۔ سلم کی اجازت کے پس پردہ معقول وجہ فروخت کار کی فوری ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ اگر اُسے پوری رقم ادا نہ کی جائے تو کاروبار کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس لئے تمام فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ سلم میں پوری رقم کا ادا کیا جانا لازم ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریہ ہے کہ فروخت کار خریداروں کو دو یا تین دن کی رعایت دے لیکن اس رعایت کو معاہدے کا حصّہ نہیں بننا چاہئے۔

(۲) سامان کی تفویض کی مدت کا تعیّن ضروری ہے۔

(۳) چیز کا فروخت کار کے قبضہ میں نہ ہونے کے باوجود اُس کی فروخت جائز ہے۔

(۴) بیعِ سلم ایک جیسی چیزوں میں جائز نہیں ہے مثلاً انگور کے بدلے میں انگور یا اناج کے بدلے میں اناج۔

(۴) صرف اُن اشیاء کی فروخت جائز ہے جن پر معیار اور مقدار کا اطلاق ہوتا ہے۔ جن اشیاء پر مقدار اور معیار کا اطلاق نہیں ہوتا' اُنہیں سلم کی بنیاد پر فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً قیمتی پتھر سلم کی بنیاد پر فروخت نہیں کئے جا سکتے کیونکہ قیمتی پتھروں کا ہر ٹکڑا اپنے معیار' اپنے سائز اور وزن میں بالعموم دوسرے ٹکڑوں سے مختلف ہوتا ہے اور اُن کی تخصیص بالعموم نہیں کی جاسکتی۔

(۵) معاہدہ طے پانے کے وقت رقم کی ادائی ضروری ہے۔

(۶) ''کسی خاص جنس یا کسی خاص کھیت کی پیداوار پر سَلَم اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر اگر فروخت کار کسی خاص کھیت کی گندم یا کسی خاص درخت کا ثمر فراہم کرنے کا معاہدہ کرتا ہے' تو اس صورت میں ''سلم'' قانونی طور پر جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ اُس خاص کھیت کی پیداوار یا اُس درخت کا ثمر خریدار کو سپردگی سے پہلے ہی تباہی کی نذر ہو جائے تو اس صورت میں سپردگی غیر یقینی رہے گی۔ یہی اصول ہر اُس جنس پر بھی صادق آئے گا جس کی سپردگی یقینی نہیں ہو۔'' [اَلْمُغنی'' لابن قدامہ' جلد ۴' صفحہ ۳۲۵' بحوالہ ''اَین انٹروڈکشن ٹو اسلامک فنانس'' (اردو ترجمہ) از مفتی محمد تقی عثمانی' صفحہ ۱۸۸]

''جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا کہ اُس چیز کی فروخت جو فروخت کار کے قبضہ میں ہی نہیں' اُصولی طور پر جائز نہیں لیکن بیع سلم کا جواز ایک استثنائی صورت ہے۔ کچھ فقہاء نے اس کا جواز مندرجہ ذیل آیتِ قرآنی سے نکالا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (اَلْبَقَرَة: ۲۸۲)

''ایمان والو! جب کسی مدتِ معیّن تک اُدھار کا معاملہ کرنے لگو تو اُسے لکھ لیا کرو۔'' (۲:۲۸۲)

یہ بات کہ نبی اکرم ﷺ نے کچھ شرائط کے تحت اس کی اجازت مرحمت فرمائی' اُس ضرورت کے تحت تھی جو کم آمدنی کے کسانوں اور تاجروں کو درپیش تھی۔ سود کی ممانعت کے بعد وہ سودی قرضے نہیں لے سکتے تھے' اس لئے اُنہیں زرعی پیداوار پیشگی فروخت کرنے کی اجازت دی گئی۔ (ڈاکٹر محمد طاہر منصوری' صفحات ۲۰۰' ۲۰۱)

اسی طرح عرب تاجر اشیاء اور اجناس دوسرے ملکوں کو برآمد کرتے تھے اور اُن ممالک کی اشیاء اپنے ملک میں درآمد کرتے تھے۔ اس قسم کے کاروبار کو چلانے کے لئے اُنہیں سرمائے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سود کی ممانعت کے بعد وہ سودی قرضہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے اُنہیں اپنی اشیاء اور اجناس پیشگی فروخت کرنے کی اجازت دی گئی۔ نقد قیمت کی وصولی کے بعد وہ مندرجہ بالا کاروبار کر سکتے تھے۔

(8) استصناع: یہ ایک اور قسم کی فروخت ہے جس میں کسی جنس کا معاہدہ اُس کے وجود میں آنے سے پہلے کر لیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صنعت کار کو یہ آرڈر دیا جائے کہ وہ خریدار کو مخصوص جنس مہیا کرے۔ اگر صنعت کار خریدار کو میٹیریل سمیت وہ چیز یا جنس فراہم کرنے کا ذمہ لے لیتا ہے تو ایسے کاروبار کو ''استصناع'' کہا جاتا ہے۔ لیکن استصناع کے قانونی جواز کے لئے ضروری ہے کہ فریقین کی رضامندی سے قیمت طے کر لی جائے اور یہ کہ مہیا کی جانے والی چیز یا جنس کی ضروری تخصیص اُن کے مابین طے ہو جائے۔

استصناع کا معاہدہ صنعت کار پر اشیائے مطلوبہ فراہم کرنے کی اخلاقی ذمہ داری ڈالتا ہے لیکن کام شروع کرنے سے پہلے فریقین (صنعت کار اور خریدار) میں سے کوئی بھی فریق دوسرے کو اطلاع (نوٹس) دینے کے بعد معاہدے کو منسوخ کرنے کا مجاز ہے۔ (''رَدُّالمُحتار'' لابن عابدین' ج ۵' ص ۲۲۳)

''اِستِصناع'' اور ''سَلَم'' میں فرق : (۱) استصناع کا موضوع ہمیشہ کسی چیز کی صنعت کاری یا اُس کا بنانا ہوتا ہے جبکہ سَلَم کا اطلاق کسی بھی چیز پر ہوسکتا ہے خواہ اُس میں صنعت کاری (Manufacturing) کا دخل ہو یا نہ ہو۔

(۲) ''سَلَم'' میں ضروری ہے کہ رقم کی مکمل ادائیگی پیشگی کردی جائے جبکہ ''استصناع'' میں یہ ضروری نہیں ہے۔

(۳) ''سَلَم'' کا معاہدہ ایک دفعہ پختہ ہوجانے کے بعد یک طرفہ طور پر منسوخ نہیں ہوسکتا جبکہ ''استصناع'' کا معاہدہ صنعت کار کے کام شروع کرنے سے پہلے منسوخ ہوسکتا ہے۔

(۴) ''سَلَم'' میں سپردگی کے وقت کا تعیّن فروخت کا لازمی جزء ہوتا ہے جبکہ ''استصناع'' میں وقت کا تعیّن ضروری نہیں ہے۔ (ایضاً)

''اِستِصناع'' اور ''اِجارہ'' میں فرق: ''استصناع'' میں صنعت کار (Manufacturer) سامانِ مطلوبہ اپنے میٹیریل سے بنا دینے کا ذمّہ لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''استصناع'' میں صنعت کار کے پاس اگر میٹیریل موجود نہیں ہے تو وہ میٹیریل مہیا کر کے سامانِ مطلوبہ کے آرڈر کی تکمیل کر کے اُسے خریدار کے سپرد کرے گا۔ لیکن اگر میٹیریل گاہک فراہم کرتا ہے اور صنعت کار اُس پر صرف اپنی محنت (لیبر) اور مہارت صَرف کرتا ہے' تو ایسا کاروبار ''استصناع'' نہیں کہلائے گا بلکہ یہ ''اجارہ'' ہوگا جس میں ایک آدمی کی خدمات ایک مخصوص فیس کی ادائی پر حاصل کی گئی ہیں۔ (''شرح المجلہ'' ۔۔۔ خالد الاتاسی' جلد ۲' صفحہ ۴۰۸ بحوالہ ''اسلامک فنانس'' صفحہ ۱۹۷)

جب اشیائے مطلوبہ کی صنعت کاری فروخت کار کر لے اور اُنہیں تیار کر لے تو وہ اُنہیں خریدار کو پیش کرے۔ فقہائے اسلام میں اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا اِس موقع پر خریدار کو اُن اشیاء کے مسترد کرنے کا حق حاصل ہے کہ نہیں۔ امام ابوحنیفہ کا یہ نظریہ ہے کہ اُسے معائنہ کرنے کا اختیار (خِیارُ الرؤیا) حاصل ہے کیونکہ ''استصناع'' ایک قسم کی فروخت ہی ہے اور اگر کوئی شخص کوئی ایسی چیز خرید کر لیتا ہے جو اُس نے دیکھی ہی نہیں تو اُسے دیکھنے کے بعد وہ اس کے خریدنے سے انکار کرسکتا ہے۔ اسی اصول کا اِطلاق ''استصناع'' پر ہوتا ہے۔
(''اسلامک فنانس'' از مفتی محمد تقی عثمانی' صفحہ ۱۹۷)

کاغذی زر (PAPER MONEY) کی قانونی حیثیت : تمام عملی مقاصد کے لئے کاغذی زر حقیقی زر ہے اور دھات کے قدیم زر اور ہمارے آج کے کاغذی زر میں کوئی اہم فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں اشیائے صَرف کی قدر کو متعیّن کرنے کا ذریعہ ہیں۔ بہت سے نامور مسلم علماء وفضلاء کی تحریروں نے اِسی حقیقت پر زور دیا ہے۔ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں:

''ہم اشیائے ضرورت کی قیمت ادا کرتے ہیں' مزدوروں کو اُن کی مزدوری دیتے ہیں' بیویوں کو اُن کا مہر دیتے ہیں اور اسی کاغذی زر ہی کی صورت میں قتلِ خطا کی دیت ادا کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کاغذی زر کو چُرا لے تو اُسے فوجداری قانون کے ضابطے کے مطابق چوری کی سزا دی جاتی ہے۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر ہم اس کے قانونی زر ہونے کے مقام سے کیوں انکار کریں؟'' (''ربٰو اور بینک کا سود' جو یوسف القرضاوی کی کتاب 'فوائد البنوك هى الربو المحرّم'' کا ترجمہ ہے' صفحات ۴۰' ۴۱)

''مکّہ مکرّمہ کی فقہی اکادمی نے اپنے اجلاس منعقدہ اکتوبر 1986ء میں اس بات پر زور دیا کہ کاغذی زر میں سونے' چاندی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے یہ ''ثمن'' ہے لہٰذا کاغذی زر پر سود' زکوٰۃ' سلم کے کاروبار سے متعلق اور اُن تمام معاہدات پر جن میں سونا' چاندی کام میں لائے جاتے ہیں' شرعی قوانین کا اطلاق ہوگا۔'' (ڈاکٹر طاہر منصوری' صفحات ۱۹۹' ۲۰۰)

اسلامی بینکوں کی کارکردگی --- ایک حقیقت پسندانہ تشخیص : اسلامی بینکوں کا ڈھانچہ (Mechanism) جس کی بنیاد 'مشارکت'' پر ہے' سُود سے پاک ہے۔ اس لئے کھاتہ داروں کو سود ادا کرنے یا مؤکلوں سے سود وصول کرنے کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلامی بینکنگ کے نظام میں دو قسم کے کھاتہ دار ہوتے ہیں: پہلی قسم کے وہ کھاتہ دار ہیں جو اپنا زائد سرمایہ بینک میں رکھاتے ہیں اور اُنہیں کسی اطلاع (نوٹس) کے بغیر کسی بھی وقت اپنی رقم نکلوانے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس قسم کے کھاتے صرف سرمائے کے تحفظ کے لئے ہوتے ہیں اور اُنہیں اُن پیداواری سرگرمیوں میں نہیں لگایا جاتا جن میں نقصان کا خطرہ لاحق ہو۔ ایسے کھاتوں پر بینک مسلمان کھاتہ داروں سے زکوٰۃ اور غیر مسلم کھاتہ داروں سے خدمات کا معاوضہ (سروس چارجز) وصول کرتے ہیں۔ ایسے کھاتوں کی افادیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ بے مصرف نقدی کو بے مَصرف ذخیرہ اندوزی سے روکتی ہے اور پیداواری سرگرمیوں میں رقم لگانے کا تحرّک اور جوش (Stimulus) پیدا کرتی ہے۔

کھاتہ داروں کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو نوٹس دیئے بغیر اپنی رقوم نہیں نکلوا سکتے۔ اُن کا زائد سرمایہ قلیل المیعاد مدت کی بنیاد پر پیداواری کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ ایسے کھاتہ داروں سے بینک کچھ بھی وصول نہیں کرتا بلکہ وہ مالی سال کے اختتام پر (Dividends) کی شکل میں اپنے جمع شدہ سرمائے کے تناسب کے لحاظ سے بینک کے نفع نقصان میں حصّہ دار بننے کے مجاز ہوتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اسلامی بینک ایک سال سے پانچ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کی مدّت تک کی سرمایہ کاری کا اعلان کرنے کے ذریعے خزینوں کو بڑھا سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں کچھ بینک ایک مقررہ شرح سود پر سرمایہ کاری کے سرٹیفیکیٹ یا سرمایہ کاری کے بانڈ جاری کرتے ہیں لیکن اسلامی ریاست میں سرمایہ کاری سرٹیفیکیٹس کے ایسے حاملین بینک کے منافع جات میں (Dividends) کی شکل میں اپنے سرمایہ کے تناسب سے

حصّہ دار بننے کے اہل ہوتے ہیں۔ اُن (Dividends) کو مالی سال کے اختتام پر بھنایا جا سکتا ہے۔'' ("Islamic Economics --- Theory & Practice" --- M. A. Mannan, pp. 221, 222)

'' آج اسلامی بینکنگ ایک نا قابلِ انکار حقیقت بن چکی ہے۔ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے اور نئے نئے اسلامی بینک سرمایہ کثیر کے ساتھ قائم کئے جا رہے ہیں۔ اسلامک بینکنگ سے تعاون کے لئے روایتی بینک اسلامی امدادی (ذیلی) کمپنیاں اور شاخیں کھول رہے ہیں' یہاں تک کہ غیر مسلم مالیاتی ادارے بھی اس میدان میں آگے آ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ مسلمان کھاتہ داروں کو اپنی طرف لانے کے لئے جاذبیت دے رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اگلی دہائی کے دوران اسلامک بینکنگ کئی گنا بڑھ جائے گی اور اُمید ہے کہ اسلامی بینکوں کے دائرۂ عمل کی وسعت دُنیا کے مالیاتی معاملات کے اچھے خاصے میدان کو ڈھانپ لے گی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ اسلامی مالیاتی ادارے اپنے کاروبار کو وسعت دیں' اُنہیں پچھلی دو دہائیوں میں اپنی کارکردگی کا جائزہ لینا چاہئے کیونکہ ہر نئے نظام کو اپنی سرگرمیوں پر نظرِ ثانی کرنے اور اپنی کوتاہیوں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کے لئے ماضی کے تجربات سے سیکھنا پڑتا ہے۔ جب تک ہم اپنی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ نہیں کریں گے' اُس وقت تک ہم اپنی مکمل کامیابی کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ اسی تناظر میں ہم نے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کے طریقِ عمل کا شریعتِ اسلامی کی روشنی میں تجزیہ کرنا اور زیرِ غور لانا ہے کہ اُنہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔'' [''اَین انٹروڈکشن ٹو اسلامک فنانس'' (اردو ترجمہ) از مفتی محمد تقی عثمانی' صفحہ ۱۹۲]

<u>اسلامی بینکوں کی خصوصیات</u> : (۱) اسلامی بینکوں کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اسلامی مالیاتی ادارے قائم کرنے کے ذریعے جن کا مقصد شریعت کی اتّباع ہے' موجودہ بینکاری نظام میں بہت سی رکاوٹوں پر قابو پا لیا ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کی سود سے پاک اقتصادی نظام کی شدید ترین خواہش تھی لیکن اسلامی بینکنگ کا تصوّر محض ایک نظریہ تھا جسے تحقیقاتی اوراق میں زیرِ بحث لایا گیا تھا اور جس کی کوئی عملی مثال سامنے نہیں آئی تھی۔ یہ اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے ہی تھے جنہوں نے نظریے کو عملی شکل میں بدل دیا اور ایسے ماحول میں اُس نظریاتی تصوّر کے لئے ایسا طرزِ زندگی اور عملی مثال پیش کی جہاں اس بات کا دعویٰ کیا جاتا تھا کہ کوئی مالیاتی ادارہ سودی نظام کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ حقیقت میں اسلامی بینکوں کا اِس عزمِ صمیم کے ساتھ آگے بڑھنا واقعی جراٗت مندانہ قدم تھا کہ اُن کا تمام کاروباری لین دین شریعت کے مطابق ہوگا اور اُن کی تمام سرگرمیاں سُودی عنصر سے پاک ہوں گی۔

(۲) اسلامی بینکوں کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اپنے متعلقہ شریعتی بورڈوں کے زیرِ نگرانی ہوتے ہوئے اُنہوں نے علمائے شریعت کے آگے جدید کاروبار سے متعلق سوالناموں کا ایک وسیع طیف (نقشہ Spectrum) پیش کیا اور اس طرح اُنہوں نے معاصر کاروباری طریق کو نہ صرف سمجھنے کا موقع مہیا کیا بلکہ شریعت کی روشنی میں اسے جانچنے اور دوسرے وہ متبادل طریقے معلوم کرنے میں بھی پیش رفت کی جو اسلامی اصولوں کے مطابق اور قابلِ قبول ہوں۔

(۳) یہ اسلامی بینکوں کا بڑا خدماتی عمل ہے کہ بڑے پیمانے کے کاروبار میں اُن کے داخلے کی وجہ سے اسلام کے قانونی نظام کے ارتقاء کا پہیہ ایک دفعہ پھر چل پڑا ہے۔ بہت سے اسلامی بینک اپنے شرعی بورڈوں کے زیرِ نگرانی کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنے روزمرّہ مسائل کو اسلامی اصول وضوابط کی روشنی میں لاتے ہیں اور اُن کے متعلق مخصوص حکمِ ناطق (رُولنگ) دیتے ہیں۔ یہ طریقِ کار علمائے شریعت کو نہ صرف مارکیٹ کی جدید صورتِ حال سے آگاہ رکھتا ہے بلکہ ''استنباط'' کے عمل کے ذریعے فقہِ اسلامی کے ارتقاء کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح اگر ایک عمل کو علمائے شریعت غیر اسلامی سمجھتے ہیں تو علمائے شریعت اور اسلامی بینکوں کی انتظامیہ کی اجتماعی کوششوں سے کسی موزوں متبادل کو بھی تلاش کر لیا جاتا ہے۔ اب تک شریعت بورڈ کی قراردادیں درجنوں ضخیم کتابوں کی شکل میں آچکی ہیں اور یہ ایک ایسی خدمت ہے جس کی بے قدری نہیں کی جا سکتی۔

(۴) اسلامی بینکوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اب اُنہوں نے بین الاقوامی منڈی میں اپنے آپ کو اور اسلامی بینکنگ کو منوالیا ہے کہ وہ روایتی بینکنگ سے ممتاز بینکنگ ہے اور تمام عالم میں اُسے رفتہ رفتہ تسلیم کیا جا رہا ہے۔ (ایضاً صفحات ۲۳۶ تا ۲۲۹)

<u>اسلامی بینکوں کی خامیاں</u> : موجودہ اسلامی بینکوں کی کارکردگی میں کچھ خامیاں اور نقائص ہیں جن کا تجزیہ بڑی سنجیدگی سے کیا جانا چاہئے:۔

اسلامی بینکنگ کے نظریہ کی بنیاد شرعی ضوابط کے تحت کارفرما اقتصادی فلسفہ تھا۔ سود سے آزاد بینکنگ کے سیاق میں اس فلسفے کا مقصد ہر قسم کے استحصال سے پاک ایسے منصفانہ بینکاری نظام کا لانا تھا جس کا اطلاق معاشرہ کے ہر فرد پر ہو۔ سودی عمل کا مستقل رُجحان تو ہمیشہ اُمراء کے حق میں اور عوام کے مفادات کے خلاف رہا ہے۔ امیر کبیر صنعت کار بینکوں سے بھاری سرمایہ لے کر کھاتہ داروں کی رقوم کو اپنے عظیم منافع بخش منصوبوں میں لگا دیتے ہیں۔ منافع کمانے کے بعد وہ کھاتہ داروں کو ان منافعوں میں حصّہ دار نہیں بناتے بلکہ معمولی شرحِ سود ادا کر دیتے ہیں اور اسے بھی وہ اپنی پیداوار کی قیمت کو بڑھا کر لے لیتے ہیں۔ اس لئے وسیع سطح سے اگر دیکھا جائے تو وہ کھاتہ داروں کو کچھ بھی نہیں دیتے۔ جبکہ انتہائی نقصانات کی صورت میں جو اُن کے اور نتیجۃً بینک کے دیوالیہ پن پر منتج ہوتے ہیں، تمام کا تمام نقصان کھاتہ داروں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح تقسیمِ دولت میں سودی نظام عدمِ مساوات اور عدمِ توازن پیدا کرتا ہے۔

اس کے برعکس اسلامی مالیات کا نظام ہے۔ شریعت کے مطابق سرمایہ کاری کا مثالی طریقِ کار ''مشارکت'' ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں میں مساوی تناسب کے مطابق ہر فریق حصّہ دار ہوتا ہے۔ ''مشارکت'' کھاتہ داروں کو کاروبار میں کمائے گئے منافع میں حصّہ دار بننے کے بہترین مواقع فراہم کرتا ہے اور یہ منافع شرحِ سود سے کافی زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ چونکہ منافع کا اندازہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک متعلقہ اجناس پوری کی پوری فروخت نہ ہو

جائیں' کھاتہ داروں کوادا کئے گئے منافع جات پیداوار کی قیمت میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے سودی نظام کے برعکس کھاتہ داروں کوادا شدہ رقوم قیمتوں میں اضافہ کے ذریعے واپس نہیں لی جاسکتیں۔

اس فلسفے کو اُس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا جب تک اسلامی بینک ''مشارکت'' کے کاروبار کو وسعت نہ دیں۔ یہ صحیح ہے کہ ''مشارکت'' کو فنانسنگ کے طریقِ عمل کے طور پر استعمال کرنے میں کچھ عملی مسائل درپیش ہیں بالخصوص موجودہ فضا میں جہاں اسلامی بینک تن تنہا اور اپنی متعلقہ حکومتوں کی امداد کے بغیر کام کر رہے ہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ اسلامی بینکوں کو ''مشارکت'' کی طرف رفتہ رفتہ پیش قدمی کرنی چاہئے اور مشارکتی مالیات کے سائز میں بھی اضافہ کرنا چاہئے۔ شومیٔ قسمت سے اسلامی بینکوں نے اسلامی بینکنگ کی اس بنیادی ضرورت کو نظر انداز کر دیا ہے اور ایسے کاروبار کی طرف تدریجی انداز میں بھی آگے بڑھنے کی کوششیں نظر نہیں آتیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ نقصان دہ عوامل کی صورت میں سامنے آیا ہے:۔

اوّل تو یہ کہ اسلامی بینکنگ کے پسِ پردہ کارفرما بنیادی فلسفے کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

دوم یہ کہ ''مشارکت'' کے کاروبار کو نظر انداز کرنے سے بینک ''مرابحہ'' اور ''اجارہ'' کے استعمال پر مجبور ہو گئے ہیں اور ان دونوں کے اپنانے میں بھی روایتی بینکنگ کے ڈھانچے کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے جس میں نتیجہ سودی نظام پر مبنی کاروبار کے نتیجے سے مختلف نہیں ہے۔ علمائے شریعت نے مالیاتی مقاصد کے لئے مرابحہ اور اجارہ کی اجازت صرف اُن شعبوں میں دی ہے جہاں ''مشارکت'' کام نہیں کر سکتا۔ اس رعایت کو ہر قسم کے کاروبار کے لئے مستقل اصول نہیں سمجھنا چاہئے اور اسلامی بینکوں کے تمام طریق ہائے عمل اس رعایت کے گرد نہیں گھومنے چاہئیں۔

سوم یہ کہ جب لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اسلامی بینکوں کے زیرِ نگرانی حاصل ہونے والی آمدنی روایتی بینکوں سے حاصل شدہ آمدنی کے قریب قریب ہے تو وہ اسلامی بینکوں کی کارکردگی کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

چہارم یہ کہ اگر اسلامی بینکوں کا تمام لین دین مذکورہ بالا طریق پر مبنی ہے تو اسلامی بینکنگ کی حمایت میں عوام کے آگے کچھ کہنا بڑا مشکل ہوگا بالخصوص غیر مسلموں کے آگے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اِن باتوں میں دستاویزات کو توڑنے مروڑنے کے سوا کچھ نہیں رکھا۔

بعض اسلامی بینکوں میں یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ''مرابحہ'' اور ''اجارہ'' بھی شرعی طریقِ عمل کے مطابق نہیں ہیں۔ مرابحہ کا بنیادی تصوّر یہ تھا کہ بینک جنس کی خریداری کریں اور اسے گاہک کے پاس مؤخر ادائیگی پر کچھ منافع لے کر فروخت کر دیں۔ شرعی نقطہ نگاہ سے جنس کا اس کے فروخت ہونے سے پہلے بینک کی ملکیت میں آنا ضروری ہے لیکن مشاہدہ ہے کہ کئی اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے ایسے کاروبار میں کئی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

''**اسلامی بینکنگ اور بین الاقوامی تعلقات** : کچھ مسلمان جنہیں بین الاقوامی اقتصادیات کی ماہیت کا علم نہیں ہے' کہتے ہیں کہ اسلامی بینکنگ ناقابلِ عمل ہے کیونکہ یہ اسلامی ملک کو باقی دنیا سے علیحدہ اور تنہا کر دے گی جس سے اُس کی بین الاقوامی تجارت کو خاصا نقصان پہنچے گا۔ لیکن اگر مختلف اقوام عالم کا جن کے سیاسی اور اقتصادی اصول ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں' پہلو بہ پہلو رہنا ممکن ہے اور اگر امریکہ' یوگوسلاویہ یا روس اور عرب ممالک کا آپس میں تجارتی معاہدے کرنا ممکن ہے تو مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ایک اسلامی ملک باقی دنیا سے کیوں کٹ کے رہ جائے۔ مثال کے طور پر اگر پاکستان اسلامی بینکاری نظام کے اصولوں کو قبول کر لے تو یہ اُس کی اقتصادیات کی داخلی تنظیم نو کا معاملہ ہو گا بالکل اسی طرح جیسے ایک وفاق میں جزوی یا ترکیبی اکائیوں کو اپنے مسائل حسبِ منشا حل کرنے کے لئے علاقائی خودمختاری دی جاتی ہے بغیر اس کے کہ یہ خودمختاری وفاق کی اساسی (بنیادی) فطرت پر کسی طرح اثرانداز ہو۔''

''دوم یہ کہ بین الاقوامی تجارت میں نقصان کا سبب بننا تو دُور کی بات ہے' اسلامی بینکنگ اپنا حجم اور وسعت بڑھائے گی۔ کیونکہ جدید طرز کے بینک اپنے مؤکلین کی ہنڈیاں اور تمسکات (Bills of Exchange) قبول کر کے اور دوسرے غیرملکی زرِمبادلہ کے کاروبار میں اپنی خدمات کا مشاہرہ بہ طور معاوضہ وصول کر کے غیرملکی تجارت میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام کے تحت بینک تاجروں کے ساتھ حصّہ داری کی وجہ سے کسی معاوضہ کے بغیر یہ تمام خدمات انجام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں تجارت میں حصّہ دار ہونے کے لحاظ سے بینک تاجروں کی غیراقتصادی منصوبوں (یاسٹہ بازی) سے دُور رہنے میں مدد کرتے ہیں تاکہ نہ صرف اپنے ملک میں نہیں' بلکہ بہ حیثیتِ مجموعی پوری دُنیا میں معاشی خوشحالی لانے کے لئے کسی جنس کی طلب اور رسد میں باہم موافقت اور مطابقت پیدا کی جا سکے۔'' ("Islamic Economics --- Theory & Practice" --- M. A. Mannan, pp. 234, 235)

اقتصادی تعاون اور ترقی کی مرکزی تنظیم (OECD) # نے قابلِ تعریف انداز میں سود سے پاک بینکاری کے متعلق اپنے تاثرات اس طرح دئے ہیں :۔

''سود سے پاک بینکاری سرمایہ کاری کی ایک اچھوتی شکل ہے۔ مذہب سے برگشتہ اور متشککین (Sceptics) تک نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلامی بینکنگ میں نہ صرف سُود کو کوئی اور نام نہ دینے کی کوشش ہے بلکہ شرعی نظام کے اندر رہتے ہوئے اسلامی بینکنگ میں منافع کا جواز نکلتا ہے جو قرآن کے بنیادی ڈھانچے کے عین مطابق ہے۔''

''دنیا کی تقریباً 20% آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر کٹر مذہبی اور دین دار ہیں۔ وہ اِس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ اُن کے مالی معاملات اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں اور اس لحاظ سے وہ قدرتی طور پر جائز منافع لینے کے حق میں ہیں۔ اس صورت میں گشتی اور مفاداتی خزینوں دونوں میں اسلامی بینکاری کے مواقع موجود ہیں۔''

Development Centre of the Organisation of Economic Cooperation & Development

''تمام اکناف عالم میں کئی نئے اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شرعی اصولوں کے مطابق بینکاری نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ نفع بخش بھی ہے۔'' ("Arab and Islamic Banks"
... Prof. Trante Wohlus Scharf, OECD, p. 90) Paris, 1983.

اُسی کتاب میں پروفیسر موصوف نے بڑے کھلے دل سے یہ نتیجہ نکالا ہے:

''اسلامی بینکاری ایک طرف تو مال گزاری اور عوام کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی ہے تو دوسری طرف وہ صنعت اور تجارت کے مابین تعلقات کو بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ نئی تعلق داری اسلامی اقتصادی نظام کے قیام کی بنیاد ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی مالیات کے مقابلہ جاتی ماحول میں اسلامی اصولوں کی ابھی آزمائش ہونا باقی ہے تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ کاروبار کے مندہ پن (کساد بازاری)، جمود اور پیداوار کی کم افزائش کی صورتوں میں اسلامی بینک اِقتصادی ترقی میں مفید کردار ادا کر رہے ہیں کیونکہ اُن کے طریقِ عمل کا مرکزی نقطہ ہی پیداواری سرمایہ کاری میں مرکوز ہے۔ شمال اور جنوب دونوں میں تمام ممالک کو داؤ پر لگانے کے سرمایہ (Venture/Risk Capital) کی زیادہ ضرورت ہے۔ بالخصوص صنعتکار ممالک کی جانب سے قرضہ کا سرمایہ موجود تو ہے لیکن سود کی انتہائی اونچی شرح کے ساتھ۔ تاہم متوسط طبقہ کے تاجر اپنے سرمائے کو بڑھانے کے لئے اُسے خطراتی مہمات میں لگانا مشکل سمجھتے ہیں۔ اس چیز نے شمالی ممالک میں پیداواری افزائش اور اقتصادی ترقی میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اس طرح تمام دنیا میں اسلامی بینکوں اور کاروباری مہمات کے مابین عملی اور فوری تعاون کا امکان موجود ہے۔ وسیلے کے اس طریقِ کار کو ابھی ترقی کے مدارج طے کرنا باقی ہیں۔'' (ایضاً)

ایک بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن (IFC) کی جانب سے سود سے پاک مالیاتی نظام پر دی گئی رپورٹ کا مطالعہ کرنے سے ہم شرم کے مارے ڈوب جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے مہربان و شفیق خالق پر اعتماد کو ترک کر دیا ہے جبکہ ہمارے مخالف مذہب کے لوگ اپنی روایتی بینکاری کو چھوڑ کر اسلامی اصولوں کے مطابق بینکاری کو اپنانے پر تیار ہیں۔ ہالہ سپننگ ملز میں سرمایہ کاری کی تجویز کی ایک رپورٹ میں آئی۔ ایف۔ سی کے صدر اور عالمی بینک کی ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں:

''آئی۔ ایف۔ سی نے مالیات کے اسلامی طریقِ کار کی طرف تبدیلی پر غور کیا ہے۔ یہ چیز غیر ملکی قرضوں پر حکومتِ پاکستان کے ارادوں کے خلاف ہوگی۔ غیر ملکی قرض دینے والے کے لئے اسلامی اصولوں کو اپنانے کی تعبیر حکومتی پالیسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے کہ غیر ملکی قرض دینے والوں کو اس ضرورت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔'' (Report No. IFC/887, dated Dec. 22, 1957, to the Board of Directors, IFC)

''اسلام میں محاصل اور بجٹ سے متعلق حکمتِ عملی: محاصل اور بجٹ سے متعلق اسلامی اصول کا مقصد ایک ایسے سماج کو منظم اور مرتب کرنا ہے جس کی بنیاد مادّی اور روحانی اَقدار کو مساوی درجہ دینے کے ذریعے متوازن تقسیمِ دولت پر ہو۔''

''اسلامی ریاست ایک ایسی مثالی ریاست ہوتی ہے جو قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کے لئے میکانزم (طریقِ عمل) کے طور پر کام کرتی ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست میں محاصل کی حکمتِ عملی (پالیسی) اسلامی قوانین اور اقدار کے مطابق ہونی چاہئے۔ مذہبِ اسلام کے قوانین کا بنیادی مقصد نوعِ انسان کی فلاح و بہبود ہے جس کا حصول صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب (صرف محاصلاتی نظام ہی نہیں) بلکہ تمام قانونی اور اقتصادی نظام الٰہی صفات کے مطابق و موافق ہوں۔ اور وہ الٰہی صفات (الف) حفاظتی نگہداشت (Providence) بحوالہ سورۃ الانبیاء: آیت ۴۲ (ب) مخیّر ہونا (Beneficence) اور (ج) دردمندی اور ترحّم (Compassion) ہیں۔ اس طرح اسلامی ریاست کی اخراجاتی اور محاصلاتی سرگرمیوں کو اسلامی قوانین کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اُن مخصوص اقتصادی اور معاشرتی اغراض کے حصول کے لئے استعمال ہونا چاہئے جن کا ذکر قرآن و سنت میں موجود ہے۔''

''اخراجات کی حکمتِ عملی: قرآن مجید نے حکومتی آمدنی کے اخراجات کی حکمتِ عملی (پالیسی) سے متعلق نہایت جامع حکم دیا ہے۔ اِن سرگرمیوں کو نہ تو سربراہِ مملکت کی صوابدید پر اور نہ ہی نام نہاد ''قانون ساز'' اراکین کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے بلکہ شارع نے خود اس کی تخصیص کرتے ہوئے (سورۃ التوبۃ: ۶۰ میں) فرمایا:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِی الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِیۡنَ وَفِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ فَرِیۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ ''حَکِیۡمٌ ۝

''صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں، محتاجوں اور زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکنوں کا حق ہیں، گردنوں کے چھڑانے میں، قرضداروں (کے قرضہ ادا کرنے) میں، اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی امداد) میں، یہ سب اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ بڑا ہی علم والا، حکمت والا ہے۔'' (۹:۶۰)

امام فخر الدین رازی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۰۶ھ) نے پہلے چار مصارف میں لام اور آخری چار مصارف میں ''فِی'' کو ذکر کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ پہلے چار مصارف میں اُنہیں زکوٰۃ سے اُن کا حصہ دے کر اُنہیں مالک بنا دیا جائے گا کہ وہ جیسے چاہیں تصرف کریں یعنی ان میں تملیک ضروری ہے لیکن آخری چار مصارف میں تملیک کی بجائے اُن کی ضروریات اور مصالح میں زکوٰۃ خرچ کی جائے گی۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے اُن کا حصہ اُنہیں نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی اُنہیں اُس پر تصرّف کا اختیار دی جائے گا کہ وہ اُس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں بلکہ اُن کی طرف سے اُن کی قیمت ادا کر دی جائے گی۔ اِسی طرح مقروضوں کی زکوٰۃ کا حصہ اُن کے قرضخواہوں کو دے دیا جائے گا، اسی طرح مجاہدین کی زکوٰۃ کا حصہ اُن کی ضرورت کا اسلحہ خریدنے میں خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح مسافروں کی ضرورت کی چیزوں میں اُن کا حصہ خرچ کیا جائے گا۔

''اِس قاعدہ کے مطابق مساجد' سرائے اور پانی کی سبیلیں بنانے' پُلوں کی مرمت کرنے' مُردوں کو دفن کرنے اور دیگر نیکی کے کاموں میں زکوٰۃ کو صَرف کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اُن میں تملیک (کسی کو مالک بنانا) بالکل نہیں پائی جاتی (کیونکہ یہ چیزیں وقف ہوتی ہیں اور وقف کا کوئی مالک نہیں ہوتا)۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے مالِ زکوٰۃ سے طعام خریدا اور فقراء کو صبح اور شام کھانا کھلایا تو یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں تملیک نہیں ہوئی اور اگر اُس نے مالِ زکوٰۃ سے کسی زندہ فقیر کا قرض اُس کی اجازت کے بغیر ادا کر دیا تو یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں بھی فقیر کو مالک نہیں بنایا گیا اور اگر فقیر کی اجازت سے اُس کا قرض ادا کیا گیا ہے تو جائز ہے کیونکہ اب فقیر کے لئے تملیک پائی گئی گویا کہ فقیر نے مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کیا اور اُس کو قرض کی ادائی کے لئے وکیل بنا دیا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے مالِ زکوٰۃ سے غلام خرید کر کے آزاد کر دیا تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔''(''تبیان القرآن''۔۔۔علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ۵' ص ص ۱۷۵' ۱۷۷)

آیتِ مذکورہ میں قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔ آخری مدیعنی ''راہ گیر'' میں اُن کی رہائش اور خوراک کی فراہمی کے علاوہ سیر و سیاحت کے شعبے کی اصلاح مثلاً ہوٹلوں اور نقل وحمل کے ذرائع کو بہتر بنانا' شاہراہوں کی حفاظت اور اس قسم کی دوسری اصلاحات شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اصلاحات سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی مستفید ہوں گے۔''

''قرآن مجید نے سماج کے مختلف طبقات میں متوازن تقسیمِ دولت کے لئے اخراجات کی وسیع پالیسی بھی مرتب کی ہے۔ اس طرح دولت کے ایک جگہ اکٹھا ہونے کی بجائے اسلام اسے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''جو تمہاری ضرورت سے بچ جائے' اُسے خرچ کرو'' (۲۱۹ : ۲)۔

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ دولت کو فضول کاموں پر خرچ کیا جائے۔ اسلام فضول خرچی کی نہ صرف حوصلہ شکنی کرتا ہے بلکہ اس کی مذمّت کرتا ہے (سورہ بنی اسرائیل: ۳۱)۔ ذخیرہ اندوزی اور مال کو جوڑ جوڑ کے رکھنے کی بھی مذمت کی گئی ہے کیونکہ اس سے گردشِ دولت رک جاتی ہے اور صارف اور سماج دونوں اس کے فائدہ منداستعمال سے محروم رہتے ہیں۔ قدرتی طور پر اسلامی ریاست میں ٹیکس کے نظام کو محروم القسمت طبقہ کی نگہداشت کے اصول پر مبنی ہونا چاہئے۔''

<u>اسلام کے محاصل کی حکمتِ عملی (پالیسی)</u>: محاصل کی وصولی میں اسلامی ریاست مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے ساتھ مختلف سطح کا رویّہ اختیار کرنے کی پابند ہے۔ اگر صرف مسلمانوں سے ٹیکس کی کوئی خاص رقم ادا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے (اور ریاست کے غیر مسلمین سے نہیں)' تو یہ موقع مسلمانوں سے غیر مسلمین کی طرف دولت کی منتقلی کا ہے اور غیر مسلمین مسلمانوں کی اُس رقم سے ایک اچھا خاصا خوش آئند کاروبار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہاں دونوں طبقات سے مختلف رویّہ اختیار کرنے کا جواز ہے۔ اگر زکوٰۃ مسلمانوں سے اکٹھی کر کے اُسے غریب مسلمانوں

اور غیر مسلمین کی بہبود پر خرچ کی جائے تو غیر مسلمین سے مالیات کا کچھ حصّہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مالیاتی انتظام کے دوران غیر مسلموں سے ''جزیہ'' اور ''خراج'' وصول کرنے کا یہی جواز تھا۔

بجٹ سے متعلق پالیسی : تہذیب انسانی کی تیز رفتاری کے نتیجہ میں جدید زندگی کے پیچیدہ ہونے کی وجہ سے بجٹ کی روایت پسند پالیسی سے ہٹ کر بجٹ کی ایسی جدید پالیسی کے اپنانے کی ضرورت ہے جس میں دولت کی نمو اور افزائش ہو۔

بہ ظاہر حکومت کے خرچ کو قرضوں سے پورا کرنے (Deficit Financing) اور غیر ملکی قرضوں کی ضرورت سے بمشکل ہی انکار کیا جا سکتا ہے۔ آر سی ڈی کی طرح مسلم ریاستوں کے مابین اقتصادی تعاون کی علامت کے طور پر کل اسلامی ترقیاتی بینک یا کل اسلامی امدادِ باہمی کا فنڈ' جو بھی نام ہم اسے دیں' کے قیام کی تجویز دی جاتی ہے۔ اس کے قیام سے سود سے پاک غیر ملکی زرِ مبادلہ کے حصول کا مسئلہ بہت حد تک حل ہو جائے گا۔ دنیا کا ایک وسیع و عریض اسلامی ملک ہونے کے ناطے سے پاکستان کو اس میں قیادت کا کردار ادا کرنا چاہئے۔''

''چونکہ اسلام میں سود کے لینے دینے کی ممانعت ہے' اس لئے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اگر یہ بالکل ممکن نہیں تو ہمارے خیال میں اسلامی ریاست کو غیر مسلم ممالک سے باہمی مبادلہ (Reciprocity) کی بنیاد پر سُودی کاروبار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ دراصل اسلام کا بجٹ کا نظام اپنی فطرت اور جوہر میں جدید ریاستوں میں نافذ شدہ نظام سے مختلف ہے' جس کی دو بڑی وجوہ ہیں:

(۱) اسلام کے بجٹ کے نظام کی صورت میں سود کے جابرانہ استعمال کی گنجائش کالعدم ہو کے رہ جاتی ہے۔

(۲) لوگ ریاست کے نام نہاد مالیاتی ''جادوگروں'' کے رحم و کرم پر نہیں ہوتے۔

بجٹ میں جدید رُجحانات : حالیہ سالوں میں بجٹ کی نئی شکلیں سامنے آئی ہیں جن میں سے پروگرام بجٹنگ اور کارکردگی بجٹنگ بہت اہم ہیں۔ مؤخر الذکر نظام انتہائی پیچیدہ ہے اور اس کا انحصار لاگت کا حساب رکھنے (Cost Accounting) کے پیچیدہ نظام پر ہے' مسلم ممالک میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص اوّل الذکر اور مؤخر الذکر دونوں نظام اُس وقت لائے جا سکتے ہیں جب ایک ٹھوس انتظامی ڈھانچہ تربیت یافتہ اکاؤنٹنٹوں' ماہرینِ اقتصادیات' منصوبہ سازوں اور دوسرے ماہرین کی کہکشاؤں کے ساتھ معرضِ وجود میں آ جائے گا۔''

("Islamic Economics--- Theory and Practice" ... M. A. Mannan, pp. 309-323)

(۴۸) اُڑان (FLYING)

نوٹ: اِس مضمون کو جلد اوّل کے مضمون ''(۱۵) ہوا بازی (Aviation)'' کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جو صفحات ۴۷۰ تا ۴۷۴ پر موجود ہے۔

قرآن مجید اُڑنے کے تصوّر کو مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے۔ ہوا میں اُڑنے کا تصوّر (۱) اوپر چڑھنے اور (۲) نیچے کو آنے (اُترنے) کے دُہرے عمل کے ساتھ ملحق ہے۔

اوپر چڑھنے کی قرآنی مثالیں: (1) آسمان کی بلندیوں کی طرف جانے کا انتہائی موزوں اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رَفع اِلی السَّماء (آسمان کی طرف اٹھایا جانا) میں ملتا ہے جب رب تعالیٰ نے اُنہیں یہود کی دستبرد سے بچانے کے لئے آسمانوں کی طرف اٹھالیا اور جس کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ اِن آیات میں ہوا:

(۱) اِذْقَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ (آلِ عمران : ۵۵)

(وہ وقت یاد کیجئے) جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں یقیناً تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تمہیں اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں۔'' (۵۵ : ۳)

(۲) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ہ (النِّساء : ۱۵۸)

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب' حکمت والا ہے۔'' (۴:۱۵۸)

(2) لفظ ''رَفع'' کو محلِّ نظر رکھنے سے طُور کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلّق کرنے کا واقعہ بھی ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ اُن سے تورات کو منوانے کے لئے رب تعالیٰ نے طور کو اُن کے سروں پر اٹھا دیا تھا جس کا بیان سورۂ البقرۃ اور سورۂ النِّساء میں اس طرح ہے:

(۱) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (البقرۃ :۶۳' ۹۳)

''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور تم پر طور کو بلند کیا تھا۔'' (۶۳' ۹۳ : ۲)

(۲) وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ (النِّساء : ۱۵۴)

''اور ہم نے اُن (بنی اسرائیل) سے پختہ وعدہ لینے کے لئے اُن کے اوپر طور کو بلند کیا۔'' (۱۵۴ : ۴)

اِس آیت کی رُو سے کچھ معترضین نے اعتراض کیا کہ اسرائیلیوں سے مجبوراً تورات منوائی گئی لیکن سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ میں ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ دَعُوْهُمْ وَمَا يَدِيْنُوْنَ (کافروں کو اُن کے دین پر چھوڑ دو)۔ پھر کسی کو جبراً مسلمان بنایا بھی نہیں جا سکتا تو اس آیت کا کیا مطلب ہوا؟

اس اعتراض کے چند جواب ہیں: (۱) اس واقعہ میں بہ ظاہر جبر تھا لیکن درحقیقت اُنہیں معجزہ دکھا کر مطمئن کرنا تھا کہ یہ کتابِ تورات واقعی رب کی جانب سے ہے جیسا کہ دیگر معجزات کا مقصود ہوتا ہے۔ (خزائن العرفان' صفحہ ۱۳) (۲) بندوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کو دین پر مجبور کریں۔ ''دین میں کوئی جبر نہیں'' کی آیت بندوں کے لئے ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ یہ فعل اللہ کا تھا۔ (۳) اسرائیلیوں کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ ایمان تو پہلے ہی لا چکے تھے۔ اب اُنہیں ارتداد (دین سے پھر جانے سے) روک کر ایمان پر قائم رکھا گیا۔ اب بھی مرتد کو ایمان لانے پر مجبور کیا جاتا ہے ورنہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ (۴) یہ عہد شکنی کی سزا تھی اور بدعملی کی سزا دینا نقلاً وعقلاً ہر طرح درست ہے۔

اس واقعہ پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ پہاڑ کا ہوا میں بغیر ستون کے معلّق ہو جانا خلافِ عقل ہے۔ ہلکی چیز بھی ہوا میں معلّق نہیں رہ سکتی تو اتنا بھاری پہاڑ کیسے معلّق رہ گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہاڑ کا کسی ستون اور سہارے کے بغیر ہوا میں معلّق رہ جانا مسلمان کی عقل کے بالکل موافق ہے۔ آسمان' سورج' چاند اور بھاری بادل' برف کے پہاڑ (یعنی اولے اور برف) سب معلّق ہی ہیں۔ اگر ایک وقت میں پتھر کا پہاڑ بھی معلّق ہو گیا تو کونسی خلافِ عقل بات ہوگئی۔ آج مشین کے ذریعے بھاری ہوائی جہاز مع ساز وسامان کے ہوا میں معلّق ہو جاتے ہیں بلکہ جرمنی نے اُڑن بم بنا کر مشین کے بغیر ہی بھاری چیز کو لٹکا کر دکھا دیا تو کیا جرمنی معلّق کر سکتا ہے اور رب تعالیٰ نہیں کر سکتا!! (تفسیر نعیمی' جلد اوّل' صفحہ ۵۰۸) مطبوعہ لاہور ۱۳۶۳ھ۔

(3) ہمارے نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کو جسمانی معراج (بحوالہ سورۃ الاسراء: آیت اوّل) اور پھر وہاں سے خلائی مسافتوں کو طے کرتے ہوئے ملاءِ اعلیٰ اور لامکاں سے آگے جنت و جہنم کی سیر کرنا وغیرہ (بحوالہ سورۃ النّجم: آیات ۱ تا ۱۸) خلا کی طرف عروج کرنے کی ایک اور مثال ہے۔

(4) سورۂ الانعام کی آیت ۱۲۵ میں ہمیں آسمان کی طرف عروج کرنے کا واضح اشارہ ملتا ہے:

وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّه' يَجْعَلْ صَدْرَه' ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (۱۲۵ : ۶)

''اور جس کے لئے اللہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اُسے گمراہ رکھے' اُس کے سینہ کو وہ تنگ اور بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے اُسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہو۔'' (۱۲۵ : ۶) #

<u>(5) جنابِ سلیمان علیہ السلام کے تخت کا ہوا میں اِدھر اُدھر منتقل ہونا ہوائی اُڑان کی ایک اور مثال ہے</u>

جاہلیت کے اُس دور میں کسی کو کیا معلوم تھا کہ آسمان کی مسافتیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ ہوا کی کمی کی وجہ سے دَم گھٹتا جاتا ہے جبکہ ہوائی جہاز' ہیلی کاپٹر اور اس قسم کے دیگر ذرائع کی ابھی ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا آیت میں جہاں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی طرف واضح اشارہ موجود ہے' وہاں اس بات کا بھی پختہ ثبوت موجود ہے کہ یہ کلام بلاشک وشبہ رب تعالیٰ کا کلام ہے۔

جیسا کہ سورۃ الانبیاء اور سورہ سبا کی مندرجہ ذیل آیات میں اس کا ذکر ہوا :

(۱) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِأَمْرِهٖۤ اِلَی الْأَرضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (الانبیاء : ۸۱)

''اور ہم نے سلیمان (کے تابع) زوردار ہوا کو کردیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی جس میں ہم نے برکت رکھ دی ہے۔'' (۸۱ : ۲۱)

یعنی ملکِ شام کی طرف کہ وہ جب کبھی باہر جاتے تو واپس ہوا کے ذریعہ سے آتے تھے۔ ان کے والدِ محترم جنابِ داؤد علیہ السلام کے تسخیر جبال (پہاڑوں) کا ذکر اِس سے قبل کی آیت ۷۹ میں ہوا اور یہاں آیت ۸۱ میں اُن کے فرزندِ ارجمند جنابِ سلیمان علیہ السلام کے معجزہ تسخیرِ ہوا کا ذکر ہو رہا ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لطیفہ (باریک نکتہ) خوب لکھا ہے کہ باپ کے لئے پہاڑوں، پتھروں اور چٹانوں جیسا کثیف ترین جسم مسخر کیا گیا اور بیٹے کے لئے ہوا جیسی لطیف ترین چیز مسخر کی گئی کہ اگر وہ چاہتے کہ ہوا تیز چلے تو وہ تیز چلتی اور اگر وہ چاہتے کہ وہ ہوا آہستہ چلے تو وہ آہستہ چلتی غرض کہ وہ ہر دو حال میں سلیمان علیہ السلام کے تابع تھی۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت میں تیز ہوا کے مسخر کرنے کا ذکر ہے اور سورہ صٓ کی اِس آیت ۳۶ میں نرم ہوا کے تابع کرنے کا ذکر ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِیْ بِأَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ (صٓ : ۳۶)

''پس ہم نے ہوا کو اُن کے تابع کردیا تھا، وہ آپ کے حکم سے جہاں آپ چاہتے، آپ کو نرمی سے پہنچا دیتی تھی۔'' (۳۶ : ۳۸)

اس کا جواب یہ ہے کہ ہوا فی نفسہٖ نرم اور خوشگوار تھی جیسے صبح کے وقت ہوا آہستہ آہستہ چلتی ہے اور جب ہوا اُن کے تخت کو لے کر چلتی تو اُنہیں تیزی کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچا دیتی تھی جیسا کہ فرمایا:

(۲) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا : ۱۲)

''اور ہم نے ہوا کو سلیمان کے تابع کردیا تھا، صبح کی سیر ایک ماہ کی مسافت ہوتی تھی اور شام کی سیر (بھی) ایک ماہ کی مسافت ہوتی تھی۔'' (۱۲ : ۳۴)

(6) سورہ فاطر کی آیت ۱۰ میں لفظ ''یَصْعَدُ'' کا مطلب اُن خوشبویات، مہکوں اور عطریات کا اوپر کو چڑھنا ہے جو مؤمن کے الفاظ کی ادائیگی میں اُس کے دل و دماغ کی پاکیزگی کا نتیجہ ہوتے ہیں:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر : ۱۰)

''اُسی تک پاکیزہ کلمات بلند ہوتے ہیں اور وہ نیک عمل کو بلند فرماتا ہے۔'' (۱۰ : ۳۵)

''پاکیزہ کلمات'' سے مراد یا تو کلمہ توحید یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے یا اس سے مراد مؤمنوں کی کی ہوئی اللہ تعالیٰ کی ثنا ہے جسے لے کر ملائکہ مقربین اوپر کو چڑھتے ہیں۔ (''تبیان القرآن''۔۔ غلام رسول سعیدی، ج ۹، ص ۶۶۱)

''کلمات اور کلام کا اوپر چڑھنا متصور نہیں ہے کیونکہ کلمات اور کلام عرض ہیں جو متکلم کے ساتھ قائم ہیں۔ اپنے محل سے قطع نظر اُن کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر فرشتوں کا ان کلمات کو لے کر اوپر کو چڑھنے کا مطلب اللہ ربُّ العزت کی بارگاہ میں اُن کا مقبول ہونا ہے کیونکہ ثواب کی جگہ اوپر ہے اور عذاب کی جگہ نیچے ہے۔ کلمات کے اوپر چڑھنے سے مراد یہ بھی ہے کہ فرشتے اُن صحائفِ اعمال کو لے کر اوپر کو چڑھتے ہیں جن صحائف میں اُنہوں نے کلماتِ طیّبات لکھے ہوتے ہیں اور پھر اس سے کیا چیز مانع ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کلمات کو مجسم کر دے اور فرشتے اُنہیں اٹھا کر لے جائیں۔'' (ایضاً' ص ۶۶۲)

(7) پرندوں کا فضائے بسیط میں اڑنا کہ اُنہیں نیچے گرنے کا کوئی خوف وخطر نہیں ہوتا' اوپر کو بلند ہونے کی ایک اور مثال ہے اور اس میں '' قانونِ کششِ ثقل'' (Law of Gravitation) کا اشارہ بھی ملتا ہے جسے قرآن مجید نے نیوٹن (جسے اس نظریہ کا دریافت کرنے والا بتایا جاتا ہے) کے آنے سے صدیوں پہلے بتا دیا تھا:

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَٰفَّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ (المُلك : ۱۹)

'' کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں پر نظر نہیں کی کہ پَر پھیلائے ہوئے ہیں اور سمیٹ بھی لیتے ہیں' بجز خدائے رحمٰن کے اُنہیں کوئی نہیں تھامے رہتا۔'' (۶۷ : ۱۹)

یعنی اُس صانعِ مطلق ہی نے اُن کا جسم اس سبک وضع کا بنایا ہے کہ باوجود ثقل کے ہوائے لطیف ورقیق میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ پرندوں کی قوّتِ پرواز' اُن کا ہوائی موجوں کو چیرتے ہوئے جانا' اُن کا اتنی بلندیوں پر اپنے جسم کا توازن قائم رکھنا' یہ سب انسان کے لئے کیسے حیرت انگیز مشاہدات ہیں اور اُن سے حق تعالیٰ کی صناعی کا کیسا سبق ملتا ہے!

<u>نیچے اترنے (نزول) کی قرآنی مثالیں</u> : (1) منّ وسلویٰ کا نزول اسرائیلیوں پر اور المائدہ (دسترخوان) کا نزول عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر کا بیان علی الترتیب سورۃ البقرۃ اور سورۃ المائدۃ میں کیا گیا ہے:

(۱) وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ (۵۷ : ۲)

''اور ہم نے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کر دیا اور ہم نے تمہارے اوپر منّ وسلویٰ اتارا۔''

(۲) قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِينَ ٥ (ألمائدة : ۱۱۵)

''اللہ نے فرمایا کہ تم پر وہ کھانا ضرور اتاروں گا پھر تم میں سے جو کوئی کفر اختیار کرے گا تو اُسے سزا بھی وہ دوں گا کہ وہ سزا دنیا والوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا۔'' (۱۱۵ : ۵)

بعض جلیل القدر تابعین' مجاہد اور حسن کی رائے یہ ہے کہ جب اُنہوں نے ناشکری پر سخت ترین عذاب کی دھمکی سنی تو اپنا مطالبہ واپس لے لیا لیکن جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ مائدہ بالفعل نازل ہوا۔ اس میں کون کون سے کھانے تھے؟ اس کی تفصیل کا نہ یقینی علم ہے اور نہ اُس کے جاننے کی ضرورت ہے۔

(2) عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ جنابہ مریم سلام اللہ علیہا پر اُن کے وضعِ حمل کے وقت بے موسمی تازہ' پکی ہوئی کھجوروں کا گرنا ہمیں قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کی یاد دلاتا ہے کہ وہ جسے بھی چاہے' بے موسمی پھلوں سے نوازے جس طرح کہ وہ مریم علیہا السلام کو اُن کی طفولیت کے زمانے میں بے موسمی پھلوں سے نوازتا تھا:

وَهُزِّيٓ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّاo (مریم : ۲۵)

''(اے مریم!) اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ' اس سے تم پر ترو تازہ خرمے گریں گے۔'' (۲۵ : ۱۹)

''یونانی اطباء نے تازہ خرموں کو زچہ خانے کے لئے بہترین غذا تسلیم کیا ہے۔علامہ ابن العربی نے کہا کہ پہلے اُن کے پاس خود بخود بے موسمی پھل آتے تھے اور اب اُنہیں درخت کے ہلانے کا حکم دیا جارہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اُن کا دل اللہ کی یاد میں مستغرق تھا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعضاء کو کام کرنے اور تھکنے سے فارغ رکھا اور جب اُن کا دل اپنے بچہ کی حفاظت' اُس کی پرورش اور اُس کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ ہوگیا تو اُنہیں بھی عام لوگوں کی طرح کسب اور اسباب کے حصول کی طرف متوجہ کردیا۔ بہر حال اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاش کو حاصل کرنے کے لئے کسب کرنا اور اسباب کا حصول ضروری ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ سیّدہ مریم کے ہلائے بغیر وہ کھجوریں گر جاتیں لیکن رب تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ بندہ خود اپنے لئے رزق کی تلاش میں جدّ وجُہد کرے۔'' (''تبیان القرآن''۔۔۔علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ۷' صفحہ ۲۶۸)

(3) سورۃ الحج کی آیت ۳۱ میں اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے لوگوں کو اُن لوگوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو آسمان سے گرے اور پرندے یا ہوا اُنہیں اچک کے لے جائے اور دُور دراز جگہ پر پھینک دے:

وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍo

(4) شبِ معراج جب ختمی مرتبت نبی ﷺ نے اللہ ربّ العزت کے بے پایاں اور لاتعداد انعامات و نوازشات کو لے کر اس مغلوب الجذب باقی شدید خواہش کے ساتھ کہ وہ اُن نوازشات کو اپنی محبوب اُمّت میں تقسیم کریں گے' اس دنیا کو نزول فرمایا' تو اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کے اس عمل کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا:

وَ النَّجۡمِ اِذَا هَوٰى o (سورۃ النّجم : ۱) ''قسم ہے ستارے کی جب وہ نیچے کو اُترے۔'' (۱ : ۵۳)

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہاں اَلـنَّـجۡم سے مراد نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہے اور اِذَا هَوٰى سے مراد حضور علیہ السلام کا شبِ معراج آسمان سے واپس زمین پر نزول فرمانا ہے۔ (روح المعانی بحوالہ ''ضیاء القرآن'' جلد پنجم' صفحہ ۹)

(5) شبِ قدر میں ملائکہ اور روح القدس (جبریل علیہ السلام) کا زمین کی طرف نیچے اترنا اور اُس رات آسمانِ دنیا پر قرآن کا نزول اس سلسلہ کی روشن مثالیں ہیں۔

(BIBLIOGRAPHY) مراجع ومصادر

1. Abdul Haq, Qazi — Review of Religions
2. Akhtar K. Bhatti (Engr.) & Gul-e-Jannat — The Holy Qur'an and the Environment (Delhi, 1994)
3. Ali Asghar Chishti — Islam and Women.
4. Amir Ali — The Spirit of Islam.
5. Anwarullah, Dr. — Islamic Law of Evidence.
6. Armstrong, Karen — Muhammad – A Biography of the Prophet.
7. Arnold, T. W. — The Preaching of Islam.
8. Asad, Leopold — Islam on the Crossroads.
9. Barth — Religions of India.
10. Bashir Mahmood, Sultan — Doomsday and Life after Death.
11. Bauer — Women and Love.
12. Besant, Annie — The Life and Teachings of Muhammad (Madras, 1932).
13. Bosworth Smith — Muhammad and Muhammadanism (1874 Edn.).
14. Clover, Monsma — The Evidence of God in an Expanding Universe.
15. Cobbold, Lady — Pilgrimage to Mecca.
16. Cohen — Everyman's Talmud (London)
17. Coleridge, S. T. — Rime of the Ancient Mariner (A Poem).
18. Coulson, Charles — Science and Christian Belief.
19. Coulson, Noel J. — A History of Islamic Law.
20. Craig, William, L. — Universe and its Creator.
21. Davenport, J. — An Apology for Muhammad and the Koran.
22. Denton, Michael — Nature's Destiny : How the Laws of Biology Reveal Purpose in the Universe.
23. Durant, Will — The Age of Faith.
24. Ebbing, Krafft — Psychopathia Sexualis.
25. Graves, Dan — Scientists of Faith (1996 Edn.)
26. Guitton, Jean — Die et la Science.
27. Hammertson — Universal History of the World.
28. Hamid Hasan, Dr. — Islam and the Right to Security.
29. Harun Yahya — Miracles in Our Bodies.
30. Harun Yahya — The Qur'an Leads the Way to Science.
31. Havelock, Ellis — Man and Woman.
32. Heyworth, Dunne, J. — An Introduction to the History of Modern Education in Egypt.
33. Hitti, Philip, K. — History of the Arabs.
34. Hitti, Philip, K. — Islam – A Way of Life.
35. Hossein Nasr — Science and Civilization in Islam (Cambridge, 1968).
36. Iqbal, Dr., Muhammad — The Reconstruction of Religious Thought.
37. Jalalud Din Ansar Umari — Woman in the Islamic Society.
38. James Jeans, Sir — The Mysterious Universe.
39. Katircioglu, Mahmud M. — Wisdom of the Qur'an.
40. Khurshid Ahmad — Elimination of "Riba" from the Economy (Lahore, 1995).
41. Kisch — Sexual Life of Women.

42. Landau, A. — Islam and the Arabs.
43. Lane, Poole — Studies in a Mosque.
44. Lecky — History of European Morals.
45. Leonard, A. G. — Islam.
46. Lerounge, Raymond — Vie de Muhamet.
47. Letourneau, M. — Evolution of Marriage.
48. Ludovici — Woman.
49. Macfarlane — The Case for Polygamy.
50. Malik, S.K. Brigadier — The Qur'anic Concept of War.
51. Mannan, M. A. — Islamic Economics – Theory and Practice.
52. Margoliouth, D. S. — Muhammad and the Rise of Islam.
53. Margoliouth, D. S. — Islam and Christianity.
54. Maryam Jamila — Western Civilization Condemned by Itself.
55. Maududi, Sayyid — Economic System of Islam
56. Maududi, Sayyid — Purdah and Status of Woman in Islam (1976 Edition.)
57. Mercier, Dr. — Conduct and Its Disorders Biologically Considered.
58. Mills, Charles — History of Muhammadanism.
59. Moore, Philip — Islamic Finance : A Partnership of Growth (1997 Edn.)
60. Morris, Henry M. — Men of Science – Men of God (1992 Edition)
61. Musleh-ud-Din, Dr. M. — Economics and Islam.
62. Nemilov — Biological Tragedy of Woman.
63. Newton — Principia (1958 Edition)
64. Nurbaki, Haluk, Dr. — The Holy Qur'an and the Facts of Science.
65. Palley, William — Natural Theology.
66. Patterson, Collin — Cladistics.
67. Petersen, Dennis, R. — Unlocking the Mysteries of Creation (1990 Edition).
68. Planck, Max — Where is Science Going? (1933 Edition).
69. Qamar A. Furrukh — Ibn-e-Taymiyya on Public and Private Law in Islam.
70. Qutub, Muhammad — Islam --- the Misunderstood Religion.
71. Rashid Ahmad Jallundri — Islam and Current Issues.
72. Roberts, J. M. — A Short History of Christianity.
73. Robertson, Smith — Religions of the Semites.
74. Robertson, Smith — Kinship and Marriage in Early Arabia.
75. Rosenthal — Knowledge Triumphant.
76. Ross, Hugh — The Fingerprint of God.
77. Saeedullah, Qazi — Environment and Islam.
78. Sale, George — The Koran.
79. Saqib, Ghulam Nabi — Modernization of Muslim Education.
80. Scharlieb Mary, Lady — Straight Talks to Women.
81. Schuon, F. — Understanding Islam (Translated) 1965 Edition.
82. Scott — History of Prostitution.
83. Scott, S. P. — History of the Moorish Empire in Europe.
84. Shalaby, Ahmad — History of Muslim Education.
85. Tahir Mansuri, Dr. M. — Islamic Law of Contracts & Business Administration.
86. Tahirul Qadri, Prof. Dr. — Islamic Concept of Intermediation.
87. Taqi Usmani, Mufti — An Introduction to Islamic Finance.
88. Taqi Usmani, Muftm — Islam and Modernism.

89. Taqi Usmani, Mufti — Our Socio-Economic Order.
90. Thompson & Geddes — Evolution of Sex.
91. Tibawi, A. L. — Islamic Culture.
92. Tomlinson, John — Honest Money – A Challenge of Banking.
93. Trante Wohlus Scharf — Arab and Islamic Banks (Paris 1983 Edition).
94. Vaglieri, Laura, Prof. — An Interpretation of Islam.
95. Watt, Montgomery — Muhammad at Madina.
96. Williams — Basic Human Embryology.
97. Yusuf, Mirza Muhammad — A-One Comprehensive General Knowledge (Lhr 1988)

ENCYCLOPAEDIAS

1. Encyclopaedia Britannica.
2. Encyclopedia Americana.
3. Funk and Wagnall's New Encyclopedia of Science.
4. Grolier Academic Encyclopedia (USA. 1967).
5. Encyclopaedia of Islam.
6. Encyclopaedia of Seerah.
7. Encyclopaedia of the Qura'n, Leiden 2006-1010.
8. Hutchinson 20th Century Encyclopaedia, 7th Edition.
9. Encyclopaedia of Islam --- E. Van Donzel.
10. Hastings' Encyclopaedia Britannica.
11. The New Encyclopaedia (Chicago – 15th Edition).
12. The Concise Encyclopaedia of Islam (London, 1989).
13. Cheyne and Black's Encyclopaedia Biblica (London).
14. Hammerton's Encyclopedia of Modern Knowledge.
15. Encyclopaedic Survey of Islamic Culture.

ARTICLES/ADDRESSES

1. Muslim Approach to Education --- Muhammad Peer
2. Knowledge and the Spirit of Motherhood --- Earnest Bergman
3. Muhammadanism in Religious Systems of the World (An Address by Swan Sonnenschein).

INTERNET

WWW.leadru.com/offices/Schawfer/docs/Scientists. html.

DICTIONARIES

1. Dictionary of Contemporary Thought --- David Kirby.
2. Dictionary of Christian Antiquities --- Smith and Cheetham.
3. Hastings' Dictionary of the Bible.
4. Edward Lane's Arabic—English Lexicon (Beirut Lebanon 1968).
5. Dictionary of Modern Written Arabic.
6. Black Law Dictionary.
7. Dictionary of Modern Written Arabic.

8. Oxford English Urdu Dictionary --- Shanul Haq Haqqi, Karachi, 2009.
9. Popular Oxford Standard Medical Dictionary (English to English & Urdu)
10. Popular Oxford Newage Dictionary of Biology.

(۱۱) مفردات القرآن ـــ علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی (م۵۰۲ھ) مطبوعہ ایران ۱۳۴۲ھ۔
(۱۲) لسان العرب ـــ علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی (م۷۱۱ھ) مطبوعہ ایران ۱۴۰۵ھ۔
(۱۳) القاموس المحیط ـــ علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م۸۱۷ھ) مطبوعہ بیروت۔
(۱۴) تاج العروس ـــ علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی (م۱۲۰۵) مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ مصر۔

Journals/Newspapers

1. "The Hindu" --- Madras : 5th November, 1939.
2. "Newsweek" July 27, 1988.

(۳) روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲۰ فروری ۱۹۸۱ء۔
(۴) روزنامہ "جنگ" لاہور ۲۵ مئی ۱۹۸۶ء۔
(۵) روزنامہ "جنگ" لاہور ۲۵ جون ۱۹۸۶ء۔
(٦) اردو ڈائجسٹ ـ مئی ۱۹۸۹ء ـ رحمۃ للعالمین نمبر

TAFSIR LITERATURE

1. Text, Translation and Commentary on the Holy Qur'an --- Abdullah Yusuf Ali (USA 1403 A.H.)
2, 3. Translation and Commentary on the Holy Qur'an (English, Urdu) --- Abdul Majid Daryabadi (Karachi, March 1971).

(۴) جامع البیان : امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (م۳۱۱ھ) 'مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۵) احکام القرآن : امام ابوبکر احمد بن علی رازی الجصاص (م۳۷۰ھ) 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ء
(٦) مجمع البیان : شیخ ابوعلی فضل بن حسن طبرسی (م۵۴۸ھ) 'مطبوعہ ایران' ۱۴۰٦ھ۔
(۷) تفسیر کبیر: امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی (م٦۰٦ھ) 'مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
(۸) الجامع لاحکام القرآن : علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی (م٦٦۸ھ) 'مطبوعہ ایران ۱۳۸۷ھ۔
(۹) انوار التنزیل: قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی (م٦۸۵ھ) 'مطبوعہ مصر۔
(۱۰) البحر المحیط: علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف اندلسی (م۷۵۴ھ) 'مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ۔
(۱۱) تفسیر القرآن : حافظ عماد الدین بن محمد بن کثیر (م۷۷۴ھ) ' مطبوعہ ادارہ اندلس بیروت ۱۳۸۵ھ
(۱۲) الدُّرُّ المنثور: حافظ جلال الدین السیوطی (م۹۱۱ھ) 'مطبوعہ ایران۔
(۱۳) التفسیرات الاحمدیہ : علامہ احمد جیون جونپوری (م۱۱۳۰ھ) مطبع کریمی بمبئی (انڈیا)
(۱۴) روح البیان :علامہ اسماعیل حقی (م۱۱۳۷ھ) 'مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ' کوئٹہ۔
(۱۵) فتح القدیر : شیخ محمد علی شوکانی (م۱۲۵۰ھ) 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت۔
(۱٦) روح المعانی: علامہ ابوالفضل سید محمود آلوسی (م۱۲۷۰ھ) 'مطبوعہ دار إحیاء التراث العربی' بیروت۔
(۱۷) نور العرفان (تفسیر نعیمی) :مفتی احمد یار خاں نعیمی (م۱۳۹۱ھ) 'مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ' گجرات۔
(۱۸) تفہیم القرآن : سید ابوالاعلیٰ مودودی (م۱۳۹۹ھ) 'مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن' لاہور۔
(۱۹) ضیاء القرآن :جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری' مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز' لاہور۔
(۲۰) اللباب :ابن عدیل دمشقی۔
(۲۱) تفسیر ابن ابی حاتم۔
(۲۲) تفسیر حسینی :علامہ حسین واعظ کشفی۔
(۲۳) تفسیر الحسنات : مولانا ابوالحسنات قادری۔
(۲۴) تبیان القرآن :علامہ غلام رسول سعیدی۔

کتبِ حدیث/شروحِ حدیث

(۱) مؤطا امام مالک : امام مالک بن اَنس اَصبحی (م ۱۷۹ھ)، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۹ھ۔

(۲) المصنف عبدالرزاق : امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (م ۲۱۱ھ)، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۳۹۰ھ۔

(۳) المصنف ابن ابی شیبہ: امام ابوبکر عبداللہ بن محمد ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ)، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۰۶ھ۔

(۴) المسند : امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ۔

(۵) سنن دارمی : امام ابوعبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی (م ۲۵۵ھ)، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

(۶) صحیح بخاری : امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۲ھ۔

(۷) صحیح مسلم : امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قُشیری (م ۲۶۱ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

(۸) سنن ابنِ ماجہ : امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ (م ۲۷۳ھ)، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ۔

(۹) سنن ابوداؤد : امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (م ۲۷۵ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ

(۱۰) سنن ترمذی : امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ)، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ۔

(۱۱) البحر الذخار المعروف بہ مسند البزار: امام احمد بن عمرو بن عبدالخالق بزار (م ۲۹۲ھ)، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۹ھ

(۱۲) سنن نسائی : امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نَسائی (م ۳۰۳ھ)، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ۔

(۱۳) سنن کبریٰ : امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نَسائی (م ۳۰۳ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۱ھ

(۱۴) مسند ابوعوانہ : امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق (م ۳۱۶ھ)، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ۔

(۱۵) شرح معانی الآثار : امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی (م ۳۲۱ھ)، مطبوعہ مطبع مجتبائی لاہور ۱۳۰۴ھ۔

(۱۶) المعجم الکبیر : امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (م ۳۶۰ھ)۔ مطبوعہ بیروت۔

(۱۷) المستدرک : امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)، مطبوعہ دار الباز، مکہ مکرمہ۔

(۱۸) حِلیۃ الاولیاء : امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (م ۴۳۰ھ)، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ۔

(۱۹) سنن کبریٰ : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان (پاکستان)۔

(۲۰) دلائل النبوۃ : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔

(۲۱) مجمع الزوائد : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔

(۲۲) جامع الاصول: امام ابن الاثیر الجزری (م ۶۰۶ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ۔

(۲۳) التذکرہ فی امور الآخرۃ : امام ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی (م ۶۶۸ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

(۲۴) ریاض الصالحین: امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی (م ۶۷۶ھ)۔

(۲۵) اربعین : امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی (م ۶۷۶ھ)۔

(۲۶) منہاج الطالبین : امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی (م ۶۷۶ھ)۔

(۲۷) مشکوٰۃ المصابیح : امام ولی الدین تبریزی (م ۷۴۲ھ)، مطبوعہ اصح المطابع، دہلی۔

(۲۸) مجمع الزوائد : حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی (م ۸۰۷ھ)، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۲ھ

(۳۰) فتح الباری : حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)' مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ۔
(۳۱) بلوغ المرام : حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)' مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ۔
(۳۲) سُبُل السلام (شرح بلوغ المرام) : الصنعانی
(۳۳) الجامع الصغیر : حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۳۹۱۔
(۳۴) الخصائص الکبریٰ : حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر۔
(۳۵) کنز العمال : علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری (م ۹۷۵ھ) مطبوعہ بیروت ۱۴۰۵ھ۔
(۳۶) مرقات : علامہ علی بن سلطان القاری (م ۱۰۱۴ھ)' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۹۰ھ۔
(۳۷) مظاہر حق (شرح مشکوٰۃ اردو) : مولانا قطب الدین۔
(۳۸) شرح صحیح مسلم : علامہ غلام رسول سعیدی

کتب تاریخ' سیرت وفضائل

(۱) کتاب السیر والمغازی : امام محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ۔
(۲) السیرۃ النبویۃ : امام عبدالمالک بن ہشام (م ۲۱۳ھ)' مکتبہ فاروقیہ ملتان۔
(۳) الطبقات الکبریٰ : امام محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ)' مطبوعہ دار صادر بیروت' ۱۳۸۸ھ۔
(۴) تاریخ الامم والملوک : امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)' مطبوعہ دار القلم بیروت۔
(۵) اَلشِّفا : قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی (۵۴۴ھ)' مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان۔
(۶) البدایۃ والنہایۃ : حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی (م ۷۷۴ھ)' بیروت ۱۳۹۳ھ۔
(۷) المواہب اللدنیہ : علامہ احمد قسطلانی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔
(۸) حُسن المقصد فی عمل المولد : حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۳۹۱۔
(۹) شرح الشفا : علامہ علی بن سلطان محمد القاری (م ۱۰۱۴ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت۔
(۱۰) السیرۃ الحلبیۃ : علامہ علی بن برہان الدین الحلبی (م ۱۰۴۴ھ)' مطبوعہ المکتبۃ الاسلامیہ بیروت۔
(۱۱) شرح المواہب اللدنیہ : علامہ محمد عبدالباقی زُرقانی (م ۱۱۲۴ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۳ھ
(۱۲) الانوار المحمدیۃ : علامہ یوسف بن اسماعیل النبہانی (م ۱۹۳۲ء)' مطبوعہ مصر۔
(۱۳) حجۃ اللہ علی العالمین : علامہ یوسف بن اسماعیل النبہانی (م ۱۹۳۲ء)' مطبوعہ مصر۔
(۱۴) السیرۃ النبویۃ : علامہ سیّد احمد بن زینی الدحلان۔ مطبوعہ المکتبۃ الاسلامیہ' بیروت۔
(۱۵) الشمامۃ العنبریۃ : نواب صدّیق حسن خان بھوپالی (م ۱۳۰۷ھ)
(۱۶) ضیاء النبی ﷺ : جسٹس پیر کرم شاہ الازہری' مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز' لاہور۔
(۱۷) سیرتِ رسولِ عربی : نور بخش توکلی' اردو بازار لاہور۔
(۱۸) الفاروق ۔ عمر رضی اللہ عنہ : محمد حسین ہیکل۔
(۱۹) میلاد النبی ﷺ : پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔

کتب اسماء الرجال

(۱) میزان الاعتدال : علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذھبی (م ۷۴۸ھ)، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۱۶ھ
(۲) تھذیب التھذیب : حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)، بیروت ۱۴۱۵ھ۔

کتب فقہ

(۱) فتاوٰی قاضی خاں : علامہ حسین بن احمد اوز جندی (م ۲۹۵ھ)، مطبع کبرٰی امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ۔
(۲) المبسوط : شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی (م ۴۸۳ھ)، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۳۹۸ھ۔
(۳) إحیاء علوم الدین : امام محمد بن محمد الغزالی (م ۵۰۵ھ)، مطبوعہ دار الخیر بیروت ۱۴۱۳ھ۔
(۴) بدائع الصنائع : علامہ ابو بکر بن مسعود کاسانی (م ۵۸۷ھ)، مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید اینڈ کمپنی ۱۴۰۰ھ
(۵) المُغنی : علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ (م ۶۲۰ھ)، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۵ھ۔
(۶) روضۃ الطالبین : علامہ یحیٰی بن شرف النووی (م ۶۷۶ھ)، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۵ھ۔
(۷) الحاوی للفتاوٰی : علامہ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد۔
(۸) فتاوٰی عالمگیری : مُلّا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ)، مطبوعہ مطبع کبرٰی امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ۔
(۹) ردُّ المحتار : علامہ سیّد محمد امین عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ)، مطبوعہ دار إحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ۔
(۱۰) التشریع الجنائع الاسلامی : عبد القادر عودہ۔

کتب متفرقہ

(۱) قُوت القلوب : شیخ ابو طالب محمد بن الحسن المکی (م ۳۸۶ھ)، مطبع میمنہ مصر ۱۳۰۶ھ۔
(۲) الاحکام السلطانیہ : علامہ ابو الحسین علی بن محمد حبیب الماوردی (م ۴۵۰ھ)۔
(۳) جامع الاصول : علامہ ابو الحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر (م ۶۳۰ھ)، بیروت۔
(۴) الآحاد والمثانی : علامہ ابو الحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر (م ۶۳۰ھ)، بیروت۔
(۵) الطرق الحکمیہ : شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزیہ (م ۷۵۱ھ)
(۶) زاد المعاد : لابن القیم جوزیہ (م ۷۵۱ھ)
(۷) مفتاح دار السعادۃ : لابن القیم جوزیہ (م ۷۵۱ھ)
(۸) العِقد الفرید : ابن عبد ربّہٖ۔
(۹) کتاب الخراج : امام ابو یوسف

(۱۰) کتاب الاموال : ابی عُبید۔
(۱۱) محلّہ : ابن حزم اندلسی۔
(۱۲) فضل العلم : ابن عبدالبرّ۔
(۱۳) مکتوباتِ امام ربانی: امام احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ)' مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۳۷۰ھ
(۱۴) حجۃ اللہ البالغۃ: شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ)۔
(۱۵) نَیل الاوطار : شیخ محمد بن علی بن محمد شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)' مطبع مصطفٰی البابی واولادہ بمصر ۱۳۵۰ھ۔
(۱۶) نظریۃ الِاثبات : احمد فتحی بہناسی۔
(۱۷) معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل : نعیم صدّیقی۔
(۱۸) قرآن اورعلمِ جدید: ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔
(۱۹) سود پر تاریخی فیصلہ (اردو ترجمہ): مفتی محمد تقی عثمانی۔
(۲۰) اسلام کا نظریہِ تعلیم : ڈاکٹر احمد لسٹر۔
(۲۱) تعلیم و تعلّم : منوّر ابنِ صادق۔
(۲۲) اسلام کا نظامِ تعلیم : ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی۔
(۲۳) اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی۔
(۲۴) اسلامی نظامِ تعلیم کا مفہوم ومطلب: مولونا محمد طاسین۔
(۲۵) قرآنِ پاک ایک چیلنج' ایک سائنسی معجزہ : میجر (ر) امیر افضل خان۔
(۲۶) کتابِ زندگی : سلطان بشیر محمود۔
(۲۷) نظریہ ارتقاء : ایک فریب (اردو ترجمہ) :ہارون یحیٰ۔
(۲۸) قرآن رہنمائے سائنس (اردو ترجمہ) : ہارون یحیٰ۔
(۲۹) دیوان حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالٰی عنہ مع شرح دیوان از عبدالرحمٰن البرقوقی۔

اشاریہ (قرآنی) جلد سوم INDEX (QUR'ANIC-- III)

(قوسین کے اندر کے اعداد سورۃ نمبر/صفحہ نمبر کو ظاہر کرتے ہیں)

۲ : ۲۸۲ (۱۲۶۱، ۱۳۶۵، ۱۴۶۹)

اشاریہ احادیث مبارکہ

INDEX (General) اشاریہ(عمومی)

﴿☆☆☆☆☆☆☆☆☆﴾

قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اردو ترجمہ

جلد سوم

مؤلف
پروفیسر اشفاق احمد خان